سعادت الدارین

فی

مقتل الحسین علیہ السلام

تالیف منیف

علامہ الشیخ محمد حسین النجفی مجتہد العصر مدظلہ العالی

اسلامک بک سنٹر، اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔

جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں کبھی مردہ نہ کہنا بلکہ (وہ لوگ) زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کی حقیقت کا شعور نہیں رکھتے۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۴)

کتابِ مستطاب

سعادت الدارین فی مقتل الحسین

تالیف

صدر المحققین، سلطان المتکلمین حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ
الشیخ محمد حسین النجفی قبلہ مجتہد العصر مدظلہ العالی

ناشر

اسلامک بک سینٹر، 362-C، گلی نمبر 12، سیکٹر G-6/2، اسلام آباد

باسمہ سبحانہ

اھداء

ان خزف ریزوں کو عقیدت واخلاص کے سلک میں پرو کر سرکار سید الشہداء ابو عبداللہ الحسین علیہ السلام کی بارگاہ معلٰی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔ اس امید کامل کے ساتھ کہ شاید ان کی نظر کیمیا اثر سے ان کی آبرو میں اس قدر بڑھ جائے کہ سوائے جنت الفردوس کے ان کی اور کوئی قیمت مقرر نہ کی جاسکے۔ ؏

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

الاحقر
محمد حسین عفی عنہ
کوٹ فرید، سرگودھا
۳ دسمبر ۱۹۷۶ء

قطعہ تاریخ کتاب سعادۃ الدارین

از قلم شاعر اہل بیت سید وزیر حسین وزیر شیرازی

دو اماموں کی سرگزشت ہے یہ
اس لیے کہیے اس کو ذوالنورین
سال تاریخ یوں وزیر کہو
"چاپ ثانی سعادت الدارین"

(۱۳۹۸ھ)

نام کتاب	:	سعادت الدارین فی مقتل الحسینؑ
تالیف	:	علامہ الشیخ محمد حسین النجفی
تحقیق وتصحیح	:	علامہ آفتاب حسین جوادی
پیشکش	:	سید محمد ثقلین کاظمی
کمپوزنگ	:	غلام حیدر (میکسیما کمپوزنگ سینٹر، موبائل:03335169622)
ناشر	:	اسلامک بک سینٹر، C-362، گلی 12، سیکٹر G-6/2 اسلام آباد
طباعت	:	میکسیما پرنٹنگ پریس، راولپنڈی
طبع پنجم	:	مئی ۲۰۰۴ء بمطابق ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
قیمت	:	۳۰۰ روپے
تعداد	:	۱۰۰۰

ملنے کا پتہ

اسلامک بک سینٹر

مکان نمبر C-362، گلی نمبر 12،

سیکٹر G-6/2، اسلام آباد

فون:051-2870105

میکسیما کمپوزنگ سینٹر

آفس نمبر 19، تھرڈ فلور، ماسکو پلازہ،

W-64، بلیو ایریا، اسلام آباد

موبائل:03335169622

عرض ناشر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خالق ارض وسماء کا خصوصی احسان وکرم ہے کہ اس نے ہمیں مکتب اہل بیت علیہم السلام جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

حقیقت امر یہ ہے کہ علامہ محمد حسین نجفی دامت فیوضہم العالیہ نے مختلف عنوانات پر بہت سی علمی اور جامع کتب تحریر فرمائی ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب "سعادت الدارین فی مقتل الحسینؑ" بھی ہے۔ یہ بڑی تحقیقی کتاب ہے جو واقعات کربلا پر سند کی حیثیت رکھتی ہے اس وقت تک اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ کتاب ایک اچھے اور خوبصورت انداز میں شائع ہو، چنانچہ جناب علامہ محمد حسین نجفی قبلہ سے اس کتاب کے پانچویں ایڈیشن کو اسلامک بک سینٹر اسلام آباد کی طرف سے شائع کرنے کی اجازت طلب کی گئی جو آپ نے بخوشی مرحمت فرمائی۔

اشاعت کی اجازت ملنے کے بعد اس کتاب کی تصحیح وتصویب کیلئے جناب مولانا آفتاب حسین جوادی دام مجدہ کو زحمت دی گئی چنانچہ انہوں نے پورے انہماک کے ساتھ اس مسودے پر نظر ثانی فرمائی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں، خداوند عالم ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

ہم اس کتاب کو ممکن حد تک جدید کمپوزنگ، عمدہ وخوبصورت طباعت اور تصحیح کے ساتھ ابنائے قوم وملت کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ بحق چہاردہ معصومین علیہم السلام ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش قبول فرمائے اور اسے ہمارے لیے ذریعہ بخشش قرار دے، واعظین وذاکرین کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

والسلام
سید محمد ثقلین کاظمی
اسلامک بک سینٹر، C-362، گلی نمبر 12
سیکٹر G-6/2، اسلام آباد

بتاریخ: ۱۲ مئی ۲۰۰۴ء بمطابق ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۵ء

اجمالی فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

بزرگوں کی یاد منانا اور اس کی غرض وغایت

زندہ قوموں کا دستور ہے کہ وہ اپنے واجب الاحترام بزرگوں کی یاد منانے اور ان کے عظیم کارناموں کا تذکرہ کر کے نئی پود کے خون کو گرمانے اور ان میں جذبۂ عمل پیدا کرنے کو اپنے لیے مایۂ سعادت مندی اور اس میں تقصیر وکوتاہی کرنے کو گناہ تصور کرتی ہیں۔ اسلام بھی اسی فطری تقاضا کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ تعلیم دیتا ہے: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ محسن کے احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ دینا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ جس قدر واقعہ کی اہمیت اور صاحبِ واقعہ کی عظمت ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق اس کی یادگار مہتم بالشان اور موثر ہوتی ہے۔

یادگاروں کے قائم کرنے کا خواہ وہ کسی قوم وملت سے متعلق ہوں۔ مذہبی ضرورت سے قائم کی گئی ہوں یا قومی لحاظ سے، ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ تمام آنے والی نسلیں جب تک وہ یادگار قوم کے تغافل سے محفوظ اور اپنی قوت اثر کے لحاظ سے قائم رہ سکتی ہے۔ اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ کم از کم سال میں ایک مرتبہ اس یادگار کے ہیرو کا کریکٹر و کردار ان کے پیش نظر ہو جائے۔ وہ اس کی ارادی وعملی قوتوں پر غور کریں۔ اپنے جذبات کی تصحیح اور شعار کی اصلاح میں اس کے واقعات سے مدد لیں تاکہ اگر کبھی زمانہ اور وقت اس کا مقتضی ہو تو دنیا کے سامنے ویسی ہی شاندار اور زریں مثال پیش کر سکیں۔

محرم کا حسینؑ ایسے ہی کریکٹر و کردار کا انسان تھا جس کے واقعات کا مطالعہ اور جس کی یادگار کا مشاہدہ ہر قوم وملت کے افراد کے لیے یکساں مفید اور سبق آموز ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے انسانیت کی حفاظت، حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں ایسی شاندار قربانیاں دی ہیں اور نوعِ انسان کو فلسفۂ اخلاق کے وہ درس دیے ہیں کہ جن کی

بدولت اقوام عالم میں انتہائی بلند و بالا مقام حاصل کر لیا ہے۔ آج وہ تنہا مدینہ و کربلا کا، شیعہ اور سنی مسلمانوں کا، ہندوؤں اور دوسری قوموں کا حسینؑ نہیں ہے بلکہ ایک انگریز کے قول کے مطابق تمام دنیا کا حسینؑ ہے۔ گو ایسا پُر درد واقعہ جس کی یاد ہر مومن کے لوح قلب پر کالنقش علی الحجر کندہ ہے۔ بظاہر کسی رسمی یادگار کا محتاج نہیں ہے لیکن یہ ایک ناشکر گزاری ہوتی۔ اگر مسلمان اپنے محسن ہیرو کی جو اسلام کو نئے سرے سے زندہ کرنے والا اور اس کی بقاءِ ہستی کا باعث ہے اور جس کی عظیم الشان اور بے مثال قربانی پر اسلامی تاریخ جس قدر فخر و ناز کرے کم ہے، کوئی یادگار قائم نہ کرے! مسلمانوں نے یادگار قائم کی اور ایسی کی کہ دوسری قومیں اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتیں۔ (مجاہد اعظم)

مجالس عزاء کی تاریخ

وہ مثالی یادگار ہے حسین علیہ السلام کی مجلس عزاء جو اگرچہ سال بھر دنیا کے گوشے گوشے میں برپا رہتی ہے مگر محرم کے عشرہ میں اس کی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اب رہی اس بات کی تحقیق کہ شہادت حسینؑ کے بعد اس غم کدہ عالم میں پہلی مجلس عزا کب منعقد ہوئی؟ اس کا صحیح جواب دینا قدرے مشکل ہے۔ ہاں مختلف تاریخی آثار و اخبار سے اس قدر ضرور واضح و آشکار ہوتا ہے کہ پہلی مجلس عزا اسیران اہل بیتؑ کی رہائی کے بعد حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور مخدرات عصمت و طہارت نے یزید کے دار الحکومت شام میں منعقد کی۔ پھر دوسری مجلس واپسی پر مدینہ پہنچنے کے بعد ہوئی جس میں تمام مردوں اور عورتوں نے شریک غم ہو کر امام عالی مقام پر گریہ و بکا کیا۔ پھر اسی تسلسل کے ساتھ آئمہ اطہار علیہم السلام مخصوص طریقہ اور محدود پیمانہ پر مجالس عزا منعقد کرتے رہے۔ بالآخر دیلمی خاندان کے دور میں ان کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی اور آزادانہ طور پر مجالس عزا منعقد کی گئیں اور کھلم کھلا طور پر مظلوم کربلا کا ماتم کیا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ برابر مختلف ادوار و اعصار میں جاری و ساری رہا۔ متحدہ ہندوستان میں مجالس عزا پر خاص توجہ کی گئی اور ان کو بام عروج تک پہنچایا گیا۔

مجالس و محافل کے فوائد و عوائد کا ایک شمہ

ارباب عقل و دانش پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اگر ہماری یہ مجالس و محافل اور ماتمی جلوس صحیح طریقے و سلیقے سے انعقاد پذیر ہوں تو بے شمار فوائد و عوائد کے حامل ہیں اور حق تو یہ ہے کہ ماضی کے بعض تاریک ترین دوروں اور نامساعد حالات سے گزرنے کے باوجود مذہب حق کی بقاء اور اس کی ترقی و اشاعت کا راز اسی عزاداری سید الشہداءؑ میں پوشیدہ نظر آتا ہے جیسا کہ فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر جوزف نے اپنی کتاب "الاسلام والمسلمون" میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اب ذیل میں ان مجالس و محافل کے بعض فوائد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ مجالس دینی معلومات حاصل کرنے کا وہ مدرسہ ہیں جن میں تمام طبقات کے لوگ شرکت کر کے دینی معلومات

از قسم اصول و فروع دین، اسلامی تاریخ، تمدن و معاشرت، اخلاق اور سیرت معصومینؑ کے درس حاصل کرتے ہیں جس سے اصلاح عقائد و اعمال میں خاصی مدد ملتی ہے۔

(۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ سے لوگوں کو اطاعت گزاری کا حکم اور غفلت شعاری سے ممانعت کر کے مقصد خلقت کی تکمیل میں مدد کی جاتی ہے۔

(۳) معصومین علیہم السلام کے فضائل اور صفاتِ جلیلہ اور مخالفین کے برے خصائل و صفاتِ رذیلہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے سامعین میں فطری طور پر اپنے اندر صفاتِ جمیلہ پیدا کرنے اور صفاتِ رذیلہ سے اجتناب کرنے کا ملکۂ صالحہ پیدا ہوتا ہے۔

(۴) امام الشہداءؑ کے عظیم کارناموں کے تذکرہ سے سننے والوں کے اندر حق کی نصرت اور باطل کا مقابلہ کرنے کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(۵) یہاں چونکہ دین حق کی حفاظت و صیانت کے لیے خود اختیاری طور پر آئمہ طاہرینؑ اور بالخصوص امام حسینؑ کے جانگداز مصائب برداشت کرنے کے تذکرے ہوتے ہیں جس سے ان کے نام لیواؤں کے دل میں مذہب کی حقانیت راسخ ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی مذہب اہل بیتؑ ترک کر کے کسی اور مذہب کو اختیار نہیں کرتے۔

(۶) یہاں دین اسلام کے معارف و حقائق بیان ہوتے ہیں جن سے مقصد شہادتِ حسینؑ کی تکمیل ہوتی ہے۔

(۷) یہاں چونکہ مظلومین کی مظلومیت اور ظالمین کے واقعاتِ ظلم و جور کو مؤثر اور دل نشین انداز میں بیان کیا جاتا ہے اس لیے سامعین کے دلوں میں مظلوم سے الفت اور ظالم سے نفرت کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

(۸) یہاں دنیائے دوں کی حقارت و بے ثباتی اور آخرت کی جلالت و ہمیشگی کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے سامعین میں ''زہد'' و ''تقویٰ'' جیسی جلیل القدر صفتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۹) یہاں آئمہ طاہرینؑ پر حمایت حق کی وجہ سے وارد شدہ مصائب و شدائد اور ان کے صبر و رضا کے تذکرے کئے جاتے ہیں جس کے سبب سے ان کے نام لیواؤں کے اندر صبر و رضا اور بالخصوص دین کے معاملہ میں وارد شدہ تکالیف برداشت کرنے کا خوابیدہ شوق بیدار ہو جاتا ہے۔

(۱۰) اس سے مجالس منعقد کرنے اور ان میں شرکت کرنے والوں کا جناب رسالت مآبؐ اور ان کی آل اطیابؑ کے ساتھ محبت اور قلبی لگاؤ کا عملی ثبوت مل جاتا ہے کیونکہ محبوب کی خوشی سے خوش ہونا اور اس کے غم سے غمناک ہونا ایک فطری اور جبلی تقاضا ہے۔ اسی بنا پر امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ارشاد

﴿شیعتنا خلقوا من فاضل طینتنا یحزنون لحزننا و یفرحون لفرحنا﴾ (بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۲۸۹، طبع قدیم) اور حضرت باقر العلوم علیہ السلام کا فرمان ہے: ﴿شیعتنا من تابعنا فی افعالنا و لم یخالفنا و اذا امنا امن و اذا خفنا خاف﴾ ہمارا شیعہ وہ ہے جو ہمارے اعمال میں ہماری پیروی کرتا ہے اور جب ہم امن میں ہوں تو وہ امن میں ہوتا ہے اور جب ہم خوف زدہ ہوں تو وہ بھی خائف ہوتا ہے۔ (تفسیر برہان، ج ۲، ص ۱۷۳، طبع تہران) تلک عشرۃ کاملۃ۔

انہی حقائق کی بنا پر حضرات معصومین علیہم السلام ایسی مجالس و محافل کو محبوب رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے اپنے صحابی فضیل سے دریافت فرمایا: ''اے فضیل کیا تم باہم بیٹھ کر اور مجالس برپا کر کے احادیث بیان کرتے ہو؟ فضیل نے عرض کیا: ہاں فرزند رسولؐ! فضیل کا یہ جواب سن کر امامؑ نے فرمایا: ﴿تلک مجالس انا احبھا﴾ ''ایسی مجالس کو میں محبوب رکھتا ہوں۔'' پھر فرمایا: ﴿رحم اللہ من احیی امرنا﴾ خدا اس بندے پر رحم فرمائے جو ہماری شریعت کو زندہ کرتا ہے۔ (نفس المھموم)

دعوت غور و فکر

مجالس و محافل کے بے شمار فوائد میں سے اوپر صرف دس فائدے ذکر کیے گئے ہیں جو قطرہ از دریا و دانہ از انبار کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن آیئے موجودہ مجالس و محافل کا اجمالی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا ان کے انعقاد سے یہ فوائد حاصل بھی ہو رہے ہیں یا نہیں؟ کیا ان میں صحیح عقائد و اعمال کی تعلیم دی جاتی ہے؟ کیا ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے؟ کیا کربلا والوں کے اتفاق و اتحاد کے تذکرے کرنے والوں کی اپنی صفوں میں اتحاد ہے؟ کیا مظلوم کی حمایت کے دعویداروں میں آج ظالم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت کا جذبہ موجود ہے؟ غرضیکہ آیا ہمارے اخلاق و اطوار سے ہمارا حسینی ہونا واضح و آشکار ہوتا ہے؟ اگر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حالات حاضرہ کا جائزہ لیا جائے تو ان سوالات کے جوابات نہایت مایوس کن سامنے آتے ہیں۔

موجودہ روش و رفتار پر تنقید

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجالس بہت ہوتی ہیں۔ ان میں روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ ظاہری مظاہر غم کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ بالخصوص محرم کے ایام میں تو کچھ اور ہی کیفیت ہوتی ہے لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ آیا شہادت امام کی علت غائی اور اصلی مقصد یہی ہے کہ محرم کا چاند نظر آیا۔ ماتمی لباس پہنا، مجلس عزا منعقد کی، مرثیے اور نوحے پڑھے، لچھے دار تقریریں سنیں، آنسو بہائے، سر پیٹا، سینہ کوٹا اور بس۔ اگر مقصد شہادت صرف اتنا ہی ہے اور ہم نے اس سے یہی سبق حاصل کیا ہے تو دنیائے اسلام کے لیے یہ دوسری مصیبت ہے جو حادثۂ عاشوراء سے کم نہیں ہے

اور یہ سراسر اس عدیم النظیر واقعہ کی توہین و تذلیل ہے۔

مجالس عزا بہترین عبادت اور ذریعہ بخشش ہیں

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس عظیم سانحہ کو زندہ رکھنے، جذبات غم والم میں ہیجان پیدا کرنے اور حزن انگیز اسباب میں اضافہ کرنے کی خاطر ماتمی جلوسوں اور دیگر مظاہر غم کے افادی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا! اسی طرح اس حقیقت میں بھی کسی محب اہل بیتؑ کو کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا کہ امام الشہداءؑ یا دوسرے آئمہ ہدیٰ ؑ کے نام پر مجالس عزاء یا محافل میلاد منعقد کرنا بہترین اسلامی عبادات اور بخشش گناہان کا بہترین ذریعہ ووسیلہ ہے۔ جیسا کہ کامل الزیارہ، ثواب الاعمال اور عیون اخبار الرضا وغیرہ کتب معتبرہ میں نثر و نظم کے ذریعہ ذکر مصائب کرنے اور رونے و رلانے کی فضیلت میں بکثرت احادیث شریفہ موجود ہیں۔ (ہم نے ان کا ایک شمہ اپنے رسالہ اصلاح المجالس میں نقل بھی کیا ہے) لیکن بایں ہمہ ارباب عقل و دانش پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ماتمی جلوس ہوں یا مجالس عزاء یہ اصل مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مجالس کی موجودہ روش میں اصلاح کی ضرورت ہے

اب قابل غور بات یہ ہے کہ ہر سال لاکھوں روپے خرچ کرنے کے باوجود آیا وہ مقصد حاصل ہو رہا ہے؟ اور ان مجالس سے مطلوبہ نتائج و آثار ان پر مترتب ہو رہے ہیں؟ آج ہر ہمدرد قوم وملت کے قلب حساس میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے! یہاں پھر قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جواب میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ موجودہ طرز مجالس میں کچھ خامیاں وخرابیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے! بنابریں موجودہ طرز میں اصلاح کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے۔

پہلے:۔ ان مجالس کا طریقہ وہ ہونا چاہیے جو آئمہ اہل بیتؑ کا تھا۔ مجالس عزا کو بزم مشاعرہ اور جلسۂ موسیقی نہ بنایا جائے۔

دوسرے:۔ رسوم کو بھی ایسے سادہ اصول سے ادا کیا جائے جو ہر قسم کی لغویات تصنع اور نمود ونمائش سے مبرا ہوں۔ نہ ایسے طریقے پر کہ مخالف مضحکہ اڑائیں۔

تیسرے:۔ مراسم یادگاری اس طرح ادا کی جائیں کہ بدعات سیئہ وحرکات نامشروع کی حد تک نہ پہنچیں اور اس مصرع کی مصداق نہ بنیں کہ ؎

ماتم کریں حسینؑ کا لوٹیں حسن پورہ (مجاہد اعظم، حصہ اول)

ہم اس کے قائل نہیں کہ اگر کسی مسجد میں قوالی ہوتی ہو یا کسی بزرگ کی قبر پر عرس تو مسجد گرادی جائے یا قبر اکھاڑ دی جائے یا اگر باغ میں کچھ خس وخاشاک پڑ جائے تو باغ تباہ کر دیا جائے بلکہ غلط رسم کا استیصال کرنا چاہیے لہذا اگر ہماری موجودہ مجالس میں کچھ نقائص ہیں اور یقیناً ہیں از قسم بد اعتقادی، بدعملی، بے اخلاصی اور رسم پرستی وغیرہ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ مجالس ہی بند کر دی جائیں بلکہ ان کی اصلاح ہونی چاہیے تاکہ گلزار عزائے حسینؑ سے یہ خس وخاشاک دور ہو جائے۔

اصلاح احوال کی زیادہ ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اصلاح کون کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اس اصلاح کی ذمہ داری کسی ایک فرد یا ایک گروہ پر عائد نہیں ہوتی بلکہ مجالس پڑھنے، سننے اور منعقد کرنے والے سب طبقات پر عائد ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری اہل علم پر عائد ہوتی ہے جو کشتیٔ قوم کے ناخدا ہونے کے دعویدار ہیں۔ لہذا اگر یہ طبقہ بعض اغراض فاسدہ کا شکار ہو کر اپنی شرعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش نہیں کرے گا تو خدا اور رسول کی لعنت میں گرفتار ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡهُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ﴾ (سورہ بقرہ، ۲ آیت ۱۵۹)

اور جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو کھلی دلیلیں اور ہدایت ان پر نازل کر چکے بعد اس کے کہ ہم نے کل آدمیوں کے لیے کتاب میں اس کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یقیناً ان ہی پر اللہ لعنت کرتا ہے اور انہی پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ (ترجمہ مقبولؒ)

اور جناب رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿اذا ظهرت البدع فی امتی فلیظهر العالم علمه فمن لم یفعل فعلیه لعنة اللّٰه﴾

''جب میری امت میں بدعات ومنکرات ظاہر ہو جائیں تو عالم دین کو چاہیے کہ اپنے علم کا اظہار کریں سو جس نے ایسا نہ کیا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔''

(اصول کافی، صفحہ ۳۰، باب البدع والرأی والمقائیس)

اس شرعی ذمہ داری کے ادا نہ کرنے کی اس تہدید ووعید کے پیش نظر ہم نے اصلاح احوال کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اگرچہ ہمیں اس کی بڑی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑ رہی ہے مگر ہم نے بعونہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہر تکلیف برداشت کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ لعنتِ خداوندی کے بالمقابل سب کچھ ہیچ ہے۔ ہم سے تو انسان ضعیف البیان کو خوش

کرنے کی خاطر خالق دو جہاں کو ناراض کر کے اس کی لعنت کا طوق اپنی کمزور گردن میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہم نہ تو مجالس عزا کے خلاف ہیں (معاذ اللہ) اور نہ واعظین و ذاکرین کی ذات سے ہمیں کسی قسم کی کوئی کدو کاوش ہے بلکہ مقصد صرف اصلاح احوال کی کوشش کرنا ہے ﴿إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ وَاللَّهُ عَلَى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ﴾۔

کیا اصلاح ہونی چاہیے؟

مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر اب یہ سوال ابھرتا ہے کہ ان مجالس میں کیا اصلاح ہونی چاہیے؟ موجودہ طرز میں وہ کون سے نقائص ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے؟ تاکہ مطلوبہ فوائد و آثار ان پر مترتب ہو سکیں۔ اس کا جواب یہ ہے۔ یہ خرابیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو مجالس پڑھنے، سننے اور منعقد کرنے والوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق ان طبقات میں سے کسی ایک کے ساتھ ہے۔ اب ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ ان تمام خامیوں کی نشاندہی کر کے ان کے ازالہ کی سعی جمیل کرتے ہیں۔

سب سے پہلی اصلاح اخلاص کا ہونا ہے

موجودہ طرز مجالس میں جو سب سے بڑی خامی ہے وہ اخلاص کی جنس گرانمایہ کی کمی ہے یہ درست ہے کہ ہر گروہ و جماعت میں مستثنیات ہوتے ہیں (وقلیل ما ہم) لیکن بدقسمتی سے جہاں تک مذکورہ بالا تینوں طبقوں کی اکثریت کا تعلق ہے اس میں نہ صرف یہ کہ اس چیز کی قلت ہے بلکہ سراسر فقدان ہے حالانکہ ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ جب تک خلوص نیت نہ ہو۔ اس وقت تک کوئی عمل، عمل اور کوئی عبادت، عبادت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے لازم ہے کہ کوئی بھی عمل صالح ہو اسے ہر قسم کے دنیوی اغراض فاسدہ سے مبرّا اور خالصاً لوجہ اللہ ہونا چاہیے۔ ارشاد قدرت ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (سورۂ بینہ، آیت ۵)

"حالانکہ انہیں تو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ یکسو ہو کر دین کو اس کے لیے خالص رکھتے ہوئے صرف اللہ کی عبادت کریں۔"

جناب پیغمبر اسلام ﷺ فرماتے ہیں:

﴿الناس کلهم هلکی الا العالمون و العالمون کلهم هلکی الا المخلصون و المخلصون علی خطر عظیم﴾

"سب لوگ ہلاک ہو جائیں گے سوائے جاننے والوں کے اور جاننے والے سب ہلاک ہو جائیں گے سوائے مخلصین کے اور مخلصین بھی بڑے خطرے میں ہیں۔

(الکبریت الاحمر، ص ۱۲، فصل دوم، در شرائط واعظ)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

﴿من تعلّم علماً من علم الاخرة یرید به غرضاً من غرض الدنیا لم یجد ریح الجنّة﴾ جو شخص علم آخرت (علم دین) کو دنیا کمانے کے لیے حاصل کرے اسے جنت کی خوشبو بھی نصیب نہ ہوگی۔ (سرائر ابن ادریس حلیؒ، بحوالہ لولو و مرجان، صفحہ ۱۳، مطبوعہ لکھنؤ)

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاص کے بغیر عمل ایک کاغذی پھول ہے جس میں خوشبو نہ ہو یا ایک ڈھانچہ ہے جس میں روح نہ ہو۔ یہی مقدار خواب غفلت میں سوئے ہوئے حضرات کو بیدار کرنے کیلئے کافی ہے ع

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

مجلس خواں طبقہ کی اکثریت کے اخلاص سے خالی ہونے کے شواہد پنجگانہ

چونکہ سطور بالا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بدقسمتی سے مجلس پڑھنے، سننے اور منعقد کرنے والوں کی اکثریت دولت اخلاص سے تہی دامن ہے اگرچہ موجودہ ماحول میں یہ حقیقت دلائل و براہین کی محتاج نہیں ہے تاہم بموجب ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ ناظرین کرام کے اطمینان قلب کی خاطر۔ پہلے مجلس خوان گروہ کے عدم اخلاص پر پنجگانہ قطعی شواہد و قرائن پیش کرتے ہیں اور پھر دوسرے دونوں طبقوں کے عدم اخلاص پر شواہد پیش کریں گے۔

عدم اخلاص کا پہلا شاہد فیس کا طے کرنا

اس دعویٰ کا پہلا شاہد یہ ہے کہ یہ لوگ فیس طے کر کے اور اجرت چکا کر مجالس پڑھتے ہیں۔ معمولی عقل و انصاف رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ اس طرح دین فروشی کرنے والے شخص یا گروہ میں اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے مگر اخلاص ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ بات روز روشن سے بھی زیادہ واضح و آشکار ہے تاہم بطور اتمام حجت اس دین فروشی کی مذمت کے سلسلہ میں ایک دو احادیث شریفہ پیش کی جاتی ہیں۔ لیھلک من ھلک عن بیّنة و یحییٰ من حیّ عن بیّنة۔

(۱) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿من اراد الحدیث لمنفعة الدنیا لم یکن له فی الاخرة نصیب ومن اراد به خیر الاخرة اعطاه الله به خیر الدنیا و الاخرة﴾ جو شخص دنیوی منفعت کی

خاطر حدیث حاصل کرے آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے اور جو آخرت کی خیر کے لیے حاصل کرے اسے خدائے کریم دنیا و آخرت کی خیر و خوبی عطا فرمائے گا (اصول کافی، صفحہ ۲۵، باب المستاکل بعلمہ والمباھی بہ)۔ (۲) امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿لا تاکل بنا الناس فیفقر﴾ ہمارے ذریعہ سے لوگوں کا (مال) نہ کھاؤ ورنہ فقیر و نادار ہو جاؤ گے۔ (اصول کافی، صفحہ ۵۲۱، باب طلب الریاسۃ) بعض اہل تحقیق نے اس فقرہ سے "فقر دارین" مراد لیا ہے یعنی دنیا میں خیر و برکت نہ ہوگی اور آخرت میں نیکیوں سے دامن تہی ہوگا۔

ائمہ اطہارؑ کے اپنے مادحین کو مال عطا کرنے والے شبہ کا ازالہ

ذکر اہل بیت علیہم السلام کو ذریعۂ معاش بنانے والے کچھ لوگ اپنے اس فعل مذموم کے لیے یہ جواز پیش کیا کرتے ہیں کہ یہ ائمہ طاہرین علیہم السلام اپنے مدح کنندہ شعراء مثل فرزدق، کمیتؒ اور دعبل خزاعیؒ وامثالہم رضوان اللہ علیہم کو ان کے مدحیہ قصائد یا مراثی غم انشاء کرنے پر عطایائے کثیر عطا فرمایا کرتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نام پر بھاری بھرکم فیس لینا جائز ہے۔

اس شبہ (جو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے) کا جواب ظاہر ہے کہ ان شعراء کرامؒ نے نہ کبھی فیس طے کی تھی اور نہ ہی کبھی اسے ذریعۂ معاش بنایا تھا کیونکہ جہاں ائمہ طاہرین علیہم السلام کا ان کو عطیات کثیرہ سے نوازنا مذکور ہے وہاں یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ ان شعراء نے کبھی ائمہ علیہم السلام کے ساتھ پہلے معاملہ طے کیا ہو کہ آقا ہم نے آپ کی یا آپ کے اب وجد کی مدح میں قصیدہ یا ان کی مصیبت پر مرثیہ لکھا ہے مگر سنائیں گے تب جب پہلے آپ یہ طے کرلیں کہ آیا فیس دیں گے؟ ظاہر ہے کہ جب تک یہ بات ثابت نہ کی جائے اس وقت تک اس کے ساتھ تمسک ہرگز درست نہیں ہے اور یہ بات قیامت تک ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ روایات میں تو اس کے برخلاف بوقت عطا ان مخلص شعراء کے انکار اور حضرات ائمہؑ کے باصرار عطا کرنے کے تذکرے ملتے ہیں۔

مجالس پر نذرانہ لینے کے جواز کا طریقہ

مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادحین ائمہ قربۃً الی اللہ پہلے ان کی مدح وثنا کرتے تھے اور بعد میں یہ ذوات مقدسہ از خود خوش ہو کر ان کو کچھ نذرانہ پیش فرما دیتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح دینا اور لینا جائز ہے جیسا کہ اس روایت سے بھی یہی واضح ہوتا ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ نے فرمایا: ﴿لا تشارط و تقبل کل ما اعطیت﴾ پہلے اجرت اور فیس طے نہ کرو (بلکہ قربۃً الی اللہ) پڑھو ہاں اگر بعد میں جو کچھ پیش کیا جائے تو اسے قبول کر لو۔ (مہیج الاحزان، صفحہ ۱۲، طبع ایران) علماءِ اعلام کا فتویٰ بھی اسی کے مطابق ہے۔ جیسا کہ دیار فقہ کی سیر کرنے والے حضرات پر مخفی نہیں ہے اور اگر بالفرض بعض علماء کے فتویٰ کے مطابق اجرت

طے کرنے کو جائز بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والے کو آخرت میں اجر وثواب بھی ملے گا! مگر یہاں تو ابلہ یا خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ بایں ہمہ دین فروشی من بکی او ابکی..... الخ والی احادیث کو اپنے اوپر منطبق کیا جاتا ہے۔ بھلا جب دارِ دنیا میں اجرت مقرر کر کے اہل ایمان سے نقد وصولی کر لی تو پھر آخرت میں خدا سے اجر وثواب لینے کا استحقاق کہاں رہا؟

مستحبات پر اجرت لینے کے جواز والے شبہ کا ازالہ

بعض نیم ملا خطرۂ ایمان قسم کے لوگ اپنے اس مذموم دھندے کا جواز ثابت کرنے کے لیے یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ واجبات کی ادائیگی پر اجرت لینا حرام ہے نہ مستحبات پر، اور چونکہ مجلس عزاء ایک مستحب امر ہے لہٰذا اس پر اجرت لینا جائز ہے۔

ان حضرات کے دینی معلومات میں اضافہ کی خاطر عرض ہے کہ مذکورہ بالا کلیہ درست نہیں ہے کیونکہ شریعت مطہرہ میں بعض مستحبات پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے جیسے اذان کہنا اور نماز باجماعت پڑھانا وغیرہ۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا: ﴿لا تصلی خلف من یبغی علی الاذان و الصلوٰة بالناس اجراً ولا تقبل شهادته﴾ جو شخص اجرت طے کر کے اذان کہتا ہے اور لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے اس کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی جائے اور نہ ہی (بوجہ سقوطِ عدالت) اس کی شہادت قبول کی جائے (من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۳، صفحہ ۱۶، باب القضاء) انہی حقائق کی بناء پر فقہاء عظام نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ﴿و کذا یحرم اخذ الاجرة علی الصلوٰة بالناس جماعة و فاقاً لجماعة و فی الخبر لا تصلی خلف من یبغی علی الاذان و الصلوٰة بالناس اجراً و لا تقبل شهادته و هو نص فی التحریم﴾

(حاشیہ شرح اللمعہ، جلد اول، باب المتاجر، صفحہ ۲۲۷ و کذا فی المسالک والجواہر)

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس شبہ کے ساتھ تمسک کرنا بھی بالکل بے جا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جب سے مجالس عزا کو کچھ لوگوں نے ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔ اسی وقت سے مذہب کی صحیح تبلیغ ختم ہو کر رہ گئی ہے اور اب تو رفتہ رفتہ ان لوگوں کی ہوس زر اس قدر بڑھ گئی ہے کہ حرام وحلال کی بھی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ یہاں تک کہ بعض پیشہ ور مقررین وذاکرین مخصوص پیشہ ور ننگِ انسانیت عورتوں کے ہاں مجالس پڑھنا اور ان سے فیس لینا بھی معیوب نہیں سمجھتے۔ آہ

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

دوسرا شاہد:۔ خدا اور رسول کی رضا پر پبلک کی خوشنودی کو مقدم سمجھنا

مذکورہ بالا دعویٰ پر دوسرا شاہد یہ ہے کہ یہ لوگ منشاءِ ایزدی سمجھنے اور پھر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنے کی بجائے جہاں جاتے ہیں پہلے یہ سوال کرتے ہیں کہ اس مقام کی پبلک کس موضوع و مضمون کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ ان کی بلا جانے کہ ان کا وظیفہ شرعی کیا ہے؟ اصلاح احوال کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟ معاشرہ کا مرض کیا ہے؟ اور پھر اس کا علاج کیا؟ ان کا تو ایک ہی اصل الاصول ہے کہ کسی نہ کسی طرح پبلک اور بالخصوص بانی مجلس راضی ہو جائے اور عوام سے صدائے واہ واہ بلند ہو جائے وہ اسی امر کو اپنی مجلس کی کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو ہادیانِ دین نے راہزنانِ ایمان و یقین قرار دیا ہے چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ خداوند عالم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی: ﴿لا تجعل بینی و بینک عالماً مفتوناً بالدنیا فیصدک عن طریق محبتی فان اولئک قطاع طریق عبادی المریدین ان ادنی ما انا صانع بھم ان انزع حلاوۃ مناجاتی من قلوبھم﴾ اے داؤد! میرے اور اپنے درمیان ایسے اہل علم کو، سطہ قرار نہ دو جو دنیا پر فریفتہ ہیں۔ ورنہ وہ تمہیں میری محبت کے راستہ سے روک دیں گے کیونکہ ایسے لوگ میرے ان بندوں کے لیے راہزن ہیں جو میری بارگاہ میں باریابی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں کم تر درجہ کا جو سلوک ان کے ہمراہ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے دلوں سے اپنی مناجات کی لذت سلب کر لیتا ہوں۔ (اصول کافی، صفحہ ۲۵)

بھلا جو لوگ خود دنیائے دوں کی محبت کے مرض میں گرفتار ہوں وہ دوسروں کو کیا پیغامِ شفا دیں گے۔

؎ آں خویشتن گم است کرا راہبری کند

حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں ﴿الدنیا داء الدین و العالم طبیب الدین فاذا رأیتم الطبیب یجرّ الداء علی نفسہ فاتھموہ﴾ دنیا ایک دین کا مرض ہے اور عالم اس دین کا طبیب! پس جب تم دیکھو کہ خود طبیب مرض کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے تو اسے دین کے معاملہ میں متہم سمجھو (اس پر اعتماد نہ کرو)۔

(خصال صدوق، صفحہ ۱۱۳، طبع جدید تہران)

ان حضرات کی یہ روش درحقیقت کمزوریٔ ایمان و اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ دلوں میں عظمتِ خداوندی کا نقش راسخ نہیں اور نہ اس کی ذات ان کی امیدوں کا مرکز ہے وہ اپنے نفع و نقصان اور سود و زیاں کا مالک انسان ضعیف البیان کو سمجھتے ہیں، سچ ہے: ﴿اذا عظم الخالق صغر المخلوق﴾ جب عظمتِ خالق دل میں جاگزین ہو جائے تو پھر مخلوق چھوٹی معلوم ہوتی ہے (نہج البلاغہ) اور جب دل عظمتِ خالق سے خالی ہو تو پھر نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوتا ہے۔

؎ بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نا امیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

تیسرا شاہد: اہل علم وایمان کی توہین وتذلیل کرنا

سابقہ دعویٰ پر تیسرا شاہد یہ ہے کہ چونکہ اس طبقہ کی اکثریت دولت اخلاص سے محروم اور حسد وغیرہ روحانی امراض میں مبتلا ہے اس لیے وہ دوسرے اہل فضل وکمال کے اثر ورسوخ کو کم کرنے اور اپنی مجالس کو بزعم خویش کامیاب بنانے کے لیے بلا جھجک بر سر منبران کی تذلیل اور ان پر طعن وتشنیع اور افترا پردازی کر کے اپنے ایمان کا (بشرطیکہ موجود ہو) ستیاناس کرتے ہیں حالانکہ اس سلسلہ میں خدائے قہار کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (سورۂ نور، آیت ۱۹) یقیناً وہ لوگ جو اس بات کو دوست رکھتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی باتیں رائج ہوں۔ ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی اور اللہ (اس کو) خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (ترجمہ مقبول) اور پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿من اهان عالماً فقد اهانني﴾ جو شخص کسی عالم کی توہین کرتا ہے وہ گویا میری توہین کرتا ہے۔ (جامع الاخبار، صفحہ ۳۷، طبع نجف و بحار الانوار) ارشاد قدرت ہے: ﴿إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ "افتراء پردازی وہی لوگ کرتے ہیں جو ایمان نہیں رکھتے۔" (سورۂ نحل، آیت ۱۰۵) مگر افسوس کہ یہ گروہ خوف خدا سے آزاد ہو کر اسی منبر پر جو شریعت اسلامیہ کے حقائق ومعارف کی نشر واشاعت کے لیے وقف تھا اپنے نفس امارہ کی تسکین کے لیے دوسرے اہل ایمان کی برملا توہین کرتے ہیں اور ان سے ذاتی انتقام لینے کے لیے اسی حسینی اسٹیج کو منتخب کرتے ہیں مگر کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے ؎

فليبک على الاسلام من كان باكياً

اس سے ظاہر ہے کہ ان کی یہ مجلس خوانی خوشنودی خدا وائمہ ہدیٰ ؑ کے لیے نہیں ہے ورنہ ان کی یہ روش ورفتار اور یہ حالت زار نہ ہوتی۔

چوتھا شاہد: جھوٹی روایات اور غلط واقعات کا پڑھنا

مرقوم الصدر دعویٰ پر چوتھا شاہد یہ ہے کہ مجلس خواں گروہ کی اکثریت اپنی مجالس کی ظاہری ونمائشی کامیابی کی خاطر بالعموم اور مصائب میں گریہ وبکا کے کہرام برپا کرنے کے لیے بالخصوص بلا تحاشہ کذب وافترا ایسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہوئے غلط واقعات اور بے سروپا روایات پڑھتے ہیں حالانکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کذب تمام صفات رذیلہ کی جڑ ہے جس طرح کہ صدق تمام صفات جمیلہ کا اصل اصول ہے۔

کذب کی مذمت قرآن کی روشنی میں

اس سلسلہ میں متعدد آیات مبارکہ موجود ہیں۔ تبرکاً چند آیات درج کی جاتی ہیں: (۱) ارشاد قدرت ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ (سورۂ مومن، آیت ۲۸) خداوند عالم اسراف کرنے والے جھوٹے کو ہدایت نہیں کرتا۔ (۲) ﴿إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ (سورۂ نحل، آیت ۱۰۵) جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں وہ آیات خداوندی پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص واضح ہوتا ہے کہ عمداً جھوٹ بولنے والا شخص دائرۂ ایمان سے خارج ہے۔ (۳) ﴿لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ (سورۂ آل عمران، آیت ۶۱) جھوٹوں پر خدا کی لعنت۔ (۴) ﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللّٰهِ وُجُوهُهُمْ مُسْوَدَّةٌ﴾ (سورۂ زمر، آیت ۶۰) بروز قیامت تم دیکھو گے کہ جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا ہوگا ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ وفیہ کفایۃ لمن لہ ادنی درایۃ۔

مذمت کذب احادیث کی روشنی میں

اس سلسلہ میں روایات بحد تواتر موجود ہیں۔ بطور تذکرہ و عبرت چند روایات پیش کی جاتی ہیں:

(۱) جناب رسول خدا ﷺ سے منقول ہے، فرمایا: جب کوئی شخص بلا عذر جھوٹ بولتا ہے تو اس پر ستر ہزار فرشتے لعنت کرتے ہیں اور اس کے منہ سے ایک ایسی بدبو نکلتی ہے جو عرش الٰہی تک جا پہنچتی ہے تب حاملان عرش اس پر لعنت کرتے ہیں اور خدائے قہار اس کے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ کے عوض ایسے ستر زنا کا عذاب درج کرتا ہے جو محارم کے ساتھ کیے گئے ہیں۔ (جامع الاخبار)

(۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: ﴿ان اللّٰہ عزوجل جعل للشر اقفالاً و جعل مفاتیح تلک الاقفال الشراب و اشر من الشراب الکذب﴾ خداوند عالم نے برائی کے لیے کچھ قفل (تالے) بنائے ہیں اور ان تالوں کی کنجی شراب ہے لیکن جھوٹ شراب سے بھی بدتر ہے۔

(ثواب الاعمال وعقابہا، صفحہ ۲۴۳، طبع بیروت)

(۳) انہی بزرگوار سے مروی ہے، فرمایا: ﴿ان الکذب هو خراب الایمان﴾ بلاشبہ جھوٹ بولنا باعث خرابیٔ ایمان ہے۔ (اصول کافی، صفحہ ۵۳۹، باب الکذب) صاحب لؤلؤ و مرجان نے قرآن وحدیث کی رو سے جھوٹ بولنے کے پورے چالیس عدد مفاسد شمار کیے ہیں۔ (اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں)

خدا، رسولؐ اور ائمہ طاہرینؑ پر جھوٹ بولنا اور بھی گناہِ عظیم ہے

سطور بالا میں کذب و افتراء کی مذمت میں جو کچھ لکھا گیا ہے یہ عام کذب کے بارے میں ہے لیکن اگر یہی کذب و افتراء خدا اور رسولؐ یا ائمہ ہدیٰ ؑ پر کیا جائے تو اس کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ زمان، مکان اور فاعل وغیرہ کے بدلنے سے گناہ کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ (سورۂ اعراف، آیت ۳۷) اس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جو خدا پر افترا پردازی کرتا ہے۔ (۲)

نیز ارشادِ قدرت ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (سورۂ نحل، آیت ۱۱۶/۱۱۷) جو لوگ خدا پر افتراء کرتے ہیں وہ ہرگز کامیاب نہ ہوں گے ہاں اس میں معمولی سا فائدہ ہے (دنیا میں) مگر ان کے لیے (آخرت میں) تکلیف دہ عذاب ہے۔

جناب رسول خداؐ کی متفق بین الفریقین حدیث ہے: ﴿من كذب علىّ متعمداً فليتبوء مقعده من النار﴾ جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولتا ہے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ مہیا کر لے۔

امام محمد باقرؑ ابوالنعمان سے فرماتے ہیں: ﴿لا تكذب علينا كذبة فتسلب الحنيفية﴾ اے ابوالنعمان! ہم پر جھوٹ نہ بولنا ورنہ ملتِ اسلام تم سے سلب کر لی جائے گی۔ (اصول کافی، صفحہ ۵۳۸)

یہی وجہ ہے کہ خدا اور رسولؐ اور ائمہ ہدیٰؑ پر کذب و افترا پردازی کرنے سے روزہ باطل ہو جاتا ہے اور بنا بر مشہور بین الفقہاء اس سے قضا و کفارہ دونوں واجب ہو جاتے ہیں اور اسی بناء پر علماءِ اخلاق نے تمام اقسام کذب سے اس قسم کو بدترین اور سب سے زیادہ سنگین قرار دیا ہے چنانچہ حضرت شیخ نراقی رقمطراز ہیں: ﴿واشد انواع الكذب اثماً و معصية الكذب على الله و على رسوله و على الائمة و كفاه ذماً انه يبطل الصوم و يوجب القضاء و الكفارة على الاقوى﴾ جھوٹ کے تمام انواع میں سے از روئے گناہ زیادہ سخت وہ جھوٹ ہے جو خدا، رسولؐ اور ائمہ طاہرینؑ پر بولا جائے اور اس کی مذمت کے لیے یہی امر کافی ہے کہ یہ جھوٹ روزہ کو باطل کر دیتا ہے اور بنا بر اقویٰ قضاء و کفارہ ہر دو کا موجب ہوتا ہے (جامع السعادات، ج ۲، صفحہ ۳۲۳، طبع بیروت)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾

ایک عبرت انگیز خواب

بعض رویائے صادقہ سے بھی قرآن و حدیثِ معصومینؑ سے ثابت شدہ مذکورہ بالا حقیقت کی تائید مزید ہوتی ہے چنانچہ شہر کرمان شاہ میں ایک شخص نے عالم و کامل و جامع آقا شیخ محمد علی صاحب مقامع الفضل وغیرہ قدس اللہ سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں جناب سید الشہداءؑ کے

بدن مبارک کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹ رہا ہوں جس سے آں جنابؑ کے زخم تازہ ہو گئے ہیں۔ اس کی کیا تعبیر ہے؟ آقائے موصوف اس شخص اور اس کے پیشہ سے واقف نہ تھے۔ تھوڑی دیر سر جھکا کر فکر کرنے کے بعد فرمایا: شاید تم روضہ (مجلس) خوانی کرتے ہو۔ اس نے عرض کیا: ہاں، جناب آقا نے فرمایا: یا تو روضہ خوانی چھوڑ دو یا پھر کتب معتبرہ سے واقعات نقل کیا کرو۔ (لولو و مرجان)

ایک مفید مشورہ

بنابریں کس قدر احسن و اولیٰ ہے کہ وہ مجلس خواں حضرات جو کتب علمیہ کا مطالعہ کرنے کی استعداد رکھتے ہیں وہ مقاتل کی کتب معتبرہ سے روایات معتمدہ بیان کریں اور جو حضرات یہ استعداد نہیں رکھتے وہ پڑھنے سے پہلے واقعات کی کسی محقق عالم دین سے تصحیح و توثیق کرالیں۔ اس طرح کر کے وہ دینی شرعی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں جو خلا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ ہماری اس کتاب سے پُر ہو جائے گا اور امید ہے کہ اس کی موجودگی میں مقتل کی کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ انشاء اللہ۔

ایک عذر لنگ کا ازالہ

بعض وہ حضرات جو اس سلسلہ میں ہر قسم کی رطب و یابس روایات بیان کرنے کے عادی ہیں وہ اپنے اس طرز عمل کے جواز کی سند میں حضرت امیر علیہ السلام کے اس ارشاد کو پیش کرتے ہیں: ﴿اذا حدثتم بحدیث فاسندوہ الی الذی حدثکم فان کان حقا فلکم و ان کان کذباً فعلیہ﴾ یعنی جب تم کوئی حدیث نقل کرو تو اس کی نسبت اس شخص کی طرف دے دو جس نے تم سے بیان کی ہے اگر وہ حدیث سچی ہوئی تو اس کا فائدہ تم کو ملے گا اور اگر غلط ہوئی تو نقصان اس کا ہوگا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث قدرے مجمل ہے۔ اس میں اس ناقل کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ کیسا ہو؟ ثقہ ہو یا غیر ثقہ؟ صادق ہو یا کاذب؟ صالح ہو یا طالح؟ وغیرہ۔ مگر بموجب الاحادیث یفسر بعضها بعضاً۔ دوسری احادیث شریفہ میں یہ وضاحت موجود ہے کہ ناقل روایت کا ثقہ و صادق ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ جناب امیرؑ سے ہی مروی ہے حارث ہمدانی سے فرماتے ہیں: ﴿ولا تحدث الناس بکل ما سمعت فکفی بذلک کذبا﴾ جو کچھ تم نے لوگوں سے سنا ہے وہ سب کچھ بیان نہ کرو ورنہ تمہارے جھوٹا ہونے کے لیے یہی امر کافی ہے۔ (نہج البلاغہ)

نیز یہ بھی انہی جناب سے منقول ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی وصیت میں فرمایا: ﴿ولا تحدث الا عن ثقة فتکون کذاباً و الکذب ذل﴾ بغیر قابل وثوق آدمی کے اور کسی سے کوئی حدیث نقل نہ کرو ورنہ دروغ گو قرار

پاؤ گے اور دروغ گوئی باعث ذلت ہے۔ (کشف الحجہ، صفحہ ۱۷۶، طبع قم)

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ ہر کس و ناکس سے سنی سنائی بات کا نقل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ثقہ آدمی سے سن کر یا ثقہ آدمی کی کتاب سے دیکھ کر اور وہ بھی نسبت دے کر بیان کرنے سے شرعی ذمہ داری پوری ہو سکتی ہے اسی لیے ارشادِ قدرت ہے: ﴿اِذَا جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ جب کوئی فاسق کوئی خبر بیان کرے تو اچھی طرح اس کی چھان بین کر لیا کرو۔

بموجب خوئے بد را بہانہ بسیار

ایک غلط روش کی مذمت

بعض بہانہ جو مجلس خوان بعض اوقات جب کوئی عجیب و غریب روایت یا واقعہ بیان کریں تو اس کے حوالہ کے سلسلہ میں کسی ایسی گمنام کتاب کا نام بیان کر دیتے ہیں جس کا اہل فن نے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا ہوتا یا کسی مشہور عالم جلیل کے ایسے مقتل کا نام لے لیتے ہیں کہ اس کی فہرست تالیفات میں اس کتاب کا نام نہیں ملتا یا اگر ملتا بھی ہے تو اس میں اس واقعہ کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ یا کسی ایسے عالم دین سے سننے کا حوالہ دے دیتے ہیں جو اس وقت دوسرے عالم میں سدھار چکے ہوتے ہیں تاکہ تصدیق بھی نہ ہو سکے۔ بہرحال یہ روش بہت مذموم ہے اور بناء الفاسد علی الفاسد کی مصداق ہے جس سے اجتناب لازم و واجب ہے۔

ایک اور عذر بارد کا ازالہ

بعض بے توفیق ضعیف بلکہ موضوع روایات و واقعات بیان کرنے کے جواز میں یہ شبہ پیش کیا کرتے ہیں کہ سید الشہداء علیہ السلام کی مجالس عزاء میں رونا رلانا شرعاً پسندیدہ امر ہے اس لیے یہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہو جائے درست ہے۔

یہ شبہ سابقہ شبہ سے بھی زیادہ رکیک اور کمزور ہے۔ یہ درست ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام اور بالخصوص سید الصابرین کے مصائب و آلام کا تذکرہ کرنا اور ان پر رونا یا رلانا ایک بہت بڑی عبادت اور باعث اجر و ثواب ہے لیکن ہے تو پھر بھی بہرحال مستحب! اور کذب و افتراء کی حرمت مسلّم الثبوت ہے۔ عقل سلیم اور شرع متین کے کن قوانین کی رو سے یہ جائز ہے کہ مستحب امر کی بجا آوری کے لیے فعل حرام کا ارتکاب کیا جائے؟ کیا غصبی یا مسروقہ مال سے سفر زیارت کرنا اس بناء پر جائز قرار دیا جا سکتا ہے کہ زیارت ائمہ اطہار علیہم السلام ثواب بے حساب کی موجب ہے؟ کیا اس غرض کے لیے کسی کا مال غصب کرنا یا چرانا جائز ہو جائے گا؟ کیا کوئی معمولی عقل و خرد رکھنے والا انسان یا معمولی دینی بصیرت رکھنے والا مسلمان ایسا کرنے کی جرأت و جسارت کر سکتا ہے؟ کیا یہ اطاعت بامر ممنوع کے تحت میں داخل نہیں

ہے جیسا کہ صاحب جواہر الکلام نے ایک ایسے ہی شبہ (جواز غنا در مراثی بغرض بکا و ابکاء) کے جواب میں لکھا ہے:
﴿و كونه معيناً على البكاء المرغب فيه طاعة الله بمعصية﴾ باقی رہا اس (غنا) کا گریہ و بکاء پر جو کہ شرعاً مرغوب ہے۔ معین و مدد ہوتا تو (بنا بر تسلیم) چونکہ یہ خدا کی نافرمانی کے ساتھ اس کی اطاعت ہے (اس لیے محال اور ناجائز ہے) مالكم كيف تحكمون؟ الله اذن لكم ام على الله تفترون؟

پانچواں شاہد:۔غنا و سرود کا ارتکاب ہے

ہمارے دعویٰ کی صداقت پر پانچواں شاہد یہ ہے کہ مجلس خوان طبقہ کے اکثر بلکہ تمام ذاکرین اور بعض مقررین بھی بلا تحاشا غنا و سرود کا ارتکاب کر کے جہاں مجالس عزا کی حقیقی شان خراب کرتے ہیں وہاں اپنی آخرت بھی برباد کرتے ہیں۔

حرمت غنا قرآن کی روشنی میں

یہاں بنظر اختصار صرف بعض آیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

(۱) ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (سورۂ حج، آیت ۳۰) ''تم ناپاک بتوں سے بچے رہو اور لغو باتوں گانے وغیرہ سے بچے رہو۔''

اس آیت مبارکہ میں وارد شدہ لفظ ''قول زور'' کی تفسیر حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے غنا و سرود کے ساتھ کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان، برہان، صافی اور اصول کافی وغیرہ)

(۲) ارشاد رب العباد ہے: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَ یَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ (سورۂ لقمان، آیت ۶) ''لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لہو الحدیث کو خریدتا ہے تاکہ علم و معرفت کے بغیر لوگوں کو خدا کے راستہ سے گمراہ کرے اور خدا کی آیات سے تمسخر کرے ایسے لوگوں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں وارد شدہ لفظ ''لہو الحدیث'' کی تفسیر حضرت باقر العلوم علیہ السلام نے غنا کے ساتھ فرماتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿الغناء مما اوعد الله عليه النار﴾ کہ غنا ان ممنوع امور میں سے ہے جن پر خدا نے وعید جہنم فرمائی ہے۔ (مذکورہ بالا کتب ملاحظہ ہوں)

حرمت غناء احادیث معصومینؑ کی روشنی میں

اس سلسلہ میں روایات متواترہ و متکاثرہ موجود ہیں۔ صرف بطور تبرک و تذکرہ چند روایات پیش کی جاتی ہیں:

(۱) بروایت جابر بن عبداللہ انصاری جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: ﴿اول من تغنى ابليس

لما اکل آدم من الشجرۃ ﴾ سب سے پہلے جس نے غنا کا ارتکاب کیا وہ شیطان تھا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھایا تھا۔ (من لا یحضرہ الفقیہ)

اس روایت شریفہ سے ظاہر ہے کہ تمام غنا کرنے والے خواہ جس رنگ میں بھی اس کا ارتکاب کریں وہ سب شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾

(۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: ﴿ الغناء عش النفاق ﴾ غنا و سرود منافقت کا آشیانہ ہے (جہاں وہ پرورش پاتی ہے)۔ (۳) انہی جناب سے منقول ہے، فرمایا: ﴿ مجلس الغناء لا ینظر اللہ الی اھلہ ﴾ جہاں غنا ہو۔ خدا وہاں بیٹھنے والوں کی طرف نظر (رحمت) نہیں کرتا۔ اہل انصاف بتائیں جس مجلس کی طرف خدا نظر رحمت ہی نہ فرمائے وہ مجلس شرف قبولیت کیوں کر حاصل کر سکتی ہے؟

(۴) نیز انہی جناب سے مروی ہے، فرمایا: ﴿ استماع الغنا و اللھو ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء الزرع ﴾ کان لگا کر (توجہ سے) غنا سننا اس طرح دل میں نفاق کو اگاتا ہے جس طرح پانی انگوری کو اگاتا ہے (ہر سہ از وسائل الشیعہ وغیرہ)

حرمت غنا اتفاق فقہاء کی روشنی میں

قرآن و حدیث کی روشنی میں حرمت غنا پر تمام علماء فقہاء کا اتفاق ہے چنانچہ صاحب حدائق قدس سرہ رقمطراز ہیں: ﴿ ولا خلاف فی حرمتہ فیما اعلم ﴾ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح صاحب جواہر نور مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: ﴿ بلا خلاف اجدہ بل الاجماع بقسمیہ علیہ و السنۃ متواترۃ فیہ بل یمکن دعویٰ کونہ ضروریا فی المذھب ﴾ میں اس (غنا) کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں پاتا بلکہ اس پر ہر دو قسم کا (محصل و منقول) اجماع قائم ہے۔ اس سلسلہ میں احادیث متواترہ وارد ہیں بلکہ یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ غناء کی حرمت مذہب اہل بیتؑ کے ضروریات میں سے ہے (جن کا منکر دائرۂ مذہب سے خارج متصور ہوتا ہے)۔

قصائد و مراثی میں غنا کا گناہ زیادہ سخت ہے

جیسا کہ قبل ازیں بھی بیان کیا جا چکا ہے زمان، مکان، فاعل اور مابہ العصیان کے بدلنے سے گناہ کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ بنابریں عام جگہ، عام دن، عام آدمی اور عام چیز (جیسے غزل وغیرہ) میں غنا کا ارتکاب کیا جائے تو گناہ کی نوعیت اور ہوگی لیکن اگر اسی جرم کا ارتکاب کسی متبرک جگہ، متبرک دن، قرآن و دعا یا مجلس عزا میں کیا جائے اور ایسا کرنے والا بھی صاحب عقل و علم ہو تو اس صورت میں یقیناً اس جرم کی سنگینی بڑھ جائے گی چنانچہ حضرت آقا شیخ

زین العابدین قدس سرہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ﴿در مراثی و قرآن عذابش بیشتر است﴾ یعنی اگر قرآن یا مرثیہ خوانی میں غنا کا ارتکاب کیا جائے تو اس کا عذاب زیادہ ہے۔ (ذخیرۃ العباد)

اسی طرح حضرت شیخ انصاری اعلی اللہ مقامہ غنا کی تعریف[1] کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ﴿وظهر مما ذكرنا انه لا فرق بين استعمال هذه الكيفية فى كلام حق او باطل فقراة القرآن و الدعاء و المراثى بصوت يرجع فيه على سبيل اللهو لا اشكال فى حرمتها ولا فى تضاعف عقابها لكونها معصية فى مقام الطاعة و استخفافاً بالمقرّد و المدعو و المرثى﴾ مذکورہ بالا تعریف سے ظاہر ہے کہ اس صوتی کیفیت کی حرمت میں کوئی فرق نہیں خواہ کلام حق میں اس کا استعمال کیا جائے یا باطل میں۔ بنابریں اگر قرآن، دعا اور مرثیہ کو ترجیع لہوی کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کی حرمت اور عذاب کے دوگنا ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ یہ مقامِ اطاعت میں معصیت ہے اور اس میں مقرد (قرآن)، مدعو (خدا) اور جس کا مرثیہ پڑھا جا رہا ہے (امام) کی توہین ہے۔" (مکاسب، صفحہ ۳۷)

موجودہ مجالس عزا کی حالتِ زار پر صاحب البرہان کا تبصرہ

ہم یہ نہیں کہتے کہ اچھی آواز غنا ہے سادہ طریقہ پر ذاکری کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تقدیس مجلس کا خیال رکھا جائے اور مجلس عزا کو محفل سرود یا بزم موسیقی نہ بنایا جائے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ آج جس نہج پر مجالس عزا ہو رہی ہیں اس نے تھیٹر کو بھی مات کر دیا ہے۔ انہی حالات سے متاثر ہو کر مجلہ علمیہ البرہان لدھیانہ کے سرپرست مرحوم نے (جلد ۲۳ء ۱۹۳۳ء) میں انہی مجالس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

---

[1] **تعریف غنا کی تحقیق**:۔ حضرت شیخ قدس سرہ نے غنا کی یہ مشہور بین الفقہاء تعریف نقل کر کے اس سے موافقت ظاہر کی ہے۔ ﴿هذا الصوت المشتمل على الترجيع المطرب﴾ اس آواز کا کھینچنا جس میں ترجیع کی جائے اور طرب آور بھی ہو اور اس کے علاوہ بھی بعض تعریفات نقل کر کے آخر میں بطور خلاصہ لکھا ہے: ﴿فالمحصّل من الادلة المتقدمة حرمة الصوت المرجع فيه على سبيل اللهو﴾۔ (مکاسب ص ۳۷)

اس کے علاوہ اس کی اور بھی مختلف تعریفات کی گئی ہیں جن کی تفصیل ہمارے رسالہ "حرمت غنا اور اسلام" میں دیکھی جا سکتی ہے مگر جس نظریہ پر علماء محققین کی رائے مستقر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ غنا کی تعریف بیان کرنا عالم و فقیہ کا منصب نہیں ہے اس کا کام صرف شرعی حکم بیان کرنا ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام، باقی رہی موضوع حکم کی تشخیص و تعیین اس سلسلہ میں اہل خبرہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ بنابریں غنا کے مفہوم کی تعیین کے سلسلہ میں بھی اس کے اہل خبرہ (گانے بجانے والے لوگوں) کی طرف رجوع کرنا چاہیے پس وہ جس مخصوص آواز کو غنا و سرود قرار دیں اسے غنا سمجھا جائے گا۔ (منہ عفی عنہ)

"ایک ناواقف شخص انہیں دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ یہ مجلس عزا ہے یا محفل سرود و نشاط۔ جب ایک اچھا گانے والا اپنے فن کا عمدہ مظاہرہ کرتا ہے تو سامعین واہ واہ، سبحان اللہ (بلکہ نعرۂ حیدری، ناقل) کا وہ شور مچاتے ہے کہ چھتیں اڑنے لگتی ہیں۔ ایک ناواقف شخص باہر سے سننے والا اسے مجلس عزا تو کیا سمجھے گا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ (معاذ اللہ، ناقل) کسی تھیٹر یا سینما کا تماشا دیکھ رہا ہے یا اگر بٹیر بازی کا شوقین ہے تو وہ یہ سمجھے گا کہ بٹیر لڑائے جا رہے ہیں اور اگر وہ نیک منش انسان ہے تو اپنے حسن ظن کی بنا پر یہ خیال کرے گا کہ کوئی مشاعرہ ہے جس میں غزل خوانی ہو رہی ہے۔"

جناب مولانا موصوف کا یہ خیال آج سے کم و بیش نصف صدی پہلے کی مجلس کے متعلق ہے مگر اب تو صورت حال اس سے بھی کہیں بدتر ہو چکی ہے۔ آج مجالس کی کامیابی کا دار و مدار صرف دو باتوں پر ہے۔ پہلے حاضرین کو خوب ہنسایا جائے اگرچہ لغویات و واہیات قسم کے قصے، کہانیوں یا لطیفہ بلکہ کثیف گوئیوں سے ہی اور پھر فنی گریز اور بھارتی ایکٹنگ سے سامعین کو خوب رلایا جائے اور حقیقی یا مصنوعی گریہ و بکا کا شور بلند کر دیا جائے اگرچہ من گھڑت اور خانہ ساز غلط روایات و واقعات سے ہی۔ اللہ بس باقی ہوس۔ و الی اللہ المشتکی۔

کیا مجالس عزائے حسین کی یہی شان ہے؟ کیا عزاداروں اور سوگواروں کی یہی حالت ہوتی ہے؟ کیا اقوام عالم کے سامنے ائمہ معصومین ﷺ کی سیرت و کردار کے پیش کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ کیا مذہبی عبادات و رسوم کی ادائیگی کا یہی سلیقہ ہے؟ اور کیا حسینؑ کی شہادت اور مجالس کے انعقاد کی یہی غرض و غایت ہے؟ یہ سوالات ارباب عقل و فکر کی خصوصی توجہ کے طلب گار ہیں!

بانیان مجالس اور سامعین کی اکثریت کے دولت اخلاص سے تہی دامن ہونے پر شواہد پنجگانہ

جب مجلس خوان گروہ کی اکثریت کا اخلاص سے عاری ہونا ثابت ہو چکا تو اب ہم اپنے دعویٰ کے دوسرے جزو یعنی بانیان مجالس اور سامعین کی اکثریت کے دولت اخلاص سے تہی دامن ہونے پر پانچ شواہد پیش کرتے ہیں۔

اثبات مدعا پر پہلا شاہد تیری میری مجلس کی تفریق

اس دعوے پر پہلا شاہد یہ ہے کہ آج کل مجالس عزائے سید الشہداءؑ میں تیری مجلس اور "میری مجلس" کی تفریق پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ مجالس کے باہمی تصادم کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ واضح ہے کہ یہ طرز عمل روح اخلاص کے منافی ہے۔ جب ہر مجلس مجلس حسینؑ ہے اور اس کے انعقاد کا مقصد دین حق کی نشر و اشاعت کر کے خدا اور رسولؐ اور ائمہ ہدیٰ ﷺ کی رضا حاصل کرنا ہے تو پھر یہ تیری میری مجلس اور فلاں و فلاں کی مجلس کے کیا معنی ہیں؟ جب

یہ مجلس عبادت ہے تو عبادت تو وہی ہوتی ہے جو خالصاً لوجہ اللہ ہو۔ جب سے اس تفریق کا قبیح سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے ساتھ ہی مجالس کے تصادم کا سلسلہ غیر مرضیہ بھی شروع ہو گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ آج مجلس سے مجلس ٹکرا رہی ہے اور جلوس سے جلوس ٹکرا رہا ہے۔ ہر بانی مجلس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی مجلس کامیاب ہو جائے دوسرے کی کامیاب ہو یا ناکام۔ اس سلسلہ میں جن جن حرکات قبیحہ وافعال نامرضیہ کا ارتکاب کیا جاتا ہے وہ عیاں را چہ بیان کا مصداق ہے جس کا فطرتی وقدرتی نتیجہ یہ ہے کہ مجالس کی اصل شان اور افادیت بھی ختم ہوتی جارہی ہے اور بجائے اس کے کہ ان مجالس سے نظم وضبط اور اتفاق واتحاد کا درس لیا جاتا۔ الٹا یہی مجالس باہمی تفریق وجدائی کا باعث بن رہی ہیں۔

دوسرا شاہد: بے جا تکلفات باردہ کا ارتکاب

مذکورۃ الصدر دعوے کے اثبات پر دوسرا شاہد یہ ہے کہ اکثر بانیان مجالس کا مقصد نام ونمود حاصل کرنا اور اپنے ٹھاٹھ باٹھ کی نمائش کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر کرنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات ایسے امور کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں جو شرعاً ناجائز یا کم از کم نامرغوب ضرور ہوتے ہیں۔ ان تکلفات باردہ کی وجہ سے روز بروز اسراف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اب رفتہ رفتہ مجالس میں حقہ، پان، سگریٹ، چائے اور شربت شیرہ وغیرہ اور امام بارگاہوں کی جھاڑ فانوس اور آئینہ وغیرہ سامان آرائش سے زیبائش وآرائش کرنا کہ جس کی وجہ سے وہ بجائے عزاخانہ کے محفل یا نشاط خانہ معلوم ہوں۔ عزاداری کا جز بنتی جارہی ہیں جس سے عزاداری کی اصل روح یعنی سادگی جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے بالخصوص عبادت خانوں میں تو اس پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ مساجد میں سونے چاندی سے نقش و نگار کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ مجروح ہو رہی ہے بلکہ مردہ۔ اس لیے اس فاسد جذبہ کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اخلاص کے منافی ہے جس کی وجہ سے "نیکی برباد اور گناہ لازم" والی مثل صادق آتی ہے۔ امّا من کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً و لا یشرک بعبادۃ ربہ احداً۔

تیسرا شاہد: تعیش دماغی کی تلاش

مذکورہ بالا دعویٰ کے اثبات پر تیسرا شاہد یہ ہے کہ بانیان کرام ہوں یا سامعین عظام ان کی اکثریت ایسے مجالس خوان حضرات کو پسند کرتی ہے جن کی پڑھائی میں تعیش دماغی حاصل کرنے کے پورے پورے سامان مہیا ہوں اور اگر کوئی پڑھنے والا خدا اور رسولؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی منشاء کے مطابق سادہ اور صحیح طریقہ پر پڑھتا ہے تو نہ بانیان اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی سامعین شرکت کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بانی حضرات کسی کو دعوت دینے سے پہلے اس کی آزمائشی تقریریں سنتے ہیں اور اس مقصد کے لیے بعض مقامات پر خصوصی مجالس کا اہتمام

کیا جاتا ہے اور سامعین حضرات شرکت سے پہلے یہ معلوم کرتے ہیں کہ پڑھنے والا کون اور کیسا ہے؟ ان حضرات کی یہ روش و رفتار اس امر کی غماز ہے کہ یہ لوگ مجلس کو مجلس عزا سمجھ کر منعقد نہیں کرتے اور سنتے بلکہ مجلس حسینؑ کی آڑ میں تعیش دماغی اور تفریح طبعی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ واقعۂ کربلا ایسا رقت خیز سانحہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی محبت اہل بیتؑ ہو اور یہ واقعۂ ہائلہ سنے اور پھر اس کی آنکھ اشکبار نہ ہو۔ خود شہید کربلا کا ارشاد ہے: ﴿انا قتیل العبرة ما ذکرنی مؤمن الا استعبرت عیناه﴾ (نفس المہموم وغیرہ) پھر نامعلوم مظلوم کربلا کی مصیبت عظمیٰ پر چند اشک غم بہانے کے لیے فضول تکلفات کی کیا ضرورت ہے؟ کیا نوبت نقارہ اور راگ ورنگ کے بغیر گریہ نہیں ہوتا اگر کسی کا کوئی عزیز مر جائے تو کیا مجلس سماع منعقد کرنے، ڈھول بجوانے اور راگ و سرود سے اس پر رنج و غم کا اظہار کیا جاتا ہے؟ جب وہاں ایسا نہیں کیا جاتا تو کم از کم شہدائے کربلا کے ساتھ وہی سلوک ہی کیا جائے جو اپنے مرنے والے عزیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے: ﴿لا یقاس بآل محمدؐ احد من الناس﴾ (نہج البلاغہ) بہر حال اگر ان مجالس کے انعقاد کا مقصد خوشنودئ خدا اور رسولؐ حاصل کرنا ہے تو بانیوں اور سامعین کو بلا تکلفات بارده بچے فضائل و مصائب اہل بیتؑ سننے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ نیز ضروری ہے کہ ان مجالس میں کسی فرقہ کی دل آزاری نہ کی جائے بلکہ بحکم امام "ذعہم ولا تنفر" پر عمل کرتے ہوئے ایسا طرز مجلس خوانی اختیار کیا جائے کہ تمام برادران اسلامی شوق سے ان میں شرکت کر کے بارگاہ حسینیؑ میں اپنی عقیدت کے پھول نثار کر سکیں۔

چوتھا شاہد: صالح وطالح کی عدم تمیز

ہمارے مدعا پر چوتھا شاہد یہ ہے کہ بانیان مجالس ہوں یا سامعین ان کی اکثریت مجالس پڑھانے یا سننے کے سلسلہ میں صحیح العقیدہ اور بدعقیدہ، صادق و کاذب اور صالح و طالح میں کوئی امتیاز نہیں کرتی بلکہ ان کا مطمح نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر پڑھنے والا مولوی ہے تو چند رٹے رٹائے غیر علمی نکتوں سے ہی مجمع کو خوب اچھال سکے اور اگر ذاکر ہے تو اپنی خوش الحانی کی وجہ سے حاضرین کو مسحور کر سکے۔ بلا تشبیہ آج منبر پر مؤذن حمص والے واقعہ کو دہرایا جاتا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک نو وارد شخص جب شہر حمص میں وارد ہوا تو اس نے ایک خوش آواز شخص کو اس طرح اذان کہتے ہوئے سنا جو بجائے ﴿اشهد ان محمداً رسول الله﴾ کے کہہ رہا تھا: ﴿ان اهل حمص یشهدون ان محمداً رسول الله﴾ (یعنی حمص کے لوگ گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں) اس شخص نے قاضئ شہر سے جا کر حقیقت حال دریافت کی۔ قاضی نے اسے بتایا کہ ان کا مقررہ مؤذن تعطیلات پر گھر گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہمیں ایک خوش آواز مؤذن کی ضرورت درپیش آئی۔ بد قسمتی سے مسلمانان حمص میں ایسا کوئی شخص نہ مل سکا۔ اس لیے

ہمیں ایک یہودی کی خدمت حاصل کرنا پڑی اور چونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی رسالت کا قائل نہیں اس لیے کہتا ہے:

﴿ان اهل حمص يشهدون الخ......﴾ (زہر الربیع)

ہمارے اکثر سادہ لوح عوام نے بھی یہی نظریہ قائم کر رکھا ہے کہ ہمیں تو ایک خوش الحان آدمی سے مجلس حسینؑ سننا ہے ہمیں ان کے کردار سے کیا تعلق ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہمارے اسلامی بھائیوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ہم نے تو قرآن کی اقتداء کرنا ہے پیش نماز جیسا بھی ہو۔ اس دن سے ان کے مصلیٰ کی عظمت ختم ہو گئی ہے اسی طرح جب سے ہمارے عوام نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تو مجلس حسینؑ سننا ہے ہمیں پڑھنے والے کے کردار سے کیا سروکار ہے! اسی دن سے حسینی اسٹیج کی تقدیس ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ روش و رفتار شاہد ہے کہ اس عمل میں روح اخلاص کا فقدان ہے۔ اگر یہ مجالس خالصاً لوجہ اللہ ہیں تو ضروری ہے کہ منبر پر انہی لوگوں کو لایا جائے جن کے عقائد و اعمال شریعت مقدسہ کے عین مطابق ہوں اور بد عقیدہ و بداعمال افراد کو حسینی اسٹیج کے قریب بھی نہ آنے دیا جائے کیونکہ ؎

آں خویشتن گم است کرا رہبری کند

پانچواں شاہد: سیرت حسینیؑ کا فقدان

ہمارے مرقومہ بالا دعویٰ کی صداقت پر پانچواں شاہد یہ ہے کہ بانیان مجالس ہوں یا سامعین ان کی اکثریت میں سیرت و کردار امام حسین علیہ السلام کی جھلکیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لوگ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے مجالس منعقد کرتے ہیں۔ ان میں واہ وا اور آہ کی آوازیں بھی خوب بلند ہوتی ہیں۔ دعوتیں خوب اڑتی ہیں۔ نا ؤ نوش کے انتظام اعلیٰ پیمانہ پر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے جلسوں میں تو بعض اوقات پڑھنے اور سننے والے اس قدر کثیر التعداد ہوتے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ بانیٔ مجلس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملائے جاتے ہیں۔ بالعموم پڑھنے والے بانیان کرام کو جنت کے ٹکٹ بھی دے کر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہاں اگر کسی چیز کی کمی ہوتی ہے تو سیرت و کردار کی۔ ان لوگوں کے عقائد و نظریات اور اخلاق و اطوار ائمہ اطہار علیہم السلام کی بجائے دشمنانِ اہل بیتؑ کے کردار کی غمازی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ اور نہیں تو کم از کم بانیان و سامعین کرام کو نمازی تو ضرور ہونا چاہیے اور نماز بھی مثالی، کیونکہ ان مجالس کے انعقاد کا اصلی مقصد تو یہی ہے کہ عزاداروں میں حسینیتؑ پیدا کی جائے اور سید الشہداء علیہ السلام نے روزِ عاشورہ میں حالتِ جنگ میں نمازِ ظہر اور وہ بھی جماعت کے ساتھ اس طرح پڑھی ہے کہ اس کی نظیر صفحۂ عام پر نظر نہیں آتی۔ لہٰذا ان کے نام لیواؤں کو بھی ان ذواتِ مقدسہ کی اس قدر تاسّی تو کرنا چاہیے کہ مشکل سے مشکل اور کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی نمازِ خدا ترک نہ کریں اور

اگر عین حالت مجلس اور جلوس میں نماز کا اول وقت داخل ہو جائے تو مجلس یا جلوس کو روک کر وہیں نماز باجماعت پڑھ کر اہل عالم پر واضح کر دیں کہ "حسینی" اس طرح ہوتے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ ان مجالس وجلوس ہائے عزاء کی افادیت میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے اور مذہب حق کی کس قدر ترویج وترقی ہوتی ہے! اور اگر یہ نہیں تو پھر یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ؎

جو کچھ بھی ہے تکلف وہم و خیال ہے

الحمد للہ کہ ان حقائق کی روشنی میں ہمارے دعویٰ کی صداقت اظہر من الشمس ہو گئی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم تمام مجالس ومحافل پڑھنے، سننے اور منعقد کرنے والوں کو اخلاص کی دولت گرانمایہ ارزانی فرمائے۔ آمین بجاہ النبی و آلہ الطاہرین۔

مجلس خواں گروہ کے آداب دہ گانہ

اب ہم ذیل میں کتاب کبریت احمر، لولو و مرجان، مجاہد اعظم حصہ اول وغیرہ کتب معتبرہ سے بمع اضافات جدیدہ ومفیدہ مجلس خوان گروہ کے دہ گانہ آداب وشرائط کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان دہ گانہ آداب کا تذکرہ کیا جائے گا جن کا تعلق بانیان کرام یا سامعین عظام یا خود مجلس امام کے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ

پہلا ادب: صحت عقائد

تمام ادیان ومذاہب میں بالعموم اور دین اسلام میں بالخصوص عقائد اور ان کی صحت کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ ارباب بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ تمام انسانی اقوال وافعال کی قبولیت کا دارو مدار تمام اخروی جزا وسزا کا انحصار اسی صحت عقیدہ پر ہے۔ اسی فساد اعتقاد کی وجہ سے کفار ومشرکین پر جنت حرام قرار دی گئی ہے۔ ارشاد قدرت ہے: ﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾

عقیدہ میں معمولی سی لغزش انسان کو خلود فی النار کا سزاوار بنا دیتی ہے اس لیے ہر مکلف پر بالعموم اور مبلغ دین پر بالخصوص ناقابل انکار قطعی دلائل سے اصول اسلامیہ اور عقائد ایمانیہ کا اس طرح محکم کرنا واجب ولازم ہے کہ تزول الجبال ولا تزول تلک العقائد چونکہ افراد قوم کے عقائد کی اصلاح یا ان کا فساد زیادہ تر اہل منبر کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اس لیے اگر خدانخواستہ ان کے عقائد فاسد ہوئے تو ان کا وجود قوم وملت کے لیے شیطان سے بھی زیادہ ضرر رساں اور باعث نقصان ہوگا۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ صرف سنی سنائی باتوں سے یا گھر بیٹھ کر محض چند کتب کی ورق گردانی کرنے سے عقائد میں درستی اور پختگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر ہادیان دین نے ایسے لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرنے کی ہدایت

فرمائی ہے جن کا سرمایہ علم صرف چند کتابوں کی ورق گردانی تک محدود ہو۔ چنانچہ جناب رسول خداؐ کا ارشاد ہے:
﴿ایاکم و اهل الدفاتر ولا یغرنکم الصحفیون﴾ کاپیوں والے (اہل علم) سے بچنا کہیں یہ کرم کتابی تمہیں دھوکہ نہ دے دیں (بحار ج ا) کیونکہ ایسے لوگ ما یفسدونه اکثر مما یصلحون (اس قدر اصلاح نہیں کرتے جس قدر افساد کرتے ہیں) وجہ ظاہر ہے کہ علمی اسرار و رموز صرف کتب بینی سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ اس مقصد جلیل کے حاصل کرنے کے لیے علماءِ محققین کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرنا پڑتا ہے جیسا کہ جناب علامہ حلی نے فرمایا ہے: ﴿ولکل علم اسرار لا یطلع علیها من الکتب فیجب اخذه من العلماء و لهذا قال علیه السلام خذوا العلم من افواه الرجال و نهی عن الاخذ عمن اخذ علمه من الدفاتر فقال علیه السلام لا یغرنکم الصحفیون﴾ آنحضرت کا مشہور ارشاد ہے: خذوا العلم من افواه الرجال ۔ کہ علم کو علماء سے حاصل کرو۔ (بحار، ج ا، تحریر الاحکام)

حضرت صادق آل محمدؑ فرماتے ہیں: ﴿من دان الله بغیر سماع من عالم صادق الزمه الله التیه الی الفناء﴾ جو شخص کسی حقیقی عالم سے سنے بغیر کوئی عقیدہ قائم کرے گا وہ مرتے وقت تک سرگردان رہے گا (کبریت احمر، صفحہ اا طبع ایران) ان حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فروع دین کی طرح اصول عقائد میں بھی علماءِ اعلام ہی کی طرف رجوع کرنا لازم ہے اور انہی سے صحیح عقائد کرنا واجب، ہاں اصول و فروع کے سلسلہ میں اس قدر فرق ہے کہ فروع کے سلسلہ میں صرف شرعی حکم معلوم کیا جائے گا۔ اس کی دلیل دریافت نہیں کی جائے گی لیکن اصول عقائد میں صحیح عقیدہ بھی انہی سے معلوم کیا جائے گا اور ساتھ ہی اس کی دلیل بھی حاصل کی جائے گی تاکہ وہ عقیدہ علی وجہ البصیرہ ہو اور اس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔

اہل منبر کے لیے مفید مشورہ

اہل منبر کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں کہ علماءِ اعلام سے اپنے عقائد کی اصلاح کرائیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث بیان کرنے کے سلسلہ میں بھی علماءِ محققین سے اجازۂ نقلِ روایت حاصل کریں کیونکہ کتابوں میں ہر قسم کا رطب و یابس مواد مل جاتا ہے اس لیے حزم و احتیاط فی الدین کا تقاضا یہ ہے کہ اہل منبر نقل روایات سے پہلے اس کا اجازہ حاصل کریں اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان کی مجلس خوانی سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا کہ دینی نقصان ہوگا۔ بعض علماءِ کرام نے تو ایسے بے لگام مقررین کی مجالس میں شرکت کرنے کو بھی حرام قرار دے دیا ہے جن کا نہ خود علمی پایہ بلند ہوتا ہے اور نہ علماءِ اعلام کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں: ﴿فلا یجوز الاستماع الیهم و حضور منابرهم و مجالسهم و یحرم علیهم نقل الاحادیث مالم یرجعوا الی من له اهلیة التمیز بین

ضعاف الاحادیث و صحیحها ممن یجوز تقلیده و الرجوع الیه﴾ (احیاء الشریعہ، ج ۱)

لہٰذا ایسے لوگ اگر دینی احکام میں مداخلت کریں گے تو بقول علامہ مازندرانی ان کا قول مثل بول متصور ہوگا۔ ﴿واعظ غیر مجتهد قولش مثل بولش می باشد در بیان احکام اگر از خود بگوید﴾

(ذخیرۃ المعاد، ص ۱۰۲، طبع لکھنؤ)

دوسرا ادب: ضرورت اخلاص

قبل ازیں اخلاص فی العمل کی ضرورت و اہمیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں اس کے اعادہ و تکرار کی حاجت نہیں ہے یہاں تو صرف اجمالی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ہر عبادت کی روح اخلاص ہے لہٰذا مجالس خوان حضرات کے لیے لازم ہے کہ وہ مجالس کو (جو کہ بہترین عبادت ہے) پورے خلوص نیت کے ساتھ پڑھیں۔ اس میں ذاتی نام و نمود کی خواہش، ریا و سمعہ کی آمیزش، تعریف و توصیف کی تمنا اور اپنی برتری اور دوسروں کی تحقیر کا جذبہ یا اس قسم کا کوئی اور نفسی ولولہ کارفرما نہ ہو۔ قبل ازیں ثابت کیا جا چکا ہے کہ فیس مقرر کر کے مجلس پڑھنا بھی روح اخلاص کے منافی ہے جس سے اجر و ثواب اکارت ہو جاتا ہے۔

وضاحت

ہم واعظین و ذاکرین کی مالی خدمت کرنے کے مخالف نہیں بلکہ اس بات کے حامی ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ امداد و اعانت کی جائے تاکہ وہ فکر معاش سے فارغ البال اور مرفہ الحال ہو کر فریضہ تبلیغ کو بجا لا سکیں۔ بنابریں اگر یہ حضرات خلوص کے ساتھ مجلس پڑھ دیں اور ان کی خدمت میں علی قدر مدارجہم بطور ہدیہ و نذرانہ کم یا زیادہ کچھ پیش کیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔ ہمیں اگر اعتراض ہے تو صرف ذکر حسینؑ کی تجارت پر۔ اس کے چک جکا اور مول بھاؤ پر۔ ظاہر ہے کہ ہدیہ و عطیہ کی صورت اور ہے اور تجارت کی شکل اور۔ و بینهما بون بعید۔

تیسرا ادب: مقتضائے حال کے مطابق گفتگو کرنا

علم معانی و بیان سے معمولی واقفیت رکھنے والے حضرات کے لیے یہ حقیقت کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں ہے کہ مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنے کا نام بلاغت ہے۔ بنابریں اہل منبر کو منبر پر ایسے مطالب و مضامین بیان کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے ان کی قابلیت کا اظہار تو ہوتا ہو مگر سامعین کے پلے کچھ نہ پڑے بلکہ ان کو چاہیے کہ سامعین کے ظرف فہم و مقدار عقل کی وسعت کے مطابق حقائق بیان کریں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿انا معاشر الانبیاء امرنا ان نکلم الناس علی قدر عقولهم﴾ ہم گروہ انبیاء کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کی عقل و فکر کے مطابق گفتگو کریں۔ (بحار الانوار) جناب امیر علیہ السلام اپنی

وصیت میں فرماتے ہیں: ﴿یا بنی! لا تقل ما لا تعلم بل لا تقل کلما تعلم﴾ بیٹا! جس بات کا علم نہ ہو وہ بات نہ کہو بلکہ ہر وہ بات جو تمہیں معلوم ہے وہ بھی نہ کہو۔ (نہج البلاغہ) سچ ہے لیس کلما یعلم یقال ؎

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آج کل کچھ لوگ عوامی سٹیج پر ایسے ایسے باریک مطالب بیان کرتے ہیں اور ایسی ایسی علمی موشگافیاں کرتے ہیں کہ سامعین کی اکثریت تو سواد علمی سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے کیا سمجھے گی بلکہ ظن غالب یہ ہے کہ خود بیان کرنے والوں کی بھی مطالب کی گہرائی و گیرائی تک صحیح رسائی نہیں ہوتی اور نہ ہی اپنی بیان کردہ تمام باتوں پر اعتقاد ہوتا ہے بلکہ صرف عنوانِ خطابت کے تحت سب کچھ کیا جاتا ہے اگرچہ سامعین کے عقیدہ و عمل کا بیڑا غرق ہو جائے۔ دوسری طرف کچھ اہل منبر علمی سطح سے ہٹ کر ایسے مبتذل نکات، بودے استدلات، رکیک استنتاجات اور غلط بیانات بیان کرنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ عوام کالانعام تو ان باتوں سے ضرور محظوظ ہوتے ہیں اور داد و تحسین کی صدائیں بھی بلند ہوتی ہیں مگر ایک باسمجھ اور بابصیرت انسان سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ آج حقائق کی جگہ لطائف اور دقائق کی جگہ ظرائف نے لے لی ہے اور اس سے ہماری قوم کی دماغی تربیت استدلالی لحاظ سے ابتر ہوتی جا رہی ہے اور قوائے فکریہ کو برابر مغالطوں کا شکار کیا جا رہا ہے۔ اس طرح قوم سے صحیح غور و فکر کا مادہ ہی سلب ہوتا جا رہا ہے۔ بالخصوص اغیار کی موجودگی میں ہمارے مجالس خوان جب ایسے اطوارت پر اتر آتے ہیں تو ارباب بصیرت کو نہایت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ ایسے لوگ قابل اصلاح ہیں۔ وفقنا اللہ لما یحب و یرضی۔

چوتھا، پانچواں اور چھٹا ادب: مجلس طے کرنے اور غنا سے اجتناب کرنا

اہل منبر کو چاہیے کہ مجلس حسینؑ ایسی مقدس چیز کو اجرت کے طے کرنے، ان میں غنا و موسیقی کا ارتکاب کرنے اور کذب و افتراء کی آلائش سے ملوث کرنے سے مکمل اجتناب کریں۔ ان تمام امور پر قبل ازیں مکمل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں تو صرف اجتماعی طور پر ان آداب و شرائط کا اجمالی تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ وبس۔

ساتواں ادب: حسینیؑ سیرت کا عملی نمونہ پیش کرنا

مجلس خوان حضرات کو چاہیے کہ اپنی سیرت و کردار کی پاکیزگی سے اسوۂ حسینیؑ کا عملی نمونہ پیش کریں۔ اپنی شکل و شمائل اور عادات و خصائل کو شریعت مقدسہ کے اصولوں کے مطابق ڈھالیں۔ واجبات کی بجا آوری اور محرمات سے اجتناب کی سختی کے ساتھ پابندی کریں۔ راست گوئی، راست بازی اور خلوص کو اپنا شعار قرار دیں، ایثار کو اپنا شیوہ بنائیں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کو سرمایۂ حیات مستعار قرار دیں تاکہ ذاتی اغراض سے بالا ہو کر خدمت دین کر سکیں اور قومی، ملی مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دیں۔ ذکر حسینؑ کو ذریعۂ معاش و سرمایۂ حیات نہ

بنائیں۔ لوازم عیش و عشرت سے اجتناب کریں تاکہ مہمان کربلا کی سادہ زندگی بیان کرنے والوں کی مہمانداری میں اہل ایمان کو پریشانی نہ ہو۔ نیز ان کو مصائب و آلام کی تکلیف جھیلنے کی عادت ڈالنا چاہیے تاکہ تبلیغ حق کے سلسلہ میں اگر کوئی تکلیف پہنچے تو اسے خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرسکیں۔ نیز انہیں چاہیے کہ اپنے عمل سے اتفاق و اتحاد کی تلقین کریں۔ غرضیکہ سیرت حسینؑ کا تذکرہ کرنے والوں کو اپنے عمل و کردار سے لوگوں کو سیرت ائمہ اطہار ؑ کا درس دینا چاہیے۔ اگر اہل منبر میں یہ صفات جلیلہ موجود نہیں ہیں تو پھر وہ اس عزت و منزلت کے ہرگز مستحق نہیں ہیں جو ان کے جلیل القدر منصب سے وابستہ ہے اور ان کی منبر پر سب ہاؤ ہو اور رونا رلانا سطحی جذبات کی نمائش ہے جو کوئی قابل قدر چیز نہیں ہے۔ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

آٹھواں ادب: واعظین کے بیان کا امید و بیم کے درمیان ہونا

اہل منبر کو چاہیے کہ ان کا بیان خوف و رجاء کے بین بین ہو نہ تو اس قدر عذاب خداوندی سے ڈرائیں کہ لوگ رحمت پروردگار سے مایوس ہو جائیں اور نہ ہی رحمت حق پر غلو اعتماد کر کے اس قدر ڈھیل دیں کہ لوگ عذاب خدا سے مامون و مطمئن ہو کر گناہوں پر جری و جسور ہو جائیں۔ حضرت صادق آل محمدؑ فرماتے ہیں: ﴿الا اخبركم بالفقيه حق الفقيه من لم يقنط الناس من رحمة الله ولم يؤمنهم من عذاب الله﴾ کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ حقیقی فقیہ اور شریعت دان کون ہے؟ جو نہ تو لوگوں کو رحمت حق سے ناامید کرے اور نہ ہی عذاب خدا سے بے خوف کر دے (اصول کافی، صفحہ ۱۹، باب صفۃ العلماء) فلاح کونین کے لیے جس قدر خدا کی رحمت کاملہ پر اعتماد کی ضرورت ہے اتنا ہی اس کے عذاب و عقاب سے ڈرنا بھی لازم ہے کیونکہ جہاں وہ غفور و رحیم ہے وہاں جبار و قہار بھی ہے ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اسی لیے آنحضرتؐ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بشیر ہونے کے ساتھ ساتھ نذیر بھی تھے ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ بہرحال ایک عقلمند اور ہمدرد قوم مبلغ کی حیثیت ایک ماہر طبیب کی سی ہے اسے چاہیے کہ قوم کی نبض پر ہاتھ رکھے اور جہاں جس قسم کے بیان کی ضرورت ہو اس کے مطابق بشارت یا نذارت کا فریضہ انجام دے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اکثر مقررین نے صرف بشارت کو اختیار کر کے نذارت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہماری اجتماعی قوت عمل پژمردہ ہو گئی ہے اور اس کے باوجود ہر شخص جنت کا ٹھیکیدار نظر آتا ہے۔ ایسے خوش فہم حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ جنت کے پٹے ایسے ارزاں پڑے نہیں بکتے کہ اس طرح رائیگاں اور مفت میں ہاتھ آجائیں۔ شفاعت برحق ہے اور ضرور ہے مگر ہمارا مسئلہ شفاعت نصرانیوں کی طرح نہیں ہے کہ گناہوں کی گٹھری خدا کے بیٹے کے حوالہ کر دی اور خود مطلق

الشان ہوکر جو چاہیں کرتے پھریں۔ خدا کی بارگاہ میں دیر تو ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ﴾

نواں ادب: مبلغین کا معصومینؑ کے فرامین پر اکتفا کرنا

مبلغین کو چاہیے کہ وہ حضرات معصومین ؑ کے ارشادات و فرامین بیان کرنے پر اکتفا کریں اور بغیر شدید ضرورت کے مخالفین کے روایات نقل کرنے سے تا بمقدور اجتناب کریں۔ اصول دین ہوں یا فروع دین بلکہ فضائل ائمہ طاہرین ؑ میں بھی روایات مخالفین پر اعتماد کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے چنانچہ علامہ مجلسیؒ نے ہفتم بحارالانوار ص ۲۱۴ پر ایک پورا باب بعنوان "باب النهي عن اخذ فضائلهم من مخالفيهم" منعقد کیا ہے اور پھر ارشاد معصومین ؑ کی روشنی میں اس مطلب کو ثابت فرمایا ہے اسی طرح حضرت شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے عدة الاصول ص ۵۳ طبع ایران میں اس مطلب پر فرقہ حقہ کے اجماع کا دعویٰ فرمایا ہے۔ رجال کشی ص ۲ طبع بمبئی میں بروایت علی بن سوید جناب امام موسیٰ کاظم ؑ سے مروی ہے: ﴿لا تاخذن معالم دينك عن غير شيعتنا فانك ان تعديتهم اخذت دينك عن الخائنين﴾ اپنے دین کے معالم و معارف کو شیعیان علیؑ کے علاوہ اور کسی سے حاصل نہ کرنا۔ اگر تم نے ان سے تجاوز کیا تو پھر خیانت کاروں سے دینی معلومات حاصل کرو گے۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج ہماری مجالس کچھ اس نہج پر چل رہی ہیں کہ ابتداء سے انتہا تک مخالفین کی کتب تفسیر و حدیث وغیرہ کے حوالہ جات پر مجلس ختم ہو جاتی ہے اور جو لوگ اپنے ہادیان دینؑ کے فرامین سننے کے شوق میں شریک مجلس ہوتے ہیں ان کے کان قال الباقر ؑ اور قال الصادق ع ☆ کی آواز سننے کے لیے ترستے ہی رہتے ہیں۔ اسی غلط روش کا نتیجہ ہے کہ اپنی مذہبی کتب کا مطالعہ متروک ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے اور سننے والوں کی اکثریت اپنے صحیح مذہبی معلومات سے تہی دامن نظر آتی ہے۔ مخالفین کی رطب و یابس مطالب سے لبریز کتب کے ناموں سے تو قوم کا بچہ بچہ واقف ہے مگر اپنی کتب اربعہ کے بھی انہیں نام معلوم نہیں ہیں، العجب۔ بہرکیف اس روش میں اصلاح کی اشد ضرورت ہے ہاں بوقت ضرورت بغرض تائید یا بطور الزام ان کے روایات پیش کرنے میں مقررین کے لیے کوئی حرج نہیں لیکن نہ اس حد تک کہ اسے ہی اصل مقصود بالذات سمجھ لیا جائے۔

دسواں باب: طول ممل و اختصار مخل سے اجتناب کرنا

مبلغین و ذاکرین کو انسانی نفسیات سے بھی واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ موقع و محل کی نزاکت کا خیال کر کے طول یا اختصار سے کام لے سکیں۔ بموجب خير الامور اوساطها بہتر یہ ہے کہ طول ممل اور اختصار مخل ہر دو سے اور بالخصوص طول کلام سے اجتناب کریں۔ جب سننے والوں کا ہنوز اشتیاق باقی ہو تو سلسلہ کلام بند کر دینا چاہیے تاکہ

کلام میں زیادہ اثر پیدا ہو۔ اس بات کا لحاظ کرنا اس وقت اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے جب کہ اور بھی پڑھنے والے موجود ہوں تا کہ ایک کے طول کلام سے دوسروں کی مجلس متاثر نہ ہو۔ اور اس طرح ان کے درمیان باہمی عداوت اور شکر رنجی کے جذبات نہ ابھرنے پائیں۔ ہاں اگر کسی وقت خود سامعین کا اصرار ہو کہ مقرر اپنے بیان کو قدرے طول دے تو یہ اور بات ہے۔ حدیث میں وارد ہے: ﴿القائل اقل ملالة من المستمع فاذا حدثت فلا تمل جلسائک﴾ بولنے والا سننے والے کی نسبت کم ملول ہوتا ہے لہٰذا جب کچھ بیان کرو تو (طول کلام سے) سامعین کو ملول نہ کرو۔ بہر حال اہل منبر کو خود نفسیاتی طور پر موقع و محل کی نزاکت کا خیال رکھنا چاہیے۔ و لکل مقام مقال۔

واعظ میں کن صفات کا ہونا ضروری ہے

اس سلسلہ کے اختتام پر حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی ایک حدیث پیش کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہے جس میں آنجنابؑ نے واعظین کے چند اہم صفات جلیلہ کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے مذکورہ بالا حقائق کی تائید مزید ہوتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿من لم ینسلخ من هواجسه ولم یتخلص من آفات نفسه و شهواتها ولم یهزم الشیطان ولم یدخل فی کنف الله و امان عصمته لم یصلح للامر بالمعروف و النهی عن المنکر لانه اذا لم یکن بهذه الصفة فکل ما اظهر یکون حجة علیه ولا ینتفع الناس به قال الله تعالیٰ اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم و یقال له یا خائن اتطالب خلقی بما خنت به نفسک و ارخیت عنانک﴾ کوئی بھی شخص جب تک اپنے وساوس نفسانیہ اور اس کے آفات و شہوات سے گلو خلاصی نہ کرا لے اور شیطان کو شکست دے کر خدا کی پناہ گاہ اور امان میں داخل نہ ہو جائے اس وقت تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ جب تک ان صفات کا حامل نہ ہوگا تو جو کچھ کہے گا وہ اس کے برخلاف اتمام حجت ہوگا اور لوگ اس سے فائدہ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے خدا فرماتا ہے: کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو نیز اس سے (منجانب اللہ) یہ کہا جاتا ہے او خائن! تو میری مخلوق سے ان امور کی بجا آوری کا مطالبہ کرتا ہے جن میں خود خیانت مجرمانہ کرتا ہے اور اپنے نفس کی لگام ڈھیلی چھوڑتا ہے۔ و نعم ما قیل لا تنهه عن خلق و تاتی مثلة عار علیک اذا فعلت عظیم۔

بانیان مجالس اور سامعین کرام کے دہ گانہ وظائف کا بیان

یہ امر کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے کہ ہر کام کی انجام دہی کے کچھ مخصوص قواعد و ضوابط ہوتے ہیں اگر ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ کام ناتمام رہتا ہے اسی طرح مجالس عزا کے انعقاد و استماع اور ان سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنے کے بھی کچھ قواعد ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ یہ عمل خیر بے کیف اور جسد بلا روح ہو کر رہ جائے گا ہم ذیل میں

صرف دس اہم وظائف کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پہلا وظیفہ: خلوصِ نیت

اس موضوع پر قبل ازیں کافی تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک عبادت ہی نہیں ہوتی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اور اخلاص ہی عبادت کی روح اور اس کا حقیقی جوہر ہے اگر اس کا فقدان ہو تو وہ عمل صالح بجائے شرف قبولیت حاصل کرنے کے الٹا عامل کے لیے باعث وزر و وبال بن جائے گا لہٰذا اگر بانی اور سامع مجالس عزاء کے انعقاد و استماع کو عبادت سمجھتے ہیں تو ان کو خلوص نیت سے ان میں حصہ لینا لازم ہے۔

دوسرا وظیفہ: جہاں غیر شرعی امور کا ارتکاب ہو وہاں شرکت نہ کرنا

جن مجالس میں غیر شرعی امور مثل کذب وافتراء علی المعصومین، ہجو مومنین اور غنا و سرود وغیرہ کا ارتکاب ہوتا ہو بانیوں کو ان میں حصہ لینے اور سامعین کو اس میں شرکت کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے بشرطیکہ اصلاح احوال سے قاصر ہوں ورنہ پہلے اصلاح کی کوشش کرنا مقدم ہے۔ ارشاد قدرت ہے: ﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ (سورۂ نساء، آیت ۱۴۰) اور وہ تم پر کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جس وقت تم یہ سنو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جاتا ہے یا ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے تو تم ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ کسی اور معاملہ میں گفتگو نہ شروع کریں ورنہ تم بھی اس صورت میں (کفر میں) انہیں کے مانند ہو جاؤ گے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ غلط کار لوگوں کو پہلے تو وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے ان حرکات سے باز رکھنے کی کوشش کرو اور اگر تمہاری کوشش بار آور نہ ہو تو پھر ان کی ہمنشینی سے اجتناب کرو۔ (کبریت احمر) امالی شیخ مفید علیہ الرحمۃ میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے ایک طویل حدیث منقول ہے جس میں مذکور ہے کہ آنجنابؑ نے سلیمان جعفری کے والد کو ایک بدعقیدہ شخص عبدالرحمن بن یعقوب کی ہمنشینی پر ٹوکا اور فرمایا کہ اگر اس کی ہمنشینی اختیار کرنا ہے تو ہماری صحبت چھوڑ دو۔ اس کے اس عرض کرنے پر کہ وہ اس کا ہم عقیدہ تو نہیں ہے! پھر کیا حرج ہے؟ فرمایا: کیا تمہیں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ اس پر عذاب خدا نازل ہو اور سب اہل بزم کو اپنی لپیٹ میں لے لے پھر امام نے ایک اسرائیلی مومن کا تذکرہ فرمایا جو غرق فرعون کے وقت اپنے کافر باپ کی ہمنشینی کی وجہ سے غرق ہو گیا تھا۔ ﴿لان البلاء اذا ینزل یعم. ولم یکن له عمن قارب المذنب دفاع﴾ قبل ازیں بھی اس سلسلہ میں بعض اعلام کا فتویٰ نقل کیا جا چکا ہے کہ جو پڑھنے والا غلط و صحیح روایات اور غث و سمین واقعات میں تمیز کرنے کی نہ خود اہلیت رکھتا ہو اور نہ ہی علماءِ اعلام کا فتویٰ کی طرف سے مجاز ہو تو اس کی مجلس خوانی میں شمولیت جائز نہیں ہے۔ واللہ الموفق۔

سرکار علامہ سید علی الحائری مجتہد پنجاب، اس سوال کہ ''جن مجالس عزا میں بعض خلاف شرع امور کا ارتکاب ہوتا ہو مثلاً موضوع اور غلط روایات بیان کی جاتی ہوں یا راگ میں سوز خوانی ہوتی ہو۔ ڈھول تاشہ بجتا ہو۔ ایسی مجالس میں شریک ہونا جائز ہے؟ یا معصیت؟ بینوا تو جروا، کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''مذکورہ باتیں فی الواقع خلاف شرع ہیں اور مجالس عزا ایسے غیر مشروع باتوں سے مبرا ہونی چاہیں ورنہ جن مجالس میں ایسے خلاف شرع امور کا ارتکاب ہوتا ہو ان میں شرکت کرنا یقیناً خلاف شرع ہے'' وھو العالم''

(رسالہ الحافظ لاہور، ج ۲، نمبر ۵، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۶ء بمطابق محرم ۱۳۴۵ھ)

تیسرا وظیفہ: مجلس میں دنیوی خیالات سے فارغ ہو کر شریک ہونا

جب مومنین کرام مجلس عزا میں شریک ہوں تو لازم ہے کہ دنیا و مافیہا سے غافل اور تمام خیالات سے فارغ القلب ہوں اور قائل کی گفتگو کو پوری توجہ سے سماعت کریں تا کہ گوہر مقصود ہاتھ آ سکے۔ ارشاد قدرت ہے: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (سورۂ زمر، آیت ۱۸/۱۷) پس تم میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے رہے اور ان میں سب سے بہتر کی پیروی کرتے رہے یہ خوشخبری سنا دو وہ وہی ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے ہدایت فرمائی اور وہی عقلمند ہیں۔ ایک شخص نے جناب رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ علم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: خاموشی اختیار کرنا۔ سائل نے کہا: پھر کیا ہے؟ فرمایا: توجہ سے سننا۔ عرض کیا۔ پھر کیا؟ فرمایا: یاد کرنا۔ عرض کیا: پھر کیا؟ فرمایا: اس پر عمل کرنا۔ عرض کیا: پھر کیا؟ فرمایا: اس کی نشر و اشاعت کرنا (منیۃ المرید شہید ثانیؒ) دیکھا آپ نے کہ آنحضرت نے تحصیل علم کے طرق ثلاثہ بیان کرنے کے بعد چوتھے مرتبہ پر اپنی اصلاح احوال اور آخر میں پانچویں مقام پر دوسرے بنی نوع انسان کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے کا ذکر فرمایا ہے مگر آج منبر کے اجارہ داروں کی اکثریت کے پاس نہ علم ہے اور نہ ہی عمل مگر اصلاح قوم اور تبلیغ دین کا درد آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا ؎

ہر صبح سفر ہر شام سفر

ایسے ہی لوگوں پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ خود میاں فضیحت دیگراں را نصیحت۔ ﴿فوا عجبا من اغلب اهل المنبر لا يفرقون بين الهر و البر ولا يطالعون الزبر المعتبرة ولا يتاملون فيها و يعرجون على عرشتها العالية كانهم اباء سحبان ولا يستحيون من احد فيما يقولون فياتون بما يشاؤن من مزخرفات و ريب المنون. اعاذنا الله و اياهم من هذه السجية فانها مهلكة و خلاصة المرام انه لا بد لهم اولا من تصحيح مباديه على ما هي عليها ثم رعاية ادابه ثم التخلق بالاخلاق الحميدة و

التحلی بالفضائل و التعری عن الرذائل بعد ما اطاعوا اللّٰہ فی حلالہ و حرامہ الذی ھو التقوی و قال تعالٰی انما یتقبل اللّٰہ من المتقین ﴾ (لولوۃ الغالیۃ)

چوتھا وظیفہ: مجالس میں شرکت سے ذاتی ترفع کا مانع نہ ہونا

بالعموم یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب غرباء کے ہاں مجلس عزا ہو یا پڑھنے والا کم علم ہو تو مالدار اور علماء ذی وقار اس مجلس میں شمولیت کرنا اپنے لیے کسر شان کا باعث سمجھتے ہیں حالانکہ شرعاً ان کا یہ فعل سخت مذموم ہے سید الشہداء علیہ السلام کی مجلس عزا میں شمولیت کرنے سے کسی قسم کا مالی یا علمی ترفع وتکبر مانع نہیں ہونا چاہیے کیونکہ علاوہ اس کے کہ بعض اوقات انسان اپنے سے کم علم وفضل رکھنے والے حضرات سے بھی علمی استفادہ کر لیتا ہے اس میں تواضع و فروتنی کی صفت جلیلہ پائی جاتی ہے۔ تواضع کرنے والوں کو خداوند عالم سربلندی عطا فرماتا ہے اور شرکت نہ کرنے میں تکبر جیسی مذموم صفت کا اظہار ہوتا ہے اور خدا تکبر کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور ان کو ذلیل کرتا ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں وارد ہے ﴿وما تواضع احد للّٰہ الا رفعہ اللّٰہ وما تکبر احد الا وضعہ اللّٰہ ﴾ (امالی الاخبار) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من الکبر ﴾ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ داخل جنت نہیں ہو سکے گا کیونکہ ﴿ان اللّٰہ لا یحب المتکبرین ﴾ جب وہ [illegible] تھے [illegible] اٹھنے بیٹھنے میں عار محسوس نہیں فرماتے تھے تو ہمارے امراء غرباء کے [illegible] اس واقعہ کا تصور کریں جب حضرت امام حسین علیہ السلام چند فقراء کے [illegible] انہوں نے جواب سلام کے بعد دعوت شرکت [illegible] اور روایت میں صدقہ ہونے کا عذر کرکے شمولیت سے معذوری ظاہر فرمائی پھر ان مساکین کو اپنے ہاں دعوت دی اور ان کو پر تکلف ضیافت دی اور بوقت رخصت ہر ایک مسکین کو چند درہم بھی مرحمت فرمائے۔ (عاشر بحار وغیرہ)

مگر افسوس آج انہی امام کے نام پر غرباء کے ہاں منعقد ہونے والی مجالس میں نہ صرف یہ کہ امراء شرکت کرنا اپنی سبکی سمجھتے ہیں بلکہ خود پڑھنے والوں کی اکثریت بھی ان کے ہاں مجلس پڑھنے سے پہلو تہی کرتی ہے اور کنی کتراتی ہے اور اگر حسن اتفاق سے کوئی تاریخ خالی ہو اور ان کے اصرار پر وعدہ کر بھی لیں تو اگر اسی اثنا میں کسی امیر کے ہاں سے دعوت نامہ موصول ہو جائے تو سابقہ عہد و پیمان کو طاق نسیان پر رکھ کر نئی دعوت پر چلے جاتے ہیں اور غریب مومن کی دل شکنی، اپنی وعدہ شکنی اور مومن کی بے بسی کے ساتھ اپنی رسوائی کی ذرہ بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ﴿وکان عھد اللّٰہ مسئولا ﴾ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ایسے ہی لوگوں نے جہنم کا تیسرا

طبقہ پُر کرتا ہے ﴿ومن العلماء من یری ان یضع العلم عند ذوی الثروۃ و الشرف ولا یری لہ فی المساکین و الضعفاء فذلک فی الدرک الثالث من النار﴾ بعض اہل علم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے علم سے صرف مالداروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن غرباء و مساکین کو اس سے کچھ حصہ نہیں دینا چاہتے ایسے لوگ جہنم کے تیسرے طبقہ میں ہوں گے۔ (خصال شیخ صدوقؒ) بہرحال ایسا کرنے والوں کو احکم الحاکمین کی بارگاہ میں جوابدہی کے لیے تیار رہنا چاہیے ﴿وَ هُوَ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ. تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾

پانچواں وظیفہ: بطور سوگوار شریک مجلس ہونا

کچھ کمزور ایمان والے لوگ لباس فاخرہ زیب تن کر کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ مجالس میں شرکت کرتے ہیں ان کا یہ رویہ قابل نفرین ہے۔ مجالس عزا میں اس طرح ادب و احترام اور اس حال میں شامل ہونا چاہیے کہ ان کی شکل و صورت سے ان کا سوگوار ہونا ظاہر ہوتا ہو۔ وہاں شور و شغب، گالی گلوچ، شکوہ و شکایت بلکہ تمام منافیٔ احترام باتوں سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے اور پورے سکینہ و وقار کے ساتھ مجالس کا انعقاد و استماع عمل میں لانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کے حسنات سیئات بن جائیں جیسا کہ آیت مبارکہ ﴿وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے فرمایا ﴿ھی اعمال حسبوھا حسنات فوجدوھا فی کفۃ السیئات﴾ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو یہ لوگ نیکیاں خیال کرتے تھے لیکن انجام کار انہوں نے ان کو برائیوں کے پلڑے میں پایا۔ (تفسیر برہان) بھلا وہ بد بخت نام نہاد مومنین و مومنات جن کی نظریں مجلس پڑھنے والے کی بجائے نامحرم و نامحرمات کا نظارہ کرنے میں لگی ہوئی ہوں اور جن کی توجہ فضائل و مصائب سننے کی بجائے اپنے جسم و لباس کی بناوٹ و سجاوٹ کی نوک پلک سنوارنے پر ہو، جن کی ظاہری وضع قطع سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ کسی میلۂ مسرت میں شریک ہیں (معاذ اللہ) نہ مجلس عزا میں اور وہ بانیان و بانیات مجالس جو خلاف شرع طریقہ سے کمائے ہوئے روپیہ سے مجلس منعقد کریں۔ آیا وہ بھی اس عمل کی قبولیت کی امید کر سکتے ہیں؟ اور اسے بخشش گناہان کا ذریعہ قرار دے سکتے ہیں؟ آیا اس روش و رفتار سے والدۂ حسینؑ راضی ہو سکتی ہیں؟ حاشا و کلا۔

عشرت کنیم تعزیۂ اش نہیم نام   حاشا کہ رسم و راہ محبت چنیں بود

اس سے بھی زیادہ رونے کا مقام تو یہ ہے کہ جہاں منبر رسولؐ اور حسینی اسٹیج پر جانے والے بعض نالائقوں کی یہ حالت ہو کہ عین عشرۂ محرم میں بجائے واعظ یا ذاکر حسینؑ معلوم ہونے کے اپنی شکل و صورت اور وضع قطع سے کسی تھیٹر کے ایکٹر معلوم ہوتے ہوں وہاں اگر سامعین اور بانیین ایسے نہیں ہوں گے تو اور کیسے ہوں گے؟ و زیرے چنیں

شہریارے چناں ۔ خدا کرے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو اپنے فرائض کا احساس ہو اور پھر ان سے سبکدوش ہونے کا جذبہ بھی پیدا ہو کیونکہ صورتِ حال کے بگاڑ میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔

چھٹا وظیفہ: بحالتِ نجاست شاملِ مجالس نہ ہونا

بہتر ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے والے باطہارت ہو کر شریکِ مجلس ہوں اور اگر مجلس کسی مسجد میں ہے تو پھر توجب وحائض کی اس طرح شمولیت کہ جس سے مسجد میں داخل ہونا لازم آئے حرام ہے اور بنابر احتیاط مشاہد مقدسہ کا بھی یہی حکم ہے۔

ساتواں وظیفہ بکاء یا تباکی کرنا

چونکہ مقربانِ بارگاہِ خدا کے مصائب پر اشکِ غم بہانا اجر و ثوابِ بے حساب کا باعث ہے اس لیے تمام معصومین ؑ کے بالعموم اور امام الشہداء ؑ کے مصائب پر بالخصوص دل کھول کر گریہ و بکا کرنا چاہیے اور اگر کسی وقت سوئے اتفاق سے گریہ نہ آئے تو کم از کم صدقِ دل سے رونے والوں کی شکل ضرور بنائیں تاکہ عنایاتِ الٰہیہ میں شامل حال ہوسکیں یہ بات بہت ہی معیوب ہے کہ ذکرِ مصائب ہو رہا ہو اور کوئی شخص سنگدلانہ قسم کی سنجیدگی کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا رہے۔ یہ قساوتِ قلب کی علامت ہے اور قسی القلب شخص رحمتِ پروردگار سے بعید ہوتا ہے یہ بات علم الاخلاق میں مبرہن ہو چکی ہے کہ بعض اخلاق جبلی ہوتے ہیں اور بعض کسبی روایات سے بھی اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔ جناب امیر ؑ فرماتے ہیں: ﴿ان لم تکن حلیماً فتحلم﴾ اگر تم حلیم و بردبار نہیں ہو تو بزور و تکلف حلیم بنو۔ دوسری حدیث میں یوں وارد ہے: ﴿من لم یتحلم لم یحلم (الدرر و الغرر للآمدی)﴾ جناب رسول خدا ؐ فرماتے ہیں: ﴿یا اباذرؓ من استطاع ان یبکی فلیبک و من لم یستطع فلیشعر قلبه الحزن و لیتباکی ان القلب القاسی بعید من الله ولکن لا یشعرون﴾ اے ابوذرؓ! جو شخص رو سکتا ہے وہ تو روئے اور جو نہیں رو سکتا وہ اپنے دل میں حزن پیدا کرے اور رونے کی شکل و صورت بنائے کیونکہ سخت دل خدا سے دور ہوتا ہے لیکن ایسے لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔ (مکارم الاخلاق)

بہرحال تباکی کرنے سے بالآخر بکاء کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔

آٹھواں وظیفہ: عزاخانہ کو سادہ رکھنا

عام لوگ عزاخانوں کی زیبائش و آرائش میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں اور بڑے تکلفات کرتے ہیں حالانکہ عزاخانہ کو ایسا سادہ ہونا چاہیئے کہ اس کی ظاہری ہیئت سے ہی حزن و ملال کے آثار نمودار ہوں اور شریکِ مجلس ہونے والوں پر خود بخود رنج و الم کے علامات ظاہر ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی زیبائش و آرائش کے جلوے دیکھ کر الٹا دنیوی

زخارف کی طرف رغبت پیدا ہو۔ بہرحال ہمیشہ اس بات کو پیش نگاہ رکھنا چاہیئے کہ وہ مجلس گاہ ہے نہ آرائشگاہ۔ یہ محل حزن وملال ہے نہ مقام جمال وجلال۔ یہاں جناب رسول خدا ﷺ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کو پرسا دینا مقصود ہے نہ کہ اپنے عزّ ووقار کا اظہار ہاں البتہ اگر محافل میلاد پر قدرے تزئین وآرائش کر لی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ یہ امر مستحسن ہے بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہنچے اور نہ ہی کسی اور ممنوع امر کا ارتکاب کیا جائے۔

نواں وظیفہ: مجالس میں کچھ شیرینی تقسیم کرنا

مجالس ومحافل میں حسب توفیق کچھ نہ کچھ شیرینی ضرور تقسیم کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنا علاوہ اس کے اجر وثواب کثیر کا باعث ہے جیسا کہ بعض احادیث قدسیہ میں وارد ہے کہ ﴿و ما من عبد انفق فی محبة ابن بنت نبیه طعاماً و غیر ذلک درهما الا و بارکت له فی دار الدنیا الدرهم بسبعین درهماً و کان معافاً فی الجنة و غفرت له ذنوبه﴾ جو شخص اپنے نبی کی دختر کے فرزند (امام حسین علیہ السلام) کی محبت میں کچھ طعام وغیرہ یا ایک درہم بھی خرچ کرے گا۔ میں اسے دار دنیا میں اس ایک درہم کے بدلے ستر درہم کی برکت دوں گا اور عافیت کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا اور میں اس کے گناہ بھی معاف کر دوں گا۔ (لولو ومرجان، صفحہ ۴۰)

یہ امر بعض وجوہ کی بنا پر مذہب حق کی ترقی وترویج کا سبب بھی ہے۔ عامۃ الناس اور بعض حقائق ناآشنا لوگ محض شیرینی کے لالچ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ذریعہ ہے جب کلمۂ حق ان کے گوش گزار ہوتا ہے تو بالآخر مذہب حق قبول کر لیتے ہیں جیسا کہ تجربہ شاہد ہے۔

دسواں وظیفہ: اسوۂ حسینی کی تاسی کرنا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساتویں وظیفہ میں اور اس سے قبل بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ مصائب سید الشہداء علیہ السلام میں رونا اور رلانا کار ثواب اور باعث اجر بے حساب ہے لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حسینی شہادت ایسے عظیم الشان واقعہ کی اصل غرض وغایت صرف رونا اور رلانا قرار دینا درست نہیں ہے اور نہ ہی مجالس عزاء کے انعقاد کا اصل مقصد فقط رونے اور رلانے کے اسباب جمع کرنا ہے۔ ایسا خیال حسینی شہادت کبریٰ کی لطافتوں اور نزاکتوں کو بے اعتنائی کی آماجگاہ بنانے کے مترادف ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ گریہ وبکاء سرکار شہادت کی شہادت عظمیٰ کی اصل غرض وغایت کی نشر واشاعت اور اس کے پرچار کا ایک مؤثر ذریعہ اور آلہ ہے۔ ان آداب ووظائف سے جو سب سے اہم وظیفہ ہے وہ یہ ہے کہ بانیان کرام اور سامعین عظام کو اسوۂ حسینی کی تقلید وتاسی کرنا چاہیئے اور اپنے عمل وکردار سے اپنے حسینی ہونے کا عملی ثبوت فراہم کرنا چاہیئے۔ یہ مجالس عزاء حسینی شہادت کے اعلیٰ وارفع مقاصد کی نشر واشاعت کا مفید ترین ذریعہ ہیں۔ ان میں فضائل ومصائب کے ساتھ ساتھ اصول وفروع دین اور

سیرتِ معصومین ﷺ کا تذکرہ بھی موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق سائنٹفک طریقوں سے کرنا چاہیے اور حسینی شہادتِ عظمیٰ کے مقصد کی تکمیل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اقوامِ عالم کے سامنے اپنے عمل و کردار سے شریعتِ مقدسہ کے اصولوں کا عملی نمونہ پیش کر کے اس کی صداقت کا عملی اعلان کریں تاکہ دنیا ہمارے کردار کی بلندی کو دیکھ کر آلِ محمدؐ کی عصمت و طہارت کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ جن کے نام لیوا ایسے بلند کردار اور پاکیزہ سیرت کے مالک ہیں ان کے پیشوا کس قدر عظیم الشان انسان ہوں گے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم قوم میں صحیح شعور پیدا کرے تاکہ وہ تمام عبادات کو بالعموم اور مجالس و محافل کو بالخصوص شریعتِ مطہرہ کے قواعد و قوانین کے مطابق بجا لا کر خوشنودیٔ خدا و رسولؐ اور آلِ رسولؐ کا پروانہ اور دین و دنیا میں سرخروئی کا تمغہ حاصل کر سکیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

کچھ موجودہ کتاب کے بارے میں

اربابِ عقل و اطلاع پر یہ حقیقت مخفی و مستور نہیں ہے کہ تاریخ اسلام بلکہ پوری تاریخ عالم میں واقعۂ کربلا سے زیادہ عظیم کوئی اور واقعہ رونما نہیں ہوا اور یہ کہ عالم اسلام کی بقا بلکہ پورے عالم انسانیت کی نجات و فلاح پر جو گہرے نقوش سانحۂ کربلا نے چھوڑے ہیں اتنے کسی اور واقعہ نے نہیں چھوڑے ہیں۔ آج اسلام کے اندر زندگی کے جو آثار اور انسانیت کے اندر حیات کے جو رمق نظر آ رہے ہیں یہ سب شہید انسانیت کے عظیم جہاد کا ہی ثمرہ و نتیجہ ہے۔

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است   پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

یہ حقیقت بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ جو واقعہ جس قدر عظیم ہوتا ہے اسی قدر اغراض فاسدہ رکھنے والے لوگوں کو اس میں رنگ بھرنے کے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں اور وہ اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس میں کچھ اس طرح رطب و یابس کو گڈمڈ کر دیتے ہیں کہ تلاش حق کرنے والوں کے لیے حق و حقیقت کے نقوش دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ بالخصوص جب وہ واقعہ ایسا ہو کہ اس سے کسی گروہ کی مذہبی موت واقع ہوتی ہو۔ اس صورت میں وہ ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی غیر مستند روایت یا غیر معتبر واقعہ مل جائے تو اس کا سہارا لے کر پورے واقعہ کو لوگوں کی نظروں میں مشکوک و مشتبہ بنا دیں۔ جب بھی عقائد یا تاریخی واقعیت و حقیقت کی جگہ تعصب و جنبہ داری لے لے تو اس کے یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

واقعۂ کربلا تو کئی صدیوں تک ایسے حالات میں گھرا رہا کہ حکومتیں اسے انظارِ عامہ میں سبک کرنے بلکہ اسے انسانی اذہان سے محو کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی رہیں اور اب تک دشمنانِ حسینیت یہی سعی نافرجام کر رہے

ہیں۔ ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِھِمْ وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ﴾

یہ اور بات ہے کہ ہمیشہ خداوند عالم اپنے دست قدرت سے شمع حسینی کے جانباز پروانوں (علماء حق) کے ذریعہ ان لوگوں کے عزائم مشئومہ کو خاک میں ملاتا رہا ہے، ملا رہا ہے اور ملاتا رہے گا انشاء اللہ ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

چنانچہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جس دور میں بھی کسی دشمن حسینؑ وحسینیت نے واقعۂ کربلا کی اہمیت کو کم کرنے کی ناپاک جسارت کی تو ارباب حق نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور حقائق کو اس طرح واضح واجاگر کیا کہ انکار وشک کے تمام دروازے بند کردیئے۔ سنہ ۶۱ ھ سے لے کر اب تک واقعۂ کربلا پر جس قدر لکھا جاچکا ہے تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عہد ائمہؑ سے لے کر شیخ صدوق ؒ ومفید ؒ تک اور ان سے لے کر علامہ مجلسیؒ تک اور علامہ موصوف سے لے کر علامہ شیخ جعفر شوستریؒ تک اور ان کے بعد آج تک برابر تمام علمائے اعلام نے اس واقعۂ ہائلہ کو ہمیشہ اپنی اپنی توجہات خاصہ کا مرکز بنائے رکھا ہے اور اپنی تالیفات قیمہ سے اس کی افادیت کو چار چاند لگائے ہیں۔

اس طرح عربی وفارسی کا دامن تو واقعۂ کربلا پر لکھی گئی مستند کتب مقاتل سے لبریز نظر آتا ہے لیکن اردو زبان میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود اگر بنظر تحقیق دیکھا جائے تو غیر معتبر وغیر مستند کتب کے بالمقابل معتبر ومستند کتب کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں نظر آتی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے بعض غیر ذمہ دار واعظین وذاکرین نے بکاء وابکاء کے حرص، عوام الناس سے داد تحسین وآفرین حاصل کرنے کے شوق اور اپنے ہم پیشہ لوگوں سے گوئے سبقت لے جانے کے ذوق کی وجہ سے حقائق کو بالکل مسخ کرکے رکھ دیا بلکہ انہیں از خود واقعات اختراع پر آمادہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل واقعات کا حلیہ بگڑ گیا اور اصل حقائق رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے (الا ماشاء اللہ) جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اگر کوئی غیر جانبدار آدمی اردو میں لکھی ہوئی عام مجالس یا پنجابی میں لکھے ہوئے مجموعوں سے اصل حقیقت کا سراغ لگانا چاہے تو بالآخر تھک ہار کر یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ؎

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان میں اس موضوع میں بعض محققانہ انداز میں لکھی ہوئی کتب بھی موجود ہیں جیسے شہید انسانیت مجاہد اعظم وغیرہ مگر ان میں نقص یہ ہے کہ وہ اس انداز سے لکھی گئی ہیں کہ ایک واعظ یا ذاکر ان کو پیش نظر رکھ کر کامیاب مجلس نہیں پڑھ سکتا کیونکہ ان کے فاضل مصنفین کا یہ مطمع نظر ہی نہیں تھا۔

ان حالات کے پیش نظر، میں کافی عرصہ سے اس فکر میں تھا کہ اس موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب

ابنائے ملک وملت کے سامنے پیش کی جائے جس میں واقعات کربلا کو از ابتدا تا انتہا اپنے حقیقی خدوخال، اصلی آب و تاب اور واقعی شان وشکوہ کے ساتھ بیان کیا جائے اور اس سانحۂ کبریٰ کے تمام علل واسباب اور اس کے جملہ نتائج و آثار اور اس سے حاصل ہونے والے دروس اخلاق وغیرہ تمام متعلقہ مباحث کو بھی واضح وآشکار کیا جائے اور وہ بھی اس انداز سے کہ اہل منبر بغرض بکاء وابکاء انہیں منبر پہ بیان کر کے اپنی مجالس کو کامیاب بنا سکیں لیکن ہمیشہ دیگر مصروفیات کی کثرت اس نیک مقصد کے سامنے حائل وحاجب رہیں حتیٰ کہ جب گذشتہ سال ''المبلغ'' میں بالاقساط ایک مضمون بعنوان ''اصلاح المجالس والمحافل'' لکھنا شروع کیا (جس کا خلاصہ اسی کتاب کے ہمراہ بطور مقدمہ شامل اشاعت کیا جارہا ہے) جس میں مجالس ومحافل کی موجودہ روش ورفتار پر بھرپور مگر تعمیری تنقید کر کے اصلاح احوال کی سعی مشکور کی گئی ہے تو اس وقت سے بعض قومی حلقوں کی طرف سے اصرار ہوا کہ اس موضوع پر ایک تحقیقی کتاب قلمبند کروں۔ بہرحال اس بات نے میرے اشہب عزم وارادہ کے لیے مہیز کا کام کیا اور میں نے اتمام حجت کے لیے موانع وعوائق کی زنجیروں کو توڑ کر اس عظیم کام کی انجام دہی کا بیڑا اپنے نحیف کاندھوں پر اٹھاتے ہوئے آج شب یکم ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ، بمطابق شب ۴ دسمبر ۱۹۶۷ء کو واقعۂ کربلا پر ایک عظیم کتاب بنام ''سعادت الدارین فی مقتل الحسین'' لکھنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ **السعی منی و الاتمام من اللہ**۔ میں نے اس کتاب کی جمع وتالیف میں کس قدر تحقیق وتدقیق سے کام لیا ہے؟ کس قدر کتب ورق گردانی کی ہے؟ کس قدر تتبع وتفحص کیا ہے؟ کس قدر محنت وعرق ریزی کی ہے؟ اور پھر اپنے عظیم مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس امر کا اندازہ وفیصلہ قارئین کرام کے خداداد ذوق پر چھوڑا جاتا ہے کیونکہ

آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیان است

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل واقعۂ کربلا اور اس کے علل واسباب اور اس سانحۂ کبریٰ کے نتائج وآثار پیش کرنے سے پہلے سرکار سید الشہداء علیہ افضل التحیۃ والثناء کے چیدہ چیدہ حالات زندگی نیز ان کے فضائل وکمالات اور بعض معجزات ومحامد صفات کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تاکہ اس میں آنجناب کی مختصر سوانح عمری بھی آجائے اور اس طرح یہ کتاب بفضلہ تعالیٰ اپنے موضوع پر من جمیع الجہات کامل بلکہ اکمل ہو جائے **وما توفیقی الا باللہ**۔

دعا ہے کہ خلاق عالم بطفیل سرکار محمد وآل محمد علیہ وعلیہم السلام اس ناچیز کتاب کو شرف قبولیت بخش کر اسے میری دنیوی واخروی نجاح وفلاح کا سبب قرار دے اور ابنائے قوم وملت کو اس سے استفادہ کی توفیق عنایت فرمائے اس سے موجودہ جمود وخمود کی فضا ختم ہو اور قوم میں صحیح علمی مذاق پیدا ہو تاکہ وہ صحیح حقائق کا مطالعہ کر سکیں اور ہر قسم کے تعصب وتنگ نظری سے بالا ہو کر حق وحقیقت کی اتباع کریں اور اس طرح صادقین کے مذہب کی صداقت کو چار چاند

لگ جائیں اور دشمنانِ حسین و حسینیت اپنے ناپاک ارادوں میں خائب و خاسر ہوں۔ ﴿حتّٰی تعلو کلمة اللّٰه وهم کارهون﴾ اور انشاء اللہ ضرور ایسا ہوگا کیونکہ ﴿الحق یعلو ولا یعلٰی علیه. قَدْ جَآئَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ﴾۔

واناالاحقر محمد حسین عفی عنہ

من مقام دارالعلوم محمدیہ سرگودھا

غرۃ شہر رمضان ۱۳۸۷ھ

شب دوشنبہ ۴ دسمبر ۱۹۶۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لاهله و الصلوٰة علیٰ اهلها

﴿ پہلا باب ﴾

حضرت امام حسین علیہ السلام کی
ولادت باسعادت اور ابتدائی حالات
از ۴ھ تا ۱۱ھ

اگرچہ سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی تاریخ ولادت باسعادت کے سلسلہ میں ارباب تاریخ میں قدرے اختلاف ہے مگر امامیہ کے نزدیک مشہور و منصور قول یہ ہے کہ ہجرت نبویؐ کے چوتھے سال بروز پنج شنبہ بتاریخ پانچ شعبان المعظم مدینہ منورہ میں واقع ہوئی[1] [illegible]

امام حسین علیہ السلام کی طہارت

جناب صفیہ بنت عبد المطلب سے مروی ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت ہوئی اس وقت میں جناب سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی خدمت میں موجود تھی۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ﴿یا عمة هلمی الی ابنی فقلت یا رسول الله انا لم ننظفه بعد. فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أ انت تنظفینه ان الله قد نظفه و طهره﴾

پھوپھی جان! میرا بیٹا مجھے لا دو۔ میں نے عرض کیا ابھی تک ہم نے مولود کو پاک و صاف نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اسے پاک کرو گی؟ اسے تو خدائے قدوس نے پاک و پاکیزہ پیدا کیا ہے۔[3]

---

1. روضۃ الکافی ص ۲۶۰۔ ارشاد شیخ مفید ص ۲۰۹۔ روضۃ الواعظین نیشاپوری ص ۱۹۳۔ اصول کافی ج ۱ ص ۴۹۲۔ تاریخ ج ۲ ص ۲۔ عاشر بحار ص ۶۲۔ مناقب ج ۳ ص ۶۲ وغیرہ۔
2. فتحی الاول ج ۱ ص ۲۹۱ پر بعض علماء اعلام کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ کی ولادت آخر ربیع الاول میں ہوئی وهو لا یخلو من قوة من بعض الوجوه فتامل۔
3. امالی شیخ صدوق ص ۸۳، طبع قم۔ عاشر بحار ص ۹۹، الدمعۃ الساکبۃ ص ۲۶۱۔

جب شہزادہ کو آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے ان کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنے لعاب دہن سے گھٹی ڈالی۔[1]

اسم گرامی

بعض اخبار میں وارد ہے کہ جب آنجنابؑ کی ولادت ہوئی تو جناب سیدہؑ نے نام تجویز کرنے کے لیے مولود مسعود کو حضرت امیرؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ آنجنابؑ نے فرمایا: میں سرکار رسالت مآبؐ پر سبقت نہیں کر سکتا۔ جب آنحضرتؐ تشریف لائے تو آپؐ نے فرمایا: میں اپنے رب جلیل پر سبقت نہیں کر سکتا۔ اس اثناء میں جبرئیل امینؑ حاضر ہوئے اور تحفۂ درود و سلام کے بعد رب جلیل کا یہ پیام سنایا کہ ﴿ان علیاً منک بمنزلة هارون من موسٰی فسمه باسم ابن هارون﴾ چونکہ حضرت علیؑ کو آپؐ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی لہٰذا ان کے بیٹے والا نام رکھو۔ ان کا نام "شبیر" تھا۔ آپ عربی میں اس کا نام "حسین" رکھیں چنانچہ آنحضرتؐ نے اس مولود کا نام حسینؑ[2] رکھا۔ اس سے قبل جناب امام حسنؑ کی ولادت اور نام تجویز کرتے وقت بھی یہی صورت حال درپیش آئی تھی۔

عمران بن سلمان اور عمرو بن ثابت سے منقول ہے کہ ﴿الحسن و الحسين من اسامى الجنة ولم يكونا فى الدنيا﴾ حسنؑ و حسینؑ دونوں نام جنت کے ناموں میں سے ہیں۔ (شہزادگان کونین سے قبل) دنیا میں پہلے یہ نام کسی کے نہ تھے۔[3]

رسم عقیقہ

جناب امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ ﴿ان رسول الله صلى الله عليه واله عق عن الحسن بكبش و عن الحسين بكبش و اعطى القابلة شيئاً و حلق راسهما يوم سابعهما و وزن شعرهما فتصدق بوزنه فضةً﴾

جناب رسول خداؐ نے جناب امام حسنؑ کا ایک مینڈھے کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا اسی طرح امام حسینؑ کا عقیقہ بھی ایک مینڈھے کی قربانی کے ساتھ کیا اور دایہ کو بھی کچھ (چوتھا) حصہ دیا اور ساتویں روز ان کے بال منڈوا کر

---

1. لواعج الاشجان از آقای سید محسن امین عاملی، ص ۶۔
2. امالی شیخ صدوق، ص ۸۲، الدمعۃ الساکبۃ، ص ۲۶۳، عاشر بحار، ص ۶۷، ۶۸۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۔۔۔ ۹۴۴۔
3. الدمعۃ الساکبۃ، ص ۲۶۳، بحوالہ عوالم العلوم بحرانی۔

ان کے ہم وزن چاندی راہِ خدا میں خیرات کی۔[1]

تعلیم وتربیت

بعض آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ولادتِ امام حسینؑ کے وقت جناب سیدہ سلام اللہ علیہا علیل الطبع ہوگئی تھیں اس لیے آنجنابؑ کی کفالت حضرت ام سلمہؓ کے متعلق تھی۔ جناب رسول خدا ﷺ اپنا انگوٹھا مبارک یا زبان مبارک (باختلاف روایات) چسا چسا کر آنجنابؑ کی تربیت کرتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک طویل روایت کے ضمن میں مروی ہے ﴿و حملت ستة اشهر ثم وضعته ولم يعش مولود قط لستة اشهر غير الحسين بن على عليهما السلام و عيسى بن مريم فكفلته ام سلمة و كان رسول الله صلى الله عليه واٰله ياتيه كل يوم فيضع لسانه فى فم الحسينؑ فيمصّه حتّٰى يروى فانبت الله لحمهٗ من لحم رسول الله صلى الله عليه واٰله ولم يرضع من فاطمة عليها السلام ولا من غيرها لبناً قط...... الخ﴾

یعنی جناب سیدہ سلام اللہ علیہا اس مولودِ مسعود کے ساتھ چھ ماہ تک حاملہ رہیں۔ اس کے بعد آنجنابؑ کی ولادت ہوئی اور سوائے آنجنابؑ اور حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ (دوسری بعض روایات میں بجائے عیسیٰؑ کے یحییٰؑ بن زکریا مذکور ہیں) کے چھ ماہ کا اور کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ ان کی کفالت جناب ام سلمہؓ کے متعلق تھی۔ جناب رسول خدا ﷺ ہر روز شہزادہ کے پاس تشریف لاتے اور اپنی زبانِ مبارک ان کے دہن اقدس میں دے دیتے اور وہ اس قدر چوستے کہ سیر ہو جاتے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ شہزادہ کا گوشت و پوست آنحضرتؐ کے گوشت و پوست سے اُگ آیا اور شہزادہ کونین نے جناب سیدہؑ یا کسی اور عورت کا دودھ مطلقاً نہیں پیا۔[2] اس مولودِ مسعود کی طہارت و پاکیزگی اور خلق و مروت کا کیا کہنا جس کی نشوونما لعابِ رسولؐ چوس چوس کر ہوئی ہو ۔

لله مرتضع لم يرتضع ابداً　　　من ثدى انثىٰ ومن طٰه مراضعهٗ

جناب صفیہؓ کا بیان ہے کہ جب میں نے ولادت کے بعد شہزادہ کو جناب رسول خدا ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور آپؐ نے ان کو زبان مبارک چسانا شروع کی تو ﴿فما كنت احسب رسول الله يغذوه الا لبناً او عسلاً﴾ میں یہ خیال کرتی تھی کہ آنحضرتؐ شہزادہ کو دودھ یا شہد پلا رہے ہیں۔[3]

---

[1] عاشر بحار، ص ۷۲۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۶۳۔ ارشاد شیخ مفید، ج ۲، ص ۱۱۔

[2] الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۶۱ بحوالہ علل الشرائع شیخ صدوقؒ۔ کذا فی الکافی ص ۲۵۳ طبع ایران۔

[3] امالی الشیخ صدوقؒ، ص ۸۳۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۶۳۔ عاشر بحار، ص ۹۹۔

ولادتِ امامؑ پر زینتِ جنان وخمود نیران

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس روز اس مولود مسعود کی ولادت ہوئی خداوند عالم نے مالک داروغۂ جہنم کو حکم دیا کہ اس مولود کی کرامت میں آتش جہنم کو آج خاموش کر دو اور رضوان جنت کو حکم دیا کہ جنت کی آرائش کو دوبالا کر دو۔ حور العین کو حکم دیا کہ اپنی آرائش جمال میں اضافہ کرو اور فرشتوں کو حکم دیا کہ مزید تسبیح و تقدیس کرو۔[1]

ملائکہ کی مبارکبادی

بعض اخبار و آثار سے یہ بھی واضح و آشکار ہوتا ہے کہ اس مولود مسعود کی ولادت کے وقت جبرئیل امین علیہ السلام نے پروردگار عالم کے حکم سے بہت سے ملائکہ کی ہمراہی میں سرور عالم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ہدیہ مبارکباد پیش کیا۔ بعض آثار سے ان کی تعداد ایک ہزار[2] اور بعض سے چار ہزار اور بعض سے اس سے بھی زیادہ ظاہر ہوتی ہے بہر حال اس قدر تو واضح ہے کہ انا اعطینک الکوثر کی دوسری عملی تفسیر کے ظہور کے وقت ملائکہ مقربین نے نیابت ایزدی میں بارگاہ رسالتؐ میں ہدیہ تبریک پیش کیا۔ اسی طرح بعض آثار سے اس مولودِ مسعود کی برکت سے بعض ملائکہ کے ترک اولیٰ کا معاف ہونا بھی مستفاد ہوتا ہے۔[3] فتدبر

مالی اذا وضع الحساب وسیلة ۔۔۔ انجو بها من حرّ نار موقد

الا اعترافی بالذنوب واننی ۔۔۔ متمسک بولاء آل محمد

ولادتِ امامؑ کے وقت گریۂ رسولؐ مقبول

بعض اخبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ [illegible] تعزیت کے ساتھ ساتھ سید الشہداء [illegible] پر وارد ہونے والے مصائب و شدائد پر تعزیت مسعود بھی ادا کی تھی جس پر جناب رسول خدا ﷺ روئے اور فرمایا: اتقتله امتی قال نعم یا محمدؐ فقال النبیؐ ما هؤلاء بامتی انا بریٔ منهم و الله عزّوجل بریٔ منهم فقال جبرئیل و انا بریٔ منهم ﴿کیا اسے میری امت قتل کرے گی؟ جبرئیل نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ لوگ میری امت سے نہیں ہوں گے۔ میں ان سے بری و بیزار ہوں اور خدا بھی ان سے بیزار ہے۔ جبرئیل نے کہا اور میں بھی ان سے بیزار ہوں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ جناب سیدہ کے پاس تشریف لے گئے ﴿فهناها و عزاها فبکت فاطمةؑ﴾ اور اس مولود مسعود کی مبارکباد پیش کی اور تعزیت بھی ادا فرمائی جس پر جناب سیدہ

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۷۵۔

[2] امالی شیخ صدوق ص ۸۴۔

[3] حاشیہ بحار ص ۹۹، ۷۰۔ والدمعة الساکبہ ص ۲۶۲ وغیرہ۔

رونے لگیں۔[1]

ایک روایت میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ نے روتے ہوئے تین بار فرمایا: ﴿لعن اللہ قوما هم قاتلوک یا بنی﴾ اے بیٹا خدا اس قوم پر لعنت کرے جو تجھے قتل کرے گی۔[2]

اترجوا امة قتلت حسینا — شفاعة جده یوم الحساب

فلا واللہ لیس لهم شفیع — وهم یوم القیامة فی العذاب

اللهم العن قتلة الحسینؑ و اصحابه و اله۔

جس مظلوم پر جناب رسول اکرم ﷺ نے قبل شہادت بلکہ بوقت ولادت گریہ وبکا کیا ہو بعد از شہادت اس کی مظلومیت پر اہل ایمان کیوں اشک غم نہ بہائیں ؎

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

شمائل نبویہ کی تقسیم

اصول کافی میں مرقوم ہے کہ ﴿ان فاطمة علیها السلام اتت بالحسن و الحسین علیهما السلام الی رسول اللہ صلی اللہ علیه و اله و قالت انحل ابنی هذین یا رسول اللہ و فی روایة هذان ابناک فورثهما شیئاً فقال اما الحسن فله هیبتی و سؤددی و اما الحسین فان له جرأتی و جودی﴾ جناب سیدہؑ ایک مرتبہ اپنے دونوں شہزادوں کو بارگاہ نبویؐ میں لائیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ان لڑکوں کو کچھ عطا فرمائیے۔ دوسری روایت کے مطابق یوں عرض کیا یا رسول اللہ! یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں انہیں کچھ (فضل و کمال کا) اظہار و اثبات عطا فرمائیے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا میری ہیبت و سرداری حسنؑ کے لیے ہے اور میری جرأت، دلیری اور سخاوت حسینؑ کے لیے ہے۔[3] [illegible]

سر داد و نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؑ

محبت رسول ثقلین با امام حسینؑ

جناب رسول خدا ﷺ کو اپنے نواسوں بالخصوص اس سبط اصغر سے جو الفت و محبت تھی وہ عیاں راچہ بیان کی مصداق ہے۔ آنحضرتؐ کی خلوت ہو یا جلوت اور بحالت فرصت ہو یا مشغولیت۔ ہنگام وعظ و نصیحت ہو یا اوقات

---

[1] الدمعة الساکبة ص ۲۹۳۔ عاشر بحار ص ۶۹۔

[2] امالی شیخ صدوقؒ ص ۸۳۔

[3] الدمعة الساکبة ص ۲۶۱۔

عبادت واطاعت غرضیکہ ہر حال میں ان کی محبت ومودت کے تذکرے اور عملی مظاہرے جاری رہتے تھے۔ تمام امت کو بھی ہر وقت ان کی محبت ومودت کی تاکید فرماتے تھے۔

کبھی اس محبت کا یوں اظہار فرماتے ﴿الحسن و الحسین ریحانتانی من الدنیا﴾ حسنؑ وحسینؑ دنیا میں میرے دو پھول ہیں[1] کبھی فرماتے ﴿اللّٰھم انی احب حسیناً فاحب من احب حسیناً﴾ بارالٰہا میں حسینؑ سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس شخص سے محبت کر جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔[2] کبھی یوں فرماتے ﴿الحسین منی و انا من الحسین﴾ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔[3] یعنی میرا نام اور کام حسینؑ کی وجہ سے باقی رہے گا۔

کبھی اس طرح فرماتے ﴿من احب الحسن و الحسین فقد احبنی و من ابغضھما فقد ابغضنی﴾ جس شخص نے ان دونوں شہزادوں سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی اس نے مجھ سے دشمنی کی۔[4]

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ جناب سیدہؑ کے گھر کے پاس سے گزرے۔ اندر سے حسینؑ کے رونے کی آواز آئی۔ آنحضرت تشریف لے گئے اور جناب سیدہؑ سے فرمایا: ﴿الم تعلمی ان بکائہ یوذینی﴾ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حسینؑ کے رونے سے مجھے اذیت ہوتی ہے۔[5] نہ معلوم اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے قلب وجگر میں کی کیفیت ہوئی ہوگی جب یہی حسینؑ میدان کربلا میں سب اعزا وانصار راہ حق میں قربان کرنے کے بعد یکا وتنہا رہ گئے تھے اور آواز استغاثہ بلند کر رہے تھے اور خیام حسینی سے آواز گریہ وبکا بلند ہو رہی تھی جس سے امام کا جگر شق ہو رہا تھا۔

یہ بھی متعدد احادیث میں وارد ہے کہ جب آنحضرت ﷺ بحالت نماز سجدہ میں جاتے تو شہزادے ان کی پشت مبارک پر سوار ہو جاتے اور آنحضرت سجدہ کو طویل کر دیتے۔[6]

رسولؐ خدا کا اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنے نواسہ حسینؑ پر قربان کرنا

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تمام خونی رشتوں میں انسان کو اولاد سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے نواسہ حسین علیہ السلام سے جو محبت تھی اس کی معراج کمال کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنے عزیز بیٹے ابراہیم کو اپنے نواسے پر قربان کر دیا چنانچہ ابن عباس بیان کرتے ہیں: كنت عند النبي و علی فخذہ الایسر

---

[1] عاشر بحار، ص ۷۹۔

[2] مشکوٰۃ المصابیح، ص ۵۷۲، طبع مجتبائی دہلی۔

[3] سنن ترمذی، صفحہ ۶۲۲۔

[4] سنن ابن ماجہ، ج ۱، ص ۳۳۔ عاشر بحار، ص ۸۵۔

[5] نفس المہموم، ص ۱۱، ۱۲۔ عاشر بحار، ص ۸۲۔

[6] عاشر بحار، ص ۸۲۔ و نفس المہموم، ص ۱۲۔

ابنه ابراهيم و علي فخذه الايمن الحسين بن علي عليهما السلام و هو تارة يقبل هذا و تارة هذا اذ هبط جبرئيل بوحي من رب العالمين فلما سرّي عنه قالَ اتاني جبرئيل من ربّي فقال يا محمدً ان ربك يقرئك السلام و يقول لست اجمعهما فافد احدهما بصاحبه فنظر النبيّ الى ابراهيم فبكى فقال ان ابراهيم ان امه امة و متى مات لم يحزن عليه غيري و ام الحسينؑ فاطمة و ابوه عليؑ ابن عمي لحمي و دمي و متى مات حزنت ابنتي و حزن ابن عمي و حزنت انا عليه و انا اوثر حزني على حزنهما يا جبرئيل فاقبض ابراهيم فدية بالحسينؑ قال فقبض بعد ثلاث فكان النبيّ اذا رأى الحسين عليه السلام مقبلاً قبله و ضمّه الى صدره و رشف ثناياه و قال فديت من فديته بابني ابراهيمؑ

ﷺ بارگاہ رسالتؐ میں موجود تھا۔ آنحضرت کا فرزند ابراہیم آپ کی بائیں ران پر اور نواسہ حسینؑ دائیں ران پر بیٹھا تھا۔ آپ کبھی اسے بوسہ دیتے اور کبھی اسے۔ اسی اثنا میں جناب جبرئیل پروردگار عالم کی وحی لے کر نازل ہوئے۔ جب آنحضرت کی حالت وحی ختم ہوئی تو ارشاد فرمایا: ابھی ابھی میرے پاس جبرئیلؑ میرے پروردگار کا یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ خدا تحفۂ درود و سلام کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ میں ان دونوں کو زندہ رکھنا نہیں چاہتا لہٰذا ایک کو دوسرے پر قربان کیجئے اس کے بعد آنحضرتؐ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی طرف دیکھا اور رو کر فرمایا: ابراہیم کی ماں کنیز ہے اگر یہ مر گیا تو اس پر مجھے ہی حزن و ملال ہوگا لیکن حسینؑ کی ماں فاطمہؑ اور باپ علیؑ ہے جو میرا ابن عم زادہ اور میرا گوشت و پوست ہے لہٰذا حسینؑ کی موت پر میری بیٹی، میرا ابن عم اور میں خود سب سوگوار ہوں گے اس لیے میں تنہا اپنے حزن کو ان دونوں کے رنج و الم پر ترجیح دیتا ہوں پھر جبرئیل کو خطاب کر کے فرمایا: جبرئیل! میں ابراہیم کو حسینؑ پر قربان کرتا ہوں چنانچہ تین دن کے بعد ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد آنحضرت کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب بھی حسینؑ کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھتے تو ان کے پیار کرتے، چومتے، سینے سے لگاتے اور فرماتے میں اس پر نثار جس پر میں نے اپنے بیٹے ابراہیم کو قربان کر دیا ہے۔[1]

آنحضرت ﷺ اپنے اس پارۂ جگر کو اس طرح پیار کرتے تھے اور اس کو خوش کرتے تھے کہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے قدم مبارک پر کھڑا کرتے تھے اور ان سے فرماتے کہ اے میری آنکھوں کی روشنی آگے بڑھ۔ پس وہ بچہ آپ کے روئے مبارک کے قریب ہو جاتا تھا تو آپ ان کو اپنی چھاتی سے لگا لیتے تھے اور ان کی آنکھوں کو اور منہ کو چوم لیتے تھے اور ان کی فرطِ محبت میں، اپنے پروردگار سے عرض کرتے کہ پروردگار! میں اس کو دوست رکھتا ہوں تو بھی اسے دوست رکھ اور اسے بھی دوست رکھ جو اسے دوست رکھے۔[2]

۱۔ الدمعۃ الساکبہ، ج ۳، ص ۲۶۲؛ نفس المہموم، ص ۱۳-۱۲۔ ۲۔ ذبح عظیم، ص ۹-۱۰، بحوالہ عاشر بحار، تاریخ التواریخ وغیرہ۔

ارباب عقل و دانش جانتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی یہ شدید محبت محض خونی رشتہ کی بنا پر نہ تھی بلکہ یہ اس شہزادہ کے خداداد فضائل و کمالات اور مراتب و محامد صفات کا نتیجہ تھی جس کا وہ اپنے قول کے علاوہ عمل سے بھی ہر وقت و ہر حال میں برابر اظہار کرتے رہتے تھے۔

افسوس کہ امام حسین علیہ السلام کے لیے اس لطف و محبت اور اس بے پایاں سکون اور اطمینان کی عمر طولانی نہیں ہو سکی۔ ابھی آپ کا سن سات برس کا بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ربیع الاول ۱۱ھ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات واقع ہوگئی اور حسینؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔[1]

تمام اہل اسلام پر محبت حسینؑ واجب ہے

اس بات پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ کی محبت اور اتباع ہر کلمہ گو پر واجب و متحتم ہے چنانچہ ارشاد قدرت ہے: ﴿وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ تمہارے لیے رسولؐ کا کردار نمونہ عمل ہے۔ نیز ارشاد رب العباد ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ خدا تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔ نیز آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: ﴿لا یومن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من نفسہ و مالہ و ولدہ و والدہ و الناس اجمعین﴾ کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کی جان، مال، اولاد، والد اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہوں۔[2]

اب جس سے یہ واجب الحب محبوبؐ محبت کرے اس کی محبت و مودت کیونکر واجب نہ ہوگی؟ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ ﴿من کان یحبنی فلیحب ابنی ھذین فان اللّٰہ امرنی بحبھما﴾ جو شخص بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اسے چاہیے کہ وہ میرے ان دونوں بیٹوں سے بھی محبت کرے کیونکہ خلاق عالم نے مجھے ان کی محبت کا حکم دیا ہے۔[3]

نیز بعض روایات میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿من احب الحسنؑ و الحسینؑ احببتہ و من احببتہ احبہ اللّٰہ و من احبہ اللّٰہ ادخلہ الجنۃ و من ابغضھما ابغضتہ و من ابغضتہ ابغضہ اللّٰہ و من ابغضہ اللّٰہ ادخلہ النار﴾ جو شخص حسنؑ و حسینؑ سے محبت رکھے گا اس سے میں محبت رکھوں گا اور جس سے میں محبت رکھوں گا اس سے خدا محبت رکھے گا اور جس سے خدا محبت رکھے گا وہ اسے ضرور داخل جنت کرے گا اور جو شخص ان سے

---

[1] شہید انسانیت، ص ۹۵۔

[2] تفسیر در منثور، ج ۳، ص ۲۲۳۔

[3] عاشر بحار الانوار، ص ۷۵۔ ایضاً ص ۷۹ بحوالہ حلیۃ الاولیاء۔

دشمنی کرے گا اس سے میں دشمنی رکھوں گا اور جس سے میں دشمنی رکھوں گا اس سے خدا دشمنی رکھے گا اور جس سے خدا دشمنی رکھے گا اسے ضرور داخل جہنم کرے گا۔[1]

جب بالاختصار سطور بالا میں یہ ثابت کر دیا گیا کہ آنحضرت کو اپنے اہل بیتؑ سے بالعموم اور سرکار سید الشہداؑ سے بالخصوص انتہائی الفت ومحبت تھی تو اب ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس سرکار سے محبت ومودت کرنا اپنا دینی وایمانی فریضہ قرار دے اور یہی آیت مودت کا مفاد ہے: ﴿قُلْ لَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (سورہ شوریٰ، آیت ۲۳) میں تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں تم سے کوئی مزدوری طلب نہیں کرتا ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو، فریقین کی کتب تفسیر میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے آنحضرت سے دریافت کیا ﴿من قرابتک الذین وجبت علینا محبتھم. قال: ھم فاطمۃ و علیؑ و ابناھما﴾ وہ آپ کے قرابتدار کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب قرار دی گئی ہے؟ فرمایا: وہ فاطمہ، علی اور ان کے دونوں بیٹے ہیں۔[2]

جناب شافعی نے کیا خوب کہا ہے ؎

يا اهل بيت رسول الله حبكم فرض من الله فى القران انزله

كفاكم من عظيم القدر انكم من لم يصل عليكم لا صلوة له[3]

علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر (ج ۷، ص ۴۰۶) پر آیہ مودت اور اس کی تفسیر لکھنے کے بعد بطور فیصلہ تحریر فرماتے ہیں: ﴿فكل ذلک يدل على ان حب ال محمد واجب﴾ سب آیات وروایات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آل محمد کی محبت واجب ہے۔ اسی طرح نواب صدیق حسن خاں اپنی کتاب ''الدین الخالص، ج ۲ ص ۲۸۵ پر حدیث نبویؐ ﴿احبوا اهل بيتى لحبى﴾ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ﴿و يدل له القران قل لا اسئلكم عليه اجرا ..... و هذه المحبة لهم واجبة متحتمة على كل فرد من افراد الامة﴾ ''ہر فرد امت پر ان ذوات مقدسہ کی محبت واجب ہے۔''

---

[1] ارشاد شیخ مفیدؒ، ج ۲، ص ۱۳۔

[2] تفسیر بیضاوی، ص ۳۷۸، طبع ایران۔ صواعق محرقہ، ص ۱۳۶، طبع جدید۔ کشاف، ج ۳، ص ۴۰۲۔

[3] صواعق محرقہ، ص ۱۳۶، طبع جدید۔

حضرت امام حسینؑ کے
نسبی خصوصیات اور خاندانی روایات

ارباب بصیرت پر یہ حقیقت مخفی و محجوب نہیں ہے کہ انسانی رفعت و عظمت میں جہاں اس کے ذاتی صفات اور خصائل و شمائل کا بڑا حصہ ہے وہاں نسبی خصوصیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ توارث صفات کا مسئلہ آج کل مسلم الثبوت ہو چکا ہے یعنی یہ کہ اخلاق و کردار کی تشکیل میں خاندانی روایات اور موروثی صفات کو بھی بہت دخل ہے۔ حسینؑ کے ذاتی فضائل و کمالات اور محامد صفات کا تذکرہ تیسرے باب میں آ رہا ہے انشاء اللہ۔ یہاں صرف ان کے بعض خاندانی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حسینؑ خاندانی لحاظ سے اس آسمان رفعت و شرف پر فائز ہیں کہ جہاں تک طائر عقل بھی پرواز کر کے نہیں پہنچ سکتا۔ کتب فریقین میں یہ ارشاد نبویؐ مرقوم ہے کہ خلاق عالم نے تمام اقوام عالم میں سے قریش کو اور پھر قریش سے بنی کنانہ کو اور پھر بنی کنانہ میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منتخب کیا ہے[1] ظاہر ہے کہ جناب امام حسینؑ اسی شجرۂ طیبہ کی عظیم شاخ اور اسی دوحۂ مبارکہ کے گل سرسبد ہیں۔ والد ہیں تو سید الاولیاءؑ، والدہ ہیں تو سیدۃ النساء، نانا ہیں تو سید الانبیاء، دادا ہیں تو سید البطحاء اور بھائی ہیں تو سید شباب اہل الجنۃ۔ بالفاظ دیگر باپ ہے تو نفس رسولؐ۔ ماں ہے تو بتولؑ اور بضعۃ الرسولؐ۔ انہی دو عظیم المرتبت ماں باپ کے بیٹے ہیں حسینؑ **مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان**۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

پاس ادب مانع ہے ورنہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ نسبی طور پر حسینؑ کو جو شرف حاصل ہے وہ ان کے آباء و اجداد میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے اور یہ وہ شرف ہے جس پر خود سرکار سید الشہداءؑ نے بھی افتخار فرمایا ہے جیسا کہ بعض آثار و اخبار سے واضح و آشکار ہوتا ہے۔

---

[1] صواعق محرقہ، ص ۱۸۶، ۱۸۷، طبع جدید وغیرہ۔

شہزادۂ کونینؑ کا حضرتِ امیرؑ کے ساتھ مفاخرہ

ایک طویل روایت میں وارد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وفاتِ رسولؐ سے کچھ دن پہلے ایک بار حضرت امیرؑ سرکار رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں شہزادۂ کونین حضرت امام حسینؑ تشریف لائے جناب رسول خدا ﷺ نے شہزادہ کو اپنی گود میں بٹھایا اور ان کے ہونٹوں اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ حضرت امیرؑ نے عرض کیا: ﴿یا رسول اللّٰہ اتحب ولدی الحسینؑ﴾ کیا آپ میرے فرزند حسینؑ سے محبت رکھتے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿کیف لا احبہ وھو عضو من اعضائی﴾ بھلا میں کیونکر اس سے محبت نہ کروں حالانکہ یہ میرے اعضاء میں سے ایک عضو ہے۔ پھر جناب امیرؑ نے عرض کیا: ﴿اینا احب الیک انا ام الحسینؑ﴾ ہم دونوں میں سے آپ کو زیادہ محبت کس سے ہے مجھ سے یا حسینؑ سے! یہ سن کر شہزادہ بولا اور عرض کیا: ﴿نعم یا ابتاہ من کان اعلیٰ شرفاً کان احب الی النبیؐ و اقرب الیہ منزلۃً﴾ ہاں بابا جان! ہم میں سے جس کا (خاندانی) شرف زیادہ ہوگا وہی رسول کو زیادہ محبوب ہوگا۔ بیٹے کا یہ کلام سن کر حضرت امیرؑ نے فرمایا: ﴿اتفاخر من یا حسینؑ﴾ بیٹا حسینؑ کچھ خبر بھی ہے یہ فخر و مباہات کس سے کر رہے ہو؟ شہزادہ نے عرض کیا: ﴿نعم ابتاہ ان شئت؟﴾ ہاں بابا جان مجھے معلوم ہے۔ اگر خیال ہو تو بسم اللہ! اس وقت جناب امیر المومنینؑ نے اپنے فضائل و کمالات کا ایک شمہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿یا حسین انا امیر المؤمنین. و لسان الصادقین. انا وزیر المصطفیٰؐ. انا خازن علم اللّٰہ انا قائد السابقین الی الجنۃ. انا الذی عمہ سید الشہداء فی الجنۃ انا الذی اخوہ جعفر الطیار فی الجنۃ انا حبل اللّٰہ المتین. انا لسان اللّٰہ الناطق. انا حجۃ اللّٰہ علی خلقہ. انا باب اللّٰہ الذی یؤتی منہ. انا بیت اللّٰہ الذی من دخلہ کان امناً. فمن تمسک بولایتی و محبتی امن من النار. انا قاتل الناکثین و القاسطین و المارقین. انا ابو الیتامیٰ. انا کھف الارامل. انا عم یتسائلون عن ولایتی یوم القیامۃ. انا النبأ العظیم. انا الذی اکمل اللّٰہ بہ الدین یوم غدیر. انا ابو الائمۃ الطاھرین. ان الذی تصدق بالخاتم. انا الذی نمت علی فراش النبیؐ و فدیتہ بنفسی من المشرکین. انا ترجمان اللّٰہ انا خازن علم اللّٰہ..... انا قسیم الجنۃ و النار﴾ ”اے حسینؑ! میں مؤمنوں کا امیر، صادقین کی زبان، وزیرِ مصطفیٰؐ، خازن علم خدا اور سابقین الی الجنۃ کا قائد ہوں۔ میں وہ ہوں جس کا چچا (حضرت حمزہ) سید الشہداء جنت میں ہے۔ میں وہ ہوں جس کا بھائی جعفر طیار بھی جنت میں ہے۔ میں خدا کی حبل متین، میں خدا کی لسان ناطق، میں خلق خدا پر اس کی حجت، میں خدا تک پہنچنے کا دروازہ، میں خدا کا وہ گھر ہوں کہ جو اس میں داخل ہو جائے (عذاب الٰہی سے) مامون ہو جاتا ہے جو شخص میری ولایت و محبت کے دامن کے ساتھ

متمسک ہوگا آتش جہنم سے محفوظ رہے گا۔ میں بیعت توڑنے والوں (اصحاب جمل) حق سے منہ موڑنے والوں (اصحاب صفین) اور دین سے خارج ہونے والے (اصحاب نہروان) سے جہاد کرنے والا ہوں۔ میں یتیموں کا سرپرست، میں بیواؤں کا ملجاء ہوں میں وہ ہوں جس کی ولایت کا قیامت کے دن لوگوں سے سوال ہوگا، میں نباء عظیم (بڑی خبر) ہوں میں وہ ہوں جس کے ذریعہ خدا نے بروز غدیر خم اپنے دین کو کامل کیا تھا۔ میں ائمہ طاہرین ﷺ کا والد ہوں میں وہ ہوں جس نے (حالت رکوع میں) انگوٹھی راہ خدا میں دی۔ میں وہ ہوں جس نے (شب ہجرت) بستر رسولؐ پر سو کر اپنی جان نثاری کا ثبوت دیا۔ میں خدا کا ترجمان، میں علم خدا کا خازن اور میں قسیم جنت و نار ہوں۔"

یہ فرما کر حضرت امیرؑ خاموش ہوگئے۔ جناب رسول خدا ﷺ نے شہزادہ کو خطاب کرکے فرمایا:

﴿اسمعت یا ابا عبد اللہ ما قال ابوک وھو عشر عشیر معشار مالہ من فضائلہ وھو فوق ذلک و اعلی﴾ اے ابوعبداللہ! جو کچھ آپ کے والد ماجد نے بیان کیا ہے تم نے اسے سنا ہے۔ یاد رکھو یہ ان کے فضائل و کمالات کا عشر عشیر بھی نہیں ہے وہ اس سے بھی بہت اجل و اعلیٰ ہیں۔ شہزادہ نے یہ سن کر فرمایا: ﴿الحمد للہ الذی فضلنا علی کثیر من عبادہ المؤمنین و علی جمیع المخلوقین و خصّ جدنا بالتنزیل و التاویل و الصدق و مناجاۃ الامین جبرئیل و جعلنا خیار من اصطفاہ الجلیل و رفعنا علی الخلق اجمعین اما ما ذکرت یا امیر المؤمنین فانت فیہ صادق امین﴾ اس خدا کا حمد و شکر ہے جس نے ہمیں اہل ایمان اور تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے اور ہمارے جد نامدار کو تنزیل و تاویل اور جبرئیل امین کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور ہمیں اپنی تمام برگزیدہ مخلوق میں سے افضل قرار دے کر اپنی تمام مخلوق پر رفعت و بلندی عطا فرمائی ہے۔ یا امیر المؤمنینؑ! آپ نے اپنے متعلق جو کچھ بیان فرمایا ہے آپ اس میں صادق القول ہیں۔ جناب رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ﴿اذکر انت یا حسینؑ فضائلک﴾ اے حسینؑ! تم بھی تو اپنے فضائل بیان کرو۔ تب شہزادہ گویا ہوئے۔ ﴿یا ابت انا الحسینؑ بن علیؑ و امی فاطمۃ الزہراؑ سیدۃ نساء العالمین و جدی محمدؐ ن المصطفیٰ سید بنی ادم اجمعین لا ریب فیہ یا علیؑ امی افضل من امک عند اللہ و عند الناس اجمعین و جدی خیر من جدک و افضل عند اللہ و عند الناس اجمعین و انا فی المہد ناغانی جبرئیل و تلقانی اسرافیل یا علیؑ انت عند اللہ افضل و انا الفخر بالاباء و الامہات و الاجداد﴾ اے بابا بزرگوار! میں حسینؑ ہوں جو اس علیؑ ابن ابی طالب کا بیٹا ہے (جس کے فضائل آپ نے خود بیان فرمائے ہیں) میری ماں وہ فاطمہ زہراؑ ہیں جو تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔ اور میرے نانا محمدؐ مصطفیٰ ہیں جو بلا شک تمام بنی آدم کے سردار ہیں۔ بابا جان! میری مادر گرامی خدا اور تمام خلق کے نزدیک آپ کی والدہ سے افضل ہیں

اور میرے نانا بزرگوار خدا و خلق کے نزدیک آپ کے نانا سے افضل ہیں۔ (والد تو افضل ہیں ہی) اور میں وہ ہوں جس سے جھولے میں جبرئیل نے باتیں کیں۔ اور اسرافیل نے ملاقات کی۔ بابا جان! آپ خدا کے نزدیک یقیناً مجھ سے افضل ہیں لیکن جہاں تک آباء واجداد کے ساتھ فخر ومباہات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مجھے زیادہ فخر حاصل ہے۔ یہ کہہ کر بابا کے گلے میں لپٹ گئے۔

جناب امیر علیہ السلام نے دست شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا: ﴿زادک اللہ شرفاً و فخراً و علماً و حلماً و لعن اللہ ظالمیک یا ابا عبد اللہ﴾ بیٹا خدا تمہارے شرف وفخر اور علم وحلم میں اضافہ فرمائے اور تم پر ظلم کرنے والے ظالموں پر لعنت کرے اس کے بعد شہزادہ اپنے نانا کی گود میں چلے گئے۔[1]

مولا! ترا حسینؑ بھی کچھ تجھ سے کم نہیں ۔۔۔ تجھ سے کروں موازنہ مجھ میں یہ دم نہیں

(رشک ترابی)

ظاہر ہے کہ یہ مفاخرہ صرف لوگوں پر اظہار حقیقت کی خاطر تھا ورنہ خود ان بزرگواروں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف وافتراق نہ تھا ﴿اھل البیت ادری بما فی البیت﴾

بہر حال صاحبان عقل سمجھ سکتے ہیں کہ قطع نظر خصوصیات امامت کے جو مولود مسعود ایسے والدین کا چشم و چراغ ہو اور جس نے ایسے عالی خانوادہ میں نشوونما پائی ہو وہ کس قدر بلند اخلاق، نیک کردار اور انسانی کمالات کا شاہکار ہوگا۔

مکونی بیان عنہا و کلام

قاضی محمد بہلول زنگہ زوری آفندی نے کیا خوب لکھا ہے:

﴿ھمیں کافی است کہ چشم روزگار مثل علیؑ بن ابی طالب پدرے و فاطمہؑ مادرے و مانند حسینؑ بن علیؑ ذات باشرافت پسرے ندیدہ است﴾[2] یعنی چشم وفلک نے علیؑ بن ابی طالبؑ جیسا باپ، فاطمہ زہراؑ جیسی ماں اور حسینؑ جیسا شریف ونجیب بیٹا نہیں دیکھا۔''

آپ خود امام ہیں۔ امام کے بیٹے ہیں۔ امامؑ کے بھائی ہیں اور قیامت تک آنے والے ائمہ برحق علیہم السلام کے باپ ہیں۔ کون ہے جو حسینؑ کا مثل ہو؟ ﴿ھذا حسین فاعرفوہ﴾ یہ ہیں حسینؑ! ان کو پہچان لو۔

مع حسینؑ کا جواب لا حسینؑ کا جواب دے

---

1. العترۃ من بحار مناقب العترۃ، طبع نجف، ص ۱۷۵ تا ص ۱۷۸۔
2. تشریح ومحاکمہ تاریخ آل محمدؐ ص ۱۱۹۔

﴿ تیسرا باب ﴾

حضرت امام حسین علیہ السلام کے حسبی کمالات
یعنی
ان کے ذاتی اخلاق واطوار اور نفسانی فضائل ومناقب

ارباب دانش وبینش جانتے ہیں کہ کسی بھی انسان کی حقیقی عظمت وجلالت اس کے ذاتی اخلاق واطوار اور نفسانی فضائل وکمالات سے واضح وآشکار ہوتی ہے یہی چیز جوہر انسانیت ہے۔ کما قیل

ے اقبل علی النفس و استکمل فضائلها فانت بالنفس لا بالجسم انسان

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اپنی بعثت کا مقصد اقصیٰ ہی مکارم اخلاق کی تکمیل قرار دیا ہے کہ ﴿انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق﴾ غرضیکہ جو کام (بنابر مشہور) ایک کم ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ومرسلین مکمل نہ کر سکے آپ نے اس کو اس درجہ پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا کہ اب کسی نبی ورسول کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ جناب سرور انبیاء خلق عظیم پر فائز تھے۔ اس کی تکمیل کی صورت اسی وقت ہو سکتی تھی جبکہ اس کی بقا کا بندوبست ہو ورنہ جس طرح اور انبیاء کی تعلیم وقتی رہی یہ بھی وقتی رہتی اور بقا بغیر تولید مثل محال ہے لہٰذا حضورؐ نے سب سے پہلے اسی طرف توجہ فرمائی اور اپنی زندگی میں چار نفس (علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ) ایسے بنا دیئے جو ہو بہو ایسے ہی تھے جیسے نفس رسولؐ۔ محاسن اخلاق میں کوئی فضیلت ایسی نہ تھی جو رسولؐ میں ہو اور ان میں نہ ہو جس طرح ہر ہر فضیلت کو عملاً رسولؐ نے دکھایا انہوں نے بھی دکھایا۔ یہ قدرت کی طرف سے تکمیل اخلاق کا ایک مکمل بندوبست تھا کہ اس نے بارہ معصوم ہستیاں ایسی خلق فرمائیں جن کو سرور انبیاء کی نیابت کا فخر یکے بعد دیگرے حاصل رہا اور جو اخلاق محمدی کا نمونہ ہر زمانے میں پیش کرتے رہے اور جو جو نفسانی کمالات رسولؐ میں تھے۔ وہ سب بے کم وکاست نمایاں کرتے رہے جس طرح آنحضرت کی نبوت تا قیام قیامت ہے اسی طرح رسول کا یہ اخلاقی نمونہ بھی قیامت تک ہر زمانہ میں چلنے والا ہے۔[1] ہم ذیل میں اس مقدس گروہ میں سے پانچویں لعل ولایت کے فضائل نفسانیہ، کمالات روحانیہ اور اخلاق جمیلہ وصفات جلیلہ کا ایک شمہ ہدیۂ قارئین کرام کرنا چاہتے ہیں ورنہ

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

---

[1] اخلاق الائمہ، ص ۵۔

حسینؑ کے کمالاتِ علمیہ کے بعض نادر نمونے

مخفی نہ رہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہبی، دوسرا کسبی۔ علم وہبی ولدنی وہ ہوتا ہے جو علیم مطلق اپنے بعض مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی والہام وغیرہ مرحمت فرماتا ہے۔ یہی وہ حقیقی علم ہے جس میں کسی قسم کی خطا اور غلطی کا امکان نہیں ہوتا کیونکہ اس میں معلم وہ ذات مستجمع جمیع صفات ہے جس کا علم عین ذات ہے اور متعلم وہ معصوم ہستیاں ہوتی ہیں جن میں شیطانی سہو ونسیان کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے متعلق بوجہ عصمت وطہارت اغراض نفسانیہ کے تحت اس میں کسی قسم کی کمی یا بیشی کرنے کا احتمال ہوتا ہے۔ کسبی علم وہ ہوتا ہے جو دنیا میں اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ تمام انبیاء اور ان کے اوصیاء علم وہبی ولدنی کے حامل ہوتے ہیں اور مدرسہ الٰہیہ کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ دنیوی مدارس میں نہیں پڑھا کرتے۔ ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام بھی اسی مدرسۂ الٰہیہ کے پڑھے ہوئے تھے۔ کسی دنیوی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے سینے علوم ربانیہ کے دفینے اور دماغ معارف الٰہیہ کے خزینے تھے۔ علم وہبی رکھنے والے بزرگوں کی سب سے بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی سائل کے جواب میں ﴿لا ادری﴾ نہیں کہتے چنانچہ ائمہ امام میں وارد شدہ متعدد احادیث میں موجود ہے: ﴿الحجة من لا یقول لا ادری﴾ حجت خدا وہ ہوتا ہے جو کسی بھی سائل کے جواب میں ﴿لا ادری﴾ (میں نہیں جانتا) نہ کہے (اصول کافی وغیرہ) بلکہ ہر سائل کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب باصواب دے کر اسے مطمئن کر سکے بلکہ امام برحق تو وہ ہوتا ہے کہ خود لوگوں کو سوال کرنے پر آمادہ کرتے ہوئے کہے: ﴿سلونی سلونی قبل ان تفقدونی﴾ جو کسی سائل کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکے وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے مگر حجت خدا نہیں ہو سکتا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اسی خانوادۂ علم وفضل کے پانچویں فرد فرید وجوہر وحید ہیں۔ ان کے علوم کی تہ تک رسائی حاصل کرنا حد امکان سے باہر ہے۔ یہاں بطور نمونہ مشتے از خروارے کچھ ان کے خداداد علم وکمال کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ معاویہ کی موجودگی میں عمرو بن العاص نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے دریافت کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہماری اولاد بہ نسبت آپ حضرات کی اولاد کے زیادہ ہے؟ آپؑ نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

بغاث الطیر اکثرھا فراخاً — و ام الصقر مقلال نذور

یعنی شکار نہ کرنے والے کمزور پرندوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں اور شکاری پرندوں کی ماں بچہ مردہ اور کم اولاد ہوتی ہے۔

پھر عمرو نے پوچھا: اس کی وجہ کیا ہے کہ ہماری مونچھیں آپ سے پہلے سفید ہو جاتی ہیں۔ آپ نے فرمایا: ﴿ان نساء کم نساء بخرة فاذا دنی احدکم من امرأته نهکت فی وجهه فشاب منه شاربه﴾ تمہاری عورتیں گندہ دہن ہیں۔ تم جب ان کے نزدیک جاتے ہو تو وہ مُنہ پھیلاتی ہیں تو اس سے تمہاری مونچھیں سفید ہو جاتی ہیں۔ پھر عمرو نے دریافت کیا: اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات کی ڈاڑھیاں گھنی ہوتی ہیں اور ہماری ایسی نہیں۔ فرمایا: ﴿البلد الطیب یخرج نباته باذن ربه و الذی خبث لا یخرج الا نکداً﴾ جو پاکیزہ بستی ہو اس کی انگوری خدا کے حکم سے اچھی اگتی ہے اور جو بدطینت ہو اس کی انگوری ناتواں ناتواں ہوتی ہے۔ حضرت کے یہ نقد مگر تلخ حقائق پر مبنی جوابات سن کر معاویہ پکار اٹھا: ﴿بحقی علیک الا سکت انه ابن علی بن ابی طالب﴾ تجھے میرے حق کی قسم چپ ہو جاؤ، کیونکہ یہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے اس وقت امام علیہ السلام نے یہ شعر پڑھا ۔

ان عادت العقرب عدنا لها — و کانت النعل لها حاضرة

قد علم العقرب و استیقنت — ان لا لها دنیا و لا اخرة

اگر عقرب نے دوبارہ عود کیا تو ہم بھی عود کریں گے اور جوتا ہاتھ میں موجود ہوگا۔ یہ تو عقرب کو معلوم ہی ہے کہ اس کی نہ دنیا ہے اور نہ آخرت۔[1]

(۲) حسن بصری نے لکھ کر آنجناب علیہ السلام سے "قدر" کی حقیقت دریافت کی۔ امام عالی مقام علیہ السلام نے جو اسے جواب دیا وہ درج ذیل ہے، ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فاتبع[2] ما شرحت لک فی القدر مما افضی الینا اهل البیت فانه من لم یومن بالقدر خیره و شره کفر و من حمل المعاصی علی الله جل و عز فقد افتریٰ علی الله افترا عظیما ان الله تبارک و تعالیٰ لا یطاع باکراه و لا یعصی بغلبة و لا یهمل العباد فی الحکمة لکنه المالک لما ملکهم و القادر لما علیه اقدرهم فان ائتمروا بالطاعة لم یکن الله صاد اعنها مبطئا و ان ائتمروا بالمعصیة فشاء ان یمن علیهم فیحول بینهم و بین ما ائتمروا به فعل و ان لم یفعل فلیس هو حملهم علیها تیسرا و لا کلفهم جبرا بتمکینه ایاهم بعد اعذاره و انذاره لهم و احتجاجه علیهم طوقهم و مکنهم و جعل لهم السبیل الی اخذ ما الیه دعاهم و ترک ما عنه نهاهم جعلهم مستطیعین لاخذ ما امرهم به من شئی غیر اخذ به و لترک ما نهاهم عنه من شئی غیر تارکیه و الحمد لله الذی جعل عباده اقویا لما امرهم به ینالون بتلک القوه وما نهاهم

---

[1] مناقب شہر ابن آشوب، ج ۳، ص ۱۷۷، طبع بمبئی۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

[2] رسالہ بلاغۃ الحسین مترجم، ص ۱۳۳ تا ۱۳۴۔

عنه و جعل العذر لمن لم يجعل له السبيل حمداً متقبلا فانا على ذالک اذهب و به اقول و الله و انا و اصحابی ایضاً علیه و له الحمد﴾

دیکھو پیروی کرو اس کی جو میں تمہیں قدر کے متعلق لکھتا ہوں۔ اس علم سے جو ہم اہل بیت تک پہنچا ہے اس لیے کہ جو شخص اچھی اور بری ہر قسم کی تقدیر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو گناہوں کی ذمہ داری اللہ پر قرار دے اس نے خدا پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ خداوند عالم کی اطاعت زبردستی سے نہیں ہوتی اور نہ نافرمانی خدا کے مقابلہ میں غالب آنے کی بنا پر ہوتی ہے اور نہ وہ اپنی حکمت سے اپنے بندوں کو مطلق العنان چھوڑتا ہے بلکہ وہ مالک ہے اس کا بھی جسے اس نے ان کی ملکیت میں دیا ہے اور قادر ہے اس پر بھی جسے اس نے ان کی قدرت میں رکھا ہے لہٰذا اگر وہ اس کے احکام کی اطاعت کرنا چاہیں تو اللہ اس سے روکنے والا یا دیر کرنے والا نہ ہوگا اور اگر گناہ کرنا چاہیں تو اس وقت اگر وہ چاہے کہ اپنے احسان سے کچھ موانع پیدا کر کے ان کو ان کے ارادہ کیے ہوئے گناہ سے باز رکھے تو ایسا کر دیتا ہے لیکن اگر ایسا نہ کرے تب بھی ان کے گناہ کا باعث اور مجبور کرنے والا وہ نہ ہوگا اور نہ یہ کہ اس نے زبردستی اس کا مرتکب کیا ہوگا بلکہ قدرت دینے کے ساتھ انہیں پورے طور پر اچھا برا بتانے اور حجت تمام کرنے کے بعد اس نے انہیں اپنے افعال پر طاقت دی ہے اور ان کے لیے راستہ کھلا رکھا ہے کہ یہ اس عمل کو اختیار کریں جس کی طرف اس نے انہیں دعوت دی ہے اور اسے ترک کریں جس سے اس نے انہیں منع کیا ہے چاہے یہ انہیں ترک کریں یا نہ۔ اور مسلسل و متصل حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے اپنے بندوں کو طاقت دے رکھی ہے اپنے احکام کی تعمیل پر اور اسی طاقت سے جب چاہتے ہیں وہ تعمیل کرتے ہیں اور احکام کی مخالفت پر بھی طاقت دی ہے اور جس کے لیے راستہ تعمیل احکام کا موجود ہی نہ ہوا سے تو معذور قرار دیا ہے (وہ مکلف ہی نہیں ہے) یہی میرا مسلک ہے اور بخدا اسی کا میں قائل ہوں اور میں اور میرے تمام اصحاب بحمد اللہ اسی پر قائم ہیں۔

(۳) آنجنابؑ نے ایک کنیز کو آزاد کر کے اس سے عقد کر لیا تھا۔ اس پر اعتراض کرتے ہوئے معاویہ نے آپ کو ایک خط لکھا اس کے جواب میں آپؑ نے تحریر فرمایا: ﴿اما[1] بعد فقد بلغنی کتابک و تعییرک ایای بانی تزوجت مولاتی و ترکت اکفائی من قریش فلیس فوق رسول الله منتهی فی شرف ولا غایة فی نسب و انما کانت ملک یمینی خرجت عن یدی بامر التمست فیه ثواب الله ثم ارتجعتها علی سنة نبیه وقد رفع الله بالاسلام الخسیسة و وضع عنا به النقیصة فلا لوم علی امرء مسلم الا فی امر ماثم و انما اللوم لوم الجاهلیة﴾

---

[1] رسالہ بلاغۃ الحسین مترجم ص ۲۔

تمہارا نوشتہ مجھے ملا۔ جس میں تم نے مجھ پر اعتراض کیا ہے کہ میں نے اپنی آزاد کردہ کنیز سے عقد کر لیا اور قریش میں سے کسی برابر کی لڑکی سے شادی نہ کی۔ تو ظاہر ہے رسول کی قرابت سے بڑھ کر (جو کہ مجھے حاصل ہے) نہ تو کوئی شرف ہے نہ اس کے برابر نسب کی کوئی منزل ہے۔ وہ پہلے میری کنیز تھی جسے میں نے ثواب خدا حاصل کرنے کے لیے آزاد کر کے اپنی ملکیت سے نکال دیا پھر میں نے پیغمبر کی سنت پر عمل کرتے ہوئے (عقد کر کے) اسے اپنے پاس پلٹا لیا۔ خداوند عالم نے اسلام کے ذریعہ ہر پستی کو بلندی بخش دی ہے اور اسی اسلام کے ذریعہ ہم (مسلمانوں) سے ہر کمی کو دور کر دیا ہے لہٰذا مرد مسلمان اسی وقت مستحق ملامت ہے جبکہ اس سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو۔ ذلیل و گھٹیا اور بڑی کمینگی تو یہ ہے کہ مسلمان ہو کر کوئی جاہلیت کی ذہنیت پر برقرار رہے۔

(۴) توحید باری تعالیٰ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ایها[1] الناس اتقوا هؤلاء المارقة الذين يشبهون الله بانفسهم يضاهئون قول الذين كفروا من اهل الكتاب بل هو الله ليس كمثله شئ وهو السميع البصير لا تدركه الابصار وهو يدرك الابصار وهو اللطيف الخبير استخلص الوحدانية و الجبروت و امضى المشية و الارادة و القدرة و العلم بما هو كائن لا منازع له فى شئى من امره ولا كفو له يعادله ولا ضد له ينازعه ولا سمى له يشابهه ولا مثل له يشاكله لاتقدار له الامور ولا تجرى عليه الاحوال ولا تنزل عليه الاحداث ولا يقدر الواصفون كنه عظمته ولا يخطر على القلوب مبلغ جبروته لانه ليس له فى الاشياء عديل ولا تدركه العلماء بالبابها ولا اهل التفكير بتفكرهم الا بالتحقيق ايقانا بالغـ [illegible] د يوصف بشئى من صفات المخلوقين وهو الواحد الصمد ما تصور فى الاوهام فهو خلافه، ليس برب من طرح تحت البلاغ و معبود من وجد فى هواء و غير هواء وهو فى الاشياء كائن لا كينونة محظور بها عليه ومن الاشياء بائن لا بينونة غائب عنها ليس بقادر من قارنه ضد، او ساواه ند، ليس عن الدهر قدمه ولا بالناحية اممه احتجب عن العقول كما احتجب عن الابصار و عمّن فى السماء احتجبا به كمن فى الارض قربهُ كرامة و بعده اهانة لا تحله فى، ولا توقته اذ، ولا تؤامره ان، علوه من غير وقل، و مجيئه من غير تنقل، يوجد المفقود، و يفقد الموجود ولا تجتمع لغيره الصفتان فى وقت. يصيب الفكر منه الايمان به موجودا وجود الايمان لاوجود صفة، به توصف الصفات لابها يوصف و به تعرف المعارف، لابها يعرف، فذلك الله لا سمى لهُ سبحانه ليس كمثله شئ، وهو السميع البصير﴾

---

[1] بحوالہ تحف العقول۔

اے لوگو! ان بے دین لوگوں سے بچو جو خدا کو اپنے نفوس کا سا سمجھتے ہیں اور کفار اہل کتاب کی ایسی باتیں کرتے ہیں بلکہ وہ اللہ ہے اس کی ایسی کوئی چیز نہیں۔ وہ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ نگاہیں اسے نہیں پاسکتیں وہ البتہ نگاہوں کو دیکھتا ہے۔ وہ مادی کثافتوں سے بری اور بڑا باخبر ہے۔ یکتائی واقتدار کو اس نے خاص اپنے لیے رکھا ہے۔ اپنی خواہش وارادہ کو کر گزرنے والا، قدرت کو عمل میں لانے والا، اور ہر ہونے والی بات کا عالم ہے، کسی چیز کے متعلق اگر حکم صادر کردے تو کسی کو مجال دم زدن نہیں۔ نہ تو کوئی اس کا ہمسر ہے کہ برابری کرے۔ نہ کوئی حریف ہے جسے اختلاف کی جرأت ہو۔ نہ کوئی اس کا نظیر ہے جو اس سے مشابہ ہونے کا دعویٰ کرے۔ نہ اس کا کوئی نمونہ ہے جو اس کا شبیہ ہو، نہ اس پر انقلابات آتے ہیں نہ اس کی حالتیں بدلتی ہیں۔ نہ تغیرات لاحق ہوتے ہیں توصیف کرنے والے اس کی عظمت کی حقیقت بیان کرنے پر قادر نہیں۔ نہ دلوں کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتنی قدرت والا ہے کیونکہ موجوداتِ عالم میں کوئی چیز اس کے ہم پلہ نہیں۔ نہ علماء اپنی عقلوں سے، غور وفکر کرنے والے اپنے غور وفکر سے کام لے کر اسے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر یہ کہ وہ بے دیکھے اس کی عین حقیقت پر یقین کریں۔ کیونکہ مخلوقات کے اوصاف سے اس کی توصیف نہیں کی جاسکتی۔ (کہ کسی مخلوق سے مثال دے کر اس کی شناخت کرائی جاسکے) وہ واحد ویکتا اور بے نیاز ہے۔ وہم وگمان جو کچھ اس کا خاکہ تیار کرے خداوند عالم اس کے خلاف ہی ہوگا۔

خدا وہ نہیں جو بار مصیبت کے نیچے درماندہ ہو اور وہ معبود نہیں جو ہو یا غیر ہو کسی بھی مکان میں پایا جائے۔ اور وہ تمام چیزوں میں موجود ہے (مگر) ایسا ہونا نہیں جو اسے ان میں محدود بنادے اور تمام چیزوں سے دور ہے مگر ایسی دوری نہیں جس کی وجہ سے وہ ان سے بے تعلق و بے خبر ہوجائے قادر (علی الاطلاق) وہ نہیں ہوسکتا جس کے ہمسر کوئی ضد اور اس کے ہمتا کوئی اس کا مثل ہو۔ وہ زمانہ کے حدود میں گرفتار اور مکان کی پابندی میں مقید نہیں ہے۔ وہ جس طرح نگاہوں سے پوشیدہ ہے اسی طرح عقلوں سے بھی مخفی ہے اس کی نزدیکی اعزاز اور اس کی دوری تحقیر ہے۔

اس کے ساتھ "ہیں" کی لفظ (جو کسی ظرف میں ہونے کا پتہ دے) صرف نہیں ہوسکتی۔ نہ "جب" کے ساتھ اس کو کسی وقت سے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔ نہ اس کے وجود میں "اگر" کی گنجائش ہے۔ بلندی اس کی غیر جسمانی ہے اور متوجہ ہونا اس کا بغیر انتقال مکانی ہے۔ وہ ہست کو نیست اور نیست کو ہست بناتا ہے اور اس کے غیر کے لیے کسی وقت بھی یہ دونوں صفتیں بہم نہیں ہوسکتیں۔ جتنی غور وفکر اس کے موجود ہونے پر ایمان رکھتا ہے ایسا وجود جس پر بس ایمان لایا جاسکتا ہے اس کی توصیف نہیں ہوسکتی صفتیں ہیں ان کا مفہوم اسی کے ذریعہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس کی ذات ان صفتوں سے سمجھ میں نہیں آتی۔ تمام پہچانی ہوئی چیزیں اس کی بدولت ہمیں معلوم ہیں وہ ان سے معلوم نہیں

ہوتا۔ یہ ہے اللہ جس کا کوئی ہمنام نہیں، وہ ہر عیب سے بری، اس کے مثل کوئی چیز نہیں۔ اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

شیخ عبداللہ العلائلی لکھتے ہیں: ﴿الاخبار عن الحسینؑ فی هذا الباب اکثر من ان تحصٰی ولقد کان یجبنی بالمدهشات فی الفتیا وما الیها من العلم حتی قال فیه ابن عمر انه یغرّ العلم غراً ای یغذی﴾ یعنی اس سلسلہ میں امام حسینؑ سے بے شمار اخبار مروی ہیں۔ آپ کے فتاوی اور علمی کارنامے لوگوں کو مدہوش کر دیتے ہیں۔ ابن عمر آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ نے غذائے علم کو سیر ہو کر حاصل کیا [1] ہے۔

فصاحت و بلاغت

خاندانِ رسالت کی فصاحت و بلاغت حد بیان سے باہر ہے اس خانوادۂ فضل و کمال کا جو بھی فرد ہے۔ وہ میدانِ فصاحت و بلاغت کا یکہ تاز شہسوار نظر آتا ہے۔ فصاحت اس بیت علم کی کنیز معلوم ہوتی ہے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ﴿اوتیت جوامع الکلم و اوتی علی جوامع الکلم﴾ مجھے اور علی کو منجانب اللہ یہ عطیہ ہوا ہے کہ کم الفاظ میں معانی زیادہ سمو سکتے [2] ہیں۔

شیخ شبراوی اس خانوادۂ عصمت و طہارت کے متعلق لکھتے ہیں: ﴿ان اهل البیتؑ حازوا الفضائل کلها علماً و حلماً و فصاحةً و صباحةً و ذکاءً و بدیهةً و جوداً و شجاعةً فعلومهم لا تتوقف علی تکرار درس ولا یزید یومهم فیها علی ما کان بالامس بل هی مواهب من مولاهم من انکرها و اراد سترها کان کمن اراد ستر وجه الشمس﴾

یعنی اہل بیت رسولؐ جمیع فضائل علم وحلم، فصاحت وصباحت، ہدایت و ذکاوت، سخاوت و شجاعت غرضیکہ جمیع فضائل و مکارم پر حاوی و فائز ہیں۔ ان کے علوم تعلیم و تعلم و درس و تدریس اور بحث و تکرار پر موقوف نہیں ہیں اور نہ ایسا ہے کہ ان کا آج کل پر فوقیت رکھتا ہو کہ کل وہ نہیں جانتے تھے اور آج جان گئے ہوں۔ درحقیقت یہ خدا کے بخشے ہوئے کمالات ہیں جو اہل بیتؑ کو عطا ہوئے ہیں جو شخص اس امر کا انکار کرے یا اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کوئی آفتاب کو چھپانے کی سعی کرے۔ [3]

امیر شام ایسے الد الخصام بھی اس خاندان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

---

[1] سمو المعنی فی سمو الذات، ص ۴، بحوالہ تحف العقول۔

[2] شرح نہج البلاغہ ابن میثم بحرانی، ص ۲/ ۳۰۔

[3] کتاب الاتحاف بحب الاشراف، ص ۱۹، طبع مصر۔

﴿المسنة بني هاشم الحداد التي تفلق الصخر و تغرف من البحر﴾ یعنی بنی ہاشم کی تیز زبانیں پتھر میں شگاف ڈال دیتی ہیں اور سمندروں سے پانی لیتی ہیں[1] و الفضل ما شهدت به الاعداء۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اسی خانوادۂ نبوت کے عدیم النظیر خطیب ہیں۔ آپ کے متعلق شیخ محمد بن طلحہ الشافعی لکھتے ہیں: ﴿انه علیه السلام من ذلک الوقت افصح من نطق کانت الفصاحة لدیه خاضعةً و البلاغة لامره سامعةً طائعة﴾ آنجنابؑ اپنے دور کے سب بولنے والوں سے زیادہ فصیح اللسان تھے۔ فصاحت آپ کی فرمانبردار لونڈی اور بلاغت مطیع امر کنیز تھی۔[2]

محمود عقاد مصری لکھتے ہیں: ﴿وقد اوتی ملکة الخطابة من طلاقة لسان و حسن بیان و غنة صوت و جمال ایماء﴾ قدرت نے آپ کو ایسا ملکۂ خطابت عطا کیا تھا جس میں طلاقت لسان، حسن بیان، صوت حسن اور حسین اشارے بھی کچھ موجود ہے۔[3] و لنعم ما قیل۔

ے وہی کلام، وہی لہجۂ لسان اللہ	ہر ایک لفظ میں قرآن کی جلالت ہے
نثار کوثر و تسنیم و سلسبیل کا حسن	عجیب روح فصاحت عجیب بلاغت ہے
نپے تلے ہوئے الفاظ وہ معانی خیز	کہ جیسے وحی کی پابند لب کی حرکت ہے
نبوت اور امامت کے علم کا تیور	علی کا رعب محمد کی شان و شوکت ہے
یہی تھا راز نبیؐ کے زباں چبانے میں	زباں حسینؑ کی گویا زبانِ قدرت ہے

آنجنابؑ کے کلام معجز نظام پر مشتمل ایک نہایت عمدہ رسالہ بنام بلاغۃ الحسین طہران میں اور پھر اس کا سلیس اردو ترجمہ اور نفیس مقدمات کے ساتھ نجوہ سے شائع ہو چکا ہے جس میں آپ کے خطب شریف، مکاتیب نفیسہ اور کلمات قصار لطیفہ درج ہیں۔ شائقین حضرات اس رسالہ کا مطالعہ کر کے نور ایمان و ایقان میں اضافہ کریں۔ یہاں بطور نمونہ آپ کا کچھ کلام حقائق ترجمان پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے نیز قبل ازیں سابقہ عنوان کے تحت بھی اس کے کچھ نمونے پیش کئے جا چکے ہیں۔

(۱) نافع بن ارزق نے ابن عباس سے سوال کیا: ﴿صف لنا الهک الذی تعبده﴾ مجھ سے اپنے اس پروردگار کا وصف بیان کرو جس کی عبادت کرتے ہو؟ ابن عباس نے عظمت الٰہی کے احساس سے سر جھکا لیا۔ تب نافع

---

[1] مواسم الادب و آثار العجم و العرب، ص ۱/۳۶۔

[2] مطالب السئول، ص ۲۲۹، طبع لکھنؤ۔

[3] ابو الشہداء، ص ۶۳، طبع مصر، بحوالہ مقدمہ بلاغۃ الحسین۔

حضرت امام حسین ؑ کی طرف متوجہ ہوا۔ حضرتؑ نے فرمایا: ﴿یا نافع ان من وضع دینهٔ علی القیاس، لم یزل فی الارتماس، مائلا عن المنهاج، ظاعنا بالاعوجاج، ضالاً عن السبیل قائلا غیر الجمیل، یابن الارزق اصف الٰهی بما وصف به نفسه لا یدرک بالحواس، ولا یقاس بالناس فهو قریب غیر ملتصق، و بعید غیر مستقصي یوحد ولا یبعض، معروف بالایات، موصوف بالعلامات، لا اله الا هو الکبیر المتعال، فبکی ابن الارزق، و قال ما احسن کلامک، فقال لهٗ بلغنی انک تشهد علی ابی و علی اخی و علی بالکفر، فقال له الحسینؑ انی سائلک عن مسئلة فقال سل فسئله عن قوله، و اما الجدار فکان لغلامین یتیمین فی المدینة، فقال یابن الارزق، من حفظ فی الغلامین، فقال ابو هما فقال الحسینؑ ابوهما خیر ام رسول الله فقال ابن الارزق قد انبانا الله عنکم انکم قوم خصمون﴾

اے نافع جو شخص اپنے مذہب کی بنیاد قیاس پر رکھے گا ہمیشہ غوطے کھاتا اور راہِ راست سے ہٹا ہوا، کجروی میں مبتلا، راہ راست سے گمراہ اور غیر مستحسن اقوال کے ساتھ گویا رہے گا۔ اے نافع بن ارزق میں اپنے خدا کی وہی صفت بتا سکتا ہوں جو اس نے خود اپنی صفت بیان کر دی ہے۔ حسیات سے اس کا ادراک ممکن نہیں اور خلائق پر اس کا قیاس درست نہیں۔ وہ نزدیک ہے مگر جسمانی طور پر چسپیدہ نہیں۔ اور دور ہے مگر جسمانی طور پر علیحدہ نہیں۔ وہ ایک ہے مگر کسی مجموعہ کا جزو نہیں، نشانیوں سے پہچانا ہوا اور علامتوں سے توصیف کیا ہوا ہے۔ سو اس بزرگ و بلند کے کوئی دوسرا معبود برحق نہیں۔ یہ سن کر ابن ارزق رونے لگا اور کہا: کیا خوب آپ کا بیان ہے۔ حضرت نے فرمایا: مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ تم میرے والد بزرگوار اور بھائی کو اور خود مجھے کافر سمجھتے ہو۔ (اس پر وہ شرمندہ سا ہو گیا) حضرتؑ نے فرمایا: میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: دریافت کیجئے۔ آپ نے یہ آیت پڑھی جو حضرت خضرؑ کے قصہ میں ہے کہ ''وہ دیوار دو یتیم لڑکوں کی تھی۔'' آپ نے فرمایا: اے ابن ارزق یہ لڑکوں کے بارے میں کس کے حقوق کا خیال کیا گیا۔ ارزق نے کہا: ان کے باپ کے حقوق کا، حضرت نے کہا (کہ سچ بتاؤ) ان کے باپ کا درجہ بلند تھا یا رسول اللہ ﷺ کا۔ ابن ارزق نے کہا کہ تم لوگوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ یہ لوگ بڑے بحث کرنے والے ہیں۔

(۲) ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ان الحلم زینة، و الوفاء مروة و الصلة نعمة و الاستکبار صلف، و العجلة سفه، و السفه ضعف، و الغلو ورطة، و مجالسة اهل الدنائة شر، و مجالسة اهل الفسوق ریبة﴾

بردباری زینت ہے، وفا تقاضائے انسانیت ہے، صلہ نعمت ہے، بڑا بننا بے غیرتی ہے، جلد بازی نادانی اور نادانی ضعف ہے، حد سے گزرنا باعثِ خطرہ ہے، کمینوں کی ہم نشینی بری اور فاسقوں کی ہم نشینی سبب تہمت ہے۔

(۳) دنیا سے پرہیز کرنے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: یابن ادم تفکر، و قل این ملوک الدنیا و اربابها الذین عمروا خرابها، و احفروا انهارها، و اغرسوا اشجارها، ومدنوا مدائنها، فارقوها وهم كارهون، و ورثها قوم اخرون، و نحن بهم عما قليل لاحقون يا ابن ادم اذكر مصرعك، و فی قبرک مضجعک و موقفک بین یدی الله، تشهد جوارحک علیک یوم تزل فيه الاقدام و تبلغ القلوب الحناجر و تبيض وجوه، و تسود وجوه، و تبدوا السرائر و يوضع الميزان القسط، يابن ادم اذكر مصارع ابائک و ابنائک کیف کانوا و حیث حلوا و کانک عن قليل، قد حللت محلهم و صرت عبرة معتبر.

وانشد شعرا:

این الملوک التی عن حفظها غفلت   حتی سقاها بکاس الموت ساقیها

تلک المدائن فی الافاق خالیة   عادت خراباً و ذاق الموت بانیها

اموالنا لذوی الوارث نجمعها   و دورنا لخراب الدهر نبنیها

اے فرزند آدم! غور کرو اور بتاؤ کہ شاہان دنیا اور دنیا والے کہاں ہیں؟ کدھر گئے وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا کے ویرانوں کو آباد کیا۔ نہریں کھودیں، درخت لگائے۔ اس کے شہروں کو آباد کیا۔ وہ لوگ خواہش نہ رکھتے ہوئے بھی اس دنیا سے جدا ہوگئے اور ان کی جگہ دوسرے لوگ مالک بن بیٹھے۔ ہم لوگ بھی عنقریب ان سے جا ملیں گے۔ اے فرزند اپنے بچھڑنے اور قبر میں لیٹنے اور پھر بروز قیامت خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کرو۔ جہاں تمہارے اعضاء تمہارے خلاف گواہی دیں گے اس دن جبکہ قدم پھسلیں گے اور دل حلق تک آ جائیں گے اور بعضوں کے چہرے سپید اور بعضوں کے سیاہ ہوں گے اور ڈھکی چھپی باتیں ظاہر ہو جائیں گی اور انصاف کی ترازو نصب کی جائے گی۔ اے فرزند آدم اپنے باپ دادا اور اپنی اولاد کے مرنے کو یاد کرو کہ پہلے وہ کہاں تھے اور اب کہاں ہیں اور تم بھی عنقریب انہیں لوگوں کی منزل میں جا پہنچو گے اور عبرت حاصل کرنے والے کے لیے نمونہ عبرت بن جاؤ گے۔

اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے ؎

کہاں ہیں وہ بادشاہ جو اپنی جانوں کو بچانے سے غافل رہے

یہاں تک کہ پلانے والے نے انہیں موت کا جام پلا دیا

دنیا میں ان کے شہر خالی ہیں

اور ویران ہو رہے ہیں اور ان کے بنانے والے نے موت کا مزہ چکھ لیا ہے

ہم اپنے مال وارث ہونے والوں کے لیے جمع کرتے ہیں

اور اپنے گھر زمانے کی تباہ کاریوں کے لیے بناتے ہیں

(۴) اہل بیتؑ رسولؐ کے فضائل اور ان کی اطاعت کے واجب ہونے کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں: اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بار امیر شام مدینہ میں آیا اور مجمع اشراف میں امام حسینؑ سے کچھ بیان کرنے کی خواہش کی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید جنابؑ، معاویہ کا ذکر اچھائی کے ساتھ کریں گے مگر آپؑ منبر پر تشریف لے گئے۔ خدا کی حمد و ثنا کے بعد رسول خداﷺ پر درود بھیجا، اس اثنا میں آپ نے ایک آدمی کو دوسرے سے یہ پوچھتے ہوئے سنا کہ ﴿من هذا الذی يخطب﴾ یہ کون تقریر کر رہا ہے۔[۱] آپؑ نے فرمایا: ﴿نحن حزب الله الغالبون و عترة رسول اللهؐ الاقربون و اهلبيته الطيبون و احد الثقلين، الذی جعلنا رسول الله ثانی كتاب الله تبارک الذی فيه تفصيل كل شیٔ لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه، و المعول علينا فی تفسيره ولا يبطئنا تاويله بل نتبع حقائقه، فاطيعونا فان طاعتنا مفروضة اذ كانت بطاعة الله و رسوله مقرونة قال الله عزوجلّ اطيعوا الله و اطيعوا الرسول و اولی الامر منكم، فان تنازعتم فی شیٔ فردوه الی الله و الرسول، و قال ولو ردوه الی الرسول و اولی الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم، ولولا فضل الله عليكم و رحمتهٗ لاتبعتم الشيطان الا قليلا و احذركم الاصغاء، الی هتاف الشيطان بكم فانه لكم عدوّ مبين فتكونوا كاوليائه الذين قال لهم، لا غالب لكم اليوم من الناس و انی جارلكم فلما ترأت الفئتان، نكص علی عقبيه و قال انی بری منكم، فتلقون للسيوف ضربا و للرماح ورد باو للعمد حطما و للسهام غرضا، ثم لا يقبل من نفس ايمانها لم تكن امنت من قبل او اكتسب فی ايمانها خيرا﴾

ہم اللہ کے غالب رہنے والے لوگ، پیغمبر خداﷺ کے قریب ترین عزیز اور آپؐ کے طیب و طاہر اہل بیت اور دو گراں قدر چیزوں میں سے ایک ہیں۔ ہمیں کو پیغمبرؐ نے کتاب خدا کا ثانی قرار دیا ہے۔ وہ کتاب خدا جس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے اور باطل کا جس کے آس پاس گزر نہیں۔ کلام مجید کی تفسیر میں ہمیں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ہم سے اس کی تاویلیں مخفی نہیں بلکہ ہم ہی اس کی حقیقتوں کی پیروی کرنے والے ہیں۔ پس تم ہماری اطاعت کرو کہ ہماری

---

[۱] الدمعۃ الساکبہ، ص ۴۱، ۲۷۲۔ مناقب شہر ابن آشوب، ج ۳، ص ۷۷۔ ترجمہ از بلاغۃ الحسین، ص ۲۵۔ (ایضاً عاشر بحار، ص ۱۴۷ وغیرہ)۔

اطاعت فرض ہے کیونکہ خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ہماری اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو حقدار حکومت ہیں ان کی اطاعت کرو۔ اگر تم میں کسی بات میں نزاع واقع ہو تو اس امر میں خدا و رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہ بھی خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ "اگر تم خدا و رسول اور اپنے حقداران حکومت سے رجوع کرتے تو یقیناً وہ لوگ جو تحقیق کرنے والے ہیں اس کو سمجھ لیتے اور اگر تم پر خدا کا فضل و کرم اور اس کی مہربانی نہ ہوتی۔ تو تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب کے سب شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔" میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ شیطان جو تمہارے کانوں میں کہتا رہتا ہے تو اس کے کہنے پر کان نہ دھرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اگر تم اس کی باتوں پر کان دھرو گے تو اس کے ان پیروؤں کی طرح ہو جاؤ گے جن سے شیطان نے کہا تھا کہ "آج کے دن تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا میں جو تمہارے ساتھ ہوں لیکن جب دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہو گئی تو وہ الٹے پیروں بھاگ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں" اور نتیجہ یہ ہوگا کہ تم تیر و تلوار نیزہ و گرز گراں کی زد پر آ جاؤ گے پھر اس وقت کسی شخص کا ایمان لانا قابل قبول نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ پہلے سے ایمان نہ لایا ہو اور عملی حیثیت سے اپنے ایمان کا ثبوت نہ پیش کیا ہو۔

امامؑ کے کلام منظوم کا نمونہ

عمدہ نثر کی طرح اچھی نظم میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنا بھی فصاحت و بلاغت کا ایک شعبہ اور ذوق سلیم اور طبع کے مستقیم ہونے کی علامت ہے۔ امام کو مبدا فیض سے اس میں سے بھی حظ وافر ملا تھا۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ آپ کا کلام منظوم بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) روز عاشورا مبارزت کے وقت[۱] اور بروایتے شہادت علی اصغر کے بعد[۲] جنابؑ نے یہ اشعار آبدار پڑھے:

کفر القوم و قدما رغبوا	عن ثواب اللّٰہ رب الثقلین
قتلوا قدماً علیا و ابنہ	حسن الخیر کریم الطرفین
حنقاً منھم و قالوا اجمعوا	و احشروا الناس الی حرب الحسینؑ
یا لقوم من الناس رذل	جمعوا الجمع لاھل الحرمین
ثم صاروا و تواصوا کلھم	باجتیاحی لرضاء الملحدین
لم یخافوا اللّٰہ فی سفک دمی	لعبید اللّٰہ نسل الکافرین
و ابن سعد قد رمانی عنوۃً	بجنود کوکوف الھاطلین

۱۔ نفس المہموم ص ۱۸۶۔ ۲۔ مقتل م ص ۳۸۵۔

لا لشیء کان منی قبل ذا　　غیر فخری بضیاء الفرقدین

بعلیٍّ الخیر من بعد النبیِّ　　و النبی القرشی الوالدین

خیرة اللّٰہ من الخلق ابی　　ثم امی فانا ابن الخیرتین

انا فضة قد خلصت من ذهب　　فانا الفضة و ابن الذهبین

من له جد کجدی فی الوریٰ　　او کشیخی فانا من العلمین

فاطمة الزهراء امی و ابی　　قاصم الکفر ببدر و حنین

عبد اللّٰہ غلاماً یافعاً　　و قریش یعبدون الوثنین

یعبدون اللات و العزی معاً　　و علی کان یصلی القبلتین

فابی شمس و امی قمر　　فانا الکوکب و ابن القمرین

وله فی یوم احد وقعة　　شفت الغل بفض العسکرین

ثم فی الاحزاب و الفتح معاً　　کان فیها حتف اهل القبلتین

فی سبیل اللّٰہ ماذا صنعت　　امة السوء معاً بالعترتین

عترة البر النبی المصطفی　　و علی الورد یوم الجحفلین

(۲) مندرجہ ذیل اشعار بھی آپؑ روزِ عاشورا مبارزت کے وقت پڑھتے تھے ؎

انا بن علی المطهر من ال هاشم　　کفانی بهذا مفخراً حین افخر

و جدی رسول اللّٰہ اکرم من مشی　　و نحن سراج اللّٰہ فی الخلق یزهر

و فاطمة امی من سلالة احمد　　و عمی یدعی ذا الجناحین جعفر

و فینا کتاب اللّٰہ انزل صادقاً　　و فینا الهدیٰ و الوحی بالخیر یذکر

و نحن امان اللّٰہ للناس کلهم　　نسرّ بهذا فی الانام و نجهر

و نحن ولاة الحوض نسقی ولاتنا　　بکاس رسول اللّٰہ ما لیس ینکر

و شیعتنا فی الناس اکرم شیعة　　و مبغضنا یوم القیامة یخسر

(۳) اشعار ذیل بھی جناب سید الشہداء علیہ السلام کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں ؎

فان تکن الدنیا تعد نفیسة　　فان ثواب اللّٰہ اعلیٰ و انبل

و ان تکن الابدان للموت انشات　　فقتل امرء بالسیف فی اللّٰہ افضل

وان تکن الارزاق قسماً مقدراً ۔ فقلة سعی المرء فی الکسب اجمل
وان تکن الاموال للترک جمعها ۔ فما بال متروک به المرء یبخل
(نفس المہموم، ص ۱۱۷، عاشر بحار، ص ۲۰۳)

آنجناب علیہ السلام کے اکثر خطب ومواعظ آگے چل کر ہم مناسب مقامات پر پیش کریں گے انشاء اللہ۔ دیدہ ور حضرات کے لیے اتنی مقدار ہی اثبات مدعا کے لیے کافی ہے کیونکہ اگر

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جز میں کل ۔ کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

امام حسین علیہ السلام کے کمالات عملیہ کے بعض نمونے

جود وسخا وعرفان منزلت

امام عالی مقام علیہ السلام کے عظیم عملی کارناموں سے صفحات تاریخ چھلک رہے ہیں یہاں صرف بطور نمونہ بعض واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اخلاقی فضائل میں سے سخاوت ایک بہت بڑی اچھی خصلت ہے۔ اس کی افراط سے اسراف اور تفریط سے بخل جنم لیتے ہیں لہذا سخاوت میں محل وبے محل اور اہل ونا اہل کا خیال کرنا بھی ضروری ہوتا ہے خاندان نبوت سے بہتر اس کے صحیح مقام کو اور کون پہچان سکتا تھا۔ وہ سخاوت کرتے وقت یہ معلوم کر لیتے تھے کہ کون کس قدر مروت واحسان کا حقدار ہے؟ پھر اس کے استحقاق کے مطابق اس کے ساتھ حسن سلوک فرماتے تھے۔

(۱) چنانچہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یابن رسول اللہؐ! میں نے کامل دیت کی ضمانت دی ہے اور اس کی ادائیگی سے قاصر ہوں۔ میں نے خیال کیا کہ کسی کریم وسخی ترین انسان سے سوال کروں اور جب سوچا تو خاندان نبوت سے زیادہ کریم وشریف کسی کو نہ پایا۔ اس لیے آپ سے مستدعی ہوں کہ اس کی ادائیگی کا کوئی بندوبست کر دیجئے۔ آنجنابؑ نے فرمایا: او فلاں! میں تم سے تین مسئلے دریافت کرتا ہوں۔ اگر ایک مسئلہ کا جواب دیا تو ۱/۳ دیت ادا کروں گا اور اگر دو کا دیا تو ۲/۳ اور اگر تینوں کا صحیح جواب دے دیا تو پھر پوری دیت ادا کر دوں گا۔ اعرابی نے یہ سن کر عرض کیا: یابن رسول اللہؐ! آپ جیسا صاحب علم وفضل سوال کرے، میری کیا مجال ہے کہ جواب دے سکوں۔ آپؑ نے فرمایا: میں نے اپنے جد نامدار سے سنا ہے کہ ﴿المعروف بقدر المعرفة﴾ معرفت کے مطابق حسن سلوک کرنا چاہیے۔ اعرابی نے عرض کیا: اچھا پوچھیے۔ اگر جواب معلوم ہوا تو عرض کروں گا ورنہ جنابؑ سے ہی استفادہ کروں گا۔ ﴿ولا حول ولا قوة الا باللّٰه﴾ امام عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ای الاعمال افضل؟﴾ افضل ترین عمل کون سا ہے؟ اعرابی نے عرض کیا: ﴿الایمان باللّٰه﴾ اللہ پر ایمان لانا۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿فما النجاة من المهلكة؟﴾ ہلاکت سے بچنے کا ذریعہ کیا ہے؟ اعرابی نے عرض کیا: ﴿الثقة

باللّٰہ ﴾ خدا پر بھروسہ کرنا۔ پھر آنجنابؑ نے فرمایا: ﴿فما یزین الرجل؟ ﴾ انسان کے لیے باعث زینت کیا ہے؟ اعرابی نے عرض کیا: ﴿علم معہ حلم ﴾ وہ علم جس کے ساتھ بردباری ہو! امامؑ نے فرمایا: اگر یہ موجود نہ ہو تو پھر؟ اس نے عرض کیا: ﴿مال معہ مروۃ ﴾ پھر وہ مال جس کے ساتھ سخاوت ہو۔ امامؑ نے فرمایا: اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر؟ اس نے عرض کیا: ﴿فقر معہ صبر ﴾ پھر وہ فقر وفاقہ ہو جس کے ساتھ صبر وشکر ہو۔ امامؑ نے فرمایا: اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر کیا؟ اعرابی نے کہا: ﴿فصاعقۃ تنزل من السماء فتحرقہ فانہ اھل لذلک! ﴾ پھر آسمان سے بجلی گرے جو اسے جلا کر راکھ کر دے کیونکہ اس صورت میں وہ اسی بات کا مستحق ہے۔ اعرابی کا یہ جواب سن کر امامؑ مسکرائے اور ہزار دینار کی تھیلی اسے مرحمت فرمائی اور مزید برآں اسے ایک انگوٹھی عطا کی جس کے نگینہ کی قیمت دو سو درہم تھی اور فرمایا: ﴿یا اعرابی اعط الذھب الی غرمائک و اصرف الخاتم فی نفقتک! ﴾ اے اعرابی یہ سونا (اشرفیاں) تو اپنے طلبگاروں کو دے اور یہ انگوٹھی اپنی ضروریات پر صرف کر۔

اعرابی نے یہ آیت پڑھتے ہوئے کہ ﴿اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ﴾ وہ تھیلی اور انگوٹھی لے لی اور چلتا بنا۔[۱]

(۲) عبد الرحمٰن سلمی نے آنجنابؑ کے کسی شہزادے کو سورۂ حمد پڑھائی۔ امامؑ نے سنی اور سن کر بہت خوش ہوئے۔ معلم کو ایک ہزار دینار، ایک ہزار کپڑوں کا جوڑا مرحمت فرمایا اور اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ کسی نے عرض کیا: مختصر سے کام کے عوض اس قدر عطائے کثیر؟ آپؑ نے فرمایا: ﴿این یقع ھذا من عطائہ ﴾ جو کچھ اس نے عطا کیا ہے۔ (سورۂ حمد یاد کرائی ہے) اس سے میری عطا کو کیا نسبت ہے۔[۲] اس کے بعد یہ اشعار آبدار پڑھے۔

ع اذا جادت الدنیا علیک فجد بھا ——— علی الناس طراً قبل ان تتفلت

فلا الجود یفنیھا اذا ھی اقبلت ——— ولا البخل یبقیھا اذا ما تولت

اس واقعہ سے معلمین قرآن کی قدر ومنزلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ معلمین کو تعلیم قرآن کی اجرت طے نہیں کرنا چاہیے مگر بچوں کے والدین کو خود خیال رکھنا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ ان کی خدمت کرنی چاہیے۔

ہمدردیٔ خلائق

شفقت علی الخلق وہ جلیل القدر صفت ہے کہ جس سے انسان کی انسانیت کا جوہر کھلتا ہے۔ حدیث نبویؐ میں وارد ہے: ﴿خیر الناس من نفع الناس ﴾ بہترین خلائق وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچائے۔ جس

---

[۱] عاشر بحار، ص ۱۲۵۔ دمعۂ ساکبہ، ج ۳، ص ۲۷۳، ۲۷۴۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۱، ص ۱۵۶، ۱۵۷، طبع نجف اشرف۔

[۲] عاشر بحار، ص ۱۲۲۔ دمعۂ ساکبہ، ص ۲۷۳۔ مناقب شہر ابن آشوب، ج ۴، ص ۶۶، طبع بمبئی۔

شخص میں انسانی ہمدردی نہیں وہ فی الحقیقت جوہر انسانیت سے عاری ہے ۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست　　　بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

دیگر صفات جلیلہ کی طرح اس صفت میں بھی ائمہ اہل بیت علیہم السلام بے نظیر نظر آتے ہیں۔ وہ کسی ستم رسیدہ انسان کی تکلیف گوارا نہ کر سکتے تھے اور اس کی تکلیف رفع کرنے میں مقدور بھر سعی بلیغ فرماتے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شفقت علی الخلق زبان زد خاص وعام ہے۔ ذیل میں ایک دو واقعات بطور تبرک ذکر کیے جاتے ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ آپؑ اسامہ بن زید کی بیماری میں اس کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ اسامہ نے کہا: ﴿واغماہ﴾ (ہائے غم) آنجنابؑ نے دریافت کیا: اے بھائی تجھے کیا غم ہے؟ اسامہ نے عرض کیا: ساٹھ ہزار درہم کا مقروض ہوں۔ امام نے فرمایا: غم نہ کر۔ یہ قرض میں ادا کر دوں گا۔ اسامہ نے کہا: کہیں اس کی ادائیگی سے قبل میں مر نہ جاؤں؟ آنجنابؑ نے فرمایا: مطمئن رہو۔ تمہاری وفات سے پہلے ادا کر دوں گا۔ چنانچہ ان کی وفات سے پہلے ان کا وہ تمام قرضہ چکا دیا آنجنابؑ فرمایا کرتے تھے۔ بادشاہوں میں تین خصلتیں بہت بری ہیں۔ (۱) طاقت در دشمنوں سے بزدلی (۲) کمزور لوگوں پر ظلم وستم۔ (۳) عطاو بخشش کے وقت بخل۔[۱]

(۲) حضرت امام حسین علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک غلام کو دیکھا کہ وہ کتے کو روٹی کھلا رہا ہے۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا: میں افسردہ ہوں۔ اس کتے کو خوش کر کے اپنی خوشی کا خواہشمند ہوں کیونکہ (میں مسلمان ہوں) اور میرا مالک یہودی ہے جس سے میں علیحدگی چاہتا ہوں۔ امام فرماتے ہیں میرے نزدیک میرے جد نامدار کا یہ فرمان ثابت تھا کہ ﴿افضل الاعمال بعد الصلوٰة ادخال السرور فی قلب المؤمنین بما لا اثم فیہ﴾ نماز کے بعد بہترین عمل یہ ہے کہ بغیر گناہ کا ارتکاب کے اہل ایمان کو خوش کیا جائے۔ چنانچہ میں اس کی قیمت دو سو (۲۰۰) دینار لے کر اس کے سردار یہودی کے پاس گیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ یہودی نے کہا: ﴿الغلام فداہ لخطاک و ھذا البستان لہ. و رددت علیک المال﴾ غلام آپؑ کے قدموں کا صدقہ ہے (یہ آپ کا مال ہے) اور یہ باغ بھی اس کا ہے اور آپ کی رقم بھی واپس کرتا ہوں۔ میں نے کہا: ﴿و انا قد وھبت لک المال﴾ میں یہ رقم تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ یہودی نے کہا: ﴿قبلت المال و وھبتہ للغلام﴾ میں اسے قبول کر کے غلام کو ہبہ کرتا ہوں۔ امام نے فرمایا: ﴿اعتقت الغلام و وھبت لہ جمیعاً﴾ اور میں غلام کو (جو میری ملکیت میں داخل ہو چکا تھا) آزاد کر کے یہ سب مال ومنال اسے بخشتا ہوں۔ یہ مظاہرہ دیکھ کر اس غلام کی بیوی نے کہا: ﴿قد اسلمت و وھبت زوجی مھری﴾ میں اسلام قبول کرتی ہوں اور اپنا حق مہر بھی اسے معاف کرتی

[۱] عاشر بحار، ص ۱۴۳۔ دمعۂ ساکبہ، ۲۷۳۔ مناقب، ج ۴، ص ۷۶۔

ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر یہودی نے کہا: ﴿و انا ایضاً اسلمت و اعطیتها هذه الدار﴾ میں بھی اسلام لاتا ہوں اور یہ گھر بھی اس عورت کو عطا کرتا ہوں۔[1] ﴿اللّٰهم صل علی محمد و ال محمد﴾

تواضع اور بخشش

فروتنی وانکساری جس کی ضد تکبر وغرور ہے دیگر اخلاقی فضائل کی طرح ایک بہت بڑی عمدہ اخلاقی صفت ہے۔ دوسری صفات جلیلہ کی طرح یہ صفت بھی ائمہ اطہار علیہم السلام میں بدرجۂ اتم واکمل پائی جاتی تھی۔ وہ آیت مبارکہ ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ کے صحیح مصداق تھے۔ نیز ﴿اذلة علی المؤمنین و اعزة علی الکافرین﴾ انہی کی شان میں وارد تھا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی تواضع پسندی اور غرباء ومساکین پر شفقت ومہربانی مشہور عالم تھی۔

(۱) ایک بار آپ چند مساکین کے پاس سے گزرے جو ایک چادر پر روٹیوں کے کچھ ٹکڑے پھیلائے بیٹھے تھے۔ آپ نے ان پر سلام کیا۔ انہوں نے جواب سلام کے بعد آپ کو دعوت شرکت دی۔ آپ ان کے ہمراہ دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ﴿لو لا انه صدقة لاکلت معکم﴾ اگر یہ روٹیاں صدقہ کی نہ ہوتیں (جو کہ ہم پر حرام ہے) تو ضرور میں تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتا۔ اس کے بعد ان سے فرمایا: میرے گھر چلو چنانچہ ان کو گھر لے جا کر عمدہ کھانا کھلایا، کپڑے پہنائے اور کچھ درہم بھی عطا فرمائے۔[2]

(۲) روز عاشور حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ کے بعد ان کی پشت اقدس پر گھٹوں کے کچھ نشان دیکھے گئے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے اس کا سبب پوچھا گیا۔ آپؑ نے فرمایا: ﴿هذا مما کان ینقل الجراب علی ظهره الی منازل الارامل و الیتامی و المساکین﴾ کہ آنجناب بیواؤں، یتیموں اور غریبوں اور مسکینوں کے گھروں میں ضروریات زندگی اپنی پشت پر اٹھا کر لے جاتے تھے۔ یہ اسی بار برداری کے آثار ہیں۔[3]

عفو و درگزر

باوجودیکہ انسان بدلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو اور پھر بھی عفو وصفح سے کام لے۔ یہ صفت جلیلہ لاکھوں میں سے کسی ایک میں ہوتی ہے۔ خداوند عالم نے اپنے مخصوص بندوں کی صفات خاصہ میں اس صفت جلیلہ کو بھی خاص طور پر ذکر فرمایا ہے کہ ﴿وَ الْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ کہ وہ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں اور جرم معاف کر

---

[1] عاشر بحار، ص ۱۳۵۔ دمعۂ ساکبہ، ۳، ۱۷۔ مناقب، ج ۳، ص ۸۱۔

[2] عاشر بحار، ص ۱۳۴۔ الدمعۃ ساکبہ، ۳، ۱۷۔ مناقب، ج ۳، ص ۷۶۔

[3] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۳، ص ۷۶۔ عاشر بحار، ص ۱۳۴۔

دیا کرتے ہیں۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام ہمیشہ لوگوں کی لغزشوں کو نظر انداز فرما دیا کرتے تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو منجانب اللہ یہ جلیل صفت وافر مقدار میں ملی تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے کسی غلام سے کوئی ایسا قصور سرزد ہوا جس کی وجہ سے وہ مستوجب سزا قرار پاتا تھا۔ آنجنابؑ نے حکم دیا کہ اسے کوڑے لگائے جائیں۔ اس غلام نے فوراً کہا: ﴿مولائی و الکاظمین الغیظ﴾ میرے آقا! خدا فرماتا ہے میرے خالص بندے وہ ہوتے ہیں جو غصہ کو ضبط کر لیتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿خلوا عنه﴾ اسے چھوڑ دو۔ اس نے آیت کا دوسرا ٹکڑا پڑھا: ﴿یا مولائی والعافین عن الناس﴾ میرے آقا خدا کے خالص بندے تو مجرموں کو ان کا جرم معاف کر دیا کرتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿عفوت عنک﴾ میں نے تجھے معاف کر دیا۔ غلام نے آیت کا آخری حصہ پڑھا: ﴿یا مولائی واللہ یحب المحسنین﴾ خدا تو نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ امامؑ نے یہ سن کر فرمایا: ﴿انت حر لوجه الله و لک ضعف ما کنت اعطیک﴾ جا تجھے میں راہ خدا میں آزاد کرتا ہوں اور جو کچھ پہلے تجھے ملتا تھا اس کا دو چند بھی دیتا ہوں۔[1]

ایک مرتبہ آپؑ بیت الخلاء میں داخل ہوئے وہاں روٹی کا ایک لقمہ دیکھا۔ اٹھا کر غلام کو دیا کہ جب میں باہر آؤں تو یہ لقمہ مجھے دینا۔ غلام نے (پاک صاف کر کے) وہ لقمہ کھا لیا۔ جب آپؑ باہر تشریف لائے تو پوچھا: او فلاں وہ لقمہ کہاں ہے؟ غلام نے عرض کیا: میرے آقا! وہ تو میں نے کھا لیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ امامؑ نے فرمایا: ﴿انت حر لوجه الله﴾ جا تو راہ خدا میں آزاد ہے۔ کسی نے عرض کیا: یا ابن رسول اللہؐ! اتنی سی بات پر اسے پروانۂ آزادی دے دیا۔ آپ نے جواباً فرمایا: ﴿سمعت جدی صلی الله علیه و اله یقول من وجد لقمةً ملقاةً فمسح منها ما مسح و غسل منها ما غسل ثم اکلها لم یسغها فی جوفه حتی یعتقه الله من النار. ولم اکن لاستعبد رجلاً اعتقه الله من النار﴾ میں نے اپنے جد نامدارؐ سے سنا ہے کہ جو شخص کہیں لقمہ پڑا ہوا دیکھ لے اور اگر صاف کرنے کے قابل ہے تو اسے صاف کر کے یا دھونے کے لائق ہے تو دھو کر اسے کھا لے تو قبل اس کے کہ وہ اس کے پیٹ میں ہضم ہو۔ خدا اسے آتش جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک ایسے شخص کو غلام رکھوں جسے خدا نے آتش جہنم سے آزاد کر دیا ہے۔[2]

عبادت و زہادت

عبادت وہ گراں قدر چیز ہے جسے خلاق عالم نے جن و انس کی خلقت کی اصلی غرض و غایت قرار دیا ہے۔ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ﴾ لہٰذا جو شخص جس قدر عبادت الٰہی زیادہ اور خلوص و خشوع سے کرے

[1] عاشر بحار، ص ۷۵/ ۱، الدمعۃ الساکبہ ۲/ ۷۷۔
[2] الدمعۃ الساکبہ ۲/ ۷۷ وغیرہ۔

گا اسی قدر اس کا مقام انسانیت بلند سے بلند تر متصور ہوگا۔ بلا خوف رد کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جس طرح سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام نے خشوع و خضوع اور خلوص کے ساتھ عبادت ایزدی کی ہے کہیں اور اس کی مثال کا ملنا ناممکن ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام بھی اسی خانوادۂ عصمت و طہارت کے رکن رکین ہیں۔ جس مقدس ہستی نے سرکار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ایسے عبادت گزاروں کی آغوش عصمت میں پرورش پائی ہو۔ اس کی عبادت و اطاعت کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟

روایات میں وارد ہے کہ جب جناب امام حسین علیہ السلام نماز کے لیے وضو فرماتے تھے تو ﴿تغیر لونہ و ارتعدت مفاصلہ﴾ رنگ مبارک متغیر ہو جاتا اور اعضا میں کپکپی پیدا ہو جاتی تھی۔ لوگوں کے عرض کرنے پر کہ فرزند رسول آپ کی یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے؟ فرماتے تھے: ﴿حق لمؤمن وقف بین یدی الملک الجبار ان یصفر لونہ و ارتعدت مفاصلہ﴾ مؤمن کو چاہیے کہ وہ جب اپنے جبار و قہار بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہو تو اس کا رنگ زرد پڑ جائے اور جوڑوں میں کپکپی پیدا ہو جائے۔[1]

(۱) ایک مرتبہ کسی شخص نے عرض کیا۔ مولا! آپ اس قدر خدا سے کیوں ڈرتے ہیں؟ فرمایا: ﴿لا یامن یوم القیامۃ الامن خاف اللہ فی الدنیا﴾ بروز قیامت وہی لوگ امن و امان میں ہوں گے جو دنیا میں خدا سے ڈرتے ہیں۔[2] و لنعم ما قیل

خواهی که روز حشر کنی خنده بایدت　　امروز از مصیبت فرد اگر یستن

(۲) کسی شخص نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کے والد ماجد کی اولاد کم کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: ﴿اتعجب کیف ولدت و لقد کان یصلی فی الیوم و اللیلۃ الف رکعۃ﴾ مجھے تو بہت عجب ہے کہ ہماری ولادت کیونکر ہوگئی؟ آنجناب تو شب و روز میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔[3]

ارباب سیر و تواریخ نے لکھا ہے کہ آنجناب نے پورے پچیس حج پیادہ پا کیے حالانکہ سواریاں ہمراہ[4] ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی نے دریافت کیا: فرزند رسول جب سواری موجود ہے تو پھر سوار کیوں نہیں ہوتے؟ اور اگر سوار نہیں ہونا تو پھر سواری ہمراہ کیوں لاتے ہیں؟ فرمایا: سوار اس لیے نہیں ہوتے کہ خدا سے حیا دامن گیر ہوتی ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کو جائیں اور سوار ہو کر جائیں اور سواری اس لیے ساتھ لاتے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم مجبوری کی بنا

---

[1] دمعہ ساکبہ، ص ۲۷۲ بحوالہ عوالم۔　[2] مناقب، ص ۷۸۔ دمعہ ساکبہ، ص ۲۷۲۔

[3] عاشر بحار، ص ۱۷۵۔ دمعہ ساکبہ، ص ۲۷۲ بحوالہ العقد الفرید لابن عبد ربہ اندلسی۔

[4] مناقب، ص ۷۸۔ دمعہ ساکبہ، ص ۲۷۲، کذا فی الناسخ والتمام۔

پر پیدل چل رہے ہیں کہ سواری ملتی نہیں ہے۔

آپؑ کو عبادت الٰہی کا اس درجہ شوق تھا کہ شب عاشور آپؑ نے محض عبادت کے لیے بمشکل پسر سعد سے مہلت لی تھی۔ شب عاشورا سخت رات تھی۔ دنیا بھر کے مصائب حضرتؑ پر ہجوم کیے ہوئے تھے ایسے وقت میں بکمال شوق اور انتہائی خضوع و خشوع سے عبادت کرنا انہی کا کام تھا اور اس سے بھی زیادہ سخت وقت نماز ظہر کا تھا۔ فوج مخالف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔

ایک زخمی مظلوم کو چاروں طرف سے دشمن گھیرے ہوئے تھے۔ وار پر وار کر رہے تھے اور حسینؑ ایسے وقت میں نماز ادا فرما رہے تھے[1]۔

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

شجاعت و شہامت

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ صفات نفسانی میں صفت "شجاعت" کو نہایت بلند مقام حاصل ہے لیکن وہ تہور اور جبن کے درمیان ایسا خط ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ معمولی سے افراط سے تہور (اجڈ پن) پیدا ہو جاتا ہے اور ذرا سی تفریط سے "جبن" (بزدلی) جنم لے لیتی ہے۔ عوام الناس عموماً شجاعت کا حقیقی مفہوم سمجھنے میں غلطی کا شکار رہے ہیں۔ وہ شجاعت کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ انسان موقع و محل دیکھے بغیر ہر جگہ سینہ تان کر اور شمشیر بکف ہو کر مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جائے حالانکہ یہ شجاعت نہیں بلکہ اجڈ پن ہے۔ شجاعت میں موقع و محل کی مناسبت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ہر موقع کی مناسبت سے مناسب اقدام کا نام شجاعت ہے۔ شجاع وہ ہے کہ اگر شمشیر زنی میں مصلحت ہو تو تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر میدان قتال و جدال میں کود پڑے اور اگر عواقب پر نگاہ کرتے ہوئے اپنے مقصد کا تحفظ تلوار کو نیام کے اندر کرنے میں پوشیدہ ہو تو وہاں صبر و ضبط سے کام لے کیونکہ

نہ ہر جا توان مرکبے تاختن　　　　کہ جاہا بود سپر انداختن

چونکہ ائمہ معصومین علیہم السلام شجاعت کے حقیقی مفہوم سے آگاہ اور صحیح معنوں میں شجاع تھے اس لیے دین کے تحفظ و بقا کی خاطر ان کا ہر اقدام موقع و محل کی مناسبت سے ہوتا تھا جہاں دیکھا دین کی بقا صبر و سکون میں ہے وہاں ساکت و صامت ہو کر خانہ نشین ہو گئے اور جہاں شمشیر زنی میں مصلحت دیکھی وہاں شمشیر بکف ہو کر میدان کارزار میں اتر آئے۔ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس زندگی کے مختلف ادوار میں یہ اختلاف عمل نمایاں طور پر نظر آتا

---

[1] اخلاق ائمہ، ص ۳۵۔

ہے۔ کیا کوئی مسلمان یہ جرأت کر سکتا ہے کہ آپؑ کے کسی اقدام صلح یا جنگ پر بزدلی یا تہور کا الزام لگائے؟ پس جو تاویل پیغمبر اکرمؐ کے اختلاف عمل کی کی جائے وہی ائمہ اطہارؑ کے مختلف اقدامات کی کرنی چاہیے۔ ہم نے اوپر اصل حقیقت بیان کر دی ہے کہ شجاعت نام ہی موقع ومحل کے مناسب اقدام کا ہے۔ بنابریں امام حسنؑ کے صلح کرنے اور امام حسینؑ کے جنگ کرنے کا ایراد درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتا ہے۔

بہرحال حضرت امام حسینؑ میں جوہر شجاعت بدرجہ اتم واکمل پایا جاتا ہے اگرچہ آپ اپنے عظیم والد کے حین حیات میں جنگ جمل وصفین میں اپنی شجاعت وشہامت کے جوہر دنیا کو دکھا چکے تھے مگر آپ کی شجاعت کا شاہکار معرکۂ کربلا ہے۔ بالخصوص روز عاشورا اور وہ بھی بعد از شہادت اصحاب واقرباء۔ بعض راویان اخبار کا بیان ہے: ﴿فو اللہ ما رأیت مکثوراً قط قد قتل ولدہ و اہل بیتہ و اصحابہ اربط جاشاً منہ علیہ السلام و ان کانت الرجال لتشد علیہ فیشد علیہا بسیفہ فتنکشف عنہ انکشاف المعزی اذا شد فیہا الذئب و لقد کان یحمل فیہم و قد تکملوا ثلاثین الفاً فینہزمون بین یدیہ کانّہم الجراد المنتشر۔ ثم یرجع الی مرکزہ و ہو یقول لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم﴾ بخدا میں نے کبھی کثرت اعداء کے نرغہ میں گھرے ہوئے ایسے شخص کو جس کا سارا گھرانہ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا ہو حسینؑ جیسا شجاع، ثابت قدم، مطمئن اور جری نہیں دیکھا۔ حالت یہ تھی کہ چاروں طرف سے پیادے حملہ کرتے تھے مگر جب امام حسینؑ تلوار سونت کر ان پر حملہ کرتے تو وہ اس طرح بھاگ کھڑے ہوتے جس طرح بھیڑیے کے حملہ کے وقت بکریاں بھاگ جاتی ہیں حالانکہ ان کی تعداد تیس ہزار تھی۔ مگر امامؑ کے حملہ کے وقت یوں تتر بتر ہو جاتے جیسے منتشر شدہ ٹڈیاں ہوں[1] حتیٰ کہ ایسی حالت میں علاوہ زخمیوں کے ایک ہزار نو سو پچاس ناریوں کو واصل جہنم کیا۔[2]

ان حقائق کی روشنی میں صاحب کشف الغمہ کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ شجاعۃ الحسین علیہ السلام یضرب بہا المثل و صبرہ فی مآقط الحرب اعجز الاواخر و الاول۔ حسینؑ کی شجاعت ضرب المثل ہے اور مقامات حرب وضرب میں ان کے صبر وثبات نے اوائل واواخر کو عاجز کر دیا ہے۔[3] و لنعم ما قیل ؎

حسینؑ جان مصطفیٰ وہی سب اس میں عادتیں ❊ سپہر تھرتھرا گیا دکھائیں وہ شجاعتیں
زمین جگمگا اٹھی ▪ دل سے کیں عبادتیں ❊ تن حسینؑ پاک سے چمک رہی تھی آیتیں
رکوع کی، سجود کی، قیام کی، قعود کی

---

[1] نفس المہموم ص ۱۸۷۔ ارشاد ص ۲۶۴۔ لہوف ۱۰۳۔
[2] عاشر بحار ص ۲۰۵۔ نفس المہموم ص ۱۸۸۔
[3] کشف الغمہ اربلی ص ۱۸۱ طبع ایران۔

♦ چوتھا باب ♦

حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعض معجزات

معجزہ کے لغوی معنی ہیں "عاجز کنندہ" اور اصطلاح علماء متکلمین میں "معجزہ" خداوند عالم کے اس خارق عادت فعل کو کہا جاتا ہے جسے وہ اپنے کسی نبی یا اس کے وصی کے ہاتھوں پر ان کی صداقت وحقانیت ظاہر کرنے کے لیے ظاہر کرتا ہے بشرطیکہ اس فعل کا ظہور مقرون بالتحدی ہو اور دعوائے نبوت وامامت کے ساتھ ملا ہوا ہو لہذا اگر کسی نبیؑ یا امامؑ سے کوئی ایسا فعل اعلان نبوت وامامت سے قبل صادر ہو تو اسے اصطلاح میں "ارہاص" کہا جاتا ہے اور اگر نبیؑ یا امام کے علاوہ کسی اور مقدس بزرگ سے ایسا کوئی خارق عادت امر ظاہر ہو تو اسے "کرامت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[1] معجزہ کی مذکورہ بالا اجمالی کیفیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ معجزہ کا حقیقی فاعل خداوند عالم ہوتا ہے ہاں چونکہ حسب ظاہر اس کا ظہور نبی وامام سے ہوتا ہے اس لیے مجازاً ان کا فعل کہلاتا ہے یہی امر قرآن کریم، احادیث معصومینؑ اور تحقیقات علماء متقدمین ومتاخرین سے مستفاد ہوتا ہے۔ تفصیل کے شائقین ہماری کتاب "اصول الشریعہ فی عقائد الشیعہ" کے باب چہارم کا مطالعہ فرمائیں۔

بہرکیف اس بات پر سب اہل حق کا اتفاق ہے کہ خداوند عالم کے مقرر کردہ انبیاء ومرسلینؑ اور اوصیاءؑ وائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کا صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے تاکہ صادق وکاذب کے درمیان آسانی امتیاز ہو سکے۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کے معجزات اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان کا عدّ واحصاء کرنا مشکل ہے ہم ذیل میں تبرکاً وتیمناً صرف حضرت سید الشہداء روحی لہ الفداء کے چند معجزات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پہلا معجزہ

ابی خالد کابلی یحییٰ بن ام الطویل سے نقل کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہم حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے کہ اس اثنا میں ایک نوجوان روتا ہوا آیا۔ آنجنابؑ نے اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ ابھی ابھی میری والدہ کا انتقال ہوا ہے اور وہ بڑی مالدار تھی مگر وہ اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں کر گئی اور نہ ہی اس کا کوئی اتہ پتہ بتا گئی ہے البتہ اس نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ اس کی تجہیز وتکفین وغیرہ سے قبل آپؑ کو اس کی موت کی اطلاع دے دوں۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: چلو اس مومنہ کے پاس چلیں۔ چنانچہ ہم اس کے گھر کے دروازے پر

---

[1] اصول الشریعہ فی عقائد الشیعہ، ص ۱۲۱ بحوالہ سبیل النجاۃ فی اصول الاعتقادات وغیرہ۔

پہنچے تو دیکھا کہ وہ عورت مردہ حالت میں کپڑے میں ڈھانپی ہوئی پڑی ہے۔ امام ؏ نے دہلیز دروازہ کے پاس کھڑے ہو کر ﴿دعا اللّٰہ لیحیھا حتٰی توصی بما تحب من وصیتھا فاحیاھا اللہ تعالٰی......﴾ بارگاہ احدیت میں دعا کی تا کہ خدا اسے زندہ کرے اور وہ اپنے حسب منشاء وصیت کرے۔ امامؑ کی دعا کے نتیجہ میں قادر مطلق نے اس عورت کو زندہ کر دیا اور وہ کلمۂ شہادت پڑھتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

امام ؏ کو دیکھ کر عرض کیا: ﴿ادخل البیت یا مولائی و مرنی بامرک﴾ میرے آقا اندر تشریف لایئے اور اپنے حکم سے آگاہ فرمایئے۔ چنانچہ امام عالی مقام ؏ اندر تشریف لائے اور تکیہ پر بیٹھ گئے۔ پھر اس مؤمنہ سے فرمایا: ﴿وصی یرحمک اللّٰہ﴾ خدا تم پر رحم کرے اپنی وصیت کر۔ اس نے عرض کیا: یابن رسول اللہؐ میرے پاس اتنا اتنا مال ہے جو فلاں جگہ رکھا ہے اس کا تیسرا حصہ تو میں آپؑ کی نذر کرتی ہوں تا کہ آپ جہاں مناسب سمجھیں اپنے محبوں میں صرف فرمائیں۔ اور دو حصے اپنے اس بیٹے کو دیتی ہوں بشرطیکہ آپؑ کے نزدیک آپؑ کے محبوں میں شامل ہو۔ ورنہ یہ بھی آپ کا مال ہے۔ ﴿فلا حق للمخالفین فی اموال المؤمنین﴾ کیونکہ مخالفین کا اہل ایمان کے مال میں کوئی حق نہیں ہے۔ پھر اس مؤمنہ نے امامؑ سے التماس کیا کہ آپؑ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں اور اس کی تجہیز وتدفین کا خود انتظام فرمائیں۔ اس کے بعد وہ اپنی حالت کی طرف لوٹ گئی (یعنی مرگئی)۔[1]

دوسرا معجزہ

ایوب بن اعین حضرت امام جعفر صادق ؏ سے روایت کرتے ہیں کہ امام حسین ؏ کے زمانہ میں ایک عورت ایام حج میں طواف کر رہی تھی اور ان کے پیچھے پیچھے ایک مرد بھی طواف میں مشغول تھا۔ اثناءِ طواف میں عورت نے اپنی کلائی باہر نکالی اور اس مرد نے اپنا ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیا۔ خدا نے اس کا ہاتھ وہیں کلائی میں گاڑ دیا۔ طواف منقطع ہو گیا۔ لوگ اس مرد و عورت کو پکڑ کر حاکم مکہ کے پاس لے گئے۔ اس نے فقہاء کی طرف رجوع کیا۔ سب نے یہی فتویٰ دیا کہ اس مرد کا ہاتھ کاٹ دینا چاہئے کیونکہ اس نے خانۂ خدا میں اس جرم شنیع کا ارتکاب کیا ہے۔ حاکم نے پوچھا آیا یہاں اولاد رسولؐ میں سے کوئی بزرگ موجود ہیں۔ لوگوں نے کہا: ہاں گزشتہ شب حضرت امام حسین ؏ تشریف لے آئے ہیں۔ اس نے امام عالی مقامؑ سے دربار میں تشریف لانے کی استدعا کی۔ جب آپ تشریف لائے تو اس نے تمام صورت حال عرض خدمت کی۔ ﴿فاستقبل القبلۃ و رفع یدیہ فمکثوہ طویلاً یدعو﴾ امام ؏ رو بقبلہ دست دعا بلند کر کے کافی دیر تک دعا کرتے رہے اس کے بعد وہاں تشریف لے گئے جہاں وہ مرد و عورت کھڑے تھے۔ ﴿حتٰی خلّص یدہ من یدھا﴾ اور پھر اپنے دست حق پرست سے اس مرد کے ہاتھ کو

---

[1] عاشر بحار، ص ۱۳۲،۱۳۹۔ و معہ ساکبہ، ص ۳۴۹ وغیرہ۔

عورت کے ہاتھ سے علیحدہ کر دیا۔ حاکم نے پوچھا: کیا ہم اس مرد کو سزا نہ دیں؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں۔[1]

تیسرا معجزہ

محمد بن عمارہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور وہ اپنے آباء و اجداد طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ سند سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ اہل کوفہ حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خشک سالی کی شکایت کرتے ہوئے آنجنابؑ سے استدعا کی کہ آپ طلب باراں کی دعا فرمائیں۔ آنجنابؑ نے اپنے شہزادہ امام حسین علیہ السلام کو حکم دیا کہ اٹھ کر ان کے لیے طلب باراں کرو۔ ﴿فقام و حمد اللّٰہ و اثنی علیه وصلی علی النبیؐ وقال اللّٰھم معطی الخیرات و منزل البرکات ارسل السماء علینا مدراراً ...... الخ﴾ شہزادہ نے کھڑے ہو کر پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجا۔ اس کے بعد دعا کی: یا اللہ! اے خیرات کے عطا کرنے والے اور برکات کے نازل کرنے والے موسلا دھار بارش برسا۔ راوی کہتا ہے ﴿فما فرغ من دعائه حتٰی غاث اللّٰہ غیثا بغتة﴾ ابھی امام علیہ السلام دعا سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ خداوند عالم نے اچانک باران رحمت نازل کر دیا اور کوفہ کے اطراف و جوانب سے ایک اعرابی آیا اور ذکر کیا کہ اس قدر بارش ہوئی ہے کہ کوفہ کے تمام نشیب و فراز والے مقامات لبریز ہو گئے ہیں۔[2]

چوتھا معجزہ

جب امام علیہ السلام نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت ام سلمہؓ نے ان کو یہ کہہ کر اس ارادہ سے روکنے کی کوشش کی کہ میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ عراق میں شہید کیا جائے گا اور میرے پاس ایک شیشی میں اس جگہ کی مٹی بھی ہے۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿انی واللّٰہ مقتول کذالک وان لم اخرج الی العراق یقتلوننی فان احبت ان اریک مضجعی و مضجع من یستشھد معی فعلت!!﴾ خدا کی قسم میں ضرور اسی طرح شہید کیا جاؤں گا (جس طرح میرے جد نامدار نے خبر دی ہے) اور اگر میں عراق نہ بھی جاؤں تو بھی یہ ظالم مجھے ضرور قتل کر ڈالیں گے۔ پھر فرمایا: اگر آپ چاہیں تو میں ابھی آپ کو اپنی اور اپنے اصحاب کی قتل گاہ بھی دکھا دوں۔ جناب ام سلمہؓ نے کہا: ﴿قد شئت و حضرته﴾ "ہاں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" ﴿فتکلم باسم اللّٰہ عزوجل الاعظم فانخفضت الارض حتی اراھا مضجعه و مضجعھم و اعطاھا من التربة...... الخ﴾ امام علیہ السلام نے اسم اعظم پڑھا۔ پس فوراً زمین پست ہو گئی۔ امام علیہ السلام نے جناب ام سلمہؓ کو

---

[1] عاشر بحار الانوار، ص۱۴۲، دمعہ ساکبہ، ص۲۶۹۔ مناقب شہر ابن آشوب، ج۲، ص۶۸، تظلم الزہراء، ص۹۔

[2] عاشر بحار، ص۱۴۳۔ دمعہ ساکبہ، ص۲۷۰ وغیرہ۔

اپنی اور اپنے اصحاب واعزہ کی قتل گاہ دکھائی اور کچھ خاک کربلا بھی ان کے حوالہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فاذا فاضت دما فاعلمی انی قد قتلت﴾ جب اس سے خون ابلنے لگے تو سمجھ لینا کہ میں شہید ہو گیا ہوں۔ جناب ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب روز عاشورا ظہر کے بعد میں نے دونوں شیشیوں کو دیکھا تو ان سے خون ابل رہا تھا اس وقت میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔[1]

پانچواں معجزہ

جناب سید الشہداء علیہ السلام کا گلوئے بریدہ سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہے جس کی تفصیل بعد از شہادت کے واقعات میں آئیگی اسی طرح میدان کربلا میں بعض اشقیاء آنجنابؑ کے حق میں گستاخی کرنے اور پھر امامؑ کی دعائے بد سے فوراً ان کے واصل جہنم ہو جانے کے واقعات بھی آنجنابؑ کے معجزات باہرہ میں سے ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی اسی کتاب میں اپنے مناسب مقام پر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ فانتظر۔

---

[1] نفس المہموم ص ۸۸ وغیرہ۔

پانچواں باب

حضرت امام حسین علیہ السلام کی امامت حقہ کے بعض دلائل و براہین

اگر چہ آنجناب کی خلافت و امامت بیخ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کی مصداق ہے نیز اس موضوع پر ہر زبان میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس پر مزید کچھ خامہ فرسائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میں خود بفضلہ تعالیٰ اس موضوع پر ایک مبسوط و مدلل کتاب بنام "اثبات امامۃ الائمۃ الاطہار فی ضوء العقل والآیات والاخبار" لکھ چکا ہوں جو منظر عام پر آ چکی ہے اور گم گشتگان وادیٔ ضلالت کے لیے اسباب رشد و ہدایت فراہم کر رہی ہے تاہم بطور تبرک و تیمن ذیل میں امام عالی مقام علیہ السلام کی امامت حقہ کے چند دلائل کی طرف اجمالی اشارہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ہر لحاظ سے مکمل و مختتم ہو جائے اور کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔

ارباب دانش جانتے ہیں کہ آنجناب کی امامت مطلقہ کو عمومی اور خصوصی طور پر ہر طرح ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اول

اتنا تو سنی و شیعہ ہر دو فریق کے نزدیک مسلّم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ خلفاء ان کی مسند کے وارث ہوں گے جیسا کہ بخاری و مسلم وغیرہ صحاح ستہ کی متعدد احادیث نبویہ سے بھی ثابت ہے۔ ہاں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف ان بارہ خلفاء کی تعیین میں ہے۔ دو ہی سلسلے پیش نظر ہیں۔ ایک وہ جو حضرت علی علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت قائم آل محمد عجل اللہ تعالیٰ فرجہ پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو ابوبکر صاحب سے شروع ہوتا ہے اور بالعموم اس کا اختتام ولید بن یزید بن عبدالملک بن مروان پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہمارے علم کلام و مناظرہ میں ناقابل رد دلائل قاطعہ سے اس دوسرے سلسلہ کی خلافت و امامت باطل کی جا چکی ہے اور اس کے بطلان سے خود بخود پہلے سلسلۂ جلیلہ کی امامت حقہ ثابت ہو جاتی ہے۔

دوم

خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے نصوص کثیرہ موجود ہیں۔ جن میں نام بنام آنحضرتؐ نے اپنے حقیقی خلفاء و اوصیاء کی تعیین و تشخیص فرما دی ہے یہاں بنظر اختصار صرف ایک دو روایات شریفہ نقل کی جاتی ہیں۔ (۱) جناب جابر بن عبداللہ انصاری بیان فرماتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ اولی الامر ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ نازل ہوئی تو میں نے بارگاہ رسالتؐ میں عرض کیا: ﴿عرفنا اللّٰه و رسوله فمن اولو الامر الذین

قرن اللّٰہ طاعتہم بطاعتک؟﴾ یارسول اللہؐ! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کو تو پہچان لیا ہے مگر یہ اولی الامر کون ہیں جن کی اطاعت خداوند عالم نے آپ کی اطاعت کے ساتھ ملا کر واجب کی ہے۔ جناب رسول خداؐ نے فرمایا:

﴿ہم خلفائی یا جابر و ائمة المسلمین من بعدی اولهم علیؑ بن ابی طالب ثم الحسنؑ و الحسینؑ ثم علیؑ بن الحسینؑ ثم محمدؑ بن علیؑ المعروف فی التوراة بالباقر و ستدرکه یا جابر فاذا لقیته فاقراه منی السلام ثم الصادق جعفرؑ بن محمدؑ ثم موسیٰؑ بن جعفرؑ ثم علیؑ بن موسیٰؑ ثم محمدؑ بن علیؑ ثم علیؑ بن محمدؑ ثم الحسنؑ بن علیؑ ثم سمّی و کنیتی حجة اللّٰہ فی ارضه و بقیته فی عباده ابن الحسنؑ بن علیؑ ذاک الذی یفتح اللّٰہ تعالیٰ ذکره علی یدیه مشارق الارض و مغاربها ذاک الذی یغیب عن شیعته و اولیائه غیبة لا یثبت فیها علی القول بامامته الا من امتحن اللّٰہ قلبه للایمان﴾

اے جابرؓ! وہ میرے خلفاء اور میرے بعد مسلمانوں کے امام ہیں۔ پہلے حضرت علیؑ بن ابی طالب۔ ان کے بعد حسنؑ پھر حسینؑ پھر علیؑ بن حسینؑ پھر محمدؑ بن علیؑ جو کہ توراۃ میں باقر کے لقب سے مشہور ہیں۔ اے جابرؓ عنقریب تم ان سے ملاقات کرو گے جب ان سے ملو تو میرا انہیں سلام پہنچا دینا۔ ان کے بعد جعفرؑ بن محمدؑ (صادق) ان کے بعد موسیٰؑ بن جعفرؑ (کاظم) پھر علیؑ بن موسیٰؑ (رضا) پھر محمدؑ بن علیؑ (تقی) پھر علیؑ بن محمدؑ (نقی) پھر حسنؑ بن علیؑ (عسکری) پھر میرے ہم نام وہم کنیت حجۃ اللہ فی الارض وبقیۃ اللہ فی البلاد فرزند حسنؑ بن علیؑ۔ یہی وہ بزرگوار ہے جس کے ہاتھوں پر خداوند عالم مشارق و مغارب کو فتح کرے گا۔ (اور ہر جگہ حقیقی اسلام کا پرچم لہرائے گا) اور یہ امام اپنے شیعوں اور دوستوں سے اس قدر طویل غیبت اختیار کریں گے کہ ان کی امامت پر صرف وہی لوگ ثابت قدم رہیں گے جن کے ایمان وایقان کا خدائے رحمٰن نے امتحان لے لیا ہوگا۔[1]

(۲) حضرت سلمانؓ محمدی بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار میں جناب رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسینؑ ان کی ران پر بیٹھے تھے اور آنحضرتؐ ان کی آنکھوں اور منہ پر بوسہ دے رہے تھے اور ساتھ ہی فرماتے جاتے تھے: ﴿انت سید بن سید انت امام بن امام ابو ائمة انت حجة بن حجة ابو حجج تسعة من صلبک تاسعهم قائمهم﴾ تو سردار اور سردار کا بیٹا ہے تو امام اور امام کا بیٹا اور ائمہ کا باپ ہے۔ تو حجت خدا اور

---

[1] اکمال الدین شیخ صدوقؒ، باب فی نص اللہ تبارک وتعالیٰ علی القائمؑ، صفحہ ۲۳۶۔ کفایۃ الاثر، ص ۲۹۵، مطبوعہ مع اربعین مجلسیؒ۔ عاشر بحار اور دمعۃ الساکبہ، ص ۳۶۶۔ ینابیع المودۃ، باب ۹۴، ص ۴۹۴۔

حجت خدا کا بیٹا اور نو حجت ہائے خدا کا باپ ہے جو تیری صلب سے ہوں گے جن کا نواں قائم (آل محمدؐ) ہوگا۔[1]

سوم

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت بلافصل اور امامت مطلقہ دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کے ساتھ ثابت ہے۔ (ان دلائل کے یہاں نقل کرنے کی گنجائش نیز ضرورت نہیں ہے فلتطلب من مظانھا) اب آنجنابؑ جس پر نص امامت فرمادیں گے وہ امام سمجھا جائے گا اور یہ امر نصوص متکافرہ بلکہ متواترہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے امام حسن علیہ السلام کے بعد امام حسین علیہ السلام کی امامت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ہم بنظر اختصار صرف ایک ارشاد نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ جناب اصبغ بن نباتہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت امیر علیہ السلام اپنے دولت سرا سے اس حالت میں برآمد ہوئے کہ ان کا ہاتھ امام حسن علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا۔ ﴿وھو یقول خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ ذات یوم و یدی فی یدہ ھکذا وھو یقول خیر الخلق بعدی و سیدھم اخی ھذا امام کل مسلم و مولی کل مومن بعد وفاتی الا وانہ سیظلم بعدی کما ظلمت بعد رسول اللہ و خیر الخلق و سیدھم بعد الحسن ؑ ابنی اخوہ الحسین ؑ المظلوم بعد اخیہ المقتول فی ارض کربلا الا انہ و اصحابہ سادۃ الشھداء یوم القیامۃ ومن بعد الحسین ؑ تسعۃ من صلبہ خلفاء اللہ فی ارضہ و حججہ علی عبادہ و امنائہ علی وحیہ و ائمۃ المسلمین و قادۃ المؤمنین و سادۃ المتقین و تاسعھم القائم﴾ (الحدیث) اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرما رہے تھے کہ ایک بار اسی طرح جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ برآمد ہوئے تھے اور میرا ہاتھ اسی طرح ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت وہ فرما رہے تھے۔ میرے بعد تمام مخلوق سے افضل اور ان کا سردار میرا یہ بھائی ہے یہی ہر مسلمان کا امام اور میری وفات کے بعد ہر مومن کا آقا و سردار ہے (اس کے بعد جناب امیرؑ نے فرمایا) آج اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ میرے بعد سب لوگوں سے افضل اور ان کا سردار میرا یہ بیٹا حسنؑ ہے۔ یہ میری وفات کے بعد ہر مسلمان کا امام اور ہر مومن کا آقا ہے لیکن ان پر بھی میری وفات کے بعد اسی طرح ظلم و ستم کیا جائے گا جس طرح پیغمبر کی وفات کے بعد مجھ پر کیا گیا تھا۔ پھر میرے اس بیٹے کے بعد سب مخلوق سے افضل اور ان کا سردار ان کا بھائی حسینؑ ہے۔ جس پر اپنے بھائی کے بعد ظلم کیا جائے گا اور وہ زمین کربلا میں شہید کیا جائے گا۔ وہ اور ان کے ساتھ شہید ہونے والے بزرگوار بروز قیامت تمام شہداء کے سردار ہوں گے۔ حسینؑ کے بعد ان کی پشت سے نو بزرگوار اللہ کی زمین میں اس کے خلفاء اس کے بندوں پر، اس کی وحی پر اس کے امین، مسلمانوں کے امام، مومنوں کے قائد اور متقیوں کے سردار ہوں گے ان میں کا نواں قائم (آل محمدؐ) ہوگا۔[2]

---

[1] الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۶۶۔ ینابیع المودۃ، ص ۱۹۸، باب ۵۴۔
[2] الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۶۷۔ کفایۃ الاثر۔ حق الیقین۔

چہارم

جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کی نص کے مطابق ان کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام امام مفترض الطاعة ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب جس پر امام حسن علیہ السلام نص فرمائیں گے وہی آپ کے بعد مسند آرائے امامت ہوگا۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ امام حسن مجتبیٰ نے اپنے بعد جناب امام حسین علیہ السلام کی نشان وہی فرمائی تھی اور اپنی تجہیز و تکفین وغیرہ امور کی بھی انہی کو وصیت فرمائی تھی اور اسرار نبوت و ودائع امامت آپؑ کے ہی سپرد کئے تھے۔ آپ کا یہ ارشاد کتب معتبرہ میں موجود ہے فرمایا: ﴿ان الحسینؑ بن علیؑ بعد وفاة نفسی و مفارقة روحی جسمی امام من بعدی و عند اللہ جل اسمہٗ فی الکتب الماضی وراثة من النبیؐ..... الخ﴾ یعنی میری وفات اور روح و جسم کی مفارقت کے بعد حسین بن علی کتاب اللہ کے مطابق وراثۃ من النبیؐ میری مسند امامت کے وارث ہیں۔[1]

پنجم

باب چہارم میں یہ امر ثابت کیا جا چکا ہے کہ نبی و امام کا صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر جو صاحب معجزہ ہے وہ یا نبی ہے یا نبی کا وصی۔ نیز سابقہ باب میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعدد معجزات قاہرہ و آیات باہرہ بیان کئے جا چکے ہیں۔ بعد ازیں دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا تو اس کو نبی مانا جائے یا امام؟ لیکن چونکہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہر قسم کی نبوت کا دروازہ تو ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے اب کوئی نبی تو ہو نہیں سکتا لہٰذا لا محالہ آپ کو وصیِ نبی اور امام حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ وھو المطلوب و قد حصل بعون اللہ الودود۔

مخفی نہ رہے کہ آنجناب کا دعوائے امامت کرنا اظہر من الشمس ہے اور علاوہ دیگر بیسیوں شواہد و دلائل کے آپ کا وہ خطبہ شریفہ بھی اس امر پر نص صریح ہے جو آپ نے امیر شام کے روبرو ارشاد فرمایا تھا جو اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۵۹ پر گزر چکا ہے۔ فراجع۔

---

[1] الدمعة الساکبة، عاشر بحار، ص ۱۴۰، اصول کافی، ص ۱۵۳، طبع ایران۔

چھٹا باب

حضرت امام حسین علیہ السلام کی ازواج اور اولاد امجاد کی تعداد

کتب سیر و تواریخ میں امام حسین علیہ السلام کی چند ازواج محترمات کے اسماءِ گرامی ملتے ہیں جو مختلف اوقات میں آنجناب کی زوجیت کے شرف سے مشرف ہوئیں۔ ہم ذیل میں ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) **جناب شہر بانویہ** بنت یزدجرد بن شہریار بن پرویز بن ہرمز بن کسریٰ انوشیروان العادل۔ یزدجرد بادشاہان فارس میں سے آخری بادشاہ تھے۔

مشہور یہ ہے کہ یہ معظمہ بی بی خلیفہ دوم کے ایام خلافت میں قید ہو کر مدینہ آئیں اور امام حسین علیہ السلام کی زوجیت کے شرف عظیم سے مشرف ہوئیں جیسا کہ اصول کافی وغیرہ کتب سے مستفاد ہوتا ہے۔

اور عیون اخبار الرضاؑ باب ۳۴ کی ایک روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفہ سیوم کے ایام خلافت میں آئیں۔ اسی قول کی شبلی نعمانی نے الفاروق میں تائید کی ہے لیکن ارشاد شیخ مفید علیہ الرحمہ ص ۸۰ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ مخدرہ حضرت امیر المومنینؑ کی ظاہری خلافت کے دور میں آئیں[۱] واللہ العالم۔

ان مخدرہ کے بطن سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام متولد ہوئے اسی لیے آنجناب کو ابن الخیرتین (دو برگزیدہ خاندانوں عرب میں بنی ہاشم اور فارس میں سے کسریٰ انوشیرواں) کے چشم و چراغ کہا جاتا ہے۔

و ان غلاماً بین کسری و هاشم   لاکرم من نیطت علیه التمائم

نیز یہ بھی مخفی نہ رہے کہ جو امر روایات معتبرہ سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ معظمہ ولادت امام کے بعد جلد وفات پا گئی تھیں اس لیے واقعہ کربلا میں موجود نہ تھیں۔[۲] (تفصیلات کا انتظار کریں)

(۲) **معظمہ لیلیٰ** بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود بن معتب الثقفی۔ یہ محترمہ قمر بنی ہاشم شہزادہ علی اکبر کی والدہ ماجدہ ہیں عروہ بن مسعود وہ عظیم انسان تھا جس کی عظمت کا لوہا تمام عرب مانتے تھے چنانچہ ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جو بات آیہ مبارکہ ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ (یہ قرآن طائف و مکہ کے دو شہروں میں سے کسی عظیم مرد پر کیوں نازل نہیں ہوا؟) میں مذکور ہے۔ یہ بات ولید بن مغیرہ نے کہی

---

۱ منتخب التواریخ ص ۲۲۲،۲۲۳۔

۲ بحار الانوار ج ۱۱ ص ۳، منتخب التواریخ ص ۲۲۳ وغیرہ۔

تھی کہ ﴿لو کان ما یقول محمدٌ حقا لا نزل القران علی او عروۃ بن مسعود الثقفی﴾ اگر محمدؐ کی بات درست ہوتی تو پھر قرآن مجید مجھ یا عروہ بن مسعود ثقفی پر نازل ہوتا۔ جناب عروہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے ﴿و کان یشبہ بالمسیح فی صورتہ﴾ اور اسے شکل و صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی۔[1]

(۳) جناب رباب بنت امراء القیس بن عدی الکلبیہ (امراء القیس سے عرب کا مشہور شاعر امراء القیس مراد نہیں ہے) یہ مخدرہ سکینہ بنت الحسینؑ اور عبداللہ بن الحسینؑ (جو کہ علیؑ اصغر کے نام سے مشہور ہیں) کی والدہ ماجدہ ہیں۔ صاحب مقام نے ہشام کلبی (نسابہ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ﴿کانت الرباب من خیار النساء و افضلھن﴾ جناب رباب منتخب روزگار اور افضل ترین عورتوں میں سے تھیں۔ بعض آثار و اخبار سے یہ بات واضح و آشکار ہوتی ہے کہ سرکار سید الشہداء علیہ السلام کو ان محترمہ سے خاص تعلق خاطر تھا۔ عام کتب سیر و مقاتل میں یہ اشعار جناب امام حسین علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔[2]

لعمرک اننی لاحب داراً	تکون بھا سکینۃ و الرباب
احبھما و ابذل جل مالی	و لیس لعاتب عندی عتاب
ولست لھم و ان عابوا مطیعاً	حیاتی او یغیبنی التراب

یہ مخدرہ واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔ جب قید و بند سے رہا ہو کر واپس مدینہ پہنچیں تو اشراف و اکابر قریش نے آپ کی خواستگاری کی مگر آپ نے یہ فرما کر ﴿ما کنت لا تخذ بعد رسول اللّٰہ خسراً﴾ (میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد اور کوئی خسر نہیں بنانا چاہتی) ــــــــــــ

ــــــــــــ ان کی خواستگاری مسترد کر دی۔ انہی کے متعلق ــــــــــــ

مشہور ہے کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام کے بعد ایک سال زندہ رہیں اور تا زیست سایہ میں نہ بیٹھیں حتیٰ کہ اسی رنج و الم میں گھل گھل کر دنیا سے رخت سفر باندھ کر آخرت کی طرف سدھا گئیں۔

(۴) محترمہ ام اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ التیمیہ۔ یہ جناب فاطمہ بنت الحسینؑ کی والدہ مکرمہ ہیں۔ ان کے والد طلحہ وہی بزرگ ہیں جو برادران اسلامی کے نزدیک عشرۂ مبشرہ میں داخل ہیں۔ یہ محترمہ پہلے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زوجیت میں تھیں۔ شہزادہ حسین بن حسنؑ اور طلحہ بن الحسنؑ انہی کے بطن سے متولد ہوئے۔ جناب امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان سے عقد کیا۔ مقام ذخار کی ایک روایت سے مترشح ہوتا

---

[1] منتخب التواریخ ص ۲۳۷، بحوالہ اسد الغابہ جزری۔

[2] منتخب التواریخ ص ۲۳۸۔

ہے کہ یہ عقد حضرت امام حسن علیہ السلام کی وصیت کے نتیجہ میں عمل میں لایا گیا تھا۔[1]

(۵) جناب قضاعیہ :۔ یہ شہزادہ جعفر بن الحسینؑ کی والدہ ماجدہ ہیں جن کا امامؑ کے حین حیات میں مدینہ کے اندر انتقال ہو گیا تھا۔[2]

آنجنابؑ کی اولاد امجاد کی تعداد میں اگرچہ فی الجملہ اختلاف ہے مگر جو امر محققین علماء سیر و تواریخ کی تحقیقات کے بعد پایہ ثبوت تک پہنچا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آنجنابؑ کے چار صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔

(۱) حضرت علیؑ بن الحسینؑ امام زین العابدینؑ۔ (۲) شہزادہ علی اکبرؑ۔ (۳) شہزادہ عبد اللہ مشہور بہ علی اصغر۔ (۴) شہزادہ جعفر بن الحسینؑ۔ (۵) جناب فاطمہؑ خاتون۔ (۶) جناب سکینہؑ خاتون۔[3]

جناب علامہ مجلسیؒ نے بھی چھ عدد اولاد والا قول لکھنے کے بعد فرمایا ہے: ﴿و انچه مذکور شد اظهر و میان علماء امامیه اشهر است﴾[4]

سطور بالا میں اجمالاً لکھا جا چکا ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی والدۂ ماجدہ کا اسم گرامی شہر بانویہ (و بروایتے شاہ زناں) ہے اور قمر بنی ہاشم شہزادہ علی اکبرؑ کی والدہ ماجدہ جناب لیلیٰ بنت ابی مرہ ثقفیہ تھیں اور شہزادہ عبد اللہ معروف بہ علی اصغرؑ اور جناب سکینہؑ بنت الحسینؑ ہر دو کی والدہ ماجدہ جناب رباب بنت امرء القیس کلبیہ ہیں اور شہزادہ جعفر محترمہ قضاعیہ کے بطن سے ہیں اور جناب فاطمہؑ خاتون کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ام اسحاق تیمیہ ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد ان کے جو صاحبزادے زندہ رہے اور جن سے امام حسین علیہ السلام کی نسل بڑھی وہ صرف حضرت علیؑ بن حسینؑ (امام زین العابدین علیہ السلام) ہیں۔ باقی دو شہزادے (جناب علی اکبر و اصغرؑ) میدان کربلا میں شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوئے اور شہزادہ جعفر کا واقعہ کربلا سے پہلے مدینہ میں طبعی موت سے انتقال ہو گیا تھا۔ کسی شاعر نے امام زین العابدین علیہ السلام کو آل رسول کا باوا آدم قرار دیا ہے ؎

علیّ السجاد محراب الدعا ادم الآل علیّ بن الحسینؑ

حمد اللہ مستوفی نے اپنی تاریخ گزیدہ میں لکھا ہے: یزید عنید کے چودہ لڑکے تھے اور حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی شہادت کے وقت صرف ایک شہزادہ چھوڑ گئے تھے لیکن اس کے باوجود آج تمام اطراف و اقطار عالم میں

---

[1] و [2] منتخب التواریخ ص ۲۲۸، مخفی نہ رہے کہ ارشاد شیخ مفید، منتہی الآمال، مناقب شہر ابن آشوب وغیرہ کتب معتبرہ میں انہی پانچ ازواج محترمات کے حالات ملتے ہیں۔ واللہ العالم۔

[3] تفصیل کیلئے ارشاد مفید، اعلام الوریٰ طبرسی، عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب، جلاء العیون مجلسی، منتہی الآمال، محدث قمی، منتخب التواریخ محدث خراسانی، ناسخ التواریخ مرزا سپہر کاشانی، قمقام زخار و صمصام بتار شہزادہ فرہاد مرزا وغیرہ کتب معتبرہ کی طرف رجوع کیا جاوے۔

[4] جلاء العیون، ص ۴۳۹، طبع ایران۔

حسین علیہ السلام کی اولاد آسمانی ستاروں سے بھی زیادہ موجود ہے اور نسل یزید کا کہیں کوئی نام و نشان بھی موجود نہیں [1] اور یہ بات ﴿اِنَّا اَعۡطَيۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ۔ وَ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ﴾ کی اصلی تفسیر ہے۔

یـریـد الـجـاحـدون لیطفؤه   ویـابـی الـلّٰـه الا ان یـتـمّـه

اور صاحبزادیوں میں سے جناب فاطمہؑ خاتون سے آپؑ کی نسل بڑھی جو کہ جناب شہزادہ حسن مثنیٰ کی زوجیت میں تھیں اور ان سے ان کے تین صاحبزادے متولد ہوئے: (۱) عبد اللہ المحض ۔ (۲) ابراہیم الغمر ۔ (۳) حسن المثنیٰ ۔ (تفصیلات دیکھنے کے شائقین عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب کا مطالعہ فرمائیں)۔

---

[1] بحوالہ منتخب التواریخ ص ۲۳۹۔

ساتواں باب

امام حسین علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا دور

وفاتِ پیغمبرؐ سے شہادتِ جناب امیرؑ
اور شہادتِ جناب امیرؑ سے شہادتِ امام حسنؑ تک
۱۱ھ تا ۴۰ھ تا ۵۰ھ

حضرت امام حسین علیہ السلام کی کل عمر شریف ستاون برس اور کچھ ماہ ہے جس میں قریباً سات برس جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اور چھتیس سال اپنے والد ماجد حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ہمراہ اور چھیالیس برس اپنے برادر معظم حضرت امام حسن علیہ السلام کی معیت میں گزارے اور قریباً دس برس اور کچھ ماہ اپنی ظاہری امامت کی مدت ہے۔ ہم نے سابقہ ابواب میں سرکار سید الشہداءؑ کے چیدہ چیدہ حالات اور فضائل و کمالات لکھ دیے ہیں۔ ناناؐ کے حین حیات میں آپ صغیر السن تھے مگر یہ آپ کے ناز و نعم اور لاڈ پیار کا دور تھا جو بہت جلد بیت گیا اور ۱۱ھ میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ آنحضرت کی وفات شمع رسالتؐ کے تمام پروانوں کے لیے بالعموم اور ان کے اہل بیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بالخصوص بڑا روح فرسا و جانگداز حادثہ تھی۔ بالاخص حسینؑ کے غم و ہم کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جس کے ساتھ پیغمبر کی شفقت کا انداز ہی نرالا تھا وہ نانا جو اپنی گود میں بٹھاتا تھا، سینہ پر لٹاتا تھا اور کاندھے پر چڑھاتا تھا جو ذرا سی بھی خاطر شکنی حسینؑ کی گوارا نہ کرتا تھا آج حسینؑ آنکھیں پھیر پھیر کر چاروں طرف دیکھتے تھے اور وہ شفیق و مہربان نانا نظر نہ آتا تھا۔[1]

جب ایک مورخ دیکھتا ہے کہ وفات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر خلافت ثالثہ کے دور تک بلکہ ظاہری خلافت امیرؑ و امام حسن مجتبیٰ علیہم السلام تک اسی حسینؑ کے حالات پر بالکل پردہ پڑا ہوا ہے تو اسے بڑا تعجب ہوتا ہے اور مایوسی بھی! کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ابھی چند روز پیشتر حیات رسولؐ کے زمانہ میں ان کی توقیر و تعظیم کیا تھی؟ یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے فضائل و مناقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے برابر سنے جاتے ہیں۔ یہ وہی حضرات ہیں جن کی محبت تمام اہل اسلام پر واجب کی گئی تھی۔ یہ وہی ذوات عالیہ ہیں جن کی اطاعت جزو ایمان اور ارکان اسلام

---

[1] شہید انسانیت ص ۶۶۔

میں سے بتائی گئی تھی۔ یہ وہی مقدس بزرگوار ہیں جو اپنی ذاتی شرافت وفضیلت کے اعتبار سے تمام لوگوں پر ترجیح رکھتے تھے جن کا دوست خدا اور رسول کا دوست اور جن کا دشمن خدا اور رسول کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔[1]

مگر آنحضرت ﷺ کے بعد ان کے حالات وواقعات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ارباب عقل واطلاع پر اس کی اصلی وجہ مخفی ومستور نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد ذاتی ہوا وہوس اور ذاتی اقتدار کی خاطر کچھ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ مسند رسولؐ کے جو حقیقی وارث وجانشین تھے ان کو خانہ نشین کر دیا گیا اور ان خود غرضیوں کے پیش نظر رسول خدا ﷺ کی وصیتوں کو بھلا دیا گیا۔ خدا ورسولؐ کے فرمان نظر انداز کر دیے اور ۔۔

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اے کاش دنیوی وملکی اقتدار سلب کرنے کے بعد اہل اسلام کم از کم دینی معاملات میں تو خاندان رسولؐ کے فیوض وبرکات سے استفادہ کرتے رہتے مگر افسوس ان کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا اور رئیس اہل بیتؑ حضرت امیر المومنینؑ نے بھی اس وقت صبر وسکوت میں اسلام کی بقاء وبہتری دیکھتے ہوئے ان لوگوں کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں پر صبر وضبط سے کام لیا اور خانہ نشین ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح تقریباً پچیس سال گزر گئے۔ اس مدت مدید میں یہ حضرات بڑی خاموشی اور حکمت عملی کے ساتھ معارف قرآن وحدیث اور حقائق اسلام وایمان کی تعلیم وتلقین اور ترتیب وتدوین کرتے رہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا شغل معلوم نہیں ہوتا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برسر اقتدار طبقہ اور جناب امیر ؑ کے باہمی تعلقات بڑے خوشگوار تھے لیکن قطع نظر دوسرے بے شمار قرائن وشواہد کے جو اس دعویٰ کو قطعاً باطل ثابت کرتے ہیں صرف یہی بات اس دعویٰ کی نفی کے لیے کافی ہے کہ تینوں خلافتوں کے دور میں بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں اور ان لوگوں کے خیال کے مطابق یہ تھیں بھی اسلامی جنگیں مگر کوئی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ علی بن ابی طالب ایسے اسلامی جرنیل نے کسی جنگ میں شمولیت فرمائی ہو؟ بہر حال یہ تھے وہ علل واسباب جن کی وجہ سے ان خلافتوں کے دور میں امام مظلومؑ کے حالات زاویہ خمول میں مستور نظر آتے ہیں اور آپؑ کے حالات مبارکہ میں لکھی گئی بڑی بڑی ضخیم کتب مثل بحار الانوار، مقتام ذخار اور ناسخ التواریخ وغیرہ بھی بالکل تہی دامن نظر آتی ہیں۔ صاحب ذبح عظیم نے اس دور کے دو تین واقعات درج ضرور کیے ہیں مگر وہ ایسے واقعات ہیں کہ خود مرحوم کو اعتراف ہے کہ "ان واقعات سے بھی ان حضرات کا کوئی خاص تعلق کسی خاص مقصد اسلامی سے نہیں پایا جاتا اور نہ ان سے کسی ملکی ضرورت سے لگاؤ ثابت ہوتا ہے اور نہ فرمانروائے عہد کی کوئی توجہ اور

[1] ذبح عظیم ص ۷۵۔

التفات ظاہر ہوتی ہے۔"[1]

اسی لیے ہم نے ان واقعات کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔

باقی رہا حضرت امیر علیہ السلام اور حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا مختصر ظاہری دور خلافت و امامت۔ اس میں اگرچہ امام حسین علیہ السلام کے بعض ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں جو قابل تذکرہ ہیں اور ہم بعد ازیں عنقریب ان واقعات کا تذکرہ بھی کریں گے انشاء اللہ مگر خاص اہم واقعات کے نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں حسب ظاہر امام حسینؑ کی پوزیشن ایک محکوم کی ہے نہ حاکم کی، امام وقت حضرت امیر علیہ السلام ہیں یا امام حسن علیہ السلام اور یہ بات شیعی نقطہ نگاہ سے مسلم الثبوت ہے کہ جب کسی وقت میں دو امام اکٹھے ہوں تو حکم اسی امام کا نافذ ہوتا ہے جو ظاہری درجۂ امامت پر فائز ہوتا ہے اور دوسرا ساکت و صامت ہوگا۔ اصول کافی (ص ۷۶) وغیرہ کتب معتبرہ میں اس مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں۔ کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے دریافت کیا جاتا ہے: ﴿تکون الارض لیس فیھا امام؟﴾ آیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زمین میں امام (حجت خدا) موجود نہ ہو۔ اور وہ جواب میں فرماتے ہیں: ﴿لا﴾ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر راوی پوچھتا ہے: ﴿یکون امامان؟﴾ آیا بیک وقت دو امام ہو سکتے ہیں جواب دیا جاتا ہے: ﴿لا الا واحدھما صامت﴾ نہیں مگر اس صورت میں کہ ایک ساکت و صامت ہو! اس لئے آپؑ کے بابا اور بھائی کے دوار خلافت میں بھی ایسے واقعات بہت کم ملتے ہیں جن کو آپؑ کی مخصوص سیرت میں درج کیا جا سکے۔ علاوہ بریں ان ہر دو بزرگواروں کے دور میں بھی امت کی مہربانیوں سے سکون و اطمینان کہاں نظر آتا ہے تاکہ یہ بزرگوار طمانیت قلب کے ساتھ اپنے علمی و عملی کارنامے انجام دیتے۔

بہر حال محض اس خیال سے کہ قارئین کرام ہماری کتاب میں یہ خلا بری طرح محسوس نہ کریں۔ جو کچھ تھوڑے بہت سیر و تواریخ میں اس طویل دور کے واقعات ملتے ہیں۔ جن کا براہ راست سید الشہداء کی ذات کے ساتھ تعلق ہے۔ یا وہ واقعات جو اگرچہ کسی اور ذات سے متعلق ہیں۔ لیکن اپنے دوررس اثرات کی وجہ سے واقعہ کربلا کے ساتھ بالواسطہ مرتبط ہیں ان کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بجائے اس کے کہ ہم خود کچھ خامہ فرسائی کریں۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مستطاب "شہید انسانیت" طبع ثانی میں اس موضوع پر جو سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے جو کئی صفحات تک پھیلا ہوا ہے اس کا ایک جامع خلاصہ یہاں پیش کر دیں۔ چنانچہ صاحب شہید انسانیت مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ رسول کی خلافت کا مسئلہ اتنا اختلافی بن گیا۔ کہ آج تک اس کی بنا پر شیعہ اور سنی کا تفرقہ قائم

---

[1] ذبح عظیم، ص ۲۵۶۔

ہے یہاں اس پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے نہ ان ناگوار واقعات کا کوئی مستقل تذکرہ مقصود ہے۔ بہر حال یہ متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسولؐ کے بعد کچھ افراد امت نے متفق ہو کر سیاسی اقتدار خاندان رسولؐ سے ہٹا دیا۔ اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرکار رسالت کے بعد ڈیوڑھی کی چہل پہل اور رونق سناٹے میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ ماحول جس میں حسینؑ زندگی بسر کر رہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا حسینؑ ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوائے اوقات نماز کے ہر وقت گریہ وزاری سے کام ہے۔ باپ کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ انہوں نے اہل زمانہ کی بے رخی کو دیکھتے ہوئے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ آپ ہر وقت ایک گوشہ میں بیٹھے قرآن مجید کے متفرق اجزاء کو اصلی ترتیب اور شان نزول کے مطابق کتابی شکل میں مرتب کرتے رہتے۔ کیا اس صورت حال کو دیکھ کر حسینؑ کا دل نہ گھٹتا ہوگا؟ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیسا اندھیرا ہے؟ جو ایک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہر حال آپؑ نے اپنے باپ کے طرز عمل میں یہ نصب العین نمایاں پایا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں۔ مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیئے۔ ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے۔ اس لئے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افسوس ہے کہ رسولؐ کی وفات سے چند ہی مہینوں کے بعد گوناگوں مصائب و تکالیف اٹھانے کے ساتھ حسینؑ سے ان کی بزرگ مرتبت ماں بھی جدا ہو گئیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات سے علی ابن ابی طالبؑ اور بھی دل شکستہ ہو گئے اور حسنؑ و حسینؑ کے لئے مہر و محبت کی دنیا بڑی حد تک ویران نظر آنے لگی۔ اب ان کے لئے گہوارہ شفقت و تربیت صرف ایک تھا۔ اور وہ تھی ان کے بزرگ مرتبہ باپ کی ذات سات برس کی عمر سے لے کر چھتیس سال کی عمر تک انتیس سال برابر حسینؑ اپنے وہبی کمالات کے ماورا حضرت علی بن ابی طالبؑ ایسے حکیم الٰہی عالم ربانی۔ معلم اخلاق انسانیت اور مجموعہ فضائل نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ یاب ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عام نظام اسباب کی دنیا میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس عمر کے آغاز سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں۔ نوجوانی کے زمانہ میں ان پر دیواریں اٹھتی ہیں۔ اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمل ہو کر اس پر نقش و نگار بن جاتے ہیں۔ اور وہ ساز و سامان اور شیشہ و آلات سے بھی آراستہ ہو جاتی ہے حسینؑ کے لئے ان تمام منازل کی ظاہری تکمیل علی ابن ابی طالبؑ کی نگرانی میں ہو رہی تھی حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے والد بزرگوار علی بن ابی طالبؑ باوجودیکہ زمانہ کی بے توجہی، حق فراموشی اور سرد مہری سے کبیدہ خاطر ضرور تھے۔ لیکن جب کسی عملی مسئلہ میں کسی مہم کے متعلق مشورہ میں کسی مقدمہ کے فیصلہ میں ان کی ضرورت پڑ جاتی اور ان سے امداد کی خواہش کی جاتی۔ تو وہ فوراً بلا عذر امداد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ یہ جذباتی انسانوں کے رویہ کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اگر کسی منصب

کے حصول سے جس کے وہ حقدار ہوں محروم کر دیئے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہو کر الگ ہو جائیں گے۔ اور اگر اس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں ان سے مدد طلب کی جائے تو اپنی دلی رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دیں گے۔ اس سے اہل بیت کی ہر فرد کے سامنے یہ نمونہ پیش ہو رہا تھا۔ کہ ہم چاہے مسلمانوں سے کتنے ہی غیر متعلق کر دیئے جائیں۔ مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہئے ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہئے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد کو حقیقی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ تو اس موقع پر فوراً ہمیں اپنے فرض کو انجام دینا چاہئے۔ اور اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہئے۔

تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر وقت ایسا آیا کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ تخت حکومت کو حاصل کر لیتے۔ جبکہ خلیفہ دوم نے اپنے انتقال کے وقت چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر خلافت کو ان میں منحصر کر دیا۔ اور ان میں سے ایک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو بھی قرار دیا تھا تمام دوسرے ارکان حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کے منصب پر نامزد کرنے کے لئے تیار تھے۔ بشرطیکہ آپ کتاب سنت کے علاوہ شیخین (ابو بکر و عمر) کی سیرت پر عمل کا بھی عہد کریں[1] مگر حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے حقیقت پرور، بلند ہمت اور مستغنی طبیعت باپ نے اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا۔ اس پر کہ وہ کتاب وسنت پر عمل کے علاوہ کسی دوسری شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں وہ ظاہری خلافت کا ہما جو ان کے سرہانیوں پر چکر لگا رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ تک کے لئے ان سے علیحدہ ہو گیا۔ حسینؑ نے اس میں ایک بڑے اہم سبق کا عملی نمونہ دیکھا جس پر ان کے آئندہ اقدامات کی بنیاد قائم ہونا تھی۔ اور وہ یہ کہ شریعت اور مسلمان حکمرانوں کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جو حکومت کا آئین اور اس کا عمل ہو۔ اس کو شریعت کی رو سے بھی صحیح ماننا پڑے۔ بلکہ شریعت کے مستقل اصول ہیں جنہیں مقتدر ہونا چاہئے اور حکومت کے عمل کو ان کا ماتحت ہونا چاہئے۔ اور جب ایسا نہ ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے۔ اور حاکم کے عمل کو تسلیم نہ کرے۔ اور اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف اور آئین مذہب میں بنیادی تبدیلی کا باعث ہو[2] تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ ہو جائے اور اس کے لئے بشرط ضرورت کسی قربانی سے دریغ نہ کرے"۔ تیسرے خلیفہ عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں گذرا۔ مسلمانوں کو ان سے شکائتیں پیدا ہوئیں۔ اور اقدامات کی حد تک پہنچیں مگر حضرت علی بن ابی طالب نے ان اقدامات کو تقویت پہنچانے کے بجائے پوری کوشش کے ساتھ ان کو روکنے کی کوشش فرمائی کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح

---

1. طبری، ج ۵، ص ۴۰۔
2. حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۱۵۰، طبع مصر۔

کرائی۔ مخالف جماعت کی شکایات دور کرائیں۔ اور انہیں سمجھا بجھا کر منتشر کیا[1] مگر مروان جو اس دور میں کاتب کے عہدہ پر تھا۔ اس کی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اور اس جماعت نے حاکم وقت کے مکان کا محاصرہ کر لیا[2] اس وقت بھی حضرت علی بن ابی طالبؑ نے یہ ہمدردی کی۔ کہ جب آپ کو معلوم ہوا۔ کہ محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا ہے۔ تو آپؑ نے حسنؑ و حسینؑ اپنے دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصر حکومت کے اندر پہنچا دیا۔ بہر حال نظام حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ حملہ آور جماعت نے دار الحکومت کی سرزمین کو خلیفہ کے خون سے رنگین اور ان کے رشتہ حیات کو قطع کر دیا۔

ایک مہینہ انیس دن محاصرہ[3] رہا۔ لاش تین دن تک بے گور و کفن[4] رہی۔ اور عامہ مسلمین دفن کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ آخر میں راتا راتی ''حش کوکب'' نام کے مقام پر جو مسلمانوں کے قبرستان سے الگ تھا۔ سپرد خاک کئے گئے۔[5]

اس عبرت ناک موقع سے ایک حساس انسان کس قدر اہم نتائج اخذ کر سکتا تھا؟ سلطنت دنیا کی بے ثباتی جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد نیز مروان اور دیگر بنی امیہ کے ہاتھوں اسلام کے شیرازہ کی ابتری یہ سب کچھ حسینؑ نے دیکھا اور اپنی آئندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا۔ حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں۔ اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب کے نتیجہ میں مسلمانوں کی آنکھیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے چہرہ پر جم گئیں۔ انہوں نے آپؑ کے پاس آکر خلافت اسلامی کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ کہ حضرت علیؑ باوجودیکہ اس سے پہلے ہمیشہ خلق خدا کی ہدایت اور ان کے نظم و نسق کی اصلاح کے لئے بے چین اور خلافت رسولؐ کے لئے اپنے استحقاق کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ آج مسلمانوں کی اس ملتجیانہ پیش کش کو مسترد فرما رہے تھے[6] حسینؑ خوب جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ عمال حکومت کے رویہ کی بدولت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور زاویہ نگاہ میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت بڑی حد تک دنیاوی اقتدار سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی۔ اور کسرویت و قیصریت کے آثار اس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اس

---

[1] طبری، ج ۵، ص ۹۶، ۹۷، ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۲۲۔
[2] الوزراء و الکتاب، ص ۱۲۔ طبری، ج ۵، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔
[3] طبری، ج ۵، ص ۱۳۲۔
[4] طبری، ج ۵، ص ۱۴۳۔
[5] طبری، ج ۵، ص ۱۴۳، ۱۱۴۔
[6] طبری، ج ۵، ص ۱۵۲۔

سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبر اسلام ﷺ نے دنیا میں پھیلایا تھا۔ اور جس پر حضرت علی ابن ابی طالبؑ نہایت سختی کے ساتھ عامل تھے۔ اس لئے آپ نے پورے طور پر انکار کیا۔ مگر مسلمانوں کا اصرار اتمام حجت کی صورت اختیار کر گیا۔ مجبوراً حضرت علیؑ کو یہ ذمہ داری قبول کرنا پڑی مگر آپؑ نے صاف اعلان کر دیا کہ دیکھو جب تم ذمہ داری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اسی پر تمہیں چلاؤں گا۔ اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پروانہ کروں[1] گا۔ لوگوں نے اس کا اقرار کر کے ذی الحجہ ۳۵ھ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بیعت کی۔ اور آپؑ خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لئے گئے۔ اس سے ایک طرف یہ ثابت کیا گیا۔ کہ دنیا کی فضا اب اہل بیتؑ کے حکومت و اقتدار کے لئے موزوں نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ اگر اللہ کے بندے وفاداری کے عہد کے ساتھ رہنمائی کے طالب ہوں تو جب تک حجت ان پر پورے طور سے تمام نہ ہو جائے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم بظاہر ان کے عہد و پیمان کو باور کریں۔ اور ان کی خواہش رہنمائی کی تکمیل کے لئے قدم آگے بڑھائیں۔

خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد وہی ہوا جو حضرت علیؑ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کچھ لوگوں نے تو بیعت سے ہی پہلو تہی کی۔ حضرت علیؑ نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی۔ جب تک وہ عملی طور سے کوئی مخالفت نہ کرتے۔ ضرورت ہی کیا تھی کہ ان سے تعرض کیا جائے جبکہ اصول مذہب میں دستور یہ ہے کہ لا اکراہ فی الدین تو خلافت کے تسلیم کرانے میں اکراہ کے کیا معنی؟ لیکن بعض لوگوں کا یہ مشورہ کہ معاویہ اور جتنے عثمان کے زمانہ کے عامل ہیں۔ ان سب کو آپ برقرار رکھیں۔ اور وہ مطمئن ہو جائیں اور آپؑ کی گرفت میں آ جائیں۔ تو پھر چاہے سب کو معزول کر دیں۔ اسے آپؑ نے منظور نہیں فرمایا۔ اور آپ نے کہا کہ سیاست دنیا کے لحاظ سے تو بے شک یہی بہتر ہے جو تم کہتے ہو۔ مگر جب میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور نااہل ہیں تو انہیں اپنی طرف سے حکومت کا پروانہ بھیج کر میں ان کے مظالم میں شریک ہوں۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔[2]

یہ بڑا دور رس واقعہ ہے۔ اگر حضرت علی ابن ابی طالبؑ اپنی ماتحتی میں معاویہ ایسے شخص کی حکومت کو دینی فریضہ کے ماتحت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تو اس کے بعد بھی حسینؑ بیعت کر کے معاویہ سے بڑھ کر یزید ایسے شخص کی حکومت کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں؟

پھر بھی حضرت علیؑ نے معاویہ کے نام خط لکھا اس میں کوئی سختی و درشتی اور جنگ جویانہ انداز نہ تھا۔[3] معاویہ

---

[1] طبری، ج ۵، ص ۱۵۶۔

[2] طبری، ج ۵، ص ۱۵۹، ۱۶۰۔

[3] ملاحظہ ہو: نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۱۴۰۔

اگر مخالفت پر پہلے ہی تلے ہوئے نہ ہوتے تو اس خط پر انہیں عمل کرنا چاہئے تھا۔ (کہ لوگوں سے بیعت حضرت علیؑ کی لے کر خود ایک وفد کے ساتھ مدینہ آنجنابؑ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے) مگر وہاں تو عناد و مخالفت کی چنگاریاں پہلے سے سلگ رہی تھیں۔ آخر آپؑ کے مقابلہ میں قتل عثمان کا غلط الزام تراشا گیا۔ اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔ معاویہ نے شام والوں کو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے خلاف اس غلط تہمت کو ان کے ذہن نشین کر کے پورے طور پر مشتعل کر دیا۔ مسجد جامع دمشق میں ماتمی جلسے کیے گئے۔ مقتول خلیفہ کا خون بھرا کرتا منبر پر ڈال دیا گیا۔ اور عالم یہ تھا کہ پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع اسے دیکھ نالہ وزاری کرتا۔ اور اس جوش رقت میں ان سے کہا جاتا کہ اب تمہیں علی سے اس خون کا بدلہ لینا ہے۔[1]

اب حضرت علی ﷺ شام کی مہم کے تدراک کا سامان کرنا چاہ رہے تھے جو یک بیک خبر آئی کہ طلحہ اور زبیر نے زوجہ رسولؐ عائشہ بنت ابوبکر کو آمادہ کر کے آپ کے خلاف محاذ تیار کر لیا ہے۔[2]

وہ لوگ جو پچیس برس تک حضرت علیؑ کو میدان جنگ سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے بالکل خاموشی کی زندگی گذارتے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ وہی علیؑ اپنی تلوار کو اتنے عرصہ تک نیام میں رکھ چکے تھے کہ جوانی سے بڑھاپا آ گیا تھا۔ آج وہ ذمہ داری اپنے اوپر عاید ہو جانے کے بعد آئین واصول اور حق کی حفاظت کے لئے جنگ پر بالکل تیار ہیں۔ بے شک امام حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے پدر بزرگوار نے اسی اصول کی سختی کے ساتھ پابندی فرمائی کہ جب تک فریق مخالف عملاً جنگ کی ابتدا نہ کر دے۔ اس وقت تک تلوار میان سے نہ نکالی جائے۔ چنانچہ جمل کے میدان میں یہی ہوا۔ کہ جب صفوف لشکر مرتب ہو چکے۔ تو حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے ہاتھ میں قرآن لے کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا: کہ کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انہیں اس پر عمل کرنے کی دعوت دے۔ مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر اہل کوفہ میں سے ایک جوان جس کا نام مسلم تھا کھڑا ہوا کہا میں جاؤں گا۔ (تین بار آپ نے یہی اعلان فرمایا اور یہی جوان ہر بار اٹھا) (المختصر) وہ قرآن لے کر صفوف مخالف کے سامنے گیا (دعوت عمل دی) مگر ظالموں نے (اس کے یکے بعد دیگرے دونوں بازو قلم کرنے کے بعد) اسے قتل کر دیا۔ علی ابن ابی طالبؑ پکارے۔ اب ان سے جنگ حلال ہو گئی۔[3]

---

1. طبری، ج ۵، ص ۱۶۲ (کذافی الکامل، ج ۳، ص ۱۴۱)۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منبر پر آویزاں کی جاتی تھیں۔ اور سامنے گریہ وزاری کی جاتی تھی۔
2. طبری، ج ۵، ص ۱۶۳۔
3. طبری، ج ۵، ص ۲۰۵، ۲۰۶۔

اب دنیا نے دیکھا کہ وہی تلوار جو بدر، احد، خندق اور خیبر میں کسی وقت چمک چکی تھی۔ جمل کے میدان میں چمکنے لگی۔ وہی ہاتھ ہے اور ہاتھ کی صفائی۔ وہی دل ہے اور دل کی طاقت۔ یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریق مخالف کی شکست پر ختم ہوا۔ اس وقت حضرت علیؑ نے فریق مخالف کی سرگروہ ام المومنین عائشہ کے ساتھ وہ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کیا جیسا کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا ہوگا[1] یہ معرکہ روز پنجشنبہ ۱۰ جمادی الثانیہ ۳۶ھ کو پیش ہوا۔

ظاہر ہے کہ عام اسباب کے لحاظ سے اب جناب امیرؑ کا سن لڑائیوں کی امنگوں کا متقاضی نہیں تھا۔ السٹھ برس کی عمر تھی مگر آپ کا پچیس برس کی خاموشی کے بعد اب میدان جنگ میں آ جانا۔ اعلان کر رہا تھا کہ حقیقتاً ہمارا حرکت وسکون سب فرض کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر ہمیں جواب دینا چاہیے۔ اصول وفرض کے حدود میں جذبات کا تقاضا اور سن کا اختلاف کوئی چیز نہیں ہے اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہے جوانی کی تمام امنگیں قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی ہوں۔ پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے۔ اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا چاہیے۔ اور اگر فرض ہمارا عملی اقدام کا ہو تو چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جسمانی قوتوں کو متاثر بھی کیے ہو مگر پھر بھی ہمیں عزم وارادہ کے قدموں پر کھڑا ہو جانا چاہیے اور وہ کرنا چاہیے جو جوانمردانہ ہمت کا تقاضا ہے۔

ادھر شام میں اشتعال انگیزی مسلسل جاری رہی مگر آپؑ نے اپنی جانب سے اصلاح کی کوشش جاری رکھی (کئی آدمی) معاویہ کے پاس روانہ فرمائے۔ تاکہ جا کر اتحاد واتفاق اور اطاعت واجتماع کی دعوت دیں مگر اس امن پسندانہ پیش قدمی کا جواب یہ ملا کہ پلٹ جاؤ میرے پاس سے کیونکہ میرے تمہارے درمیان تلوار سے فیصلہ ہوگا[2] بالآخر مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا جانے لگا۔ اس جنگ کے آغاز وانتہا اور انجام میں بہت سے جاذب توجہ امور پیش آتے رہے۔ پہلے یہ کہ اس جنگ میں بھی حضرت علیؑ نے اپنی فوج کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن ابتداء نہ کرے تم جنگ نہ کرنا۔[3] (تمام جہاد مسلمانوں کے ساتھ تمام پیش کردہ معرکوں میں آپؑ نے یہی ہدایت فرمائی) اور جب لڑائی چھڑ جائے اور پھر دشمن کو شکست ہو۔ تو کسی بھاگتے ہوئے کا پیچھا نہ کرنا کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ کسی عورت کی بے حرمتی نہ کرنا کسی مقتول کے اعضا قطع نہ کرنا خیام میں بلا اجازت داخل نہ ہونا۔ ان کے مال واسباب کو نہ لوٹنا۔ اور دشمنوں کی عورتیں تمہیں اور تمہارے سرداروں کو گالیاں بھی دیں تو انہیں کوئی ایذا نہ پہنچانا[4] اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ سامنے آیا۔ کہ معاویہ کے مقدمۃ الجیش ابوالاعور سلمی نے نہر فرات پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؑ کے لشکر پر پانی

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھو: طبری، ج ۵، ص ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۵۔
۲ طبری، ج ۵، ص ۲۳۳۔
۳ طبری، ج ۵، ص ۲۳۸۔
۴ طبری، ج ۶، ص ۶۔

بند کر دیا۔ مجبوراً آپ نے پانی کے لئے جنگ کا حکم دیا۔ آپ کے لشکر نے ابوالاعور سلمی کی فوج سے گھاٹ چھین لیا اور یہ ارادہ کیا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے۔ جیسے اس نے ہم پر بند کیا تھا۔ مگر حضرت علیؑ نے اس کو گوارا نہ فرمایا آپ نے کہا وہ ان کا فعل تھا مگر تم انہیں پانی سے نہ روکو۔ اطمینان کے ساتھ سیراب ہونے دو۔ اس سے یہ سبق دیا جا رہا تھا کہ ہماری مخالف جماعت انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے۔ مگر ہم کو ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہیے۔ اور اس کے کمینہ طرز عمل کا معاوضہ اس کے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرنا ضروری ہے جنگ صفین میں حضرت علیؑ کو مسلمانوں کی خونریزی سے بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی چنانچہ پکار کر امیر شام سے کہا کہ اس سے کیا حاصل ہے کہ عام مسلمانوں کا خون بڑی فیاضی سے بہہ رہا ہے۔ بس تم نکل آؤ میدان میں۔ اور میں آ جاؤں۔ اور اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔[1] مگر معاویہ نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لئے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے۔ مقابلے کے لئے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے حضرت علیؑ جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں کے آگے تھے۔ اس لئے ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے مشتاق تھے۔ ان کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا بچہ آغوش مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی جنگ صفین میں ایک موقع پر امام حسنؑ سے فرمایا تمہارے باپ کو کوئی پروا نہیں کہ موت اس پر گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے۔[2] پھر جو ایسے باپ کے بیٹے ہوں۔ جن کے سامنے یہ سیرت ہو۔ اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں۔ انہیں موت کا اندیشہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حسینؑ اپنے بھائی حسنؑ اور محمد بن حنفیہ کے ساتھ اس جنگ میں برابر حصہ لے رہے تھے۔ اور سخت سے سخت موقعوں پر ثبات قدم کے جوہر دکھا رہے تھے۔ تاریخ نے ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے جب علی بن ابی طالبؑ کے لشکر کا بڑا حصہ شکست کھا چکا تھا لکھا ہے کہ اس وقت نہیں رہ گئے تھے علیؑ کے پاس۔ مگر بڑے فرض شناس اور پر جگر افراد اس وقت آپؑ نے اپنے گھوڑے کا رخ میسرہ کی جانب پھیرا کہ جدھر قبیلہ ربیعہ کے لوگ اب تک دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جس کا نام زید بن وہب جہنی ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علیؑ کو کہ آپ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے تھے۔ اور آپؑ کے فرزند حسنؑ حسینؑ اور محمد بن حنفیہ آپؑ کے ساتھ ساتھ تھے اور تیر علیؑ کے کان اور شانوں کے پاس سے گذر رہے تھے مگر آپ کے فرزند بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے تھے۔ اور آپ اپنے باپ کی حفاظت کرتے تھے۔[3]

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۳۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۱۱۔

[3] الاخبار الطوال، ص ۱۸۲، طبری، ج ۶، ص ۱۰۔

کیا یہ جذبہ فداکاری اور قربانی کا معمولی مظاہرہ ہے جو علیؑ کی آنکھوں کے سامنے ان کے صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد بھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ علیؑ کے یہ بہادر بیٹے موت کے ڈر سے کسی فرض میں کوتاہی کریں۔ یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟ اسی جنگ صفین کے میدان میں ایک اور منظر کا بھی مشاہدہ ہوا۔ وہ یہ کہ عین جنگ کی حالت میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی نگاہ آفتاب پر تھی۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نماز ظہر کا وقت آیا یا نہیں؟ ابن عباس نے عرض کیا یہ نماز کا موقع ہے؟ جنگ تو ہو رہی ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ اور ہماری یہ جنگ کس بات کے لئے ہے؟ اسی نماز کے لئے تو جنگ کر رہے ہیں۔ یہ عبادت الٰہی کے فرض کی اہمیت کا ایک بے مثال عملی درس تھا۔ کہ تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو۔ جب نماز کا وقت آئے تو لازم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر ایک دن حضرت علیؑ نے طے کیا کہ اب ملک فتح کرنے کے بعد ہی جنگ کو موقوف کیا جائے۔ ایک دن و رات مسلسل ہنگامہ دار و گیر برپا رہا۔ جس کے نتیجہ میں فوج شام کے قدم اکھڑنے لگے۔ اور معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا۔ مگر عمرو بن العاص نے اس دن کے لئے ایک چال اختیار کی تھی۔ وہ یہ کہ فوراً قرآن نیزوں پر بلند کر دیئے گئے۔ اور ندا دی گئی کہ بھائیو! یہ کتاب خدا ہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے۔ تو شام کے حدود کی حفاظت کون کرے گا اور عراق والے ہلاک ہو گئے تو عراق کے حدود کا نگہبان کون ہو گا[۱]

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی فوج والوں کو اس مکاری اور چالبازی سے آگاہ کیا اور صاف فرمایا کہ یہ لوگ نہ اہل دین ہیں نہ اہل قرآن۔[۲] مگر آپ کی فوج کے بہت سے لوگ آپؑ سے منحرف ہو کر اس بات پر مصر ہو گئے کہ اب تلوار روک لیجئے۔ نہیں تو ہمارے اور آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن کے مقابلہ کے وقت اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے۔ ایک انتہائی ہولناک صورت حال تھی۔ مجبوراً آپؑ نے جنگ کے التواء کا حکم دیا۔ اور طے پایا کہ ایک حکم اہل شام کی طرف سے نامزد ہو۔ اور ایک کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہل شام کی طرف سے عمرو بن العاص ایسا امیر شام کا نفس ناطقہ مقرر کیا گیا۔ اور جب علیؑ نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبد اللہ بن عباس یا کسی دوسرے ایسے ہی مخلص کو اپنی جانب سے مقرر کریں۔ تو وہی اپنی فوج والے پھر بگڑ گئے۔ آخر سب نے ابو موسیٰ اشعری کو اپنی جانب سے مقرر کیا۔ (صلح نامہ میں یہ نمایاں طور لکھا گیا تھا کہ حکمین کتاب خدا کے مطابق فیصلہ کریں گے۔) اس کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حکمین کو اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ یہ اقرار نامہ ۱۳ صفر ۳۷ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ (بالآخر عمرو بن العاص کی مکارانہ کارروائیوں سے اس کا جو انجام ہوا۔ اور اس نے ابو موسیٰ اشعری کو

---

۱ طبری، ج ۶، ص ۳۶۔

۲ طبری، ج ۶، ص ۲۷۔ ارشاد، ص ۱۳۴۔

جس طرح بے وقوف بنایا یہ تاریخ اسلام کے مبتدی طالب علموں سے بھی حقائق پوشیدہ نہیں ہیں)۔

ابوموسیٰ اشعری چیخ اٹھے۔ ارے یہ تونے کیا کیا۔ تونے غداری کی۔ بے ایمانی کی۔ تو کتے کی طرح ہے۔ عمرو عاص نے جواب دیا۔ تمہاری مثال گدھے کی سی ہے جس کی پشت پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔ غرض اس ہڑبونگ اور ان تہذیب و اخلاق کے مظاہروں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہو گیا۔[1] اس مکارانہ فیصلہ کو کسی نے تسلیم نہ کیا۔ اور اختلاف جوں کا توں قائم رہ گیا۔ باوجود حضرت علیؑ کی اس دور اندیشی اور احتیاط کے پھر بھی مفسد آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے۔ اقرار نامہ کے لکھتے ہی آپ کی فوج سے یہ آواز آئی۔ انسانوں کو حکم بنانا درست نہیں: ﴿لا حکم الا للہ﴾ یہ جماعت خوارج کا سنگ بنیاد تھا۔ انہوں نے حضرتؑ سے معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے پر اصرار کیا۔ حضرت نے فرمایا: معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس کی مخالفت ممکن نہیں۔ بہر حال خوارج نے اپنی جماعت کو منظم کر کے مقابلہ کی تیاری کر دی۔ جس سے ۳۸ھ میں جنگ نہروان کی صورت پیش آئی۔ (اور بالآخر مخالف کی شکست پر ختم ہوئی)۔ نہروان کے بعد بھی فتنے بالکل ختم نہیں ہوئے۔ امیر شام نے اہل کوفہ کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت کو زیادہ منظم کر لیا۔ برابر اطراف مملکت میں اپنی فوجیں بھیج کر بدامنی کا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھا جس میں خفیہ و اعلانیہ ہر قسم کے اقدامات شامل تھے۔

جناب امیرؑ کے بڑے معاون مالک اشتر کو زہر دلوا کر خاتمہ کرا[2] دیا۔ ان کے بعد محمد بن ابی بکر مصر کے گورنر بنا کر بھیجے گئے مگر عمرو بن عاص نے خطوط لکھ کر مصر کے بعض عمائد سے ساز باز کر کے اپنی فوج لے کر حملہ کر دیا۔ ادھر سے شام والوں کی فوج اور ادھر خود مصر والوں کا مسلح لشکر محمد بن ابوبکر چکی کے دو پاٹوں میں آگئے۔[3] شکست کھائی اور خود انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کئے گئے بلکہ لاش کو بھی آگ میں جلا دیا گیا۔[4] اس کے بعد مصر پر معاویہ کا تسلط ہو گیا (اس طرح امیر شام نے مختلف علاقوں میں فوج کے دستے بھیج کر حضرت امیرؑ کے کئی آدمی قتل کر دیئے۔ افراتفری مچائی اور گوریلا جنگ کی شکل اختیار کر لی) اس سلسلہ کا سب سے زیادہ اندوہناک سانحہ بسر بن ارطاۃ کا تین ہزار کی فوج کے ساتھ حجاز پر حملہ تھا۔ جس نے مدینہ اور مکہ والوں سے بجبر بیعت لینے کے بعد یمن کا رخ کیا اور وہاں کئی آدمیوں کو قتل کیا۔ عبداللہ بن عباس کا مکان لوٹا اور ان کے دو کم سن بچوں کو ذبح کرا دیا۔ پھر جب حضرت علیؑ نے مقابلہ کے لیے لشکر بھیجا تو مع اپنی فوج کے شام کی طرف فرار کر گیا۔[5]

---

۱ طبری، ج ۶، ص ۴۰۔

۲ طبری، ج ۶، ص ۵۴۔

۳ طبری، ج ۶، ص ۵۷۔

۴ طبری، ج ۶، ص ۶۰۔

۵ طبری، ج ۶، ص ۸۰، ۸۱۔

یہ بزدلی کا طریقہ حضرت علیؑ کے لیے نہایت تکلیف کا باعث تھا۔ مجبوراً پھر آپؑ نے تہیہ فرما لیا تھا کہ دمشق پر فوج کشی کر کے ہمیشہ کے لیے اس قصہ کو ختم کیا جائے جس کے لیے آپ نے ایک پُر زور خطبہ پڑھ کر مسلمانوں کو آمادہ بھی کر لیا مگر اس کے بعد ایک ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ مسجد میں عین حالتِ نماز میں ۱۸ (شب ۱۹) ماہِ رمضان کو آپؑ کے سرِ مبارک پر ابن ملجم مرادی نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار لگائی۔[۱] جس کے اثر سے ۲۱ ماہِ رمضان ۴۰ھ کو آپؑ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ اس وقت حسینؑ بن علیؑ چھتیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس طولانی دور میں حسینؑ نے اپنے والد بزرگوار علیؑ بن ابی طالبؑ سے کیا کچھ دیکھا؟ کیا کچھ سنا۔ اور کتنا اثر لیا؟ مسلم الثبوت شیعی معتقدات سے قطع نظر کرنے کے بعد تمام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے ماتحت یہ اہم تجربات اور گراں قدر تعلیمات جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسینؑ کو حاصل ہوتے رہے۔ ایک انسان کے بلندیٔ اخلاق و صفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔[۲]

انتقال فرمانے سے پہلے حضرت علیؑ نے ایک تحریری وصیت نامہ امام حسنؑ کے نام لکھا اور اس پر امام حسینؑ و محمد بن حنفیہ اور اپنی دیگر اولاد و اعزا اور مخصوص اصحاب کی گواہیاں لکھوائیں اور وصیت نامہ حسن مجتبیٰ کو سپرد کرتے وقت فرمایا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم اسے حسینؑ کے سپرد کر دینا۔[۳] اس کے علاوہ ایک وصیت آپؑ نے حسنؑ اور حسینؑ دونوں بھائیوں کو مشترکہ طور پر فرمائی۔ وہ یہ تھی۔ میں تم کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کو کبھی دنیا کے طلبگار نہ ہونا چاہئے۔ وہ دنیا خود تمہاری طلب گار اور کسی دنیاوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا۔ اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا۔ اور ثواب کے لیے کام کرنا۔ اور ظالم کے مدمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ میں تم کو تمام اپنی اولاد اور اعزہ اور ان لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہنچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا۔ اور اپنے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دینا۔ اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرتے رہنا۔ اور دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا۔ ان کی برابر خبر گیری کرتے رہنا۔ اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں وصیت کی تھی اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا۔ تم سے بڑھ کر کوئی قرآن پر عمل کرنے والا نہ ہو۔ اور نماز کا خیال رکھنا۔ یہ تمہارے دین کا ستون ہے۔ اور اللہ کے گھر (خانۂ کعبہ) کا خیال رکھنا۔ زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا اور دیکھو خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا۔ اور آپس میں صلۂ رحمی رکھنا۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا۔ اور دیکھو کبھی خلقِ خدا کو نیک اعمال کی ترغیب دینے اور بداعمالیوں سے روکنے سے

---

۱ طبری، ج ۶، ص ۸۴،۸۵۔ ۲ شہید انسانیت، ص ۹۹۔

۳ کافی، ج ۱، ص ۱۸۳۔

باز نہ آنا۔ تاکہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم نہ ہو جائے۔[1] اور دیکھو میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ بنی ہاشم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کر دیں۔ دیکھو زیادہ سے زیادہ میرے خون کے قصاص کے طور پر بس میرے قاتل کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کو ایک ضربت کی پاداش میں ایک ضربت ہی لگائی جائے اور اس کو ہرگز مثلہ نہ کیا جائے۔ یعنی اعضاء و جوارح قطع نہ کیے جائیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ فرما گئے ہیں کہ خبردار کسی کو مثلہ نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو۔[2]

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات کے متعلق کرتے ہیں مگر آل محمدؐ تو دین و شریعت، کتاب اور سنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں۔ وہ سراسر مفاد عامہ، مفاد شریعت اور احکام الٰہی سے متعلق تھیں۔ یوں تو یہ فرزند وہ تھے جو خود صحیح اور مناسب ہی کام کرتے مگر حضرت علی بن ابی طالبؑ کو بظاہر اسباب ایک مربی باپ کی طرح اپنا فرض انجام دینا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان وصیتوں کی ہر ہر لفظ وفا شعار بیٹوں کے دل پر نقش ہو جائے۔ یہ الفاظ ان کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں کہ فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دنیاوی جاہ و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دنیاوی نقصان کی کبھی پروا نہ کرنا۔ زبان پر حق کو جاری رکھنا، ظالم کے مدمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ چنانچہ ان تعلیمات کو دونوں فرزندوں نے اپنے عمل سے مجسم شکل میں پیش کیا۔ اور ایسا میں ہم آہنگی کو بھی ہر صورت میں برقرار رکھا۔ یہ الفاظ ''خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو کبھی ترک نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔'' خصوصیت کے ساتھ ان کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسین علیہ السلام کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ کی خلافت تسلیم کی۔ ابھی ملک حضرت علیؑ کے غم میں سوگوار ہی تھا۔ اور حضرت امام حسن علیہ السلام پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہوگئی اور ان کے خفیہ کارکن ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیئے۔ (بعض کوفہ و بصرہ سے پکڑے بھی گئے)۔ (ارشاد، ص ۱۹۹، ۲۰۰) اس واقعہ کے بعد امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا (جس میں اس کی ان شرارتوں پر زجر و توبیخ تھی)۔۔۔۔۔۔ اس خط کے بعد معاویہ اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی رد و بدل ہوئی۔ بہرحال ان

---

[1] نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۷۸، ۷۹۔ طبری اور ابوالفرج اصفہانی نے ان میں سے اکثر فقرات کو امام حسن علیہ السلام کے نام تحریری وصیت نامہ میں درج کیا (مقاتل الطالبین، ص ۲۵، ۲۷)۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۸۶۔ نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۸۰۔

واقعات سے یہ امر بالکل ظاہر ہو گیا کہ امیر شام معاویہ کو جناب امیرؑ سے کوئی وقتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ ان کی شہادت کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ آل رسولؐ سے ایک مستقل دشمنی ہے جس کے نتائج آئندہ دیکھیے کیا ہوں ۔۔۔۔۔ بہر حال امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار تھے ۔۔۔۔۔۔ بے شک آپ کو اور اس کے ساتھ حسینؑ کو اپنے ملک کی فضا کی طرف سے بے اطمینانی ضرور تھی اس لیے کہ خوارج کے فتنہ کے بعد سے خود اہل کوفہ میں پھوٹ پڑ چکی تھی اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر حضرت علیؑ کی فوج میں شامل تھے مگر قرابت، دوستی یا کسی وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیرؑ کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی، اختلاف رائے، اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپؑ موت کے آرزو مند تھے۔ تمام کتب تواریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں ایسے خطبے آپؑ کے درج ہیں جو آپ کی کبیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں۔ آپؑ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے میرا دل پیپ سے بھر دیا۔ اور میرے سینہ کو غم و غصہ سے پُر کر دیا[۱] کبھی فرمایا کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمہاری جماعت سے تبادلہ کر لیتا۔ اس طرح جس طرح سونے کے سکہ کا تبادلہ چاندی کے سکہ سے ہوتا ہے یعنی تم میں سے دس (۱۰) لے لیتا اور اپنوں میں کا ایک مجھے دے دیتا[۲] ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہی وہ جماعت تھی کہ جس سے امام حسنؑ کو سابقہ پڑا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ یقیناً امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہاں کے حالات کا علم ہو گیا ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔ اس لیے انہیں ہمت ہوئی کہ وہ ملک عراق پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر جسر منبج تک پہنچ گئے۔ امام حسنؑ نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے۔ حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے تمام مقامات کے عاملوں کو صورت حال کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں۔[۳] مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوس ناک صورت سامنے آ گئی کہ لوگوں نے حجر بن عدی کا گرمجوشی سے استقبال نہیں کیا۔ عام طور پر جمود اور سرد مہری سے کام لیا گیا۔ کچھ تھوڑی سی جمعیت مقابلہ کے لیے تیار ہوئی بھی تو اس میں کچھ حصہ خوارج کا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ (اس کے بعد جو حالات رونما ہوئے وہ بڑے تکلیف دہ ہیں، کئی جرنیلوں کو معاویہ نے لطائف الحیل سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ فوج میں ابتری پھیل گئی۔ ہمتیں پست ہو گئیں۔ تفصیل کے لیے تاریخ طبری و کامل وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔ بنظر اختصار ہم اس حصہ کو قلمزد کرتے ہیں۔) حد ہو گئی کہ ان حالات کے پیش نظر امام کی صلح جویانہ گفتگو کرنے والے (ارشاد ص ۱۹۴) اور بروایت ابن جریر قیس بن سعد (جرنیل کی) خبر مرگ مشہور ہونے (طبری، ج ۶، ص ۹۲) سے مجمع میں بدنظمی پیدا

---

۱ نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۷۸۔

۲ ارشاد، ص ۱۶۳۔ نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۲۰۵۔

۳ الاخبار الطوال، ص ۲۱۴۔ ارشاد، ص ۱۵۰۔

ہوگی، غدر مچ گیا۔ ▪ خیمہ جس میں امام حسنؑ کا قیام تھا لوٹ لیا گیا یہاں تک کہ جس بچھونے پر آپ تھے اسے آپؑ کے نیچے سے کھینچ لیا گیا۔[1]

یہ سب کچھ دیر کعب کے نزدیک ساباط میں ہوا۔ اس کے بعد آپ مدائن کی طرف روانہ ہو گئے مگر وہاں پہنچے پر جراح بن قبیصہ اسدی نے جو انہی خوارج میں تھا۔ کمین گاہ میں چھپ کر خنجر سے حملہ کر دیا جس سے آپ زخمی ہو گئے۔ عرصہ تک مدائن میں علاج کے بعد آپؑ تندرست ہوئے اور پھر معاویہ سے مقابلہ کی تیاری کی۔ معاویہ نے آپؑ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؑ جن شرائط پر چاہیں صلح پر تیار ہوں۔ اور اس کے ساتھ آپ کی فوج کے ان سرداروں کے خطوط بھی روانہ کر دیے جنہوں نے خفیہ طریقہ سے معاویہ سے ساز باز کرنا چاہی تھی۔ اور دعوت دی کہ آپ آئے تو ہم حسنؑ کو گرفتار کر کے آپ کے سپرد کر دیں گے۔ یا ان کو قتل کر ڈالیں گے۔[2] امام حسنؑ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی غداری سے واقف تھے اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبہ بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔

اب معاویہ نے جو آپؑ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ تو آپؑ نے اپنے نانا اور باپؑ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو ناکام واپس نہیں کیا۔ آپؑ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس بھجوا دیئے۔ وہ تمام شرائط جن سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہو جاتا ہے چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

اس صلح نامہ کی مکمل شرائط جو علامہ ابن حجر مکی نے درج کئے ہیں، حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفاء راشدین کے طریقہ پر عمل کریں گے۔[3]

(۲) یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

(۴) یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔[4]

(۵) یہ کہ معاویہ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور کسی کو بھی خاندان رسولؐ میں کوئی نقصان پہنچانے یا ان کی جان لینے کی کوشش نہ کریں گے۔ نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ اعلانیہ۔ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور دہشت

---

۱ طبری، ج ۶، ص ۹۲۔

۲ ارشاد، ص ۱۹۵۔

۳ شیعہ ماخذوں میں اس آخری حصے کا ذکر نہیں ہے۔

۴ اس شرط کے ثبوت کیلئے ملاحظہ ہو: طبری، ج ۶، ص ۹۳۔

میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔[1] یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاول ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ان واقعات پر ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے اس وقت کے واقعات کا یہ پہلو بہت اہم تھا کہ ساتھیوں کی اکثریت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال کلیۃً دور از کار ہے۔ وہ ایک بار اپنے والد بزرگوار اور اب بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرز عمل کو دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امن عالم کے لیے نقطہ اول صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے۔ مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس صلح کے اندر کوئی ایک ایسا اصول پامال نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہرحال اپنا مقدس فریضہ ہے یہی نمونہ حسینؑ نے اپنے نانا سے دیکھا تھا یہی ان کو اپنے باپ کے یہاں نظر آیا اور یہی اب ان کے واجب الاطاعت بھائی امام حسنؑ کی جانب سے پیش نظر تھا۔۔۔۔۔۔ اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے امام حسنؑ نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا۔ جس کے لیے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے مخاصمت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی لڑائی جو کچھ تھی وہ اصول شریعت و مذہب کے لیے تھی۔ حضرت امام حسنؑ نے اس صلح نامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیر شام کو پابند کر دیا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپؑ نے ایک تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مسلّم بنا دی کہ اصول شریعت اور ہے اور آئین حکومت اور دوسرا امر یہ بھی آپؑ نے ثابت کر دیا بلکہ فریق مخالف سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک حکومت شام کا جو رویہ رہا ہے وہ کتاب و سنت کے مطابق نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر حکومت شام کا سابقہ طرز عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہرحال صلح ہو گئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں اور معاویہ کی گرفت تمام ممالک اسلامیہ پر مضبوط ہو گئی۔ اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز اور ایران وغیرہ بھی ان کے تصرف میں آ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حضرت امام حسنؑ کو اس کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے انتہائی دل خراش اور توہین آمیز الفاظ سننے پڑے جن کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔۔۔۔ مگر امام حسنؑ نے صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا۔ اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن معاویہ نے جنگ کے ختم ہوتے اور سیاسی اقتدار کے قائم ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر "نخیلہ" میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ فقط یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلّم ہو جائے وہ حسنؑ

---

[1] صواعق محرقہ، ص ۸۱۔

کہ اس معاہدہ کے بعد مکمل ہوگئی اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کئے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے[1]۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اقتدار شاہی کی جرأت اس نقطہ تک پہنچی کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں معاویہ نے حضرت امیرؑ اور امام حسنؑ کی شان میں ناسزا کلمات استعمال کئے۔ اس پر سکوت کرنا اعتراف کا مترادف سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لیے فوراً امام حسینؑ جواب دینے کے لیے کھڑے ہوگئے مگر امام حسنؑ نے آپؑ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب[2] دیا۔۔۔۔۔۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے امور سلطنت سے کنارہ کشی کرنے کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر کے پھر سے مدینہ میں جا کر سکونت اختیار فرمائی۔ امام حسینؑ نے بھی بھائی کا ساتھ دیا اور مدینہ میں جا کر قیام فرمایا مگر اس اتحاد عمل کے باوجود بھی بنی امیہ نے غلط شہرت دی کہ اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائیوں میں اختلاف رائے ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس طرح بھائیوں کی یک جہتی میں واقعی کوئی فرق آ جائے مگر ان کے تمام توقعات بالکل غلط ثابت ہوئے۔ حسینؑ قول، عمل اور مسلک میں اپنے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ بالکل متحد تھے اور ہمیشہ رہے۔ آپؑ کو معلوم تھا کہ امام حسنؑ نے اگرچہ اتمام حجت کے لیے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے مگر خیال ان کا بھی یہی ہے کہ آخر میں تلوار درمیان میں آئے گی اور آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہ ہو سکے گا اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہیں۔ بشرطیکہ حالات کی تدریجی رفتار انہی کے دور حیات میں اس آخری نقطہ تک پہنچ جائے جو اس آخری اقدام کے لیے ضروری ہے۔ رہ گئے موجودہ حالات ان کے لحاظ سے امام حسینؑ بھی اس صلح سے متفق تھے۔ چنانچہ کتب تواریخ میں کئی واقعات ملتے ہیں کہ بعض لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کو معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر امامؑ نے یہ جواب دے کر ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا کہ "تمہیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے۔ اس وقت تک جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ رہے[3]۔

اس معاہدہ کے بعد اب بنی امیہ کی قوت بہت مستحکم ہوگئی تھی۔ ان کے راستے میں جو ایک خرخشہ تھا وہ بھی بالکل دور ہوگیا تھا اور انہیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا موقع مل گیا تھا چنانچہ جتنی شرطیں ہوئی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں ہوا[4] (کتاب وسنت کے احکام کی کیونکر مخالفت کی گئی۔ اپنے بعد جانشین مقرر کرنے

---

[1] ارشاد، ص ۱۹۲۔
[2] ارشاد، ص ۱۹۶۔
[3] الاخبار الطوال، ص ۲۲۲۔
[4] طبری، ج ۶، ص ۹۳۔

کے لیے امیر شام نے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ عراق وحجاز والے لوگوں پر کیا ستم ڈھائے گئے۔ شیعیان علیؑ کو کیوں کر چُن چُن کر تہہ تیغ کیا گیا۔ حضرت امیرؑ پر کیوں کر سب وشتم کیا جاتا رہا۔ اور امام حسنؑ وامام حسینؑ کو کیسے کیسے غم وغصہ کے گھونٹ پلائے گئے۔ ان دردناک واقعات سے صفحات تاریخ لبریز ہیں۔ لیکن ہم خوف طوالت سے یہاں ان کا تذکرہ نہیں کر سکتے۔ شائقین تفصیل کتب تواریخ کی طرف رجوع کریں مگر ان تمام واقعات کے باوجود حضرت امام حسن وحسین علیہما السلام نے کبھی دامن صبر وضبط کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا)۔

مگر اس انتہائی صبر وتحمل کے بعد بھی امام حسنؑ کی زندگی محفوظ نہ رہ سکی۔ سلطنت وقت کو جب کوئی بہانہ ان کے خلاف کھلے ہوئے جور وستم کا نہ ملا تو پھر وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں بڑی مہموں کے سر کرنے میں صرف کیا جاتا رہا تھا۔ امیر شام معاویہ نے اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسنؑ کی زوجیت میں تھی۔ سازباز کر کے اس کو ایک لاکھ درہم بھجوائے اور یزید کے ساتھ شادی ہو جانے کا وعدہ کیا اور اس کے ذریعہ سے حضرتؑ کو زہر دلوا دیا جس سے آپؑ کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے [1]۔ جب آپ کی حالت دگرگوں ہوئی تو آپؑ نے اپنے مختلف البطن بھائی محمد بن الحنفیہ کو بلا کر فرمایا کہ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد حسینؑ سے اختلاف کرو۔ حسینؑ میرے بعد امام ہیں اور ان کی اطاعت لازم ہے۔ محمد نے نہایت خلوص کے ساتھ اقرار وفاداری کیا اور امام حسینؑ کی اطاعت کا وعدہ کیا۔[2] پھر حضرت امام حسینؑ کو بلایا اور وصیت کی مجھے غسل وکفن کے بعد میرے جد بزرگوار رسول خدا ﷺ کے روضہ پر لے جانا تاکہ ایک مرتبہ زیارت رسول کا شرف اور حاصل ہو جائے۔[3] اور مجھے یقین ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے وہاں دفن کیا جائے گا مزاحمت کریں گے تو خبردار اس بارے میں ایک قطرۂ خون بھی نہ گرنے پائے۔ تم مجھ کو میری دادی فاطمہ بنت اسد کی قبر کے پاس جنت البقیع میں دفن کر دینا۔[4]

۲۸ صفر ۵۰ھ کو وہ امن وصلح وسلامتی کا شہنشاہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ امام حسینؑ نے وصیت کے مطابق اپنے بھائی کو غسل کے بعد تابوت میں لٹا کر روضۂ رسول کی طرف لے چلے۔ بنی امیہ کو یقین ہوا کہ آپ کو وہاں دفن کریں گے۔ سب کے سب مروان کے ساتھ ہتھیار باندھ کر نکل آئے۔ اور بیچ میں سدِ راہ ہوئے۔ اس وقت بنی ہاشم کو بہت اشتعال تھا مگر حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کی وصیت اور فرض کے احساس سے مجبور تھے۔ آپ فرما رہے تھے:

---

۱ ارشاد، ص ۱۹۷۔

۲ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۸۶۔

۳ اصول کافی، ج ۱، ص ۱۸۵ و ۱۸۷۔

۴ ارشاد، ص ۱۹۸۔

خدا کی قسم اگر بھائی کی وصیت اور ان کے اصول کا پاس نہ ہوتا تو تم دیکھتے کہ کیسی اس وقت تلوار چلتی ہے۔[1]

بہر حال حضرت امام حسن علیہ السلام کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ سے واپس لے گئے اور جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

پھر یہ خبریں بھی معلوم ہوئیں کہ امیر شام نے امام حسن علیہ السلام کی وفات پر اظہار مسرت کیا اور طعن و تشنیع کے کلمات کہے۔ اتفاق سے اس وقت ابن عباس دمشق میں تھے۔ انہوں نے یہ الفاظ سنے تو کہا کہ خوش نہ ہو تم بھی حسنؑ کے بعد عرصہ تک زندہ نہ رہو گے۔[2] (خلاصہ ختم ہوا)۔

---

[1] ارشاد، ص ۱۹۹۔

[2] الاخبار الطوال، ص ۲۲۲۔

﴾ آٹھواں باب ﴿

حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی کا تیسرا دور

شہادت امام حسنؑ ۵۰ھ سے ۶۰ھ تک

افسوس ہے کہ اس دس سال کی مدت میں بھی کوئی ایسا قابل ذکر واقعہ نظر نہیں آتا جسے نمایاں طور پر پیش کیا جا سکے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام معاویہ کے ساتھ جو معاہدہ فرما چکے تھے اس کی رو سے جناب امام حسین علیہ السلام بھی کوئی عملی کارروائی نہ فرما سکتے تھے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس طرز عمل نے ان لوگوں کے خیال کو بھی بالکل باطل کر دیا جو یہ کہا کرتے تھے کہ امام حسینؑ اس معاہدۂ صلح سے راضی نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہوتا اور واقعاً امام حسینؑ اپنے بھائی کے طرز عمل سے متفق نہ ہوتے تو اب ان کی شہادت کے بعد تو آپؑ پر کوئی ظاہری دباؤ نہ تھا۔ آپ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں آزاد تھے۔ مگر آپ نے معاویہ کی عین حیات تک سختی کے ساتھ اس معاہدۂ حسنیؑ کی پوری پابندی کی حالانکہ شہادت امام حسنؑ کے بعد شیعیان کوفہ میں ہیجانی کیفیت بھی پیدا ہوئی اور انہوں نے امام حسینؑ کو یقین دلایا کہ وہ معاویہ کی بیعت توڑ کر آپؑ کی بیعت کرنے پر آمادہ ہیں مگر امام علیہ السلام نے ان کو یہی جواب دیا کہ معاویہ سے معاہدہ ہو چکا ہے جب تک معاویہ زندہ ہے ہم اس معاہدہ کو توڑ نہیں سکتے۔[1]

یہ درست ہے کہ آپؑ جب امیر شام کی مسلسل شرائط معاہدہ کی خلاف ورزیاں اور اس کی چیرہ دستیاں دیکھتے۔ تو آپؑ کو روحانی صدمہ ہوتا مگر پھر بھی آپؑ صبر و ضبط سے کام لیتے۔ آنجنابؑ نے امیر شام کے تمام مظالم و مصائب کا آئینہ ایک تاریخی مکتوب گرامی کی شکل میں اس کے سامنے پیش کیا جبکہ امیر شام نے عمر بن عثمان کے شکایتی خط سے متاثر ہو کر حضرت امام حسین علیہ السلام کو ایک تہدید آمیز خط لکھا اور اپنی ثروت و سطوت سے شہزادۂ کونین کو مرعوب کرنا چاہا۔ آنجنابؑ نے اس کے جواب میں جو دندان شکن تاریخی خط ارسال کیا۔ وہ درج ذیل ہے، فرماتے ہیں:

﴿اما بعد فقد بلغني كتابك تذكر فيه انه قد انتهت اليك عني امور، انت لي عنها راغب، و انا بغيرها عندك جدير و ان الحسنات لا يهدي لها، و لا يسدد اليها الا الله تعالى: و اما ما ذكرت

---

[1] ارشاد ص ۲۰۶۔

انہ رقی الیک عنی، فانہ رقاہ الیک الملاقون المشاؤون بالنمیمة المفرقون بین الجمع، و کذب الغاؤون، ما اردت لک حربا، ولا علیک خلافا، و انی لا خشی اللّٰہ فی ترک ذلک منک ومن الا عذار فیہ الیک، و الی اولیائک القاسطین الملحدین، حزب الظلمة و اولیاء الشیاطین الست القاتل حجر بن عدی اخاکندة و اصحابہ المصلین العابدین، کانوا ینکرون الظلم و یستعظمون البدع و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر ولا یخافون فی اللّٰہ لومة لائم ثم قتلتھم ظلما و عدوانا. من بعد ما اعطیتھم الایمان المغلظة و المواثیق المؤکدة جراء ة علی اللّٰہ و استخفافا بعھدہ، او لست قاتل عمرو بن الحمق صاحب رسول اللّٰہ ﷺ العبد الصالح الذی ابلتہ العبادة فنحل جسمہ و اصفر لونہ فقتلتہٗ بعد ما امنتہ و اعطیتہ من العھود ما لو فھمہ العصم لنزلت من رؤوس الجبال او لست بمدعی زیاد بن سمیة المولود علی فراش عبید ثقیف فزعمت انہ ابن ابیک، وقد قال رسول اللّٰہ ﷺ الولد للفراش و للعاھر الحجر، فترکت سنة رسول اللّٰہ ﷺ تعمدا و تبعت ھواک بغیر ھدی من اللّٰہ ثم سلطتہ علی اھل الاسلام، یقتلھم و یقطع ایدیھم و ارجلھم و یسمل اعینھم و یصلبھم جذوع النخل کانک لست من ھذہ الامة و لیسوا منک او لست قاتل الحضرمیین الذین کتب الیک فیھم زیاد انھم علی دین علیؑ فکتبت الیہ ان اقتل کل من کان علی دین علی فقتلھم و مثل بھم بامرک و دین علیؑ ھو دین ابن عمہٗ الذی اجلسک مجلسک الذی انت فیہ ولو لا ذالک لکان شرفک و شرف ابائک تجشم الرحلتین رحلة الشتاء و الصیف، و قلت فیما قلت، انظر لنفسک و لدینک ولامة محمدؐ افضل من ان اجاھدک فان فعلت فانہ قربة الی اللّٰہ و ان ترکتہ فانی استغفر اللّٰہ لدینی و اسئلہ توفیقہ لارشاد امری و قلت فیما قلت انی ان انکرتک تنکرنی و ان اکدک تکدنی فکدنی ما بذالک، فانی ارجوا ان لا یضرنی کیدک و ان لا یکون علی احد اضر منہ علی نفسک لانک قد رکبت جھلک و تحرصت علی نقض عھدک، و لعمری ما وفیت بشرط و لقد نقضت عھدک بقتل ھؤلاء النفر الذین قتلتھم بعد الصلح و الایمان و العھود و المواثیق فقتلتھم من غیر ان یکونوا قاتلوا و قتلوا ولم تفعل بھم الا لذکرھم فضلنا و تعظیمھم حقنا فقتلتھم مخافة امر لعلک لو لم تقتلھم مت قبل ان یفعلوا او ما توا قبل ان یدرکوا، فابشر یا معاویة بالقصاص و استیقن بالحساب، و اعلم ان للّٰہ کتابا لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصٰھا، ولیس اللّٰہ بناس لاخذک بالظنة و

قتلک اولیائه علی التهم و نفیک اولیائه من دورهم الی دار الغربة و اخذک للناس ببیعة ابنک غلام حدث یشرب الشراب، یلعب بالکلاب، ما اراک الا قد خسرت نفسک و تبرت دینک و غششت رعیتک و اخربت امانتک و سمعت مقالة السفیه الجاهل و اخفت الورع التقی و السلام﴾

مجھے تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ میرے متعلق تمہیں کچھ خبریں پہنچی ہیں جنہیں تم میرے لیے ناپسند کرتے ہو اور اگر یہ باتیں مجھ سے ظہور میں نہ آتیں تو تمہارے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔ حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ نیکیوں کی ہدایت کرنے والا اور اپنی توفیق شامل حال کرنے والا صرف خداوند عالم ہے اور تم نے یہ جو لکھا ہے کہ تم تک میرے متعلق یہ باتیں پہنچی ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ باتیں تم تک چغل خور، پھوٹ ڈالنے والے، جھوٹے، گمراہ لوگوں ہی نے پہنچائی ہیں۔ میرا تم سے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ تم سے مخالفت کرنے کا (ابھی تک) قصد کیا ہے۔ اگرچہ ایسا نہ کرنے کی وجہ سے میں خدا سے ڈرتا ہوں (کہ وہ مجھ سے جواب طلب نہ کرے) کہ میں نے تمہارے مقابلے میں اور تمہارے ان ستمگار اور لامذہب ساتھیوں کے مقابلہ میں جو ظالموں کا جتھا اور شیطانوں کے پیرو ہیں، پوری پوری امکانی کوشش کیوں نہ کرلی کیا تم حضرت حجر بن عدیؓ کے جو قبیلہ کندہ سے تھے اور ان کے عبادت گزار نمازی اصحاب کے قاتل نہیں ہو جو ظلم سے انکار کرتے اور بدعتوں کے مخالف تھے۔ امر بالمعروف کرتے تھے اور بری باتوں سے روکتے تھے اور خدا کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرتے تھے۔ پھر تم نے انہیں سخت قسم کے عہد و پیمان کرنے اور مضبوط وعدے کرنے کے باوجود خدا پر جرأت کرتے ہوئے اور اس کے عہد کو خفیف سمجھ کر محض از راہ ظلم و جور شہید کر ڈالا۔ کیا تم حضرت عمرو بن حمقؓ کے قاتل نہیں ہو جو رسولؐ کے صحابی اور نیکوکار اللہ کے بندے تھے۔ جنہیں عبادت نے اتنا لاغر کر دیا تھا کہ ان کا جسم کاہیدہ اور ان کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ تم نے انہیں امان دینے کے بعد ایسے سخت و شدید وعدے کیے کہ اگر ایسے وعدے ہرن کے ساتھ کیے جائیں تو وہ بھی پہاڑ چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔ قتل کیا۔ کیا تم نے زیاد بن سمیہ کو جو ثقیف کے غلام کے گھر پیدا ہوا، بھائی نہیں بنایا؟ اور یہ دعویٰ نہیں کیا؟ کہ وہ تمہارے باپ کا بیٹا ہے حالانکہ پیغمبر ﷺ فرما چکے تھے کہ لڑکا شوہر کے لیے ہے اور زناکار کے لیے سنگساری ہے۔ تم نے عمداً شریعت پیغمبرؐ سے گریز کیا اور اپنی خواہش کی پیروی کی اور اس میں خدا کی طرف سے تم بالکل ہدایت پر نہیں تھے۔ پھر (اسی پر تم نے بس نہ کی بلکہ) اس زیاد کو تم نے مسلمانوں پر مسلط کر دیا کہ وہ انہیں قتل کرے اور ان کے ہاتھ پیر کاٹے اور ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائے اور درخت خرما پر سولی چڑھا دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم اس امت سے ہو ہی نہیں اور نہ ہی یہ امت اسلام تم سے کوئی خبر رکھتی ہے۔ کیا تم نے حضرمی جماعت کو قتل نہیں کیا

جس کے متعلق زیاد نے تمہیں لکھا تھا کہ وہ علیؑ کے دین پر ہیں۔ تو تم نے زیاد کو لکھا کہ جو بھی علیؑ کے دین پر ہو اسے قتل کر ڈالو۔ تمہارے حکم کی بنا پر اس نے سب کو قتل کر ڈالا اور تمہارے حکم کی وجہ سے اس نے ان کا مثلہ کیا (ہاتھ پیر کاٹے) حالانکہ علیؑ کا دین بعینہٖ محمد مصطفیٰ ﷺ کا دین ہے وہ محمد مصطفیٰ ﷺ جن کی وجہ سے تم آج اس جگہ پر بیٹھے ہو۔ اگر وہ نہ ہوتے تو تمہاری اور تمہارے آباء و اجداد کی عزت بس بھیریاں لگاتا ہوتی جاڑے کی بھیری اور گرمی کی بھیری اور تم نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ ذرا اپنے اور اپنی مذہبی ذمہ داریوں کے متعلق خوب غور کریں اور میں نے خوب غور کیا تو اپنے لیے اور اپنے مذہبی مفاد اور امت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے اس سے بہتر کچھ نظر نہیں آتا کہ جہاں تک ہو سکے میں تمہارا مقابلہ کروں۔ اب اگر میں نے ایسا کیا تو میرے لیے رضائے الٰہی کا ذریعہ ہوگا۔ اور اگر اسے ترک کیا تو پھر خدا سے مجھے اپنی مذہبی فرض کی بنا پر طالب مغفرت ہونا پڑے گا اور اسی سے میری درخواست ہے کہ وہ مجھے صحیح طریقہ کار کے اختیار کرنے کی توفیق عطا کرے اور تم نے اپنے سلسلۂ کلام میں مجھے دھمکایا ہے کہ اگر میں تم سے مخالفت کروں گا تو تم بھی مجھ سے مخالف ہو جاؤ گے اور میں تمہارے مقابلہ میں تدبیر کروں گا۔ تو تم بھی تدبیر کرو گے۔ اچھا تو تم جو چاہو میرے خلاف تدبیر کر لو۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری تدبیروں سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اور سب سے زیادہ ان کا نقصان خود تم ہی کو ہوگا اس لیے کہ تم جہالت کی سواری پر سوار ہو اپنے عہد کے توڑنے کی فکر میں ہو اور مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے کہ تم نے ایک شرط بھی پوری نہیں کی ہے اور تم اپنا عہد توڑ چکے ہو۔ ان لوگوں کو قتل کر کے جو تمہارے ساتھ مصالحت کر چکے تھے اور جن کے لیے امان دیے جانے کی قسمیں اور عہد و پیمان ہو چکے تھے تم نے انہیں قتل کر ڈالا بغیر اس کے کہ وہ جنگ کرتے اور کسی کو قتل کرتے۔ اور تم نے یہ سلوک ان سے صرف اس جرم میں کیا کہ وہ ہمارے فضائل بیان کرتے تھے اور ہمارے حقوق کا احترام کرتے تھے۔ تو تم نے انہیں قتل کر ڈالا۔ صرف ایسے خطروں کے توہمات کی بنا پر جو اگر تم انہیں قتل نہ کرتے تو شاید تمہاری زندگی میں وہ خطرات درپیش نہ آتے یا ممکن ہے کہ اس قسم کے اقدامات سے پہلے وہ ہی مر جاتے۔ اب تمہیں مبارک ہو کہ ان کا قصاص تم سے ضرور لیا جائے گا اور تمہیں آخرت میں باز پرس کا یقین رکھنا چاہیے اور معلوم ہونا چاہیے کہ خداوند عالم کی طرف سے ہر شخص کا ایک اعمال نامہ مرتب ہوتا رہتا ہے جس میں کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہوتا جو درج نہ ہو۔ اور خدا فراموش نہیں کرے گا تمہارے ان افعال کو کہ تم نے لوگوں کو صرف بدگمانیوں کی بنا پر گرفتار کیا اور دوستانِ خدا کو بے بنیاد الزامات پر قتل کیا اور انہیں ان کے گھروں سے جلاوطن کر کے پردیس میں پہنچایا اور لوگوں کو اپنے اس گمراہ لڑکے کی بیعت پر مجبور کیا جو شراب خور اور کتوں سے کھیلنے والا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے کو بڑے خسارے میں مبتلا کر رکھا ہے اور اپنے دین کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اور اپنی رعایا سے کھوٹ کی ہے۔ اور اپنے امانت داروں کو رسوا کر دیا ہے اور جاہل

احمقوں کی باتوں پر عمل کیا ہے اور متقی و پرہیز گار افراد کو خوف و دہشت میں مبتلا کیا ہے۔[1]

جہاں معاویہ نے تمام دوسری شرائط صلح کی خلاف ورزی کی وہاں اس دوسری شرط کہ "معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا" کی بھی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے نااہل بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنانے اور اس کے لیے فضا کو ہموار کرنے میں اپنا کوئی امکانی وقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ یزید کو ولی عہد بنانے کی تمنا تو امیر شام کے دل میں مدت سے چٹکیاں لے رہی تھی مگر وہ بدو وجہ کھل کر اس آرزو کا اظہار کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک تو صلح نامہ میں یہ شرط موجود تھی کہ وہ کسی کو اپنا ولی عہد مقرر نہیں کرے گا۔ دوسرے یزید کے کردار اور بُرے اطوار کی وجہ سے خائف تھا کہ شاید مسلمان اس کی بیعت پر تیار نہ ہوں گے۔ (اور اصل وجہ وجیہ بھی یہی تھی) لیکن زمین کو ہموار کرنے کی فکر و تدبیر برابر شروع تھی آخر مغیرہ بن شعبہ نے جو بہت ہی چالاک آدمی تھا اس طلسم سکوت کو توڑا اور امیر شام کو کھلم کھلا اس امر کے اعلان کرنے پر آمادہ کیا جیسا کہ روضۃ الصفا[2] وغیرہ تواریخ سے مستفاد ہوتا ہے۔ اس قصہ کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ مغیرہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا لیکن کسی وجہ سے معاویہ نے اسے معزول کر کے اس کی جگہ سعید بن العاص کو گورنر مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ نے اپنی گورنری کے تحفظ کی خاطر یہ تدبیر سوچی کہ اس نے دمشق میں جا کر یزید سے ملاقات کی اور اسے یہ پٹی پڑھائی کہ وہ اپنے والد سے یہ تقاضا کرے کہ وہ اس کی ولی عہدی کا اعلان کریں۔ چنانچہ یزید نے اپنے باپ سے جا کر یہ استدعا کی جب معاویہ کو معلوم ہوا کہ یہ سب مغیرہ کی کارستانی ہے تو اس نے مغیرہ کو خلوت میں بلا کر پوچھا کہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟ مغیرہ نے کہا: وہ درست کہتا ہے بہتر یہی ہے کہ آپ کسی کو اپنی زندگی میں ولیعہد مقرر کر جائیں تاکہ بعد میں خون خرابہ نہ ہو۔ معاویہ نے کہا: یہ کام بہت مشکل ہے کیونکر اس کی تکمیل ہوگی؟ مغیرہ نے کہا: شہر دو ہی اہم ہیں۔ ایک کوفہ اور دوسرا بصرہ۔ کوفہ میں میں موجود ہوں۔ میں حالات کو سازگار کر لوں گا اور بصرہ میں زیاد موجود ہے وہاں کے حالات کو وہ درست کر لے گا۔ معاویہ نے اس گفتگو سے خوش ہو کر مغیرہ کو کوفہ کی گورنری پر بحال رکھا چنانچہ مغیرہ نے کوفہ پہنچ کر سلسلہ جنبانی شروع کر دی اور بنی امیہ کے ہوا خواہوں سے مل ملا کر ایک وفد کی تشکیل کی جس پر اس نے بیت المال سے تیس ہزار درہم بطور رشوت صرف کئے یعنی اپنے بیٹے موسیٰ کی زیر قیادت دس آدمی دمشق روانہ کئے اور ہر ایک کو تین تین ہزار درہم دیئے۔

چنانچہ انہوں نے پروگرام کے مطابق معاویہ سے جا کر خواہش کی کہ وہ یزید کو اپنا جانشین مقرر کریں۔ معاویہ نے وفد سے تو صرف یہی کہا کہ ابھی جلدی نہ کرو اور خلوت میں موسیٰ سے دریافت کیا کہ "پدر تو دین ایں مردم

[1] بلاغۃ الحسین، ص ۱۳۹ تا ۱۵۳۔ [2] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۳، ۲۴۔

راکہ از کوفہ آمدہ اند بچند خریدہ است ؟'' کہ تمہارے باپ نے کتنے میں ان لوگوں کے دین وایمان کو خریدا ہے؟ موسیٰ نے کہا: تیس ہزار درہم میں۔ اس پر معاویہ نے کہا: ''دین و ملت ازیں جماعت چنداں قیمت نداشتہ است ''[1] ان لوگوں کی نظر میں دین وایمان کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔''

اسی طرح زیاد نے بصرہ کی زمین ہموار کی اور رجب ۵۰ھ میں مغیرہ کی وفات ہوگئی تو کوفہ و بصرہ ہر دو کی گورنری زیاد کے متعلق ہوگئی۔ اس نے حالات مزید سازگار بنائے اور رجب ۵۳ھ کو زیاد کا بھی انتقال ہوگیا تو اب معاویہ نے اس معاملہ میں مزید تاخیر وتعویق مناسب نہ سمجھی چنانچہ امیر شام نے بڑے اہتمام کے ساتھ یزید کی ولی عہدی کا اعلان کردیا۔[2] اور ساتھ ہی یہ انتظام کیا کہ اس نے جو خطبہ یزید کی تعریف وتوصیف میں پڑھا۔ چند مخصوص لوگوں (مثل سعید بن العاص، حصین بن نمیر، ضحاک بن قیس وغیرہ) نے بڑھ چڑھ کر اس کی تائید کی۔ اور اس طرح شام میں عامۃ الناس سے بیعت لے لی گئی۔[3]

کوفہ و بصرہ اور بالخصوص دمشق کے لوگوں کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اب معاویہ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ مکہ و مدینہ کے لوگوں سے بیعت لینی چاہیے چنانچہ زمین حجاز کو ہموار کرنے کے لیے مروان بن الحکم (حاکم مدینہ) کو اس مقصد کے لیے خط لکھا۔ مصر وعراق اور دمشق کے اکابر ومشاہیر نے میرے بیٹے یزید کی بیعت کر لی ہے۔ تم اہل مدینہ سے بھی اس کی بیعت لو۔[4]

---------- ----------

---------- ----------

---------- ----------

معاویہ اس سلسلہ میں ہر روڑے کو راستہ سے ہٹا رہا تھا اور ہر خرخشہ کو مٹا رہا تھا۔ چنانچہ جب ابتدا میں اسے معلوم ہوا کہ اہل دمشق یزید کی نسبت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی طرف (اس کے والد کے کارناموں کی وجہ سے) زیادہ مائل وراغب ہیں اور اسے اندیشہ دامن گیر ہوا کہ کہیں لوگ اسے خلیفہ نہ مان لیں جس کا اظہار بھی لوگوں نے کر دیا تھا تو اسے زہر دلا دیا۔ ابن عبدالبر نے اس واقعہ کی نسبت لکھا ہے: ﴿ثم ان عبد الرحمن مرض فامر معاویۃ

---

[1] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۳۳۔

[2] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۳۵۔

[3] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۳۵۔ تاریخ کامل، ج ۳، ص ۳۴۹ پر یزید کی ولی عہدی کا تذکرہ ۵۶ھ میں کیا ہے۔

[4] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۳۵۔

طبیباً عندہ یهودیا و کان عندہ مکینا ان یاتیه فیسقیه سقیة یقتله بها فاتاه فسقاه فانخرق بطنهٗ فمات (و قصة هذہ مشهورة عند اهل السیر و العلم و الآثار و الاخبار) عبدالرحمٰن بیمار ہوا۔ معاویہ نے اپنے ایک معتمد یہودی طبیب کو حکم دیا کہ وہ دوا میں کوئی ایسی چیز پلا دے کہ وہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے کوئی ایسی چیز اسے دی جس کی وجہ سے اس کا پیٹ پھٹ گیا اور اس کی موت واقع ہوگئی۔[1]

اسی طرح جب سعید بن عثمان نے یزید کی ولیعہدی پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے استحقاق کا اظہار کیا تو معاویہ نے اسے خراسان کا حاکم بنا کر[2] (اور بروایتے چالیس لاکھ درہم بھی دیئے)[3] اس کے دین و ایمان کو خرید لیا اور وہ مطمئن ہوگیا۔

بہرحال مروان نے مسجد نبویؐ میں اکابر صحابہ و تابعین کا ایک اجتماع کیا اور خود منبر پر جا کر بیان کیا کہ امیر شام اب بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعد خلافت کے متعلق ایک ایسا فیصلہ کیا ہے جس میں خدا و رسولؐ کی رضا کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی سراسر فائدہ ہے۔ بتایئے آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟ لوگوں نے سمعاً و طاعۃً کہتے ہوئے وضاحت طلب کی۔ مروان نے کہا: انہوں نے ایک ایسے شخص کو ولی عہد بنایا ہے جو نیک سیرت، صاحب عدل و مروت اور خلفائے راشدین کے قدم بقدم چلنے والا ہے۔ اور یہ شخص امیر کا بیٹا یزید ہے۔ یہ سننا تھا کہ عبدالرحمٰن بن ابوبکر بگڑ گئے۔ اور کہا: اے مروان تم بھی جھوٹ کہتے ہو۔ اور جس نے تمہیں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ بھی جھوٹ کہتے ہیں۔ یزید ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم بیان کر رہے ہو۔ اور ہم ہرگز ایسے (زانی و شرابی) کی بیعت پر راضی نہیں ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔ اس پر مروان نے آگ بگولہ ہو کر کہا: یہ اعتراض کرنے والا وہ شخص ہے جس کے متعلق آیت قرآنیہ ﴿والذی قال لوالدیه اف لکما﴾ نازل ہوئی ہے۔ عبدالرحمٰن نے غصہ سے بھرپور ہو کر کہا: اچھا تم آج اس قابل بھی ہوگئے کہ میرے حق میں قرآن کی تاویل کرو۔ کیا تو وہی نہیں ہے جسے پیغمبر اسلام ﷺ نے تمہیں اور تمہارے باپ کو مدینہ سے نکال دیا تھا۔ یہ کہہ کر عبدالرحمٰن اٹھے اور مروان کی ٹانگ سے پکڑ کر اسے منبر سے نیچے گھسیٹ لیا۔ بنی امیہ نے عبدالرحمٰن کو گزند پہنچانے کا قصد کیا ہی تھا کہ جناب عائشہ کچھ دیگر خواتین کے ساتھ مسجد میں آگئیں۔ اور مروان کو سخت دُشست کہا۔ کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ جناب رسول خدا ﷺ نے تم پر اور تمہارے باپ پر لعنت کی ہے۔ تم طرید بن طرید ہو کہ میرے بھائی سے ایسا کلام کرتے ہو۔[4] غرضیکہ اس

---

[1] استیعاب، ج ۲، ص ۳۹۶۔ کذا فی روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۳۳۔ اس میں طبیب کو نصرانی لکھا ہے۔ طبری، ج ۶، ص ۱۲۸۔

[2] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۹۔

[3] تاریخ اعثم کوفی، ترجمہ، ص ۳۲۱۔

[4] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۶۔ تاریخ الخواریج، ج ۲، ص ۱۳۶۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۵۰۔

بڑ بونگ اور تہذیب ومتانت کے اس مظاہرہ پر یہ اجتماع منتشر ہو گیا۔

معاویہ کو ان حالات کی اطلاع دی گئی۔ اسے یہ حالات و واقعات معلوم کر کے بڑی پریشانی ہوئی کیونکہ وہ اعتراض کرنے والوں کی اہمیت سے واقف تھا اس لیے اصلاح احوال اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اس سے اپنے ناخلف بیٹے کی معیت میں حج کے بہانہ سے سفر حجاز اختیار کیا اور بڑے شاہانہ شان وشکوہ کے ساتھ مدینہ پہنچے سب سے پہلے حضرت امام حسینؑ سے سامنا ہوا (چونکہ ان کے متعلق بھی معاویہ کو بہت شکایات کی اطلاع پہنچ چکی تھی) لہٰذا معاویہ نے آنجنابؑ کے حق میں کہا: لا مرحبا، ولا اھلا تو بدنۂ را مانی کہ خون او بجوش آمدہ باشد و حق عز و علاء خون ترا خواھد ریخت۔'' [۱] تمہارے لیے نہ خوشی ہو اور نہ برکت۔ تم قربانی کا وہ دنبہ ہو (معاذ اللہ) جس کا خون جوش مار رہا ہے خدا تمہارے خون کو ضرور بہائے گا۔

امام حسینؑ نے جواب میں کہا: ''ای معاویہ ھموار باش و ناھنجار سخن متراش کہ ما مخاطب ایں گونہ سخن نیستیم!'' اے معاویہ! چپ رہو کہ ہم ایسے ناہنجار کلام کے اہل نہیں ہیں۔ [۲] معاویہ نے کہا: ''اھل ایں سخنهد و بدتر ھم'' تم اس کے بلکہ اس سے بدتر کے اہل ہو۔ [۳]

پھر عبدالرحمٰن بن ابی بکر ملے تو ان سے کہا تم بالکل بڈھے ہو کر سٹھیا گئے۔ عبداللہ بن زبیر ملے تو ان سے کہا: تم مکار سوسمار کی طرح ہو۔ جو سوراخ میں سر چھپا کر دم ہلاتا ہے۔ بخدا یہ دم پکڑی جائے گی۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر کو بھی سخت سُست کہا۔

وقتی مصلحت کے تقاضے کے تحت حضرت امام حسینؑ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن زبیر مکہ چلے گئے۔ [۴]

اب معاویہ کی نظر تین شخصیتوں پر جمی ہوئی تھی جن کا مدینہ بلکہ بیرونی اسلامی دنیا میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ عبد اللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور جناب عائشہ۔ چنانچہ اول الذکر دونوں حضرات سے خلوت میں ملاقات کی۔ بڑے لطف و مدارات سے پیش آیا۔ اور پھر اپنے مطلب کا اظہار کیا لیکن ابن عباس اور بالخصوص جناب عائشہ سے اسے سخت مایوسی ہوئی۔ البتہ ابن عمر کے نرم جواب اور پھر خانہ نشین ہو جانے نے اس کے لیے راستہ کو قدرے ہموار کر دیا۔ چنانچہ معاویہ نے مسجد نبویؐ میں ایک جم غفیر کے سامنے منبر پر جا کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے اصلی مقصد پر آتے ہوئے کہا: اے لوگو! تمہیں کہو۔ اس وقت علم و عدل اور فضل و بذل کے اعتبار سے کون ایسا شخص ہے جو میرے بیٹے یزید

۱۔ روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۶۔ کامل، ج ۳، ص ۲۵۱۔
۲۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۳۶۔
۳۔ روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۶۔
۴۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۳۶۔

سے بڑھ کر حقدار خلافت ہو؟ اس کے بعد خاص کر حضرت امام حسین علیہ السلام، عبد الرحمٰن بن ابی بکر، اور عبد اللہ بن زبیر وغیرہ ہم کا نام بنام ذکر کر کے کہا کہ یہ لوگ اگر یزید کی بیعت کر لیں تو فبہا۔ ورنہ میری طرف سے اچھا نہ ہوگا۔ اس طرح ان حضرات کو بالخصوص اور دوسرے لوگوں کو بالعموم ڈرانے اور قتل کی دھمکیاں دینے کے بعد اپنی رہائش گاہ میں پہنچے۔ جب جناب عائشہ کو ان کی اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ نہایت غصہ کی حالت میں معاویہ کے پاس گئیں۔ اور کہا:

"اے معاویه هیچ می دانی که چه کردهٔ و چه میکنی برادر من محمد را در مصر ماخوذ داشتی و بکشتی آنگاه برا فروختی و بسوختی۔ و اکنوں که سفر مدینه کردهٔ برادر دیگر من عبد الرحمن را بتهدید و تهویل میترسانی و میرنجلنی و پسران اصحاب را از خویشتن هم عذاب و عقاب میدهی۔ تو کجا از من ایمن شدی۔ و امان یافتی اگر بفرمائم تورا دست بگردن بسته فراز آرند۔ و بخون برادرم محمد سر بردارند۔ کیست که در این کارِ مرا ممانعت نماید۔" اے معاویہ! تم نے اب تک کیا کیا ہے اور اب کیا کر رہے ہو۔ تو نے مصر میں میرے بھائی محمد کو قتل کیا اور پھر ان کی لاش کو نذر آتش کیا۔ اور آج مدینہ میں میرے دوسرے بھائی کو ڈراتے دھمکاتے ہو۔ نیز اصحاب رسول کی اولاد کو ہراساں کرتے ہو۔ تم کب میری گرفت سے آزاد ہوئے ہو۔ اگر ابھی میں حکم دوں تو لوگ تجھے گردن سے پکڑ کر میرے بھائی محمد کے قصاص میں قتل کر ڈالیں گے۔ اور اس سلسلے میں مجھے روکنے والا کون ہے۔[1] بعد ازیں جب معاویہ نے لوگوں سے بیعت لینا چاہی تو بھی جناب عائشہ نے مزاحمت کی۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب اوائل میں (علیٰ ما نقل عنہ) لکھا ہے: ﴿و كان (معاوية) على منبر رسول الله صلى الله عليه (وآله) وسلّم ياخذ البيعة ليزيد فاخرجت عائشه راسها من الحجرة و قالت صه صه هل استدعى الشيوخ لبنيهم البيعة قال لا قالت فمن تقتدي انت فخجل و نزل عن المنبر..... الخ﴾ معاویہ منبر رسولؐ پر بیٹھ کر لوگوں سے اپنے بیٹے یزید سے بیعت لے رہا تھا کہ جناب عائشہ نے اپنے حجرہ سے سر باہر کر کے کہا: خاموش خاموش! کیا تم سے پہلے خلفاء نے بھی کبھی اپنے بیٹوں کے لیے بیعت لی تھی؟ معاویہ نے کہا: نہیں! جناب عائشہ نے کہا: پھر تم کس کی اقتداء کر رہے ہو؟ یہ سن کر معاویہ شرمسار ہوا۔ اور منبر سے نیچے اتر آیا۔

ان حالات کے پیش نظر جب امیر شام کو جناب عائشہ کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی اور یہ بھی یقین ہو گیا کہ ان کی موجودگی میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا تو اب ان کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔ جو کامیاب رہا۔ سیوطی نے اوائل میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد لکھا ہے: ﴿و بنى لها حفرة فوقعت فيها

[1] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۳۷۔ روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۶، طبع نولکشور۔

وماتت ﴾۔ معاویہ نے ان (عائشہ) کے لیے ایک گڑھا کھدوایا جس میں گر کر وہ جان بحق ہو گئیں۔

اس واقعہ کی تفصیل حبیب السیر (جلد اول جزء سوم، ص ۸۵) میں مرقوم ہے۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے:

﴿در تاریخ حافظ آبرو از ربیع الابرار و کامل السفینه منقول است که در مشهور ۵۸ھ ثمان و خمیس من الهجرة معاویة ابن ابی سفیان جهت پسر لعین خود بمدینه رفته امام حسین[۲] و عبد الرحمٰن بن ابی بکر و عبد الله بن زبیر را برنجانید عائشه زبان ملامت و اعتراض بروے بکشاد۔ و معاویه در خانهٔ خویش چاهے کنده و سر آں را به خاشاک پوشانید و کرسئ آبنوس برآں نهاده و آنگاه عائشه را بضیافت طلب داشته۔ بر کرسی نشانید تا دراں چاه افتاد۔ و معاویه سر آں چاه را باهگ مضبوط نمود۔ و از مدینه بمکه رفت ﴾۔ حافظ آبرو کی تاریخ میں ربیع الابرار اور کامل السفینہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ۵۸ھ میں معاویہ بن ابی سفیان اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت لینے کی غرض سے مدینہ گیا۔ اور حضرت امام حسینؑ، عبد الرحمٰن بن ابی بکر اور عبد اللہ بن زبیر کو پریشان کیا۔ جناب عائشہ نے اس کی سرزنش کی۔ معاویہ نے اپنی رہائش گاہ میں ایک کنواں کندہ کرایا۔ اور اس کا دہانہ خس و خاشاک سے بند کرا دیا۔ اور اس پر آبنوس کی کرسی رکھ دی۔ اس کے بعد عائشہ کو کھانے کے بہانے سے طلب کیا۔ جب وہ آئیں تو ان کو اسی کرسی پر بٹھایا۔ وہ فوراً کنویں میں گر گئیں۔ معاویہ نے چونے سے اسے بند کرا دیا۔ اور مکہ کی طرف چلا گیا۔

بہرحال اہل مدینہ سے بیعت لینے کے بعد امیر شام نے مکہ مکرمہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر پھر حضرت امام حسینؑ، عبد الرحمٰن ابن ابی بکر اور عبد اللہ زبیر سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات کے برخلاف اب کی مرتبہ معاویہ ان سے بڑی تہذیب اور ملائمت کے ساتھ پیش آیا اور عبد الرحمٰن بن ابوبکر، عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کے پاس گرانقدر عطیات بھیجے جنہیں انہوں نے قبول کر لیا مگر جب ان سب سے زیادہ تحف و ہدایا حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پیش کیے مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح معاویہ نے جو منصوبہ تیار کیا تھا اس پر پانی پھر گیا مگر اس نے ایک اور مکر و حیلہ سے کام چلا لیا اور وہ یوں کہ اس نے برسر منبر اعلان کیا کہ (معاذ اللہ) امام حسینؑ، عبد الرحمٰن بن ابی بکر اور عبد اللہ بن زبیر نے یزید کی بیعت کر لی ہے (اس وقت ان کو تردید کی مہلت ہی نہ دی۔[۲] بعد میں وہ اس کی نفی کرتے رہے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا) اس بہانہ سے اہل مکہ سے بیعت لے لی۔ اس طرح امیر شام

---

[۱] روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۷۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۳۸۔

[۲] تفصیل کیلئے: تاریخ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۵۲، اور روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۹۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۳۰۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۹۷، طبع مصر جدید (نوٹ) ناسخ التواریخ سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ معاویہ نے یہ حیلہ سازی دوسرے سفر میں کی تھی جو اس نے ۵۹ھ میں کیا تھا۔

بظاہر اپنے ارادہ کی تکمیل سے شاد کام ہو کر واپس گیا۔ اس سے زیادہ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بالآخر اواخر ۵۹ھ میں معاویہ بیمار ہوا اور اکثر مورخین کے بیان کے مطابق ۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ دم واپسیں بھی اسے اگر خیال تھا تو یہی کہ یزید کی خلافت کیوں کر مستحکم و مضبوط ہو۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ وہ یزید جس کے لیے امیر شام نے راہ راست کو خیر باد کہا۔ دین و دیانت اور ضمیر کی قربانی دی۔ جس کا اعتراف خود انہوں نے مروان کے سامنے کیا تھا جیسا کہ ابن حجر مکی نے تطہیر الجنان میں لکھا ہے کہ ایک روز معاویہ رونے لگے۔ مروان نے سبب دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہو گیا ہے اور ہڈیاں گھل گئیں اور جسم کمزور ہو گیا۔ اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست کو حاصل کر لیتا۔[1] وہی یزید اپنے اس مہربان باپ کے آخری وقت میں پاس موجود ہی نہ[2] تھا۔ بلکہ دمشق کے باہر مقام "حوارین" میں عیش و عشرت کی داد دے رہا تھا۔[3]

معاویہ نے آدمی بھی اس کے بلانے کو بھیجا مگر وہ اس وقت آیا جب معاویہ دفن بھی کئے جا چکے تھے۔[4]

معاویہ نے اپنی آخری وصیت بھی ضحاک بن قیس فہری اور مسلم بن عقبہ کے ذریعہ یزید تک پہنچائی جس کا آخری حصہ یہ تھا کہ یزید کو بتا دینا کہ مجھے اس کے خلاف فقط چار آدمیوں سے اندیشہ ہے حسینؑ بن علی، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عمر۔[5]

اس سے ظاہر ہے کہ ایسے حال میں بھی معاویہ کو اگر کوئی فکر تھی تو وہ صرف اور صرف یزید کی خلافت کے استحکام کی تھی اور وہ نامزدہ اشخاص کو جن میں سے سرکار امام حسینؑ سر فہرست ہیں اپنی آنکھوں کی سوئیاں سمجھتا تھا اور ان سوئیوں کے رہ جانے کا اس کو بہت ہی صدمہ تھا۔ بہرحال اس صدمہ کو سینہ میں لے کر امیر شام بنا بر مشہور ۱۵ رجب وبقولے ۲۲ رجب ۶۰ھ کو پورے چالیس سال بادشاہی کرنے کے بعد ۷۸ وبقولے ۸۵ سال کی عمر میں عدم آباد سے اپنے اصلی مقام کی طرف انتقال کر گیا اور اسی دن یزید تخت حکومت پر متمکن ہو گیا۔

حسن بصری کہا کرتے تھے کہ معاویہ نے چار کام ایسے کئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اس کی ابدی ہلاکت و

---

۱ تطہیر الجنان بر حاشیہ صواعق محرقہ، ص ۵۶۔

۲ طبری، ج ۶، ص ۱۸۰۔

۳ طبری، ج ۶، ص ۱۸۳۔

۴ طبری، ج ۶، ص ۲۸۳۔

۵ الاخبار الطوال، ص ۲۲۷۔ طبری، ج ۶، ص ۱۸۰۔

بربادی کے لیے کافی ہے۔ اوّل یہ کہ چند جاہلوں کے تعاون سے تخت خلافت پر متمکن ہو گیا۔ حالانکہ اس وقت اس سے افضل اصحاب رسولؐ موجود تھے۔ دوسرے یہ کہ یزید جیسے نابکار بیٹے کو اپنا ولی عہد بنایا جو شرابی، کبابی، بھنگی، چرسی اور خلاف شرع ریشم پہننے اور طنبورہ بجانے والا تھا۔ تیسرے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار دے کر اسے اپنا بھائی بنایا حالانکہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔ (الولد للفراش و للعاھر الحجر)۔ چوتھے یہ کہ حضرت حجرؓ (بن عدی) اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا۔ (طبری، ج ۶، ص ۱۵۷۔ کامل، ج ۳، ص ۲۴۲۔ ابوالفدا، ج ۱، ص ۱۹۶)

نواں باب

آیا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ
ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ یا مسلسل علل واسباب کا نتیجہ تھی؟

عنوان بالا کے متعلق ایک کوتاہ اندیش اور سطحی نگاہ رکھنے والا انسان تو فوراً کہہ سکتا ہے کہ یہ دردناک واقعہ حادثاتی اور ناگہانی طور پر واقع ہوا یعنی مرگ معاویہ کے بعد یزید اس کی بچھائی ہوئی مسند پر بیٹھا۔ اور اس نے امام حسین علیہ السلام سے بشدت بیعت کا مطالبہ کیا۔ سرکار سید الشہداء علیہ السلام نے انکار پر اصرار فرمایا جس کا نتیجہ ان کی شہادت کی صورت میں نمودار ہوا۔ چنانچہ اکثر دشمنانِ حسینؑ و حسینیتؑ ہمیشہ اس واقعۂ ہائلہ کی اہمیت و عظمت کو کم کرنے کے لیے یہی کہا کرتے ہیں اور جو حضرات ذرا عمیق نگاہوں سے حقائق کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہے کہ "اگرچہ شہادت حسینؑ کا تیرہ و تار واقعہ ۶۱ھ میں واقع ہوا۔ لیکن اس یومِ دیجور قیامت کی شام ظلمت اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی۔ جب خورشید رسالت غروب ہوا۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا۔[1]

لیکن محققین و ژرف بین نگاہ رکھنے والے حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ اس خون آشام اور درد انگیز واقعہ کے علل واسباب کا سلسلہ بہت طویل ہے اور اس کی ابتدائی کڑیوں کا تعلق اس زمانہ سے ہے جبکہ اس ظاہری عالم میں امام حسینؑ کی ولادت باسعادت بھی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک نازک مقام پر پہنچنا پڑتا ہے۔ جس کا تذکرہ کچھ خوشگوار معلوم نہیں ہوتا۔ مگر کیا کیا جائے جب تک (اختصار کے ساتھ ہی سہی) اس سلسلہ کی جملہ کڑیاں بیان نہ کی جائیں۔ اس وقت تک یہ مطلب منقح نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتاب شہید اعظم، مجاہد اعظم اور بالخصوص شہادتِ عظمیٰ میں اس پر بہت سیر حاصل بحث کی گئی ہے ہم اس موضوع کی عام کتب سے بالعموم اور مولانا الحق سید علی حیدر صاحب مرحوم نجوی کی کتاب شہادۃِ عظمیٰ سے بالخصوص استفادہ کرتے ہوئے ذیل میں اس واقعۂ ہائلہ کے تمام گفتنی و ناگفتنی علل واسباب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

---

[1] رسالہ ابتلاء الحسین، ص ۳۶، بحوالہ مجاہد اعظم، ج ۱۔

ارباب بصیرت پر یہ امر مخفی و مستور نہیں ہے کہ کسی بھی عظیم واقعہ سے پہلے اس کے علل و اسباب مجتمع ہوتے رہتے ہیں اور اس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد زمانہ دراز تک اس کے نتائج و اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں جس طرح کسی عظیم واقعہ کے نتائج و اثرات پر غور و تامل نہ کرنا کھلی ہوئی غفلت ہے اس سے بڑھ کر اس کے علل و اسباب کا تصور کئے بغیر اس واقعہ کا وقوع تسلیم کر لینا بھی غفلت و کوتاہ اندیشی ہے جب یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ شہادت حسینؑ کا خونی اور دردناک واقعہ ایسا عظیم ہے کہ تاریخ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے تو عقل سلیم یہ کیونکر باور کر سکتی ہے کہ اتنا بڑا سانحہ علل و اسباب کے طویل سلسلہ کے بغیر واقعہ ہو گیا ہو حقیقت یہ ہے کہ شہادت حسینؑ کا قصر عرصہ دراز سے تعمیر ہو رہا تھا اور اس کی اینٹوں کی فہرست بہت لمبی ہے البتہ اس کی آخری اینٹ خلافت یزید بن معاویہ ہے۔ کامل غور کے بعد اس عمارت کی ابتداء اور انتہا یوں معلوم ہوتی ہے۔

شہادت حسینؑ کی پہلی اینٹ واقعہ عقبہ ہے

اس کی پہلی اینٹ ۹ھ میں واقعۂ عقبہ کے موقع پر رکھی گئی۔ حضرت رسول خدا ﷺ نے اپنے اعلان نبوت کے چوتھے سال (جبکہ کھلم کھلا دعوت کا حکم ہوا) بحکم خدا حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا یہ آپ کی خلافت کا پہلا قولی اعلان تھا اور جب شب ہجرت آپ کو اپنی جگہ مکہ میں چھوڑ کر خود مدینہ تشریف لے گئے تو یہ آپ کی خلافت کا پہلا عملی اعلان تھا مگر منافقوں کو اس کی کب امید ہو سکتی تھی کہ مدینہ میں اسلام اس قدر پھیلے اور پھولے گا۔ اس لیے اس موقع پر انہوں نے آنحضرتؐ کے قتل کی کوئی اجتماعی بلکہ انفرادی کوشش بھی نہیں کی مگر جب آنحضرتؐ کے مدینہ میں آنے کے بعد آٹھ نو سال تک انہوں نے دیکھا کہ اسلام مسلسل بڑھ رہا ہے اور منازل ترقی طے کر رہا ہے تو اب منافقین کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ یا تو حضرت رسول خدا ﷺ کو قتل کر دو یا پھر کوئی ایسی تدبیر کرو کہ اسلام کی بست و کشاد اور شان و شکوہ ان کے قبضہ میں آجائے۔ چنانچہ ۹ھ میں آنحضرتؐ غزوۂ تبوک میں جانے لگے تو مدینہ میں حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ ﴿ان رسول اللہ خرج الی تبوک فاستخلف علیا﴾ (بخاری کتاب المغازی، پ ۱۸، ص ۸۹) یہ آپؐ کی خلافت کا دوسرا عملی اعلان تھا۔ اب ان کو یقین ہو گیا کہ رسولؐ دنیا سے جاتے وقت بھی علیؑ ہی کو اپنا جانشین بنائیں گے اور اس طرح ان کو ہمیشہ محکوم رہنا پڑے گا اس لیے قتل رسولؐ کا منصوبہ بنایا۔ جب آنحضرتؐ واپس مدینہ تشریف لا رہے تھے تو جب مقام عقبہ ذی فتق پر پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت ۱۲ یا ۱۴ آدمی آپ کی سواری کی طرف بڑھے اور حملہ کر کے آپ کو ختم کرنا چاہا مگر خدا نے اپنے حبیب کو بذریعہ وحی ان لوگوں کے عزائم مشئومہ سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے آپ نے بچاؤ کی تدبیر کر لی۔ اور یہ لوگ خائب و خاسر ہوئے۔ (تاریخ خمیس، ج ۲، ص ۱۴۸) جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب حذیفہ کو ان منافقین

کے نام بتا دیے تھے مگر یہ تاکید کر دی تھی کہ ان کا اظہار نہ کرنا چنانچہ بعض حضرات ہمیشہ ان سے پوچھا کرتے تھے کہ ان کا نام تو ان میں شامل نہیں ہے لیکن جب رازدار رسولؐ نے بتانے سے اپنے انکار پر اصرار کیا تو بالآخر ایک دن ان جناب نے حلفیہ طور پر خود ہی کہہ دیا ﴿یا حذیفة واللہ انا من المنافقین﴾ اے حذیفہ (تم بتاؤ یا نہ بتاؤ) بخدا میں منافقوں میں سے ہوں۔[1]

دوسری امنٹ: واقعۂ تبلیغ سورۂ برأت

۹ھ کے آخر میں آنحضرت نے جناب اول کو سورۂ برأت کی تبلیغ کے لیے مکہ بھیجا انہوں نے کچھ راستہ طے کیا تھا کہ ان کو اس شرف سے محروم کر کے ان کی جگہ اس خدمت کی انجام دہی حضرت علیؑ کے ذمہ لگا دی جس پر ان کو صدمہ ہوا۔[2] یہ سب کچھ وحی الٰہی کے ماتحت عمل میں آیا تھا۔ مجبور تھے۔ شکایت تو کی مگر اور کچھ نہ کر سکے۔

تیسری امنٹ: واقعۂ غدیر

عن عمر بن الخطاب قال نصب رسول اللّٰہ علیاً علماً فقال من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ و اخذل من خذلہ و انصر من نصرہ اللّٰھم انت شھیدی علیھم قال و کان فی جنبی شاب حسن الوجہ طیب الریح فقال لی یا عمر لقد عقد رسول اللّٰہ عقداً لا یحلہ الا منافق فاحذر ان تحلہ قال عمر فقلت یا رسول اللّٰہ انک حیث قلت فی علیؑ کان فی جنبی شاب حسن الوجہ طیب الریح قال نعم یا عمر انہ لیس من ولد آدم لکنہ جبرئیل اراد ان یؤکد علیکم ما قلتہ فی علیؑ۔ جناب ثانی بیان کرتے ہیں کہ جس وقت پیغمبر خداؐ مقام غدیر پر حضرت علیؑ کی آقائی کا اعلان فرما رہے تھے، اس وقت میرے پہلو میں ایک خوبصورت اور خوشبودار نوجوان کھڑا تھا جس نے مجھ سے کہا: آج رسول خداؐ نے ایک ایسی گرہ لگا دی ہے جسے سوائے منافق کے اور کوئی نہیں کھول سکے گا۔ جب ثانی نے آنحضرت کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اے عمر تم خیال رکھنا کہ کہیں تم اس گرہ کو نہ کھول دو۔ نیز آنحضرت نے یہ بھی فرمایا: اے فلاں وہ کوئی آدمی نہ تھا۔ بلکہ جبرئیل تھے جو کچھ میں نے علیؑ کے بارے میں کہا ہے وہ اس کی تاکید مزید کر رہے تھے۔[3]

چوتھی امنٹ: تخلف از جیش اُسامہ

حضرت رسول خداؐ کو اپنے بعض مخصوص اصحاب کی مخفی کارروائیوں کا پتہ چلتا رہتا تھا اس لیے آپؐ نے

---

[1] میزان الاعتدال ذہبی، ج ۱، ص ۳۲۶۔
[2] قرۃ العینین، ص ۲۳۳۔ بخاری، پارہ ۲، ص ۲۲۸۔ کنز العمال، ج ۱، ص ۲۴۹۔
[3] مودۃ القربیٰ سید علی ہمدانی شافعی، ص ۱۶۔

اپنے انتقال کے وقت کوشش کی کہ ان سب کو مدینہ سے باہر کسی دور دراز مقام پر بھیج دیں تاکہ وفات کے وقت نہ وہ مدینہ میں موجود ہوں اور نہ خلیفہ کا جھگڑا کھڑا ہو۔ چنانچہ حضورؐ اپنی وفات سے چند روز قبل حضرت علیؑ کو روک کر باقی تمام اصحاب کو جن میں اصحاب ثلاثہ بھی شامل تھے حکم دیا کہ اُسامہ بن زید کی ماتحتی میں اہل روم سے جنگ کرنے کے لیے مدینہ سے چلے جائیں۔ جب صحابہ کو اس کا علم ہوا تو وہ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اور جب آنحضرتؐ کو ان کے تساہل کی اطلاع ملی تو بڑی شدت سے فرمایا: ﴿جهزوا جيش اسامة لعن الله من تخلّف عنها﴾ اسامہ کے لشکر کو جلد روانہ کرو جو لوگ اس کے ساتھ جانے سے پہلوتہی کریں۔ ان پر خدا کی لعنت ہو۔[1] مگر اس تاکید وتہدید کے باوجود یہ حضرات وہیں جمے رہے تاکہ وفات رسولؐ کے بعد آپ کی اہل بیتؑ کو مسند خلافت پر متمکن نہ ہونے دیں۔

پانچویں اینٹ: واقعہ قرطاس

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے آخری لمحات حیات میں چاہا کہ ایک ایسا وثیقہ لکھ دیں جس کے بعد اہل اسلام گمراہ نہ ہوں مگر حضرت ثانی آڑے آئے اور صاف کہہ دیا: ﴿ان الرجل ليهجر﴾ (معاذ اللہ) رسول کو ہذیان ہو گیا ہے۔ حسبنا کتاب اللہ۔ ابن عباس اس واقعہ کو یاد کر کے اس قدر رویا کرتے کہ پاس والے سنگریزے تر ہو جاتے۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جناب رسول خدا ﷺ وہ مخصوص وصیت نامہ لکھنے میں کامیاب ہو جاتے اور وہ عامۃ المسلمین کو مل جاتا تو وہ آنحضرت کی وفات حسرت آیات کے بعد چاہ ضلالت میں نہ پڑتے۔ اور نہ کسی کو جرأت ہوتی کہ وہ امام حسینؑ کو شہید کرے کیونکہ اس صورت میں نہ خلیفۂ اول کا دور ہوتا۔ نہ ثانی کا، نہ ثالث کا، نہ معاویہ کا اور نہ یزید کا، بلکہ آنحضرت ﷺ کے بعد سیادت وقیادت حضرت علیؑ اور ان کے بعد امام حسنؑ اور ان کے بعد امام حسینؑ کے سپرد ہوتی۔ اور یہ حضرات ظاہری طور پر بھی تمام مسلمانوں کے آقا و پیشوا اور مقتدا ہوتے۔ یزید کا کہیں پتہ بھی نہ چلتا۔ پیشوائے اہل حدیث مولوی وحید الزمان حیدر آبادی نے خوب لکھا ہے:

> "انہیں کی جوتیوں کے طفیل سے یزید اور یزید کے باپ کو اتنی بڑی حکومت اور بادشاہت ملی ورنہ جنگل کے سور چراتا پھرتا۔ اونٹ کا دودھ اور موت اور گوز پھوڑ کا گوشت کھاتا رہتا۔ اس محسن کشی اور کور نمکی کا کہیں ٹھکانا ہے۔"[3]

---

1. الملل والنحل، ج ۱، ص ۲۰۔ شرح ابن ابی حدید، ج ۲، ص ۲۱ وغیرہ۔
2. بخاری، پارہ اول، ص ۱۰۶۔ مشکوٰۃ، ج ۲، ص ۲۵۴۔ طبری، ج ۳، ص ۲۲۔
3. انوار اللغۃ، پ ۱۸، ص ۷، طبع بنگلور۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ کی زندگی میں شہادت حسینؑ کی عمارت میں کم از کم پانچ اینٹیں لگ چکی تھیں۔ آج دنیا والوں کو تعجب ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات سے صرف پچاس برس بعد آپ کی ہی امت نے آپؐ کے پیارے نواسہ کو کیونکر شہید کیا؟ امت کیوں کر اس اقدام پر آمادہ ہوئی۔ اگر مذکورہ بالا حقائق پر نگاہ کی جائے تو یہ تعجب ختم ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسا ہونا ضرور تھا۔ جب بعض بظاہر صحابہ اپنے ذاتی اغراض کے تحت حضرت رسول خدا ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش سے باز نہ آئے تو نواسۂ رسول کو قتل کرنے سے کیا امر مانع تھا؟ جب خلیفۂ اول نے سورۂ برأت کی تبلیغ سے معزولی پر حضرت رسولؐ سے بطور مقابلہ سوال و جواب کیا تو ان کو نواسۂ رسول کی تعظیم و تکریم کا خیال کس حد تک ہو سکتا تھا۔ جب حضرت رسول خدا ﷺ نے مقام غدیر خم پر اعلان خلافت مرتضویٰ کر دیا۔ حضرت ثانی کو اس گرہ کے نہ کھولنے کی تاکید کی گئی مگر انہوں نے اس گرہ کو کھول ہی دیا۔[1] تو ان کو امامت حسینؑ سے انکار کرنے میں کیا امر مانع تھا؟ جب لشکر اسامہ کی روانگی کا آنحضرتؐ نے بتاکید حکم دیا۔ خلاف ورزی کرنے والوں پر لعنت کی۔ مگر ارباب غرض نے حکم رسول کی تعمیل نہ کی۔ نہ مدینہ چھوڑا نہ لعن اللّٰہ من تخلف عن جیش اسامہ کی تہدید شدید کی کوئی پروا کی۔ تو پھر ان کو اطاعت حسینؑ کرنے اور ان کی مخالفت سے ڈرنے کی کیا پروا ہو سکتی تھی؟ جب جناب رسول خدا ﷺ اپنے عین حیات میں یہ فرمائیں کہ مجھے قلم دوات لا دو کہ میں ایک ایسا وثیقہ لکھ جاؤں کہ میرے بعد گمراہ نہ ہو۔ مگر یار لوگ ایک نہ سنیں۔ اور الٹا ان پر تہمت ہذیان لگائیں۔ تو آپؐ کی وفات کے پچاس برس بعد آپ کے اس ارشاد کی وہ لوگ کیا تعمیل کرتے۔ کہ ان ﴿ان ابنی ھذا الحسین یقتل بارض کربلا فمن شھد ذلک منکم فلینصرہ﴾ میرا یہ فرزند حسینؑ کربلا میں شہید کیا جائے گا۔ تم میں سے جو شخص بھی اس وقت موجود ہو۔ وہ ضرور ان کی نصرت کرے۔[2] جنہوں نے آپ کی زندگی کے آخری لمحات حیات میں آپ کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ وہ محبت و مودت حسینؑ اور آپ کو ہادی و امام ماننے اور ان کی نصرت و اعانت کرنے کے متعلق حکم نبوی کو کس کان سے سنتے؟

واقعۂ قرطاس سے متعلق مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی کا بیان پڑھنے کے قابل ہے اور دیدۂ بیدار رکھنے والے لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”سب سے پہلے واقعۂ قرطاس نے بھانڈا پھوڑا کہ اول دن سے رکاوٹوں کی کھچڑی خلافت کے لیے پک رہی تھی۔۔۔۔۔ بات پھر بھی گول مول رہی۔۔۔۔۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے وصیت کی جس کے لیے کاغذ منگواتے تھے۔ کچھ صراحت نہ فرمائی کہ کیا لکھوانا چاہتے تھے مگر جن کے دل میں تمنائے

---

[1] سر العالمین غزالی ص ۹ طبع بمبئی کی عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

[2] ما ثبت بالسنۃ، شیخ عبدالحق دہلوی ص ۱۱۔

خلافت چسکیاں لے رہی تھی۔ انہوں نے دھینگا مشتی سے منصوبہ ہی کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور صراحت کی تاویل یہ کی کہ ہماری ہدایت کے لیے قرآن بس کرتا ہے اور چونکہ اس وقت پیغمبرؐ صاحب بہ جا نہیں کا غذ۔ قلم دوات کا لانا کچھ ضرور نہیں۔ خدا جانے کیا کیا لکھوا دیں گے۔[1] حسین علیہ السلام کے جد نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ لوگوں نے اتنی تکلیف واذیت دی کہ آپ کو فرمانا پڑا: ﴿ما اوذی نبی کما اوذیت﴾ اور کچھ لوگوں نے آپؐ کی مخالفت کر کے اس قدر آپ کو روحانی صدمے پہنچائے کہ خداوند عالم کو ارشاد فرمانا پڑا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴾ (سورۂ احزاب، آیت ۵۷)

بالآخر ان لوگوں کی سرکشی وایذا رسانی اس حد تک پہنچی کہ خلق عظیم کے مالک کو آخری وقت میں فرمانا پڑا کہ:

﴿قوموا عنی﴾۔ ''میرے پاس سے اٹھ جاؤ''[2]

شہادت حسینؑ کی چھٹی اینٹ

قتل حسینؑ کی چھٹی اینٹ وفات رسولؐ کے وقت رکھی گئی۔ اگر کوئی انسان بھی مر جاتا ہے تو اس کے ساتھ معمولی سا تعلق رکھنے والے لوگ اپنا کام کاج ترک کر کے اس کی تجہیز وتکفین میں شمولیت ضروری سمجھتے ہیں۔ اور یہ تو سرور کائنات ﷺ کی وفات حسرت آیات تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر تمام روئے زمین کے مسلمان نہیں تو کم از کم مدینہ منورہ کے تمام صحابہ کرام تو اپنے تمام کاروبار بند کر کے آنحضرت ﷺ کے در دولت پر حاضر ہوتے۔ اور آپ کی تغسیل وتکفین اور تدفین کا شرف حاصل کرتے مگر یہاں تو عالم یہ ہے کہ شمع رسالتؐ کے پروانے ہونے کے دعویدار جنازۂ رسولؐ چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں اور پورے تین دن کے بعد تشریف لاتے ہیں۔ مؤرخ طبری نے لکھا ہے: ﴿لما قبض النبیؐ کان ابو بکر غائباً فجاء بعد ثلاثة ایام... الخ﴾ جب رسول خدا ﷺ کا انتقال ہوا تو اوّل صاحب غائب تھے۔ تین دن کے بعد آئے۔[3] اس طرح جنازۂ رسولؐ تین دن بے دفن پڑا رہا کیونکہ لوگ اوّل صاحب کی بیعت میں مشغول تھے۔[4] ﴿انما دفن النبیؐ بعد وفاته بثلاثة ایام﴾۔[5]

البتہ جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے فطری تعلق تھا یعنی حضرت علی علیہ السلام وخاندان بنی ہاشم، ان پر اس فطری تعلق کا پورا اثر ہوا۔ اور اس وجہ سے ان کو آنحضرت ﷺ کے درد وغم اور تجہیز وتکفین سے ان باتوں کی فرصت نہ

---

[1] امہات الامہ، ص ۹۲۔
[2] بخاری، پ ۳۰، ص ۱۰۷ وغیرہ۔
[3] طبری، ج ۳، ص ۱۹۸۔
[4] سیرۃ حلبیہ، ج ۳، ص ۳۶۲۔
[5] طبری، ج ۳، ص ۲۳۔

لی ۔۔۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عمرؓ آنحضرتؐ کی تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ کو چلے گئے۔[1] جب بقول شبلی صاحب نعمانی ''اسلام کے مہر و ماہ'' خود رسولؐ مقبول سے وہ برتاؤ کریں جو ایک معمولی مسلمان سے بھی نہیں کیا جاتا تو ۶۱ھ کے مسلمان اسی دنیوی بادشاہت کے لالچ میں حسینؑ کا خون کیوں نہ بہاتے۔ جب نانا کی یہ توہین کی تو ان کے نواسہؑ کی کیوں نہ اہانت کرتے؟ افسوس ۔

هیچ کافر نکند آنچه مسلماں کردند

شہادت حسینؑ کی ساتویں اینٹ سقیفہ بنی ساعدہ

حضرت رسول اکرم ﷺ نے بار بار حضرت امیر علیہ السلام کی خلافت کا اعلان فرمادیا تھا مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی صحابۂ کرام کی اکثریت نے ان تمام اعلانات و اہتمامات کو پس پشت ڈال دیا اور حضرت علی علیہ السلام کو جنازۂ رسولؐ کے پاس چھوڑ کر خود سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچ گئے۔ اور ظاہری خلافت پر قابض ہوگئے صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ الٹا حضرت امیر علیہ السلام سے بھی بیعت لینے پر اصرار کیا جس پر جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا: ﴿انتم احق بالبیعة لی﴾ تم کو میری بیعت کرنی چاہیے اور پھر صاف صاف فرمایا: ﴿اتاخذوه منا اهل البیت غصبا﴾ کیا تم خلافت کو ہم اہل بیتِ رسولؐ سے غصب کرنا چاہتے ہو؟[2]

ظاہر ہے کہ یزید نے بھی سقیفہ بنی ساعدہ والی کارروائی کا اعادہ ہی کیا ہے کیونکہ رسولؐ کے اعلان کے مطابق ان کے پہلے حقیقی خلیفہ سے ارباب سقیفہ نے خلافت غصب کی اور صحیح وارث مسند کو بیعت کرنے پر مجبور کیا اسی طرح ان کے تیسرے صحیح جانشین سے یزید نے خلافت غصب کر کے ان کو بیعت کرنے پر مجبور کر دیا اور جب انہوں نے انکار کیا تو ان کو شہید کرا دیا اگر ارباب سقیفہ علی علیہ السلام کو اپنے حق خلافت سے محروم نہ کرتے تو یزید کو اس کی جرأت کہاں ہوتی؟ بلکہ اس تک نوبت ہی کب پہنچتی؟ یہی توجہ ہے کہ ﴿قیل لرجل من بنی هاشم متٰی قتل الحسین بن علیؑ﴾ ایک ہاشمی سے کسی نے پوچھا کہ حسینؑ کب شہید ہوئے؟ ﴿ قال یوم سقیفه بنی ساعدة﴾ کہا کہ درحقیقت وہ سقیفہ بنی ساعدہ کے روز ذبح ہو گئے تھے۔[3] ﴿ولنعم ما قیل﴾ کہ کشته شد حسینؑ اندر سقیفه۔

جناب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے مذکورہ بالا حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبرؐ صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم اتفاقات پیش آئے کہ ان کا

---

1. الفاروق، ص ۶۶۔
2. الامامت والسیاست، ص ۱۹۔
3. رسالہ الالفاظ الکتابیہ، ص ۱۴۳ طبع بیروت۔

ادب اور لحاظ جو ہونا چاہیے تھا۔ اس میں ضعف آ گیا۔ اور شدہ شدہ منجر ہوا۔ اس ناقابل برداشت واقعۂ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔"[1] اسی وجہ سے تو غزالی وغیرہ بعض متعصب علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ ﴿و یحرم علی الواعظ وغیرہ ذکر روایۃ مقتل الحسنؑ و الحسینؑ و حکایاتہ وما جریٰ بین الصحابۃ من التشاجر و التخاصم فانّہ یہیج علی بغض الصحابۃ و الطعن فیہم﴾ واعظ وغیرہ پر حسنؑ و حسینؑ کی شہادت اور صحابہ کرام کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان کا ذکر کرنا حرام ہے کیونکہ اس سے صحابہ کرام کا بغض پیدا ہوتا ہے۔[2]

شہادتِ حسینؑ کی آٹھویں اینٹ حضرت امیرؑ کی گرفتاری

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ جب خاصے تشدد کے بعد بھی حضرت امیر علیہ السلام نے اول کی بیعت نہ کی تو ثانی کچھ لوگوں کو ہمراہ لے کر حضرت علی علیہ السلام کے در دولت پر گئے اور ان کو گرفتار کر کے دربار خلافت میں لائے۔ اور ان سے زبردستی بیعت لینے کی پوری کوشش کی۔[3] بالکل اسی طرح امیر شام کے بیٹے یزید نے دولت و حکومت کے نشے میں سرشار ہو کر نواسہ رسولؐ سے زبردستی بیعت لینا چاہی اور حاکم مدینہ کو تاکیدی حکم بھیجا کہ ﴿خذ حسیناً بالبیعۃ اخذاً شدیداً لیست فیہ رخصۃ حتی یبایع﴾ حسینؑ کو بیعت کے لیے سختی سے گرفتار کرو اور جب تک بیعت نہ کریں انہیں ہرگز نہ چھوڑو۔[4] اگر ثانی، فرمانِ رسولؐ کو نظر انداز کر کے ان کے حقیقی وارث و جانشین کی اس قدر توہین و تذلیل نہ کرتے تو پھر یزید یا کسی اور شخص کو حسینؑ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی کیونکر جرأت ہوتی؟ جس چیز کا سنگ بنیاد سقیفہ والوں نے رکھا تھا یزید نے اسی قصر کی تکمیل کی۔۔۔۔۔ و بس۔

شہادتِ حسینؑ کی نویں اینٹ: خانۂ علیؑ و بتولؑ کو آگ لگانے کی دھمکی

جب حضرت علی علیہ السلام نے مسلمانوں کے خلیفۂ اول کی بیعت کرنے سے انکار کیا تو حضرت ثانی کچھ لوگوں کے ساتھ آگ اور لکڑیاں ہمراہ لے کر گئے اور خانۂ علیؑ و بتولؑ کے دروازہ پر جا کر کہا: باہر نکل کر بیعت کرو ورنہ میں گھر کو آگ لگا دوں[5] گا۔

---

[1] رویائے صادقہ، ص ۲۰۰۔

[2] صواعق محرقہ، ص ۲۲۱، طبع جدید۔

[3] طبری، ج ۳، ص ۱۱۹۹۔ الامامت والسیاست، ص ۱۹۔

[4] طبری، ج ۶، ص ۱۸۹۔

[5] طبری، ج ۳، ص ۱۹۸۔ الامامت والسیاست، ج ۱، ص ۲۰۔ العقد الفرید، ج ۳، ص ۱۷۶۔ مروج الذہب، ج ۲، ص ۱۵۹۔ الملل والنحل شہرستانی، ج ۱، ص ۲۵۔ ازالۃ الخفاء، ص ۲۲۶۔ کنز العمال، ج ۳، ص ۱۳۹۔ استیعاب، ج ۱، ص ۲۳۵ وغیرہ۔

شبلی نعمانی نے لکھا ہے: "علامہ طبری نے تاریخ کبیر میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہؑ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: میں گھر کو آگ لگا دوں گا۔۔۔۔۔اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں۔ (الفاروق، ص ا ۷) اللہ اکبر۔ جس رسول کا کلمہ پڑھیں، جس کی نبوت کی پانچ وقت اذان میں گواہی دیں، جس کی شفاعت پر جہنم سے بچنے کی امید رکھیں۔ اسی کی چہیتی بیٹی سیدہ نساء العالمینؑ کے دروازہ پر اسی دروازہ کو جلانے کے لیے آگ اور لکڑیاں لے جائیں؟ کیا آدمؑ سے لے کر اس وقت تک کسی نبی، کسی رسول، کسی وصی، کسی ولی یا اور کسی مذہبی پیشوا کی بیٹی کے ساتھ اس کے ماننے والوں نے یہ سلوک کیا ہے؟ نمرود نے ضرور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانا چاہا مگر وہ کافر تھا۔ آپ کی نبوت کا قائل نہ تھا۔ اب جو لوگ واقعۂ کربلا پر حیرت و استعجاب کرتے ہیں کہ یزید نے کیونکر قتل حسینؑ کا حکم دیا؟ کیا وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ نواسۂ رسولؐ ہیں؟ وہ یہ بتائیں کہ اول صاحب نے دروازۂ علیؑ و بتولؑ پر آگ اور لکڑیاں لے جانے کی اجازت کیونکر دی؟ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ انہی کے رسولؐ کے پارۂ جگر ہیں؟ جو شمر کے فعل پر تعجب کرتے ہیں کہ اس نے حسینؑ پر کیونکر تلوار اٹھائی۔ وہ ثانی کے فعل کو کیوں نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ کیوں کر دروازۂ سیدہؑ پر لکڑیاں لے گئے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ بضعۃ الرسول کا دروازہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر آج طلب بیعت کے لیے در دولت پر آگ اور لکڑیاں جمع کر کے گھر جلانے کی دھمکیاں نہ دی جاتیں۔ اور اس خانوادہ کی توہین و تذلیل کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو ۶۱ھ میں کربلا کے میدان میں شہادت حسینؑ کے بعد لوگ خیام حسینؑ سے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے بلند ہوتے نہ دیکھتے اور یہ نعرے لگتے ہوئے نہ سنتے ؎

لوٹو تبرکات علیؑ و بتولؑ کو

قتل حسینؑ کی دسویں اینٹ محرومی جناب سیدہؑ از میراث

شریعت اسلام کا مسلمہ اصول ہے کہ ہر باپ کی میراث اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ملتی ہے۔ قرآن نے انبیاء کا کوئی استثناء نہیں کیا۔ جب وفات رسولؐ کے بعد مسلمانوں نے خلافت علویہ کے ساتھ حق فاطمیہؑ پر بھی قبضہ کر لیا تو اسی مذکورہ بالا اصول کے ماتحت جناب سیدہؑ نے خلیفۂ وقت سے اپنی وراثت کا مطالبہ کیا مگر دربار خلافت سے یہ جواب ملا کہ رسول کا ارشاد ہے: ہم گروہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ (وقف) ہوتا ہے غرضیکہ اول صاحب نے بالکل انکار کر دیا اور رتی برابر کوئی چیز بھی جناب سیدہؑ کو نہ دی جس کی وجہ سے جناب سیدہ عالم سلام اللہ علیہا اول صاحب پر اس قدر غضب ناک ہوئیں کہ مرتے دم تک ان سے کلام نہ کیا۔[1] اور حضرت

---

[1] بخاری، ج ۲، ص ۶۰۹، طبع دہلی۔ مسلم، ج ۲، ص ۹۱۔

علی علیہ السلام کو وصیت کر گئیں کہ جن لوگوں نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے ان کو میرے جنازہ میں شریک نہ ہونے دینا۔ چنانچہ جناب امیرؑ نے ایسا ہی کیا۔[1]

عجیب لطیفہ یہ ہے کہ اول صاحب تو یہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ ہم انبیاء نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ کسی کو وارث کرتے ہیں مگر کتب سیر و تواریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنے والد ماجد کے وارث ہوئے تھے۔ چنانچہ فاضل حلبی نے لکھا ہے کہ جناب رسول خداؐ کے والد جناب عبداللہ نے اپنے بعد پانچ اونٹ اور کچھ دنبیاں چھوڑیں۔ اور جناب رسول خداؐ نے یہ چیزیں اپنے والد کی وراثت میں حاصل کیں۔[2] اور ابن قیم نے لکھا ہے کہ ماثور وہ پہلی تلوار ہے جو رسول اکرمؐ نے اپنے والد سے میراث میں پائی تھی۔[3] جناب رسول خداؐ تو اتنی چیزیں وراثت میں حاصل کریں۔ مگر خلیفۂ اول کا بیان یہ ہے کہ انبیاء وراثت میں کچھ نہیں پاتے!! اب اہل انصاف بتائیں کہ کس کو سچا اور کس کو جھوٹا مانا جائے؟

نوٹ :۔ مخفی نہ رہے کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا دعویٰ ہبۂ فدک اور اس کا منظور نہ ہونا بھی اسی مطالبۂ فدک کی ایک کڑی ہے کیونکہ آیت مبارکہ ﴿و آت ذا القربی حقه﴾ کے نزول کے وقت آنحضرتؐ نے فدک جناب سیدہؑ کو عطا فرما دیا تھا۔[4] اور مزید برآں ایک سند بھی لکھ دی تھی جسے جناب سیدہؑ نے دعویٰ کے وقت پیش بھی فرما دیا تھا۔[5] اور تحقیق یہ ہے کہ پہلے جناب سیدہؑ نے اسی ہبہ کا دعویٰ کیا تھا مگر جب دربار خلافت میں اس دعویٰ کی شنوائی نہ ہوئی تو پھر سیدہ عالم نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے دوسرا طریقہ استعمال کیا کہ اگر یہ حق مجھے بطور ہبہ کے نہیں دیتے تو پھر مجھے بطور وراثت پدر کے دو۔ مگر افسوس مسلمانوں نے بضعۃ الرسول کا یہ دعویٰ بھی تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور الٹا ان کی تکذیب بھی کی۔ یہی تو وجہ تھی کہ بی بی عالم رنج و الم میں گھل گھل کر یہ مرثیہ پڑھتے ہوئے دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئیں۔ ؎

صبت علیّ مصائب لو انها　　　صبت علی الایام صرن لیالیا[6]

---

1. مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۴۰۔ روضۃ الاحباب، ج ۱، ص ۴۳۳ طبع لکھنؤ۔ شرح نہج البلاغہ حدیدی، ج ۱، ص ۲۰۔
2. سیرت حلبیہ، ج ۱، ص ۵۶۔
3. زاد المعاد، ج ۱، ص ۴۳۔ مدارج، ج ۲، ص ۴۸۹۔
4. تفسیر در منثور، ج ۴، ص ۱۷۷۔ تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۱۲۵۔
5. معارج النبوۃ، رکن چہارم، ص ۲۲۱۔ روضۃ الصفا، ج ۲، ص ۱۵۸ طبع نولکشور۔
6. رواتح المصطفیٰ، ص ۳۰۔

برادران اسلامی کے نامور عالم مولوی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی نے انہی جانگداز حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے فرماتے ہیں: ''جو شخص سب سے زیادہ پیغمبرؐ صاحب کی وفات سے متاذی ہوا وہ فاطمہؑ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبرؐ صاحب تھے۔ اور باپ بھی کیسے باپ دین و دنیا کے بادشاہ۔ ایسے باپ کا سر سے اٹھ جانا۔ اس پر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم رہنا اور نمک بر جراحت ترکہ پدری باغ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ کا ہار جانا کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو زہر کھا کر مر جاتا مگر ان کے صبر و ضبط ان ہی کے ساتھ تھے۔ پھر بھی انہی رنجوں میں گھل گھل کر چھ مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جن سے انہیں رنج پہنچے تھے۔ نہ بولیں اور نہ بات کی۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے اپنے جنازہ پر آنے کی بھی مناہی کر دی۔ اور شب کے وقت مدفون ہوئیں۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ مانا کہ ان کا غصہ کسی قدر بے جا بھی ہوتا۔ تاہم ان کے باپؐ کے حقوق کیا چاہتے تھے؟ فاطمہؑ کے دل غمزدہ کو خوش کرنے کے لیے علیؑ کو اگر وہ اہل نہ بھی تھے برائے نام خلافت دے دی ہوتی اور آپ انتظام کیا ہوتا خیر خلافت کون دیئے دیتا تھا مگر باغ فدک کے دے دینے میں ایسی کون سی قباحت تھی۔ غایۃ ما فی الباب حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا صدقۃ کے خلاف ہوتو ہو۔ گناہ اگر ہوتا تو فاطمہؑ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھائیں۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبرؐ صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم اتفاقات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہیے تھا اس میں ضعف آ گیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابل برداشت واقعۂ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔''[1]

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی وفات حسرت آیات کے بعد اہل بیت نبویؐ کے لیے قافیۂ حیات تنگ سے تنگ تر ہو گیا تھا۔ صاحب براہین قاطعہ ترجمہ صواعق محرقہ نے لکھا ہے: ''امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہ در مدت حیات فاطمہ الزہراؑ بیعت نہ کردہ بود لیکن او را عز و جاہی بواسطہ حیات حضرت خیر النساء نزد مردماں بود۔ چوں حضرت فاطمہ وفات یافت حضرت علیؑ از روئے مردماں انکار نمود و عزلت اختیار کرد و کسے یاد آمد و شد نہ کرد۔''[2]

شہادت حسینؑ کی گیارہویں اینٹ بنی امیہ کی اسلامی عہدوں پر تقرری ہے

جب سے اسلام ظاہر ہوا۔ اس کے سب سے زیادہ سخت اور کھلم کھلے دشمن بنو امیہ رہے۔ ان کو اسلام سے بدو جہ دشمنی تھی ایک اس سبب سے کہ وہ بنو ہاشم کے خاندانی حریف تھے۔ وہ ان کی عظمت و سربلندی ہرگز گوارا نہ کر

---

[1] رویائے صادقہ ص ۱۹۹، ۲۰۰۔ [2] کذا فی النجاری، ج ۳ ص ۱۰۹، طبع دہلی۔

سکتے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ وہ اپنے آبائی مذہب کفر و شرک کی حفاظت اپنا حاصل زیست سمجھتے تھے۔ بہرحال فتح مکہ سے پہلے کفار نے جتنی جنگیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لڑیں وہ سب ابوسفیان کی سرداری یا اس کی شرکت سے لڑی گئیں۔ حتیٰ کہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد خوف تلوار سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر زمرۂ مسلمین میں داخل ہوگیا۔ مگر تمام مورخین نے ابوسفیان اور اس کے بیٹے معاویہ کو مولفۃ القلوب میں شمار کیا ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ اسی طرح اشارہ کرتے ہوئے امیر شام کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ﴿وانی لعلی المنهاج الذی ترکتموه طائعین و دخلتم فیه مکرهین...﴾ (ترجمہ) میں اس دین پر قائم ہوں جس میں تم داخل تو مجبوری کے تحت ہوئے تھے مگر اسے ترک بخوشی کیا ہے۔[1]

بہرحال ظاہری اسلام کے بعد اب خفیہ طور پر اسلام و بانیٔ اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے رہے البتہ ۱۱ھ کو جب رحلت رسولؐ کے بعد جب حضرت علی علیہ السلام ظاہری خلافت سے محروم کر دیے گئے تو اب ابوسفیان نے چاہا کہ حمایت علیؑ کا بہانہ کر کے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ ابوسفیان نے حضرت علیؑ سے کہا کہ قریش کے ذلیل ترین انسان کو خلافت سے کیا واسطہ؟ اگر کہو تو پیادوں اور سواروں سے میدان کو بھر دوں! حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ابوسفیان! تو مدت سے اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ مگر تیری دشمنی سے اسلام کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا۔ (اب بھی چاہتا ہے کہ اسلام میں فتنہ برپا کرے)۔[2] جناب نے یہ جواب باصواب دے کر ان کے غلط منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ دوسری طرف جب ابوبکر و عمر صاحب کو معلوم ہوا۔ وہ انکی مخالفت کر رہا ہے۔ تو انہوں نے اس کے بیٹے یزید کو حکومت شام کا پروانہ دے دیا۔ جس پر ابوسفیان ان کا مطیع و منقاد ہوگیا۔ اس طرح شہادت حسینؑ کی عمارت کی گیارہویں اینٹ رکھی گئی۔ اگر ابوسفیان کا بیٹا یزید شام کا گورنر نہ بنایا جاتا تو اس کے بعد اس کا بھائی معاویہ بھی وہاں کا گورنر نہ بنتا۔ نہ وہ حضرت امیرؑ سے جنگ کرتا۔ نہ اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ بناتا۔ اور نہ امام حسینؑ شہید ہوتے۔ اس طرح اہل سقیفہ نے خاندان رسول کی تباہی و بربادی کا مکمل سامان کر دیا۔ سقیفہ میں خود خلیفہ بن کر اہل بیتؑ پر امن و عافیت کا دروازہ بند کر دیا۔ اور بنی امیہ کو شام کی حکومت دے کر ان کے سانس لینے کا دوسرا دروازہ بھی بند کر دیا۔ اس طرح بنی امیہ کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل گیا۔ اور وقت آنے پر وہ کچھ کر دکھایا جس پر مسلمان قیامت تک آنسو بہاتے رہیں گے۔

شہادت حسینؑ کی بارہویں اینٹ امیر شام معاویہ ہے

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یزید بن ابوسفیان کو شام کا گورنر بنایا گیا۔ ۱۵ھ یا ۱۹ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

---

[1] نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۱۳، طبع مصر۔
[2] تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۰۲۔

اس کے انتقال کے بعد حضرت عمر نے اس کے بھائی معاویہ کو اس کی جگہ شام کا گورنر مقرر کیا۔ پھر معاویہ نے اپنی طویل گورنری اور پھر حنظبانہ خلافت کے دور میں جو مظالم و مصائب خاندان نبوت پر ڈھائے اور اپنے ناخلف بیٹے یزید کو سریر آرائے تخت خلافت کرنے کے لیے کیا کیا سازشیں کیں اور دین اسلام کا صحیح حلیہ مسخ کرنے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے۔ اس کی اجمالی کیفیت ہم سابقہ باب میں بیان کر چکے ہیں۔

شہادت حسینؑ کی تیرھویں اینٹ شوریٰ ہے

امام حسینؑ کے قتل کی جو عمارت ۹ھ سے تیار ہو رہی تھی کی تیرھویں اینٹ جناب ثانی کی قائم کردہ شوریٰ کمیٹی ہے اس وقت شوریٰ کی تفاصیل میں جانا اور یہ بتانا مقصود نہیں کہ جناب امیرؑ کو کس ڈرامائی انداز میں محروم خلافت کیا گیا۔ ایں همه راز است که معلوم عوام است ۔ البتہ اس کے متعلق لائق مؤرخ جسٹس امیر علی نے تاریخ اسلام میں جو ریمارک دیے ہیں۔ ان کا یہاں نقل کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "خلافت کو شوریٰ پر چھوڑنے میں خلیفۂ دوم سے ایسی غلطی سرزد ہوئی جس نے بنو امیہ کی سازشوں کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ بنو امیہ اب مدینہ میں نہایت زبردست ہو گئے تھے اور یہ خاندان رسول کے مدت سے رقیب تھے۔ اور بنی ہاشم سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جناب رسالت مآب ﷺ کا نہایت تندہی سے تعاقب کیا تھا اور فتح مکہ کے بعد محض ذاتی مفاد اور اغراض کی خاطر مسلمان ہو گئے تھے۔ اسلام کی ترقی کو وہ اپنے ذاتی اقبال کا ذریعہ بنانے کی ٹھانے ہوئے تھے۔ انہوں نے نہایت سہولت سے بدو سرداروں کو جوان کے بھائی بند تھے اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ اور اپنی چالبازیوں سے وہ حضرت علیؑ کو خلافت سے محروم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چند دن کی بحث و مباحثہ کے بعد بنو امیہ خاندان کے ممبر حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ ان کا انتخاب آخر میں اسلام کی تباہی کا باعث ہوا۔ حضرت عثمان کمزور اور ارادے کے کچے تھے۔ اور کسی بھی انتظام حکومت کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ بنو امیہ کے حسب منشاء وہ فوراً اپنے خاندان کے اثر میں آ گئے۔ وہ بالکل اپنے سیکریٹری مروان کے کہنے پر چلتے جو بنی امیہ میں سخت بدطینت تھا۔ حضرت عثمان نے حضرت عمر کے بہت سے گورنروں کو موقوف کر کے ان کی جگہ اپنے خاندان کے آدمی جو سخت نالائق اور ناقابل تھے، مقرر کیے۔"[1] اس کارروائی کے جو ناخوشگوار نتائج برآمد ہوئے اور جس طرح اس کی سزا امت مسلمہ کو بھگتنی پڑی وہ تاریخ اسلام پر سرسری نگاہ رکھنے والے حضرات پر مخفی نہیں ہے۔

شہادت حسینؑ کی چودھویں اینٹ خلافت ثالثہ

جیسا کہ سابقہ تنقیح سے ظاہر ہے خلافت ثالثہ بھی عمارت شہادت حسینؑ کی ایک اینٹ ہے۔ جس طرح وہ

---

[1] تاریخ اسلام، ص ۳۳۸، ۳۳۹ بالاختصار۔

خلیفہ منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنے دور خلافت میں بنی امیہ کی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جس طرح کنبہ پروری کا مظاہرہ کیا اور پھر جس طرح بعض احداث ظاہر کیے۔ اور مفاد دین وملت اور مقتضائے سیاست دنیوی کے خلاف بعض ناگفتہ بہ افعال واعمال کا ارتکاب کیا جو بالآخران کے قتل تک منجر ہوئے۔ یہ حقائق تاریخ اسلام کے مبتدی طالب علموں پر بھی مخفی نہیں ہیں۔ یہاں تو صرف اس قدر بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر آپ خلیفہ نہ بنائے جاتے تو پھر نظر بنظر شہادت حسینؑ بھی واقع نہ ہوتی کیونکہ نہ پھر آپ قتل ہوتے۔ نہ معاویہ جناب امیرؑ پر ان کے قتل کا الزام عائد کرتا۔ نہ وہ آنجنابؑ سے لڑتا۔ نہ اسے خود خلیفہ بننے کا بہانہ ملتا۔ اور نہ اپنے بعد یزید کو اپنا ولی عہد اور جانشین بنانے کا اس کے لیے موقع پیدا ہوتا۔ یہ سب امور طبعی ترتیب کے مطابق وقوع پذیر ہوئے جس سے حضرت عثمان کا دامن کسی طرح آزاد نہیں ہو سکتا۔

پندرہویں اینٹ: ایک ام المومنین کی مہربانیاں

خلافت اولیٰ وثانیہ کی تشکیل اور پھر دونوں صاحبوں کی روضہ رسولؐ میں تدفین میں ایک ام المومنین کا جو حصہ ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اسی طرح جنگ جمل میں انہوں نے اپنے پرانے بغض وکینہ کا حضرت امیرؑ سے وہ انتقام لیا کہ اس کے مثل کسی نے نہ لیا ہوگا اس طرح انہوں نے لوگوں کو خاندان نبوت سے بدظن اور دور کرنے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ اسی بغض وکینہ کی چنگاریاں مسلسل دھکتی رہیں تا جبکہ بالآخر شہادت حسینؑ کی صورت میں نمودار ہوئیں۔

سولہویں اور آخری اینٹ خلافت یزید ہے

مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب یہ دعویٰ محتاج تامل وتردد نہیں رہتا کہ یزید شہادت حسینؑ کی آخری اینٹ ہے۔ سب علل واسباب جمع ہو چکے تھے۔ اس نے جزء متمم کا کام کیا۔ اور بالآخر اسی اشقی الاولین والآخرین کے منحوس دور میں اسی کے حکم سے یہ سانحہ کبریٰ اور حادثہ عظمیٰ ظہور پذیر ہوا۔ جس پر مسلمان روز قیامت تک اشک غم بہاتے رہیں گے۔ تفصیل آئندہ اوراق میں ملاحظہ کیجئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دسواں باب

امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کی جنگ

بالفاظ دیگر امام حسنؑ کے تقیہ کرنے اور امام حسینؑ کے تقیہ نہ کرنے کے بعض رموز و اسرار

قدیم الایام سے کچھ کوتاہ اندیش لوگ یہ کہتے چلے آتے ہیں کہ جس طرح امام حسنؑ نے امیر شام سے مصالحت کر لی تھی اسی طرح اگر جناب امام حسینؑ بھی معاویہ کے بیٹے یزید سے صلح کر لیتے تو یہ خونی سانحہ کربلا رونما نہ ہوتا اور نہ طرفین کا یہ خون خرابہ ہوتا۔

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہم اس باب میں چند ناقابل تردید حقائق بیان کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح و آشکار ہو جائے گی کہ اصلی مقصد (تحفظ و بقاء اسلام) کے حصول کے لیے جس طرح امام حسنؑ کے دور میں صلح ضروری تھی۔ اسی طرح امام حسینؑ کے وقت میں جنگ ناگزیر تھی۔ امامینؑ کے طرز عمل کا یہ ظاہری اختلاف صرف وقتی تقاضوں کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ ورنہ تمام [illegible] کے طرز عمل میں حقیقی و معنوی طور پر کوئی اختلاف نہیں ہے سب کا مقصد ایک تھا اور وہ تھا احقاق حق و ابطال باطل۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حالات حاضرہ کا جو تقاضا ہوتا تھا امام وقت وہی طرز عمل اختیار کرتے تھے بظاہر جیسا اختلاف امام حسنؑ و امام حسینؑ کے طرز عمل میں نظر آتا ہے بعینہ ایسا ہی اختلاف خود صاحب شریعت مقدسہ کے اپنے عمل میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایک وقت میں ان کو مختلف انواع و اقسام کی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں مگر آپ ﴿لکم دینکم ولی دین﴾ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور اپنا فریضہ تبلیغ دین انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جنگ و جدال اور قتل و قتال کے بعد حدیبیہ کے مقام پر ﴿الصلح خیر﴾ پر عمل کرتے ہوئے کفار مکہ سے صلح کر لیتے ہیں اور وہ بھی بظاہر ایسے کمزور شرائط پر کہ بعض مشہور صحابہ کو آپ کی نبوت میں بھی شک پڑنے لگتا ہے۔[1] اور اس کے بعد ایک تیسرا دور ایسا بھی آتا ہے کہ مخالفین کی انتہائی بے راہ روی کے پیش نظر ﴿فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم﴾ کا متشددانہ حکم دیا جاتا ہے! تو اب اس ظاہری اختلاف کو دیکھ کر کوئی صحیح الدماغ انسان اور وہ بھی مسلمان یہ وہم و گمان بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کے طرز عمل میں فی الحقیقت کسی قسم کا تضاد و اختلاف پایا جاتا ہے؟ ماننا پڑتا ہے کہ حالات کے اختلاف سے فرائض

---

[1] درمنثور، ج ۶، ص ۷۷، عینی شرح بخاری، ج ۲، ص ۲۵۷ وغیرہ۔

کے تقاضے بھی مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اور در حقیقت انسان کامل وہی ہوتا ہے جو جذبات کے افراط و تفریط سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے موقع و محل کی مناسبت اور حالات کے تقاضوں کا کامل غور و تدبر کے ساتھ جائزہ لے کر ان کے مناسب حال اقدام کرے بنا بریں یہ کہنا بالکل صحیح اور درست ہے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید، نتیجہ خیز اور موثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے عمل میں لایا جائے تو وہ نتیجتاً مفید ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے مرتکب کو اکثر ہمیشہ کے لیے مورد الزام بنا دیتا ہے۔ واقعات کی رفتار یکساں حالت پر نہیں ہوتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کا طریقۂ علاج بھی اس اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر زخم رسیدہ کچے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو۔ پھاہے لگاؤ۔ مرہم بدلو۔ ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ۔ پھر اگر اچھا نہ ہو اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اسے کاٹ کر بھی پھینک دو۔ کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالتے۔ تو ضرور مورد الزام ہوتے اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے۔ حالانکہ یہ طرز عمل وہی ہے جو بعد میں اختیار کیے جانے پر ممدوح و مستحسن قرار پائے گا۔ دشوار گزار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور موثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری۔ جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو۔ اس وقت اس کا درجہ ہے وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک موثر ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آ جائے تو جلد بازی، غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آ جانا ضروری ہے۔[1]

باب ہفتم میں صلح حسنؑ کا جو تذکرہ کیا جا چکا ہے وہ اس محاربۂ کربلا کی تمہید تھی۔ اور یہ واقعہ گویا کہ اس کا نتیجہ اور اسی مبتداء کی خبر!

اس قدر تمہیدی بیان کے بعد ہم صلح حسنؑ اور اقدام حسینؑ کے چند نمایاں فروق بیان کرتے ہیں تاکہ حقیقت بالکل واضح و آشکار ہو جائے کہ دونوں شہزادوں کے طرز عمل میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف مظاہرے ہیں۔

صلح حسنؑ و اقدام حسینؑ کا پہلا فرق

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جانی قربانی اصلاح احوال کا آخری اور بالکل آخری حربہ ہے یعنی جب تک حالات بالکل ناقابل اصلاح نہ ہو جائیں اس وقت تک اس آخری طریقۂ کار کے اختیار کرنے کا کوئی عقلی جواز موجود نہیں ہے۔ ابتدائی حالات میں زبانی استدلال و احتجاج اور پھر مصالحت کو عمل میں لانا ضروری ہوتا ہے تاکہ اگر اس

[1] شہید انسانیت، ص ۲۱۵۔

سے بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح ہو جائے تو فھو المراد۔ ورنہ پھر آخری اور فیصلہ کن اقدام کیا جائے چنانچہ اس طبعی ترتیب کے عین مطابق شہزادۂ صلح و امن حضرت امام حسن علیہ السلام نے اصلاح احوال کا یہی ابتدائی طریقۂ کار استعمال کیا جس کا اختیار کرنا عقلاً و شرعاً ضروری تھا اور پھر ظاہری تخت و تاج سے علیحدہ ہو کر پورے دس برس تک اس طرز عمل کے نتائج کا انتظار کیا اور اس اثناء میں سرکار سید الشہداءؑ بھی حالات حاضرہ کا بنظر غائر جائزہ لیتے رہے لیکن افسوس کہ حالات بجائے اصلاح پذیر ہونے کے بد سے بدتر اور خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ تمام شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی کی گئی۔ خلاف اسلام افعال و اعمال کے ارتکاب پر اصرار کیا گیا۔ مؤمن کے حقوق پامال کر دیے گئے۔ بنا بریں اب اصلاح احوال کے لیے آخری طریقہ کار (جانی قربانی) کا وقت آ چکا تھا۔ لہٰذا اب سرکار سید الشہداءؑ کے متعلق تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ پھر مصالحت کر کے حالات کے سنورنے و سدھرنے کا انتظار کریں اور پھر یہ مصالحت بھی کس سے؟ یزید بن معاویہ سے یا للعجب۔

دوسرا فرق

تاریخ اسلام اس بات پر گواہ ہے کہ معاویہ نے حضرت امام حسنؑ سے بیعت کا کبھی مطالبہ نہیں کیا تھا[1] بلکہ آدمی بھیج بھیج کر بڑی لجاجت و خوشامد سے صرف مصالحت کی بار بار درخواست کرتا رہا تھا جسے رحمۃ للعالمینؐ کے نواسے نے مسلمانوں کی حالت زار پر رحم و کرم کرتے ہوئے منظور کر لیا۔ چنانچہ خود امام حسنؑ امیر شام کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

﴿ولو آثرت ان اقاتل احداً من اھل القبلة لبدات بقتالک فانی ترکتک لاصلاح الامة و حقن دمائھا﴾ اے معاویہ! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اگر اہل قبلہ میں سے کسی کے ساتھ میں جنگ کرتا تو پھر سب سے پہلے تجھ ہی سے کرتا لیکن میں نے تو امت جد کی اصلاح و فلاح اور ان کے خون کی حفاظت کی خاطر تجھے چھوڑ دیا ہے۔[2]

اس کے برخلاف یزید نے امام حسینؑ کے سامنے کبھی صلح کا نام تک نہیں لیا۔ بلکہ دولت اقتدار کے نشہ سے سرشار ہو کر یہ چاہا کہ مسند رسولؐ کے حقیقی وارث و جانشین سے بیعت لے۔ اور یہ نمرود وقت فخر خلیلؑ کی گردن کو اپنے سامنے جھکائے۔ ظاہری مادی ساز و سامان کی کثرت اور غیر معمولی فوجی طاقت و قوت کے بل بوتے پر اپنے اس خواب کی تعبیر دیکھنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت اسد اللہ کے لخت جگر نے اپنے عمل سے دنیا کو دکھا دیا کہ حسینؑ کی یہ گردن حفاظت حق کے لیے کٹ تو سکتی ہے مگر باطل کے سامنے جھک نہیں سکتی۔ لہٰذا حالات کے اختلاف کے لحاظ سے ان

۱۔ ملاحظہ ہو: تاریخ ابو الفداء، ج ۱، ص ۱۸۲۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۰۲۔ طبری، ج ۶، ص ۹۲۔ بیعت کا کہیں نام تک مذکور نہیں ہے۔

۲۔ تاریخ کامل، ج ۳، ص ۲۰۵۔ الامامۃ والسیاسۃ، ص ۱۸۳۔

ہو گیا ہے۔"[1]

اسی طرح مولانا موصوف ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اس بات کا گواہ ہے کہ ہمارے امامؑ اور شہزادے نے اپنی خوشی کے ساتھ یہ خلافت معاویہ کو نہیں دی بلکہ مجبوری سے آپؑ نے دیکھا کہ میرے ساتھی لوگ در پردہ معاویہ سے سازش رکھتے ہیں اور معاویہ جنگ پر تلا ہوا ہے۔ آپؑ معاویہ کو ظالم و غاصب جانتے تھے۔ اور ہرگز خلافت کا مستحق نہیں جانتے تھے۔"[2]

بہر حال اس بیان حقیقت ترجمان سے واضح و عیاں ہے کہ اس مصالحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام حسنؑ معاویہ کے اعمال کی صحت پر مہر توثیق ثبت کر رہے ہیں بلکہ صلح کے باوجود بھی حسن حسنؑ ہیں اور معاویہ معاویہ! لیکن یزید امام حسینؑ سے اپنی بیعت کا مطالبہ کر رہا تھا اور بیعت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس شخص کی بیعت کی جا رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے اعمال و افعال کی صحت و صداقت پر بھی مہر تصدیق ثبت کی جا رہی ہے۔ طلب بیعت سے یزید کا مقصد وہی تھا جو مکہ معظمہ میں ابوسفیان کا رسول خدا ﷺ سے مطالبہ تھا کہ اسلام کا نام نہ لو۔ کفر و شرک کو ضلالت و گمراہی قرار نہ دو۔ خدا کی وحدانیت کو چھوڑ کر صنم پرستی اختیار کرو۔ غرضیکہ تم بھی ہماری روش و رفتار اختیار کرو۔ (اور ابو سفیان کا بیٹا بھی اسلام کے پردہ میں اسی طریق کار پر کاربند رہا) اب یزید کے حضرت امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ چونکہ بموجب ؎

آنچہ پدر نتواند پسر تمام کند

اپنے آباء واجداد کے کافرانہ نظریات اور ان کے کفریات کی نشر و اشاعت پر تلا ہوا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ جن ننگ اسلام بلکہ ننگ انسانیت حرکات ناشائستہ کا ارتکاب کر رہا تھا اس پر صحیح وارث اسلام جناب امام حسین علیہ السلام سے مہر تصدیق ثبت کرائے اور اس طرح عوام الناس کی آنکھوں میں دھول ڈالے کہ اگر اس کے نظریات اور حرکات شرعاً صحیح نہ ہوتے تو امام حسینؑ اس کی بیعت کیونکر کرتے؟ (کفر یزید کی بحث آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں) امام عالی مقام اپنے منصب و مقام اور وظیفہ و کام سے کماحقہٗ واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس شراب خوار، زناکار، تارک صوم و صلوٰۃ، خدا و رسولؐ سے استہزاء کرنے والے اور احکام شریعت کو مٹانے والے نابکار کی بیعت کرنے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یزید کے رندانہ حرکات اور ملحدانہ خیالات شرعاً درست ہیں۔ اور اس کے اعمال و احکام صحیح اور واجب العمل ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلام وہی ہے جو یزید پیش کر رہا ہے۔ یہ مطلب اس وقت اور بھی زیادہ واضح

---

[1] انوار النعمانیہ، پارہ ۱۵، ص ۲۷ طبع بنگلور۔ [2] انوار اللغۃ، پارہ ۱۶، ص ۹۔

ہو جاتا ہے جب یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ پہلے زمانہ میں بیعت اس شرط پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سنت پر عمل ہوگا مگر یزیدی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ بیعت کرنے والے کو اقرار کرنا پڑتا تھا کہ میں خلیفہ کی ملکیت ہوں۔ وہ میرے اور میرے مال و اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ اب ارباب انصاف فرمائیں کہ ان حالات میں اگر حضرت امام حسین علیہ السلام یزید کی بیعت کر لیتے (حالانکہ کسی وقت بھی امام برحق " کے لیے کسی اور کی بیعت جائز نہیں۔ خواہ وہ عالم و عادل ہی کیوں نہ ہو) تو پھر اسلام رجعت قہقری کر کے سابقہ حالت کفر و بے دینی پر آ جاتا، کفر کا دور دورہ ہوتا، دین اسلام نیست و نابود ہو جاتا۔ حسینؑ کے جد نامدار، پدر بزرگوار اور برادر عالی وقار کی کوششوں پر پانی پھر جاتا۔ اور ان کی تمام محنتیں اور زحمتیں ضائع و برباد ہو جاتیں۔ کیا حسینؑ یہ گوارا کر سکتے تھے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! چنانچہ امام مظلومؑ نے ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھائیں۔ اپنے اعزہ و اقارب، اصحاب و احباب کا قتل گوارا فرمایا، مخدرات عصمت و طہارت کی اسیری منظور کی مگر اسلام کی ابدی تباہی و بربادی قبول نہ کی بلکہ پورے استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ انکار بیعت کر کے اعزا و انصار، مال و جان کی قربانی دے کر اور ناقابل تحمل مصائب و شدائد برداشت کر کے اسلام کو ایک زندۂ جاوید حقیقت بنا دیا اور مسلمانانِ عالم کے سامنے ایک نمونہ عمل پیش کر دیا کہ حق و حقیقت کی حمایت اور دین اسلام کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا پڑ جائے تو یہ کہہ کر کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سب کچھ قربان کر دینا مگر حق و صداقت پر آنچ نہ آنے دینا، سچ ہے ؎

سر داد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

چوتھا فرق

تقیہ ضرور شریعت اسلامیہ میں جائز ہے جیسا کہ آیت مبارکہ ﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾[1] (پ ۵، ع ۱۳) اور ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ م بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ م بِالْاِيْمَانِ﴾[2] (پ ۱۴، ع ۲۰) وغیرہ آیات قرآنیہ سے مستفاد ہوتا ہے مگر ارباب دانش و بینش جانتے ہیں کہ تقیہ کے جواز کے چند شرائط ہیں۔ منجملہ ان کے ایک اہم شرط یہ ہے کہ تقیہ کرنے سے جان و مال اور عزت و ناموس بچ جائے اور دین حق کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے۔ لیکن اگر تقیہ کرنے سے دین حق کو نقصان پہنچتا ہو تو اس صورت میں اس کا مستحسن ہونا تو بجائے خود جواز ہی ثابت نہیں ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ انبیاء و مرسلین اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے نصب و تقرر کی غرض و غایت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ دین و شریعت کی حفاظت و حراست کریں۔ اور کفر و شرک اور باطل کا قلع قمع کریں۔ بنا بریں جبکہ یزید کا فسق و فجور بلکہ اس کا

---

[1] تفسیر در منثور، ج ۲، ص ۱۶۔ [2] تاریخ کامل، جلد ۲، ص ۴۴ وغیرہ کتب تفسیر و تاریخ ملاحظہ ہوں۔

کفر صریح واضح و آشکار ہو چکا تھا جو بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح جائز سمجھتا تھا جو شراب کو پانی کی طرح پیتا اور نماز کا نام نہ لیتا تھا۔[1] جو منبر رسولؐ پر بیٹھ کر علانیہ یہ کفریہ اشعار پڑھتا تھا ؎

لعبت بنو ھاشم بالملک   فلا خبر جاء ولا وحی نزل[2]

دریں حالات اگر سید الشہداء علیہ السلام تقیہ فرماتے تو ان کی اور ان کے اعزا و انصار کی جان تو ضرور بچ جاتی مگر دین اسلام مٹ جاتا۔ کفر و شرک کی نشر و اشاعت ہوتی لوگ صراط مستقیم سے بھٹک جاتے۔ حقائق ایمان کی جگہ رسوم جاہلیت لے لیتیں۔ اور اس طرح حسینؑ کے مقدس آباء و اجداد کی مساعی جمیلہ پر پانی پھر جاتا ہے ایسے حالات میں حسینؑ ایسے حق باز و حق کوش اور جری و بہادر پاکباز انسان کے لیے ممکن تھا کہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے اسلام کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیتے؟ لا واللّٰہ۔ بلکہ ایسے حالات میں تو اہل سنت کے اصول کے مطابق بھی حسینؑ پر اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جہاد واجب تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے: ﴿اذا کفر الخلیفۃ بانکار ضروری من ضروریات الدین حل قتالہ بل وجب..... فصار قتالہ من الجہاد فی سبیل اللہ..... الخ﴾ جب کوئی خلیفہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہو جائے تو اس وقت اس سے جنگ کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔۔۔ اور اس سے جنگ کرنا جہاد فی سبیل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔[3]

ان حالات میں اگر امام حسینؑ تقیہ کر کے گھر میں بیٹھے رہتے تو پھر اسلام کو پناہ کون دیتا؟ اسلام کی جڑ کاٹی جا رہی تھی۔ اس کی روک تھام کون کرتا؟ تین پشتوں کا دشمن اسلام تو اس کے قلع قمع کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کو اس کے ناپاک عزائم میں ناکام کون بناتا؟ جب اسلام کو مٹایا جا رہا تھا تو اس کا علم کون بلند کرتا؟ اس لیے حسینؑ آگے بڑھے۔ اور وہی کچھ کیا جو شرعاً ان کا فرض منصبی تھا یعنی زبان حال سے یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ان کان دین محمد لم یستقم   الا بقتلی فیا سیوف خذینی

جان و مال اور اہل و عیال کو راہ حق میں نثار کر کے اسلام کو ابداً آباد تک کے لیے زندہ و پائندہ حقیقت بنا دیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

لیکن امام حسن علیہ السلام کے وقت یہ صورت حال نہ تھی چونکہ معاویہ اگرچہ دینی اعتبار سے جتنا بھی گیا گزرا ہوا

---

1. تاریخ الخلفاء سیوطی، ص ۲۰۹۔
2. تذکرہ خواص الامۃ، ص ۲۶۱ وغیرہ۔
3. حجۃ اللہ البالغہ، ص ۲۳۶۔

تھا مگر پھر بھی اس نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا ۔ نے اپنے بیٹے کی طرح اسلام کا جوا بالکل اتار کر دور نہیں پھینک دیا تھا۔

پانچواں فرق

خداوند عالم کا ارشاد ہے: ﴿قَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ﴾ (پ ۲۶، ع ۱۳، س حجرات) باغی گروہ سے اس وقت تک جہاد جاری رکھو جب تک کہ وہ اللہ کے "امر" کی طرف پلٹ نہ آئے "امر اللہ" کی تفسیر دو چیزوں سے کی گئی ہے۔ اول امام حق کی اطاعت قبول کر لینا۔ دوسرے صلح کرنے پر آمادگی ظاہر کرنا۔ چنانچہ علامہ رازی نے بذیل آیت بالا یہی دوسرے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿ای الی الصلح فانه مامور به بدل علیه قوله تعالی فاصلحوا ذات بینکم﴾[1] یعنی امر اللہ کی طرف پلٹنے سے مراد صلح پر آمادہ ہونا ہے کیونکہ صلح کا خدا نے حکم دیا ہے جس پر یہی ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے کہ اپنے جھگڑوں کی اصلاح کرو۔ بنا بریں جب معاویہ نے صلح کی پیشکش کی تو شہزادۂ امن و سلام کے لیے صلح شرعاً جائز تھی۔ خصوصاً جبکہ یہ بھی ملحوظ رکھا جائے کہ حالات ایسے ناخوشگوار ہو چکے تھے کہ آپ کے ساتھی بُری طرح داخلی افتراق و انتشار کا شکار ہو چکے تھے اور آپ کے صحیح غمخوار آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے مگر حضرت امام حسین علیہ السلام کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہاں امیر شام کا ناخلف بیٹا نشۂ دولت و اقتدار سے سرشار ہو کر امام عالی وقار سے بیعت لینے پر اصرار کر رہا تھا۔ اور امام علیہ السلام کسی قیمت پر بھی اس کی بیعت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس میں دین اسلام کی ہلاکت و بربادی تھی۔ اس لیے سوائے اقدام جہاد کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت ناقابل تردید حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ تقاضائے وقت کے لحاظ سے امام حسن علیہ السلام کی صلح ایسی تھی کہ اگر اس وقت امام حسین علیہ السلام ذمہ دار ہوتے تو وہ بھی صلح ہی کرتے۔ اور امام حسین علیہ السلام کا جہاد بھی اپنے وقت کے اعتبار سے ایسا صحیح اقدام تھا کہ اگر ان کی جگہ امام حسنؑ ہوتے تو وہ بھی اسی مسلک کو اختیار فرماتے۔

چھٹا فرق

شیعی نقطۂ نگاہ سے تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہے کہ ہر امام اپنے دور میں حکم خداوندی کے مطابق عمل درآمد کرتا ہے اور اس کا ہر قول و فعل مشیت ایزدی کے تابع ہوتا ہے۔ جسے حکم صلح ہو وہ صلح کر کے وقت گزار لیتا ہے اور جسے حکم جہاد ہو وہ اس پر عمل کر کے اپنا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ﴿ان الائمة علیهم السلام لم یفعلوا شیئا و لا یفعلون الا

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۵۷۳، کذا فی منہاج السنۃ، ج ۲، ص ۲۱۲۔

◆ گیارھواں باب ◆

آیا امام حسین علیہ السلام کا یہ اقدام باغیانہ تھا؟ (معاذ اللہ)

اور

یزید کے حقیقی خدوخال، تاریخ کی روشنی میں

اگرچہ جمہور مسلمین یزید عنید کو فاسق و فاجر بلکہ ملحد و مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں مگر ہمیشہ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے بھی رہے ہیں اور اب بھی (خصوصاً ہمارے ملک میں) موجود ہیں۔ جو یزید کی حمایت کرکے اسے صرف خلیفۂ رسولؐ ہی نہیں بلکہ اسے خلیفہ راشد ثابت کرنا اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ (خدا ان کا حشر و نشر یزید کے ساتھ کرے) اسی گروہ کا سرخیل ابن تیمیہ حرانی ہے جو کہتا ہے: ﴿لا یجوز لعن یزید و لا تکفیرہ فانہ من جملۃ المؤمنین﴾۔ یزید پر لعنت کرنا اور اس کی تکفیر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ مومنین میں سے ایک مومن ہے۔[1]

اور اسی بدبخت گروہ کا دوسرا سرگرم رکن ابن العربی مالکی ہے جو حمایت یزید میں یہاں تک کا فرانہ فتویٰ دے گیا ﴿لم یقتل یزید الحسین الا بسیف جدہٖ﴾ یزید نے حسینؑ کو قتل نہیں کیا مگر انہی کے جد[2] کی تلوار کے ساتھ۔ اس گروہ کا ایک ترجمان ملا علی قاری بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے: ﴿ان الامر بقتل الحسین بل قتلہ لیس موجباً للعنۃ علی مقتضی مذھب اھل السنۃ﴾ امام حسینؑ کے قتل کا حکم دینا بلکہ ان کو قتل کرنا بھی اہل سنت کے مذہب کے مطابق کفر نہیں ہے۔[3]

نیز اسی فرقۂ ضالہ و مضلہ کے ایک مشہور فرد ابن حجر مکی نے حافظ ابن صلاح کے حوالے سے لکھا ہے[4]:

﴿لکونہ امر بقتل الحسین لم یصح عندنا انہ امر بقتلہ رضی اللّٰہ عنہ..... و اما سبّ یزید و لعنہ فلیس شان المؤمنین و ان صح انہ قتلہ او امر بقتلہ﴾ یہ بات ہمارے نزدیک ثابت نہیں ہے کہ یزید نے قتل حسینؑ کا حکم دیا تھا اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ اس نے امام کو قتل کیا یا ان کے قتل کا حکم دیا تاہم اس پر لعنت کرنا اہل

---

[1] منہاج السنہ، ج ۲ کذا فی الصواعق ۲۲۳۔

[2] منح مکیہ شرح قصیدہ ہمزیہ ابن حجر مکی۔ بحوالہ مجاہد اعظم، ج ۱

[3] شرح بدء الامالی۔

[4] صواعق محرقہ، ص ۲۲۳، طبع جدید۔

ایمان کی شان نہیں ہے۔

جناب غزالی بھی اسی جماعت کی صف میں نظر آتے ہیں جنہوں نے احیاء العلوم[1] میں بڑی شد و مد سے لعنت یزید کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہمارے ملک میں ''خلافت معاویہ و یزید'' اور ''خلافت رشید ابن رشید'' وغیرہ کتب و رسائل کے مؤلفین اپنے پیشروں سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ بہر حال کہاں تک یزید کے پرستاروں کے نام گنوائے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

یک حسینؑ نیست کو گردد شہید ورنہ بسیار اند در دنیا یزید

جیسا کہ آپ نے سطور بالا میں ملاحظہ کر لیا ہے اس گروہ میں کچھ ایسے بھی دین و ایمان کے دشمن یزید کے حامی موجود ہیں جنہوں نے محض یزید کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام پر بغاوت کا الزام عائد کیا ہے۔ چونکہ دشمنان حسینؑ و ہوا خواہان یزید ہمیشہ یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ ان لوگوں کے اس ایراد کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تاکہ معلوم ہو کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے اور اس میں کتنا وزن ہے؟ اسی لیے ہم نے یہ باب منعقد کیا ہے۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے پہلے بغاوت کی شرعی تعریف معلوم ہونی چاہیے۔ مخفی نہ رہے کہ اصطلاح شرع اقدس میں بغاوت کا مفہوم ہے جناب رسول اسلام ﷺ کے صحیح وارث و جانشین کے خلاف علم مخالفت بلند کرنا۔[2] جیسا کہ جمل و صفین والوں نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ بنابریں کسی شخص پر بغاوت کا الزام عائد کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جس کے خلاف اس نے کوئی اقدام کیا ہے۔ آیا اس کی خلافت و امامت صحیح طریقہ پر ثابت بھی ہے یا نہیں؟ اس اصول کے تحت اگر خلافت یزید کا جائزہ لیا جائے تو وہ (شیعی نقطۂ نظر سے قطع نظر کرتے ہوئے) اہل سنت کے قواعد کے مطابق بھی کسی طرح درست ثابت نہیں ہوتی اور اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

خلافت یزید کے ناجائز ہونے کی پہلی وجہ

یہ ہے کہ باب ہفتم میں شرائط صلح امام حسنؑ و معاویہ کے ضمن میں مکمل وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد اپنا ولی عہد اور خلیفہ مقرر کرنے کا کوئی حق[3] نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاویہ کا یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا اصول شریعت اور آئین اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ معاویہ کو اس تقرر کا

---

[1] احیاء العلوم، ج ۳، ص ۱۲۱، ۱۲۲، طبع مصر۔

[2] الهدایہ، ج ۱، ص ۵۸۲، مع حاشیہ۔

[3] صواعق محرقہ، ص ۱۳۶۔ الامامۃ والسیاسۃ، ص ۱۵۸، طبری، ج ۴، ص ۹۲ وغیرہ۔

قطعاً کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ ﴿ولو نظروا فی سیر العلماء لعلموا کیف عقدت له البیعة و الزم الناس بها و لقد فعل فی ذلک کل قبیح﴾ اگر یہ لوگ کتب سیر وتواریخ پر نگاہ کرتے تو ان کو یہ حقیقت معلوم ہو جاتی کہ بیعت یزید کیونکر منعقد ہوئی اور کس طرح لوگوں کو اس بیعت پر مجبور کیا گیا اور کس طرح اس سلسلہ میں تمام قبیح وشنیع کارروائیاں کی گئیں؟[1] ان قبیح کارروائیوں کا ایک شمہ ہم آٹھویں باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ ناظرین کرام اس کی طرف رجوع کریں ؂

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

مولوی شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی نے بھی اسی طرح لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ خلافت غیر آئینی تھی اور کسی طرح بھی درست نہ تھی۔ چنانچہ وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: "تمام کتب سیر وتواریخ وغیرہ سے ثابت ہے اور تمام علماء محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا امام حسن ؓ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت صرف ان کی حیات تک کے لیے سپرد کی تھی۔ اور اس شرط پر ان کو خلافت سونپ دی تھی کہ تمہارے بعد پھر خلافت ہماری ہی طرف لوٹے گی۔ تم کو ہرگز یہ حق نہ ہوگا کہ کسی کو اپنا ولی عہد بناؤ یا اس کو میراث سمجھو اور کسریٰ اور قیصر کی سلطنت بناؤ۔ علامہ ابن عبدالبر اندلسی استیعاب جلد اول ص ۱۴۴ میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿ولا خلاف بین العلماء ان الحسن ؓ انما سلم الخلافة لمعاویة حیاته لا غیر ثم یکون له من بعده و علی ذلک انعقد بینهما ما انعقد فی ذلک﴾ بالاتفاق تمام علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ امام حسنؓ نے امیر معاویہ کو صرف ان کی حیات تک کے لیے خلافت سپرد کی تھی۔ نہ مابعد کے لیے بھی۔ اور اسی پر ان دونوں کے مابین صلح ہوئی تھی۔ اور اصابہ فی تمیز الصحابہ، ص ۶۷۷ میں ہے: ﴿..... علی ان یجعل العهد له من بعده﴾ یعنی "اس بات پر کہ خلافت ان کے بعد پھر انہی امام حسنؓ کے سپرد ہو۔۔۔۔۔ (کذا فی الامامة والسیاسة، ص ۱۵۸)۔۔۔۔۔ لیکن افسوس معاویہ نے خلاف معاہدہ یزید کو خلیفہ وولی عہد مقرر کر دیا۔"[2] لہٰذا جب یزید کی خلافت ہی صحیح نہیں تو اس کے خلاف کوئی اقدام کیونکر بغاوت ہو سکتا ہے؟

دوسری وجہ

ظاہر ہے کہ یزید کی خلافت خلافتِ معاویہ کی فرع ہے لہٰذا اگر معاویہ کی خلافت شرعاً درست ثابت ہوگئی تو پھر تو یزید کی خلافت کے صحیح ہونے کا کچھ احتمال ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر سرے سے خود معاویہ کی خلافت وامارت ہی غیر

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۸، ص ۱۲۹۔

[2] رسالہ شہادت حسینؓ، ص ۳۵۔

آئینی اور ان کی دھینگا مشتی کا نتیجہ ثابت ہوئی تو پھر خلافت یزید کی صحت بالکل خارج از بحث سمجھی جائے گی۔ اس لیے خلافت معاویہ کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے سو مخفی نہ رہے کہ اہل سنت کے علماء محققین کو تحقیقات بسیار کے بعد اس بات کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ معاویہ کی خلافت کو کسی طرح بھی شرعاً درست نہیں قرار دیا جا سکتا چنانچہ اہل سنت کے علامہ وامام مولوی وحید الزمان لکھتے ہیں: ''یہ بعض مولویوں کی صریح غلطی ہے کہ جو آیتیں یا حدیثیں مہاجرین وانصار کی فضیلت میں وارد ہیں ان سے ابوسفیان اور معاویہ کی فضیلت ثابت کرتے ہیں۔ معاویہ اور ابوسفیان نہ سابقین اولین میں سے ہیں اور نہ متبعین باحسان میں سے بلکہ ساعین الی البغی و العدوان (بغاوت اور سرکشی کرنے والوں) میں سے ہیں۔ امام نسائی نے فرمایا: معاویہ کی فضیلت میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہوئی۔ سوائے ایک حدیث کے کہ اللہ اس کا پیٹ نہ بھرے۔ اور یہ دعا آپ کی معاویہ کے حق میں قبول ہوئی۔ ان کے سامنے ستر طرح کے کھانے رکھے جاتے۔ وہ کھاتے کھاتے تھک جاتے، پر ان کا پیٹ نہ بھرتا ۔۔۔۔۔ جب معاویہ نے منبر پر بیان کیا کہ خلافت کا مستحق کوئی ہم سے زیادہ نہیں ہے تو عبد اللہ بن عمر نے اپنے جی میں کہا: تجھ سے زیادہ خلافت کا مستحق وہ ہے جو تجھ سے اور تیرے باپ سے لڑتا رہا۔ یعنی جس زمانہ میں تو اور تیرا باپ دونوں کافر تھے تو دوسرے لوگ جو تجھ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے اور تجھ پر جہاد کرتے تھے وہ تجھ سے زیادہ خلافت کے مستحق ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ کی حکومت دھینگا مشتی سے تھی۔ نہ صلاح و مشورہ اور استحقاق سے نہ تو اس کو خلافت نہیں کہہ سکتے۔ جیسے اوپر کئی بار بیان ہو چکا ہے۔''[1]

باب دہم میں اسی بزرگ کا صلح حسنؑ کے سلسلہ میں یہ کلام نقل کیا جا چکا ہے کہ جناب امام حسنؑ کی صلح معاویہ سے اسی طرح تھی جس طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی صلح کفار مکہ سے جو آنحضرت کی طرف سے صحیح اور کفار کی طرف سے جبری اور ظلمی تھی۔ یہی کیفیت یہاں بھی تھی۔

پس اس بیان حقیقت ترجمان سے یہ حقیقت بالکل واضح و عیاں ہوگئی کہ معاویہ بن ابوسفیان کی خلافت غلط اور غیر آئینی تھی اس کے بعد یزید کی خلافت کا بطلان محتاج دلیل و برہان نہیں رہتا۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

مولانائے موصوف کا یہ بیان حرز جان بنانے کے لائق ہے کہ ''یزید کا کوئی حق نہ تھا کہ اس کو مسلمانوں پر حکومت ملے۔ بھلا جب فرشتے موجود ہوں تو کوئی شیطان کی حکومت منظور کرے گا؟ مگر معلوم نہیں کہ اہل شام کس قبیل کے مسلمان تھے۔ امام حسین علیہ السلام کی کفش برداری کی بھی یزید لیاقت نہیں رکھتا تھا ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک کجا عیسیٰؑ کجا دجال ناپاک

---

[1] انوار اللغۃ، پ ۱۲، ص ۳۷۔

مگر امام صاحب کے موجود ہوتے ہوئے بھلے مانسوں نے یزید سے بیعت کر لی اور اس پر بھی اکتفا نہ کی۔
امام صاحب کی جان کے درپے ہو گئے آخر کس شقاوت سے آپ کو بچوں اور عزیزوں سمیت قتل کر دیا ؎

اگر اسلام همین است که این ها دارند وائے گر پس امروز بود فردائے[1]

اہل سنت کی اس مسلم الثبوت حدیث کہ ﴿الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم یکون ملک عضوض﴾
میرے بعد خلافت صرف تیس برس تک ہوگی۔ اس کے بعد کاٹنے والی بادشاہی ہوگی۔ (انوار اللغۃ، پ ۱۸، ص ۱۳۴)
سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ خلیفہ نہیں بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ ایک بادشاہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس بنا پر تیس
سال کا عرصہ امام حسنؑ کی شش ماہا ظاہری خلافت پر ختم ہو جاتا ہے۔ پس جب یزید کی خلافت ہی شرعاً ثابت نہیں تو اس
کے خلاف اقدام کرنے والا کیونکر باغی قرار دیا جا سکتا ہے۔[2]

تیسری وجہ

ہر چیز کا ایک میزان و معیار ہوتا ہے۔ آخر خلیفۂ رسولؐ ہونے کا بھی تو کوئی معیار ہونا چاہئے۔ ایسا تو نہیں ہو
سکتا کہ جو شتر بے مہار دعوائے خلافت کر دے۔ اور لاٹھی کے زور سے تخت خلافت پر متمکن ہو جائے۔ وہ خلیفۂ رسولؐ
بن جائے؟ اگر چہ شرابخوار، زناکار، تارک صوم و صلوٰۃ غرضیکہ پکا فاسق و فاجر بلکہ عقیدۃً کافر اور اسلام کا غدار بھی ہو؟
کیا کوئی مسلمان بقید ہوش و حواس اس دھاندلی کی اجازت دے سکتا ہے؟ حاشا و کلا۔ بنا بریں یزید کے آراء و افکار
اور اس کی سیرت و کردار کا جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ اس کا استحقاق یا عدم استحقاق خلافت معلوم ہو جائے۔ جہاں تک
ہم نے اسلامی کتب تاریخ و حدیث کا مطالعہ کیا ہے ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یزید اپنی سیرت و کردار اور آراء و افکار
کے اعتبار سے صرف فاسق و فاجر ہی نہیں بلکہ بالکل کافر ہے ہم ان حقائق کا ایک شمہ ذیل میں درج کر کے باانصاف
ناظرین کرام کو دعوت فکر دیتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ تعصب و عناد کی عینک اتار کر حقائق کا مطالعہ کرنے والے
حضرات اس نتیجہ میں ہمارے ساتھ اتفاق رائے کریں گے۔

یزید کے بعض کافرانہ عقائد و نظریات

یزید کہتا ہے ؎

لیت اشیاخی ببدر شهدوا جزع الخزرج من وقع الاسل

---

[1] انوار اللغۃ، پ ۱۲، ص ۵۴۔

[2] معاویہ بن ابی سفیان کی خلافت کے ابطال اور اس کی ملوکیت کے اثبات کے سلسلہ میں کتاب ''خلافت سے ملوکیت تک'' کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

قد قتلنا القرم من ساداتکم — وعدلنا میل بدر فاعتدل

فاهلوا و استهلوا فرحاً — ثم قالوا یا یزید لا تشل

لست من خندف ان لم انتقم — من بنی احمدَ ما کان فعل

لعبت بنو هاشم بالملک فلا — خبر جاء ولا وحی نزل

یزید ان اشعار کفر شعار میں دین اسلام اور اس کے حقائق کا انکار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نجس و ناپاک کشتگان بدر کا ذریت رسولؐ سے بدلہ لینے کے بعد کہتا ہے:

(۱) کاش میرے بدر والے وہ بزرگ جنہوں نے تیر کھا کر بنی خزرج کی جزع فزع اور اضطراب کو دیکھا تھا آج موجود ہوتے۔

(۲) (اور دیکھتے کہ) ہم نے تمہارے سرداروں میں سے بڑے سردار (امام حسینؑ) کو قتل کر کے بدر والی کجی کو سیدھا کر دیا ہے۔

(۳) اس وقت خوشی کے مارے ضرور بآواز بلند پکار کر کہتے کہ اے یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔

(۴) میں اولاد خندف سے نہیں ہوں اگر اولاد احمدؐ سے ان کے کئے کا بدلہ نہ لے لوں۔

(۵) بنی ہاشم نے ملک گیری کے لیے ایک ڈھونگ رچایا تھا ورنہ کوئی خبر آسمانی آئی تھی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی (معاذ اللہ)۔[۱]

تاریخ طبری میں ان اشعار کے بعد اس رائے کا اظہار ملتا ہے: ﴿هذا هو المروق من الدين و قول من لا يرجع الى الله ولا الى دينه ولا الى كتابه ولا الى رسوله ولا يؤمن بالله ولا بما جاء من عند الله..... الخ﴾ یعنی یہ کھلم کھلا دین اسلام سے خروج ہے اور ایک ایسے شخص کا قول ہے جو خدا اور رسولؐ اور ان کے لائے ہوئے دین پر ایمان نہیں رکھتا۔[۲]

علانیہ شراب کے متعلق یزید کا نظریہ اور بیٹے کے متعلق معاویہ کی تدبیر

یزید چونکہ علانیہ شراب کے دور چلا کر داد عیش و عشرت دیتا تھا امیر شام کو اندیشہ ہوا کہ چونکہ ابھی تک اکثر لوگوں کے دل و دماغ میں اسلامی احکام و ارکان کی کچھ نہ کچھ عظمت راسخ ہے۔ اس لیے وہ کہیں یزید سے متنفر نہ ہو

۱۔ تذکرہ خواص الامۃ سبط ابن جوزی، ص ۱۴۸۔ صواعق محرقہ، ص ۲۲۳۔ ینابیع المودۃ، ص ۳۲۵۔ نزل الابرار بدخشی، ص ۹۷۔ اتحاف لحب الاشراف، ص ۱۸۔ شذرات الذہب، ص ۲۹۹ وغیرہ۔ بحوالہ ناموس اسلام، ج ۲، ص ۲۲۶۔

۲۔ تاریخ طبری، ص ۳۵۸ طبع جدید۔

جائیں اور اس طرح وہ جو یزید کی ولی عہدی کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے اس میں اسے مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لیے اپنے چہیتے بیٹے کو شراب خواری کی یہ تدبیر بتائی۔ ﴿لا تفعل نهاراً لئلا تهون فی اعین الناس﴾ بیٹا! دن کو شراب نہ پیا کرو۔ تا کہ لوگوں کی نگاہوں میں تمہاری قدر و منزلت نہ گر جائے۔ ﴿ذکره ابن المغازلی فی تاریخه و ابن الانباری فی تاریخه﴾

اس کے جواب میں یزید نے اپنے باپ کو جواباً یہ دو شعر لکھ کر بھیج دیے۔

فان حرمت یوماً علی دین احمدٌ	فخذها علی دین مسیح بن مریم
اگر دین احمدؐ میں شراب نوشی حرام ہے	تو پھر مسیح بن مریم کے دین پر پی لو
ما قال ربک ویل للذی شربوا	بل قال ربک ویل للمصلین
خدا نے شرابخواروں کے متعلق ویل للشاربین کہیں نہیں کہا	البتہ نمازگزاروں کے متعلق قرآن میں ویل للمصلین موجود ہے۔[1]

ان اشعار سے واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ یزید صرف یہی نہیں کہ عملاً ایک انتہائی گیا گزرا شخص تھا بلکہ وہ خیالات و نظریات کے اعتبار سے بھی ایسا لاابالی تھا کہ وہ احکام شریعت کا استہزاء کیا کرتا تھا۔ کمبخت شراب کا اتنا دلدادہ تھا کہ جس وقت معاویہ اس کی ولیعہدی کی کوشش میں مشغول تھا تو اس نے یزید کو حج کے بہانہ سے اہل مکہ و مدینہ کو متاثر کرنے کے لیے حجاز بھیجا تھا تو اس نے مدینہ منورہ پہنچ کر بھی بادہ کشی کا دور چلایا تھا۔[2]

یزید اور محرمات شرعیہ جیسے زنا، ترک صلوٰۃ اور شرب خمر کا ارتکاب

عبداللہ بن حنظلہ (غسیل الملائکہ) بیان کرتے ہیں: ﴿و اللّٰه ما خرجنا علی یزید حتّی خفنا ان نرمٰی بالحجارة من السماء ان رجالا ینکح امهات الاولاد و البنات و الاخوات و یشرب الخمر و یدع الصلوٰة﴾ خدا کی قسم ہم نے اس وقت تک یزید کے خلاف آواز بلند نہیں کی جب تک ہمیں یہ خوف دامن گیر نہیں ہو گیا کہ کہیں ہم پر آسمان سے پتھر نہ برسیں کیونکہ وہ ایسا شخص تھا جو (جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے) اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا۔ اور شراب علانیہ پیتا تھا اور نماز ترک کرتا تھا۔[3] اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یزید عملی حیثیت سے کس قدر گرا ہوا تھا؟

---

[1] روض الجنان، مولانا اشرف علی تھانوی (علی ما نقل فی ناموس اسلام)۔

[2] تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳، ص ۲۳، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۷ھ۔

[3] تاریخ الخلفاء سیوطی، ص ۲۰۸، ۲۰۹۔ تذکرۃ سبط ابن الجوزی، ص ۱۶۳۔ صواعق محرقہ، ص ۱۳۲۔

یزید کے عام عادات و اطوار

مورخ جلیل مسعودی نے یزید کے متعلق لکھا ہے: ﴿وکان یزید صاحب طرب و جوارح و کلاب وقرود و فھود و منادمة علی الشراب..... الخ﴾ یزید بڑا عیش و عشرت پسند، شکاری جانوروں، کتوں، بندروں اور چیتوں کا دلدادہ تھا اور ہر وقت انہی اشغال میں مشغول رہتا تھا اور ہر وقت اس کے ہاں شراب خواری کی بزمیں قائم رہتی تھیں۔[1] جب یزید کی بدکرداریوں کی عام شہرت ہوئی تو مدینہ کے لوگوں پر بالخصوص یہ بات بہت شاق گزری۔ حاکم مدینہ عثمان بن محمد بن ابی سفیان نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اشراف مدینہ کا ایک وفد مرتب کر کے یزید کے پاس بھیجا جس میں جناب عبداللہ بن حنظلہ انصاری اور منذر بن زبیر وغیرہ شامل تھے۔ عثمان کا خیال تھا کہ یہ لوگ یزید کی عطا و بخشش سے مطمئن ہو جائیں گے مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ان حضرات نے واپس آ کر یزید کے کردار کو بالکل طشت از بام کر دیا اگرچہ یزید نے رخصت کے وقت بطور رختانہ عبداللہ کو ایک لاکھ اور ان کے ہمراہیوں کو دس دس ہزار درہم دیے۔ یزید کا خیال تھا کہ اس حیلہ سے ان کو اپنے دام تزویر میں پھانسنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اس کی توقع کے خلاف جب یہ لوگ واپس پلٹ کر مدینہ پہنچے تو برملا ﴿فاظھروا شتم یزید و عیبه و قالوا قدمنا من عند رجل لیس له دین یشرب الخمر و یضرب بالطنابیر و یعزف عنده القینات بالمعازف و یلعب بالکلاب و یسمر عنده الحراب و هم اللصوص و انا نشهدکم انا قد خلعناه﴾ یزید کے عیوب اور اس کی برائیاں ظاہر کیں اور کہا ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آ رہے ہیں جو بالکل بے دین ہے، شراب پیتا ہے، طنبورے بجاتا ہے، اس کے سامنے کنیزیں باجے بجاتی ہیں، کتوں سے کھیل کر دل بہلاتا ہے، رات کو بدمعاشوں اور چوروں کے جمگھٹ میں جنگی کہانیاں بیان ہوتی ہیں۔ ہم تمہیں گواہ کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی بیعت توڑ دی ہے۔[2]

چنانچہ دیگر اہل مدینہ نے بھی یزید کی بیعت توڑ دی جس کے نتیجہ میں وہ المیہ واقع ہوا جو واقعہ حرہ کے نام سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔ ''حرہ'' مدینہ طیبہ کے مشرق میں ایک مقام کا نام ہے جہاں فوج یزید کے سپہ سالار مسلم بن عقبہ (جس کے پاس پندرہ ہزار کا لشکر جرار تھا) اور اہل مدینہ میں سخت خونریز جنگ ہوئی اور نتیجتاً اہل مدینہ کو شکست ہوئی۔ سرداران لشکر (عبداللہ بن حنظلہ و عبداللہ بن مطیع) جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد مسلم (مسرف انسب ہے) نے مدینۂ رسولؐ میں جو مظالم ڈھائے۔ ان کے بیان سے قلم اور زبان عاجز و حیران ہے۔ مورخین کے ایک عام

---

[1] مروج الذہب، ج ۲، ص ۶۸۔ طبع مصر۔

[2] طبری، ج ۷، ص ۴۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۳۸۔

اندازے کے مطابق تین شبانہ وروز تک مدینہ کو تاخت وتاراج کیا گیا۔ علاوہ مالی نقصان کے صرف جانی نقصان کا یہ اندازہ ہے کہ اس میں سات سو (۷۰۰) صحابہ رسولؐ اور دس ہزار عوام شہید کیے گئے۔ کم وبیش تین سو کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی۔ مسجد نبوی کی اس طرح ہتک حرمت کی گئی کہ اس میں خچر اور گدھے باندھے گئے۔ تین دن تک مسجد نبویؐ میں نماز واذان نہ ہوئی۔[1] یہ ننگ اسلام بلکہ ننگِ انسانیت ۶۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور آغاز ۶۴ھ میں ہلاک ہوگیا۔ اس تین سال اور کچھ ماہ میں تین ایسے شنیع جرائم کا ارتکاب کیا جن کو یاد کر کے انصاف پسند دنیا قیامت تک اس پر نفرین کرتی رہے گی۔ حکومت کے پہلے سال خاندانِ رسول کی بربادی، دوسرے سال بلدِ رسول کی تباہی اور آخری سال خانۂ خدا پر حملہ اور اس کی ویرانی ؎

ناوک نے اس کے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ذہبی نے اس کے متعلق لکھا ہے: ﴿افتتح دولته بقتل الحسینؑ و اختتمها بواقعة الحرة فمقته الناس ولم يبارک فی عمره﴾ یعنی یزید نے اپنی حکومت کا افتتاح شہادت حسینؑ اور اختتام واقعۂ حرہ سے کیا جس کی وجہ سے لوگوں نے اس سے نفرت کی اور خدا نے اس کی عمر میں برکت نہ دی۔ (میزان الاعتدال)

یزید کے متعلق اسلامی دنیا کی رائے

انہی حقائق کے پیش نظر اہل سنت کے بڑے بڑے جلیل القدر علماء وائمہ نے یزید کو نہ صرف فاسق وفاجر بلکہ کافر لکھا ہے۔

(۱) چنانچہ ملا علی قاری لکھتے ہیں: ﴿اختلف فی اکفار یزید قیل نعم یعنی لما روی عنه ما یدل علی کفره من تحلیل الخمر..... و لعله وجه ما قال الامام احمد بتکفیره لما ثبت عنده﴾ یعنی کفر یزید کے بارے میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ہاں وہ کافر ہے کیونکہ اس سے ایسے افعال واقوال نقل ہوئے ہیں جو اس کے کفر پر دلالت کرتے ہیں جیسے شراب کو حلال سمجھنا وغیرہ۔ اور شاید انہی وجوہ کی بنا پر امام احمد بن حنبل نے اس کے کفر کا فتویٰ دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کے یہ کافرانہ اقوال وافعال ثابت ہو گئے تھے۔[2]

(۲) پیشوائے اہل سنت شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی تحریر فرماتے ہیں: "اکثر اکابرین ومحدثین وبزرگان دین مثل امام احمد بن حنبل، وعلامہ ابن جوزی، وجلال الدین سیوطی وعلامہ سعد الدین تفتازانی وسید آلوسی وغیرہم

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۹۔ طبع مصر جدید۔ بالاختصار واصابہ، جزء نمبر ۶، ص ۲۷۱، قسم ثالث وصواعق محرقہ، ص ۲۲۲، طبع مصر جدید۔

[2] شرح فقہ اکبر، ص ۸۸۔

رحمہم اللہ تعالیٰ، یزید کے کفر کے قائل ہیں اور سرے سے اسے مسلمان ہی نہیں جانتے۔[۱] الخ۔"

(۳) علامہ سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں: ﴿فنحن لا نتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ لعنۃ اللّٰہ علیہ و علی انصارہ و اعوانہ﴾ ہم یزید پر لعنت کرنے کے جواز بلکہ اس کے بے دین و بے ایمان ہونے پر کسی قسم کا توقف اور شک وشبہ نہیں کرتے۔ اس پر اور اس کے اعوان و انصار پر خدا کی لعنت ہو۔[۲]

(۴) علامہ جلال الدین سیوطی (جو یزید کو چھٹا خلیفہ بھی شمار کرتے ہیں) لکھتے ہیں: ﴿لعن اللّٰہ قاتلہ و ابن زیاد معہ و یزید ایضاً﴾ خداوند عالم حسینؑ کے قاتل اور ابن زیاد اور یزید پر بھی لعنت کرے۔[۳]

(۵) علامہ ابن جوزی نے یزید کے کفر اور اس پر لعنت کے جواز میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: "الرد علی المتعصب العنید فی جواز اللعن علی یزید" اس میں انہوں نے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے۔

(۶) سبط ابن جوزی نے بھی اپنی کتاب تذکرہ خواص الامۃ میں اس کا کفر اور اس پر لعنت کا جواز ثابت کیا ہے۔

(۷) سید محمود آلوسی بغدادی نے اپنی تفسیر روح المعانی جلد ہشتم میں کفر یزید کی بحث کرتے ہوئے ابن عربی مالکی کے کافرانہ فتویٰ کا تار و پود بکھیر نے اور کفر و لعنت یزید کے بارے میں مختلف علماء اہل سنت کے نظریات نقل کرنے کے بعد خود لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے: "میرا گمان غالب یہی ہے کہ وہ خبیث ہرگز مسلمان اور مصدق رسالت نہیں تھا۔"[۴]

(۸) قاضی شہاب الدین فرماتے ہیں: ﴿تواتر عن یزید من ایذاء النبیؐ فی اھل بیتہ ما یوجب اللعن فرحم اللّٰہ من جوّز لعنہ قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ ان الذین یوذون اللّٰہ و رسولہ لعنھم اللّٰہ فی الدنیا و الآخرۃ و اعد لھم عذاباً مھینا﴾ "یزید کے متعلق یہ بات بالتواتر ثابت ہے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بوجہ قتل اہل بیتؑ اذیت پہنچائی۔ اور یہ بات موجب لعنت ہے۔ خدا رحم کرے ان لوگوں پر جو یزید پر لعنت کو جائز سمجھتے ہیں۔ خدا فرماتا ہے جو لوگ خدا اور رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں ان پر خدا نے لعنت کی ہے۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔" (قول سدید، ص ۷۳)

۱۔ شہادت حسین، ص ۵۲۔

۲۔ شرح عقائد نسفی، ص ۱۱۷۔

۳۔ تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۷، طبع جدید۔

۴۔ روح المعانی، ج ۸، ص ۱۳۶۔

(۹) علامہ ذہبی لکھتے ہیں: ﴿کان (یزید) ناصبیاً فظاً غلیظاً یتناول المسکر و یفعل المنکر﴾ یزید پکا دشمن اہل بیتؓ اور سخت بدخو تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور گناہوں کا ارتکاب کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال)

(۱۰) جناب پھلواروی صاحب نے مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا یہ فتویٰ ان کے فتاویٰ (ج ۳، ص ۷) سے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے۔ ﴿در شان وے (یزید) براہِ افراط و موالات رفتہ می گویند۔ کہ وی بعد ازاں کہ باتفاق مسلماناں امیر شد۔ اطاعتش بر امام حسینؓ واجب شد و ندانستند کہ وی باوجود حسینؓ امیر شود؟ اتفاق مسلماناں کسے باشد جماعتے از صحابہ و از اولاد صحابہ خارج از و بودند و برخے کہ حلقۂ اطاعت او بگردن انداختند چوں حال او بہ تشرب خمر و ترک صلوۃ و زنا و استحلال محارم معائنہ کردند بہ مدینہ منورہ باز آمدند و خلع بیعت کردند۔۔۔۔ الخ﴾ یعنی ”کچھ لوگ محبت یزید میں افراط کا شکار ہو کر یہ کہتے ہیں کہ جب یزید تمام مسلمانوں کے اتفاق سے امیر تسلیم ہو گیا تھا تو اب حسینؓ پر بھی اس کی اطاعت واجب تھی۔ ان لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ کیا حسینؓ کی موجودگی میں یزید امیر ہو بھی سکتا تھا؟ نیز یہ کہاں کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کی خلافت پر تمام مسلمانوں نے اتفاق کر لیا تھا جبکہ صحابہ اور اولادِ صحابہ کی ایک جماعت اس سے خارج تھی۔ اور جنہوں نے اس کی اطاعت کا قلادہ گردن میں ڈالا بھی تھا۔ ان کو بھی جب اس کے صحیح حالات معلوم ہوئے کہ وہ شراب خوار، تارک نماز، زناکار اور محارم الٰہیہ کو حلال جاننے والا ہے تو انہوں نے مدینہ میں پہنچ کر اس کی بیعت توڑ ڈالی۔“[1]

(۱۱) مولانا محمد مبین صاحب فرنگی محلی نے بڑی تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ﴿یزید و بنوا الحکم ملعونون علی لسان النبیؐ﴾[2] ”یزید اور حکم کی تمام اولاد پیغمبر اسلام کی زبانی ملعون ہے۔“

(۱۲) علامہ وحید الزمان نے انوار اللغۃ میں کئی جگہ پر کفر یزید اور اس پر لعنت کرنے کے جواز کی تصریحات کی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ”اب تک ان اہل شام کے چیلے چاپڑوں سے جہاں پاک نہیں ہوتا۔ کوئی تو یزید کو پیغمبری تک پہنچا دیتا ہے۔ کوئی اس کو خلیفۂ برحق کہتا ہے۔ امام صاحب کو باغی قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے (شیخ ابو بکر بن عربی مالکی استاد امام غزالی) اگر یزید امامؑ صاحب کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرتا تب بھی میں اس پر لعنت نہ کرتا۔ کیونکہ وہ اولوالامر میں تھا۔ کوئی کہتا ہے امام حسینؑ اسی تلوار سے مارے گئے جو ان کے نانا کی

---

[1] رسالہ شہادت حسینؓ، ص ۵۳۔

[2] وسیلۃ النجاۃ، ص ۳۹۰۔

تھی۔ اللہ ان لوگوں سے سمجھے۔ معلوم نہیں قیامت کے دن آنحضرتؐ کے سامنے یہ لوگ اپنا منہ کیسے بنائیں گے؟ ہم تو یزید کو معہ اس کے معاونین جیسے شمر لعین، ابن زیاد، عمر بن سعد، خولی، سنان وغیرہم کو ملعون اور مردود اور اشقی الخلق والخلیقہ جانتے ہیں۔

الف الف لعنت یزید پر اور الف الف لعنت یزید کے طرفداروں اور حامیوں اور تعریف کرنے والوں پر جو اس کو خلیفہ یا اولوالامر میں سے سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنا وقوف نہیں کہ خلافت شرعی کوئی خالہ جی کا گھر ہے کہ جو زبردست ہوا۔ اس نے دبا لیا۔ اور خلیفہ بن بیٹھا۔" [1] یہاں بنظر اختصار انہی بارہ شہادتوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ تفصیل کے شائقین کتاب معاویہ و یزید اور سیاست معاویہ و یزید وغیرہ کتب مبسوطہ کی طرف رجوع کریں۔

ان حقائق پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں یزید کسی طرح بھی خلافت نبویہ کا مستحق نہ تھا۔ اس کا اسلام ہی ثابت نہیں۔ تا بخلافت چہ رسد؟ لہٰذا اس کے خلاف کوئی اقدام کرنا ہرگز بغاوت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ و الحمد للہ علی وضوح الحق و الحقیقۃ۔

ایک مشہور شبہ کا جواب

ہوا خواہان بنی امیہ و محبان یزید بہت ہاتھ پیر مارنے کے بعد بموجب "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" نجات یزید کے سلسلہ میں بخاری کی اس حدیث کو پیش کیا کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم﴾ "میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر (بادشاہ روم کے) شہر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔" ۴۹ھ میں معاویہ نے ایک فوج سفیان بن عوف کی کمان میں قسطنطنیہ بھیجی تھی اور چونکہ یزید اس لشکر میں شامل تھا۔ لہٰذا وہ مبشر بالجنۃ قرار پاتا ہے۔ یہ دلیل بالکل علیل اور بچند وجہ ناقابل قبول ہے۔

اوّلاً: یہ روایت سند کے اعتبار سے مجروح و مقدوح ہے کیونکہ اس کے راوی بوجہ بد عقیدہ یا بد عمل ہونے کے ناقابل اعتبار ہیں۔ اس روایت کا سلسلۂ سند اس طرح ہے: ﴿حدثنا اسحٰق بن یزید بن ابراھیم الدمشقی حدثنا یحییٰ عن عمیر بن الاسود العنسی الحمصی﴾۔ اس سلسلہ کا پہلا راوی اسحاق ہے جو کہ علماء رجال کے نزدیک ضعیف ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۲۲۰ طبع حیدرآباد) میں لکھتے ہیں: ﴿قال ابن ابی حاتم کتب عنہ ابی و سمعت ابا زرعۃ یقول ادرکناہ ولم نکتب عنہ﴾۔ ابن ابی حاتم بیان کرتے ہیں: میرے باپ نے اس (اسحاق) سے حدیث لکھی اور میں نے ابوزرعہ (رازی) سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے اس کا زمانہ پایا ہے مگر (بوجہ ضعیف ہونے کے) اس سے حدیث نہیں لکھی۔

---

[1] انوار اللغۃ، پارہ ۱۲، ص ۱۵۵۔

دوسرا راوی یحییٰ ہے۔ اس کے متعلق تہذیب التہذیب (ج ۱۱، ص ۲۰۰) میں لکھا ہے: ﴿کان یرمی بالقدر روی عن ابن معین انه کان قدریاً﴾ اس پر قدری ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور ابن معین (بہت بڑے نقاد) سے روایت ہے کہ یہ قدری تھا۔ اور جناب رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿القدریة مجوس هذه الامة﴾ قدریہ میری امت کے مجوسی ہیں۔ (شرح مقاصد)

تیسرا راوی ثور ہے۔ اس کے متعلق تہذیب (ج ۲، ص ۳۳) میں لکھا ہے: ﴿یقال انه کان قدریاً و کان جده قتل یوم صفین مع معاویة و کان ثور اذا ذکر علیاً قال لا احب رجلاً قتل جدی نفاه اهل الحمص لکونه قدریاً﴾ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص قدری المذہب تھا۔ اس کا دادا جنگ صفین میں معاویہ کی معیت میں مارا گیا۔ چنانچہ جب بھی ثور حضرت علی علیہ السلام کا ذکر کرتا تو کہتا تھا میں ایسے شخص کو دوست نہیں رکھتا جس نے میرے دادا کو قتل کیا ہے۔ اہل حمص نے اس کو قدری ہونے کی وجہ سے شہر بدر کر دیا تھا۔ (کذافی میزان الاعتدال) اس سے معلوم ہوا کہ یہ شخص قدری ہونے کے ساتھ ساتھ دشمن اہل بیت بھی تھا۔ اور یہ امر بجائے خود راوی کے لیے قادح ہے لہٰذا ایک قدری و ناصبی کی روایت کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے؟

چوتھا راوی خالد بن معدان ہے۔ اس کے متعلق تقریب التہذیب (ص ؟؟) میں تصریح موجود ہے کہ ﴿یرسل کثیراً﴾ کہ یہ شخص روایت نقل کرنے میں ارسال سے بہت کام لیتا تھا۔ اس بنا پر یہ بھی ناقابل اعتماد ہو کر رہ جاتا ہے۔

علاوہ بریں ان تمام راویوں کا دمشقی (شامی) اور حمصی ہونا بھی بری طرح کھٹکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان راویوں نے اپنی طرف سے یا حکومت وقت کے اشارے پر ایسی روایات وضع کر کے بلاد اسلامیہ میں پھیلا دیں جن سے سلاطین وقت کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ یہ روایت بالکل وضعی و جعلی ہے اور ناقابل استدلال۔

ثانیاً: اگر بالفرض اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو اس میں پہلے لشکر کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور جس لشکر میں یزید شامل تھا وہ پہلا نہ تھا۔ یزید ۵۰ھ میں شریک ہوا۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے ۴۲ھ میں ایک مہم مدینہ قیصر قسطنطنیہ کے خلاف روانہ کی جا چکی تھی۔ اور سالہائے مابعد میں بھی برابر مہمیں روانہ ہوتی رہیں۔ جیسا کہ یزید کے خاص ہمنوا ابن خلدون اور ابن کثیر نے بیان کیا ہے۔ (از قول سدید)

ثالثاً: واقعات شاہد ہیں کہ یزید نے اس مہم میں بادل ناخواستہ شرکت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو عمل قلبی رضامندی سے نہ ہو۔ وہ شرعاً قابل اعتنا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مؤرخ شہیر ابن اثیر کا بیان ہے کہ معاویہ نے یزید کو شرکت

جہاد کا حکم دیا مگر اس نے سستی سے کام لیا۔ اور کوئی بہانہ کر کے رہ گیا۔ ادھر لشکر میں بخار اور چیچک کی وبا پھوٹ پڑی۔ جب یزید کو اس کی اطلاع ملی تو اس کے خوب بغلیں بجائیں اور یہ عیاشانہ اشعار پڑھے ؎

ما ان ابالی بما لاقت جموعهم ... بالفدفدا البيد من حمى ومن شوم

اذا اتكأت على الاغماط مرتفعاً ... بدير مران و عندى ام كلثوم

جب معاویہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے کہا: بخدا میں اس کو بھیج کر رہوں گا۔ چنانچہ یزید کو طوعاً کرہاً جانا پڑا۔ اس طرح یزید نے بادل ناخواستہ مجبوراً اس جہاد میں شرکت کی۔ (کامل، ج ۳، ص ۲۲۷) ان حالات میں یزید کے لیے کیا فضیلت باقی رہ جاتی ہے۔

رابعاً: بعض محدثین اہل سنت (ابن التین وابن المنیر) نے اس حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ ﴿**لا يلزم من دخوله في ذالك العموم ان لا يخرج بدليل خاص اذ لا خلاف ان قوله عليه السلام و الصلوٰة مغفور لهم مشروط بكونه من اهل المغفرة حتى لو ارتد ممن غزاها بعدة لك لم يدخل في ذلك العموم اتفاقا... الخ**﴾ اس (بخشش) والے عموم میں یزید کے داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دلیل خاص کے ذریعہ اس سے نکل نہ سکے کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آنحضرت کا یہ ارشاد کہ وہ (لشکر) بخشا ہوا ہے اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ شامل ہونے والا شخص مغفرت کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔ لہٰذا اگر اس لشکر والوں میں سے کوئی شخص بعد میں مرتد ہو جائے تو وہ بالاتفاق اس (بخشش کے) عموم میں داخل نہ ہوگا۔[1] (اور چونکہ یزید نے بعد ازاں وہ وہ افعال شنیعہ کیے ہیں کہ اگر پہلے اس کا اسلام بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر اس کا ارتداد یقینی لازم آتا ہے) لہٰذا وہ اس عموم سے خارج متصور ہوگا۔

خامساً: شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ "جہاد ماضی کے گناہ دھوتا ہے مستقبل کے گناہوں یا اعمال کو محو نہیں کرتا۔ یزید سے بعد میں جو گناہ سرزد ہوئے۔ ان کا حساب کتاب اور جزا و سزا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جو انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔"[2] اس جواب باصواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہی شخص جنتی کہلا سکتا ہے جس کا خاتمہ بالخیر ہوا ہو۔ یہ نکتہ تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے لیے خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ کسی بھی شخص کے بارے میں اخلاص وعقیدت کے پھول نثار کرنے سے قبل یہ دیکھ لینا چاہئے کہ آیا اس کا خاتمہ بالخیر بھی ہوا تھا یا نہ؟ ﴿**لان الاعمال بالخواتيم. رزقنا الله حسن الخاتم بجاه النبیؐ و الوصیؑ و**

---

1. قسطلانی شرح بخاری، ج ۵، ص ۸۳، ۸۵، وج ۱۰، ص ۱۳۹۔
2. ماہنامہ الرحیم مجریہ اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۴۳، شائع کردہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ۔

ابنائهما و فاطمة﴾

سادساً: بنابر تسلیم خود علمائے اہل سنت نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔ سبط ابن جوزی نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے: ﴿قلنا فقد قال النبیؐ لعن اللّٰه من اخاف مدینتی و الآخر ینسخ الاول﴾ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آنحضرت کا ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ جو شخص میرے شہر مدینہ کے لوگوں کو خوف زدہ کرے اس پر خدا کی لعنت ہو۔ (اور چونکہ غزوۂ قسطنطنیہ کے بعد یزید نے اہل مدینہ کو واقعۂ حرہ میں خوف زدہ کیا تھا لہٰذا آخری حدیث نے پہلی کو منسوخ کر دیا۔[1]

جناب رسول خداؐ کا ارشاد ہے: ﴿من اخاف اهل المدينة ظلماً اخافه اللّٰه و عليه لعنة اللّٰه و الملائكة و الناس اجمعين و لا يقبل اللّٰه منه صرفاً و لا عدلاً﴾ جو شخص اہل مدینہ پر ظلم کر کے انہیں ناجائز طور پر ڈرائے اسے خدا ڈرائے گا اور اس پر خدا، اس کے ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی اور بروز قیامت خداوند عالم اس کا کوئی مالی و جانی عمل قبول نہ کرے گا۔[2] اب رہا یزید کا مسلم بن عقبہ کی ماتحتی میں لشکر جرار بھیج کر اہل مدینہ کو ڈرانا دھمکانا اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھانا تو یہ تاریخ کا وہ مسلم الثبوت دردناک و کربناک واقعہ ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں قریباً ایک ہزار باکرہ عورتوں کی بکارت زائل کی گئی (اور ناجائز حمل ٹھہرے) اور قریباً اتنے ہی صحابہ تہہ تیغ کیے گئے۔ قریباً سات سو قاریانِ قرآن ذبح کیے گئے۔ کئی دن تک مدینہ کی ہتک حرمت کی گئی۔ مسجد میں سلسلۂ جماعت اور آمد و رفت موقوف ہو گیا۔ اہل مدینہ چھپ گئے یہاں تک کہ مسجد نبویؐ میں کتے اور بھیڑیے داخل ہونے لگے۔ اور منبر رسولؐ پر پیشاب کیا۔[3] ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾۔

اور ابن زبیر کے معاملہ میں منجنیقوں سے خانۂ خدا کی دیواریں منہدم کر کے اسے آگ لگا دی گئی۔[4]

اہل انصاف غور فرمائیں۔ بعد ازیں بھی یزید کی نجات کی کوئی امید باقی رہ جاتی ہے۔ لعنة اللّٰه عليه و على انصاره و اعوانه۔

سبط ابن جوزی لکھتے ہیں: ﴿ان جماعة سئلوا جدی عن يزيد. فقال ما تقولون فی رجل ولی ثلاثة سنين ففی سنة الاولى قتل الحسينؑ. و فی الثانية اخاف المدينة و اباحها و فی الثالثة رمی

۱۔ تذکرۃ الخواص، ص ۲۰۸، طبع مصر۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل۔ تذکرہ خواص الامۃ و طبرانی۔

۳۔ صواعق محرقہ، ص ۱۳۲۔

۴۔ صواعق محرقہ، ص ۱۳۲۔

الکعبۃ بالمجانیق و ھدمھا فقالوا نلعنہ فقال فالعنوہ ﴾ ایک گروہ نے میرے نانا (ابن جوزی) سے یزید کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے جواب میں فرمایا: بھلا تم ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جس نے اپنے سہ سالہ دورِ حکومت میں سے پہلے سال میں حسینؑ کو شہید کیا۔ دوسرے سال میں اہل مدینہ کو خوف زدہ کر کے مدینہ کی ہتک حرمت کی اور تیسرے سال میں خانہ کعبہ کو منجنیقوں سے اڑا دیا۔[1] انہوں نے کہا: کیا ہم اس پر لعنت کریں؟ کہا: ہاں اس پر لعنت کرو۔

انہی حقائق کی بناء پر مؤرخ جلیل مسعودی نے لکھا ہے: ﴿و لیزید و غیرہ اخبار عجیبۃ و مثالب کثیرۃ من شرب الخمر و قتل ابن الرسولؐ و لعن الوصی و ھدم البیت. و سفک الدماء و الفسق و الفجور و غیر ذلک مما ورد فیہ الوعید بالیأس من غفرانہ کورودہ فیمن جحد توحیدہ و خالف رسلہ... الخ ﴾ یزید اور اس کے ہمراہیوں کے اخبار و آثار عجیب اور مصائب و مثالب کثیر ہیں۔ جیسے شراب پینا، فرزند رسول کو قتل کرنا، وصی نبی پر لعن طعن کرنا، خانہ کعبہ کا گرانا، مسلمانوں کا خون بہانا، اور دیگر مختلف قسم کے ایسے فسق و فجور کے کاموں کا ارتکاب کرنا جن کے ارتکاب کرنے والوں کے لیے اسی طرح رحمت و بخشش خداوندی سے ناامیدی کی وعید و تہدید وارد ہوئی ہے۔ جس طرح منکرین توحید و مخالفین رسول کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔[2] ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جو منکرین خدا اور رسول کا مقام ہے۔ وہی یزید بن معاویہ کا مقام ہے بلکہ کئی اعتبار سے اس کا معاملہ ان سے بھی بدتر ہے۔ بئس ما اشتروا بہ انفسھم لو کانوا یعلمون۔

---

1. تذکرۃ خواص الامۃ، ص ۱۶۵۔
2. مروج الذہب، ج ۲، ص ۷۲۔

بارھواں باب

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے مقصد کی وضاحت

اب تک سابقہ ابواب خصوصاً دسویں باب میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اگر چہ مقصد شہادت حسینؑ کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ان مباحث کا مطالعہ کرنے والے ناظرین کرام پر حسینیؑ شہادت عظمیٰ کا مقصد اقصیٰ مخفی و مستور نہیں رہ سکتا۔ تاہم اس باب کے ضمن میں ذرا اور وضاحت وصراحت کے ساتھ اس موضوع پر تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ ہر کہ و مہ پر اس بے نظیر حسینیؑ کارنامے کا مقصد ومطلب بالکل واضح ولائح ہو جائے۔

کام کی قدر و قیمت اس کی غرض وغایت کے تابع ہوتی ہے

یہ امر کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی عقل و خرد رکھنے والی ہستی کوئی کام بغیر کسی غرض وغایت کے نہیں کرتی البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ غرض ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی بلکہ کبھی بلند اور کبھی پست ہوتی ہے۔ اسی لیے ہمیشہ کسی بھی فعل کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس کی غرض وغایت کی بلندی یا پستی سے لگایا جاتا ہے جس فعل کی جس قدر غرض وغایت بلند اور عظیم الشان ہوگی اسی قدر وہ کام بلند و عظیم المرتبت سمجھا جائے گا اور جس قدر اس کی غرض وغایت دنی اور پست ہوگی اسی قدر وہ فعل ارباب نظر کی نگاہ میں حقیر و مہین متصور ہوگا۔ مثلاً ایک شخص اپنے محبوب حقیقی کے پسندیدہ دین کی بقا و تحفظ کی خاطر اپنی جان عزیز جان آفرین کے سپرد کرتا ہے وہ شہید راہ خدا کہلاتا ہے۔ اور زندۂ جاوید کے ممتاز لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور اس طرح خوشنودی خدا کا تمغہ حاصل کرتا ہے اور لوگ اس پر مدح وثنا کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

ایک دوسرا شخص ہے وہ بھی اپنی جان نثار کرتا ہے مگر کسی پری وش محبوبہ کے عشق ومحبت میں گرفتار ہو کر اور اس کے درد وفراق سے متاثر ہو کر تو وہ عند اللہ "خودکشی" ایسے سنگین جرم کا مجرم قرار دیا جاتا ہے اور ارباب عقل و دانش اس کی حماقت پر ہنستے ہیں۔ یہ اختلاف وتفاوت کیوں ہے؟ جبکہ دونوں فعل بظاہر متجانس و متماثل ہیں۔ دونوں میں جان کا زیاں ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ اختلاف اقدار صرف اغراض ومقاصد کے اختلاف سے رونما ہوا ہے۔ اس لیے اس مسلّمہ اصول کی بنا پر حسینیؑ شہادت کی حقیقی عظمت معلوم کرنے کے لیے اس کا اصلی مقصد معلوم کرنا ضروری ہے۔

شہادت حسینیؑ نے بنی امیہ کے خلاف اسلام کردار کو بے نقاب کر دیا

کچھ عرصہ سے خلافت نبویہ کو جس نہج پر چلایا جا رہا تھا اس نے بتدریج اب قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کی شکل و

صورت اختیار کر لی تھی۔ اب حالت یہ تھی کہ کھلے بندروں حکام اسلام احکام اسلام کی مخالفت کرتے تھے اور ان کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ کھدر ایسے سادہ اسلامی لباس کی جگہ اب ریشم و دیبا نے لے لی تھی۔ ان کے گھروں سے اب آواز قرآن کی جگہ راگ و سرود کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ عبادت و اطاعت میں شب زندہ داری کی جگہ راتیں داد عیش و عشرت دینے میں گزاری جاتی تھیں۔ پانی کی بجائے اب دور جام و سبو چلتا تھا۔ محرمات ابدیہ سے اب جنسی خواہش کی تسکین مباح سمجھی جاتی تھی۔ اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ عامۃ المسلمین انہی نظریات اور افعال کو اصل اسلام سمجھتے تھے اور نام نہاد حکام اسلام کے خلاف شرع افعال و احکام کو عین اسلام قرار دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس وقت اسلام کا صحیح ہمدرد، بانی اسلام کا نواسہ، اسلام کے پہلے بطل جلیل و عظیم جرنیل کا لخت جگر اور امت مسلمہ کا سچا غمخوار یعنی حسین بن علی علیہما السلام خاموش تماشائی کی طرح حالات کو دیکھتا رہتا۔ یا (معاذ اللہ) یزید عنید کی بیعت کر لیتا تو ظاہر ہے کہ پھر اس نام نہاد خلیفۂ وقت کے مذکورہ بالا ملحدانہ نظریات اور کافرانہ حرکات پر مہر صحت ثبت ہو جاتی۔ اور اس طرح اسلام نیست و نابود ہو جاتا اور اگر برائے نام باقی رہ بھی جاتا تو اس مسخ شدہ شکل میں کہ اسے اصل صحیح اسلام سے ذرہ بھر بھی کوئی مناسبت نہ ہوتی۔ ایسے حالات میں حضرت امام حسینؑ نے بیعت سے انکار اور شہادت عظمیٰ کا راستہ اختیار کر کے تمام عالم پر اس حقیقت کو آشکار کر دیا کہ اسلام اور ہے۔ اور موجودہ مسلمانوں خصوصاً نام نہاد خلیفۃ المسلمین کا عمل و کردار اور؟ جسے اسلام کی تصویر سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اس طرح امام عالی مقام نے جام شہادت نوش کر کے قیامت تک اسلام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اور بنی امیہ کے چشم و چراغ یزید پلید کے ملحدانہ اعتقادات اور کافرانہ حرکات کو بالکل بے نقاب کر دیا۔ اب رائے عامہ اس قدر بیدار ضرور ہو گئی تھی کہ اگر یزید کے بعد بھی بنی امیہ یا بنی عباسیہ کی بعض خلافتوں کے دور میں ایسے قبیح و شنیع حرکات کا ارتکاب قصر ہائے حکومت میں کیا گیا ہے۔ تو ایک لمحہ کے لیے بھی مسلمانوں نے اسے اسلام نہیں سمجھا بلکہ یہی کہا ہے کہ اسلام اور ہے اور خلیفہ کا کردار اور؟

شہادت حسینؑ بقائے اسلام کی ضامن ہے

یزید کے عقائد و اعمال پر سرسری نظر کرنے سے (جن کا ایک معتد بہ حصہ گیارہویں باب میں ذکر ہو چکا ہے) یہ حقیقت بالکل کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یزید کا مقصد اسلام کو مٹانا اور اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر کے اس کی جگہ اپنے آبائی مذہب (کفر و شرک) کو دوبارہ رائج کرنے کے لیے زمین کا ہموار کرنا تھا جس کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا البتہ اب اس کی تکمیل امام حسینؑ سے بیعت لے کر کرنا چاہتا تھا تاکہ عام مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول ڈال سکے۔ اور ان کو بآسانی یہ باور کرا سکے کہ اگر اس کے نظریات اور حرکات و سکنات درست نہ ہوتے تو بانی اسلام کا جگر گوشہ، حسب و نسب میں یکتائے روزگار۔ اور اسلام کی مزاج شناسی میں وحید عصر اور اس کا سچا غمخوار کیوں کر اس کی

بیعت کرتا؟ امام علیہ السلام حقیقت حال سے آگاہ تھے۔ اس لیے انہوں نے زبان حال سے یہ کہہ کر کہ ؎

ان کان دین محمد لم یستقم　　　　الا بقتلی فیا سیوف خذینی

خندہ پیشانی سے جانگداز مصائب و آلام برداشت کرتے ہوئے بیعت یزید سے انکار کر دیا۔ اور آخری دم تک اس پر ثابت قدم رہ کر یزید کے عزائم مشئومہ کو خاک میں ملا دیا اور اس طرح اسلام کو ایک زندۂ جاوید حقیقت بنا دیا۔ حلال و حرام کے درمیان ابدی خط امتیاز کھینچ دیا۔ جائز و ناجائز کے حدود کو مضبوط کر دیا۔ اسلامی اصول و اقدار کو پائدار بنا دیا۔ عامۃ المسلمین کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ لوگوں کو ظالم سے نفرت اور مظلوم کی ہمدردی و حمایت پر آمادہ کر دیا۔ اس طرح کفر و الحاد کا ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر کے پرچم اسلام کو ابد الآباد تک کے لیے بلند و بالا کر دیا۔ لہٰذا آج جہاں جہاں اسلام اور مسلمان موجود ہیں۔ یہ سب شہادت حسینؑ کا صدقہ ہے ؎

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است　　　　پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

(اقبالؔ)

اگر شہادت حسینؑ نہ ہوتی تو آج نہ کوئی کلمۂ اسلام پڑھتا اور نہ ہی کوئی نماز و روزہ وغیرہ اسلامی شعائر پر عمل درآمد کرتا ؎

دیتے نہ سر حسینؑ تو پڑھتا نماز کون؟

مانا پڑتا ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے جو کچھ علائم و آثار موجود ہیں یہ سب کچھ امام حسینؑ کی شہادت کے طفیل ہے اس طرح وہ مسلمانوں کے محسن اعظم قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا بموجب ھل جزاء الاحسان الا الاحسان تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سرکار شہادت کی یادگار منانے اور ان کی مجالس عزا منعقد کرنے میں باہمی اشتراک عمل اور تعاون کا مظاہرہ کر کے اپنے اس محسن کے احسان کا بدلہ احسان سے دینے کی کوشش کریں۔ فان اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین۔

شہادت حسینؑ نے پورے عالم انسانیت کو ہلاکت ابدی سے بچالیا

اگر ذرا بنظر غائر تاریخی حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی شہادت عظمیٰ کے ذریعہ سے نہ صرف اسلام کو کفر و شر کی یلغار سے بچایا ہے بلکہ پورے عالم انسانیت کو ابدی ہلاکت و بربادی سے بھی بچایا ہے۔ ارباب عقل و خرد جانتے ہیں کہ انسان اور عام حیوان میں مابہ الامتیاز جوہر عقل ہی ہے چونکہ انسان میں یہ جوہر نفیس موجود ہے اس لیے وہ خیر و شر، حسن و قبح اور حلال و حرام میں تمیز کرتا ہے اور حیوان چونکہ اس گرانقدر عطیۂ الٰہی سے محروم ہے اس لیے وہ اپنی خورد و نوش اور حرکات و سکنات میں خوب و زشت اور حلال و حرام کی قید سے آزاد ہوتا

ہے اسے جو کھانے کی چیز مل جائے اس سے پیٹ بھر لیتا ہے پینے کی ہو تو اسے پی لیتا ہے اور جنسی تسکین مٹانے کی ہو تو اس سے اپنی اس خواہش کی تکمیل کر لیتا ہے۔ اس کی بلا سے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ اس کا یہ فعل عقلاء کی نظر میں ممدوح ہے یا مذموم؟ اور اس کی یہ حرکت حسن ہے یا قبیح؟ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جوہر عقل و خرد سے محروم ہے لیکن اگر انسان عقل کے باوجود اس سے کام نہ لے اور حیوان کی طرح مطلق العنان ہو کر بندۂ نفس اور غلام ہوا و ہوس بن جائے۔ اور خیر و شر کے پیمانے توڑ کر حلال و حرام کی حدود پھاند کر اور حسن و قبیح کی قیود سے آزاد ہو کر وحشیانہ حرکات کرنے لگے۔ تو پھر خالق کائنات کی نگاہ اشرف میں حیوانات سے بھی بدتر قرار پاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ (سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹) "جو لوگ عقل تو رکھتے ہیں مگر اس سے سوچتے ہیں نہیں۔ کان رکھتے تو ہیں مگر (حق کو) سنتے نہیں۔ آنکھیں تو رکھتے ہیں مگر (حق و حقیقت کو) دیکھتے نہیں وہ حیوانات کی مانند ہیں بلکہ اس سے بھی بدتر اور گمراہ تر۔" اب ذرا یزید کے نظریات اور اس کے اعمال کو پیش نظر رکھ کر (جو گیارھویں باب میں ذکر ہو چکے ہیں) تھوڑا سا غور کیجئے۔ تو آپ پر یہ حقیقت واضح و عیاں ہو جائے گی کہ یزید نہ صرف یہ کہ اسلام کا دشمن تھا اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ پورے عالم انسانیت کا جانی دشمن تھا۔ وہ اس کی ہلاکت و تباہی کے منصوبے بنا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ پینے کے سلسلہ میں پانی و شراب کا امتیاز ختم ہو جائے اور جنسی خواہش کی تکمیل کے سلسلہ میں ماں اور بہن کی قید ختم ہو جائے۔ (ملاحظہ ہو: تاریخ الخلفاء، ص ۱۳۶ وغیرہ) اور حصول مقصد میں صدق و کذب کے حدود ٹوٹ جائیں۔

ظاہر ہے کہ اگر یزید اپنے ان ناپاک اور مہلک انسانیت عزائم میں کامیاب ہو جاتا تو آج کم از کم کرۂ ارضی پر انسان تو ہوتے مگر ان کے اندر روح انسانیت نہ ہوتی۔ لہٰذا آج جو انسانوں میں انسانیت موجود ہے یہ شہادت حسینی کا فیض ہے۔ ان حقائق سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حسینؑ صرف "شہید تشیع" نہیں اور نہ فقط شہید اسلام ہیں بلکہ وہ "شہید انسانیت" ہیں ؎

انسانیت کے نام پہ کیا کر گئے حسینؑ　　　ہر دور کے بلند خیالوں سے پوچھ لو

چونکہ شہادت حسینؑ کے مقصد میں آفاقیت پائی جاتی ہے اس لیے اس کے آثار بھی عمومی اور ہمہ گیر ہیں جو لوگ خدا کو خدا نہیں جانتے اور رسول کو رسول نہیں مانتے۔ غرضیکہ جو اسلام کو دین خدا نہیں سمجھتے۔ وہ لوگ بھی بارگاہ حسینی میں اخلاص و عقیدت کے پھول نثار کرتے ہوئے اور ان کی محبت میں اشک غم بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں و لنعم ما قیل ؎

تو اپنے خون پاک کے چھینٹوں سے اے حسینؑ انسان کی شرافت خفتہ جگا گیا
اسلام کی کشش کا نہ جن پر اثر ہوا تو درد بن کے ان کے دلوں میں سما گیا

اگر اب تک بھی کوئی قوم حسینؑ کی بارگاہِ معلیٰ میں سرِ نیاز خم نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہنوز اس نے مقصد شہادت حسینؑ پر مکمل غور و فکر نہیں کیا۔ جب بھی وہ اس پر غور و تامل کرے گی تو پھر آغوش حسینیتؑ میں ہی اپنی نجات تصور کرے گی انشاء اللہ ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

مقصد شہادتِ حسینؑ خود امام حسینؑ کے کلام حقیقت ترجمان کی روشنی میں

حضرت امام حسین علیہ السلام کے مقصد شہادت پر سب سے زیادہ روشنی آپؑ کے اس وصیت نامہ سے پڑتی ہے جو آپؑ نے مدینہ سے روانگی کے وقت اپنے بھائی جناب محمد بن الحنفیہؒ کے نام لکھا تھا۔ اس میں آپؑ فرماتے ہیں:

﴿بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ھذا ما اوصٰی بہ الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ الٰی اخیہ محمد المعروف بابن الحنفیۃ ان الحسین یشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و ان محمداً صلی اللّٰہ علیہ و آلہٖ عبدہٗ و رسولہ جاء بالحق من عند الحق و ان الجنۃ و النار حق و ان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا و ان اللّٰہ یبعث من فی القبور و انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً و انما خرجت لطلب الاصلاح فی امۃ جدی صلی اللّٰہ علیہ و آلہٖ ارید ان آمر بالمعروف و انھی عن المنکر و اسیر بسیرۃ جدی و ابی علی بن ابی طالب علیہ السّلام فمن قبلنی بقبول الحق فاللّٰہ اولٰی بالحق و من ردّ علیّ ھذا اصبر حتّٰی یقضی اللّٰہ بینی و بین القوم بالحق وھو خیر الحاکمین و ھذہ وصیتی یا اخی الیک وما توفیقی الا باللّٰہ علیہ توکلت و الیہ انیب﴾۔[1] ”یہ وہ وصیت نامہ ہے جو حسین بن علیؑ نے اپنے بھائی محمد بن الحنفیہؒ کے نام لکھا ہے۔ حسینؑ گواہی دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ واحد ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ اس کے عبد خاص اور اس کے فرستادہ برحق رسول ہیں۔ اور یہ کہ جنت و جہنم برحق ہیں۔ اور قیامت بلاشک ضرور آئے گی اور خدا مردوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔ (اس کے بعد واضح ہو کہ) میں کسی قسم کا فساد پھیلانے یا غرور و تکبر کا اظہار کرنے یا سلطنت حاصل کرنے یا ظلم و ستم کرنے کے لیے نہیں نکل رہا بلکہ اپنے جد نامدار کی امت کی اصلاح کی خاطر نکل رہا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ معروف (نیکی) کا حکم دوں اور منکر (برائی) سے روکوں (جس میں پورے عالم انسانیت کی فلاح و بہبود ہے) اور اپنے

[1] نفس المہموم، ص ۳۸، طبع ایران۔ عاشر بحار، ص ۱۷۴،۱۷۵۔ مقتل مقرم، ص ۱۳۵۔ تاریخ، ج ۲، ص ۱۹۰ وغیرہ۔

جد نامدار اور پدر عالی وقار کی سیرت پر چلوں پس جو شخص مجھے برحق سمجھ کر قبول کرے گا (جو کہ سراسر حق ہے) تو حق تعالیٰ اس کے حق کو قبول کرنے میں اولیٰ ہے اور جو شخص میرا انکار کرے گا تو میں صبر کروں گا۔ یہاں تک کہ خداوند عالم جو بہترین حکم کرنے والا ہے میرے اور قوم (جفاکار) کے درمیان مناسب فیصلہ کرے۔ اے بھائی! یہ میرا وصیت نامہ ہے۔ خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں توفیق ہے۔ میں اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔''

ان مقاصد جلیلہ کے حصول کی خاطر حسین علیہ السلام نے اقدام جہاد فرمایا اور شہادت عظمیٰ کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوئے۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

کیا حسینؑ کا مدعا دنیاوی سلطنت و بادشاہی حاصل کرنا تھا؟

عام طور پر کوتاہ اندیش اور کور باطن لوگ یہ کہہ کر شہادت حسین علیہ السلام کی عظمت کو کم کرنے کی لاحاصل سعی کیا کرتے ہیں کہ حسینؑ و یزید عنید کی جنگ (معاذ اللہ) دنیاوی اقتدار اور سلطنت حاصل کرنے کی باہمی کشاکش کا نتیجہ تھی۔ ایسی بے جوڑ اور بے تکی بات وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جوہر عقل سے تہی دامن ہیں یا پھر انہوں نے اس جوہر سے کام لینے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس لیے حالات و اسباب اور ان کے نتائج سے آنکھیں بند کر کے روایت و درایت کے خلاف اس قسم کی بے سروپا باتیں کیا کرتے ہیں۔ ورنہ معمولی عقل و خرد دیدۂ بینا اور خداداد عدل و انصاف رکھنے والے حضرات بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا دعویٰ میں صداقت کا ایک شائبہ بھی نہیں ہے اگرچہ گزشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس زعم باطل کی نفی کے لیے کافی و وافی ہے۔ تاہم بفحوائے ؎

خوش تر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

یہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے کلام کی روشنی میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ موصوف اقدام و خروج حسینؑ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: «بلکہ بنابر تخلیص رعایا از دست ظالم بود و اعانة المظلوم علی الظالم من الواجبات و آنچہ در مشکوۃ ثابت است کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از بغی و خروج ہر بادشاہ وقت اگرچہ ظالم باشد منع فرمودہ اند پس در آن وقت است کہ آن بادشاہ ظالم بلا منازع و مزاحم تسلط تام پیدا کردہ باشد، و ہنوز اہل مدینہ و اہل مکہ و اہل کوفہ بہ تسلطِ یزید پلید راضی نشدہ بودند۔ و مثل حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ و عبد اللہ بن عباس و عبد اللہ بن عمر و عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بیعت نکردہ بالجملہ خروج حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ برائے دفع تسلطِ او بود نہ برائے رفع تسلّط و آنچہ در حدیث ممنوع است آن خروج است کہ برائے رفع تسلط

سلطان جائز باشد و الفرق بین الرفع و الدفع ظاهر مشهور فی المسائل الفقیهة [1]۔ یعنی ''امام حسین کا خروج اس لیے تھا کہ کمزور رعایا کو حاکم ظالم (یزید عنید) کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلائیں۔ ظاہر ہے کہ ظالم سے گلوخلاصی کرانے میں مظلوم کی امداد کرنا واجب ولازم ہے۔ مشکوٰۃ والی حدیث میں آنحضرتؐ نے بادشاہِ وقت پر اگرچہ ظالم و جائر بھی ہو۔ خروج کرنے کی جو ممانعت فرمائی ہے۔ تو یہ اس صورت میں ہے کہ جب وہ حاکم بلا روک ٹوک اور بلا مزاحم مکمل تسلط حاصل کر چکا ہو مگر یزید کو ہنوز ایسا تسلط حاصل نہ ہوا تھا کیونکہ ابھی تک حضرت امام حسینؓ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے اس کی بیعت نہیں کی تھی۔ نیز اہل مکہ و مدینہ اور اہل کوفہ بھی اس کے اس تسلط پر راضی نہ تھے۔ خلاصہ یہ کہ امام حسین علیہ السلام کا خروج اس لیے تھا کہ اس ظالم کا (مسلمانوں پر) کامل تسلط ہونے ہی نہ دیں۔ نہ یہ کہ اس کے حاصل شدہ تسلط کو اٹھائیں۔ حدیث میں جو منع وارد ہے وہ دوسری قسم (رفع تسلط) کی ہے۔ نہ پہلی قسم (دفع تسلط) کی۔ دفع اور رفع میں جو فرق ہے وہ فقہی مسائل میں مشہور و معروف ہے۔''

ظاہر ہے کہ امام علیہ السلام کے پاس یزید کے مقابلہ میں ظاہری ساز وسامان جنگ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لہٰذا اسے کسی طرح بھی دو بادشاہوں کی جنگ نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ایک ظالم و مظلوم کی جنگ تھی۔ حق و باطل کی جنگ تھی۔ کفر و اسلام کی جنگ تھی۔ الحاد و ایمان کی جنگ تھی۔ حسین علیہم ربانی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہوا اور وہ غالب بھی آ گئے تو یہی کہا جائے گا کہ دو بادشاہ لڑے تھے۔ ایک غالب آ گیا۔ اس طرح یزید تو مغلوب ہو جائے گا مگر یزیدیت کو شکست نہیں ہوگی۔ مگر حسین علیہ السلام تو یزیدیت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے حق کی طاقت سے مسلح ہو کر بے سروسامانی کی حالت میں یزید ایسے فرعون وقت سے ٹکر لے لی اور اس طرح حق و حقیقت کی طاقت سے قصرِ یزیدیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اہل عالم پر ظاہر کر دیا کہ یہ دو بادشاہوں کا محاربہ نہ تھا بلکہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ جس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لیے حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا ہو گیا ؂

مدعائش سلطنت بودے اگر خود نہ کردے با چنیں ساماں سفر

---

[1] فتاویٰ عزیزی، ج ۱، ص ۲۲۔

شہادتِ امام حسین علیہ السلام
پنجتن پاک علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں

جیسا کہ نویں باب میں پوری تفصیل کے ساتھ اس امر پر تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ سرکار السید الشہداء علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ کوئی اتفاقی و ناگہانی حادثہ نہ تھی بلکہ مسلسل و متواتر علل و اسباب کثیرہ کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح یہ امر بھی بکثرت اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ جناب خامس آل عبا علیہ افضل التحیہ والثنا بھی اپنی شہادت سے غافل نہ تھے بلکہ پوری طرح اس کے لیے تیار تھے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ، حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے آپ کو اس حادثۂ کبریٰ اور قیامت صغریٰ کی باعلام اللہ خبر دے رکھی تھی۔ اور آنجناب نے بھی مدینہ سے روانگی کے وقت اپنے وصیت نامہ میں اس کی وضاحت کر دی تھی۔ کتب سیر و تواریخ کی مزید ورق گردانی کرنے سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعۂ ہائلہ کی اطلاع رب العزت نے اپنے سابقہ انبیاء کو بھی دے دی تھی۔ اور انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو ان جانگداز واقعات کی خبر دے دی تھی۔ تفصیل میں جانے سے اختصار مانع ہے۔ البتہ خمسۂ نجباء علیہم السلام کی پیش گوئیوں کا ایک شمہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے عاشر بحار، دمعۂ ساکبہ اور ناسخ التواریخ وغیرہ کتب مبسوطہ کی مجلدات موجود ہیں۔

جناب رسول خداؐ کا شہادتِ حسینؑ کی خبر دینا

کامل الزیارۃ میں بسند خود حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو (ان کے بچپن کے وقت) گود میں لے کر کھلا ہنسا رہے تھے کہ عائشہ نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ اس بچے سے اس قدر مانوس کیوں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بھلا میں کیونکر اس سے محبت نہ کروں۔ اور مانوس نہ ہوں۔ جبکہ وہ میرے دل کا پھل اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ ﴿اما ان امتی ستقتله فمن زاره بعد وفاته کتب الله له حجة من حججی... الخ﴾ عنقریب میری امت ان کو شہید کرے گی پس جو شخص ان کی شہادت کے بعد ان کی زیارت کرے گا اس کو میری حجوں میں سے ایک حج کا ثواب ملے گا! عائشہ نے بطور تعجب پوچھا: آپ کی حجوں میں سے ایک حج کا ثواب؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں دو حجوں کا ثواب۔ اسی طرح عائشہ تعجب کرتی

گئیں اور آنحضرت ﷺ ہر بار ایک حج کا اضافہ کرتے گئے۔ ﴿حتیٰ بلغ تسعین حجۃ من حجج رسول اللہ باعمارھا﴾ یہاں تک کہ آپؑ نے عمروں سمیت نوے حجوں کا تذکرہ فرمایا۔[1] امالی شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں جناب امیر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: میں فاطمہ زہراؑ اور حسنؑ و حسینؑ جناب رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ یکایک آنحضرتؐ ہماری طرف دیکھ کر رونے لگے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کے رونے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا: ﴿ابکی مما یصنع بکم بعدی﴾ میں ان مصائب کی وجہ سے رو رہا ہوں جو میرے بعد تم پر ڈھائے جائیں گے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا کیا ہوگا؟ فرمایا: ﴿ابکی لضربتک علی القرق و لطم فاطمۃ خدھا و طعنۃ الحسنؑ فی الفخذوا السمّ الذی یسقی و قتل الحسینؑ﴾۔ میں تیرے سر مبارک پر ضربت کے لگنے۔ (جناب) فاطمہؑ کو طمانچہ لگنے۔ حسنؑ کی ران پر نیزہ لگنے۔ نیز ان کے زہر پلائے جانے اور حسینؑ کے شہید ہونے پر گریہ وبکا کر رہا ہوں۔[2]

قبل ازیں ولادت حسینؑ کے بیان میں بھی آپؑ کی شہادت کے متعلق آنحضرتؐ کے بعض اخبار شریفہ نقل کئے جا چکے ہیں۔ فراجع۔

حضرت امیر علیہ السلام کا شہادت حسینؑ کی خبر دینا

ایک دفعہ حضرت امیر علیہ السلام نے حسب معمول فرمایا: ﴿سلونی قبل ان تفقدونی﴾ بخدا مجھ سے جس ہدایت یا گمراہ کرنے والے گروہ کے متعلق دریافت کرو گے میں تمہیں بتادوں گا۔ سعد بن ابی وقاص نے اٹھ کر کہا: فرمایئے میرے سر اور ریش میں کس قدر بال ہیں؟ آنجنابؑ نے فرمایا: میرے خلیل جناب رسول خدا ﷺ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ تو مجھ سے یہ سوال کرے گا۔ اور یہ بھی بتایا تھا کہ تیرے ہر ہر بال کی جڑ کے پاس ایک شیطان چھپا ہوا ہے۔ ﴿وان فی بیتک لسخلاً یقتل ولدی الحسینؑ ابن بنت رسول اللہ انت و ولدک برلبان من الایمان﴾ اور تیرے گھر میں ایک بچہ موجود ہے جو میرے فرزند حسینؑ بن بنت رسول کو شہید کرے گا۔ تیرا اور تیرے اس بیٹے کا ایمان واسلام سے کوئی تعلق[3] اور واسطہ نہیں ہے۔

ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ صفین کی طرف جاتے ہوئے جب ہم ارض نینوا میں پہنچے تو حضرت علی علیہ السلام

---

[1] الدمعۃ الساکبۃ، ص ۲۸۴۔ مخفی نہ رہے کہ یہ ثواب ہائے بے پایاں اس صورت میں ملیں گے کہ جب زائر کے ذمہ کوئی واجبی حج نہ ہو۔ (منہ عفی عنہ)

[2] الدمعۃ الساکبۃ، ص ۲۸۴۔

[3] دمعۃ ساکبۃ، ص ۲۸۵۔

نے بآواز بلند فرمایا: ﴿یابن عباس اتعرف هذا الموضع؟﴾ اے ابن عباس کیا تم اس مقام کو پہچانتے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ آپؑ نے فرمایا: ﴿لو عرفته معرفتی لم تکن تجوزه حتی تبکی کبکائی﴾۔ اگر تم بھی میری طرح اس جگہ کو پہچانتے ہوتے تو میری مانند گریہ کئے بغیر یہاں سے نہ گزرتے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اس کے بعد ﴿فبکی طویلاً حتی اخضلت لحیتهٗ و سالت الدموع علی صدره فبکینا معه و هو یقول اوه اوه مالی ولآل ابی سفیان مالی ولآل حزب الشیطان و اولیاء الکفر صبراً ابا عبد اللّٰه فقد لقی ابوک مثل ما تلقی منهم... الخ﴾ جناب امیرؑ بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؑ کی ریش مبارک تر ہوگئی اور آنسو سینۂ اقدس پر بہنے لگے۔ ہم بھی رونے لگے۔ آپؑ ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے تھے ہائے ہائے آل ابی سفیان کو مجھ سے کیا بیر ہے؟ شیطانی گروہ اور صاحبان کفر کو مجھ سے کیا سروکار ہے؟ اے ابا عبداللہ! صبر سے کام لینا کیونکہ تیرے باپ نے بھی ان لوگوں سے ایسے ہی اذیتیں اٹھائی ہیں جیسی تمہیں پہنچیں گی۔[۱] (اس کے بعد جناب امیرؑ) نے واقعۂ شہادت کی تفصیل ابن عباس سے بیان فرمائی۔

کامل الزیارۃ میں ابوعبداللہ سے منقول ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار حضرت امیرؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ﴿و الحسینؑ الی جنبه فضرب بیده علی کتف الحسینؑ ثم قال ان هذا یقتل ولا ینصره احد﴾ اس وقت حسینؑ آپ کے پہلو میں تشریف فرما تھے۔ آپؑ نے اپنا ہاتھ حسینؑ کے کاندھے پر رکھتے ہوئے فرمایا: یہ شہید کیا جائے گا۔ اور کوئی اس کی نصرت نہیں کرے گا۔[۲] حضرت امیرؑ ابن ملجم ملعون کی ضربت سے زخمی ہوئے۔ تو جناب امام حسنؑ زار و قطار رونے لگے۔ اس وقت امیرؑ نے فرمایا: ﴿یا بنی الیوم تجزع علی ابیک! و غداً تقتل بعدی مسموماً مظلوماً و یقتل اخوک بالسیف هکذا و تلحقان بجد کما و ابیکما و امکما﴾ بیٹا حسنؑ! آج تو اپنے والد پر گریہ و بکا کر رہے ہو۔ حالانکہ کل تمہیں زہر جفا سے شہید کیا جائے گا اور اسی طرح تمہارے بھائی حسینؑ کو بھی تلوار ظلم سے شہید کیا جائے گا۔ اور تم دونوں اسی حالت میں اپنے نانا و بابا اور ماں کی خدمت میں پہنچو گے۔[۳]

امام حسن مجتبیٰؑ کا شہادت حسینؑ کی خبر دینا

شیخ صدوق علیہ الرحمہ اپنی کتاب امالی میں اپنے سلسلۂ سند سے جناب امام جعفر صادقؑ سے روایت

۱۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۸۵۔

۲۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۸۶۔

۳۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۶۔

کرتے ہیں کہ ﴿ان الحسین بن علی بن ابی طالبؑ دخل یوماً علی الحسنؑ فلمّا نظر الیه بکی فقال ما یبکیک یا ابا عبد اللّٰه. قال ابکی لما یصنع بک فقال الحسنؑ ان الذی یوتی الیّ سم یدس الیّ فاقتل به ولکن لا یوم کیومک یا ابا عبد اللّٰه یزدلف الیک ثلاثون الف رجل یدعون انهم من امّة جدّنا محمد صلّی اللّٰه علیه و اٰله و ینتحلون دین الاسلام فیجتمعون علی قتلک و سفک دمک و انتهاک حرمتک و سبی ذراریک و نساءک و انتهاب ثقلک فعندها تحلّ ببنی امیة اللعنة و تمطر السماء رماداً و دما و یبکی علیک کل شیٔ حتی الوحوش فی الفلوات و الحیتان فی البحار﴾

ایک مرتبہ جناب امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی حضرت امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رونے لگے۔ امام حسنؑ نے پوچھا: کیوں روتے ہو؟ عرض کیا: آپؑ کے ساتھ جو سلوک کیا جانے والا ہے اس پر رو رہا ہوں۔ امام حسنؑ نے فرمایا: میری طرف تو مخفی طور پر زہر بھیجا جائے گا جس کی وجہ سے میں شہید ہو جاؤں گا لیکن اے ابا عبداللہ! تیری مصیبت کی طرح کسی کی مصیبت نہیں۔ پورے تیس ہزار آدمی تیرے قتل کے لیے چڑھ آئیں گے۔ اور بایں ہمہ دعویٰ اسلام بھی کرتے ہوں گے۔ نیز ان کا یہ دعویٰ بھی ہوگا کہ وہ ہمارے جد نامدار کی امتی سے ہیں۔ یہ سب لوگ آپ کے قتل کرنے، خون بہانے، آپ کی ہتک حرمت کرنے، آپ کی مستورات کو قید کرنے اور آپ کا ساز و سامان لوٹنے کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت بنی امیہ پر لعنت نازل ہوگی۔ اور آسمان سے راکھ اور خون برسے گا۔ اور آپ کی مصیبت پر کائنات کی ہر چیز حتیٰ کہ جنگلوں کے وحشی جانور اور پانی کی مچھلیاں بھی روئیں گی۔[1]

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا شہادت حسینؑ پر مطلع ہونا

آیت مبارکہ ﴿وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡهِ اِحۡسَانًا ۔ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ کُرۡهًا وَّ وَضَعَتۡهُ کُرۡهًا ؕ وَ حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ... الاية﴾ کی تفسیر میں اصول کافی اور تفسیر برہان وغیرہ میں متعدد ایسی روایات موجود ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ نے جناب سیدۂ عالم سلام اللہ علیہا کو حسینؑ کے مصائب سے اس وقت باعلام اللہ آگاہ فرمایا تھا۔ جبکہ ہنوز جنابؑ حالت حمل میں بھی نہ آئے تھے۔ اس لیے جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ان مصائب و آلام پر گریہ و بکا فرماتی رہتی تھیں۔

خود امام حسین علیہ السلام کا اپنی شہادت کی خبر دینا

مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس امر میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ

---

[1] الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۸۶۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۳۶۔

حضرت امام حسینؑ کو اپنی شہادتِ عظمیٰ کا علم تھا۔ مزید برآں اس سلسلہ میں خود آپؑ کے بھی کئی فرامین ملتے ہیں۔
چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ﴿واللّٰہ لا یھنئنی بنو امیۃ حتیٰ یقتلونی وھم قاتلی... الخ﴾ بخدا بنی امیہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک مجھے قتل نہ کرلیں گے۔[1] امام محمد باقر علیہ السلام بیان فرماتے ہیں کہ جس وقت امام حسینؑ احرام حج توڑ کر عراق تشریف لے جانے لگے تو عبداللہ بن زبیر نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! آپ حج چھوڑ کر عراق جا رہے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: ﴿یابن زبیر لان ادفن بشاطئ الفرات احبّ الیّ من ان ادفن بفناء الکعبۃ﴾ اے ابن زبیر اگر میں (شہید ہوکر) فرات کے کنارے دفن کیا جاؤں۔ تو یہ امر مجھے کعبہ کی ڈیوڑھی میں دفن ہونے سے زیادہ محبوب ہے۔[2]

اسی طرح ثقۃ الاسلام کلینیؒ کی روایت کے مطابق آپؑ نے مدینہ سے تشریف لے جاتے وقت بنی ہاشم کے نام جو رقیمۂ کریمہ تحریر فرمایا تھا۔ اس میں بھی اس امر کی صراحت کر دی تھی۔ تحریر فرماتے ہیں: ﴿بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. من الحسین بن علی بن ابی طالب الی بنی ھاشم. اما بعد فانہ من لحق بی منکم استشھد و من تخلف لم یبلغ مبلغ الفتح و السلام﴾ کہ ”تم میں سے جو شخص میرے ساتھ جائے گا۔ وہ شہید ہو جائے گا۔ اور جو پیچھے رہ جائے گا۔ وہ بھی (ظاہری) فتح و نصرت حاصل نہیں کر سکے گا۔“[3]

ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ سانحہ کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے کوئی غیر متوقع واقعہ نہیں تھا بلکہ آپ کے ابتدائے عمر سے برابر اس واقعۂ ہائلہ کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ اور آپ پوری طرح اس کے لیے آمادہ و تیار تھے۔ چنانچہ وقت آنے پر آپؑ نے اس ثابت قدمی، راسخ الاعتقادی، صبر و ضبط اور ناقابل تسخیر عزم و ارادہ کا اظہار فرمایا کہ جس کی نظیر صفحۂ تاریخ پر نہیں مل سکتی۔ ﴿ولقد تعجبت من صبرک ملائکۃ السماء﴾ ”اے سرکارِ شہادت آپ کے صبر پر آسمان کے فرشتے تعجب کرتے ہیں۔“ سچ تو یہ ہے کہ ؎

از ہیچ پیغمبرے نیاید ایں کار
واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

---

[1] الدمعۃ الساکبہ، ص ۲۸۶۔
[2] دمعہ ساکبہ، ص ۲۸۶۔ اس میں اپنی شہادت بمقام کربلا اور ابن زبیر کے قتل بمقام کعبہ کی طرف صریح اشارہ موجود ہے۔ (منہ عفی عنہ)
[3] نفس المہموم، ص ۳۸۔ (عاشر بحار، ص ۱۷۵ وغیرہ)۔

﴿ چودھواں باب ﴾

یزید کی تخت نشینی اور حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت لینے پر اصرار اور امام علیہ السلام کا انکار

جیسا کہ قبل ازیں آٹھویں باب کے آخر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ معاویہ نے بنا بر مشہور نیمۂ رجب اور بقولے ۲۲ رجب ۶۰ھ میں عدم آباد کو چھوڑ کر اپنے اصلی مقام کی طرف کوچ کیا اور اسی تاریخ کو یزید عنید مسند حکومت پر متمکن ہوا۔ یزید عنید تخت خلافت پر متمکن ہونے سے قبل بھی نشۂ خمر سے تو مخمور رہتا ہی تھا مگر اب ظاہری اقتدار کے نشہ نے اسے بالکل ہی چُور چُور کر دیا تھا اور عیش و عشرت کے تمام اسباب و آلات کے موجود ہونے کے باوجود جو چیز اس کی رنگین زندگی کو منغص کر رہی تھی وہ تھی چند نامور شخصیتوں کا اس کی بیعت سے انکار۔ جن میں سرکار سید الشہداء سرفہرست تھے۔ اگرچہ معاویہ نے اپنی زندگی میں اپنی پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ کانٹا راستے سے ہٹ جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس خلش کو سینہ میں لے کر مر گیا۔ معاویہ ایک کہنہ مشق سیاست دان تھا۔ اس نے اس سلسلہ میں تشدد کرنا مصلحتِ وقت کے خلاف سمجھ کر سکوت اختیار کر لیا۔ البتہ آخری وقت یزید کو اس عظیم خطرہ کی طرف متوجہ ضرور کر گیا۔ جیسا کہ آٹھویں باب کے آخر میں اس امر کا تذکرہ کیا جا چکا ہے لیکن یزید میں یہ تدبر اور سیاست دانی کہاں؟ جوانی مستانی کے نشہ کو نشۂ شراب نے دو آتشہ اور نشۂ اقتدار نے سہ آتشہ کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اس روڑے کو راستے سے ہٹانے کا عملی اقدام کیا۔ اور جہاں دوسرے بڑے شہروں کے گورنروں [1] کو مرگِ معاویہ کی اطلاع دی۔ وہاں گورنر مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو اس اطلاع نامہ کے علاوہ ایک چھوٹا سا پرزہ ﴿کانها اذن فارة﴾ [2] اس مضمون کا لکھا۔ ﴿اما بعد فخذ حسیناً و عبد اللہ بن

---

[1] مخفی نہ رہے کہ اس وقت معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم ولید بن عتبہ بن ابی سفیان۔ مکہ کا عمرو بن سعید بن العاص الاشدق، کوفہ کا نعمان بن بشیر الانصاری اور بصرہ کا عبید اللہ بن زیاد تھا۔ (لتقام، ص ۲۱۷)۔

[2] لتقام، ص ۲۱۷۔

عمر و عبد الله بن الزبیر بالبیعة اخذاً شدیداً لیست فیه رخصة حتی یبایعوا والسلام ﴾۔ حسینؑ، عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر کو میری بیعت پر مجبور کرو اور جب تک بیعت نہ کر لیں انہیں ہرگز کوئی ڈھیل نہ دو۔[1] اور بعض اخبار و آثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یزید عنید نے ولید کو مزید لکھا: ﴿انفذ کتابی الیهم فمن لم یبایعک فانفذ الی براسه مع جواب کتابی هذا و السلام ﴾ یعنی ان کے سامنے میرا یہ خط پیش کرو۔ اور ان میں سے جو بھی بیعت کرنے سے انکار کرے اس کا سر قلم کر کے میرے اس خط کے جواب کے ہمراہ ارسال کر دو۔[2] ولید بن عتبہ اگرچہ خاندان بنی امیہ کا چشم و چراغ تھا مگر وہ ایسا سفاک نہ تھا کہ بے قصور لوگوں کا خون بہانے میں اسے لذت محسوس ہو۔ علاوہ بریں وہ حضرت امام حسینؑ کی باعظمت شخصیت سے متاثر بھی تھا۔ جب اس کے پاس یزید کا یہ تہدیدی و تاکیدی مکتوب پہنچا۔ تو وہ ڈر گیا اور ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ پڑھا۔ قتل حسینؑ کو سنگین جرم قرار دیتے ہوئے بولا: ﴿لا یرانی الله اقتل ابن بنت نبیه ولو جعل یزید لی الدنیا بما فیها﴾ خدا مجھے ہرگز اس حال میں نہیں دیکھے گا کہ میں اس کے نبی کی بیٹی کے بیٹے (حسینؑ) کو قتل کروں۔ اگرچہ یزید مجھے پورے روئے زمین کی سلطنت ہی کیوں نہ دے دے۔[3] بہرکیف ولید بہت ہی سراسیمہ اور پریشان ہوا۔ اور اس مشکل مرحلہ پر مروان ابن حکم کو (جس سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اور آمد و رفت کا سلسلہ منقطع تھا) مشورہ کے لیے طلب کیا۔ اور تمام صورت حال اس کے سامنے پیش کی۔ مروان نے کلمہ استرجاع (انا للہ) پڑھنے کے بعد معاویہ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اس کے بعد کہا: عبد اللہ بن عمر کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو کچھ خطرہ ہے وہ حسینؑ بن علیؑ اور عبد اللہ بن زبیر کی طرف سے ہے۔ لہٰذا مصلحت یہ ہے کہ معاویہ کی خبر مرگ مشہور ہونے سے پہلے پہلے اسی وقت ان دونوں کو بلا کر ان پر بیعت یزید پیش کرو۔ اگر کر لیں تو فبہا ورنہ ان کو قتل کر دو۔ دیکھو! اگر اسی وقت ایسا نہ کیا گیا اور مرگ معاویہ کی خبر مشہور ہو گئی تو پھر ان لوگوں کو مخالفت کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اور ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ ولید نے اسی وقت عبد اللہ بن عمرو بن عثمان کو (جو ایک نوجوان لڑکا تھا) بھیجا۔ کہ امام حسینؑ اور عبد اللہ بن زبیر کو بلا لائے۔ چنانچہ وہ ان کے گھر گیا۔ وہاں وہ موجود نہ تھے۔ معلوم ہوا کہ مسجد نبویؐ میں ہیں۔ وہاں پہنچا۔ دونوں حضرات وہاں موجود تھے۔ بیک وقت دونوں کو حاکم مدینہ کا پیغام پہنچایا کہ وہ اس وقت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا: تم جاؤ ہم تمہارے پیچھے آتے ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ یہ شب شنبہ ۲۷ رجب ۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس سے قبل اس طرح رات

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۱۸۸۔ عاشر بحار، ص ۱۷۳۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۵۳۔ مقتل، ص ۱۷ وغیرہ۔

[2] لہوف، ص ۱۸۔ عاشر بحار، ص ۱۷۲۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۵۳۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۱، ص ۱۷۸، ۱۸۰، طبع نجف۔

[3] عاشر بحار، ص ۱۷۳۔

کے وقت ولید کا دربار میں بیٹھنے اور لوگوں سے ملاقات کرنے کا معمول نہ تھا۔[1] اس خلاف معمول وقت میں ولید کے بلاوے نے عبداللہ بن زبیر کو چونکا دیا۔ حضرت امام حسینؑ کو خطاب کر کے کہنے لگے: ولید کے اس وقت ہمیں بلانے کا کیا سبب ہوسکتا ہے؟ حضرت سید الشہداءؑ نے فرمایا: میرا خیال یہ ہے کہ معاویہ مرگیا ہے اور اس کی جگہ یزید بیٹھ گیا ہے۔ ولید چاہتا ہے کہ اس کی خبر مرگ نشر ہونے سے پہلے ہم سے یزید کے لیے بیعت کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ میں نے گزشتہ رات خواب میں دیکھا ہے کہ معاویہ کا منبر سرنگوں ہے۔ اور اس کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔[2] (جس کی یہی تعبیر ہو سکتی ہے) عبداللہ بن زبیر نے کہا: اس وقت وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: میں دفاع کا انتظام کر کے جاؤں گا۔ پھر عبداللہ نے پوچھا: اگر ولید بیعت یزید کا مطالبہ کرے تو آپؑ کا کیا ارادہ ہے؟ آپؑ نے فرمایا: میں ہرگز یزید کی بیعت نہیں کروں گا کیونکہ ایک تو معاویہ نے میرے بھائی امام حسنؑ سے معاہدۂ صلح میں یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نہیں بنائے گا بلکہ آل رسول کا حق واپس حق داروں کو دے دے گا۔ ثانیاً یزید شرابخوار، لہو ولعب میں مشغول رہنے والا فاسق و فاجر ہے۔ رسول کا نواسہ (وارث مسند رسولؐ) ہرگز اس کی بیعت نہیں کر سکتا۔[3]

یہ دونوں حضرات یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ولید کا وہی آدمی دوبارہ بلانے کے لیے حاضر ہوا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: خواہ اور کوئی نہ آئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ پیغامبر نے واپس جا کر امام علیہ السلام کا پیغام دیا۔ مروان نے ولید سے کہا: حسینؑ نے تمہیں فریب دیا ہے وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔ ولید نے کہا: ایسا نہ کہو۔ حسینؑ مکر و خدعہ کرنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی وعدہ خلافی کرنے والے ہیں۔[4]

اس کے بعد امام علیہ السلام اپنے دولت سرا میں تشریف لے گئے اور اپنے حشم و خدم اور اہل خانوادہ کے نوجوانوں سے فرمایا کہ ولید نے اس وقت مجھے اپنے گھر بلایا ہے جو خطرے سے خالی نہیں ہے لہٰذا تم ہتھیار لگالو اور میرے ہمراہ چلو۔ میں اندر جاؤں گا اور تم دروازہ پر بیٹھ جانا۔ جب میری آواز بلند ہو۔ یا میں بلاؤں تو اندر چلے آنا۔ چنانچہ آپؑ ایک جماعت کو جن کی تعداد بروایتے[5] انیس (۱۹) اور بروایتے[6] تیس (۳۰) اور بروایتے[7] پچاس (۵۰) تھی، (مشہور تیس (۳۰) نفر ہی ہے) ہمراہ لے کر ولید کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت آپؑ کے ہاتھ میں

---

[1] طبری، ج ۲، ص ۱۸۹۔

[2] قمقام، ص ۲۱۸۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۴۴ بحوالہ مثیر الاحزان ابن نما، ص ۱۰۔

[3] قمقام، ص ۲۱۸۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۵۳۔

[4] ناسخ، ج ۶، ص ۱۸۳۔

[5] مناقب شہر بن آشوب، ج ۳، ص ۸۷۔

[6] لہوف سید ابن طاؤس، ص ۱۸۔

[7] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۵۳۔

رسول خدا ﷺ والی چھڑی[۱] تھی۔ اور پروگرام کے مطابق ہمراہیوں کو دروازہ پر کھڑا کر کے آپ تنہا اندر تشریف لے گئے۔ جب آپؑ اطمینان سے بیٹھ چکے تو ولید نے آپ کو موتِ معاویہ کی اطلاع دی۔ اور بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ امام عالی مقام نے کلمۂ استرجاع ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ زبان پر جاری فرمایا۔ اور بیعت کے متعلق یہ مجمل جواب دیا: ﴿ایها الامیر ان البیعة لا تکون سراً و لکن اذا دعوت الناس غداً فادعنا معهم﴾ بیعت پوشیدہ طریقہ پر نہیں ہوتی (اور نہ ہی تو اس پر راضی ہوگا) ہاں جب تو کل اور لوگوں کو بلائے تو ہمیں بھی بلانا۔"[۲] چونکہ ولید صلح جو قسم کا آدمی تھا۔ وہ امام علیہ السلام کا یہ نرم جواب سن کر خوش ہو گیا۔ اور کہا: بہت اچھا۔ ﴿انصرف اذا شئت علی اسم اللّٰه حتّٰی تاتینا مع جماعة الناس﴾ بنام خدا واپس تشریف لے جائیں اور پھر تمام لوگوں کے ساتھ آئیں۔"[۳]

ابھی امام علیہ السلام اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ مروان نے ولید سے کہا: اگر اس وقت حسینؑ بچ کر نکل گئے تو پھر جب تک طرفین کا بہت سا خون خراب نہ ہوا۔ اس وقت تک قابو میں نہ آئیں گے۔ اس لیے مصلحت یہ ہے کہ ﴿احبس الرجل فلا یخرج من عندک حتی یبایع او تضرب عنقه﴾ ان کو یہیں روکے رکھو۔ اور ہرگز یہاں سے نکلنے نہ پائیں۔ مگر یہ کہ بیعت کر لیں۔ یا پھر ان کی گردن اڑا دو۔[۴]

مروان کا یہ کلام نافرجام سن کر امام علیہ السلام غضب ناک ہو کر اٹھے اور فرمایا: ﴿یابن الزرقاء! انت تقتلنی ام هو کذبت و اللّٰه و اثمت﴾ او زرقاء[۵] کے بیٹے! کیا تم مجھے قتل کرو گے یا ولید؟ بخدا تو نے جھوٹ بولا اور گنہگار ہوا۔[۶]

اس کے بعد آپؑ نے ولید کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿ایها الامیر انا اهل بیت النبوّة و معدن الرسالة و مختلف الملائکة و بنا فتح اللّٰه و بنا ختم اللّٰه و یزید رجل فاسق شارب الخمر قاتل النفس المحرمة معلن بالفسق و مثلی لا یبایع مثله و لکن نصبح و تصبحون و ننظر و تنظرون اینا احق

۱۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۳۶۔

۲۔ لہوف، ص ۱۸۔

۳۔ نفس المہموم، ص ۳۳۔ تاریخ، ج ۶، ص ۱۵۵۔

۴۔ نفس المہموم، ص ۳۳۔ تاریخ، ج ۶، ص ۱۵۵۔ تمام، ص ۲۱۹۔ لہوف، ص ۱۸ وغیرہ۔

۵۔ زرقاء مروان کی دادی تھی۔ اور عرب کی مشہور زانیہ اور فاحشہ عورت تھی۔ ملاحظہ ہو: کامل ابن اثیر، ج ۴، ص ۷۵۔ اداب السلطان للفخری، ص ۸۸۔ تذکرہ سبط بن الجوزی، ص ۲۲۹، طبع ایران۔

۶۔ طبری، ج ۶، ص ۱۸۹۔ ارشاد شیخ مفیدؒ، ص ۱۸۰۔ تمام، ص ۲۱۹۔ تاریخ، ج ۶، ص ۱۵۵۔

بالخلافة و البیعة ﴾ اے امیر! ہم اہل بیت نبوت اور رسالت کی کان ہیں۔ ہمارا گھر ملائکہ کی آمد و رفت کی آماجگاہ ہے۔ خدا نے ہم سے خلقت کی ابتداء کی اور ہم پر ہی اختتام کرے گا۔ یزید فاسق و فاجر، شارب خمر اور ظالم و قاتل اور متجاہر بالفسق ہے۔ مجھ ایسا (پاکباز انسان) ایسے (ننگ انسانیت) شخص کی ہرگز بیعت نہیں کر سکتا۔ البتہ جب صبح ہوگی۔ تو ہم تم دیکھیں گے۔ کہ کون زیادہ حقدار خلافت و بیعت ہے؟"[۱] حسینؑ جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوت برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پر پہنچ گیا۔ مگر حسینؑ کے صبر و برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی۔ وہ اپنی بات پر آخر تک قائم رہے۔ اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو انہوں نے پہلے دن طے کیا تھا۔[۲]

بہر حال جب مروان کے ساتھ مذکورہ بالا گفتگو کرتے وقت امام علیہ السلام کی آواز بلند ہوئی تو آپ کے دروازہ پر مقرر کردہ آدمی خنجر و شمشیر بکف ہو کر اندر گھس آئے۔ اس وقت جناب سید الشہداءؑ اٹھے اور اپنے آدمیوں کے ہمراہ واپس اپنے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔[۳]

آپ کے چلے جانے کے بعد مروان نے ولید سے کہا: اے امیر! تو نے میرے مشورہ کی مخالفت کی ہے۔ اب تم ہرگز حسینؑ پر قابو نہ پا سکو گے۔ ولید نے جواباً اس کی زجر و توبیخ کرتے ہوئے کہا: ﴿ویحک یا مروان انک اخترت لی التی فیھا ھلاک دینی و دنیای و اللّٰہ ما احب ان لی ما طلعت علیه الشمس و غربت منه من مال الدنیا و ملکھا و انی قتلت حسیناً۔ سبحان اللّٰہ اقتل حسیناً ان قال لا ابایع و اللّٰہ انی لا ظن ان امرءً یحاسب بدم الحسین خفیف المیزان عند اللّٰہ یوم القیامة لا ینظر اللّٰہ الیه ولا یزکیه وله عذاب الیم﴾۔ "اے مروان! افسوس ہے تم پر۔ تم نے مجھے ایسے امر میں مبتلا کرنا چاہا جس میں میرے دین و دنیا کی ہلاکت پوشیدہ ہے۔ بخدا! اگر مجھے (قتل حسینؑ کے عوض) تمام روئے زمین کی دولت بھی عطا کر دی جائے تب بھی میں قتل حسینؑ کو پسند نہ کروں گا۔ سبحان اللہ کیا میں محض اس بات پر حسینؑ کو قتل کر دوں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں (یزید) کی بیعت نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ جس شخص کا خون حسینؑ کے متعلق حساب لیا گیا اس کا میزان اعمال بروز قیامت خدا کے نزدیک بہت ہی خفیف ہوگا۔ نہ خدا اس کی طرف نظر رحمت کرے گا۔ اور نہ ہی اس کا تزکیہ

---

۱ لہوف، ص ۱۹۔ مقتل مقرم، ص ۲۱۹۔ تاریخ، ج ۶، ص ۱۵۵۔ الدمعة الساکبة، ص ۳۰۵۔

۲ شہید انسانیت، ص ۲۰۹۔

۳ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۳، ص ۸۷۔ تاریخ، ج ۲، ص ۱۵۵۔

(اعمال) کرے گا۔ اور اس کے لیے دردناک عذاب[1] ہوگا۔ مروان نے بھی مصلحتِ وقت کے تحت یہ کہہ دیا کہ ہاں تم نے اچھا کیا ہے۔ آپ کی رائے درست ہے۔"

یہاں اجمالاً یہ بیان کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں کہ امام حسین علیہ السلام تو حسب وعدہ ولید کے پاس چلے گئے مگر عبداللہ بن زبیر مسجد نبویؐ سے نکلا اور سیدھا گھر پہنچا اور چھپ کر بیٹھ گیا۔ ولید نے اس کے بلانے کے لیے کئی بار اپنے آدمی بھیجے مگر اس نے حاضر ہونے میں پس و پیش کیا۔ حتیٰ کہ طرفین سے گالم گلوچ تک نوبت پہنچی۔ بالآخر عبداللہ نے اپنے بھائی جعفر بن زبیر کو ولید کے پاس بھیج کر صبح تک مہلت لی۔ مہلت تو مل گئی مگر عبداللہ بن زبیر اپنے بھائی جعفر کے ہمراہ اسی رات (شب شنبہ، ۲۷ رجب ۶۰ھ) کو غیر معروف راستہ سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب صبح ہوئی اور ولید کو حقیقت حال کی اطلاع دی گئی تو اس نے غلامان بنی امیہ میں سے ایک غلام کی نگرانی میں اسی (۸۰) سوار ابن زبیر کی تلاش میں بھیجے جو شام تک ڈھونڈنے کے بعد ناکام واپس لوٹ آئے۔[2]

امام حسین علیہ السلام قبر رسولؐ پر

دربار ولید سے واپسی کے بعد حضرت سید الشہداء علیہ السلام نصف شب کے قریب اپنے جد نامدارؐ کے مقدس مزار پر حاضر ہوئے۔ جیسا کہ جناب سید محمد بن ابی طالب الحسینی الحائری نے اپنی کتاب تسلیۃ المجالس وزینۃ المجالس میں لکھا ہے۔ اور اس سے علامہ مجلسیؒ اور صاحب ناسخ و مقتام وغیرہم نے نقل کیا ہے۔ قبر مبارک سے ایک نور ساطع ہوا۔ امام حسینؑ نے عرض کیا: ﴿السلام علیک یا رسول اللّٰہ انا الحسینؑ بن فاطمۃؑ فرخک و ابن فرختک و سبطک الذی خلفتنی فی امتک فاشہد علیہم یا نبی اللّٰہ. انہم قد خذلونی و ضیعونی ولم یحفظونی فہذہ شکوائی الیک حتی القاک﴾ اے رسولؐ خدا! آپؐ پر سلام ہو۔ میں حسینؑ بن فاطمہؑ ہوں۔ میں تیرا بیٹا اور تیری بیٹی کا بیٹا ہوں۔ میں تیرا وہی نواسہ ہوں۔ جسے تو اپنی امت میں (بطور امانت و یادگار) چھوڑ گئے تھے۔ اے پیغمبرؐ خدا! ان لوگوں پر گواہ رہنا کہ انہوں نے میری نصرت نہیں کی۔ اور میری منزلت ضائع کی۔ اور حقوق کی حفاظت نہیں کی۔ آپ کی بارگاہ میں میری یہ شکایت ہے حتیٰ کہ آپؐ سے ملاقات کروں" (یعنی اس وقت باقی تفصیلات عرض کروں گا) اسی طرح اس رات صبح تک وہیں نماز و مناجات میں مشغول رہے۔[3]

بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شب ولید نے کسی آدمی کو امام حسین علیہ السلام کے حالات کی تحقیق و جستجو

---

[1] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۵۵۔ مقتل الحسین للمقرمؒ، ص ۱۲۸۔ مقتام، ص ۲۱۹ وغیرہ۔

[2] ارشاد شیخ مفیدؒ، ص ۱۸۰۔ تنقیح مقیر۔ نفس المہموم، ص ۳۵۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۵۷۔ عاشر بحار، ص ۱۷۴۔

[3] عاشر بحار، ص ۱۷۲۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۰۵۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۵۸۔ مقتام، ص ۲۲۱۔ نفس المہموم، ص ۳۰۱۔ مقتل القوام، ص ۵۳۔

کے لیے بھیجا۔ جب اس نے واپس جا کر ولید کو اطلاع دی کہ حسینؑ گھر میں نہیں ہیں۔ تو ولید نے سمجھا کہ شاید حسینؑ مدینہ چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس لیے اس نے خوش ہو کر کہا: ﴿الحمد للہ الذی خرج ولم یبتلنی بدمه﴾ خدا کا شکر ہے کہ حسینؑ کہیں چلے گئے اور خدا نے مجھے ان کے خون میں مبتلا نہیں کیا۔ جب صبح ہوئی تو سرکار سید الشہداؑ اپنے دولت کدہ پر واپس تشریف لائے۔[1]

امام علیہ السلام دوسرے دن (۲۷ رجب ۶۰ھ کو) اس غرض سے باہر تشریف لائے کہ حالات حاضرہ کا جائزہ لیں۔ راستہ میں مروان بن حکم سے ملاقات ہوئی۔ مروان نے آپؑ سے کہا: میں آپ کو ایک ایسی نصیحت کرتا ہوں جس میں آپؑ کا دینی اور دنیاوی فائدہ ہے۔ آپ نے فرمایا: کہو کیا کہتے ہو؟ کہا: یزید کی بیعت کر لو۔ حضرت امام حسینؑ نے اس ملعون کا یہ ناہنجار کلام سن کر فرمایا: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ و علی الاسلام السلام اذ بلیت براع مثل یزید و لقد سمعت جدی رسول اللہ صلی اللہ و آلہ الخلافة محرّمة علی ال ابی سفیان[2] فاذا رأیتم معاویة علی منبری فابقروا بطنه و قد راه اهل المدینة علی منبره فلم یبقروا فابتلاهم بیزید الفاسق[3] ... الخ ...﴾ "انا للہ..... اب اسلام پر الوداعی سلام ہے۔ (کہ وہ مسلمانوں سے رخصت ہو رہا ہے) کیونکہ اب امت رسولؐ کو یزید ایسے حاکم کے ساتھ جکڑا گیا ہے۔ میں نے اپنے جد نامدارؐ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ آل ابی سفیان پر خلافت حرام ہے۔ جب معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اس کا پیٹ چاک کر دینا مگر اہل مدینہ نے معاویہ کو آنحضرتؐ کے منبر پر دیکھا اور (فرمان رسول کو پس پشت ڈال کر) اس کا پیٹ چاک نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج خدا نے انہیں یزید ایسے فاسق حاکم کی حکومت کے ساتھ مبتلا کر دیا ہے۔ الخ۔۔۔۔۔ اسی قسم کی باہمی تلخ کلامی ہوئی اور مروان ناراض ہو کر چلا گیا۔ اسی روز (۲۷ رجب بروز شنبہ) عصر کے وقت ولید نے بیعت کے لیے کچھ آدمی حضرت امام حسینؑ کو بلانے کے لیے بھیجے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اصبحوا ثم ترون و نرى﴾ یہ رات گزرنے دو۔ اور صبح ہو لینے دو۔ پھر تم بھی غور کر لینا اور ہم بھی سوچ لیں گے۔" چنانچہ پھر ولید نے کوئی اصرار نہ کیا۔ اور امام عالی مقام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑنے کی حکمتیں

اب امام عالی مقام نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اب مدینہ میں مزید قیام کرنا مصلحت وقت کے خلاف ہے کیونکہ

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۳۷۔ الدمعة الساکبہ، ص ۳۰۵۔ تاریخ، ج ۶، ص ۱۵۸۔ تمام، ص ۲۲۱۔ نفس المہموم، ص ۳۶۔ مقتل العوالم، ص ۵۳۔

[2] لہوف سید بن طاؤس، ص ۲۰۔ الدمعة الساکبہ، ص ۳۰۵۔

[3] مقتل الحسین خوارزمی، ج ۱، ص ۱۸۵۔

اب یہ خطرہ یقینی حد تک پہنچ چکا تھا کہ اگر ولید نے یزید کے تہدیدی حکم کی تعمیل میں کچھ دیر پس و پیش بھی کیا۔ تو اسے معزول کر کے مروان بن حکم جیسے کسی دشمن خاندانِ رسولؐ کو گورنر بنا دیا جائے گا۔ اور انکار بیعت کی صورت میں خون امام سے زمین مدینہ رنگین کر دی جائے گی۔ مگر حسینؑ مدینہ رسولؐ کی یہ توہین ہرگز برداشت نہ کر سکتے تھے۔

اس صورت میں اہل مدینہ سے یہ توقع بھی نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ نواسہ رسولؐ کی حفاظت و حراست کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دیں گے کیونکہ امام حسینؑ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ وفات پیغمبرؐ کے بعد اسی مدینہ میں ان کی مادر گرامی حضرت فاطمہ زہراؑ پر مصائب و شدائد کے پہاڑ ڈھائے گئے تھے۔ اسی مدینہ میں ان کے عظیم والد حضرت علی بن ابی طالبؑ کو قریباً پچیس سال تک خانہ نشین کیا گیا تھا۔ اور حد یہ تھی کہ اسی مدینہ میں ان کے برادر معظم حضرت امام حسنؑ کے جنازہ پر تیر برسائے گئے تھے اور کسی مسلمان کی رگِ حمیت نہ پھڑکی تھی۔ ان حالات میں مدینہ والوں پر آپؑ کس طرح اعتماد کر سکتے تھے؟ نیز اگر جناب امام حسینؑ کی شہادت مدینہ میں واقع ہوتی۔ تو اسے وہ اہمیت ہرگز حاصل نہ ہو سکتی۔ جو اسے کربلا کے میدان میں حاصل ہوئی۔ بہرحال اب عقل و تدبر کا یہی تقاضا تھا کہ مدینہ میں مزید قیام نہ کیا جائے۔ اور سفر کربلا کی پہلی منزل (مکہ مکرمہ) کی طرف رخت سفر باندھ کر کوچ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکیم ربانی نے ایسا ہی کیا۔ اب ۲۸ رجب ۶۰ھ کی شام ہو چکی تھی۔ آپ نے اس رات کا اکثر حصہ سفر کی تیاری اور اپنے جد نامدارؐ و برادر والا تبار اور مادر عالی وقار کے مزارات عالیہ سے رخصت ہونے میں بسر کی۔ چنانچہ اس شب اپنے جد نامدارؐ کے مزار اقدس کے پاس گئے۔ چند رکعت نماز پڑھی۔ پھر بارگاہ ایزدی میں یوں مناجات کی: ﴿اللّٰھم ان ھذا قبر نبیک محمدؐ و انا ابن بنت نبیک وقد حضرلی من الامر ما قد علمت اللّٰھم انی احب الامر بالمعروف و انکر المنکر و اسئلک یا ذا الجلال و الاکرام بحق القبر و من فیہ الا اخترت لی ما ھو لک رضیً و لرسولک رضی﴾ ''خداوندا! یہ تیرے نبی محمدؐ کی قبر ہے۔ اور میں تیرے نبی کی دختر کا فرزند ہوں۔ میں جن حالات سے دوچار ہوں تو ان سے واقف ہے۔ بار الہا! میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کو دوست رکھتا ہوں۔ اور اے ذوالجلال والاکرام! میں تجھ سے اس قبر اور اس کے صاحب کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ میرے لیے وہ طریقہ کار اختیار فرما جس میں تیری اور تیرے رسولؐ کی رضامندی ہو۔'' اس کے بعد آپؑ بہت روئے۔

جب رات کا کافی حصہ گزر گیا۔ تو آپؑ نے قبر رسولؐ پر سر رکھا اور تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ اس وقت عالم رویاء میں دیکھا کہ جناب رسول خداؐ ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ جو آپؐ کے دائیں بائیں ہیں، تشریف لائے ہیں۔ اور آکر ان کو سینہ سے لگایا ہے اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دے کر فرماتے ہیں: ﴿حبیبی یا

حسینؑ کانی اراک عن قریب مرملا بدمائک مذبوحاً بارض کربلا بین عصابة من امتی و انت مع ذلک عطشان و ظمآن لا تروی وھم بعد ذلک یرجون شفاعتی لا انا لھم اللہ شفاعتی یوم القیامة حبیبی! یا حسینؑ! ان اباک و امک و اخاک قدموا علّی وھم مشتاقون الیک ﴾ میرے حبیب حسینؑ! گویا میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ عنقریب تم خاک وخون میں غلطاں ہوگے اور میری امت کے چند افراد کے ہمراہ زمین کربلا میں (ظلم وجور سے) ذبح کیے جاؤ گے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تم پیاسے بھی ہوگے۔ مگر تمہیں پانی نہیں پلایا جائے گا۔ اور (نابکار قاتل) اس کے باوجود میری شفاعت کے امیدوار بھی ہوں گے۔ خدا ہرگز بروز قیامت انہیں میری شفاعت نصیب نہیں کرے گا۔

میرے حبیب حسینؑ! تمہارے والدؑ، والدہؑ اور بھائیؑ میرے پاس پہنچ چکے ہیں اور وہ سب تمہارے مشتاق ہیں۔"

اس وقت اسی حالت خواب میں امام حسین علیہ السلام روئے اور اپنے جدامجدؐ سے عرض کیا: ﴿یا جداہ لا حاجة لی فی الرجوع الی الدنیا خخذنی الیک و ادخلنی فی قبرک ﴾ اے جد نامدارؐ مجھے دنیا میں جانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ مجھے یہیں اپنے ہمراہ قبر میں جگہ دے دیجیے مگر آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿لا بد لک من الرجوع الی الدنیا حتی ترزق الشھادة لیکون لک ما کتب اللہ لک فیھا من الثواب العظیم فانک و اباک و اخاک و عمک و عم ابیک تحشرون یوم القیامة فی زمرة واحدة حتی تدخلوا الجنة ﴾ نہیں بیٹا! تمہارے لیے دنیا میں رجوع کرنا ضروری ہے تاکہ شہادت پاکر وہ ثواب عظیم حاصل کرو جو خدائے کریم نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے۔ کیونکہ تم اور تمہارے والد، بھائی اور تمہارے والد کے چچا (جناب حمزہؑ) سب بروز حشر ایک ہی زمرہ میں محشور ہوکر داخل جنت ہوگے۔ اس کے بعد امام علیہ السلام گھبرا کر خواب سے بیدار ہوگئے۔[1]

بعدازاں اپنی مادر گرامی کی قبر اقدس پر گئے۔ ان سے الوداع کیا۔ پھر اپنے بھائی امام حسنؑ کی قبر مبارک پر گئے۔ ان سے الوداع کیا۔ پھر گھر تشریف لائے۔ اہل خانہ کو اپنا خواب والا ماجرا سنایا۔ سب اہل خانہ دل کھول کر روئے اور اس رات اہل بیت رسولؐ سے زیادہ اور کوئی شخص محزون ومکروب نہ[2] تھا۔

منھم من قضٰی نحبہٗ و منھم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلاً

---

[1] مقتل عوالم، ص ۵۴۔ عاشر بحار، ص ۱۷۴۔ ناسخ، ج ۶، ص ۱۵۹۔ الدمعة الساکبہ، ص ۳۰۵۔ نفس المہموم، ص ۳۷۔

[2] مذکورہ بالا حوالہ جات۔

پندرھواں باب

حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت

جناب امام حسین علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی کی تاریخ میں قدرے اختلاف ہے۔ حضرت سید ابن طاؤسؒ اور صاحب منتخب وغیرہ بعض حضرات نے سیوم شعبان ۶۰ھ بیان کی ہے لیکن جمہور مورخین و محققین کے نزدیک آپؑ نے شب یکشنبہ اٹھائیسویں رجب ۶۰ھ کو ہجرت فرمائی۔ جناب امام حسینؑ اپنے جد امجدؐ، مادرؑ عالی قدر اور برادر معظم جناب امام حسنؑ کے مزارات عالیہ سے الوداعی سلام کرنے کے بعد جب واپس گھر تشریف لائے تو ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا۔ کہ آپؑ نے رخت سفر باندھ کر تاریکیٔ شب کے پردہ میں مخدرات عصمت وطہارت کو ہمراہ لے کر مکہ مکرمہ کی راہ اختیار فرمائی۔ حضرت ابوطالبؑ کی قریباً تمام اولاد ذکور واناث کو اپنے ہمراہ لیا جس میں سوائے جناب محمد بن حنفیہ اور بعض دوسرے افراد کے جناب کی دونوں بہنیں حضرت زینب وحضرت ام کلثوم ۔۔۔۔ اپنے بیٹے، بھتیجے اور بھانجے شامل تھے۔ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے اپنے رسالہ شریفہ النہضۃ الحسینیہ میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ حسینؑ بیان کرنے والے عموماً یہی کہا کرتے ہیں کہ سید الشہداءؑ کی زندگی کی تمام راتوں میں سے شب عاشورا زیادہ سخت دشوار رات تھی جس میں آپؑ مع اپنے اہل خانوادہ کے ایک لق ودق اور بے آب وگیاہ صحراء میں نرغۂ اعداء میں گھر گئے تھے اور ان پر اس طرح عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا کہ پینے کا پانی بھی بند ہو چکا تھا۔ مگر بعید نہیں کہ ولید بن عتبہ کے دربار سے واپسی (اور پھر مدینہ سے روانگی) والی شب سب سے زیادہ سخت رات ہو جبکہ امام حسینؑ نہایت ہی سراسیمہ و پریشان تھے۔ کہ وہ ظالموں کے ساتھ کیا روش ورفتار اختیار کریں۔ کیا یزید کی بیعت کر لیں؟ یہ محال ہے! کیا اپنے جد نامدارؐ کے حرم (مدینہ) میں قیام پذیر رہیں؟ اس طرح دشمن بآسانی ان کا استیصال کر دے گا! کیا جائے امن مکہ کی طرف ہجرت کر جائیں؟ لیکن یہ سفر تنہا اختیار کریں۔ یا کثیر العدد کنبہ وقبیلہ کے ساتھ؟ اہل وعیال کے ساتھ سفر اور وہ بھی مکہ کا دشوار گزار راستہ۔ کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ تھا حسینؑ کا مسلسل فکری جہاد اور عقلی الم جو برابر جاری تھا۔ بالآخر امامؑ نے آخری صورت کو عملی جامہ پہنانا ہی مناسب سمجھا۔[1] آج امام حسینؑ مدینہ سے مکہ

---

[1] النہضۃ الحسینیہ، ص ۲۲ طبع نجف۔

کی طرف جو ہجرت اختیار فرما رہے تھے۔ وہ آج سے ٹھیک ساٹھ برس پہلے ان کے جد امجد حضرت رسول خدا ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے ساتھ انتہائی مشابہت رکھتی تھی۔ اس وقت آنحضرتؐ نے ابوسفیان کی شرارتوں سے تنگ آ کر ہجرت کی تھی۔ اور آج حسینؑ ابوسفیان کے پوتے یزید کی فرعونی کارروائیوں کی وجہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ہجرت رسولؐ کے کچھ عرصہ بعد یعنی فتح مکہ کے بعد ابوسفیان کی شیطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح شہادت حسینؑ کے کچھ عرصہ بعد سلطنت بنی امیہ کو بھی بالکل زوال آ گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ عام انسانی فطرت کے مطابق (کہ انسان وطن چھوڑتے وقت وطن کی ہر پسندیدہ چیز حتیٰ کہ اس کے آب و گیاہ اور خاک و باد سے بھی وداع کرتا ہے اور ان پر حسرت و یاس کی نگاہیں ڈالتا ہے)۔ آنحضرتؐ مکہ سے روانہ ہوتے وقت مڑ مڑ کر مکہ کے در و دیوار پر نگاہ ڈالتے جاتے تھے[1] حتیٰ کہ خداوند عالم کو تسلی دینا پڑی۔ ﴿ان الذی فرض علیک القران لرادک الی معاد﴾ (پ ۲۰، سورۃ القصص، ع ۱۲) اے رسولؐ! خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا ضرور تمہیں ٹھکانے تک پہنچا دے گا۔

اسی طرح جب حسینؑ مدینۂ رسولؐ سے نہایت مظلومیت کے عالم میں روانہ ہونے لگے تو ہر ہر چیز پر مایوسانہ نگاہ ڈالتے اور بار بار اپنے جد نامدار اور دوسرے بزرگوں سے وداع کرتے۔ چنانچہ قبل ازیں دو بار جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے آپ کے وداع کرنے کا تذکرہ ہو چکا ہے مگر بعض آثار و اخبار سے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ جب جناب امام حسینؑ کا یہ مختصر سا قافلہ روانہ ہو رہا تھا تو اس وقت بھی آپؑ روضۂ رسولؐ پر آخری سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ اور نہایت حسرت و یاس کے لہجہ میں عرض کیا: ﴿یا رسول اللہ بابی انت و امی لقد خرجت من جوارک کرھاً و فرق بینی و بینک و اخذت بالانف قھراً ان ابایع یزید بن معاویۃ شارب الخمر و راکب الفجور فان فعلت کفرت و ان ابیت قتلت فھا انا خارج من جوارک علی الکرہ فعلیک منی السلام یا رسول اللہ﴾ ”یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ میں مجبور ہو کر آپؐ کے جوار سے نکل رہا ہوں۔ میرے اور آپ کے درمیان (بہ ظاہر) جدائی ڈال دی گئی ہے۔ مجھے مجبور کیا جا رہا ہے کہ میں یزید بن معاویہ شارب خمر، فاسق و فاجر کی بیعت کروں۔ ظاہر ہے کہ اگر میں اس کی بیعت کرتا ہوں تو کافر ہوتا ہوں۔ اور اگر انکار کرتا ہوں تو قتل ہوتا ہوں۔ بہر کیف میں بامر مجبوری آپ کے جوار (پُر انوار) سے نکل رہا ہوں۔ یا رسول اللہؐ میری طرف سے آپؐ پر سلام ہو۔“[2]

---

[1] حاشیہ ترجمہ فرمانؒ، ص ۴۳۱

[2] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۶۳۔

ہاں ہجرت رسولؐ اور ہجرت امامؑ میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو جناب رسولؐ خدا کو کچھ عرصہ کے بعد مظفر و منصور ہو کر فاتحانہ شان سے اپنے وطن واپس لوٹنے کا یقین تھا مگر حسینؑ کو اپنی اور اپنے اعزاد احباب کی شہادت کا یقین تھا۔ دوسرے یہ کہ جناب رسول خداﷺ ہجرت کے وقت تنہا تھے مگر حسینؑ کے ساتھ مخدرات عصمت و طہارت بھی تھیں ؎

لا اضحک اللّٰہ سن الدھر ان ضحکت   و ال احمدؐ مظلومون قد قھروا

مشردون نفوا عن عقر دارھم   کانھم جنوا ما لیس یغتفر

جناب محمد بن حنفیہ اور امام عالی مقام کے درمیان مکالمہ

ارباب سیر و تواریخ کی نگارشات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مظلوم کی روانگی سے قبل بعض حضرات و خواتین نے اپنی اپنی عقل و فکر کے مطابق امام عالی مقام کو مختلف مشورے دیئے مگر یہ عجیب بات ہے کہ آپ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ مدینہ کو نہ چھوڑیں۔ یا کہا گیا کہ مکہ (جو جائے امن ہے) میں قیام کریں۔ یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ طائف یا یمن کی طرف ہجرت کر جائیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ مشورہ کسی یگانے عزیز یا بیگانے دوست نے نہیں دیا کہ آپؑ یزید کی بیعت کر لیں۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان سب کے نزدیک یہ ایک ناممکن بات تھی کیونکہ اس میں صرف اسلام ہی کی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کی ہلاکت و بربادی تھی لہٰذا اس کا اختیار کرنا حسینؑ کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ بہر حال ان مشورہ دینے والوں میں جن حضرات و خواتین کے نام نمایاں نظر آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

جناب محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، حضرت ام سلمہؓ۔ جناب محمد بن حنفیہ نے آپؑ کو یہ مشورہ دیا کہ فی الحال مکہ کو اپنا مستقر بنائیں اور رسل و رسائل کے ذریعہ لوگوں کو اپنی بیعت پر آمادہ کریں۔ اگر وہ اس پر متفق ہو جائیں تو فبہا ورنہ ریگستانی صحراؤں اور کوہساروں کے دامنوں اور شہر بہ شہر منتقل ہوتے رہیں۔ اور لوگوں کے انجام کار کا انتظار فرمائیں۔[1] اور پھر کوئی آخری رائے قائم کریں۔ امام عالی مقام نے ان کے لیے جزائے خیر کی دعا کی۔ اور اپنے اہل و اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف اپنی روانگی کے مصمم ارادہ کا اظہار فرمایا۔ اور بعض روایات کی بنا پر جناب محمد بن حنفیہ کو فرمایا:

﴿اما انت فلا علیک ان تقیم بالمدینۃ فتکون عیناً علیھم لا تخفی عنی شیئاً من امورھم﴾ تمہارے لیے کوئی حرج نہیں کہ یہیں مدینہ میں ٹھہرے رہو اور ان (مخالفین) کی

---

[1] ابن اثیر، ج ۴، ص ۷۔ طبری، ج ۶، ص ۱۹۱۔ عاشر بحار، ص ۱۷۸۔ مقتل مقام، ص ۲۴۲ وغیرہ۔

نگرانی کرو اور مجھے تازہ حالات کی اطلاع دیتے رہو۔[1]

اس کے بعد ان کے نام وہ وصیت نامہ تحریر فرمایا۔ (اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۷ پر مذکور ہے)۔

جناب ام سلمہؓ اور امامؑ عالی مقام کے درمیان گفتگو

محبّ خاندانِ نبوتؐ ہونے کے علاوہ جناب ام المؤمنین ام سلمہ ؓ کو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ خاص انس اس لیے بھی تھا کہ انہوں نے بچپن میں ان کی پرورش کی تھی اس لیے جب ان کو آپ کے سفرِ عراق کے ارادہ کی اطلاع ملی تو سخت آزردہ ہوئیں اور خدمتِ امام میں عرض کیا: ﴿یا بنی لا تحزنی بخروجک الی العراق فانی سمعت جدک رسول اللّٰہ یقول یقتل و لدی الحسینؑ بارض العراق فی ارض یقال لھا کربلا... و عندی تربتک فی قارورۃ دفعھا الیّ النبی صلی اللّٰہ علیہ و الہ... الخ﴾ اے بیٹا! عراق کا سفر کر کے مجھے غمناک نہ کرو کیونکہ میں نے تمہارے جدِ امجد کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرا بیٹا حسین عراق میں سرزمین کربلا کے اندر شہید کیا جائے گا۔ اور آپ کی قتل گاہ کی مٹی ایک شیشی میں میرے پاس محفوظ ہے۔ جو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دی تھی۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ﴿یا اماہ و انا واللّٰہ اعلم انی مقتول مذبوح ظلماً و عدواناً... الخ﴾ اے مادرِ محترم! میں خود بھی جانتا ہوں کہ میں ظلم و جور سے شہید کیا جاؤں گا۔ مجھے اپنے قاتل اور جائے قتل اور جائے دفن کا بھی علم ہے۔[2] (اس کے بعد امام اور ام سلمہؓ کے درمیان جو مزید گفتگو ہوئی اور جس طرح امام علیہ السلام نے باعجازِ امامت جناب ام سلمہ ؓ کو اپنی قتل گاہ دکھائی۔ اور ان کو خاکِ کربلا عنایت فرمائی۔ اس کا تذکرہ اسی کتاب کے چوتھے باب اور معجزہ نمبر ۳ کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ فراجع)۔ بعض آثار سے آشکار ہوتا ہے کہ جناب ام سلمہؓ نے کہا کہ اگر آپ تشریف لے جاتے ہیں تو ان مخدراتِ عصمت و طہارت کو تو ہمراہ نہ لے جائیں۔ آپؑ نے جواباً فرمایا: ﴿قد شاء اللّٰہ ان یرانی مقتولاً مذبوحاً ظلماً و عدواناً و قد شاء ان یری حرمی و رھطی و نسائی مشرّدین و اطفالی مذبوحین مظلومین ماسورین مقیدین وھم یستغیثون فلا یجدون ناصراً ولا معینا﴾ خدا کی مشیت یہی ہے کہ وہ مجھے مقتولِ جور و جفا دیکھے اور میرے اہل و عیال کو وطن سے

---

[1] مقتل الحسین مقرم ص ۱۳۳، بحوالہ مقتل محمد بن ابی طالب۔ اس سے جناب محمد بن حنفیہ کے مدینہ میں رہنے کی اصلی علت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ امامؑ نے ان کے نام جو وصیت نامہ لکھا ہے اس سے بھی اس کی تائید مزید ہوتی ہے لیکن عام ارباب مقاتل نے امام کا یہ فرمان نقل نہیں کیا۔ جناب علامہ حلی علیہ الرحمہ نے مسائل ابن مہنا کے جواب میں اور ابن نما حلی نے اخذ الثار میں لکھا ہے کہ جناب محمد بن حنفیہ بوجہ بیماری جناب سید الشہداءؑ کے ہمراہ نہ جا سکے۔ بہرحال جناب ابن حنفیہ کی جلالت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے شریکِ سفر نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ ہوگی و کذا الکلام فی تاخر عبد اللّٰہ بن جعفر الطیارؓ۔ و اللّٰہ العالم۔ (منہ عفی عنہ)

[2] نفس المہموم ص ۳۹۔ عاشر بحار ص ۱۷۵ وغیرہ۔

دور اور اس طرح گرفتار بلا دیکھے کہ بعض ذبح ہوں۔ اور بعض اس طرح قید و بلا میں مبتلا ہوں کہ جب آواز استغاثہ بلند کریں تو کوئی ناصر و مددگار جواب نہ دے۔ جناب ام سلمہؓ یہ سن کر بہت روئیں اور ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔[۱]

اصول کافی کی روایت صادقؑ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ﴿لما سار الی العراق استودع﴾ جب امام حسینؑ سفر عراق اختیار کرنے لگے تو کتاب اور وصیت (امامت) جناب ام سلمہؓ کے حوالہ کر گئے۔ جب امام زین العابدینؑ واپس تشریف لائے تو جناب ام سلمہؓ نے وہ امانت ان کے حوالہ کر دی۔[۲] جس سے جناب ام سلمہؓ کی جلالت قدر نمایاں ہوتی ہے۔

عبداللہ بن عمر کا مشورہ

عبداللہ بن عمر نے آنجنابؑ کو ان بگڑے ہوئے حالات میں مدینہ ہی میں قیام کا مشورہ دیا اور امام عالی مقام نے ان کو مناسب جواب دے کر خاموش کر دیا۔ نیز یہ بھی فرمایا: ﴿یا عبد اللہ ان من ھو ان الدنیا علی اللہ ان راس یحیٰی بن زکریا یھدی الی بغی من بغایا بنی اسرائیل و ان راسی یھدی الی بغی من بغایا بنی امیۃ[۳] .... الخ﴾ اے عبداللہ! نگاہِ قدرت میں دنیا کی پستی ذلت کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ حضرت یحییٰؑ کا سر اقدس بنی اسرائیل کے حرام زادوں میں سے ایک حرام زادے کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اسی طرح میرا سر بھی بنی امیہ کے حرام زادوں میں سے ایک حرام زادے کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جب عبداللہ کو یقین ہو گیا کہ امام ارادۂ سفر سے باز نہیں آتے۔ تو عبداللہ نے خواہش کی کہ جس مقام پر جناب رسول خداؐ بہت بوسہ دیا کرتے تھے۔ اس پر مجھے بوسہ دینے دو۔ امام نے ناف سے کپڑا اٹھایا۔ اور عبداللہ نے تین بار اس متبرک مقام پر بوسہ دیا۔[۴]

بہر کیف ان سب امور سے فارغ ہو کر سرکار سید الشہداءؑ نے ۲۸ رجب ۶۰ھ کو ابھی اتوار کی رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپؑ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق تھی۔ اس لیے کہ حقیقی آفتاب اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی۔ اس لیے کہ رسول کا نور دیدہ آج صحرائے غربت میں گامزن تھا۔[۵]

راویان اخبار کا بیان ہے کہ جس وقت آپ مدینہ سے نکلے تو اس وقت آپ اس آیت مبارکہ کی تلاوت کر

۱۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۰۲۔ عاشر بحار، ص ۱۷۵۔ مقتل مقرم، ص ۲۲۶ وغیرہ۔

۲۔ اصول کافی، ص ۱۵۵، طبع ایران۔

۳۔ اللہوف سید ابن طاؤس، ص ۲۶ و مقتل مقرم، ص ۱۴۷ بحوالہ مقتل ابن نما حلی وغیرہ۔

۴۔ امالی شیخ صدوقؒ، ص ۹۳۔

۵۔ شہید انسانیت، ص ۲۳۹۔

رہے تھے۔ ﴿فخرج منها خائفاً یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین﴾ (س قصص، پ۲۰، ع۵) پس حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شہر سے ڈرتے ہوئے اور آس لگائے ہوئے نکل کھڑے ہوئے۔ عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! مجھے ظالم کے ہاتھ سے نجات دے۔ اس آیت مبارکہ میں جناب موسیٰ کا فرعون کے ظلم وستم کی وجہ سے سکونت مصر ترک کرنے پر مجبور ہو کر نکلنے اور ظالموں کے شر سے نجات حاصل کرنے کی دعا کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح جب امام عالی مقام مکہ مکرمہ میں پہنچے تو اس وقت یہ آیت مبارکہ آپ کی زبان پر تھی: ﴿فلما توجه تلقاء مدین قال عسٰی ربی ان یهدنی سواء السبیل﴾[1] (پ۲۰، سورۂ قصص، ع۶) "اور جب مدین کی طرف ہو لئے تو کہنے لگے کہ قریب ہے کہ میرا پروردگار مجھے ٹھیک ٹھیک راستہ بتلا دے۔" اس آیت مبارکہ میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدائن میں پناہ لینے اور اس وقت کی مخصوص دعا کا تذکرہ موجود ہے ان آیات کی تلاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی اعتبار سے حضرت سید الشہداءؑ کا یہ سفر حضرت موسیٰ بن عمران علیہما السلام کے سفر سے مشابہت رکھتا ہے۔

دو مشہور غلط فہمیوں کا ازالہ

قبل اس کے کہ سفر مکہ کے درمیانی حالات قلمبند کئے جائیں یہاں دو مشہور غلط واقعات کی تنقیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ایک جناب فاطمہ صغریٰؑ کے مدینہ میں چھوڑ جانے کا واقعہ۔ اور دوسرا بوقت روانگی خاص شاہانہ شان وشکوہ کے مظاہرہ کا قصہ ہے۔

جناب فاطمہ صغریٰ کے مدینہ میں ام سلمہؓ کے پاس چھوڑے جانے کی تحقیق

مشہور ہے کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام نے مدینہ سے روانگی کے وقت اپنی ایک صاحبزادی کو بوجہ علالت ام المومنین جناب ام سلمہؓ کے پاس مدینہ میں چھوڑ دیا تھا۔ اس واقعہ کو نظماً ونثراً بڑے شد ومد اور رقت خیز پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور اُردو کے قریباً تمام کتب مقاتل اور عربی وفارسی کے بعض مجموعوں میں بڑے طمطراق کے ساتھ اس واقعہ کا تذکرہ ملتا ہے لیکن اگر اس واقعہ کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بالکل غلط اور یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ عربی وفارسی کے مستند کتب سیر وتواریخ اور معتبر کتب مقاتل میں اس واقعہ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اور جن غیر معتبر کتب (جیسے مقتل خوارزمی، روضۃ الشہداء، اور اسرار الشہادۃ وغیرہ) میں یہ واقعہ درج ہے۔ وہاں بھی نہ کوئی مسلسل سند مذکور ہے اور نہ ہی کسی معتبر کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مستند کتب قدیمہ اس سے بالکل خالی نظر آتے ہیں اگرچہ یہی بات اس واقعہ کے بے اصل ہونے کے لیے کافی ہے کیونکہ واقعات کربلا کی صحت یا عدم صحت کا معیار یہی ہے کہ جو واقعہ علماء اعلام کی کتب معتبرہ میں موجود ہے وہ معتبر متصور ہوگا۔ اور جو غیر مستند علماء کی

---

[1] ارشاد ص ۱۸۱ وغیرہ۔

غیر معتبر کتب میں درج ہو۔ اسے ناقابل اعتبار سمجھا جائے گا۔ علاوہ بریں مندرجہ ذیل وجوہ بھی اس واقعہ کے بے اصل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

وجہ اوّل: ۔ علم سیر و انساب کی مستند کتب سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرکار سید الشہداؑ کی صرف دو ہی صاحبزادیاں تھیں۔ فاطمہؑ اور سکینہؑ۔ چنانچہ ہم اسی کتاب کے صفحہ ۷۸؟؟ پر آنجنابؑ کی اولاد کے ذیل میں متعدد کتب معتبرہ کے حوالہ جات سے اس بات کی مکمل تحقیق درج کر چکے ہیں۔

مزید برآں یہاں صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق انیق بھی پیش کی جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ﴿مکشوف باد کہ آں چہ ایں بندۂ بے بضاعت باستقراء و استیعاب رنج برد و اختیار نمود آنست کہ حسین علیہ السلام را چهار پسر بود. علی اکبر الشهید و علی اوسط هو الامام و علی اصغر و عبد اللہ. سہ تن از ایشاں در یوم طف شہید شدند. و آنحضرتؑ را دو دختر افزوں بنود نختس فاطمہؑ و آں دیگر سکینہؑ﴾[1] یعنی ''میں نے بڑی محنت و مشقت کے بعد جو کچھ کتب سیر و تواریخ سے حاصل کر کے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جناب امام حسینؑ کے چار بیٹے تھے۔ علی اکبرؑ شہید، علی اوسط (امام) علی اصغر اور عبد اللہ۔ ان میں سے تین شہزادے میدان کربلا میں شہید ہو گئے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ پہلی جناب فاطمہؑ اور دوسری جناب سکینہؑ۔''

بنابریں، انہی جناب فاطمہؑ کو کبریٰ و صغریٰ کہا جاتا ہے اس اعتبار سے کہ وہ جناب سکینہ سے بڑی ہیں۔ ان کو فاطمہ کبریٰ کہہ دیا جاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ اپنی جدہ مطہرہ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے چھوٹی ہیں۔ لہٰذا انہیں ''فاطمہ صغریٰ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے آنجنابؑ کی ایک اور صاحبزادی کا تذکرہ کیا ہے تو انہوں نے ان کا نام ''زینب'' بیان کیا ہے نہ فاطمہ فتدبر۔

وجہ دوم: ۔ واقعاتِ کربلا کی بہت سی روایات جناب فاطمہ بنت الحسینؑ سے مروی ہیں۔ نیز دربار و بازار کوفہ و شام میں دیگر مخدرات کی طرح ان محترمہ کے گرانقدر خطبات بھی کتب معتبرہ میں موجود ہیں جیسا کہ ہم اپنے اپنے مقام پر ان امور کا تذکرہ کریں گے انشاء اللہ۔ لہٰذا اگر ان کی مدینہ میں موجودگی تسلیم کی جائے۔ تو ان تمام حقائق کا انکار کرنا پڑے گا۔

وجہ سوم: ۔ جلیل القدر علماءِ اعلام نے تصریحات فرمائی ہیں کہ فراق فاطمہ صغریٰ کا واقعہ بالکل بے اصل ہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن سلیمان تنکابنی (صاحب قصص العلماء) کتاب اکلیل المصائب میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿و ایں

---

[1] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۹۸۔

کہ میگوئیند فاطمہ صغریٰ در مدینہ ماند و بیمار بود اصلے ندارد ﴾ "یہ جو کہا جاتا ہے کہ جناب فاطمہؑ صغریٰ بیمار تھیں اور مدینہ میں رہ گئی تھیں۔ اس کی کوئی اصلیت اور حقیقت نہیں ہے۔

اسی طرح ناصر الملت علامہ سید ناصر حسین صاحب قبلہ لکھنوی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"روایات متکاثرہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ جناب فاطمہؑ حضرت سید الشہداءؑ کے ہمراہ معرکۂ کربلا میں موجود تھیں۔ اور ان کا مدینہ میں بوجہ مرض کے رہ جانا کسی ضعیف روایت میں بھی نہیں دیکھا۔ ہاں بحار الانوار میں ایک روایت مشتمل بر ذکر غراب ایسی پائی جاتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاطمہ صغریٰ مدینہ میں تھیں لیکن یہ روایت غراب غریب ہے کہ مجلسی علیہ الرحمہ نے خود اس کی تصریح جلاء العیون میں فرما دی۔ چنانچہ بعد اس روایت کے فرماتے ہیں: ﴿و ایں حدیث خالی از غرابتے نیست بجهت مخالفت با اخبار دیگر﴾ چونکہ یہ روایت مقتل اخطب خوارزم سے ماخوذ ہے اور ضعیف السند ہے اور روایات کثیرہ و معتبرہ سے مخالف ہے لہٰذا مقبول نہیں ہو سکتی۔ اور جناب سید الشہداءؑ کی صاحبزادیاں بنا بر قول مشہور دو تھیں۔ ایک فاطمہ صغریٰ، دوسری حضرت سکینہؑ۔[1] اگرچہ اس خبر خبیر کی اس بصیرت افروز تحریر کے بعد اب مزید کسی شاہد کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی۔ ﴿ولا ینبئک مثل خبیر﴾ مگر تاہم مزید تسکین قلب کی خاطر حضرت علامہ سید علی نقی صاحب کی تصریح بھی پیش کی جاتی ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں: "آپؑ نے اپنے دادا ابو طالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا۔ جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینبؑ اور ام کلثومؑ بھی تھیں اس کے علاوہ سب بھائی، بھتیجے اور متعلقین آپؑ کے ساتھ سوائے محمد بن الحنفیہ کے جو کسی مجبوری یا مصلحت سے مدینہ میں چھوڑ دیے گئے۔ اور ام ہانی بنت ابو طالبؑ پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکی تھیں۔ بس ان کے علاوہ اولاد ابو طالبؑ میں سے کوئی بھی حسینؑ کے ساتھ سے جدا نہیں ہوا۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم میں سے سوائے اولاد ابو طالب کے اور سلسلہ کا ایک شخص بھی میدان کربلا میں نظر نہیں آتا ہے۔[2] اگر جناب فاطمہ صغریٰ مدینہ میں موجود تسلیم کی جائیں تو پھر جناب مولانا کا یہ ارشاد کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ "اور سوائے محمد بن حنفیہ اور ام ہانی کے اور کوئی اولاد ابو طالبؑ میں سے حسینؑ کے ساتھ سے جدا نہیں ہوا۔" اگرچہ "مقتل الحسین" کے فاضل مؤلف کے نزدیک جناب ام ہانی کا مدینہ میں رہنا بھی محل کلام ہے کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق وہ اس وقت زندہ ہی نہ تھیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ﴿لانها ماتت اما فی ایام النبیؐ کما فی مناقب ابن شهر اشوب (ج۱، ص۱۱۰) او ایام معاویة کما فی تقریب التهذیب لابن حجر، (ص۶۲۰ طبع لکھنؤ)﴾

---

[1] رسالہ ہدایات ناصریہ، طبع دہلی، ص۲۔

[2] شہید انسانیت، ص۲۳۰۔

یعنی جناب ام ہانی کی وفات یا تو جناب رسول خدا ﷺ کے عین حیات میں ہوئی ہے جیسا کہ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۱،ص ۱۱۰ میں ہے۔ یا ایام معاویہ میں جیسا کہ تقریب التہذیب، ص ۶۲۰ میں مرقوم ہے۔[1]

ایک مشہور شبہ کا ازالہ

عام طور پر اس روایت کو پڑھنے والے اس کی تائید واقعہ غراب سے لیتے ہیں۔ جس کی طرف اور اس کے جواب کی طرف سرکار ناصر الملت کے کلام میں اشارہ وارد ہے۔ یہ واقعہ عاشر بحار، ص ۲۳۶ پر مذکور ہے کہ ﴿لما قتل الحسین بن علیؑ جاء غراب فوقع فی دمہ ثم تمرغ ثم طار فوقع بالمدینۃ علی جدار فاطمۃ بنت الحسین بن علیؑ وھی الصغریٰ فرفعت راسھا فنظرت الیہ فبکت بکاء شدیداً﴾ جب امام حسینؑ کی شہادت ہو چکی تو ایک کوا آیا اور اس نے اپنے پر و بال کو آنجنابؑ کے خون میں رنگین کیا اور اڑتا ہوا مدینہ میں فاطمہ صغریٰ دختر امام حسینؑ کی دیوار پر جا بیٹھا۔ جناب فاطمہؑ نے جب اس کی طرف دیکھا تو بہت روئیں اور چند اشعار پڑھے۔ الخ۔۔۔ مگر ارباب دانش پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ یہ روایت بدو وجہ ناقابل اعتبار ہے:

اولاً: اس لیے کہ یہ روایت فی نفسہٖ ضعیف ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے اسے کسی نامعلوم المولف کتاب ''مناقب قدیم'' سے نقل کیا ہے۔

ثانیاً: یہ ان اخبار معتبرۃ السند کثیرۃ العدد کے مخالف و معارض ہے جو جناب فاطمہؑ کے واقعہ کربلا میں موجود ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترجیح انہی روایات کو دی جائے گی۔ انہی حقائق کی بناء پر خود سرکار علامہ مجلسیؒ نے جلاء العیون[2] میں اس روایت کو بوجہ غرابت ساقط عن الاعتبار قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں: ﴿و ایں حدیث خالی از غرابتے نیست بجہت مخالفت با اخبار دیگر﴾۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ جناب فاطمہؑ بنت الحسینؑ کا مدینہ میں رہنے کی روایت بالکل بے اصل ہے اور بے بنیاد ہے و اللہ العالم العاصم۔

بوقت روانگی از مدینہ سید الشہداءؑ کے شاہانہ شان و شکوہ کے مظاہرہ والی روایت کی تحقیق

منجملہ روایات مخترعہ و موضوعہ کے ایک وہ روایت بھی ہے جسے آقائے دربندی نے اسرار الشہادۃ میں اپنے کسی شاگرد کے حوالہ سے اور اس نے کسی مجموعہ کے حوالہ سے عبداللہ بن سنان کوفی سے نقل کی ہے۔ وہ اپنے اب وجد کے حوالہ سے نقل کرتا ہے کہ (اس کا جد) کوفیوں کا قاصد بن کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؑ نے

---

[1] مقتل الحسین المقرم، ص ۳۸، بر حاشیہ۔

[2] ص ۱۹۸، طبع النجف۔

جوابدہی کے لیے تین دن کی مہلت طلب کی۔ حتیٰ کہ تیسرے روز عازم سفر ہو گئے۔ قاصد نے دل میں کہا۔ ذرا جا کر شہزادۂ حجاز کی جلالت شان کا ملاحظہ تو کروں۔ چنانچہ جب وہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ آنجناب کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ بنی ہاشم آپ کے اردگرد ہیں۔ اور لوگ کھڑے ہیں۔ گھوڑوں پر زینیں کسی ہوئی ہیں۔ مخدرات عصمت و طہارت کی سواری کے لیے چار محمل تیار ہیں۔ جن پر حریر و دیبا کے پردے آویزاں ہیں۔ اس کے بعد کنیزوں کا ہجوم اور سواری کا تزک و احتشام دکھایا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص نے روانگی کا منظر کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ہر سطر میں چند جھوٹ موجود ہیں۔ (پھر یہ دکھایا گیا ہے کہ) یہ شخص گیارہ محرم تک برابر ہمراہ تھا حتیٰ کہ اس نے اسیران آل رسول کو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار ہوتے دیکھا۔ پھر اسے یکایک مدینہ سے روانگی کا منظر یاد آ جاتا ہے۔ اور بے اختیار رو پڑتا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ آقائے دربندی جیسے فاضل آدمی نے اور متعدد بے سروپا روایات کی طرح اسے بھی اپنی کتاب اسرار شہادت میں بلا تامل درج کر دیا حالانکہ متعدد وجوہ کی بنا پر یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے۔

وجہ اول:۔ اوپر روانگی سید الشہداءؑ کے واقعات میں لکھا جا چکا ہے۔ کہ آنجنابؑ نہایت خوف و ہراس کے عالم میں آیت مبارکہ ﴿فخرج منها خائفا یترقب﴾ کی تلاوت کرتے ہوئے راتوں رات مدینہ سے روانہ ہوئے۔ وہاں اس کروفر اور شان و شکوہ کے اظہار کا کہاں موقع تھا؟ اور اس پریشانی کے حال میں یہ امیرانہ اہتمام کیونکر ممکن تھا۔

وجہ دوم:۔ اس واقعہ کا راوی صرف ایک ہے اور وہ بھی غیر ثقہ۔ لہٰذا اس کے بیان پر کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

وجہ سیوم:۔ اس روایت کا سوائے اسرار شہادت دربندی کے فریقین کے علماء سیر و تواریخ کی کسی کتاب میں نام و نشان تک نہیں ہے۔ (آقائے دربندی سے بعد والے مؤلفین نے اسے اسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ **فلا تغفل**)

وجہ چہارم:۔ راوی نبی زادیوں کا سوار ہونا اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے جو کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ مردانِ اہل بیت اور خود سرکار سید الشہداءؑ کے موجود ہوتے کوئی نامحرم شخص وہاں ٹھہر کر تماشہ دیکھتا۔ اور کوئی دوسرا شخص اسے برابر یہ بتاتا جاتا کہ یہ جناب زینبؑ ہیں۔ یہ جناب ام کلثومؑ ہیں۔ **و علی هذا القیاس**۔

وجہ پنجم:۔ یہ راوی بوقت روانگی جناب بی بی شہر بانو کی سواری کا تزک و احتشام سب سے زیادہ بیان کرتا ہے۔ حالاں کہ بنابر صحیح روایت وہ معظمہ اس وقت زندہ ہی نہ تھیں۔

وجہ ششم:۔ یہ کروفر اور تکلفات بارده جو اس روایت میں بیان کیے گئے ہیں۔ وہ سلطنت و امارت کے شایان شان اور دنیاوی تفاخر و نمود کے نشان ہیں۔ سیرت خاندان نبوت و امامت کو ان شاہانہ جاہ و جلال اور امیرانہ تکلفات سے کیا واسطہ؟ کیا اس کو عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ الفقر فخری فرمانے والے کا نواسہ۔ سلطان الاولیاء جیسے تارک الدنیا کا بیٹا

دیبا و حریر کے پردے استعمال کرے۔ اس اسراف وتبذیر کو آنجنابؑ کی طرف منسوب کرنا آپؑ کی سخت توہین ہے۔ (انتهى ملخصاً از مجاهد اعظم، ج ۱، ولؤلؤ و مرجان) ان حقائق کے پیش نظر یہ مطلب بالکل واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ یہ روایت بالکل بے اصل و بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی اصلیت و واقعیت نہیں ہے۔ وھو المطلوب۔

بہر حال یہ تنقید و تحقیق تو بطور جملہ معترضہ درمیان میں آ گئی تھی۔ سلسلۂ کلام سرکار سید الشہداؑ کی مدینہ سے سوئے مکہ روانگی کے متعلق جاری تھا۔ کہ آنجنابؑ شب ۲۸ رجب کو مذکورہ بالا آیت ﴿فخرج منها خائفا يترقب... الخ﴾ کی تلاوت کرتے ہوئے مدینۂ رسولؐ سے بطریق اعظم مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بعض اہل خانوادہ نے کہا: ﴿لو تنكبت عن الطريق الاعظم كما فعل ابن الزبير كيلا يلحقك الطلب﴾ مولا کس قدر اچھا ہوتا۔ اگر آپؑ شاہراہ کو چھوڑ کوئی اور (غیر معروف) راستہ اختیار فرماتے۔ جیسا کہ ابن زبیر نے کیا ہے۔ (کیونکہ وہ غیر معروف راستہ سے گئے تھے) تا کہ تلاش کنندگان آپ کو نہ پا سکیں۔ آپؑ نے فرمایا: ﴿لا والله لا افارقه حتى يقضى الله ماهو قاض﴾۔ "نہیں بخدا۔ میں ہرگز اس راستہ کو ترک نہیں کروں گا حتیٰ کہ خدا وہ فیصلہ کرے جو اس نے کرنا ہے۔"[1]

مدینہ سے نکلنے کے بعد عبداللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آنجنابؑ سے دریافت کیا کہ کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ آپؑ نے فرمایا: فی الحال تو مکہ جانے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد خدا سے طلب خیر کروں گا۔ عبداللہ نے عرض کیا: جب مکہ تشریف لے جائیں تو وہیں قیام فرمائیں اور کوفہ جانے کا ہرگز ارادہ نہ کریں۔ کیونکہ وہ منحوس شہر ہے۔ وہیں آپؑ کے والد ماجد شہید کئے گئے۔ اور وہیں آپ کے برادر معظم کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔[2]

جناب سید محمد بن ابی طالبؒ نے اپنے مقتل میں بحوالہ حضرت شیخ مفیدؒ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے سلسلۂ سند کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے تو راستہ میں فرشتوں کے چند گروہ اس حال میں حاضر خدمت ہوئے کہ وہ ناقہائے جنت پر سوار تھے۔ اور ہاتھوں میں خنجر تھے۔ سلام کے بعد عرض کیا ﴿يا حجة الله على خلقه بعد جده و ابيه و اخيه ان الله سبحانه امد جدك بنا فى مواطن كثيرة و ان الله امدك بنا﴾ اے اپنے جد امجد، والد ماجد اور برادر مکرم کے بعد مخلوق خدا پر حجت خدا۔ خداوند عالم نے ہمارے ذریعہ آپ کے جد نامدار کی بہت سے مقامات پر نصرت فرمائی۔ اب خدا یہ چاہتا ہے کہ

---

[1] ارشاد شیخ مفید، ص ۱۸۱۔ عاشر بحار، ص ۱۸۵۔ لواعج الاشجان، ص ۲۷ وغیرہ۔

[2] نفس المہموم، ص ۳۰۔ لواعج الاشجان، ص ۲۷۔ قمقام، ص ۲۲۹ وغیرہ۔

ہمارے ذریعہ آپ کی نصرت کرے۔ (آپ کا کیا منشاء ہے؟) امام عالی مقامؑ نے فرمایا: ﴿الموعد حفرتی و بقعتی التی استشهد فیها وهی کربلا فاذا وردتها فاتونی﴾ تمہاری اور میری وعدہ گاہ کربلا ہے۔ جہاں میں شہید کیا جاؤں گا۔ جب میں وہاں پہنچ جاؤں تو تم وہاں آنا۔ ملائکہ نے عرض کیا: ﴿یا حجة اللّٰه مرنا نسمع و نطیع فهل تخشی من عدو یلقاک فنکون معک﴾ اے حجت خدا ہمیں حکم دیجئے تا کہ ہم اطاعت کریں۔ اگر کسی دشمن کا اندیشہ ہے تو ہم آپؑ کے ساتھ ساتھ رہیں؟ آپؑ نے فرمایا: ﴿لا سبیل لهم علیّ ولا یلقونی بکریهة او اصل الی بقعتی﴾ جب تک میں اپنی سرزمین (کربلا) تک نہ پہنچ جاؤں۔ یہ لوگ مجھے ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔

اس کے بعد مسلمان جنوں کے چند گروہ خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ اور سلام کے بعد عرض کیا: ﴿یا سیّدنا نحن شیعتک و انصارک فمرنا بامرک وبما تشا فلو امرتنا بقتل کل عدوک و انت بمکانک لکفینک ذلک﴾ اے ہمارے آقا! ہم آپؑ کے شیعہ اور انصار ہیں جو چاہیں ہمیں حکم فرمائیں۔ اگر آپؑ حکم دیں تو آپؑ یہیں ہوں گے اور ہم آپ کے تمام دشمنوں کا کام تمام کر دیں گے۔ امام علیہ السلام نے ان کو جزائے خیر کی دعا دی۔ اور فرمایا: کیا تم نے اللہ کی کتاب میں جو میرے جد نامدار پر نازل ہوئی ہے۔ یہ ارشاد نہیں پڑھا: ﴿اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی۔ اگرچہ مضبوط قلعوں میں بھی بند کیوں نہ ہو۔ نیز خدا کا ارشاد ہے: ﴿لَبَرَزَ الَّذِیۡنَ کُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمۡ﴾ ''جن کے لیے قتل ہونا مقدر ہے۔ وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل پڑیں گے۔''

پھر فرمایا: ﴿و اذا اقمت بمکانی فبما یبتلی هذا الخلق المتعرس و بما یختبرون ومن ذا یکون ساکن حضرتی بکربلا و قد اختارها اللّٰه تعالیٰ یوم دحی الارض و جعلها معقلاً لشیعتنا و یکون لهم اماناً فی الدنیا و الآخرة ولکن تحضرون یوم السبت و هو یوم عاشوراء الذی فی آخره اقتل ولا یبقی بعدی مطلوب من اهلی و نسبی و اخوتی و اهل بیتی و یسار براسی الی یزید لعنه اللّٰه﴾۔ اگر میں یہیں رہ جاؤں تو پھر اس بدبخت مخلوق کا امتحان کس کے ذریعہ سے لیا جائے گا؟ اور کربلا میں میری قبر میں کون آرام کرے گا؟ جسے خدا نے اس روز سے میرے لیے منتخب کر رکھا ہے۔ جس روز سے فرش زمین بچھایا ہے۔ اور اسے ہمارے شیعوں کے لیے جائے پناہ اور دنیا و آخرت میں جائے امن و امان قرار دیا ہے۔ البتہ تم بروز شنبہ (اس روایت میں روز شہادت روز شنبہ مذکور ہے مگر تحقیقی قول روز جمعہ ہے جیسا کہ اپنے مقام پر اس امر کی کماحقہ تحقیق کی جائے گی انشاء اللہ)۔ عاشورا کے دن حاضر ہونا جس کے آخر میں میں شہید کر دیا جاؤں گا اور میرے بعد میرے

خانوادہ سے کوئی ایسا شخص باقی نہ رہ جائے گا جسے (قتل کرنے کے لیے) طلب کیا جائے اور میرا سر یزید ملعون کے پاس بھیجا جائے گا۔ ﴿نحن و اللّٰہ یا حبیب اللہ و ابن حبیبہ لولا ان امرک طاعة و انه لا یجوز لنا مخالفتک قتلنا جمیع اعدائک قبل ان یصلوا الیک!﴾ اے خدا کے محبوب اور اس کے محبوب کے فرزند۔ اگر آپ کی اطاعت لازم اور مخالفت ناجائز نہ ہوتی تو ہم آپ کے تمام دشمنوں کو قتل و غارت کر دیتے۔ قبل اس کے کہ وہ آپ کو کوئی گزند پہنچاتے۔ آپؑ نے فرمایا: ﴿نحن و اللّٰہ اقدر علیهم منکم ولکن لیهلک من هلک عن بینة و یحیٰی من حیّ عن بینة﴾ ہم بخدا تم سے زیادہ ان (دشمنوں) پر قدرت رکھتے ہیں لیکن (ڈھیل دینے میں مصلحت یہ ہے کہ) جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو۔ اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل و برہان سے زندہ رہے۔[1] و اللہ العالم۔

اسی طرح منازل سفر طے کرتے ہوئے آنجنابؑ چھٹے روز جمعہ کے دن سیوم ماہ شعبان ۶۰ھ کو مکہ معظمہ پہنچے۔ اس وقت یہ آیت مبارکہ آپ کی زبان پر تھی: ﴿وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ جب (حضرت موسیٰؑ) شہر مدین کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو کہا: عنقریب خدا مجھے سیدھے راستے کی راہبری فرمائے گا۔[2]

---

[1] ناسخ بحار، ص ۱۷۵۔ نفس المہموم، ص ۳۸، ۳۹۔ الدمعة الساکبہ، ص ۳۰۶۔ مقتل مقرم، ص ۲۲۸، ۲۲۹۔

[2] ناسخ بحار، ص ۱۷۵۔ نفس المہموم، ص ۴۱۔ لواعج الاشجان، ص ۲۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۵ وغیرہ۔

سولھواں باب

شہنشاہِ مدینہؑ کی حرم خدا میں پناہ!

امام علیہ السلام نے مکہ میں پہنچ کر اس دار الامن میں رحل اقامت ڈال دیا۔ اور تین شعبان سے لے کر آٹھویں ذی الحجہ ۶۰ھ تک برابر قریباً چار ماہ اور چھ دن قیام فرمایا۔ اس اثناء میں تمام اہل مکہ اور بیرونجات کے وہ لوگ جو بغرض ادائیگی عمرہ مکہ میں آئے ہوئے تھے۔ وہ برابر خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے فیوض و برکات علمیہ وعملیہ سے استفادہ کرتے۔ ابن زبیر بالعموم خانہ کعبہ میں نماز وطواف میں مشغول رہتے اور لوگوں کے ساتھ کبھی کبھی ہر روز اور کبھی دو دن میں ایک بار ضرور خدمت امام میں مشرف ہوتے مگر امام علیہ السلام کا مکہ میں قیام ان پر بہت ہی شاق وگراں تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک امام حسینؑ یہاں قیام پذیر ہیں ان کا مدعا حاصل نہیں ہوسکتا یعنی اہل حجاز ان کی بیعت نہیں کریں گے۔[1]

حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا مکہ مکرمہ میں قیام بحیثیت ایک پناہ گزین کے تھا۔ اور نظر بہ حالات ظاہر حرم خدا میں مستقل قیام کرنے کا ارادہ تھا مگر بہت جلد ہی ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ امام کا وہاں زیادہ دیر تک قیام کرنا ناممکن ہوگیا۔ آپؑ پُرامن زندگی گزارنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ اپنی موافقت میں نہ کوئی فوجی طاقت بڑھاتے ہیں۔ نہ تقریر وتحریر کے ذریعہ لوگوں کو مشتعل کرتے ہیں۔

ہاں بعض کتب میں جنابؑ کی بعض سرداران بصرہ سے خط وکتابت کا پتہ چلتا ہے کہ آپؑ نے مالک بن مسمع بکری، احنف بن قیس، منذر بن جارود، مسعود بن عمرو، قیس بن ہیثم اور عمرو بن عبید کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر اپنے ایک غلام کے ذریعہ سے بھیجا جس کا نام سلیمان اور کنیت ابوزرین تھی۔ ﴿اما بعد فان اللّٰہ اصطفی محمدًا علی خلقہ و اکرمہ بنبوتہ و اختارہ لرسالتہ ثم قبضہ الیہ وقد نصح لعبادہ و بلغ ما ارسال بہ صلی اللّٰہ علیہ و الہ و کنا اھلہ و اولیائہ و اوصیائہ و ورثتہ و احق الناس بمقامہ فی النّاس فاستأثر علینا قومنا بذلک فرضینا و کرھنا الفرقۃ و احببنا العافیہ و نحن نعلم انا احق بذلک الحق المستحق علینا ممن تولاہ و قد بعثت رسولی الیکم بھذا الکتاب و انا ادعوکم الی کتاب اللّٰہ و سنتہ نبیہٖ

[1] عاشر بحار، ص ۱۷۵۔ ارشاد مفید، ص ۱۸۱۔ تاریخ، ج ۶، ص ۱۷۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۶۔ نفس المہموم، ص ۳۱۔ لواعج الاشجان، ص ۲۸۔ طبری، ج ۶، ص ۱۹۷ وغیرہ۔

فان السنة قد اميتت و البدعة قد احييت فان تسمعوا قولي اهدكم الى سبيل الرشاد ﴾۔'' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بعد از حمد وسلام۔ خداوند عالم نے اپنی تمام مخلوق میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منتخب فرما کر منصب نبوت ورسالت پر فائز فرمایا۔ اور جب آنحضرتؐ تبلیغ رسالت اور نصیحت وہدایت کے فریضہ کو انجام دے چکے تو خدا نے ان کو اپنی بارگاہ کی طرف بلالیا۔ ان کے بعد ہم (خاندان نبوت ہی) ان کے اہل، اولیاء، اوصیاء، وارث اور تمام لوگوں سے زیادہ ان کی مسند کے حق دار تھے لیکن ہماری قوم (قریش) نے ہم پر زیادتی کی۔ (ہمارے مقام پر اور لوگوں کو مسلط کر دیا) لیکن ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اس مسند پر قابض لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں۔ محض افتراق واختلاف کو ناپسند کرتے ہوئے کنج عافیت وتنہائی اختیار کیا پس میں یہ خط دے کر اپنا قاصد تمہاری طرف بھیج رہا ہوں میں تمہیں کتاب خدا اور سنت رسول کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ آج سنت کو مارا اور بدعت کو زندہ کیا جارہا ہے۔ اگر تم میری بات کو سنو گے تو میں تمہیں رشد وہدایت کے راستہ کی طرف راہنمائی کروں گا والسلام۔''[1]

اس مکتوب گرامی سے ان لوگوں نے کیا اثر لیا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ منذر بن جارود نے تو آنجنابؑ کے قاصد کو ابن زیاد کے حوالہ کر دیا۔ اور اس ملعون نے اسے سولی پر لٹکا دیا۔[2] اور احنف بن قیس نے جواب میں صرف یہ آیت لکھ بھیجی: ﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴾۔ صبر کرو خدا کا وعدہ برحق ہے۔ اور تمہیں وہ لوگ جلد بازی پر آمادہ نہ کریں جو یقین نہیں رکھتے۔[3]

البتہ مسعودؒ[4] بن عمرو نے بنی تمیم، بنی حنظلہ اور بنی سعد کو جمع کر کے ان سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد سید الشہداءؑ کو بذریعہ خط اپنی اطاعت گزاری ووفاداری کا یقین دلایا۔[5] اور جب اس کا خط آنجنابؑ کو ملا۔ تو پڑھ کر آپؑ نے اسے یہ دعائے خیر دی۔ ﴿ما لك آمنك الله من الخوف و اعزك و ارواك يوم العطش الاكبر﴾ باقی تین حضرات نے جواب دیا یا نہ۔ یا اگر دیا تو کیا دیا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ مگر افسوس کہ مسعود بن عمرو بھی سید الشہداءؑ کی حسب وعدہ نصرت نہ کر سکا کیونکہ جب اس نے نصرت حسینؑ کے لیے سفر کی تیاری کی تو اسے

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۰۸۔ نفس المہموم، ص ۴۷۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۰۰۔ لہوف، ص ۲۷۔ مخفی نہ رہے کہ عام مورخین کا خیال یہ ہے کہ منذر سے یہ حرکت محض اس خیال فاسد کے تحت سرزد ہوئی کہ یہ شخص کوئی جعلی خط نہ لایا ہو۔ اور مبادا یزید یا ابن زیاد نے ہمارا امتحان لینے کے لیے ایسا کیا ہو؟

[3] مثیر الاحزان، ص ۱۲۔

[4] سید ابن طاؤس نے اس کا نام یزید بن مسعود لکھا ہے۔ (لہوف، ص ۳۲)

[5] مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۷۵۔ لواعج الاشجان، ص ۳۶۔

معلوم ہوا کہ سید الشہداء درجہ رفیعۂ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس نے اس سعادت سے محرومی پر بہت رنج و افسوس کیا اور پھر بساطِ صبر پر بیٹھ گیا۔[1]

بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی عبدالقیس کا ایک شخص یزید بن ثبیط (جس کے دس بیٹے تھے)۔ اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور عبیداللہ کے ہمراہ (اور بروایتے اس کا غلام عامر اور سیف بن مالک اور ادہم بن امیہ بھی اس کے ہمراہ ہو گئے)۔[2] مکہ میں بارگاہِ امام میں حاضر ہوئے اور پھر برابر ہمرکاب رہے، حتیٰ کہ کربلا میں نصرت کا حق ادا کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔[3] لیکن اس خط و کتابت سے بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ امام عالی مقام علیہ السلام اپنی عسکری طاقت بڑھا کر حکومت وقت کے ساتھ ٹکر لینا چاہتے ہیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے دفاع اور حفاظتِ خود اختیاری کے اسباب جمع کئے جا رہے ہیں۔ و بینھما بون بعید!

اہل کوفہ کے خطوط امام عالی مقام کے نام

ظاہری حالات و اسباب کا سرسری نظر سے جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت ناقابل انکار معلوم ہوتی ہے کہ اہل کوفہ کے بیعت یزید سے انکار اور بیعت امام پر اصرار پر مشتمل بے شمار خطوط آنے سے پہلے امام علیہ السلام اپنی حفاظت چاہتے تھے اور گوشۂ عافیت میں ایام زیست گزارنا چاہتے تھے مگر اہل کوفہ کے خطوط نے اس دفاع کے حدود کو قدرے وسیع کر دیا۔ اس امید کے ماتحت کہ شاید اس طرح اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ حق کا احیاء اور باطل کا استیصال بھی کر سکیں اور مسلمانوں کو ظالموں کے ظلم و جور سے نجات دلا سکیں۔[4]

اب ذیل میں ان خطوط کی تفصیل اور ان کا پس منظر اور پیش منظر پیش کیا جاتا ہے۔ ارباب سیر و تواریخ نے لکھا ہے کہ معاویہ کی وفات کے بعد جب اس کی جگہ اس کا نامزد ولی عہد یزید بیٹھا اور شیعیان علیؑ کو امام حسینؑ کے بیعت یزید سے انکار کر کے مکہ میں ہجرت کرنے کا حال معلوم ہوا۔ نیز ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ہنوز اور بھی بعض نامور افراد نے یزید عنید کی بیعت نہیں کی تو انہوں نے اس انقلاب اور تغیر کے لمحات فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے جناب سلیمان بن صرد خزاعی (صحابی رسولؐ) کے مکان پر اجتماع کیا۔ اور باہم جان و مال کے ساتھ نصرت حسین علیہ السلام کا عہد و پیمان کیا۔ اور پھر سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد اور حبیب بن مظاہر کی طرف سے اس مضمون کا ایک

---

[1] مثیر الاحزان، ص ۱۴۔ لہوف، ص ۴۷۔ مقتل مقرم، ص ۱۳۶۔

[2] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۴۔

[3] نفس المہموم، ص ۴۸۔

[4] النہضۃ الحسینیہ، ص ۱۵۔

خط حضرت امام حسینؑ کے نام لکھ کر عبداللہ بن مسمع ہمدانی اور عبداللہ بن وال تیمی کے ہاتھ خدمتِ امامؑ میں روانہ کیا۔

﴿بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم للحسینؑ بن علیؑ من سلیمان بن صرد و المسیّب بن نجبہ و رفاعة بن شداد البجلی و حبیب بن مظاهر و شیعتہ المؤمنین و المسلمین من اهل الکوفة سلام علیک فانا نحمد الیک اللّٰہ الّذی لا الٰہ الا هو اما بعد فالحمد للّٰہ الّذی قصم عدوک الجبار العنید الّذی انتزیٰ علی هذه الامة فابتزها امرها و غصبها فیئها و تامّر علیها بغیر رضیً منها ثم قتل خیارها و استبقٰی شرارها و جعل مال اللّٰہ دولة بین جابر تهادو اغنیائها فبعداً لہ کما بعدت ثمود انہ لیس علینا اما فاقبل لعلّی للّٰہ ان یجمعنا بک علی الحق و النعمان بن بشیر فی قصر الامارہ لسنا نجتمع معہ فی جمعةٍ و لا نخرج معہ الی عیدٍ و لو قد بلغنا انک قد اقبلت الینا اخرجناہ حتی نلحقہ بالشام انشاء اللّٰہ﴾۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ منجانب سلیمان بن صرد، مسیّب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد بجلی، حبیب بن مظاہر، مظہر اور کوفہ کے دیگر مومنین و مسلمین کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ سلام علیک۔ ہم اس خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ بعداز حمد و ثنا خدا کا شکر ہے جس نے آپ کے زبردست سرکش دشمن (معاویہ) کو ہلاک و برباد کیا ہے۔ جس نے زبردستی اس امتِ مسلمہ کی حکومت اور اس کے مال پر امتِ مرحومہ کی رضامندی کے بغیر قبضہ و تسلط جما رکھا تھا۔ اور اس امت کے نیک لوگوں کو قتل کرتا اور بروں کو زندہ چھوڑتا تھا۔ اور خدا کے مال کو امت کے جابر اور غنی لوگوں میں برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ اس کے لئے ہلاکت ہو جس طرح کہ قوم ثمود ہلاک ہوئی۔ اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ یہاں تشریف لائیں تاکہ شاید اس طرح خدا ہمیں حق پر مجتمع کر دے۔ نعمان بن بشیر قصر الامارہ میں موجود ہے۔ مگر ہم نہ تو اس کے ساتھ جمعہ پڑھتے ہیں۔ اور نہ عید۔ اور اگر ہمیں یہ اطلاع مل گئی کہ آپ ہماری استدعا پر تشریف لا رہے ہیں تو ہم اس کو قصر الامارہ سے نکال کر شام پہنچا دیں گے۔ انشاء اللہ۔"[1]

قاصد یہ خط لے کر دسویں ماہِ رمضان المبارک ۶۰ھ کو خدمت امامؑ میں پہنچے۔ اس کے بعد تو خطوط کا ایک تانتا بندھ گیا۔ مذکورہ بالا خط ارسال کرنے کے بعد دو دن کے توقف سے پھر قیس بن مسہر صیداوی، عبداللہ بن شداد ارحبی اور عمارۃ بن عبداللہ سلولی کو خطوط دے کر روانہ کیا گیا۔ پھر دو دن کے وقفہ کے بعد ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کو نہایت تاکیدی خطوط دے کر بھیجا گیا۔[2] ان خطوط کی تعداد ابن اثیر[3] اور سبطِ ابن جوزی نے ڈیڑھ

---

[1] ارشاد شیخ مفیدؒ ص ۱۸۲۔ عاشر بحار ص ۱۷۵۔ نفس المہموم ص ۳۱۔ کامل ج ۳ ص ۲۶۶ وغیرہ۔

[2] ارشاد ص ۱۸۲۔

[3] کامل تعداد ص ۲۶۶۔ تذکرہ خواص الامہ ص ۲۴۴۔

سواور دینوری نے دوخرجیاں۔[1] مشہور یہ ہے کہ ان خطوط کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔[2] واللہ العالم۔

کوفہ کی رائے عامہ کی اس بیداری کا نتیجہ تھا کہ کچھ ایسے لوگوں نے بھی امام علیہ السلام کی خدمت میں خطوط لکھے جو فی الحقیقت امام کے خیر خواہ نہ تھے بلکہ بنی امیہ کے ہوا خواہ تھے جیسے شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن حارث، عمرو بن الحجاج زبیدی وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے محض اس خیال کے ماتحت خط لکھا تھا کہ وہ بھی آئندہ اپنے مستقبل کو سنوار لیں۔ چنانچہ ان کے خط کا لب و لہجہ بھی دوسرے خطوط سے جدا نظر آتا ہے۔ ان خطوط میں امام علیہ السلام کی خدمت اخلاص و عقیدت کے پھول نثار کئے گئے ہیں۔ ان سے رشد و ہدایت حاصل کرنے کی دلی خواہش ظاہر کی گئی ہے مگر ان لوگوں کے خط میں مادی طاقت کی پیش کش کے ساتھ دنیوی حظوظ و لذات کی نمود کی گئی ہے۔ ان کے خط کا مضمون یہ تھا: ﴿اما بعد فان النّاس ینتظرونک لا رائی لھم دونک فالعجل فالعجل یابن رسول اللّٰہ فقد اخضرت الجنات و اینعت الثمار و اعشبت الارض و اورقت الاشجار. فاقدم علینا اذا شئت فانما تقدم علی جند مجنّدہ لک والسلام علیک و رحمة اللّٰہ﴾ یعنی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں۔ میوے پک چکے ہیں۔ زمینیں آباد ہیں۔ درخت سرسبز و شاداب ہیں۔ آپ جب چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔ جب آپ آئیں گے تو ایک لشکر آپ کی نصرت کے لیے بالکل آمادہ و تیار موجود[3] ہوگا۔ اس خط سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ امام کے مزاج شناس اور ان کی افتاد طبع سے واقف نہیں ہیں۔ اور محض ہوا کے رخ پر چلنے والے اور چڑھتے سورج کی پرستش کرنے والے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہ آخری خط لکھنے والے قریباً سب ہی معرکۂ کربلا میں فوج مخالف میں موجود تھے (لعنۃ اللہ علیہم اجمعین) یہ آخری خط ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی لے کر خدمت امام میں پہنچے۔[4]

جب اہل کوفہ کا اصرار حد سے بڑھ گیا اور اتمام حجت کی خاطر امام علیہ السلام کے لیے ان کی دعوت پر لبیک کہنا ضروری ہو گیا تو آنجنابؑ نے ان آخری قاصدوں کے ذریعہ اہل کوفہ کو اس مضمون کا جواب لکھا (اس سے قبل کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا اور سب قاصد وہیں موجود تھے): ﴿بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم من الحسینؑ بن علیؑ الی الملاء من المؤمنین و المسلمین اما بعد فان ھانیاً و سعیداً قدما علی بکتبکم و کانا اٰخر من قدم

---

[1] الاخبار الطوال، ص ۲۳۱۔

[2] لہوف، ص ۲۹۔ عاشر بحار، ص ۱۷۵، سطر آخر۔ مقتل مقرم، ص ۱۲۷۔ لواعج الاشجان، سطر آخر۔

[3] ارشاد شیخ مفیدؒ، ص ۱۸۳۔ لہوف سید ابن طاؤسؒ، ص ۳۰۔

[4] عاشر بحار، ص ۱۷۶۔ نفس المہموم، ص ۴۲ وغیرہ۔

علٰی من رسلکم و قد فہمت کل الّذی قصصتم و ذکرتم و مقالتجلکم انہ لیس علینا امام فاقبل لعل اللّٰہ ان یجمعنا بک علی الحق و الھدیٰ و انا باعث الیکم اخی و ابن عمی و ثقتی من اھل بیتی مسلم بن عقیل فان کتب الی انہ قد اجمع رأی ملأکم و ذوی الحجی و الفضل منکم علی مثل ما قدمت بہ رسلکم و قرات فی کتبکم فانی اقدم الیکم و شیکاً انشاء اللّٰہ فلعمری ما الامام الا الحاکم بالکتاب القائم بالقسط الداین بدین الحق الحابس نفسہ علی ذلک اللّٰہ و السلام [۱]

یہ خط حسینؑ بن علیؑ کی طرف سے مسلمانوں اور مؤمنوں کے گروہ کے نام ہے ہانی اور سعید تمہارے فرستگان میں سے سب سے اخیر ہیں۔ تمہارے خطوط لے کر میرے پاس پہنچے اور جو کچھ تم نے ان خطوط میں ذکر کیا ہے اسے میں نے سمجھا کہ ہمارا اس وقت کوئی امام نہیں۔ آپ آیئے۔ شاید خدا ہمیں آپ کی وجہ سے حق و ہدایت پر جمع کر دے اس لیے اب میں اپنے چچازاد بھائی اور اپنے خاندان کے مخصوص معتمد مسلم بن عقیل کو تمہاری طرف روانہ کر رہا ہوں۔ میں نے انہیں مامور کر دیا ہے کہ وہ تمہارے صحیح حالات مجھے لکھیں۔ لہٰذا اگر انہوں نے یہ لکھا کہ تمہارے ارباب بست و کشاد اور صاحبان عقل و خرد اس بات سے متفق ہیں جو تم نے بذریعہ فرستادگان اپنے خط میں ظاہر کی ہے۔ تو میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم امام برحق نہیں ہے مگر وہی جو کتاب خدا کے مطابق حکم کرے۔ اور عدل و انصاف پر کاربند ہو۔ دین حق کا پیرو ہو۔ اور اپنے نفس کو رضائے خداوندی کے لیے ان امور پر وقف کر چکا ہو۔ والسلام۔

اس کے بعد جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کو کوفہ جانے کا حکم دیا۔ اور یہ پندرہ رمضان المبارک کا واقعہ ہے۔ قبل اس کے کہ جناب مسلمؑ کی روانگی اور ان کی شہادت کے واقعات بیان کئے جائیں اور سلسلہ واقعات کو آگے بڑھایا جائے۔ یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

---

[۱] ارشاد، ص ۱۸۳۔ لہوف، ص ۳۱۔ طبری، ج ۲، ص ۱۹۸۔ الاخبار الطوال، ص ۲۳۸۔

سترھواں باب

قاتلانِ حسینؑ کا مذہب کیا تھا؟

اہل کوفہ کے انہی دعوتی خطوط اور تاکیدی بلاوے کو دیکھ کر ہمیشہ مخالفین یہ کہا کرتے ہیں کہ قاتلانِ حسینؑ شیعہ تھے۔ اس لیے یہاں قاتلانِ حسینؑ کے مذہب پر فی الجملہ تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ اس اعتراض کا بے بنیاد ہونا واضح ہو جائے۔ اگرچہ اس موضوع پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ مستقل رسائل تصنیف کیے جا چکے ہیں۔ بالخصوص رسالہ شریفہ ''قاتلانِ حسینؑ کا مذہب'' مطبوعہ امامیہ مشن لکھنؤ میں جس احسن انداز سے تاریخی حقائق کی روشنی میں اس ایراد کا بے بنیاد ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ وہ قابل داد ہے۔ ہم ذیل میں اسی رسالہ شریفہ کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں:
''کہنے کو قاتلانِ حسینؑ مسلمان تھے۔ اور اسی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن تاریخی واقعات اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتے ہیں کہ درحقیقت وہ نام نہاد مسلمان اسلام سے دور کا بھی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ مذہب ان کی نظر میں ایک خود ساختہ کھروندا اور بس دنیا ان کا دین و آئین تھی۔ وہ دنیاوی جاہ و ثروت کے آگے کسی دوسرے عالم اور اس عالم کی جزا و سزا کا خیال بھی ذہن میں نہ لاتے تھے۔

ذمہ دارانِ شہادتِ حسینؑ کا کفر و الحاد

قتل حسینؑ کا اصل بانی یزید بن معاویہ تھا۔ جس نے کفر و الحاد اور لامذہبی میراث میں پائی تھی۔ (ہم اس کتاب کے گیارھویں باب میں یزید کا کفر اس کے مسلم الثبوت احوال و افعال کی روشنی میں ثابت کر چکے ہیں اس لیے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے)۔

یزید کے بعد دوسرا شخص جسے قاتل حسینؑ کہا جا سکتا ہے۔ وہ پسر مرجانہ عبیداللہ ابن زیاد ہے جو یزید کے ساتھ یک جان و دو قالب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس شخص کا کفر و الحاد اور احکام رسولؐ سے روگردانی طشت از بام تھی۔ اور کوفہ کے عام افراد بھی اس سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ جناب ہانی بن عروہ نے ایک خاص موقع پر جناب مسلم بن عقیل سے کہا تھا: ﴿اما و اللہ لقتلت فاسقاً فاجراً کافراً غادراً و لکن کرھت ان یقتل فی داری﴾ ''خدا کی قسم آپ یقین جانئے کہ اگر آپ اس کو قتل کر ڈالتے تو یہ کسی مسلمان کا قتل نہ ہوتا بلکہ ایک فاسق و فاجر، اور کافر و غدار کا قتل ہوتا۔ بے شک مجھ کو یہ امر پسند نہ تھا۔ کہ وہ میرے گھر میں قتل ہو۔''[1]

---

[1] طبری، ج ۶ ص ۲۰۲۔

تیسرا شخص جو قتل حسینؑ کا براہِ راست ذمہ دار کہا جا سکتا ہے وہ عمر بن سعد ہے۔ اس کے اسلام کی حقیقت ان اشعار سے ظاہر ہے جو اس نے اس موقع پر نظم کیے تھے کہ جب ابن زیاد نے اس کو قتل حسینؑ پر مامور کیا ہے:[1]

فو اللّٰہ لا ادری و انی لحائرٌ — افکر فی امری علی خطرین

خدا کی قسم میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور میں حیران ہوں — میں اپنی نسبت دو عظیم باتوں میں فکر کر رہا ہوں

اتترک ملک الری و الری منیتی — ام اصبح ماثوما بقتل حسینٍ

کیا میں ملک رے کو ہاتھ سے جانے دوں حالانکہ ملک رے کی مجھ کو مدت سے آرزو ہے۔ یا حسینؑ کو قتل کرکے گنہگار ہوں

الا انما الدنیا بخیر معجل — وما عاقل باع الوجود بدین

یاد رہے کہ دنیا نقد و حاضر راحت کا نام ہے — اور کون عاقل ہے جو نقد کو قرض کے عوض بیچ ڈالے

یقولون ان اللّٰہ خالق جنة — ونار وتعذیب وغلّ یدین

لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے کوئی جنت خلق کی ہے — اور آگ اور عذاب اور ہاتھوں کی ہتھکڑیاں

فان صدقوا فیما یقولون اننی — اتوب الی الرّحمٰن من سنتین

اچھا تو اگر یہ لوگ سچے ہیں ان باتوں کو کہنے میں — تو کوئی حرج نہیں میں دو ہی برس کے اندر اس گناہ سے توبہ کراوں گا

و ان کذبوا فزنا بدنیا عظیمة — وملک عقیم دائم الحجلین

اور اگر یہ لوگ غلط کہتے ہیں اور جنت و دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے؟ پھر تو ہم ایک عظیم دنیا اور ایسے ملک کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس کی نعمتیں باقی رہنے والی ہیں۔

ان اشعار میں صریحی طور پر عقیدۂ معاد اور جنت و دوزخ کے وجود کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ جب حکام اور روسا کا یہ عالم تھا۔ تو دوسروں کا کیا پوچھنا؟ وہ تو انہی لوگوں کے اشارہ پر چلنے والے اور ان کے آلۂ کار تھے۔ ان کو مسلمان کہنا اسلام کے دامن پر ایک بدنما دھبہ لگانا ہے اور درحقیقت ان سے اسلام کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد

[1] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۸۳۔

اس سوال کا موقع ہی نہیں باقی رہتا کہ یہ لوگ سنی تھے یا شیعہ؟ اس لیے کہ سنی شیعہ کا افتراق اسلامی مشترکہ اصول و عقائد کو تسلیم کر لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور جب خود اسلام دامن کش نظر آتا ہو تو سنی شیعہ کی تفریق بے موقع ہے۔

جو کچھ اوپر حوالۂ قلم ہوا وہ اس ننگِ انسانیت جماعت کے باطل عقائد کی بنا پر تھا۔ جس کی پردہ دری تاریخ کے ہاتھوں نے کی۔ ہاں ظاہری حیثیت سے یہ افراد مذہب اسلام کے حلقہ بگوش تھے۔ اور ان کی لامذہبی جس درجہ پر بھی ہو اس پر اسی ورمی مذہب کا ہلکا سا پردہ پڑا ہوا ضرور تھا! جس کی بنا پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق اسلام کے کس فرقہ سے تھا؟ بلا خوفِ رد کہا جا سکتا ہے کہ قاتلانِ حسینؑ سنی المذہب تھے۔

دو ضروری تنقیحیں

قبل اس کے کہ اس مطلب پر دیگر شواہد پیش کیے جائیں۔ بنیادی طور پر دو تنقیحیں قائم ہونا ضروری ہیں:

(۱) امام حسینؑ کے قتل کی بنیاد کیا تھی؟ (۲) جس بنیاد پر اس عظیم قتل کا ارتکاب کیا گیا۔ اس کی جگہ کس فرقہ کے اصول و تعلیمات میں نکالی جا سکتی ہے۔

تنقیح اوّل

تنقیح اوّل کے متعلق یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ "تاریخی حیثیت سے یہ امر ناقابل انکار ہے کہ قتل امام حسینؑ کی بنیاد امیر معاویہ کے بعد یزید کی خلافت اور اس کے تسلیم کرنے کے لیے حسینؑ بن علیؑ سے بیعت لینے پر اصرار اور حسینؑ کا اس خلافت کے تسلیم کرنے سے انکار اور اپنی بات پر آخر وقت تک ہزار ہزار مصیبتیں سامنے آنے پر بھی قائم رہنا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے دنیا کی اس طویل و عریض وسعت کو فرزند رسولؐ پر تنگ کر دیا تھا اور جس کی بنا پر دشمنوں کی خون آشام تلواریں اس بے گناہ کے خون کی پیاسی ہو گئی تھیں۔" ہم اس کتاب کے چودھویں باب میں تاریخی شواہد و نصوص کی روشنی میں اس امر کو ثابت کر چکے ہیں۔ یہاں مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں ہے۔

تنقیح دوم

اب رہی دوسری تنقیح کہ یزید کی خلافت کس فرقہ کے مذہبی تعلیمات کی رو سے صحیح اور اس کی حمایت حق بجانب ہو سکتی ہے؟

یہ امر کچھ زیادہ توضیح کا محتاج نہیں ہے کہ شیعوں کے مذہبی اصول میں یزید بلکہ اس سے بڑھے چڑھے افراد کی خلافت کو کوئی جگہ حاصل نہیں ہے۔ انہوں نے تو سرے سے اس سلسلہ ہی سے اظہار برأت کیا ہے۔ جس کی پانچویں یا چھٹی کڑی میں یزید کی امامت و خلافت کو تسلیم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ امام اہل سنت حافظ جلال الدین سیوطی نے اپنی تاریخ الخلفاء میں اس مطلب کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ پہلے وہ کتاب کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہوئے

رقمطراز ہیں: ﴿ھذا تاریخ لطیف ترجمت فیه الخلفاء امراء المومنین القائمین بامر الامة من عھد ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنه الی عھدنا ھذا علی ترتیب زمانھم ﴾۔اس پُر لطف تاریخ میں میں نے حالات لکھے ہیں۔خلفاء کے جو امیر المؤمنین تھے اور امت اسلامیہ کی ریاست کے مالک تھے۔ابوبکر صدیق کے عہد سے لے کر اپنے عہد تک۔ان کے زمانہ خلافت کی ترتیب کے مطابق" انہی الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ جن اشخاص کے حالات لکھنا چاہتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو امیر المؤمنین کہنے کے لیے تیار ہیں۔اور ان کی خلافت ان کے نزدیک صحیح و مسلم تھی۔اس کے بعد جب ہم اسی تاریخ الخلفاء کی سیر کرتے ہوئے صفحہ ۲۰۵ پر پہنچتے ہیں۔تو جلی حرفوں میں یہ سرخی نظر آتی ہے:"یزید بن معاویه ابو خالد الاموی "جس کے ذیل میں مستقل طور پر یزید کے حالات درج کئے گئے ہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ یزید کی بیعت صحیح و درست اور امامت و خلافت اس کی جائز اور قابل تسلیم تھی۔ علاوہ بریں اس کتاب کے صفحہ ۹ پر معاویہ کے بعد بالتصریح یزید کو چھٹا خلیفہ شمار کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿ثم اجتمعوا علی ولدہ یزید ولم ینتظم للحسینؑ امر بل قتل قبل ذلک ﴾ اور اس (معاویہ) کے بعد اس کے بیٹے یزید کی خلافت پر اجماع ہوا۔حسینؑ کے لیے امامت حاصل نہ ہو سکی۔بلکہ وہ اس سے قبل ہی قتل ہو گئے۔(لہٰذا انہیں خلفاء میں شمار نہیں کیا جا سکتا)۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی شرح بخاری میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔(نیز شرح عقائد ص ۱۱۱ طبع لکھنؤ۔شرح فقہ اکبر ص ۱۷۸ طبع لاہور وغیرہ میں بھی یزید کو چھٹا خلیفہ لکھا گیا ہے) اہل سنت کے ان ذمہ دار حضرات کی تحریروں کے بعد اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یزید کی خلافت ان کے نزدیک صحیح اور جائز تھی۔اور اسی خلافت کو تسلیم کرانے کے لیے حسینؑ بن علیؑ شہید کئے گئے تھے جس کے بعد قدرۃً یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس مذہب کے نام لیوا تھے۔جس میں یزید کی خلافت صحیح و جائز تھی اور ان کو شیعہ فرقہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

قاتلانِ حسینؑ کے مذہب پر تاریخی شواہد و قرائن

اگرچہ مذکورہ بالا حقائق اس مطلب کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ قاتلانِ حسینؑ شیعہ نہ تھے بلکہ سنی تھے۔تاہم مزید تسلی و تشفی کے لیے ذیل میں بعض تاریخی قرائن و شواہد درج کئے جاتے ہیں۔

پہلا شاہد:۔ جناب مسلم بن عقیل کوفہ میں آ کر فرزند رسول کی بیعت لے رہے ہیں۔حاکم کوفہ نعمان بن بشیر اپنی فطری صلح پسندی کے باعث طرح دے رہا ہے۔عین اسی موقع پر یزید کے پاس کوفہ سے ایک خط جاتا ہے۔جس کی عبارت یہ ہے: ﴿اما بعد فان مسلم بن عقیل قد قدم الکوفة فبایعته الشیعة للحسینؑ بن علیؑ فان کان لک فی الکوفة حاجة فابعث الیھا رجلاً قویاً ینفذ امرک و یعمل مثل عملک فی عدوک

فان النعمان بن بشیر رجل ضعیف او هو یتضعف ﴾ مسلم بن عقیل کوفہ آئے ہیں اور شیعوں نے ان کے ہاتھ پر حسینؑ بن علیؑ کی بیعت کی ہے۔ اگر آپ کو کوفہ میں اپنی سلطنت قائم رکھنا ہے تو ایک طاقت ور شخص کو یہاں مقرر کیجئے جو آپ کا حکم نافذ کرے۔ اور دشمن کے ساتھ وہ سلوک کرے جو آپ خود اگر ہوتے تو کرتے اس لیے نعمان بن بشیر فطرتاً کمزور ہے۔ یا کسی وجہ سے کمزوری ظاہر کر رہا ہے۔ اس خط کے لکھنے والے تین آدمی ہیں: (۱) عبداللہ بن مسلم بن سعید حضرمی حلیف بنی امیہ۔ (۲) عمارہ بن عقبہ۔ (۳) عمر بن سعد ابن ابی وقاص۔

یزید نے یہ خط دیکھ کر جو فرمان ابن زیاد کے نام لکھا اس کی عبارت قابل دید ہے: ﴿اما بعد فانہ کتب الیّ شیعتی من اہل الکوفۃ یخبروننی ان ابن عقیل بالکوفۃ یجمع الجموع لشق عصا المسلمین فسر حین تقواء کتابی ھذا حتی تاتی الکوفۃ فتطلب ابن عقیل طلب الخرزۃ حتی تثقفہ فتوثقہ او تقتلہ او تنفیہ و السلام﴾ میرے پاس میرے شیعوں نے جو کہ کوفہ کے رہنے والے ہیں یہ لکھا ہے کہ ابن عقیل کوفہ میں جتھے جمع کر کے مسلمانوں کی موجودہ بنی بنائی بات کو بگاڑنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا فوراً وہاں جاؤ اور مسلم پر قابو حاصل کر کے بایں طور سزا دو کہ اسے قید خانہ میں ڈال دو۔ یا قتل کر دو۔ یا شہر بدر کر دو۔[1] (چنانچہ نعمان بن بشیر کو معزول کر دیا جاتا ہے اور ابن زیاد کو بصرہ کے علاوہ کوفہ کا گورنر بھی بنا دیا جاتا ہے)۔

محترم ناظرین نے پہچان تو لیا ہوگا کہ یہ عمر بن سعد کون ہے جو اس خط کے لکھنے والوں میں ہے؟ بے شک یہ وہی سپہ سالار ہے جو حسینؑ بن علیؑ کے قتل کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جس نے سب سے پہلے تیر لشکر حسینؑ کی طرف رہا کیا[2] تھا۔ اس کی یہ لفظیں کہ ﴿بایعتہ الشیعۃ للحسینؑ بن علیؑ﴾ شیعہ جماعت نے مسلمؑ کے ہاتھ پر حسینؑ کی بیعت کر لی ہے صاف بتاتی ہیں کہ اس شخص کو جماعت شیعہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور پھر یزید کی یہ تحریر کہ ﴿کتب الی شیعتی من اہل الکوفۃ﴾ مجھ کو میرے شیعوں نے کوفہ سے لکھا ہے بتلا رہی ہے کہ یہ شخص یزید کا شیعہ تھا۔ اور اس کی خلافت کو تسلیم کرنے والی جماعت سے تھا۔ (ظاہر ہے کہ وہ جماعت اہل سنت کی ہی ہے نہ شیعہ کی)۔

<u>دوسرا شاہد</u>:۔ فرزند رسولؐ کربلا پہنچے اور دشمنوں نے محاصرہ کر لیا۔ ساتویں تاریخ قاصد آتا ہے اور ابن زیاد کی طرف سے عمر سعد کو یہ خط دیتا ہے: ﴿اما بعد فحل بین الحسینؑ و اصحابہ و بین الماء ولا یذوقوا منہ قطرۃً کما صنع بالتقی الزکی المظلوم امیر المؤمنین عثمان بن عفان... الخ﴾ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے سامنے پانی کی طرف سدِ راہ ہو جاؤ اور ان کو ایک قطرہ چکھنے کو بھی نہ ملنے پائے جیسا کہ زکی تقی مظلوم امیر

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۱۹۹، ۲۰۰۔ ارشاد، ص ۱۸۵۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۴۵۔

المومنین عثمان بن عفان کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا۔[1]

کہاں ہیں قاتلانِ حسینؑ کو شیعہ کہنے والے۔ آئیں اور آنکھیں کھول کر اپنے امام اور حافظ محمد بن جریر طبری کی تحریر پر نظر ڈالیں۔ اور پھر بتلائیں کہ قاتلانِ حسینؑ کا مذہب کیا تھا؟ حضرت عثمان کی مظلومیت کا مرثیہ خوان کون ہو سکتا ہے؟ حضرت عثمان کو امیر المومنین کون کہتا ہے؟

تیسرا شاہد:۔ نویں ماہ محرم کو عزرہ بن قیس احمس (جو فوج مخالف میں تھا) اور جناب زہیر بن قین کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ اس کا ایک شمہ یہ ہے۔ عزرہ بن قیس کہتا ہے:

﴿یا زہیر ما کنت عندنا من شیعہ اہل ہذا البیت انما کنت عثمانیاً﴾ اے زہیر! تم تو ہماری دانست میں اس خاندان کے شیعوں میں سے نہ تھے بلکہ عثمانی مذہب رکھتے تھے۔ زہیر نے کہا: ﴿افلا تستدل بموقفی ہذا انی منہم... الخ﴾ اچھا اب تو میرے یہاں ہونے سے تم سمجھے کہ میں شیعیان اہل بیتؑ میں سے ہوں الخ۔۔۔۔۔ عزرہ کا یہ کہنا "تم تو شیعہ جماعت سے نہ تھے بلکہ عثمان کے ماننے والوں میں سے تھے۔" صریحی دلیل ہے کہ یہ طے شدہ امر تھا کہ اس وقت جو حسینؑ کا ساتھ دے وہ شیعہ جماعت سے ہے اور وہ لوگ جو ان کے مدمقابل میں تلواریں کھینچے ہوئے ہیں عثمانی المسلک اور مخالف تشیع ہیں۔ اور زہیر کا یہ مقولہ کہ "اب تو میرے یہاں ہونے سے سمجھے کہ میں شیعہ اہل بیتؑ ہوں" وہ بھی اس کا زبردست مؤید ہے۔

چوتھا شاہد:۔ اصحاب حسینؑ سے نافع بن ہلال جملی جنگ کے لیے نکلے اور وہ یوں رجز پڑھ رہے تھے: ﴿انا الجملی انا علی دین علیؑ﴾ میں قبیلہ بنی جمل میں سے اور علیؑ کے مذہب پر ہوں۔ ایک شخص مقابلہ پر نکلا جس کا نام مزاحم بن حریث تھا۔ اس نے کہا: ﴿انا علی دین عثمان﴾ میں تو عثمان کے مذہب پر ہوں۔ نافع نے کہا: ﴿انت علی دین شیطان﴾ یہ کہہ کر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔[2] اب تو تاریخ نے کوئی تتمہ باقی نہیں رکھا۔ طرفین کے مذہب کو اتنا روشن کر کے پیش کر دیا ہے کہ شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

پانچواں شاہد:۔ عین موقعۂ جنگ پر لشکر عمر بن سعد میں عمرو بن الحجاج نے کھڑے ہو کر آواز دی ﴿یا اہل الکوفۃ الزموا طاعتکم و جماعتکم ولا ترتابوا فی قتل من مرق من الدین و خالف الامام... الخ﴾ "اے اہل کوفہ، امیر کی اطاعت اور اپنی متفقہ رائے پر سختی سے قائم رہو اور کوئی شک نہ کرو۔ ان لوگوں کے قتل میں جو مذہب سے نکل گئے ہیں اور امام کی مخالفت کر رہے ہیں۔" امام حسینؑ نے یہ آواز سنی اور فرمایا: "اے عمرو بن الحجاج! تو

1۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۳۔

2۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۷۔

میری جنگ کے لیے لوگوں کو آمادہ کر رہا ہے؟ کیا ہم مذہب سے نکل گئے۔ اور تم مذہب پر قائم ہو؟ خدا کی قسم۔ جب یہ چند روزہ زندگی ختم ہو جائے گی اور موت کا مزہ چکھو گے اس وقت معلوم ہوگا کہ کون مذہب سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں سزا پانے کا مستحق ہے۔"[1]

اب کوئی بتلائے کہ وہ کون سا مذہب ہے جس سے علیحدہ ہونے کا الزام حسینؑ و اصحاب حسینؑ کو دیا جا رہا ہے اور یزید کس فرقہ کا امام ہے جس کی مخالفت کا الزام امام حسین علیہ السلام پر لگایا جا رہا ہے۔

چھٹا شاہد:۔ فرزند رسول شہید ہو چکے ہیں۔ حرم رسالت کی مخدرات اسیر ہو کر دربار ابن زیاد میں لائی گئیں۔ ابن زیاد نے اس موقع پر مجمع عام میں بر سر منبر جو تقریر کی۔ اس کا افتتاحی حصہ یہ ہے: ﴿الحمد لله الذی اظهر الحق و اهله و نصر امیر المؤمنین یزید بن معاویة و حزبه و قتل..... الحسینؑ بن علیؑ و شیعته... الخ﴾ خدا کا شکر ہے جس نے حق اور اہل حق کو فتح عنایت کی اور خلیفۂ وقت یزید بن معاویہ اور ان کے گروہ کی مدد فرمائی۔ اور حسینؑ بن علیؑ کو ان کے شیعوں سمیت قتل کیا۔"[2] اس سے صریحاً ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ قتل ہونے والی جماعت شیعہ تھی۔ اور ان کے قتل کرنے والے اس جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ بلکہ وہ اسی مذہب کے نام لیوا تھے جسے ابن زیاد حق کہتے ہوئے اس کی (ظاہری) فتح پر شکر ادا کر رہا ہے۔ وہ یزید کو امیر المؤمنین اور خلیفۂ حق سمجھنے والی جماعت میں داخل تھے۔

ساتواں شاہد:۔ قتل امام حسینؑ کا الزام اس جماعت اہل کوفہ پر عائد کرنا جو امام حسینؑ کی حقیقۃً بلانے والی تھی۔ اور یہ کہنا کہ وہ شیعہ ہی تھے۔ واقعیت سے کوسوں دور ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ کوفہ شیعیان اہل بیتؑ سے چھلک رہا تھا لیکن ادھر معاویہ کا ممالک اسلامیہ پر تسلط ہوا۔ اور کوفہ پر اپنے نامعلوم باپ کا بیٹا زیاد حاکم مقرر ہوا۔ ادھر شیعیان کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی چوڑی چکلی زمین ان پر تنگ ہوگئی۔ ان کا ہر نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیش گوئی کرتا۔ اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آخری ہونے کا پیغام سناتا۔ ابو الحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں اس زمانہ کی مرقع کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿کان اشد الناس بلاء حینئذٍ اهل الکوفة لکثرة من بها من شیعة علیؑ فاستعمل علیهم زیاد بن سمیة و ضم الیه البصرة فکان یتبع الشیعة وهو بهم عارف لانه کان منهم ایام علی فقتلهم تحت کل حجر و مدر و خافهم و قطع الایدی و الارجل و سمل العیون و صلبهم علی جذوع

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۴۹۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۶۳۔

النخل و طردهم و شردهم عن العراق فلم یبق بہا معروف منہم[1] "معاویہ کے دور حکومت میں سب سے زیادہ مصیبت میں اہل کوفہ تھے اس لیے کہ وہاں شیعیان علیؑ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ وہاں کا حاکم بھی زیاد بن سمیہ مقرر کیا گیا اور اس نے شیعوں کو پوری جستجو کے ساتھ گرفتار کیا۔ اور وہ ان کو پہچانتا بھی خوب تھا۔ کیونکہ علیؑ کے زمانہ میں وہ انہیں لوگوں کے ساتھ تھا۔ اس نے ان کو جہاں پایا قتل کیا۔ اور ہاتھ پاؤں قطع کیے۔ اور آنکھوں میں سلائیاں پھیر ڈالیں۔ اور درختوں پر سولیاں دلوائیں۔ اور عراق سے جلاوطن کیا۔ یہاں تک کہ کوئی مشہور و معروف شخص ان میں سے باقی نہ رہا۔"

اس صورت کے بعد ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعہ جماعت کے لیے کوئی نمایاں حیثیت باقی رہتی بلکہ مارے جانے، سولی پانے اور جلاوطن ہونے کے بعد جو بچے کھچے اشخاص موجود بھی تھے وہ گوشوں کے اندر اور پردوں کے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور شیعیت کا نام بھی زبان پر لانا اپنے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کرتے تھے۔

مثل مشہور ہے ظالم کی رسی دراز ہوا کرتی ہے۔ "یہ صورت حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ پورے بیس سال تک قائم رہی۔" بچے جوان، جوان بوڑھے اور بوڑھے فنا ہو گئے۔ شیعیت ایک مخصوص با معرفت اور صاحب ایمان جماعت میں مخفی حیثیت سے پرورش پا رہی تھی۔ اور وہ جماعت کوفہ کے اتنے بڑے شہر میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ رؤسائے عشائر اور شیوخ قبائل، ذمہ دار و با اقتدار اشخاص سب حکومت وقت کے ساختہ و پرداختہ اور اس کی خیر خواہی و وفاداری کی قسم کھائے ہوئے شاہی مذہب کے حلقہ بگوش و عقیدت کیش تھے۔ ان حالات میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ تیس ہزار کا لشکر جرار (فوج مخالف کی یہ کم از کم تعداد ہے جو ارباب سیر و تواریخ نے لکھی ہے) شیعیانِ کوفہ سے تیار کیا جائے؟ حاشا و کلا۔

حضرت مسلمؑ کے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار کوفیوں کے بیعت کرنے کے اسباب

یہ جو مشہور ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر اہل کوفہ کے اٹھارہ اور بروایتے بیس ہزار افراد نے جناب مسلم کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ تو یہ سب لوگ ہرگز شیعہ نہ تھے۔ عام خلقت بقول شخصے بھیڑ دھسان ہوتی ہے۔ جدھر ایک چلا اُدھر سب۔

ع "ہر کسے سکہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مطابق ہوا کے رُخ پر اڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے سرعت کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک ایسا اچانک امر جس میں جوش انگیزی کی طاقت ہو۔ وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کر سکتی۔ یزید کی خلافت سے

---

[1] نصائح کافیہ ص ۷۰۔

بسبب اس کی سیہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف۔ حسینؑ بن علیؑ کی ہر دلعزیزی۔ دوسری جانب وہ لوگ جو مسلم بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے۔ ان کی ذاتی وجاہت و تعلقات تیسری طرف اور ﴿کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ﴾ کے طبعی قانون کے مطابق ہر تازہ تحریک میں جو لذت یا جذب ہوتا ہے۔ وہ چوتھی طرف ان تمام باتوں کا مل کر یہ نتیجہ تھا کہ حضرت مسلمؑ کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب شیعہ تھے؟ کیا کوفہ میں زیادہ آل زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھنچی ہوئی تلواریں۔ اور جلادوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی میں مشغول رہے۔ اور دست و پا اور سر و زبان کا قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ کوفہ میں اٹھارہ بیس ہزار کی تعداد میں شیعہ ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ اور جب نہیں! تو کیا مذکورہ بالا سطحی عارضی اسباب سے جو رائے عام ہموار ہوئی ہو اس میں کوئی وزن یا ثبات و استقرار ہو سکتا ہے؟ اسی امر کا نتیجہ تھا جو بعد میں ظاہر ہوا۔

آٹھواں شاہد:۔ تاریخی حقائق کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ شیعیان علی کہلاتے تھے ان کی اکثریت حقیقی معنوں میں شیعہ نہ تھی بلکہ وہ حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتی تھی۔ ہاں صرف معاویہ کے مقابلہ میں محض حضرت علیؑ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے شیعہ علیؑ کہلاتی تھی۔ چنانچہ بعض آثار و اخبار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ایک بار حضرت امیرؑ نے جب ان لوگوں کو نماز تراویح پڑھنے سے روکا تو انہوں نے "۔۔۔۔۔۔۔۔۔! ہائے عمر! آج تیری قائم کردہ سنت تبدیل کی جا رہی ہے" کا شور و شغب بلند کیا جس کی بنا پر آپ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔[1] اور ایسے لوگ بھی زیادی حکومت کی وجہ سے اب زیادہ تعداد میں موجود نہیں تھے۔ مذکورہ بالا مسلم الثبوت تاریخی نصوص و شواہد سے اس دعویٰ کا بطلان اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ "قاتلان حسینؑ شیعہ تھے۔ اور یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ وہ نابکار دراصل مسلمان ہی تھے۔" ہاں البتہ ظاہری اعتبار سے سنی المذہب، عثمانی المسلک، عمری المسلک اور یزیدی المشرب مسلمان تھے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان خطوط کے لکھنے والوں میں سے جو جماعت شیعہ کے نام سے لکھے گئے ہیں۔

ایک شخص کی بھی موجودگی واقعہ کربلا میں امام حسینؑ کے مقابلہ میں پائی نہیں جاتی بلکہ ان میں سے جناب حبیب بن مظاہرؓ نے کربلا میں امام حسینؑ کے قدموں پر جاں نثاری کے ساتھ دم توڑ کر ہمیشہ کے لیے سرخروئی حاصل کی۔ اور ان اشخاص میں سے جو خطوط لے جانے والے تھے۔ سعید بن عبداللہ حنفی نے اس طرح جان نثار کی جس کی نظیر کسی شہید کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارجبی روز عاشوراء امام سے اجازت لے کر میدان

---

[1] احتجاج طبرسی، ص ۱۳۱۔

قتال میں آئے اور یہ رجز پڑھا: ﴿صبراً علی الاسیاف و الاسنة صبراً علیها لدخول الجنة﴾ پھر جنگ کی، یہاں تک کہ شہید[1] ہوئے اور قیس بن مسہر صیداوی نے اپنی زندگی کے آخری نفس تک جس ثبات واستقلال کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کیا۔ اس کا تذکرہ صفحاتِ تاریخ پر زریں حرفوں میں ثبت رہے گا۔[2] بہرحال ان خطوط کے لکھنے والے شیعہ تھے اور ان کی برأت قتل حضرت سید الشہداءؑ سے یقینی طور پر ثابت ہے۔ علاوہ بریں شہداء کربلا کی اکثریت کا تعلق اہل کوفہ سے ہے جس کی تفصیل بعد میں بیان ہوگی انشاء اللہ۔ برخلاف اس کے آخری خط جس پر سات آدمیوں کے دستخط تھے (جس پر سولہویں باب میں تبصرہ کیا جا چکا ہے) ان میں سے پانچ شخص شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، عزرہ بن قیس، عمرو بن الحجاج اور یزید بن الحارث مسلماً واقعۂ کربلا میں موجود اور قتل امام میں شریک تھے۔ یہ وہی اشخاص ہیں جن کے متعلق سابقہ باب میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے کہ نہ انہوں نے اپنے تئیں شیعہ لکھا اور نہ واقعات کی بنا پر ان کا شیعہ جماعت سے کوئی تعلق معلوم ہوتا ہے۔

شیعیانِ کوفہ کی نصرت وامدادِ امامؑ میں تقصیر وکوتاہی کے علل واسباب

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا مان لیا کہ شیعیانِ کوفہ نے قتل امامؑ میں شمولیت نہیں کی مگر انہوں نے اس طرح نصرتِ امام کا فریضہ بھی تو انجام نہیں دیا جس کا انہوں نے اپنے خطوط میں وعدہ کیا تھا۔

اس کے متعلق گزارش ہے کہ اوراقِ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے اس بات کے متعدد علل واسباب نظر آتے ہیں۔

__پہلا سبب__:۔ کوفہ کی جماعت شیعہ جو امام حسینؑ کی ہمدرد ہو سکتی تھی۔ اس کی ایک کثیر تعداد پابہ زنجیر کر لی گئی تھی۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یزید نے ابن زیاد کو لکھا: ﴿انه بلغنی ان الحسینؑ بن علیؑ قد توجهٔ نحو العراق فضع المناظر و المسالح و احترس علی الظن و خذ علی التهمة﴾ مجھ کو یہ خبر معلوم ہوئی ہے کہ حسینؑ بن علیؑ عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ تم ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو۔ اور لشکر بناؤ اور جس سے خطرہ کا وہم وگمان بھی ہو تو اس سے تحفظ کرو اور بدگمانی جس پر ہو اسے فوراً گرفتار کر لو۔[3] بس اب کیا تھا قید خانے قیدیوں سے چھلکنے لگے۔ اس کا اندازہ ابن زیاد کے اس فقرہ سے ہوتا ہے جو اس نے ایک موقع پر کہا تھا: ﴿وما ترکت لکم ذا ظنة اخافه علیکم الا وهو فی سجنکم﴾ کوئی ایسا شخص نہیں جس پر مجھے گمان بھی ہو سکتا تھا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے گا مگر یہ کہ وہ قید خانہ کے اندر ہے۔[4] انہی قیدیوں میں سے ایک مختار بن عبید اللہ ثقفی بھی تھا۔

---

[1] ابصار العین، ص ۸۰۔
[2] طبری، ج ۶، ص ۲۲۳۔
[3] طبری، ج ۶، ص ۲۱۵۔
[4] طبری، ج ۷، ص ۱۸۔

دوسرا سبب:۔ حدود کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ اور راستوں کے انسداد نے کوفہ کے رہے سہے اشخاص کے لیے جن میں جذبۂ نصرتِ حسینؑ ہو سکتا تھا۔ حضرتؑ تک پہنچنے کو دشوار سے دشوار تر بنا دیا تھا۔[۱] اور اگر وہ آنے کا قصد کرتے بھی تو یقیناً نخیلہ میں کہ جو بالکل کوفہ کے نکڑ پر کربلا کے راستے میں تھا، گرفتار کر لیے جاتے۔ یا آگے بڑھ کر قادسیہ وغیرہ کی منزل پر دست گیر ہو جاتے۔ چنانچہ قیس بن مسہر صیداوی اور عبداللہ بن یقطر جو امام حسینؑ کے فرستادہ اہل کوفہ کے نام خط لے جا رہے تھے وہ اسی قادسیہ میں پہنچ کر حصین بن تمیم کے ہاتھوں گرفتار ہوئے جو کئی ہزار سواروں کے ساتھ وہاں مقرر تھا۔[۲]

تیسرا سبب:۔ ابن زیاد کی طرف سے یہ اہتمام تھا کہ کوئی جنگ آزما شخص کوفہ میں ایسا نہ رہ جائے جو حسین کی جنگ کے لیے نہ نکلے۔ اس طرح ان افراد کے لیے جو حسینؑ کے مقابلہ سے نفرت کرتے تھے اس جرم سے حفاظت بھی تلف جان و مال کی ضامن بن گئی تھی۔ چنانچہ کوئی شخص واپس لوٹنا چاہتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ اس کام پر سوید بن عبدالرحمٰن منقری کچھ سواروں کے ساتھ مقرر تھا۔ چنانچہ سوید نے ایک شخص کو اہل شام میں سے جو کوفہ کسی اپنے ذاتی معاملہ کے لیے آیا تھا گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھیجا اور اس نے ہیبت قائم کرنے کے لیے اس کو قتل کرا[۳] دیا۔

چوتھا سبب:۔ مخفی نہ رہے کہ یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر شیعیان کوفہ حضرت مسلمؑ کی بھی مدد و نصرت نہ کر سکے۔ ان کے علاوہ یہاں ایک اور چوتھا سبب یہ بھی تھا کہ حضرت مسلمؑ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ قیام کا جو پروگرام مرتب کیا تھا وہ جناب ہانی بن عروہ کے ناگہانی گرفتار بلا ہو جانے کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا۔ چنانچہ مورخ طبری نے تصریح کی ہے کہ ﴿لم یکن خروجه یوم خرج علی میعادٍ من اصحابه انما خرج حین قیل له ان هانی بن عروه المرادی قد ضرب و حبس﴾ مسلمؑ کا جنگ کے لیے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا۔ اور کوئی قرارداد اس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ تو ایک مرتبہ اس وقت کھڑے ہو گئے جب ان کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی کو زدوکوب کرنے کے بعد قید کر دیا گیا ہے۔[۴] واقعہ کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ کیوں کر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ بیعت کرنے والے ایک دم جمع ہو جاتے؟

بہرحال باوجود ان دشواریوں کے، ان ہمت شکن مشکلات کے اور ان طاقت ربا مصائب کے وہ افراد شیعہ جو حسینؑ دعوت کے بانی و مبلغ تھے۔ اور اس تحریک کے داعی و مروج تھے (الا من شذ) وہ کسی نہ کسی طرح حسینؑ بن علیؑ تک پہنچ گئے اور اپنی جانیں ان کے قدموں پر نثار کر دیں۔ عابس بن شبیب شاکری، حبیب بن مظاہر اسدی، سعید بن

---

[۱] طبری، ج ۶، ص ۲۲۳۔
[۲] طبری، ج ۶، ص ۲۲۳۔
[۳] الاخبار الطوال، ص ۲۵۲۔
[۴] طبری، ج ۷، ص ۵۸۔

عبد اللہ حنفی، ابو ثمامہ صیداوی، بریر بن خضیر ہمدانی، اور نافع بن ہلال جملی وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے حالات بعد ازیں انصار حسینی" کے ضمن میں بیان ہوں گے انشاء اللہ۔ انہوں نے نہایت ثبات قدم کے ساتھ آخری نفس تک امام کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور آخر ان کی لاشیں حسینؑ کے قدموں پر خاک وخون میں تڑپتی ہوئی نظر آئیں۔"

ع بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

باوجود ان اعذار وموانع اور مشکلات کے ہم اس امر کے ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اکثر لوگوں نے نصرت جناب مسلمؑ اور نصرت امامؑ سے پہلوتہی ضرور کی۔ اور اپنی جانیں نثار کرنے میں کوتاہی کی۔ اور اس جرم کے وہ خود بھی معترف تھے۔ (جو بعد میں جماعت توابین کی شکل میں ظاہر ہوئے) لیکن ان کا یہ جرم اس جرم سے سنگین تر نہیں کہ رسولؐ کو میدان جنگ میں دشمنوں کے نرغہ میں تنہا چھوڑ کر اپنی جان کی حفاظت کے لیے فرار کریں۔ اور حضرت عثمان کو دار الخلافہ اور مرکزی حکومت مدینہ منورہ کے اندر مصر سے آئی ہوئی فوجوں کے حلقہ میں قصر کے اندر محصور چھوڑ کر تماشہ دیکھتے رہیں۔ اور ان کے قتل ہو جانے کے بعد تین دن بعد تک ان کی لاش دفن کرنے کی بھی جرأت نہ کریں۔ یاد رہے کہ رسول اکرمؐ کے ساتھ صحابہ کرامؓ میں سے جنگ احد میں دس آدمی ہی نہ رہے تھے۔ اور جنگ حنین میں بارہ سے زیادہ لڑائی میں نہ ٹھہرے تھے۔ اور یوم الدار حضرت عثمان کی مدد کے لیے ان کی ماننے والی جماعت میں سے بیس آدمی بھی جان نثار دکھائی نہ دیئے تھے۔ لیکن فرزند رسولؐ حسین بن علیؑ کے ساتھ جماعت شیعہ میں سے عزیز واقارب کو چھوڑ کر کم از کم چون (۵۴) جانیں قربان کرنے والے آدمی نکل آئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی غیرت کا تقاضا ہے کہ جماعت شیعہ کو حسینؑ کی نصرت میں کوتاہی کا طعنہ دیا جائے یا اس سے بڑھ کر قتل حسینؑ کا بے بنیاد الزام لگایا جائے۔"[1]

جب امام عالی مقام کو اہل کوفہ کی وفاداری پر یقین نہ تھا تو پھر ان کی دعوت قبول کیوں فرمائی؟

طول کلام کی وجہ سے ہمیں قارئین کرام کے ملال وتکدر طبع کا پورا پورا احساس ہے مگر اس مطلب کی اہمیت کے پیش نظر عنان بیان کو قدرے ڈھیلا چھوڑنا پڑا۔ جس کے لیے ہم معزز قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ اب ذیل میں ایک دوسرے وضاحت طلب امر پر بھی مختصر سا تبصرہ کیا جاتا ہے۔ کہنے والے کہتے رہتے ہیں کہ جب اہل کوفہ کے متعلق امام حسینؑ کو علم تھا کہ انہوں نے ان کے والد ماجد اور برادر معظم کے ساتھ وفا نہ کی تو پھر انہوں نے ان پر اعتماد کیوں کیا؟ خصوصاً جبکہ آپؑ کے بعض خیر خواہوں نے بھی آپ کو کوفہ جانے سے روکا تھا؟ اگرچہ مذکورہ بالا حقائق پر غائرانہ نگاہ ڈالنے سے اس سوال کا جواب معلوم ہو جاتا ہے۔ تاہم ذیل میں اس کی کسی قدر وضاحت کی جاتی ہے۔

---

[1] انتھی ما اردنا نقلہ من الرسالہ الشریفۃ المسماۃ بہ "قاتلانِ حسین کا مذہب"۔

صورتِ حال یہ ہے کہ آپ یزید سے بیعت جیسا کہ اب تک نہیں کی۔ آئندہ بھی کرنا نہیں چاہتے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا پر آپؑ سے بیعت لی جائے یا قتل کر دیئے جائیں۔ ناممکن ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تابکے! جبکہ یزید کے اخلاق و عادات اور احکام مذہبی کے مقابلہ میں خودسری سے یہ توقع بعید تھی کہ وہ مکہ معظمہ کے مذہبی احترام کا لحاظ کرے گا بلکہ یہ خطرہ بہت قریب تھا کہ مکہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکہ میں آپ کے خلاف فوج کشی ہو اور مکہ میں نہ کوئی فوجی طاقت ایسی ہے جو آپ کی حفاظت کر سکے۔ اور نہ آپؑ مکہ میں قیام کر کے حرم خدا کے اندر خونریزی ہونے کے خود باعث بننا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ باوجودیکہ رسولؐ کے نواسے کی مہاجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے مگر طائف ہو یا یمن، بصرہ ہو یا یمامہ کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں۔ اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ ایسے سخت اور نازک موقع پر عرب کے آباد ترین مقام خطہ ملک (عراق) اور اس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں۔ اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ پچپن عرضداشتیں اور دو خورجین بھر کے خطوط اور سات قاصد یکے بعد دیگرے روانہ کئے جاتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جن کی محبت پر آپ کو پورا بھروسا ہے۔ جیسے حبیب بن مظاہر، سلیمان بن صرد، رفاعہ بن شداد وغیرہ۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا آپ کے لیے مناسب تھا کہ اس دعوت کو مسترد کر دیتے؟

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قیام کی صورت میں بھی حضرت کا شہید ہونا یقینی تھا یعنی جیسے عبداللہ بن زبیر پر اسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے۔ اسی طرح آپ پر بھی فوج کشی ہوتی۔ اور یہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا۔ اس صورت میں جبکہ اہل کوفہ کی جانب سے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت دی جا رہی تھی۔ اور آپ کی نصرت کا وعدہ کیا جا رہا تھا۔ آپؑ اس دعوت کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام کرتے اور شہید کئے جاتے تو یہی لوگ جو آپؑ پر اب اعتراض کرتے ہیں کہ آپؑ کوفہ کیوں گئے؟ یہی یہ کہنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے کہ کون سی عقل مندی تھی کہ ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت و وعدۂ نصرت کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپؑ کے والد بزرگوار کی بھی نصرت کر چکے تھے۔ اور خود آپ کی بھی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اس وقت بجان و دل آپ کی حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سینکڑوں عرض داشتیں بھیج کر آپؑ سے قیادت و ہدایت کے طالب تھے۔ ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے دے کر مکہ میں قیام رکھا جہاں کی زمین بے آب و گیاہ، جہاں کے رہنے والے پست حوصلہ و بے امنگ اور جہاں کی فضا بے مہر و وفا، یہاں تک کہ قتل بھی ہوئے اور مکہ معظمہ کی حرمت کو بھی برباد کرایا۔ ان صورتوں میں ظاہر ہے کہ عقل و تدبر کا اقتضا یہی

تھا کہ ان بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ بھی ثابت ہوں تب بھی ان پر اتمام حجت کیا جائے۔

بے شک تھے ایسے لوگ جو آپؑ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ عراق والوں کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں مگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کیے ہوئے تھے کہ مکہ معظمہ میں آپؑ کا قیام آپؑ کو قتل سے بچا نہ سکتا تھا۔ بلکہ حقیقتاً اگر موازنہ کیا جاتا تو موجودہ حالات کے لحاظ سے مکہ میں قیام کی صورت میں آپؑ کا قتل کیا جانا یقینی اور کوفہ کی طرف روانگی کی صورت میں مشکوک تھا۔ اس لیے کہ ظاہری اسباب وعلل کے ماتحت اہل کوفہ کے مواعید غلط ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ بلکہ یہ خیال صرف ان کے ذاتی افتادِ طبع کے متعلق ایک غیر متیقن حکم بلکہ بدگمانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس صورت میں اگر آپؑ مکہ میں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپؑ کی شہادت سے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہل کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہتے ہوئے نوع انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں۔ تو اب اگر آپؑ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مروّت کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام کرتے ہوئے اور حفاظت خود اختیاری کے اصول پر تاحدِ امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے کو مکہ سے علیحدہ کر کے مکہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔

اسی طرح امامؑ نے ان لوگوں کے جواب میں جو آپؑ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے جیسے عبداللہ بن عباس وغیرہ کبھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے اور اگر میں وہاں جاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کریں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ آپؑ نے زیادہ تر عراق کے متعلق ان کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور سے قائم رہنے کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ ابن عباس سے گفتگو کے موقع پر[1] اور بھی صاف کہہ دیا کہ میں یہاں رہوں گا۔ تو بھی قتل ہوں گا۔ اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا جیسا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیر سے فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہوگا۔ جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی۔ میں وہ مینڈھا ہرگز نہیں بننا چاہتا۔[2] دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا۔ تو ابن زبیر کے جانے کے بعد آپؑ نے اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا: جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمائیے۔ اور باہر نہ جائیے! اس کے بعد آپؑ نے فرمایا: ”خدا

---

[1] الاخبار الطوال، ص ۲۴۳۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۱۷۔

کی قسم میں ایک بالشت بھر مکہ کے حدود سے باہر قتل کیا جاؤں۔ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں۔ اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں۔ تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے باہر لے آئیں گے۔ یہاں تک کہ جیسا چاہتے ہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کریں گے جیسے یہود نے روزِ شنبہ کے بارے میں ظلم وتعدی سے کام لیا۔[۱]

ان حالات میں ظاہری اسباب کی بنا پر آپؑ کے لیے کوفہ کی طرف تشریف لے جانا ناگریز تھا۔ اور آپ کے لیے اہل کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب نہ تھا۔ پھر بھی آپؑ نے بحسب ظاہر اسباب احتیاطی تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیلؑ کو جو مدینہ سے آپؑ کے ساتھ آئے تھے۔ اپنا نمائندہ بنا کر حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوفہ جانے پر مامور فرمایا۔[۲] [۳]

فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید

---

۱ طبری، ج ۶، ص ۲۱۷۔

۲ طبری، ج ۶، ص ۱۹۳۔ الاخبار الطوال، ص ۲۳۲۔

۳ شہید انسانیت، از صفحہ ۲۵۳ تا صفحہ ۲۵۷۔

اٹھارھواں باب

حضرت مسلمؑ بن عقیلؑ کی بجانب کوفہ روانگی اور شہادت

حضرت امام حسینؑ نے اہل کوفہ کے آخری دو قاصدوں ہانی اور سعید کے ہاتھ ان کے خطوط کا وہ جواب باصواب دے کر جو اسی کتاب کے سولہویں باب میں درج کیا جا چکا ہے۔ روانہ کر دیا۔ اس جواب کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ آپؑ نے جناب مسلمؑ کو حرب و ضرب اور تسخیر کوفہ کے لیے روانہ نہیں فرمایا بلکہ صرف وہاں کے لوگوں کے صحیح صحیح حالات و خیالات کا جائزہ لینے اور پھر صورت حال کی آنجناب کو اطلاع دینے کے لیے بھیجا ہے۔ بہر حال ان کو روانہ کرنے کے بعد ۱۵ ماہ رمضان المبارک ۶۰ھ کو قیس بن مسہر صیداوی اور عمارہ بن عبد اللہ سلولی اور عبد الرحمن ازدی کے ہمراہ (جو کہ اہل کوفہ کے نامہ بر تھے) جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کو بھی روانہ کر دیا۔ اس مذکرہ بالا خط میں آنجناب نے جناب مسلم کے متعلق جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ ﴿انی باعث الیکم اخی و ابن عمی و ثقتی من اھل بیتی﴾ ان سے جناب مسلمؑ کی شخصی عظمت و جلالت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ جناب سید الشہداءؑ نے جناب مسلمؑ کو تقویٰ اختیار کیے رکھنے اور اپنے مشن کو مخفی رکھنے اور حالات سازگار ہوں تو اس کی جلدی اطلاع دینے کا حکم دے کر روانہ فرمایا۔ جناب مسلمؑ آپؑ سے رخصت ہو کر ان حضرات کی ہمراہی میں مدینۂ رسولؐ پہنچے۔ مسجد نبویؐ میں نماز کی چند رکعتیں پڑھیں۔ پھر اپنے بعض اعزا و اقارب سے الوداع کیا۔ قبیلہ قیس کے دو راستہ شناس آدمی (اجرت پر) ساتھ لیے۔ اور کوفہ کی طرف چھ آدمیوں کا یہ مختصر سا قافلہ روانہ ہو گیا۔ تھوڑا راستہ ہی طے کیا تھا کہ سوئے اتفاق سے خود راہبر راہ گم کر بیٹھے اور ریگستان عرب کا چکر لگانے لگے۔ اور بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں سے صحیح راستہ کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے حضرت مسلمؑ کو ہاتھوں سے اشارہ کر کے راستہ کی نشاندہی کی اور اس کے بعد شدت پیاس سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ اور جان بحق ہو گئے (قرائن حالیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مسلمؑ اور ان کے ساتھی بھی صعوبت سفر اور شدت پیاس سے کچھ اس طرح نڈھال ہو چکے تھے کہ وہ ان مرنے والوں کی کوئی دیکھ بھال اور امداد نہ کر سکے) جناب مسلمؑ (اور ان کے دیگر ہمراہیوں نے) بمشکل تمام اپنے آپ کو وادی خبیت کے ایک آباد چشمہ معروف بہ مضیق تک پہنچایا۔ وہاں پہنچ کر قیام فرمایا۔ اور قیس بن مسہر صیداوی کے ہاتھ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا جس میں اپنی تکلیف سفر، شدت و پیاس سے بلک بلک کر ہمراہیوں کے مر جانے اور اپنے آپ کو بمشکل تمام مضیق کے مقام تک پہنچانے کے واقعات لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ناخوشگوار تاثرات قلمبند

کر کے آگے بڑھنے کے متعلق تردد کا اظہار بھی کیا۔ لیکن جب اُدھر سے امام عالی مقامؑ کا کوفہ جانے کے متعلق تاکیدی حکم نامہ پہنچ گیا۔ تو اس نے جناب مسلمؑ کو آگے روانہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ جناب روانہ ہو گئے، چلتے چلتے بنی طئے کے ایک چشمہ کے پاس پہنچے۔ وہاں کچھ دیر قیام فرمایا۔ پھر آگے بڑھے، دیکھا کہ ایک شخص شکار کھیلنے میں مشغول ہے۔ جناب نے دیکھا کہ اس شخص نے ہرن کو تیر مارا ہے۔ جس نے اسے نڈھال کر دیا۔ یہاں تک کہ صیاد نے اسے پکڑ لیا۔ جناب مسلمؑ نے (فال نیک لیتے ہوئے فرمایا) ہم بھی اسی طرح اپنے دشمنوں پر ظفریاب ہوں گے انشاء اللہ۔

اسی طرح منازل سفر طے کرتے ہوئے پانچ شوال[1] کو کوفہ میں وارد ہوئے۔ اور مختار بن عبیداللہ ثقفی کے گھر میں رحل اقامت ڈالا۔[2] قرائن وشواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سلیمان بن صرد خزاعی کوفہ میں موجود نہیں تھے ورنہ ضرور جناب مسلمؑ انہی کے گھر میں قیام فرماتے کیونکہ وہ علاوہ ایک مقتدر اور صاحب حیثیت ہونے کے اس تحریک کے قالب کی جان اور روح رواں بھی تھے۔ مختار کے گھر جناب مسلمؑ کے قیام کرنے سے مختار کے حسن حال پر کافی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مختار محب اہل بیتؑ اور قابل اعتماد نہ ہوتے تو جناب مسلمؑ ہرگز ان کے گھر قیام نہ فرماتے اور نہ ہی مومنین کوفہ اس پر رضامند ہوتے۔ کما لا یخفی۔ ہاں مروج[3] الذہب کے بیان سے مستفاد ہوتا ہے کہ جناب نے عوسجہ (غالباً مسلم بن عوسجہ مراد ہے) کے گھر میں قیام کیا۔ مگر مشہور یہی ہے جو ہم نے اوپر لکھ دیا ہے۔

جناب مسلمؑ کے کوفہ پہنچنے کی خبر تمام شہر میں جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پھیل گئی۔ اور لوگ جوق در جوق جناب کی ملاقات وزیارت کے لیے حاضر خدمت ہونے لگے۔ جب کافی لوگ جمع ہو گئے تو جناب مسلمؑ نے حضرت سید الشہداءؑ کا مکتوب گرامی جو اہل کوفہ کے نام تھا۔ پڑھ کر سنایا۔ لوگوں نے بڑا اچھا اثر لیا۔ اور بعض لوگ تو شدت تاثرات سے رونے لگے۔ اور اسی جوش وخروش کے عالم میں بعض حضرات نے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ عابس بن شبیب شاکری نے حمد وثنائے خدا کے بعد کہا: ﴿اما بعد فانی لا اخبرک عن الناس ولا اعلم ما فی انفسهم وما اغرک منهم و الله احدثک عما انا موطن نفسی علیه و الله لا جیبنکم اذا دعوتم ولا قاتلن معکم عدوکم ولا ضربن بسیفی دونکم حتی القی الله تعالی لا ارید بذلک الا ما عند الله﴾۔ "میں دوسرے لوگوں کے متعلق آپ سے کچھ نہیں کہتا۔ اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں

---

[1] مروج الذہب، ج ۳، ص ۴۔

[2] ارشاد، ص ۱۸۵۔ نفس المہموم، ص ۴۴۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۷۔ عاشر بحار، ص ۱۷۹ وغیرہ۔

[3] مروج الذہب، ج ۳، ص ۴، مصر۔

میں کیا ہے اور ان کے بارے میں (کوئی غلط بات کہہ کر) آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ میں تو آپ کو صرف وہ بات بتاتا ہوں جس کا میں نے پکا ارادہ کر رکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا کی قسم آپ جب بھی مجھے بلائیں گے تو میں لبیک کہتا ہوا حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کے دشمنوں سے لڑوں گا یہاں تک آپ کے ہمراہ شمشیر زنی کرتا ہوا بارگاہ خدا میں پہنچ جاؤں۔ اور اس سے میرا مقصد صرف خوشنودئ خدا حاصل کرنا ہے۔" اس کے بعد جناب حبیب ابن مظاہر نے کھڑے ہو کر عابس کو داد دیتے ہوئے کہا: ﴿رحمک اللہ قد قضیت ما فی نفسک بواجز من قولک ثم قال انا و اللہ الذی لا الہ الا ہو علی مثل ما ھذا علیہ﴾ خدا تم پر رحم کرے تم نے بہت مختصر اور عمدہ الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا ہے۔ پھر فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی معبود برحق نہیں کہ میرا ابھی یہی نظریہ ہے جو اس (عابس) کا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن سعید حنفی نے بھی (ایسے ہی پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا۔[1] اس کے بعد بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند دنوں میں بنابر مشہور اٹھارہ ہزار اور بروایت مناقب شہر ابن آشوب پچیس ہزار کوفیوں نے جناب مسلم کے ہاتھ پر حضرت امام حسینؑ کے لیے بیعت کی۔[2] چنانچہ جناب مسلمؑ نے اٹھارہ ہزار آدمیوں کے بیعت کرنے اور حالات اور فضا کے سازگار ہونے کی کیفیت لکھ کر حضرت سید الشہداءؑ سے جلدی تشریف لانے کی استدعا پر مشتمل ایک خط ان کو مکہ روانہ کیا۔ جس کا مضمون تھا: ﴿اما بعد فان الرائد لا یکذب اھلہ و ان جمیع اھل الکوفۃ معک وقد بایعنی منھم ثمانیۃ عشر الفا فعجل الاقبال حین تقرا کتابی و السلام علیک و رحمۃ اللہ و برکاتہ﴾ "حمد و ثنائے خدا کے بعد کبھی پیشرو اپنے اہل و عیال سے جھوٹ نہیں بولتا۔ تمام اہل کوفہ آپؑ کے ساتھ ہیں۔ اٹھارہ ہزار نفوس نے میری بیعت کر لی ہے۔ میرا مکتوب پڑھتے ہی آپ جلد تشریف لے آئیں والسلام علیک ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔" اور یہ خط جناب مسلمؑ نے عابس بن ابی شبیب شاکری اور قیس بن مسہر صیداوی کے ہاتھ روانہ کیا۔[3] یہ حضرت مسلمؑ کی شہادت سے ستائیس روز قبل (قریباً ۱۲ ذی القعدہ ۶۰ھ) کا واقعہ ہے۔[4] اِدھر اُدھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ نہ تو جناب مسلمؑ نے حکومت وقت سے کوئی تعرض کیا۔ اور نہ دار الامارہ پر قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ حضرت سید الشہداءؑ نے ان کو صرف طالبان رشد و ہدایت کی مذہبی اور اخلاقی اصلاح کرنے کی خاطر ان کے حالات و خیالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے۔ انہیں ان لوگوں کی سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔ ورنہ اگر کوئی شورش پسند آدمی ہوتا تو سب سے پہلے دار الامارہ پر قبضہ کرنے کی فکر کرتا۔

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۱۹۹۔ نفس المہموم، ص ۹۳ وغیرہ۔

[2] ارشاد، ص ۲۱۸۔ لہوف، ص ۲۱۸۔ عاشر بحار، ص ۱۷۶ وغیرہ۔

[3] نفس المہموم، ص ۵۹۔

[4] نفس المہموم، ص ۳۳۔

نعمان بن بشیر حاکم کوفہ

دوسری طرف مقامی حکومت کا رویہ بھی نرم معلوم ہوتا ہے۔ کوفہ کا گورنر نعمان بن بشیر ہے جو معاویہ کے وقت میں کوفہ کا گورنر تھا۔ بعد میں یزید نے بھی اسے اس عہدہ پر بحال رکھا۔ یہ شخص قدرے صلح جُو اور سلامتی پسند تھا۔

البتہ جب حاکم کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ بڑی کثرت کے ساتھ جناب مسلمؑ کی خدمت میں آتے اور جاتے ہیں اور وہ امام حسینؑ کے لیے بیعت لے رہے ہیں۔ تو اس نے منبر پر جا کر ایک جاندار تقریر کی۔ مگر اس سے بھی اس کی صلح جوئی کا جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔ حمد وثنائے الٰہی کے بعد کہا: ﴿اما بعد فاتقوا اللّٰہ عباد اللّٰہ ولا تسارعوا الی الفتنۃ و الفرقۃ فان فیھا یھلک الرجال و یسفک الدماء و تغصب الاموال انی لا اقاتل من لا یقاتلنی ولا آتی علی من لم یات علی ولا انبہ نائمکم ولا اتحرش بکم ولا اخذکم بالقرف ولا الظنۃ ولا التھمۃ و لکنکم ان ابدیتم صفحتکم لی و نکثتم بیعتکم و خالفتم امامکم فو اللّٰہ الذی لا الہ غیرہ لا ضربتکم لسیفی ھذا... الخ﴾ اے خدا کے بندو! فتنہ وفساد اور باہمی انتشار وخلفشار سے اجتناب کرو کیونکہ ایسا کرنے میں لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ خون بہتے ہیں۔ اور مال تباہ ہوتے ہیں۔ میرا رویہ تو یہ ہے کہ جو شخص مجھ سے جنگ نہیں کرے گا میں بھی اس سے جنگ نہیں کروں گا۔ نہ میں تمہارے خوابیدہ کو بیدار کروں گا۔ اور نہ ہی محض بدگمانیوں اور غلط تہمتوں پر تمہارا مواخذہ کروں گا لیکن اگر تم نے میری کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی اور اپنے امام (یزید) کی بیعت توڑ دی تو پھر میں تمہیں اپنی تلوار سے ماروں گا[1]۔۔۔ الخ

بنی امیہ کے ان ہوا خواہوں کو جن کو اہل بیت رسولؐ کے برسر اقتدار آنے کی صورت میں اپنے چھوٹے وقار واقتدار کی موت نظر آتی تھی۔ ان کو حاکم کوفہ نعمان بن بشیر کی یہ صلح جویانہ اور روادارانہ روش ورفتار ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چنانچہ نعمان کی مذکورہ بالا تقریر کے بعد بنی امیہ کے حلیف عبداللہ بن مسلم بن سعید حضرمی نے وہیں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا: ﴿انہ لا یصلح ما تری الا الغشم و ھذا الذی انت علیہ فیما بینک و بین عدوک رای المستضعفین﴾ آپ کا یہ رویہ درست نہیں۔ سوائے ظلم وزیادتی کے اصلاح احوال نہ ہوگی۔ آپ نے اپنے دشمن کے متعلق جو رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ کمزور لوگوں کا شیوہ ہے۔ نعمان بن بشیر نے جواباً کہا: ﴿لان اکون من المستضعفین فی طاعۃ اللّٰہ احب الیّ من ان اکون من الاعزین فی معصیۃ اللّٰہ﴾ اگر میں اطاعت خدا میں کمزور لوگوں میں سے ہوں تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اس سے کہ معصیت خدا میں زور آوروں میں سے ہوں۔[2] یہ کہہ کر نعمان منبر سے نیچے اتر آیا۔

---

[1] ارشاد، ص ۲۱۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۷ وغیرہ۔ [2] ارشاد، ص ۲۱۸۔ طبری، ج ۶، ص ۱۹۹۔

ہواخواہان بنی امیہ کا یزید کے پاس نعمان کے متعلق شکایتی خطوط لکھنا

اس وقت تو عبداللہ بن مسلم خاموش ہوگیا۔ مگر اس نے واپس گھر آ کر اس مضمون کا ایک خط یزید کو لکھا کہ نعمان بن بشیر کمزور شخص ہے یا جان بوجھ کر کمزوری دکھا رہا ہے اگر کوفہ کو اپنے پاس رکھنا ہے تو یہاں کوئی طاقتور اور دلیر آدمی مقرر کرو۔ اسکے بعد عمر بن سعد اور عمارہ بن عقبہ وغیرہ نے بھی یزید کو اسی مضمون کے خطوط لکھے۔[1] (کما تقدم)

جب یزید کو یہ خطوط پہنچے تو اس نے سرجون (بن منصور رومی جو کہ عیسائی المذہب اور معاویہ کے وقت میں محکمۂ خراج میں کاتب[2] تھا) سے اس معاملہ میں مشورہ لیا۔ سرجون نے عبیداللہ بن زیاد کا نام پیش کیا۔ کہ اسے کوفے کا حاکم بنادو۔ (چونکہ یزید بعض وجوہ کی بنا پر اب تک ابن زیاد سے ناراض تھا۔ جب سرجون نے دیکھا کہ یزید اس پر آمادہ نہیں ہو رہا۔ تو اس نے فوراً کہا) اگر اس وقت معاویہ زندہ ہو کر آجائیں اور وہ آپ کو یہی مشورہ دیں تو کیا آپ ان کے مشورہ پر عمل کریں گے؟ یزید نے کہا: ضرور! یہ کہہ کر سرجون نے معاویہ کی ایک تحریر نکالی۔ جس میں معاویہ نے عبیداللہ بن زیاد کو بصرہ کے ساتھ ساتھ کوفہ کا حاکم بھی بنایا تھا۔ سرجون نے کہا: یہ لو۔ معاویہ کا مشورہ یہ ہے۔ جس پر وہ بوجہ موت عمل درآمد نہ کر سکے۔ یزید نے یہ دیکھ کر کہا: بہت اچھا میں اب ایسا ہی کروں گا۔[3]

چنانچہ یزید نے مسلم بن عمرو باہلی کے ہاتھ عبیداللہ ابن زیاد کو (جو اس وقت حاکم بصرہ تھا) یہ خط لکھا جو اسی کتاب کے سولہویں باب میں درج کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کوفہ کا پروانہ بھی لکھ کر بھیج دیا۔[4]

نعمان بن بشیر کی معزولی

نعمان بن بشیر کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا گیا۔ اسی طرح ولید بن عتبہ کی روادارانہ روش کی وجہ سے معزول کر کے اس کی جگہ عمرو بن سعید الاشدق کو حاکم مدینہ مقرر کر دیا گیا۔ حکومت کی اس روش سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خاندانِ نبوت کو ختم کرنے کے لیے سخت سے سخت ظالم و سفاک لوگوں کی تلاش میں سرگردان تھی۔ اور صلح جو اور روادار قسم کے لوگوں کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ بہرحال جب ابن زیاد کو یہ حکم نامہ پہنچا تو اس نے اپنے بھائی عثمان بن زیاد کو بصرہ میں اپنا قائم مقام مقرر کر کے فوری کوفہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جس رات کی صبح ابن زیاد بصرہ

---

[1] ارشاد، ص ۲۱۸۔ طبری، ج ۶، ص ۱۹۹۔ بحار عاشر، ص ۶۷۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۷، ۲۶۸۔

[2] الوزراء والکتاب، ص ۱۵ بحوالہ شہید انسانیت۔

[3] ارشاد، ص ۲۱۹۔ طبری، ج ۶، ص ۱۹۹۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۸۔

[4] ارشاد، ص ۱۸۵۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۰۔

سے روانہ ہونے والا تھا۔ اسی رات امام علیہ السلام کا قاصد سلیمان پکڑ کر اس کے پاس لایا گیا جسے اس نے قتل کرا دیا۔[1]
اور پھر جامع مسجد میں ایک تہدیدی خطبہ دیا جس میں حکومت وقت کی مخالفت کرنے والوں کو خوب ڈرایا دھمکایا۔[2]

عبیداللہ بن زیاد کی بجانب کوفہ روانگی

بعد ازاں مسلم بن عمرو باہلی، شریک بن اعور حارثی اور دیگر اپنے اہل خانوادہ اور حشم و خدم کے ساتھ (جن کی تعداد مورخ طبری نے پانچ سو لکھی ہے) بڑی سرعت کے ساتھ منازل سفر طے کرتا ہوا اور اپنے حالات سفر کو مخفی رکھتا ہوا رواں دواں کوفہ پہنچا۔ صاحب فصول مہمہ نے (صفحہ ۱۹۶ طبع عراق پر) لکھا ہے کہ کوفہ کے قریب پہنچ کر ابن زیاد نے اپنی ظاہری ہیئت بدل کر اہل حجاز کی وضع قطع اختیار کر لی۔ اور رات کے وقت داخل شہر ہوا۔ شیخ مفیدؒ (ارشاد، صفحہ ۱۸۵ میں) فرماتے ہیں کہ جب ابن زیاد کوفہ میں داخل ہوا تو اس نے سر پر سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ اور (شجاعان عرب کے دستور کے مطابق) منہ پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔ (اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے امام حسینؑ سمجھیں اور وہ اس طرح ان کے تاثرات اور قلبی خیالات کو بآسانی معلوم کر سکے)۔

ابن زیاد کا کوفہ میں ورود

ادھر چونکہ اہل کوفہ کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ ان دنوں ہمہ تن انتظار بنے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک سردار عرابی گھوڑے پر سوار، اشراف حجاز کے لباس میں ملبوس، شاندار قافلہ کے ہمراہ آ رہا ہے تو انہوں نے بہ ظاہر یہی خیال کیا کہ یہ امام حسین علیہ السلام ہی ہیں۔ جونہی لوگوں کو اس حال میں اس قافلہ کی آمد کی اطلاع ملی تو لوگ جوق در جوق امام حسینؑ کے اشتیاق میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ جس گروہ کے پاس سے ابن زیاد کا گزر ہوتا۔ وہ اس کی تعظیم و تکریم کے ساتھ سلام کرتا۔ اور خوش آمدید کہتے ہوئے ﴿مرحباً بک یا ابن رسول اللہ قدمت خیر مقدم﴾ کہتا۔ اس طرح وہ چہروں کو تاکتا۔ آوازوں کو پہچانتا اور اندر ہی اندر فرط غصہ سے کباب ہوتا ہوا چپ چاپ گزر گیا۔ حتیٰ کہ جب اشتیاق زیارت حسینؑ میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہو گیا کہ ابن زیاد اور اس کے ہمراہیوں کو راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ تو مسلم بن عمرو باہلی نے بآواز بلند کہا: ﴿تنا خروا ھذا الامیر عبید اللہ ابن زیاد﴾ پیچھے ہٹ جاؤ! یہ امیر عبیداللہ بن زیاد ہیں۔[3] اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اور لوگوں نے واپس ہونا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ابن زیاد کے دار الامارہ پہنچتے پہنچتے چند آدمی اور بقول مورخ طبری کے کچھ اوپر دس آدمی رہ گئے۔[4] اس حال میں وہ جب رات کے وقت دار الامارہ پہنچا تو حاکم کوفہ

---

[1] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۶۸۔
[2] کامل، ج ۳، ص ۲۶۸۔
[3] ارشاد، ص ۱۸۹۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۱۔
[4] طبری، ج ۶، ص ۲۰۱۔

نعمان بن بشیر نے بھی اسے حضرت امام حسینؑ سمجھ کر دار الامارہ کا دروازہ بند کر لیا۔ اور جب ابن زیاد کے بعض آدمیوں نے دروازہ کھولنے کے لیے آواز دی تو نعمان بن بشیر نے بالاخانہ سے جھانکتے ہوئے اور ابن زیاد کو امام حسینؑ سمجھتے ہوئے کہا: ﴿انشدک اللّٰہ الا تنحیت فواللّٰہ ما انا بمسلم الیک امانتی و مالی فی قتالک من ارب﴾ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ بخدا میں اپنی امانت ہرگز آپ کے سپرد نہیں کروں گا اور مجھے آپ سے جنگ کرنے کی خواہش بھی نہیں ہے۔[1] بہر کیف اسے جب معلوم ہوا کہ آنے والا ابن زیاد ہے تو اس نے دروازہ کھول دیا اور ابن زیاد اپنے آدمیوں سمیت اندر داخل ہوا اور پھر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب سب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آنے والا عبید اللہ بن زیاد ہے۔ نہ امام حسینؑ۔ اور وہ لوگ جو پورے بیس سال عبید اللہ اور اس کے والد زیاد کے ظلم و جور کی چکی میں پس چکے تھے۔ ان کے اندر خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ اور عامۃ الناس میں پریشانی اور سراسیمگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ صبح ہوتے ہی لوگوں کو جامع کوفہ میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو ابن زیاد نے ایک تہدید آمیز تقریر کی۔ اور حکومت وقت کی اطاعت کرنے والوں کو انعام و اکرام کا لالچ دلانے کے ساتھ ساتھ مخالفت کرنے والوں کو سخت تہدید و وعید[2] کی۔ پھر منبر سے نیچے اتر آیا۔ نعمان بن بشیر نے دار الامارہ کو خالی کر کے اپنے وطن دمشق روانگی کی تیاری کر دی۔ اور ابن زیاد نے دار الامارہ میں قیام کیا۔[3] اور تمام شہر کے "عرفاء" کو بلا کر تاکیدی حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے محلّہ کے تمام ایسے مشکوک لوگوں کی جن سے حکومت وقت کو خطرہ ہے فہرست تیار کر کے پیش کریں اور پھر ایسے لوگوں کو بھی حاضر کریں۔ ان کے ساتھ جو سلوک مناسب ہوگا کیا جائے گا۔ اور جو شخص کسی وجہ سے جلدی ایسی فہرست تیار نہ کر سکے۔ وہ ضمانت دے کہ اس کے محلّہ میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں ہے جس سے مخالفت اور بغاوت کرنے کا اندیشہ ہو۔ یاد رکھو جو شخص ایسا نہیں کرے گا اور پھر اس کے محلّہ میں حکومت وقت کا کوئی مخالف پایا گیا تو اس سے عہدہ "عرافت" چھین لیا جائے گا۔ اور اسے حکومت کی عطا و بخشش سے محروم کر دیا جائے گا۔ مزید برآں اسے اس کے گھر کے دروازہ پر سولی پر لٹکا دیا جائے[4] گا۔ ابن زیاد کی یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ جاسوسوں کا جال بچھ گیا۔ مشتبہ لوگوں کی فہرستیں تیار ہونے لگیں۔ بلکہ ان کی گرفتاری کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ بلکہ فصول مہمہ ابن صباغ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جماعت نے ان احکام کی مخالفت کی۔ جسے فوراً قتل کر دیا

---

۱ ارشاد، ص ۲۱۹۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۸۔

۲ ارشاد، ص ۱۸۶۔

۳ الاخبار الطوال، ص ۲۳۳۔

۴ ارشاد، ص ۱۸۶۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۱۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۹۔

گیا۔ اس طرح لوگ بے حد خائف و ہراساں ہو گئے اور ان کے لیے کسی جگہ اکٹھا بیٹھ کر تبادلۂ خیال کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

جناب مسلمؑ کا مختار کے گھر سے جناب ہانی کے گھر منتقل ہونا

اب تک جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کا قیام مختار کے گھر میں تھا۔ جب ان کو ابن زیاد کی آمد اور اس کی متشددانہ کارروائیوں کا علم ہوا تو چونکہ ان کے وہاں قیام کا قریباً ہر خاص و عام کو علم ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے اب وہاں مزید قیام کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اس لیے آپ راتوں رات نماز عشاء کے بعد[1] جناب ہانی بن عروہ کے گھر منتقل ہو گئے۔[2]

اب حضرات شیعہ مخفی طریقہ پر جناب مسلمؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور ایک دوسرے کو وصیت کرتے کہ تمام حالات کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔[3] اب چونکہ حالات کا نقشہ یکسر بدل چکا تھا اس لیے حفاظت خود اختیاری کے لیے جناب مسلمؑ کو حکومت وقت کے ہر قسم کے جارحانہ اقدام کی روک تھام کے لیے کچھ مخصوص ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابوثمامہ صیداوی کو اس بات پر متعین فرمایا کہ وہ لوگوں سے چندہ اکٹھا کر کے اس سے اسلحۂ جنگ خریدیں۔ اور جناب مسلم بن عوسجہ کو لوگوں سے بیعت لینے پر مامور کیا گیا۔[4]

ابن زیاد کا مکر و حیلہ سے جناب مسلمؑ کے حالات معلوم کرنا

یہ سب انتظام کرنے کے بعد (جس کا تذکرہ ابھی اوپر ہو چکا ہے) ابن زیاد کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ یہ معلوم کرے کہ جناب مسلمؑ کا قیام کہاں ہے اور ان کے عزائم کیا ہیں۔ چنانچہ اس نے اس بات کا کھوج لگانے کے لیے ایک عجیب تدبیر کی۔ اپنے غلام خاص معقل کو تین ہزار درہم دے کر کہا کہ مسلم بن عقیل اور ان کے اصحاب کو تلاش کر اور پھر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں آپ لوگوں کا ہم خیال ہوں۔ یہ رقم ان کو دے دے۔ اس طرح ان کے راز ہائے درون پردہ کو معلوم کر۔ چنانچہ معقل نے ایسا ہی کیا۔ جامع مسجد میں گیا۔ دیکھا کہ مسلم بن عوسجہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور کچھ لوگوں کو ان کی طرف اشارہ کر کے یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ شخص امام حسینؑ کے لیے بیعت لے رہا ہے۔ جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو معقل نے ان کے قریب جا کر کہا: میں شام کا رہنے والا ذوالکلاع کا غلام ہوں۔ مجھے محب اہل بیتؑ بنا کر خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اسی خانوادہ کا کوئی بزرگ یہاں آیا ہوا ہے۔ جو دختر رسولؐ کے فرزند کے لیے بیعت لے رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اسے پہچانتے ہیں۔ اس لیے

---

[1] الاخبار الطوال، ص ۲۳۵۔ [2] ارشاد، ص ۲۲۰۔ نفس المہموم، ص ۴۹ وغیرہ۔
[3] ارشاد، ص ۲۲۰۔ [4] ارشاد، ص ۲۲۱۔

میری خواہش ہے کہ آپ یہ تین ہزار درہم بھی لے لیں۔ اور مجھے اس کی خدمت میں لے جائیں تاکہ میں جا کر بیعت کروں۔ آپ چاہیں تو ابھی مجھ سے بیعت لے لیں۔ (جناب مسلم بن عوسجہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے) فرمایا: مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ اپنے مطلب کو حاصل کریں گے۔ اور خدا تمہارے ذریعہ سے اہل بیت رسولؐ کی نصرت کرے گا۔ پھر مسلم نے اس کی بیعت لی اور اس سے پختہ عہد و پیمان لے لیا۔ کہ وہ اس امر کو سینۂ راز میں رکھے گا۔ اور خلوص سے کام لے گا۔ بالآخر چند روز کی آمد و رفت کے بعد مسلم بن عوسجہ نے اذن حاصل کرنے کے بعد اسے جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ چنانچہ جناب مسلمؑ نے اس سے بیعت لی۔ اور ابو ثمامہ صیداوی کو رقم وصول کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے بعد معقل کا یہ وتیرہ تھا کہ سب سے پہلے جناب مسلمؑ کے پاس پہنچ جاتا۔ اور سب کے بعد واپس جاتا۔ ہر داخل و خارج کو دیکھتا۔ تمام حالات کا بچشم خود جائزہ لیتا۔ اور برابر ابن زیاد کو سب حالات کی اطلاع دیتا۔ حتیٰ کہ ابن زیاد کو تمام ضروری حالات کی مکمل اطلاع ہو گئی۔[1]

جناب ہانی کی وجاہت اور جلالتِ قدر

ہانی بن عروہ مرادی مزحجی جو کہ محب اہل بیتؑ اور بڑا صاحب اقتدار بزرگوار تھا۔ قبیلۂ مراد و مذحج کا سردار تھا۔ جب (کسی مہم کے لیے) نکلتا تھا تو چار ہزار زرہ پوش سوار اور آٹھ ہزار پیادہ آدمی ہمراہ ہوتے اور جب بنی کندہ کے حلیف بھی ساتھ شامل ہو جاتے تو تیس ہزار (۳۰,۰۰۰) کے ساتھ نکلتا[2] تھا۔ حضرت امیر علیہ السلام کے خواص اصحاب[3] میں سے تھا۔ اور آپ کی تینوں جنگوں (جمل، صفین اور نہروان) میں آپؑ کے ہمرکاب[4] تھا۔ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شرف صحبت سے بھی مشرف[5] ہو چکا تھا۔ اور شہادت کے وقت اس کی عمر اٹھانوے سال[6] تھی۔ باوجودیکہ جناب ہانی کی ابن زیاد سے کچھ راہ و رسم بھی تھی مگر اب وہ دیگر اشراف کوفہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہونے سے محض اس خیال کے ماتحت پہلوتہی کرتے تھے کہ کہیں ابن زیاد کو جناب مسلمؑ کے ان کے ہاں قیام کی اطلاع نہ مل گئی ہو۔ اس لیے مرض کا عذر کر کے گھر پر ہی پڑے[7] رہتے۔ دوسری طرف ابن زیاد پر بذریعہ معقل تمام حقیقت حال کا انکشاف ہو چکا تھا۔ کہ جناب مسلمؑ بن عقیل ہانی ہی کے گھر میں مقیم ہیں۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جناب ہانی سے ملے۔ چنانچہ اس نے اسما ابن خارجہ، محمد بن اشعث اور عمرو بن حجاج کو بلایا اور ان

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۱۔ الاخبار الطوال، ص ۲۳۷۔
[2] مروج الذہب، ج ۳، ص ۹۔
[3] فرسان الہیجا، ج ۲، ص ۱۳۹۔
[4] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۸۔
[5] نفس المہموم، ص ۶۲۔
[6] فرسان الہیجا، ج ۲، ص ۱۳۹۔
[7] نفس المہموم، ص ۱۱۳ وغیرہ۔

سے جناب ہانی کے دربار میں نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے (جو حقیقت حال سے بے خبر تھے) یہ جواب دیا کہ بیماری کی وجہ سے حاضر نہیں ہوتے۔ ابن زیاد نے کہا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ ہر شب اپنے دروازہ پر بیٹھتا ہے اور لوگوں سے ملتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ جناب ہانی کے پاس گئے اور ان پر زور دیا کہ وہ ضرور ابن زیاد کو ملیں۔ جناب ہانی ان کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہو گئے اور چونکہ وہ حالات کی نزاکت سے بے خبر تھے۔ اس لیے اپنے آدمیوں کو اطلاع دیے بغیر تن تنہا ان کے ساتھ چلے گئے۔ دربار میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ ابن زیاد کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ ابن زیاد نے ان کو دیکھتے ہی یہ مثل کہی: ﴿اتتک بحائن رجلاہ﴾ خلاصہ یہ کہ ہانی اپنے پاؤں سے چل کر موت کی طرف آئے ہیں۔ پھر شریح قاضی کی طرف رخ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا ۔

اريد حباتــه ويــريد قتلي　　　عذيرک من خليلک من مراد[1]

جناب ہانی نے یہ صورت حال دیکھ کر ابن زیاد سے کہا: ﴿وما ذاک؟﴾ کیوں کیا بات ہے؟ ابن زیاد نے بگڑ کر کہا: ہاں اے ہانی! تم اپنے گھر بیٹھ کر امیر المومنین والمسلمین کے خلاف سازشیں کرتے ہو۔ تم نے مسلم کو بلا کر اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اور ان کے لیے اسلحہ جنگ جمع کر کے لشکر جمع کر رہے ہو۔ اور تمہارا خیال ہے کہ یہ امور بڑھی۔ تو ابن زیاد نے اپنے غلام ''معقل'' کو بلایا۔ جب وہ جناب ہانی کے سامنے کھڑا ہوا تو ابن زیاد نے جناب ہانی سے کہا: کیا اس شخص کو پہچانتے ہو۔ جناب ہانی نے کہا: ہاں۔ اس وقت ہانی کو معلوم ہوا کہ یہ شخص جاسوس تھا۔ اس طرح جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ تمام حالات کا حاکم کے نزدیک انکشاف ہو چکا ہے تو کچھ وقت کے لیے متحیر و مبہوت ہو گئے۔ پھر حواس پر قابو پاتے ہوئے (اور اقرار کرتے ہوئے) کہا: جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو! بخدا میں ہرگز غلط بیانی نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم میں نے نہ تو مسلم کو یہاں بلایا۔ اور نہ ہی مجھے ان کے حالات کی کوئی خبر تھی۔ میں نے ایک رات ان کو اپنے دروازہ پر کھڑے دیکھا۔ اور انہوں نے میرے گھر ٹھہرنے کی خواہش کی۔ مجھے ان کی خواہش کو مسترد کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوئی اس لیے ان کو اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ اور ان کو اپنا مہمان بنا لیا۔ اب مجھے اتنی مہلت دیں اور جو چاہیں عہد و پیمان لے لیں۔ اور جو چاہیں گرو رکھ لیں کہ میں گھر جا کر ان سے یہ کہہ دوں کہ جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ (تا کہ ان کو پناہ دینے اور مہمان رکھنے کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاؤں) اور پھر میں واپس آپ کے پاس پلٹ آؤں گا۔

ابن زیاد نے کہا: جب تک مسلم کو یہاں حاضر نہ کرو تم کہیں نہیں جا سکتے۔ جناب ہانی نے کہا: ﴿لا واللہ لا اجیئک بہ ابداً اجیئک بضیفی تقتلہ﴾ نہیں بخدا میں ان کو ہرگز پیش نہیں کروں گا میں اپنے مہمان کو

[1] ارشاد، ص ۲۱۲۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۵۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۰ وغیرہ۔

تمہارے سامنے اس لیے پیش کروں تا کہ تم اسے قتل کر دو؟ ابن زیاد نے کہا: تمہیں ضرور انہیں پیش کرنا ہوگا۔ ہانی نے کہا: میں ہرگز پیش نہیں کروں[1] گا۔ جب ان کا باہمی تکرار بڑھا تو مسلم بن عمرو باہلی نے مداخلت کرتے ہوئے ابن زیاد سے کہا: ذرا مجھے ہانی سے علیحدگی میں بات کرنے دیجئے! چنانچہ مسلم بن عمرو جناب ہانی کو ذرا علیحدہ لے گیا جہاں ابن زیاد دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا: میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ نہ اپنے آپ کو ہلاک کرو اور نہ قوم وقبیلہ کو مصیبت میں ڈالو۔ ابن زیاد مسلم کو کچھ نہیں کہے گا۔ تم ضرور اسے حاضر کر دو۔ اس میں تمہاری کوئی ذلت و رسوائی نہیں ہے۔ کیونکہ تم ان کو حاکم کے سپرد کر رہے ہو! جناب ہانی نے کہا: نہیں اس میں سراسر میری ذلت و رسوائی ہے کہ اپنے مہمان کو ایسے حال میں ان کے سپرد کر دوں۔ کہ طاقتور اور صاحب اعوان وانصار ہوں۔ اگر میں بالکل یک وتنہا ہوتا۔ اور میرا کوئی مددگار نہ بھی ہوتا۔ تب بھی میں جب تک ان کے سامنے کٹ نہ مرتا ان کو ہرگز پیش نہ کرتا۔

جب ابن زیاد نے دیکھا کہ ہانی نہیں مانتا تو اس نے حکم دیا: اسے میرے قریب لاؤ۔ چنانچہ ہانی کو اس کے قریب لایا گیا۔ ابن زیاد نے کہا: ﴿واللہ لتاتینی بہ او لاضربن عنقک﴾ بخدا تم مسلم کو ضرور حاضر کرو ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ جناب ہانی نے کہا: ﴿اذا واللہ تکثر البارقۃ حول دارک﴾ اگر تم نے ایسا کیا تو بخدا تیرے دار الامارہ کے اردگرد بہت تلواریں چمکیں گی۔ جناب ہانی کا خیال تھا کہ ان کی قوم ان کی نصرت وامداد کرے گی۔ یہ سن کر ابن زیاد غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ کہا: ﴿اتخوفنی بالبارقۃ؟﴾ کیا تم مجھے تلواروں سے ڈراتے ہو؟ پھر حکم دیا: اسے اور میرے قریب لاؤ۔ بدنہاد ابن زیاد نے چھڑی جناب ہانی کے منہ پر برسانا شروع کی۔ ظالم نے اس قدر پیٹا کہ جناب ہانی کی ناک ٹوٹ گئی۔ رخسار وجبین سے گوشت کے ٹکڑے گرنے لگے۔ کپڑوں پر خون بہنے لگا۔ اور سر وچہرہ خون سے رنگین ہو گیا۔ مگر ظالم حاکم برابر پیٹتا رہا۔ یہاں تک کہ چھڑی ٹوٹ گئی۔[2] اس اثناء میں جناب ہانی نے پاس کھڑے ہوئے ایک سپاہی کی تلوار پر ہاتھ مارا مگر اس نے تلوار کھینچ لی۔ یہ دیکھ کر ابن زیاد نے کہا: اب یہ خارجی ہو گئے اور ان کا خون ہمارے لیے مباح ہے۔ پھر حکم دیا کہ انہیں اندر لے جا کر قید کر دو۔ چنانچہ ظالم سپاہی انہیں گھسیٹ کر قید خانہ میں (جو کہ دار الامارہ کے پاس ہی تھا) لے گئے۔ اور دروازہ بند کر کے دروازے پر پہرہ دار بٹھا دیئے گئے۔[3]

جب عمرو بن حجاج (ہانی کے برادر نسبتی) زبیدی کو یہ اطلاع ملی کہ جناب ہانی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ تو وہ بنی

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۲۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۵۔

[2] ارشاد، ص ۲۲۲۔ نفس المہموم، ص ۵۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۱۔

[3] ارشاد، ص ۲۲۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۱۔

مذحج کی بہت بڑی جماعت لے کر چڑھ آیا۔ اور دار الامارہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت قاضی شریح آڑے آیا۔ ابن زیاد نے اس سے کہا کہ پہلے ہانی کو دیکھ لو کہ وہ زندہ ہے پھر جا کر ان لوگوں کو تسلی دو۔ اور ان کو واپس کرو۔ چنانچہ قاضی شریح جناب ہانی کے پاس گیا۔ (اور ابن زیاد نے ایک جاسوس بھی ہمراہ کر دیا تھا) اس وقت ان کا خون بہہ رہا تھا۔ اور نیم جان پڑے تھے۔ اور دھیمی دھیمی آواز سے یہ کہہ رہے تھے کہ اے مسلمانو! میری قوم ہلاک ہوگئی ہے؟ دیندار لوگ کہاں گئے؟ مددگار کہاں گئے کہ مجھے ظالم دشمن کے پنجۂ استبداد سے نجات دلاتے؟ جب جناب ہانی نے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اور لوگوں کا شور وشغب سنا تو فرمایا: میں خیال کرتا ہوں۔ یہ بنی مذحج کی آوازیں ہیں! کاش صرف دس آدمی بھی داخل ہوتے تو مجھے چھڑا لے جاتے۔ انہوں نے قاضی شریح کو بڑے واسطے دے کر کہا کہ قوم کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں تاکہ وہ مجھے چھڑا کر لے جائیں۔ مگر قاضی نے کہا کہ اگر جاسوس ہمراہ نہ ہوتا تو میں تعمیل کرتا۔ چنانچہ اس نے جا کر ان کی قوم کو تسلی دی کہ ہانی زندہ وسلامت ہے۔ فقط حکومت نے مصلحت وقت کے تحت ان کو نظر بند کر دیا ہے۔ جب عمرو نے یہ بات سنی تو یہ کہہ کر کہ ﴿اما اذا لم یقتل فالحمد لله﴾ (اگر وہ قتل نہیں ہوئے تو مقام شکر ہے) اپنی جمعیت سمیت واپس چلا گیا۔[1] اس طرح ان کے بچنے کی جو آخری کرن نمودار ہوئی تھی وہ بھی غائب ہوگئی اور قاضی شریح نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔

عبداللہ بن حازم کہتا ہے کہ مجھے جناب مسلمؑ بن عقیل نے دار الامارہ میں بھیجا تھا کہ جا کر دیکھوں کہ ہانی کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ جب ان کو مار پیٹ کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا تو میں سب سے پہلے واپس گھر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ بنی مراد کی مستورات جمع ہو کر ''یا عبرتاہ یا ثکلاہ'' کہہ کر نالہ وشیون کی آواز بلند کر رہی ہیں۔ میں نے اندر جا کر جناب مسلمؑ کو سب صورت حال کی اطلاع دی۔ (بنی ہاشم کے اس غیور بزرگوار سے یہ صورت حال کب برداشت ہو سکتی تھی اور وہ کس طرح اندر بیٹھ کر عورتوں کے گریہ وبکاء کی آوازیں سن سکتا تھا جب کہ ان کا معزز میزبان انہی کی خاطر مختلف شدائد ومصائب میں گھرا ہوا تھا)۔ جناب مسلمؑ نے مجھے حکم دیا کہ ان کا علامتی نعرہ ''یا منصور امت'' لگا کر ان کے ان اصحاب کو اکٹھا کروں۔ جو ارد گرد والے گھروں میں جمع تھے جن کی تعداد چار ہزار کے قریب تھی چنانچہ یہ نعرہ سن کر دوسرے لوگوں نے بھی یہی نعرہ بلند کیا۔ اور تھوڑی سی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ جناب مسلمؑ نے جماعت کندہ کا علمبردار عبداللہ بن عزیز کندی کو مقرر کیا۔ اور اسے حکم دیا کہ تم میرے آگے آگے چلو۔ اور جماعت مذحج واسد کا علمبردار مسلم بن عوسجہ کو اور جماعت تمیم بن ہمدان کا علمبردار ابو ثمامہ صائدی کو اور جماعت مدینہ کا علمبردار عباس بن جعدہ جدالی کو مقرر کیا اور دار الامارہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ابن زیاد دار

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۲۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۷۔ پوری تفصیل کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۷۱ میں مذکور ہے۔ نفس المہموم، ص ۵۳، ۵۴۔

الامارہ میں بیٹھا تھا کہ یکا یک جناب مسلمؑ کے چڑھ آنے کی خبر گرم ہوئی۔ وہ یہ سمجھ کر شاید جناب مسلمؑ کے ہمراہ کوئی لشکر جرار ہوگا۔ احتیاطاً قلعہ بند ہوگیا۔ اس وقت اس کے پاس حشم و خدم اور اہل خاندان کے علاوہ صرف تیس سپاہی اور بیس اشراف و رؤسائے کوفہ تھے۔ جناب مسلمؑ نے جا کر قصر کو گھیر لیا۔ اب لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا[1] رہا۔ اور شام تک کچھ نہ کچھ زد و خورد کا سلسلہ جاری[2] رہا۔ اور جب لوگوں نے متفرق ہونا شروع کیا تو حالت یہ ہوگئی کہ جب جناب مسلمؑ نے نماز مغرب پڑھی تو اس وقت کل تیس آدمی ہمراہ تھے۔ اور جب مسجد سے نکلے تو بنی کندہ کے دروازہ کا قصد کیا ابھی دروازہ تک نہیں پہنچے تھے کہ کل دس آدمی رہ گئے۔ اور جب دروازہ سے برآمد ہوئے۔ تو کوئی ایک آدمی بھی ہمراہ نہ تھا۔ جو رات کے وقت راستہ بتاتا۔[3]

حضرت مسلمؑ کی ظاہری ناکامی کے اسباب

جناب مسلمؑ کی اس ظاہری ناکامی کے وجوہ کیا تھے؟ اور وہ کیا اسباب تھے جن کا یہ حوصلہ شکن نتیجہ برآمد ہوا۔ کتب سیر و تواریخ پر اجمالی نگاہ ڈالنے سے اس کے مندرجہ ذیل علل و اسباب نظر آتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ جناب مسلمؑ کا یہ اقدام ناگہانی حیثیت سے تھا۔ ان کو اپنے اصحاب و احباب کے ساتھ مشورہ کرنے کا موقع نہ مل سکا بلکہ ابن زیاد کے جناب ہانی کو زد و کوب کر کے قید خانہ میں ڈالنے کی خبر سن کر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ مؤرخ طبری نے تصریح کی ہے کہ ﴿لم یکن خروجه یوم خرج علی میعاد من اصحابه انما خرج حین قیل له ان هانی بن عروة المرادی قد ضرب و حبس﴾ یعنی جناب مسلمؑ کا جنگ کے لیے نکلنا۔ اپنے ساتھیوں کی اطلاع اور کسی قرارداد کے بغیر تھا۔ جب ان کو یہ اطلاع ملی کہ جناب ہانی بن عروہ کو مارنے پیٹنے کے بعد قید کر دیا گیا ہے تو وہ اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔[4] ایسے حالات میں کیسے ممکن تھا کہ وہ اٹھارہ ہزار آدمی جمع ہو جاتے جنہوں نے بیعت کی تھی۔

(۲) جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ اشراف و اکابر کوفہ میں سے بیس آدمی قصر کے اندر ابن زیاد کے پاس موجود تھے اور باقی اکابر کی آمد و رفت کا سلسلہ قصر کے اس عقبی دروازہ کی طرف سے جاری تھا۔ جو دار الرومین کے ساتھ متصل تھا۔ ابن زیاد نے کثیر بن شہاب کو حکم دیا کہ بنی مذحج کی اطاعت گزار جماعت کے ساتھ اور محمد بن اشعث

---

[1] ارشاد ص ۲۲۵، مختصراً۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۱۷۱ وغیرہ۔
[2] طبری، ج ۶، ص ۲۰۷۔
[3] ارشاد ص ۲۲۷۔
[4] طبری، ج ۷، ص ۵۸۔

کو حکم دیا کہ وہ بنی کندہ اور حضر موت کے وفاداروں کو ہمراہ لے کر باہر جائیں اور لوگوں کو حکومت کی سخت گرفت اور دار و دمش سے ڈرا دھمکا کر حضرت مسلمؑ کی امداد و نصرت سے روکیں۔ اسی طرح قعقاع فرہلی، شبث بن ربعی، حجار بن ابجر اور شمر ذی الجوشن کو بھی اس کام پر مامور کیا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو حکومت وقت کی مخالفت اور اس کے سنگین نتائج سے ڈرایا اور اس کارروائی کا ان کے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔[1]

(۳) ابن زیاد نے ان رؤساء قبائل کو مامور کیا۔ جو اس کے ہمراہ قصر کے اندر موجود تھے کہ وہ اپنی اپنی قوم و قبیلہ کو حکومت وقت کی مخالفت سے ڈرائیں۔ اور جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کی حمایت و نصرت سے ان کو باز رکھیں چنانچہ انہوں نے قصر سے جھانک کر اپنے اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کو حکومت کی مخالفت سے باز آنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمانبرداروں کو انعام و اکرام کا لالچ اور مخالفین کو حکومت کے عتاب و عقاب سے ڈرایا جس کا خاصا اثر ہوا۔[2]

(۴) ابن زیاد نے انہی رؤساء شیوخ سے یہ غلط اعلان کرایا کہ مرکزی دار الحکومت شام سے مخالفت کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے بڑے بڑے لشکر آ رہے ہیں۔ جو ان کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ چنانچہ کثیر بن شہاب نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا کہ ﴿ایها الناس الحقوا باهاليكم ولا تعاجلوا الشر ولا تعرضوا انفسكم للقتل فان هذه جنود امير المومنين يزيد قد اقبلت و قد اعطى الله الامير عهداً لان اتممتم على حربه و لم تنصرفوا من عشيتكم ليحرمن ذريتكم العطاء و يفرق مقاتلكم مغازى الشام و ان ياخذ البرئ منكم بالسقيم و الشاهد بالغائب حتى لا يبقى له بقية من اهل المعصية الا اذاقها و بال ما جنتة ايديهما﴾ ”اے لوگو تم اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ اور شر و فساد میں جلدی نہ کرو اور نہ ہی اپنے نفسوں کو قتل کے لیے پیش کرو کیونکہ امیر یزید کے لشکر آ رہے ہیں۔ خدا نے امیر وقت کو یہ عہد دیا ہے۔ اگر تم جنگ پر مصر رہے اور آج شام تک واپس گھروں میں نہ چلے گئے تو تمہاری اولاد کو عطا و بخشش سے محروم کر دیں گے اور تمہارے مجرموں کی وجہ سے غیر مجرموں کو دھر لیں گے۔ اور غائب کو حاضر کی بدولت جب تک گنہگار کی نسل باقی رہے گی وہ اس کے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنی پڑے گی۔“ اسی طرح دیگر شیوخ و اکابر نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔[3]

اس شیطانی مکر و تزویر کا عامۃ الناس پر بہت اثر ہوا۔ اور لوگوں کے اعصاب پر مرکزی حکومت کے لشکر کا

---

۱ ارشاد، ص ۲۲۷ ـ طبری، ج ۶، ص ۲۰۸ ـ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

۲ ارشاد، ص ۲۲۷ ـ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

۳ ارشاد، ص ۲۲۷ ـ طبری، ج ۶، ص ۲۰۸ ـ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

خوف و ہراس کچھ اس طرح مسلط ہوا کہ انہوں نے دھڑا دھڑ متفرق ہونا شروع کر دیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ﴿کانت المرأة تاتی ابنها و اخاها فتقول انصرف الناس یکفونک و یجی الرجل الی ابنه و اخیه فیقول غداً یاتیک اهل الشام فما تصنع بالحرب و الشر انصرف!﴾ "عورتیں اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے پاس آتیں اور کہتیں واپس چلو۔ دوسرے لوگ کافی ہیں۔ اور مرد اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے پاس آتے اور کہتے کل شام والے آ جائیں گے تم یہاں لڑ کر کیا کرو گے۔ واپس چلو۔"[1]

(۵) جو لوگ جناب مسلمؑ کے ہمراہ تھے۔ ان کو تو مذکورہ بالا شیطانی مکاریوں اور عیاریوں سے علیحدہ کیا جا رہا تھا۔ اور جو باقی ماندہ اہل ایمان مختلف محلوں میں موجود تھے اور جناب مسلمؑ کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ ان کے روکنے کا یہ بندوبست کیا گیا تھا کہ شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ کوئی شخص نصرت مسلمؑ کے لیے نہ آ سکے چنانچہ اس طرح بعض لوگ گرفتار بھی ہوئے۔[2] یہ سب کچھ آٹھویں ذی الحجہ ۶۰ھ کو ہوا۔

بہرکیف انہی صبر آزما حالات کا نتیجہ تھا کہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ نویں ذی الحجہ کی رات کو نماز مغرب کے بعد جناب مسلمؑ اس طرح یکہ و تنہا رہ گئے کہ رات کی تاریکی اور کوفہ کی گنجان آبادی میں سرگرداں پھر رہے تھے مگر کوئی راستہ بتانے والا اور کوئی ہمدردی کرنے والا نہیں ملتا تھا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اس بے کسی و بے بسی کے عالم میں جائیں تو کدھر اور رات گزاریں تو کہاں؟![3]

ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

جناب طوعہ کا مختصر تعارف

اسی عالم پریشانی و سرگردانی میں جناب مسلمؑ بنی کندہ کے قبیلہ جبلہ کے محلّہ میں جا نکلے۔ اور چلتے چلتے ایک مؤمنہ طوعہ نامی عورت کے دروازہ پر جا پہنچے۔ جو پہلے اشعث بن قیس کی ام ولد کنیز تھیں۔ جب اس نے اسے آزاد کر دیا تو اس نے اسید حضرمی سے شادی کر لی جس سے اس کے ہاں بلال نامی ایک لڑکا متولد ہوا۔[4] (جس نے جناب مسلمؑ کی ابن زیاد کے دربار میں مخبری کی تھی) آج کے ہنگامۂ دار و گیر میں یہ بلال بھی باہر گیا ہوا تھا۔ جناب طوعہ دروازہ پر اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ حضرت مسلمؑ نے (اسلامی طریق کے مطابق) سلام کیا۔ اس مؤمنہ نے سلام کا

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۷۔ طبری، ج ۶، ص ۲۰۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

[2] تفصیل تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۰۸ میں مذکور ہے۔

[3] ارشاد، ص ۲۲۷۔ لہوف، ص ۳۶۔

[4] ارشاد، ص ۲۲۷۔

جواب دیا۔ جناب نے فرمایا: ﴿یا امة اللّٰه اسقینی ماءً﴾ اے اللہ کی کنیز! مجھے پانی تو پلاؤ۔ طوعہ نے جناب کو پانی پلایا۔ جب یہ مؤمنہ برتن رکھنے اندر گئی۔ تو جناب مسلمؑ (جو سارے دن کے تھکے ماندے تھے) وہیں دروازہ پر بیٹھ گئے۔ جب وہ واپس آئی اور جناب مسلمؑ کو یہیں بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہنے لگی: ﴿یا عبد اللّٰه الم تشرب؟﴾ اے اللہ کے بندے کیا آپ پانی پی نہیں چکے؟ جناب نے فرمایا: ﴿بلیٰ﴾ ہاں!

کہا: ﴿فاذهب الی اهلک!﴾ پھر اپنے گھر جائیے۔ یہ سن کر جناب مسلمؑ خاموش رہے۔ طوعہ نے دوبارہ یہی کلمات دہرائے۔ حضرت مسلمؑ پھر بھی خاموش رہے۔ تیسری بار (وہ تعجب اور غصہ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ) کہنے لگی: ﴿سبحان اللّٰه! یا عبد اللّٰه قم عافاک اللّٰه الی اهلک فانه لا یصلح لک الجلوس علی بابی ولا احله لک﴾ سبحان اللہ! او اللہ کے بندے! تم اپنے گھر کیوں نہیں جاتے، تمہیں یہاں میرے دروازہ پر بیٹھنا موزوں نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں یہاں بیٹھنے کی اجازت دیتی ہوں۔ یہ سن کر مسلمؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ﴿یا امة اللّٰه مالی فی هذا المصر منزل ولا عشیرة فهل لک الی اجر و معروف و لعلی اکافیک بعد الیوم؟﴾ اے اللہ کی کنیز (میں جاؤں تو کدھر جاؤں) میرا اس شہر میں نہ کوئی گھر ہے اور نہ کوئی قوم و قبیلہ۔ کیا تو (مجھے اپنے ہاں ٹھہرا کر) اجر و ثواب حاصل کرنا چاہتی ہے؟ شاید آج کے بعد تمہیں اس کار خیر کا کچھ بدلہ دے سکوں!

طوعہ نے (گھبرا کر) کہا: ﴿یا عبد اللّٰه وما ذالک!﴾ اے خدا کے بندے! ماجرا کیا ہے؟ جناب نے فرمایا: ﴿انا مسلم بن عقیل کذبنی هولاء القوم و غرّونی و اخرجونی!﴾ میں مسلمؑ بن عقیل ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ طوعہ نے تعجب کے لہجہ میں کہا: ﴿انت مسلم؟﴾ کیا آپ مسلمؑ ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: ﴿نعم﴾ ہاں میں مسلم ہی ہوں۔ یہ سنتے ہی طوعہ نے دروازہ کھول دیا۔ کہا: بسم اللہ اندر تشریف لائیے۔ چنانچہ وہ جناب مسلمؑ کو اپنے مکان کے ایک کمرہ میں لے گئی۔ فرش خواب بچھایا۔ اور کھانا حاضر کیا مگر جناب مسلمؑ نے تناول نہ فرمایا۔

اتنے میں طوعہ کا لڑکا بلال بھی آ پہنچا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی والدہ بار بار اس کمرہ میں جاتی ہے اور آتی ہے۔ تو بلال نے اس کا سبب دریافت کیا۔ طوعہ نے ٹال دیا لیکن جب بلال نے حد سے زیادہ اصرار کیا۔ تو طوعہ نے اس سے پختہ عہد و پیمان لے کر کہ کسی سے حقیقتِ حال کا اظہار نہ کرے۔ سارا واقعہ کہہ سنایا۔ بلال سارا واقعہ سن کر خاموش ہو رہا۔ اور اپنی خواب گاہ پر جا کر لیٹ گیا۔"[1]

---

[1] ارشاد ص ۲۲۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲، وغیرہ۔

قبل اس کے کہ جناب مسلم کا واقعہ مکمل کیا جائے۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہے کہ جب نویں ذی الحجہ کی شب جناب مسلمؑ کی جماعت متفرق ہوگئی اور جناب مسلمؑ یکہ و تنہا طوعہ کے گھر پناہ گزین ہوئے۔ ابن زیاد نے دیکھا کہ اب باہر بالکل خاموشی ہے۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ دیکھو آیا ان لوگوں میں سے کوئی موجود ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ مزید تحقیق کے لیے مشعلیں روشن کر کے مسجد کا کونہ کونہ چھان ڈالا گیا کہ مبادا کوئی شخص چھپا ہوا نہ ہو۔[1] جب ابن زیاد کو یقین ہوگیا کہ سب لوگ چلے گئے ہیں تو قصر کے باب سدہ کے (جو مسجد کی طرف کھلتا تھا) اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکل آیا۔ اور عمرو بن نافع کو حکم دیا کہ یہ اعلان کرے: ﴿برات الذمة من رجل من الشرط و العرفاء و المناکب و المقاتلة صلی العتمة الا فی المسجد﴾ پولیس والوں، عریفوں، نقیبوں اور جنگ جوؤں میں سے کوئی شخص آج نماز عشاء جامع مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ پڑھے گا تو حکومت اس کے جان و مال کی ذمہ دار نہ ہوگی۔[2] پس اس اعلان کا ہونا تھا کہ تھوڑی دیر میں جامع مسجد نمازیوں سے چھلکنے لگی۔ ابن زیاد نے اپنے اردگرد پہرے دار کھڑے کر کے نماز عشاء پڑھائی۔ اور اس کے بعد منبر پر چڑھ کر یہ خطبہ دیا۔ (نقل کفر کفر نباشد خاکش بدھنش) ﴿اما بعد فان ابن عقیل السفیه الجاهل قد اتی ما رایتم. من الخلاف و الشقاق فبرات ذمة الله من رجل وجدناه فی داره ومن جاء به فله دیته اتقوا الله عباد الله و الزموا طاعتکم و بیعتکم و لا تجعلوا علی انفسکم سبیلا﴾ ابن عقیل نے حکومت کے خلاف جو ہنگامہ آرائی کی وہ تم لوگوں نے دیکھ لی۔ ہم نے جس کے گھر اسے پالیا اس کے جان و مال کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور جو اسے پکڑ کر لائے گا۔ اسے اس کی دیت دی جائے گی (یعنی دیت کے برابر انعام)۔ پھر حصین بن تمیم (جو کہ پولیس کا افسر تھا) کی طرف متوجہ ہو کر اسے تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ کوفہ کی سخت ناکہ بندی کر دو۔ تاکہ مسلمؑ کہیں نکل کر جانہ سکیں۔ اور میں نے تمہیں تمام اہل کوفہ کے گھروں پر مسلط کر دیا ہے۔ صبح ہوتے ہی تمام گھروں کی تلاشی لو اور اس مرد (مسلمؑ) کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ اس کے بعد عمرو بن حریث کو لوگوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا منصب سونپ کر خود اندر چلا گیا۔[3]

صبح سویرے ابن زیاد اپنے دربار میں بیٹھا۔ اور لوگوں کو حاضر ہونے کا اذن عام دے دیا۔ لوگ آنے شروع ہوئے۔ اسی اثناء میں اشعث بھی آیا۔ ابن زیاد نے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ ادھر طوعہ کا

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۸۔

[2] ارشاد، ص ۲۹۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

[3] ارشاد، ص ۲۲۹۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

بدطینت لڑکا بلال صبح سویرے اٹھ کر عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کے پاس گیا۔ اور اسے بتایا کہ مسلم بن عقیل ہمارے گھر میں ہیں۔ اسی وقت عبدالرحمٰن دربار ابن زیاد میں اپنے باپ محمد بن اشعث کے پاس پہنچا۔ اور باپ کے کان میں یہ بات جا کر کہی۔ ابن زیاد حقیقت حال بھانپ گیا۔ فوراً پوچھا: کیا بات ہے؟ محمد بن اشعث نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ ابن زیاد نے محمد بن اشعث کے پہلو میں چھڑی لگاتے ہوئے کہا: اٹھو اور ابھی مسلم کو گرفتار کر کے لاؤ۔ اور ابن اشعث ہی کی قوم کے کچھ آدمی اس کے ہمراہ کر دیے۔ (جن کی تعداد حبیب السیر میں تین سو (۳۰۰) لکھی ہے) اور عبیداللہ بن عباس سلمی کی زیر قیادت بنی قیس کے ستر آدمی بھیج دیے۔[۱] یہ فوج شمشیر بکف گھوڑے دوڑاتی ہوئی طوعہ کے گھر پہنچی اور گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ اب ذرا اس طرف کی مختصر روئیداد بھی سن لیں۔ جناب مسلمؑ نے تمام رات عبادت الٰہی میں گزاری۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت شیخ عباس قمی نفس المہموم، صفحہ ۵۶ میں بعض کتب مقاتل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب صبح صادق طلوع ہوئی تو طوعہ نے وضو کے لیے جناب مسلمؑ کی خدمت میں پانی حاضر کیا اور ساتھ ہی عرض کیا: ﴿یا مولائی ما رایتک رقدت فی هذه اللیلة﴾ میرے آقا! آپ رات بھر سوئے نہیں۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿اعلمی انی رقدت رقدة فرایت فی منامی عمی امیر المؤمنین علیه السلام وهو یقول الوحا الوحا العجل العجل وما اظن الا انه اخر ایامی من الدنیا﴾ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری تھوڑی سی آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے خواب میں اپنے عم محترم حضرت امیرؑ کو دیکھا ہے جو فرما رہے تھے: جلدی کرو جلدی کرو۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ بہرکیف نماز صبح پڑھی۔ اس کے بعد تعقیبات میں مشغول تھے کہ اچانک کانوں میں گھوڑوں کی ٹاپوں اور لوگوں کے شور شغب کی آواز پڑی: ﴿عجل فی دعائه الّذی کان مشغولاً به﴾ تو آپ نے بڑی جلدی کے ساتھ وہ دعا ختم کی۔ جس کے پڑھنے میں مشغول تھے۔[۲] اور زرہ پہن کر شمشیر بکف ہو کر اس اندیشہ سے کہ کہیں ظالم گھر کو آگ نہ لگا دیں۔ جلد باہر نکل آئے۔ اور بروایت کامل بہائی نکلتے ہوئے طوعہ سے فرمایا: ﴿قد ادیت ما علیک من البر و الاحسان و اخذت نصیبک من شفاعة رسول الله صلی الله علیه و آله سید الانس و الجان﴾ تو نے نیکی و احسان کا حق ادا کر کے شفاعت رسولؐ کا استحقاق حاصل کر لیا ہے۔[۳] پھر کہا: ﴿یا نفس اخرجی الی الموت الّذی لیس منه محیص﴾[۴] اے نفس!

۱۔ ارشاد، ص ۲۲۹۔

۲۔ نفس المہموم، ص ۵۶ بحوالہ کامل بہائی۔

۳۔ نفس المہموم، ص ۵۶۔

۴۔ مقاتل الطالبیین، ص ۷۵۔

اس موت کی طرف بڑھ جس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ ظالم خونخوار درندوں کی طرح ان پر چل پڑے۔ شجاعت ہاشمی کے پیکر جناب مسلمؑ بن عقیلؑ یہ شعر پڑھتے ہوئے ۔

ع هو الموت فاصنع ویک ما انت صانع فانت بکاس الموت لا شک جارع

جو کچھ کرنا ہے کر لو یہ موجود ہے اور اب یقیناً تمہیں موت کا پیالہ پینا ہے

ع فصبراً لامر اللّٰـه جل جلالـه فحکم قضاء اللّٰه فی الخلق واقع

خدائے ذوالجلال کے حکم پر صبر لازم ہے کیونکہ مخلوق میں خالق کی قضا و قدر کا حکم نافذ ہے۔

شیرانہ انداز میں ان پر ٹوٹ پڑے چنانچہ اسی ایک حملہ میں اکتالیس (۴۱) آدمیوں کو فی النار وسقر کیا۔[۱]

حضرت شیخ عباس قمیؒ نے مقتل محمد بن ابی طالب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب جناب مسلمؑ نے ابن اشعث کے بہت سے آدمی ہلاک کر دیے تو ابن اشعث نے ابن زیاد سے مزید کمک بھیجنے کی درخواست کی۔[۲] ابن زیاد نے ملامت کرتے ہوئے کہلا بھیجا: ﴿بعثناک الی رجل واحد لتاتینا به... فکیف اذا ارسلناک الی غیره﴾ ہم نے تمہیں صرف ایک آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا تھا اور تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے اگر ہم نے کل کلاں کسی اور (فوج کے مقابلہ میں) بھیجا تو پھر تمہاری کیا کیفیت ہو گی! ابن اشعث نے جواب میں کہلا بھیجا: ﴿ایها الامیر اتظن انک بعثتنی الی بقال من بقالی الکوفة او الی جرمقانی من جرامقة الحیرة او لم تعلم ایها الامیر انک بعثتنی الی اسد ضرغام و سیف حسام فی کف بطل همام من آل خیر الانام﴾

اے امیر کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ نے مجھے کوفہ کے کسی سبزی فروش یا مقام حیرہ کے کسی جرمقانی[۳] کے گرفتار کرنے کے لیے بھیجا ہے؟ اے امیر! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ نے مجھے ایک ایسے شخص کی گرفتاری کے لیے بھیجا ہے جو شیر بیشۂ شجاعت ہے۔ اور ایسی برندہ تلوار ہے جو نسل خیر الانام کے بطل جلیل کے ہاتھوں میں ہے۔" ابن زیاد نے کہلا بھیجا: ﴿اعطه الامان فانک لا تقدر علیه الّا به﴾ تم ان کو امان (کا دھوکا) دے دو کیونکہ اس کے بغیر تم ان پر قابو نہیں پا سکتے۔[۴] اور بروایت منتخب طریحی کچھ کمک بھی بھیج دی۔[۵] ادھر گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ جناب

---

[۱] مناقب شہر ابن آشوب، ج ۴، ص ۹۰۔

[۲] المنتخب الطریحی، ص ۲۹۹۔

[۳] یہ ایک عجمی قوم کا نام ہے جو اوائل اسلام میں موصل وغیرہ کے علاقہ میں آ کر آباد ہو گئی تھی جو قرینۂ مقام سے بزدل معلوم ہوتی ہے۔ (منہ عفی عنہ)

[۴] نفس المہموم، ص ۷۵۔

[۵] المنتخب للطریحی، ص ۴۲۹۔

مسلمؑ اور بکر بن حمران احمری آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ احمری ملعون نے ایک وار کیا جو جناب مسلمؑ کے دہن مبارک پر لگا جسے ان کا بالائی ہونٹ کٹ گیا اور ہونٹ کچھ زخمی ہوا۔ اور اگلے دو دانت بھی اکھڑ گئے۔ اس کے بعد جناب مسلمؑ نے اس پر پے در پے دو وار کیے۔ ایک سر پر اور دوسرا کاندھے پر جو قریباً پیٹ تک اتر گیا۔ مگر وہ نابکار قتل ہونے سے بچ گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں میں اور زیادہ اشتعال پیدا ہو گیا۔ اور اسی اثنا میں کچھ لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ اور جناب مسلمؑ پر پتھر برسانے شروع کیے۔ اور کچھ ملاعین آگ روشن کر کے ان پر پھینکنے لگے۔ یہ دیکھ کر جناب مسلمؑ بپھرے ہوئے شیر کی طرح تلوار سونت کر کوچہ و بازار میں جوہر شجاعت دکھانے لگے۔ محمد بن اشعث نے مکر و فریب سے امان کا اعلان کرتے ہوئے کہا: ﴿لک الامان لا تقتل نفسک﴾ آپ کے لیے امان ہے اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ جناب مسلمؑ نے یہ فرما کر کہ ﴿و ای امان للغدرۃ الفجرۃ﴾ دھوکہ باز فاسقوں اور فاجروں کی امان پر کیا اعتبار ہے؟ ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس وقت آپ یہ رجز پڑھتے جاتے تھے اور بڑھ بڑھ کر حملے بھی کرتے جاتے تھے۔[1]

اقسمت لا اقتل الا حراً	و ان رایت الموت شیئاً نکراً
میں نے قسم کھائی ہے کہ آزادی کی موت مروں گا	اگرچہ موت ناپسندیدہ چیز ہے
کل امرء یوماً ملاق شراً	و یخلط البارد سخناً مرا
ہر شخص کو کبھی نہ کبھی شر کا سامنا کرنا پڑتا ہے	اور سرد کے ساتھ گرم ملانا پڑتا ہے
رد شعاع النفس فاستقرا	اخاف ان اکذب او اغرا
نفس کی گھبراہٹ دور کر دی گئی اور وہ مطمئن ہو گیا ہے	مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے جھوٹ نہ کہا جائے

اگرچہ مکر و فریب کے ان پیکروں نے کہا: ﴿انک لا تکذب ولا تغرّ﴾ ”آپ سے کوئی جھوٹ اور فریب نہیں کیا جائے گا۔“ مگر جناب مسلمؑ نے ان کی اس یقین دہانی پر کوئی توجہ نہ کی اور برابر جہاد کرتے رہے۔[2] یہاں تک کہ زخموں کی کثرت، خون کے زیادہ بہہ جانے اور شدت پیاس سے نڈھال ہو جانے کی وجہ سے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اس حال میں بھی ظالم برابر تیر اور پتھر مارتے رہے۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿مالکم ترمونی بالاحجار کما ترمیٰ الکفار و انا من اهل بیت الانبیآء الابرار ولا ترعون حق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و الہ فی ذریتہ﴾ او ظالمو! تمہیں کیا ہو گیا ہے مجھے اس طرح پتھر مار رہے ہو جس

---

1. اللہوف، ص ۴۷۔ نفس المہموم، ص ۵۷۔
2. نفس المہموم، ص ۵۷۔

طرح کفار کو مارے جاتے ہیں۔ حالانکہ میں انبیاء و ابرار کے خانوادہ سے ہوں۔ تم جناب رسول خدا ﷺ کی اولاد کے معاملہ میں آنحضرتؐ کے حقوق کی بھی رعایت نہیں[1] کرتے؟ اسی حالت میں ایک ظالم نے عقب سے چھپ کر ایک ایسا نیزہ مارا کہ جناب زمین پر گر پڑے اور دوسرے ملاعین نے آگے بڑھ کر جناب کو گرفتار کر لیا۔[2]

لیکن شیخ مفیدؒ اور مورخ جزری وغیرہ بعض ارباب تحقیق کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جناب مسلم زخموں سے چور چور ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ تو اس وقت پھر ابن اشعث نے امان کی پیشکش کی۔ اور سوائے عبید اللہ بن عباس سلمی کے ابن اشعث کے دوسرے ساتھیوں نے بھی وعدۂ امان کی توثیق کی۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿آمن انا؟﴾ کیا میں واقعی امان میں ہوں۔ سوائے ابن عباس سلمی کے باقی سب نے کہا: ہاں۔ آپ امان میں ہیں تب جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿انی واللّٰہ لولا امانکم لما وضعت یدی فی ایدیکم﴾ بخدا اگر تمہارا وعدۂ امان نہ ہوتا تو میں ہرگز اپنے آپ کو تمہارے سپرد نہ کرتا۔ جناب نے تلوار نیام میں ڈال کر گلے میں لٹکالی۔ اس کے بعد ان کے لیے سواری لائی گئی۔ اس پر ان کو سوار کر کے دارالامارہ کی طرف لے چلے۔ ظالموں نے آگے بڑھ کر جناب سے تلوار چھین لی۔ آپ نے فرمایا: ﴿ھذا اول الغدر﴾۔ یہ تمہارا پہلا دھوکہ ہے۔ ابن اشعث نے کہا: مجھے امید ہے کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ جناب نے فرمایا: ﴿ما ھو الا الرجاء فاین امانکم﴾ اچھا اب صرف امید ہی ہے وہ تمہارا وعدۂ امان کیا ہوا۔ پھر کلمۂ استرجاع ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾ زبان پر جاری فرمایا۔ اور پھر رو پڑے۔ عبید اللہ بن عباس سلمی نے کہا: تم جیسا شخص جو ایسے عظیم کام کے لیے کھڑا ہو۔ جب اسے ایسے حالات درپیش ہوں تو اسے رونا نہیں چاہئے۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿انی واللّٰہ ما ابکی لنفسی و لا لھا من القتل ارثی... و لکن ابکی لاھلی المقبلین الیّ ابکی للحسینؑ و لآل الحسین علیھم السلام﴾ بخدا میں اپنی جان کے لیے نہیں رو رہا۔ اور نہ ہی قتل سے خائف ہوں میں تو اپنے ان اہل و عیال کے لیے جو ادھر آ رہے ہیں۔ اور حسینؑ اور آل حسین علیہم السلام کے لیے رو رہا ہوں۔ پھر محمد بن اشعث سے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تم مجھے امان نہیں دلوا سکو گے۔ تم صرف اتنی بھلائی کر سکتے ہو تو کرو کہ کوئی آدمی بھیج کر امام حسین علیہ السلام کو میری طرف سے پیغام بھجوا دو کہ میں گرفتار کر لیا گیا ہوں۔ اور خیال غالب ہے کہ شام تک قتل ہو جاؤں گا۔ لہٰذا میرے آقا کوفہ والوں پر اعتماد کر کے ادھر کا رخ نہ کرو۔ ابن اشعث نے وعدہ کیا کہ میں ضرور ایسا کروں گا۔[3] بہر کیف جب جناب مسلمؑ دارالامارہ

---

[1] مناقب شہر بن آشوب، ج ۳، ص ۲۹۰۔ مناقب، ج ۴، ص ۹۰۔ طبع ؟؟

[2] لہوف، ص ۴۷۔ مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۲۰۹، ۲۱۰۔

[3] ارشاد، ص ۲۲۵۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۷۳۔ نفس المہموم، ص ۵۸۔

کے دروازہ پر پہنچے تو محمد بن اشعث ان کو وہاں ٹھہرا کر خود اجازت لے کر اندر گیا۔ اور جناب مسلمؑ کی گرفتاری اور انہیں امان دینے کا تمام واقعہ کہہ سنایا۔ ابن زیاد نے بگڑ کر کہا: تم امان دینے والے کون ہوتے ہو؟ ہم نے تمہیں اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ ان کو امان دو بلکہ اس لیے بھیجا تھا کہ ان کو پکڑ کر یہاں لاؤ۔ یہ تلخ جواب سن کر ابن اشعث بالکل خاموش ہو گیا۔[1] چونکہ جناب مسلمؑ بہت تھکے ہوئے تھے اور پیاس کا غلبہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی صراحی موجود ہے۔ جناب نے فرمایا: ﴿اسقونی من هذا الماء﴾ مجھے اس سے کچھ پانی پلا دو۔ اس وقت وہاں اندر جانے کے انتظار میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں عمارہ بن عقبہ، عمرو بن حریث، مسلم بن عمرو باہلی اور کثیر بن شہاب تھے۔ مسلم بن عمرو باہلی نے یہ گستاخانہ جواب دیا: ﴿اترا ها ما ابردها و اللّٰه لا تذوق منها قطرةً ابداً حتی تذوق الحمیم فی نار جهنم﴾ (نقل کفر کفر نباشد) دیکھتے ہو کیسا ٹھنڈا پانی ہے لیکن بخدا تم اس کا ایک قطرہ بھی نہیں چکھ سکتے۔ یہاں تک کہ آتش جہنم میں کھولتا ہوا پانی پیو۔ جناب مسلمؑ نے کہا: ﴿ویلک من انت؟﴾ افسوس ہے تمہارے اوپر تو کون ہے؟ جب اس ملعون نے اپنا تعارف کرایا۔ تو جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿لامک الثکل ما اجفاک و افظک و اقسی قلبک انت یا ابن باهلة اولی بالحمیم و الخلود فی نار جهنم منی﴾ تمہاری ماں تمہارے ماتم میں بیٹھے تو کتنا درشت طبع، قسی القلب اور جفاکار ہے اے فرزند باہلہ! تو آتش جہنم میں ہمیشہ رہنے اور اس کا گرم پانی پینے کا زیادہ سزاوار ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر عمرو بن حریث نے (اور بروایتے عمارہ[2] بن عقبہ) نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ جناب مسلمؑ کو پانی پلائے۔ چنانچہ وہ پانی کی ایک صراحی اٹھا کر لایا جس پر رومال ڈالا ہوا تھا۔ پیالہ بھی ہمراہ تھا۔ اس نے پیالہ بھر کر جناب مسلمؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ جونہی آپ نے پینے کا ارادہ فرمایا۔ تو پیالہ آپ کے خون دہن سے رنگین ہو گیا۔ جناب نے وہ پیالہ انڈیل دیا۔ دوسرا پیالہ پیش کیا گیا۔ جب جناب نے پینا چاہا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ سہ بارہ کوشش کی تو خون کے ساتھ جناب کے دو اگلے دانت بھی ٹوٹ کر پیالہ میں گر گئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿الحمد للّٰه لو کان لی من الرزق المقسوم لشربته﴾ ہر حال میں حمد خدا ہے اگر یہ پانی میرے مقدر میں ہوتا تو ضرور پیتا۔ یہ کہہ کر پیالہ ہاتھ سے رکھ[3] دیا۔

اس کے بعد ابن زیاد کا آدمی آیا اور جناب مسلمؑ کو اندر لانے کا حکم دیا۔ سب اہل سیر و تواریخ کا اتفاق ہے

---

[1] ارشاد، ص ۲۳۱۔ نفس المہموم، ص ۵۹ وغیرہ۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۱۲۔

[3] ارشاد، ص ۲۳۱۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۷۴۔ نفس المہموم، ص ۵۹۔

کہ جب جناب مسلمؑ ابن زیاد کے دربار میں پیش ہوئے۔ تو غیرت ہاشمی کے پیکر نے ابن زیاد کو سلام امیری (امیر کہہ کر سلام) نہ کیا۔ ساتھ والے سپاہی نے کہا بھی کہ آپ امیر پر سلام کیوں نہیں کرتے۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿ان کان یرید قتلی فما سلامی علیه و ان کان لا یرید قتلی لیکثرن سلامی علیه﴾ اگر ابن زیاد میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر سلام کا فائدہ؟ اور اگر قتل کا ارادہ نہیں رکھتا تو پھر سلام وکلام ہوتا ہی رہے گا۔ ابن زیاد نے کہا: ﴿لعمری لتقتلن﴾ تمہیں ضرور قتل کیا جائے گا۔[1] جناب سید بن طاؤس نے لکھا ہے کہ جب سپاہی نے امیر کو سلام نہ کرنے کا اعتراض کیا تو جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿اسکت و یحک واللّٰہ ما ھو لی بامیر﴾ خاموش رہو بخدا ابن زیاد میرا امیر نہیں ہے۔[2] اور طریحی نے لکھا ہے کہ جناب مسلمؑ نے یہ جواب دیا۔ ﴿واللّٰہ مالی امیر غیر الحسینؑ بن علیؑ﴾ بخدا میرا سوائے حسینؑ کے اور کوئی امیر نہیں ہے۔[3] جناب مسلمؑ نے ابن زیاد سے فرمایا: اگر مجھے قتل ہی کرنا ہے تو اتنی مہلت دے کہ میں کچھ وصیت کرلوں۔ جب مہلت ملی تو جناب نے حاضرین مجلس پر اک نگاہ ڈالی جن میں عمر بن سعد بھی تھا۔ جناب مسلم نے فرمایا: میرے اور تمہارے درمیان کچھ قرابت ہے۔ علیحدگی میں میری بات سنو اور اس پر عمل بھی کرنا۔ ابن سعد نے بات سننے میں کچھ پہلوتہی کی۔ جس پر ابن زیاد نے کہا: آخر بات سننے میں کیا قباحت ہے؟ اب ابن سعد اٹھا۔ جناب مسلمؑ اسے علیحدہ لے گئے۔ جہاں ابن زیاد بھی ان کو دیکھ رہا تھا۔

فرمایا: (۱) جب سے میں کوفہ آیا ہوں۔ میں سات سو درہم کا مقروض ہو چکا ہوں۔ یہ میری زرہ اور تلوار فروخت کرکے میرا قرضہ ادا کر دینا۔ (۲) جب میں قتل ہو جاؤں تو ابن زیاد سے میری لاش لے کر اسے دفن کر دینا۔ (۳) کوئی آدمی امام حسینؑ کی طرف بھیجنا جو ان کو یہاں آنے سے روکے۔ کیونکہ میں ان کو لکھ چکا ہوں کہ یہاں کی فضا سازگار ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ تشریف لا رہے ہوں گے۔ وصیت ہو چکی تو واپس آ گئے۔ ابن سعد نے اسی وقت اپنی کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے ابن زیاد سے کہا: اے امیر! کیا آپ کو معلوم ہے۔ مسلم نے مجھے کیا کہا ہے؟ انہوں نے مجھ سے یہ باتیں کی ہیں۔ اس کی ناشائستہ حرکت کو ابن زیاد نے بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس وقت یہ ضرب المثل زبان پر جاری کی: ﴿لا یخونک الامین ولکن قد یؤتمن الخائن﴾ امین کبھی خیانت نہیں کرتا مگر کبھی غلطی سے خیانت کار کو امانت دار سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر جناب مسلمؑ کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

(۱) جہاں تک تمہارے مال کا تعلق ہے ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ آپ جہاں چاہیں اسے

---

1. ارشاد، ص ۵۹۔
2. لہوف ابن طاؤس، ص ۴۷۔
3. المنتخب، ص ۲۱۲۔

صرف کریں۔

(۲) قتل کرنے کے بعد ہمیں آپ کی لاش سے کیا مطلب؟

(۳) اور جہاں تک حسینؑ کا تعلق ہے۔ اگر وہ ہمارا ارادہ نہیں کریں گے تو ہم بھی ان کا قصد نہیں کریں گے۔[۱]

اس کے بعد جناب مسلمؑ اور ابن زیاد کے درمیان کچھ اس طرح سلسلۂ کلام جاری ہوا۔ ابن زیاد نے جناب مسلمؑ پر بغاوت اور افتراق بین المسلمین کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا:

﴿لقد خرجت علی امامک و شققت عصا المسلمین و القحت الفتنة﴾ اے مسلمؑ! تم نے اپنے امام پر خروج کیا۔ اور مسلمانوں کے اتفاق کو پارہ پارہ کیا۔ اور فتنہ کا بیج بویا۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا: ﴿کذبت انما شق العصا معاویة و ابنه یزید و الفتنة القحها ابوک و انا ارجو ان یرزقنی اللّٰه الشهادة علی ید شر بریته﴾ تم غلط کہتے ہو۔ مسلمانوں کے اتحاد کو معاویہ اور اس کے بیٹے یزید نے پارہ پارہ کیا ہے اور فتنہ و فساد کا بیج تمہارے باپ (زیاد) نے بویا ہے۔ اور میں امیدوار ہوں کہ خدا مجھے بدترین خلائق آدمی کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز کرے گا۔[۲]

ابن زیاد:۔ ﴿ایها یا ابن عقیل اتیت الناس وهم جمع فشتت بینهم و فرقت کلمتهم﴾ خاموش! اے ابن عقیل! تم نے یہاں آکر لوگوں کے اندر تفرقہ ڈال دیا حالانکہ وہ مجتمع تھے۔

جناب مسلمؑ:۔ ﴿کلا لست لذلک اتیت ولکن اهل المصر زعموا ان اباک قتل خیارهم و سفک دمائهم و عمل فیهم اعمال الکسری و قیصر فاتیناهم لنامر بالعدل و ندعوا الی حکم الکتاب و السنة﴾ تمہارا الزام غلط ہے۔ میں مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی کرانے اور تفرقہ ڈالنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اس شہر والوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ تمہارے باپ (زیاد) نے ان کے نیک لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ اور ان کا خون بہایا ہے۔ اور ان میں رہ کر کسریٰ و قیصر کے اعمال کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لیے ہم آئے تاکہ عدل و انصاف کے ساتھ حکم کریں اور ان کو کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کرنے کی طرف دعوت دیں۔[۳]

ابن زیاد:۔ ﴿ما انت و ذلک یا فاسق او لم تکن نعمل فیهم بالعدل... الخ﴾ تمہیں ان امور سے کیا

---

[۱] ارشاد، ص ۲۳۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۳ وغیرہ۔

[۲] مقتل ابن نما حلی، ص ۱۷۔

[۳] ارشاد، ص ۲۳۲، ۲۳۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۱۲۔

واسطہ، کیا ہم ان میں عدل و انصاف نہیں کرتے تھے؟ اس کے بعد ابن زیاد بدنہاد نے جناب مسلمؑ حضرت امیر علیہ السلام، جناب عقیلؑ اور حضرت امام حسینؑ کے حق میں نازیبا کلمات استعمال کیے۔

جناب مسلمؑ:۔ ﴿انت و ابوک احق بالشتیمة﴾ تو اور تمہارا باپ ان گالیوں کا زیادہ سزاوار ہے۔[۱]

ابن زیاد:۔ ﴿یا فاسق ان نفسک تمناک ما حال اللّٰہ دونه ولم یرک اللّٰہ له اھلاً﴾ تمہارے نفس نے اس چیز کی تمنا کی جس کا خدا تمہیں اہل نہیں جانتا تھا اس لیے وہ تمہاری آرزو کے درمیان میں حائل ہو گیا۔

جناب مسلمؑ:۔ ﴿فمن اھله اذا لم نکن اھلهٗ﴾ اگر ہم اس کے اہل نہیں تو پھر کون اس کا اہل ہے۔[۲]

ابن زیاد:۔ ﴿امیر المؤمنین یزید﴾ یزید اس کا اہل ہے۔

جناب مسلمؑ:۔ ﴿الحمد للّٰہ علی کل حال رضینا باللّٰہ حکماً بیننا و بینکم﴾ ہم اپنے اور تمہارے درمیان خدا کے حاکم ہونے پر راضی[۳] ہیں۔

ابن زیاد:۔ ﴿اتظن ان لک فی الامر شیئاً﴾ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تمہارا بھی امر خلافت میں کچھ حصہ ہے؟

جناب مسلمؑ:۔ ﴿و اللّٰہ ما ھو الظن ولکنه الیقین﴾ خدا کی قسم یہ ظن و گمان نہیں بلکہ یقین ہے (کہ امامت ہمارا حق ہے)۔[۴]

ابن زیاد:۔ ﴿قتلنی اللّٰہ ان لم اقتلک قتلة لم یقتلھا احد فی الاسلام من الناس﴾ خدا مجھے غارت کرے۔ اگر میں تمہیں اس طرح قتل نہ کروں کہ اس سے قبل اسلام میں کوئی شخص اس طرح قتل نہ ہوا ہو۔

جناب مسلمؑ:۔ ﴿اما انک احق من احدث فی الاسلام مالم یکن... الخ﴾ ہاں البتہ تم دین اسلام میں بدعت پھیلانے والوں میں سے اس سے زیادہ حقدار ہو۔[۵]

جناب مسلمؑ کے حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ جوابات کے پیش نظر اب ابن زیاد کو مزید سوال و جواب کی تاب نہ رہی۔ بکیر بن حمران الاحمری[۶] (جس نے جناب مسلمؑ کا ہونٹ شگافتہ کیا تھا۔ اور جناب مسلمؑ نے اسے زخمی کیا تھا) (اور بروایتے ایک شامی شخص) کو حکم دیا کہ قصر کے اوپر جا کر ان کو قتل کر کے سر و جسد کو نیچے پھینک دو۔ چنانچہ ظالم قاتل ان کو اوپر لے گیا۔ اس وقت جناب مسلمؑ کی زبان پر تکبیر و استغفار اور صلوات کا ورد جاری تھا اور یہ بھی کہتے

۱۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۷۳۔
۲۔ ارشاد، ص ۲۳۲۔
۳۔ لہوف، ص ۳۹۔
۴۔ لہوف، ص ۳۹۔ ارشاد، ص ۲۳۲۔
۵۔ ارشاد، ص ۲۳۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۳ وغیرہ۔
۶۔ ارشاد، ص ۲۳۲۔ مروج الذہب مسعودی، ج ۳، ص ۸۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۷۴ وغیرہ۔
۷۔ مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۲۱۳۔

جاتے تھے: ﴿اللّٰھم احکم بیننا و بین قوم غرونا و کذبونا و خذلونا﴾ اس کے بعد احمری نے ان پر ایک ایسا بھر پور وار کیا کہ جناب کا سر مبارک کٹ کر نیچے آ رہا۔ بعد ازیں اُس ملعون نے جناب کا جسد اقدس بھی نیچے پھینک دیا۔[1] یہ واقعۂ ہائلہ بروز چہار شنبہ ۹ ذی الحجہ ۶۰ھ کو رونما ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد ظالم ابن زیاد نے حضرت ہانی کے قتل کا حکم دیا جو اب تک قید خانہ میں پڑے تھے۔ اگر چہ ابن اشعث نے ابن زیاد کو مشورہ دیا کہ ہانی کی عزت اور عظمت کے پیش نظر اسے قتل کر کے اس کی قوم وقبیلہ اور عام لوگوں کی ناراضی مول نہیں لینی چاہیے۔[2] مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ سر بازار ان کی گردن اڑا دی جائے۔ چنانچہ جناب ہانی کو اس حال میں قید خانہ سے نکالا گیا کہ ان کی مشکیں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی بے کسی اور بے بسی کے عالم میں کہتے جا رہے تھے: ﴿وا مذحجاہ ولا مذحج لی الیوم یا مذحجاہ یا مذحجاہ﴾ کہاں ہیں میرے قبیلہ مذحج والے، ہائے آج مذحج دکھائی نہیں دیتے۔ اتنے بڑے سردار قبیلے کو اس ذلت و رسوائی کے ساتھ قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا مگر لوگوں پر کچھ اس طرح خوف و ہراس مسلط تھا کہ کوئی شخص ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا حتیٰ کہ اسی بے بسی کے عالم میں عین اس مقام پر جہاں گوسفندوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ابن زیاد کے رشید نامی ترکی غلام نے تلوار سے ان کے سر کو تن سے جدا کر دیا۔[3] اس وقت جناب ہانی کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا: ﴿اِلَی اللّٰہِ الْمَعَادُ اَللّٰھُمَّ اِلٰی رَحْمَتِکَ وَ رِضْوَانِکَ وَ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾

ظالم حاکم نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ بلکہ منتخب کے بیان کے مطابق حکم دیا کہ دونوں بزرگواروں کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر ان کی مقدس لاشوں کو کوفہ کے بازاروں میں گھسیٹا جائے۔ چنانچہ ایسا[4] ہی کیا گیا۔ بعد ازاں باب الکناسہ پر ان کی مقدس لاشوں کو الٹا لٹکا دیا گیا۔[5] اور سرہائے مبارک قلم کر کے دمشق بھجوا دیے۔ جنہیں یزید عنید نے دمشق کے دروازہ پر نصب کر دیا۔[6]

ع فلیبک علی الاسلام من کان باکیا

ع فان کنت لا تدرین ما الموت فانظری الی ھانی فی السوق و ابن عقیل

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

---

[1] ارشاد، ص ۲۳۳۔ طبری، ج ۲، ص ۲۱۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۲۔ نفس المہموم، ص ۹۱ وغیرہ۔
[2] ارشاد، ص ۲۳۳۔
[3] ارشاد، ص ۲۳۳۔
[4] المنتخب، ص ۳۰۱۔
[5] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۹۱۔
[6] ابو الفداء، ج ۲، ص ۱۹۰۔ البدایہ، ج ۸، ص ۱۵۷۔

شہنشاہِ عرب وعجم کی
مکہ مکرمہ سے بجانب کربلا معلیٰ
روانگی اور منازل سفر

اس امر کو نیرنگیٔ روزگار اور فلک کجرفتار کی کج رفتاری کا شاہکار سمجھنا چاہیے کہ عین اس وقت جبکہ تمام اطراف واکناف عالم سے مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ کا رخ کر رہے تھے۔ رسول اسلام ﷺ کا نواسہ، علی علیہ السلام کا فرزند، سب سے زیادہ ذوقِ عبادت رکھنے والا، جس کے ذوقِ عبادت کا یہ عالم تھا کہ پچیس (۲۵) حج پیدل چل کر کیے تھے۔ آج جبکہ حج میں صرف دو دن باقی تھے۔ عمرۂ تمتع کو عمرۂ مفردہ کے ساتھ بدل کر مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ حضرت مسلمؑ نے اپنی شہادت سے ستائیس روز پہلے (۱۲ ذی القعدہ) کو عابس بن شبیب شاکری کے ہاتھ آپؑ کی خدمت میں کوفہ آنے کے لیے جو نامہ ارسال کیا تھا۔ وہ آپؑ کو مل چکا تھا۔ جس کے بعد آپ کو نظر بہ ظاہر حالات کوفہ تشریف لے جانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ مگر حج کو ترک فرما کر اس قدر عجلت سے کام کیوں لیا گیا؟ تکمیل حج میں صرف دو دن کا وقفہ تھا۔ کیا حسینؑ ایسے ذوقِ عبادت رکھنے والے بزرگوار کا یہ غیر متوقع اقدام غیر معمولی حالات واسباب کے پیدا ہونے کی غمازی نہیں کرتا؟ شخصیت امام سے واقفیت نہ رکھنے والا انسان تو یہ کہہ سکتا ہے (بلکہ کہا بھی گیا ہے کہ) اہل کوفہ نے اپنے رسل ورسائل کے ذریعہ جس خلوص وعقیدت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے آپؑ کو تکمیل حج کا انتظار نہ کرنے دیا۔ اور فوراً عراق کی طرف روانہ ہو گئے مگر جو لوگ ائمۂ اطہار علیہم السلام کے کام ومقام کی کچھ بھی معرفت رکھتے ہیں۔ وہ ہرگز ایسا گمان بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تمام چہ میگوئیاں اس لیے بھی ہوئی ہیں کہ امام عالی مقام کے اس عاجلانہ اقدام کے صرف ظاہری علل واسباب عام لوگوں کے پیش نظر تھے۔ لیکن بنظر غائر حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید عنید نے حاجیوں کے لباس میں کئی آدمی بھیجے ہوئے تھے کہ موقع پا کر امامؑ کی شمع حیات کو گل کر دیں۔ کتب سیر وتواریخ کا مطالعہ کرنے سے اس امر کا ثبوت مل جاتا ہے۔ چنانچہ ینابیع المودت میں لکھا ہے: ﴿وکان فیه خروج الحسین رضی الله عنه من مکة الی العراق بعد ان طاف و سعی و احل من

احرامه و جعل حجه عمرة مفردة لانه لم يتمكن من اتمام الحج مخافة ان يبطش به و يقع الفساد في الموسم لان يزيد ارسل مع الحجاج ثلاثين رجلاً من شياطين بني امية و امرهم بقتل الحسين عليه السلام على كل حال[1] اس تاریخ (۸ ذی الحجہ ۶۰ھ) کو حضرت امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے۔ طواف و سعی کے بعد اپنے حج کو عمرۂ مفردہ کے ساتھ بدل کر محل ہو گئے تھے۔ کیونکہ آپ تکمیل حج نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ یزید نے بنی امیہ کے تیس شیطان صفت آدمی حج کے بہانہ سے حاجیوں کے لباس میں بھیجے تھے اور ان کو حکم دیا تھا کہ ہر حال میں حسینؑ کو شہید کر دیں۔

اس بات کی تائید مزید خود آنجنابؑ کے اس بیان حقیقت ترجمان سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے مکہ سے روانگی کے بعد راستہ میں دوسری منزل (صفاح پر) فرزدق شاعر کے اس سوال کے جواب میں دیا تھا کہ "آپ حج ترک کر کے کیوں تشریف لے جا رہے ہیں۔" آپؑ نے فرمایا: ﴿لو لم اعجل لاخذت﴾ اگر میں جلدی نہ کروں تو گرفتار کر لیا[2] جاؤں گا۔ حقیقت میں حضرات جانتے ہیں کہ اس طرح حضرت امام حسینؑ کی مکہ مکرمہ میں شہادت ہو جاتی تو اس سے دو خرابیاں ضرور لازم آتیں۔

اوّل:۔ یہ کہ مکہ مکرمہ اور بالخصوص خانۂ خدا کی ہتک حرمت ہوتی جسے حسینؑ ایسا محافظ آداب اسلامیہ و عارف حرمات الٰہیہ امام کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے عبداللہ بن زبیر کے مکہ چھوڑنے کی وجہ دریافت کرنے پر فرمایا تھا کہ ﴿و الله لان اقتل خارجاً منها بشبرٍ احبّ الىّ من ان اقتل داخلاً منها﴾[3] بخدا اگر میں مکہ سے صرف ایک بالشت بھی باہر قتل کیا جاؤں۔ تو یہ امر مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ مکہ کے اندر قتل ہوں۔

دوسرے:۔ اس طرح دشمن بڑی آسانی کے ساتھ شہادت امام پر پردہ ڈالنے اور اپنی برأت ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ممکن تھا طواف بیت اللہ، وقوف عرفات، قربانی، منیٰ یا صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت آپ شہید کر دیے جاتے اور قاتل ہنگامہ دار و گیر سے بچنے کی خاطر لوگوں کے اژدہام میں گم ہونے میں کامیاب ہو جاتے (دریں حالات کون باور کرتا کہ اصل قاتل یزید یا اس کے مقرر کردہ آدمی ہیں۔ سیاسیاتِ ملکیہ میں ایسے گھناؤنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ مگر امام عالی مقام حکومت وقت کے ان ہتھکنڈوں سے کماحقہٗ واقف

---

[1] ینابیع المودۃ، ج ۲، ص ۸۲، طبع ایران۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۱۸۔ ارشاد، ص ۲۳۵۔

[3] طبری، ج ۶، ص ۲۱۷۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۶۔

تھے۔ اور مدینہ کا قیام بھی محض اسی لیے ترک کیا تھا کہ آپ کے واقعہ شہادت کو کوئی اتفاقی حادثہ سمجھ کر اس پر پردہ نہ ڈال دیا جائے۔ بہر حال یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ اگر سید الشہداؑ کی مکہ میں مخفی طور پر شہادت واقع ہو جاتی تو آج اس کو وہ اہمیت وعظمت حاصل نہ ہوتی جو اب اسے حاصل ہے اور نہ ہی اس شہادت پر وہ آثار مترتب ہوتے جن کی خاطر حسینؑ ایسا حکیم اسلام و نباضِ امت اس کو اختیار کر رہا تھا۔ امام عالی مقام نے جزیرۃ العرب کے قلب (مکہ مکرمہ) سے اور وہ بھی اس وقت جبکہ تمام اطراف و اکناف عالم کے مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے وہاں مجتمع تھے۔ احرام حج توڑتے ہوئے عراق کی طرف روانہ ہو کر درحقیقت لوگوں کے جمود فکری کو توڑ دیا اور ان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر کن حالات سے متاثر ہو کر حسینؑ نے یہ اقدام کیا ہے؟ اہل وعیال سمیت نانا کا جوار کیوں ترک کیا ہے؟ صرف دو دن باقی تھے۔ حج کیوں نہیں کیا؟ حسینؑ کیوں اور کہاں جا رہے ہیں؟ ہر آدمی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ سوچ کہ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے حرم خدا میں بھی حسینؑ کو آرام و اطمینان کا سانس نہ لینے دیا اور یہ کہ ان حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ گویا اس طرح امام عالی مقام نے یہ اقدام کر کے یزید کے ظلم و ستم کو طشت از بام کر دیا اور کوئی جارحانہ اقدام نہ کر کے اپنی صلح جوئی اور مظلومی کا لوگوں سے اعتراف کرا لیا۔

امامؑ کے اس حکیمانہ اقدام کا نتیجہ تھا کہ آپؑ کی شہادت کے بعد لوگوں پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ آپؑ کا قاتل کون ہے؟ اور یہ کہ آپ مظلوم ہیں؟ اس طرح یزید اور یزیدی حقیقت پر پردہ نہ ڈال سکے۔ مدینہ سے روانگی کی طرح یہاں بھی بعض لوگوں نے اپنی اپنی عقل و دانش کے مطابق امام علیہ السلام کو مشورے دیئے۔ اور سفر عراق سے روکا۔ جن میں ابن عباس اور ابن زبیر کے نام نمایاں نظر آتے ہیں مگر امام عالی مقام نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہر شخص کو اس کے ظرف و حال کے مطابق جواب دیا اور برابر اپنے مشن کی تکمیل میں مشغول رہے۔

ابن عباس کا مشورہ

چنانچہ عبداللہ بن عباس اور ابن زبیر نے امامؑ کے ارادۂ سفر کی اطلاع پا کر حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: فرزند رسولؐ! یہیں حرم خدا میں مقیم رہیں اور سفر عراق کا ارادہ ترک فرمائیں۔ امامؑ نے ان کے جواب میں فرمایا: ﴿ان رسول اللہ امرنی بامر وانا ماض فیہ﴾ جناب رسول خداؐ نے مجھے (عالم رؤیا میں) ایک خاص حکم دیا ہے اور میں اس کی تعمیل کروں گا۔

بعض آثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے اس سوال پر کہ اگر آپ خود تشریف لے جا رہے ہیں تو پھر ان عورتوں اور بچوں کو کیوں ہمراہ لے جا رہے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: ﴿ان اللہ قد شاء ان یراھن سبایا﴾ خدا کی یہ مشیت ہے کہ ان کو دشمنوں کی قید و بند میں دیکھے۔ (ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۰۳ وغیرہ)

بہر حال علاوہ ان اعزہ واقارب کے جو کہ مدینہ سے آپؑ کے ہمراہ آئے تھے۔ کچھ لوگ بصرہ وحجاز وغیرہ کے بھی آپ کے ہمرکاب ہو گئے۔ اس طرح یہ مختصر مگر باعظمت قافلہ کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔[1] یہ آٹھ ذوالحجہ بروز سہ شنبہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ جس روز کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیلؑ نے خروج فرمایا تھا جیسا کہ قبل ازیں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

بعض کتب مقاتل میں لکھا ہے کہ جس روز حضرت امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس کی شب کو اپنے اعزہ واحباب کے سامنے یہ خطبہ ارشاد فرمایا: ﴿الحمد لله ماشاء الله لا حول ولا قوة الا بالله و صلّى الله على رسوله خط الموت على ولد آدم مخطّ القلادة على جيد الفتاة وما اولهنى الى اسلافى اشتياق يعقوب الى يوسف و خيّرلى مصرع انا لاقيه كانّى باوصالى تقطّعها عسلان الفلوات بين النواويس و كربلا فيملأن منّى اكراشاً جوفاً و اجربةً سغباً لا محيص عن يوم خط بالقلم رضى الله رضانا اهل البيت نصبر على بلائه و يوفينا اجر الصّابرين لن تشذ عن رسول الله صلّى الله عليه و آله لحمة وهى مجموعةٌ له فى حظيرة القدس تقرّبهم عينه و ينجز بهم وعدهٗ من كان باذلاً مهجتهٗ و موطّناً على لقاء الله نفسه فليرحل معنا فانّى راحلٌ مصبحاً. انشاء الله﴾۔ ''حمد خدا و درود بر مصطفیٰؐ کے بعد۔ موت فرزندان آدم کے لیے اس طرح لازم (اور باعث زینت) ہے جس طرح نوجوان عورت کے گلو کے لیے قلادہ (ہار) مجھے اپنے بزرگوں کے دیدار کا اس قدر سخت اشتیاق ہے۔ جس طرح جناب یعقوبؑ دیدار یوسفؑ کے مشتاق تھے۔ میرے لیے ایک مقتل اختیار کیا گیا ہے۔ جسے میں ضرور دیکھوں گا۔ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ جنگل کے بھیڑیے (فوج یزید کے بھیڑیا صفت سپاہی) میرے جوڑوں کو جدا کر رہے ہیں۔ اور مجھ سے (اپنی آرزوؤں و امیدوں کے) شکم پُر کر رہے ہیں۔ اس دن سے بچنے کے لیے کوئی چارہ نہیں جو قلم قضا سے لکھ دیا گیا ہے۔ ہم اہل بیت خدا کی رضامندی پر راضی ہیں۔ ہم اس کی بلا ومصیبت پر صبر کریں گے۔ اور وہ ہمیں اجر وثواب عطا فرمائے گا۔ رسول خداﷺ سے ان کے پارہائے گوشت دور نہیں رہیں گے (بلکہ) بہشت عنبر سرشت میں وہ سب ان کے پاس جمع ہوں گے۔ اور ان کی وجہ سے آنحضرت کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ خدا ان سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرے گا۔ جو ہمارے بارے میں اپنی جان خرچ کرنا چاہتا ہے اور ملاقاتِ حق کے لیے اپنے نفس کو آمادہ کر چکا ہے۔ وہ ہمارے ہمراہ چلے۔ میں کل صبح روانہ ہو رہا ہوں انشاء اللہ۔''[2]

جب عمرو بن سعید الاشدق (گورنر مکہ) کو آنجنابؑ کی روانگی کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس خیال سے کہ

---

[1] ارشاد شیخ مفیدؒ ص ۲۲۵۔ [2] ارشاد ص ۲۲۶۔

شاید اہل عراق آپؑ پر اتفاق کرلیں اور اس طرح حکومت یزید میں خلل یا خلفشار واقع ہو اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو کچھ آدمی دے کر آپؑ کو ارادۂ سفر سے باز رکھنے کے لیے بھیجا۔ چنانچہ ان لوگوں نے سوال و جواب کے بعد زبردستی سدِّ راہ ہونے کی ناکام کوشش بھی کی۔ طرفین سے کچھ زدوکوب کی نوبت بھی پہنچی لیکن جب عمرو بن سعید کو اس صورت حال کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے آدمیوں کو واپس بلالیا۔ اس طرح وہ لوگ یہ کہتے ہوئے کہ یا حسینؑ! الا تتق اللہ تخرج من الجماعۃ و تفرق بین ھذہ الامۃ واپس چلے گئے اور حضرت امام حسینؑ لی عملی ولکم عملکم انتم بریئون ممّا اعمل و انا بری مما تعملون فرماتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔[1]

مکہ سے کربلا تک منازل سفر

اگرچہ مکہ سے کربلا تک درمیانی منازل کی تفصیل وتعداد میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر تواریخ و مقاتل کی کتب معتبرہ مثل عاشر بحار، تمقام، زخار، نفس المہموم اور مقتل الحسینؑ للمقرم وغیرہا سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان منازل کی تعداد سولہ ہے جن کی تفصیل اور ہر ہر منزل پر رونما ہونے والے واقعات کی بقدر ضرورت تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے تاکہ کربلا کی خونی تاریخ کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔

پہلی منزل: تنعیم (بروزن ترحیم)

اکثر کتب سیر و تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ سے روانگی کے بعد پہلی منزل یہی تھی جو کہ مکہ سے قریباً دو فرسخ اور بروایتے آٹھ فرسخ کی مسافت پر واقع ہے۔[2] اسی منزل پر جناب سید الشہداءؑ کی ایک قافلہ سے ملاقات ہوئی ہے جسے حاکم یمن بحیر بن اسحاق نے کچھ قیمتی مال و اسباب دے کر یزید بن معاویہ کی طرف روانہ کیا تھا۔ چونکہ اس مال کے حقیقی مالک بحیثیت امام زمانہ آپ ہی تھے[3] اس لیے آپ نے وہ مال و اسباب اپنے قبضہ میں لے لیا اور ساربانوں سے فرمایا: تم میں سے جو شخص ہمارے ساتھ عراق تک آنا چاہے ہم اسے پورا کرایہ دیں گے۔ اور جو یہاں سے واپس جانا چاہے اسے بقدر قطع مسافت کرایہ دے دیا جائے گا۔ چنانچہ کچھ لوگ آپؑ کے ہمراہ جانے پر رضامند ہوگئے۔ اور کچھ وہیں سے کرایہ لے کر واپس چلے گئے۔[4] اکثر کتب سیر و تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی منزل پر جناب عبداللہ بن جعفرؑ کے صاحبزادے جناب عون و محمد اپنے والد ماجد کا مندرجہ ذیل رقیمۂ کریمہ لے کر خدمت امام

---

1. ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۰۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۶۔
2. مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۸۱۔
3. حاشیہ نفس المہموم، ص ۹۱۔ بحار، ج ۱۰، ص ۱۸۵۔
4. طبری، ج ۶، ص ۲۱۸۔ مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۲۲۰۔ نفس المہموم، ص ۹۱۔ تمقام، ص ۱۸۳ وغیرہ۔

میں حاضر ہوئے۔ اس رقیمہ کا مضمون یہ تھا: ﴿اما بعد فانی اسئلک باللّٰہ لما انصرفت حین تقرأ کتابی ھذا فانی مشفق علیک من ھذا الوجہ ان یکون فیہ ھلاکک و استیصال اھلبیتک ان ھلکت الیوم طفی نور الارض فانک علم المھتدین و رجاء المؤمنین فلا تعجل بالمسیر فانی فی اثر کتابی و السلام﴾۔ اما بعد خدارا جب میرا یہ مکتوب پڑھیں تو اس سفر سے باز آ جائیں۔ کیونکہ مجھے اس سفر میں آپؑ کی اور آپ کے خانوادہ کی ہلاکت کا اندیشہ ہے اور اگر آپؑ کی موت واقع ہوگئی۔ تو زمین کا نور بجھ جائے گا۔ کیونکہ آپؑ ہی ہدایت حاصل کرنے والوں کے نشان راہ اور اہل ایمان کی امید گاہ ہیں۔ چلنے میں جلدی نہ کریں۔ کیونکہ میں خود بھی اس مکتوب کے بعد آ رہا ہوں۔[۱] جس وقت حضرت سید الشہداؑ مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت جناب عبد اللہ ہنوز مدینہ سے مکہ نہیں پہنچے تھے۔ پہنچنے پر جب ان کو آنجنابؑ کی روانگی کا علم ہوا۔ تو اپنے دونوں صاحبزادوں کو مندرجہ بالا مکتوب دے کر آنجنابؑ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اور آپ سیدھے عمرو بن سعید حاکم مکہ و مدینہ کے پاس پہنچے اور ان سے جا کر امام علیہ السلام کے لیے امان نامہ حاصل کرنے کے متعلق گفتگو کی۔ حاکم نے کہا: جو آپ عبارت مناسب سمجھیں۔ لکھ دیں۔ میں اس پر دستخط کر دوں گا۔ اور اپنی مہر بھی لگا دوں گا۔ چنانچہ اس مضمون کا امان نامہ لکھا گیا: ﴿بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم من عمرو بن سعید الی الحسین بن علی علیھما السلام اما بعد فانی اسئل اللّٰہ ان یصرفک عما یوبقک و ان یھدیک لما یرشدک بلغنی انک قد توجھت الی العراق و انی اعیذک باللّٰہ من الشقاق فانی اخاف علیک فیہ الھلاک وقد بعثت الیک عبد اللّٰہ بن جعفر و یحیٰی بن سعید فاقبل الیّ معھما فان لک عندی الامان و الصلۃ و البر و حسن الجوار لک اللّٰہ علیّ بذلک شھید و کفیل و مراع و وکیل و السلام علیک﴾۔ ”عمرو بن سعید کی طرف سے حسین بن علی علیہما السلام کے نام۔ میں بارگاہ ایزدی میں سوال کرتا ہوں کہ وہ آپ کو باعث ہلاکت امور سے باز رکھے اور جس بات میں خیر و خوبی ہو اس کی راہبری فرمائے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ عراق تشریف لے جا رہے ہیں۔ میں افتراق سے آپ کو خدا کی پناہ میں دیتا ہوں کیونکہ اس میں ہلاکت پوشیدہ ہے۔ میں آپ کی طرف عبد اللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کو بھیج رہا ہوں۔ آپ ان کے ساتھ واپس میرے پاس آ جائیں۔ آپ کو امان دی جاتی ہے اور آپ کے ساتھ صلۂ رحمی، نیکی اور اچھے پڑوسی والا سلوک کیا جائے گا۔ خدا اس بات کا شہید، وکیل اور کفیل ہے۔“[۲]

---

[۱] عاشر بحار، ص ۱۸۲۔ نفس المہموم، ص ۹۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۰۳۔ کامل، ج ۳، ص ۷۷ وغیرہ۔

[۲] طبری، ج ۶، ص ۲۱۹۔ عاشر بحار، ص ۱۸۲ وغیرہ۔

چنانچہ جناب عبداللہ اور یحییٰ بن سعید یہ امان نامہ لے کر خدمت امام عالی مقام میں حاضر ہوئے۔ امان نامہ پیش خدمت کرنے کے بعد واپسی پر اصرار کیا۔ مگر امام علیہ السلام نے یہ فرما کر ﴿انی رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ فی المنام و امرنی بما انا ماض لہ﴾ میں نے عالم خواب میں جناب رسول خداؐ کو دیکھا ہے اور اسی عالم میں انہوں نے مجھے ایک حکم دیا ہے جسے میں ضرور پورا کروں گا۔[1] بہرحال جب جناب عبداللہ بالکل مایوس ہو گئے تو اپنے دونوں شاہزادوں کو خدمت امام میں حاضر رہنے اور بوقت ضرورت جہاد کرنے کا حکم دے کر واپس چلے گئے۔[2] ''اور خود کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جا سکے۔''[3]

دوسری منزل: صفاح

یہ منزل مکہ مکرمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس منزل پر جناب سید الشہداءؑ کی مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ جو اپنی والدہ کے ہمراہ بغرض حج کوفہ سے آ رہا تھا۔ امامؑ نے اس سے اہل کوفہ کے حالات دریافت کئے۔ فرزدق نے صحیح تجزیہ کرتے ہوئے کہا: ﴿قلوب الناس معک و سیوفھم علیک و القضا ینزل من السماء و اللّٰہ یفعل ما یشاء﴾ آقا لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں اور ان کی تلواریں آپ کے برخلاف۔ قضا آسمان سے نازل ہوتی ہے اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

امام عالی مقام نے فرمایا: ﴿صدقت للّٰہ الامر و کل یوم ربنا فی شان ان نزل القضا بما نحبّ فنحمد اللّٰہ علی نعمائہ وھو المستعان علی اداء الشکر و ان حال القضا دون الرجاء فلم یتعد من کان الحق نیۃ و التقوی سریرتہٗ﴾ تم نے سچ کہا ہے۔ سب معاملات قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور ہمارا پروردگار ہر روز نئی شان میں ہوتا ہے۔ اگر ہماری خواہش کے مطابق قضا نازل ہوئی تو اس کے احسان پر اس کی حمد و ثنا کریں گے اور اداءِ شکر پر اسی سے مدد طلب کریں گے اور اگر ہماری منشاء کے خلاف حالات رونما ہو گئے تو بھی کی نیت حق اور تقویٰ شعار ہو۔ اس نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ اس کے بعد فرزدق نے آپؑ سے حج وغیرہ کے بعض مسائل دریافت کئے اور پھر مرخص ہو گیا۔''[4]

---

[1] ارشاد، ص ۲۳۶۔ عاشر بحار، ص ۸۴ وغیرہ۔

[2] ارشاد، ص ۲۲۷۔ عاشر بحار، ص ۱۸۴ وغیرہ۔

[3] شہید انسانیت، ص ۲۹۶۔

[4] نفس المہموم، ص ۹۱۔ طبری، ج ۶، ص ۲۱۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۶ وغیرہ۔

تیسری منزل: ذات عرق (جو کہ نجد و تہامہ کی حد فاصل ہے)

صاحب مقتل مقام نے جناب عبد اللہ اور ان کے صاحبزادوں کا خدمت امام میں حاضر ہونے کا واقعہ اسی منزل میں لکھا ہے۔[1] لیکن مشہور و منصور قول وہی ہے جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ بہر حال جناب سید الشہداؑ نے جناب عبد اللہ اور یحییٰ بن سعید سے رخصت ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ قطع مسافت کرتے ہوئے ذات عرق کے مقام پر پہنچے۔ اور وہاں قیام بھی فرمایا۔[2] اس مقام پر بشر بن غالب سے ملاقات ہوئی۔ جو عراق سے آرہا تھا۔ (صاحب ناسخ نے (ج ۲، ص ۲۰۵ پر) فرزدق کا نام لکھا ہے لیکن مشہور بشر ہی ہے) امام نے اس سے کوفہ والوں کی حالت دریافت کی۔ اس نے دوسرے باخبر لوگوں کی طرح یہی جواب دیا: ﴿خلفت القلوب معک و السیوف مع بنی امیۃ﴾ میں نے ان کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ ان کی تلواریں تو بنی امیہ کے ساتھ ہیں لیکن دل آپ کے ہمراہ ہیں۔

امامؑ نے اس کا یہ کلام سن کر فرمایا: ﴿صدق اخو بنی اسد ان اللّٰہ یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید﴾۔ اس اسدی نے سچ کہا ہے مگر خدا جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ اور جس بات کا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔[3]

اسی منزل کے متعلق بعض کتب مقاتل میں ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے کہ ریاشی (ابو الفضل عباس بن الفرج البصری النحوی المقتول ۲۷۵ھ)[4] اپنے سلسلۂ سند سے ایک عراقی سے نقل کرتے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر بڑی تیزی سے مسافت طے کرتا ہوا حج پر جا رہا تھا کہ اچانک ایک صحرا میں کچھ نصب شدہ خیمے دیکھے۔ قریب گیا۔ اور پوچھا کہ یہ کس کے خیمے ہیں؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ حسینؑ کے ہیں۔ میں نے از راہ تعجب کہا: کیا وہی حسینؑ جو علیؑ و فاطمہؑ کے فرزند ہیں؟ مجھے بتایا گیا کہ ہاں وہی حسینؑ۔ میں نے ان کا خیمہ دریافت کیا۔ اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ حسینؑ خیمہ کے دروازہ پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ اور کچھ خطوط پڑھ رہے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ امامؑ نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے عرض کیا: یا ابن رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ اس لق و دق صحراء میں کس چیز نے آپ کو اترنے پر مجبور کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿ان ھؤلاء اخافونی و ھذہ کتب اھل الکوفۃ وھم قاتلی فاذا فعلوا ذلک ولم یدعو اللّٰہ محرّماً الا انتھکوہ بعث اللّٰہ الیھم من یقتلھم حتی یکونوا اذل من قوم الامۃ﴾ ان لوگوں (بنی امیہ) نے مجھے خوف زدہ کر دیا

---

[1] مقتل مقام، ص ۲۸۷۔

[2] ارشاد، ص ۲۳۷۔ بحار، ص ۱۸۴۔

[3] ملہوف، نفس المہموم، ص ۹۳۔

[4] حاشیہ نفس المہموم، ص ۹۳۔

ہے۔ (مجھے اہل کوفہ نے دعوت دی ہے) اور یہ ان کے خطوط ہیں۔ لیکن یہ میرے قتل میں شریک ہوں گے۔ وہ جب یہ (جرم) کر گزریں گے اور سب حرمات الٰہیہ کی ہتک کر چکیں گے تو اس وقت خداوند عالم کسی ایسے شخص کو ان پر مسلط کرے گا جو ان کو اس طرح قتل و غارت کرے گا۔ کہ وہ لونڈی کی قوم سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے[1]۔ بعض اہل تحقیق کا خیال ہے کہ کلام امامؑ میں وارد شدہ لفظ "قومؑ" "فرام" کی تصحیف ہے۔ بنابریں مطلب یہ ہوگا کہ وہ لونڈی کے چیتھڑے سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوں گے۔[2] (وھوالاصح)

چوتھی منزل: حاجز از بطن رُمّہ

بطن رُمّہ ایک وادی ہے جس کی ایک جگہ کا نام حاجز ہے۔ جہاں امامؑ نے قدرے قیام فرمایا تھا۔ اسی مقام سے امام علیہ السلام نے قیس بن مسہر صیداوی (اور بروایتے عبداللہ بن یقطر[3]) کے ہاتھ اہل کوفہ کے نام اس مضمون کا خط بھیجا: ﴿بسم اللّٰه الرّحمٰن الرحیم من الحسینؑ بن علیؑ الی اخوانه المؤمنین و المسلمین سلام علیکم فانی احمد الیکم اللّٰه الّذی لا اله الّا هو اما بعد فان کتاب مسلم بن عقیل جائنی یخبر فیه بحسن رائیکم و اجتماع ملائکم علی نصرنا و الطلب بحقنا فسالت اللّٰه عز و جلّ ان یحسن لنا الصنع و ان یثیکم علی ذلک اعظم الاجر و قد شخصت الیکم من مکة یوم الثلاثا لثمان مضین من ذی الحجة یوم الترویة فاذا قدم علیکم رسولی فاکمشوا فی امرکم و جدّوا فانی قادم علیکم فی ایامی هذه و السلام علیکم و رحمة اللّٰه و برکاتهٗ﴾ جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہ حسینؑ بن علیؑ کا مکتوب ہے اپنے دینی بھائیوں کے نام حمد الٰہی اور سلام مسنون کے بعد۔ مسلمؑ بن عقیل کے خط سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے حالات درست اور تمہارے درمیان ہماری نصرت اور طلب حق پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ میں نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی ہے کہ وہ انجام بخیر کرے۔ اور تمہیں اجر عظیم عطا کرے۔ میں آٹھویں ذی الحجہ سے مکہ سے تمہاری طرف روانہ ہو چکا ہوں۔ جب میرا قاصد پہنچے تو تم جلدی اپنے انتظامات مکمل کر لو۔ کیونکہ میں انہی دنوں میں تمہارے ہاں پہنچنے والا ہوں۔ والسلام۔

---

[1] نفس المہموم، ص ۹۳۔ مقتل الحسین مقرم، ص ۱۸۳۔

[2] نفس المہموم، ص ۹۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۶۔

[3] کتاب لؤلؤ و مرجان محدث نوری سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام نے دو مکتوب قیس بن مسہر اور عبداللہ بن یقطر (جو کہ آنجناب کی دایہ میمونہ کے بیٹے تھے) ہر دو کے ہاتھ روانہ کیا تھا۔ چنانچہ عبداللہ نے بھی ابن زیاد بدنہاد کے حکم سے جام شہادت نوش کیا۔
(قمر ساں الہیجا، ج ۱، ص ۲۶۰)۔ (منہ عفی عنہ)

جناب قیسؓ امام علیہ السلام کا یہ مکتوب مبارک لے کر کوفہ روانہ ہوئے۔ اُدھر چونکہ ابن زیاد کو سرکار سید الشہداء کی بجانب عراق روانگی کی اطلاع مل چکی تھی اس لیے اس نے قادسیہ سے خفان اور خفان سے قطقطانہ تک عراق سے واقصہ اور واقصہ سے بصرہ کے راستہ تک ناکہ بندی کر کے وہاں اپنی پولیس متعین کر دی تھی۔ اور ہر آنے جانے والے کی مکمل نگرانی کی جاتی تھی۔ اس ناکہ بندی کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب امام حسینؑ جب بطن العقیق سے آگے بڑھے اور بعض بدوؤں سے ملاقات ہوئی تو ان سے کوفہ کی تازہ صورت حال دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا: ﴿واللہ ما ندری غیر انا لا نستطیع ان نلج ولا نخرج﴾ بخدا ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہم تو نہ اندر جا سکتے ہیں اور نہ باہر نکل سکتے ہیں۔ (ارشاد، ص ۲۳۸)

قیس بن مسہر صیداوی کی شہادت

اس پولیس کا سربراہ حصین بن نمیر تمیمی تھا۔ چنانچہ قیس کوفہ جاتے ہوئے قادسیہ پہنچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ جب اس نے تلاشی لینا چاہی تو جناب قیس نے افشائے راز کے اندیشہ سے خط پھاڑ ڈالا۔ بہر حال حصین نے انہیں گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ جب ابن زیاد کے سامنے پیش ہوئے۔ تو اس نے پوچھا کہ تُو نے وہ خط کیوں پھاڑا۔ جناب قیس نے بلاجھجک کہا۔ تاکہ تم اس کے مندرجات پر مطلع نہ ہو سکو۔ ابن زیاد نے اصرار کیا۔ کہ بتاؤ اس میں کیا لکھا تھا۔ اور کن کن اشخاص کے نام لکھا گیا تھا؟ مگر جناب قیس نے بتانے سے انکار کر دیا۔ ابن زیاد نے کہا: اچھا اگر ایسا نہیں کرتے ہو تو پھر منبر پر چڑھ کر حسینؑ بن علیؑ پر سب و شتم کرو۔ قیس نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے آمادگی ظاہر کی۔ اور فوراً منبر پر جا کر خدا کی حمد و ثنا اور پیغمبر اسلام پر درود و سلام بھیجنے کے بعد کہا: ﴿ایها الناس ان هذا الحسین بن علیؑ خیر خلق اللہ ابن فاطمة بنت رسول اللہ صلی اللہ علیه و آله و انا رسوله فاجیبوه﴾۔ اے لوگو! حسینؑ بن علیؑ جو دختر رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے فرزند ہیں۔ بہترین خلائق ہیں۔ میں ان کا قاصد ہوں۔ تم پر لازم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہو۔ اس کے بعد جناب امیر علیہ السلام پر درود و سلام بھیجا اور ابن زیاد اور اس کے باپ پر لعنت کی۔ ابن زیاد نے غصہ سے آگ بگولہ ہو کر حکم دیا کہ ان کو قصر پر لے جا کر نیچے گرا دیا جائے۔ چنانچہ ظالموں نے ایسا ہی کیا۔ بروایتے ان کے ہاتھ پس پشت باندھ کر گرایا گیا۔ اور گرتے ہی ان کے اعضاء و جوارح چور چور ہو گئے۔ ابھی کچھ رمق باقی تھی کہ عبدالملک بن عمیر لخمی نے آگے بڑھ کر ان کے رشتۂ حیات کو قطع کر دیا۔[1]

﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾

---

[1] ارشاد، ص ۲۳۸۔ نفس المہموم، ص ۹۵۔ الاخبار الطوال، ص ۲۴۵۔ منتخب التواریخ، ص ۲۹۳۔

پانچویں منزل: بطن العقبہ

حاجز سے روانہ ہو کر جناب سید الشہداءؑ عربوں کے ایک چشمہ پر پہنچے اور وہاں عبداللہ بن مطیع عدوی سے ملاقات ہوئی۔ اسے جب سید الشہداءؑ کے عزم عراق کا علم ہوا تو اس نے بھی دوسرے عام مشیروں کی طرح آنجنابؑ کو سفر عراق اختیار نہ کرنے کا مشورہ دیا مگر جنابؑ نے خصوصی مصالح و حکم کی بنا پر اس کے مشورہ کو قبول نہ کیا۔ اور آگے روانہ ہو گئے۔[1] اب حضرت امام حسینؑ کے ہمراہیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ عربوں کے جس چشمہ سے گزرتے وہاں کے چند آدمی اس خیال کے تحت آپ کے ہمراہ ہو جاتے تھے کہ شاید امام عراق جا کر تخت و تاج کے مالک بنیں گے۔ اور امامت کے ساتھ سلطنت بھی جمع ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ شدہ شدہ مختصر قافلہ نے اب ایک مختصر سے لشکر کی صورت اختیار کر لی تھی۔[2]

چھٹی منزل: خزیمیہ

آنجنابؑ بطن العقبہ سے روانہ ہو کر مقام خزیمیہ پر پہنچے۔ اور وہاں پہنچ کر ایک شب و روز قیام[3] فرمایا۔ بعض اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی منزل پر ایک واقعہ درپیش آیا۔ وہ یہ کہ جب صبح ہوئی تو جناب زینب عالیہؑ نے خدمت امام میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ رات کے وقت جب میں کسی کام کے لیے باہر نکلی تو سنا کہ کوئی ہاتف غیبی یہ شعر پڑھ رہا ہے ؎

الا یا عین فاحتفلی بجهد	ومن یبکی علی الشهداء بعدی
اے آنکھ پوری کوشش سے آنسو بہا	اور بھلا میرے بعد شہداء پر اور کون روئے گا
علی قوم تسوقهم المنایا	بمقدار علی انجاز وعد
(میرے بعد کون روئے گا) اس گروہ پر جن کو	ایفاء عہد کے لیے ہانک کر لے جا رہی ہیں موتیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جناب صدیقہ صغریٰؑ نے ان اشعار سے کوئی اچھا تاثر نہیں لیا۔ جناب سید الشہداءؑ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿یا اختاہ الامر الذی قضی فهو کائن﴾ اے بہن! جو قضا و قدر میں ہے۔ وہ ضرور ہو کر رہے گا۔[4]

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۸۔ نفس المہموم، ص ۹۵۔ [2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۸، ص ۱۶۸۔ مقتل الحسین، ص ۱۸۶۔
[3] عاشر بحار، ص ۱۸۶۔ [4] ابن نما، ص ۲۳۔ نفس المہموم، ص ۹۵۔ تاریخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۰۹۔

ساتویں منزل: زرود

سابقہ منزل سے روانہ ہوکر جناب امام حسینؑ منزل زرود پر وارد ہوئے۔ اس منزل پر جو قابل ذکر اہم واقعہ درپیش آیا۔ وہ جناب زہیر بن القین بجلی کی سید الشہداءؑ سے ملاقات اور پھر اس کے نتیجہ میں ان کی آپ کے انصار و اعوان میں شمولیت ہے۔ جناب زہیر جو کہ عقیدۂ عثمانی تھے اور امامت اہل بیتؑ کے قائل نہ تھے اسی لیے وہ آنجنابؑ کے ہمراہ خیمہ نصب کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر منزل زرود کے چشمہ نے ان کو اکٹھا ہونے پر مجبور کر دیا۔ حج بیت اللہ کے فریضہ سے فارغ ہوکر واپس آ رہے تھے۔ منزل زرود پر انہوں نے اپنا خیمہ آنجنابؑ کے خیام کے قریب نصب کیا۔ امام عالی مقام چشم بصیرت سے ان کے جوہر قابل کو دیکھ رہے تھے۔ اس لیے ان کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ جس وقت قاصد پہنچا۔ اس وقت زہیر اپنے آدمیوں کے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ قاصد نے جا کر یہ پیغام دیا کہ میرے آقا ابو عبداللہ الحسینؑ نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے کہ آپ ان سے ملیں۔ یہ سن کر زہیر نے قدرے پس و پیش کی مگر ان کی زوجہ دلہم بنت عمرو نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور کہا: کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ فرزند رسولؐ آپ کو بلائیں۔ اور آپ ان کے پاس نہ جائیں۔ آخر جانے میں حرج کیا ہے؟ جائیں اور ان کی بات سنیں۔ اور پھر واپس آ جائیں۔ چنانچہ جناب زہیر خدمت امامؑ میں حاضر ہوئے۔ امامؑ کی نظر کیمیا اثر نے ان کی کایا پلٹ دی۔ جب تھوڑی دیر کے بعد زہیر واپس اپنے خیمہ میں پہنچے۔ تو ان کا چہرہ فرط مسرت سے تمتما رہا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ میرے خیمہ کو جناب امام حسینؑ کے خیام کے ساتھ نصب کیا جائے اور پھر اپنی زوجہ کو کافی مال و اسباب دے کر اس کے بعض رشتہ داروں کے ہمراہ یہ کہہ کر میکے بھجوا دیا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تجھے کوئی گزند پہنچے۔ اور بروایتے اسے طلاق[1] دے دی۔ وہ نیک بخت اٹھی۔ اور روتے ہوئے ان کو الوداع کہا اور یہ دعا کرتے ہوئے کہ ﴿کان اللّٰہ عونا و معینا و خار اللّٰہ لک﴾ (خدا آپ کا حامی و ناصر ہو) یہ استدعا کی کہ ﴿ان تذکرنی فی القیمۃ عند جد الحسینؑ﴾۔ ''بروز حشر مجھے حسینؑ کے جد نامدار کی بارگاہ میں فراموش نہ کرنا۔'' قمقام کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ زوجۂ زہیر ان کی شہادت تک کربلا میں موجود تھیں۔ و المشہور ھو الاول و اللّٰہ العالم۔ (قمقام، ص ۲۹۲)۔ پھر اپنے ساتھیوں سے فرمایا: میں نے تو حضرت امام حسینؑ کا ساتھ دینے اور بوقت ضرورت ان پر اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم میں سے جو اس مہم میں میرے ساتھ شریک ہونا چاہے۔ بسم اللہ۔ ورنہ اس کی اور میری یہ آخری ملاقات ہے۔ وہ بے شک علیحدہ ہو جائے۔[2] جس طرح جناب زہیر نے حمایت

---

[1] ارشاد، ص ۲۳۹۔

[2] عاشر بحار، ص ۱۸۶۔ نفس المہموم، ص ۹۶۔ ملہوف، ص ۶۲۔ ارشاد، ص ۲۳۹ وغیرہ۔

دین وحفاظت امام مبینؑ میں جانبازی اور جاں نثاری کا حق ادا کیا۔ وہ تاریخ کربلا کا سنہری باب ہے۔ تفصیل انصار حسینیؑ کے تذکرۂ شہادت میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

آٹھویں منزل: ثعلبیہ

منزل زرود سے روانہ ہو کر امام عالی مقام نے دوسرے روز شام کو منزل ثعلبیہ کے مقام پر قیام فرمایا۔ اور نظر بظاہر حالات اسی منزل پر پہلی بار آنجنابؑ کو حضرت مسلمؑ وہانی کی شہادت کے واقعۂ ہائلہ کی اطلاع ملی۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ بنی اسد کے دو شخص عبداللہ بن سلیمان اور منذر بن مشمعل بیان کرتے ہیں کہ جب ہم فریضۂ حج کی ادائیگی سے فارغ ہوئے۔ تو ہمارا مقصد اقصیٰ یہ تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو امام حسینؑ سے جا کر ملحق ہوں۔ اور حقیقت حالات سے آگاہی حاصل کریں۔ چنانچہ ہم بڑی تیزی سے منازل سفر طے کرتے ہوئے منزل زرود پر امام کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں ایک آدمی کوفہ سے آتا ہوا نظر آیا۔ امام علیہ السلام اسے دیکھتے ہی اس طرح رُک گئے۔ گویا اس سے مل کر کچھ حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس شخص نے امام علیہ السلام کو دیکھ کر راستہ چھوڑ کر دوسری طرف کا رخ کر لیا۔ اس کے بعد امام آگے نکل گئے۔ ہم نے باہم مشورہ کیا کہ اس شخص سے ضرور کوفہ کی تازہ صورت حال معلوم کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم جلدی جلدی اس شخص کے پاس پہنچے۔ اور سلام کیا۔ اس نے جواب سلام دیا۔ ہم نے اس کا نام ونسب دریافت کیا۔ اس نے کہا: میں بنی اسد کے ساتھ تعلق رکھتا ہوں۔ اور میرا نام بکر بن فلاں ہے۔ ہم نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہم بھی اسدی ہیں۔ پھر ہم نے اس سے کوفہ کی تازہ صورت حال پوچھی۔ اس نے کہا کہ مسلمؑ و ہانی قتل کر دیے گئے ہیں۔ اور میں اس وقت تک کوفہ سے باہر نہیں نکلا۔ جب تک اپنی آنکھوں سے یہ ہولناک منظر نہیں دیکھا۔ کہ جناب مسلم وہانی کے پاؤں میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ اور ان کی لاشوں کو کوفہ کے بازاروں میں گھسیٹا جا رہا تھا۔" یہ دردناک خبر سن کر ہم واپس آئے۔ اور امامؑ کے قافلہ میں آ کر شامل ہو گئے۔ جب امام علیہ السلام نے دوسرے روز شام کے وقت منزل ثعلبیہ پر قیام کیا۔ تو ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپؑ کے کچھ مخصوص اصحاب بھی وہاں موجود تھے۔ ہم نے سلام عرض کیا۔ امام نے سلام کا جواب دیا۔ ہم نے عرض کیا: ہم ایک خبر گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حکم دیں تو سب کے روبرو عرض کر دیں۔ ورنہ تنہائی میں عرض کریں۔ یہ سن کر امام عالی مقام نے ایک نظر سے ہم کو دیکھا۔ اور ایک نظر حاضرین پر ڈالی۔ پھر فرمایا: ﴿ما دون هؤلاء سر﴾۔ ان سے علیحدگی و رازداری کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہم نے عرض کیا۔ کل شام آپ نے وہ آدمی دیکھا تھا۔ جو کوفہ کی طرف سے آ رہا تھا؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں بلکہ میں تو اس سے کچھ پوچھنا بھی چاہتا تھا۔ ہم نے عرض کیا کہ (آپ کی منشاء کے مطابق) ہم نے اس سے حالات حاضرہ معلوم کیے ہیں۔ وہ شخص ہمارے قبیلہ کا ہے۔ اور بڑا سچا اور عقلمند آدمی ہے۔

اس نے ہمیں بتایا ہے کہ جناب مسلمؑ و ہانی شہید کر دیے گئے۔ اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اس وقت تک کوفہ سے باہر نہیں نکلا جب تک اس نے اپنی آنکھوں سے یہ پُر درد منظر نہیں دیکھا۔ کہ ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر بازاروں میں گھسیٹا جا رہا تھا۔ یہ خبر وحشت سن کر امامؑ نے کئی بار فرمایا: ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ رحمۃ اللّٰہ علیہما﴾[1]۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ واقعات تو وہی ہیں جو تمام کتب سیر و مقاتل میں موجود ہیں مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صاحب شہید انسانیت مدظلہ کے الفاظ میں ادا کیا جائے۔" وہ تحریر فرماتے ہیں: "اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس سے پورا پورا اثر لے چکے تھے۔ اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائے قائم کر چکے تھے۔ ان سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی۔ اور وہ بے ساختہ بول اٹھے کہ خدا کا واسطہ اپنی اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔ یہیں سے واپس ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے۔ نہ دوست بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا کوفہ آپؑ کے خلاف ہی ہوگا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے۔ اس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ حضرت امام حسینؑ خود پہلے ہی سے انجام پر مطلع تھے۔ اور آپ کا سفر جن نتائج کو پیش نظر رکھ کر تھا۔ ان میں اس خبر کے آنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن دوسرے افراد کے لیے وقتی جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل کے پیش کرنے کا محل نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے حضرتؑ نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری جذبہ کے احساس سے دینا چاہا۔ اور اس کے لیے ایک نظر اولاد عقیلؑ پر ڈالی۔ اور فرمایا: "تمہاری کیا رائے ہے؟ مسلمؑ تو شہید ہو گئے۔" تمام عقیلی جوان کھڑے ہو گئے۔ اور کہا: "خدا کی قسم ہم تو واپس نہ ہوں گے۔ جب تک مسلمؑ کے خون کا بدلہ نہ لے لیں۔ یا وہی موت کا ساغر ہم بھی نہ چکھ لیں۔ جو مسلمؑ نے چکھا۔" حضرتؑ متوجہ ہوئے دونوں اسدیوں کی طرف اور فرمایا: "جب یہ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔"[2] جب ان کو یقین ہو گیا کہ امامؑ نے آگے بڑھنے کا ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ تو دونوں نے کہا: ﴿خار اللّٰہ لک﴾ خدا آپ کو خیر و خوبی عطا کرے۔ امامؑ نے بھی ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿رحمکما اللّٰہ﴾ "خدا تم دونوں پر رحم و کرم کرے۔" (ارشاد، ص ۲۲۰)

بہرحال امامؑ نے رات یہیں گزاری۔ سحر کے وقت امامؑ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ کافی مقدار میں پانی لے لو۔ اس کے بعد آگے روانہ ہوئے۔ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے روانگی سے قبل کوفہ کے ایک شخص ابو ہرہ ازدی نے خدمتِ امامؑ میں حاضر ہو کر سلام کے بعد حرم خدا و حرم رسولؐ چھوڑنے کا سبب پوچھا۔ آپؑ نے فرمایا:

---

[1] ارشاد شیخ مفیدؒ، ص ۲۲۰۔ عاشر بحار الانوار، ص ۱۸۶۔ مقتل، ص ۲۹۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۱۰۔ نفس المہموم، ص ۹۷ وغیرہ۔

[2] شہید انسانیت، ص ۳۰۲۔ بحوالہ الاخبار الطوال، ص ۲۳۶۔ طبری، ج ۶، ص ۲۲۵۔ ارشاد، ص ۲۲۳۔

﴿ویحک یا ابا هرة ان بنی امیة اخذوا مالی فصبرت و شتموا عرضی فصبرت و طلبوا دمی فهربت و ایم اللّٰه لتقتلنی الفئة الباغیة و لیلبسنهم اللّٰه ذلاً شاملاً و سیفاً قاطعاً و لیسلّطن اللّٰه علیهم من یذلّهم حتّی یکونوا اذل من قوم سبا اذ ملکتهم امراة فحکمت فی اموالهم و دمائهم﴾[1]
بنی امیہ نے میرا مال لوٹا لیکن میں نے صبر کیا۔ مجھے گالیاں دے کر ہتک حرمت کی۔ پھر بھی میں نے صبر سے کام لیا۔ اب جبکہ انہوں نے میرا خون بہانا چاہا تو میں نکل کھڑا ہوا۔ خدا کی قسم یہ باغی گروہ مجھے ضرور قتل کرے گا۔ اس وقت خداوند عالم ان کو مکمل ذلت و رسوائی اور تلوار برندہ کا لباس پہنائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو ان کو ذلیل وخوار کریں گے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ قوم سبا سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہوں گے۔ جن کی حاکم ایک عورت تھی۔ جو ان کے مال اور خون کے فیصلے کیا کرتی تھی۔

اسی منزل ثعلبیہ کے متعلق اصول کافی میں ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے کہ منزل ثعلبیہ پر ایک شخص نے خدمت امامؑ میں حاضر ہو کر سلام کیا۔ امامؑ نے جواب سلام دے کر پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے عرض کیا: کوفہ کا۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿اما و اللّٰه یا اخا اهل الکوفة لو لقیتک بالمدینة لاریتک اثر جبرئیل من دارنا و نزول لهٗ بالوحی علی جدی، یا اهل الکوفة فمستقی العلم من عندنا فعلموا و جهلنا هذا مالا یکون﴾[2] اے کوفہ کے رہنے والے! اگر ہماری تمہاری ملاقات مدینہ میں ہوتی تو میں تمہیں اپنے گھر میں جبرئیل کے اس وقت کے نشانات دکھاتا جب وہ میرے جدِ نامدارؐ پر وحی لے کر نازل ہوتے تھے۔ اے اہل کوفہ! علم و فضل کا چشمہ تو ہمارے ہاں ہو۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ تو عالم ہوں اور ہم جاہل؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

تبصرہ

اس مقام پر اکثر ذاکرین و واعظین بڑے رقت خیز انداز میں بیان کیا کرتے ہیں کہ جب حضرت سید الشہداءؑ کو جناب مسلمؑ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپؑ نے جناب مسلمؑ کی ایک چھوٹی سی صاحبزادی کو گود میں لے کر بہت پیار کیا۔ اور بار بار سر پر ہاتھ پھیرا۔ یہ کیفیت دیکھ کر صاحبزادی نے عرض کیا۔ آپ مجھ سے وہ سلوک کر رہے ہیں۔ جو یتیموں سے کیا جاتا ہے۔ امام عالی مقام نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: ہاں تم یتیم ہو گئی ہو۔ اب تم مجھے اپنا باپ اور میری اولاد کو بھائی و بہن تصور کرو۔ اگرچہ ناسخ التواریخ میں بحوالہ اعثم کوفی اس روایت کا تذکرہ موجود ہے۔ مگر نقادانِ فن کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی قدیم یا جدید مقتل کی مستند کتاب میں اس کا وجود ہے۔

چنانچہ مولانا السید عبد الرزاق الموسوی المقرم النجفی اپنی کتاب مقتل الحسینؑ کے صفحہ ۱۸۱ کے حاشیہ نمبر ۴ پر

---
[1] لہوف، ص ۶۲۔ نفس المہموم، ص ۹۸۔
[2] اصول کافی، ص ۲۱۵، طبع ایران۔

رقمطراز ہیں: ﴿ولم اقف علی مصدر وثیق ینص علی ان الحسینؑ اخذ بنت مسلم المسماۃ حمیدۃ و مسح علی راسها فاحست بالشر... الخ﴾ یعنی ”میں کسی ایسے مستند ماخذ پر مطلع نہیں ہو سکا جس میں یہ مذکور ہو کہ جناب امام حسینؑ نے جناب مسلمؑ کی شہزادی حمیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس بچی کے شہادت پدر کا خطرہ محسوس کیا۔“

نویں منزل: زُبالہ

آنجنابؑ نے جیسا کہ سابقاً بیان ہو چکا ہے۔ منزل ثعلبیہ میں رات گزارنے کے بعد صبح سویرے اگلی منزل کے لیے کافی پانی ہمراہ لیا۔ اور آگے روانہ ہوئے اور منزل زُبالہ پر جا کر قیام فرمایا (اور بروایتے اس سے قبل منزل شقوق پر بھی مختصر سا توقف کیا)[1] اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر جناب کو قیس بن مسہر صیداوی (بروایتے عبداللہ بن یقطر وھوالاظہر) کی شہادت کی خبر غم اثر ملی اور جناب مسلمؑ اور ہانی کی اطلاع بھی کو منزل ثعلبیہ میں مل چکی تھی۔ مگر جن خواص اصحاب کے سامنے آپ کو یہ وحشت ناک خبر ملی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے آنجنابؑ کے عام ہمراہیوں تک اس ہولناک خبر کو نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ اسے صیغۂ راز ہی میں رکھا تھا لیکن حکیم اسلام و نباضِ امت جناب سید الشہداءؑ نے ان لوگوں کو تاریکی میں رکھنا مناسب نہ سمجھا جو شخص اس خیال سے ہر ہر منزل سے ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ کہ عراق کے حالات جناب سید الشہداءؑ کے حق میں سازگار ہیں۔ اور وہ جناب وہاں پہنچ کر ظاہری مسند اقتدار پر متمکن ہوں گے۔ اس لیے جناب نے مناسب سمجھا۔ کہ عام لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے تا کہ کوئی شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے اور صرف وہی لوگ آپ کے ساتھ جائیں جو آپؑ کے عظیم مقصد سے متفق ہوں۔ چنانچہ آپؑ نے ایک تحریر پڑھ کر اہل قافلہ کو سنائی جس کا مضمون یہ تھا: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہمیں یہ ہولناک خبر ملی ہے کہ مسلمؑ بن عقیل، ہانی بن عروہؓ اور عبداللہ بن یقطر شہید کر دیئے گئے ہیں اور ہماری محبت و نصرت کا ادعا کرنے والوں نے ہماری نصرت سے دست برداری اختیار کر لی ہے۔ اس لیے تم میں سے جو شخص واپس جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی اس پر ہماری طرف سے کوئی ذمہ داری ہے۔ والسلام۔“ امام عالی مقام کے اس اعلان کا وہی نتیجہ ظاہر ہوا جس کی توقع تھی۔ کہ وہ لوگ جو صحیح صورت حالات سے ناواقف تھے اور محض خوش آئند توقعات کے ماتحت ہمراہ ہو گئے تھے۔ علیحدہ ہو کر دائیں بائیں طرف روانہ ہو گئے۔ اور راستے میں شامل ہونے والوں میں سے سوائے چند آدمیوں کے صرف وہی لوگ آپؑ کے ہمراہ باقی رہ گئے۔ جو مکہ و مدینہ سے آپؑ کے ساتھ آئے تھے۔[2]

---

[1] مناقب شہرابن آشوب، ج ۳، ص ۹۱، طبع بمبئی۔
[2] ارشاد، ص ۲۳۰، طبری، ج ۶، ص ۲۲۶، نفس المہموم، ص ۹۸، لہوف، ص ۶۳ وغیرہ

سید اجل سید بن طاؤس نے لکھا ہے کہ جب حضرت سید الشہداؑ کو منزل زبالہ میں جناب مسلمؑ کی اطلاع شہادت ملی تو اس وقت ﴿ارتج الموضع بالبکاء و العویل لقتل مسلم بن عقیل و سالت الدموع کل مسیل﴾ جناب مسلمؑ کی شہادت کی وجہ سے اس قدر آواز گریہ و بکا بلند ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ صدائے نالہ وشیون سے وہ جگہ بھی کانپ رہی ہے۔'' اور جناب سید الشہداؑ نے روتے ہوئے فرمایا: ﴿رحم اللّٰہ مسلماً فلقد صار الی روح اللّٰہ و ریحانہ و جنّتہ و رضوانہ اما انہ قد قضی ما علیہ و بقی ما علینا﴾۔ ''خدا مسلمؑ پر رحم فرمائے کہ وہ خدا کے روح و ریحان اور اس کی جنت و رضوان کی طرف منتقل ہو گئے۔ جو کچھ ان کے ذمے تھا۔ وہ اسے پورا کر چکے۔ اب جو کچھ ہمارے ذمہ ہے وہ باقی ہے۔'' اس کے بعد یہ اشعار پڑھے ۔

فان تکن الدنیا تعد نفیسۃ ⁂ فان ثواب اللّٰہ اعلی و انبل

و ان تکن الابدان للموت انشئت ⁂ فقتل امرء بالسیف فی اللّٰہ افضل

و ان تکن الارزاق قسماً مقدّراً ⁂ فقلّۃ حرص المرء فی السعی اجمل

و ان تکن الاموال للترک جمعھا ⁂ فما بال متروک بہ المرء یبخل[1]

دسویں منزل: بطن عقبہ

(بعض کتب میں اس منزل کا نام منزل عقیق لکھا ہے فلاحظ) منزل زبالہ سے روانہ ہو کر جناب سید الشہداؑ کا مختصر سا قافلہ منزل بطن عقبہ میں پہنچا۔ اس مقام پر آنجنابؑ کی ملاقات بنی عکرمہ کے ایک شخص عمرو بن لوذان سے ہوئی۔ اس نے جنابؑ سے دریافت کیا۔ کہ کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ جب آپؑ نے کوفہ کا نام لیا۔ تو اس نے کہا: خدا کے لیے واپس چلے جائیں۔ اور ان لوگوں پر ہرگز بھروسہ نہ کریں۔ آپؑ کے سامنے سوائے نیزوں اور تلواروں کے کچھ نہیں ہے۔ آنجنابؑ نے فرمایا: ﴿یا عبد اللّٰہ لیس یخفی علیّ الرای و لکن اللّٰہ لا یغلب علی امرہ﴾ اے اللہ کے بندے! یہ صورت حال مجھ پر مخفی نہیں ہے مگر خدا کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ (جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا) پھر فرمایا: ﴿و اللّٰہ لا یدعونی حتیٰ یستخرجوا ھذہ العلقۃ من جوفی فاذا فعلوا لسلط اللّٰہ علیھم من یذلھم حتی یکونوا اذل من فرق الامم (او قال. من قوم الامۃ)[2]﴾۔ خدا کی قسم جب تک یہ لوگ مجھے جان سے نہ مار ڈالیں گے اس وقت مجھے ہرگز نہیں چھوڑیں گے اور وہ جب ایسا کر گزریں گے۔ تو خدا ان پر وہ شخص مسلط کرے گا۔ جو ان کو ذلیل و خوار کرے گا۔ یہاں تک کہ تمام لوگوں سے (یا قوم سبا سے) بھی

---

1. لہوف سید بن طاؤس، ص ۶۴، ۶۵۔ و کذا فی التاریخ، ج ۶، ص ۲۱۰ وغیرہ۔
2. مقتل المقرم، ص ۱۹۳۔

زیادہ ذلیل ورسوا ہوں گے۔[1]

جناب ابن قولویہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے منزل عقبہ پر اپنے ساتھیوں سے فرمایا: ﴿ما ارانی الا مقتولا﴾ میں ضرور شہید کیا جاؤں گا۔ اصحاب نے عرض کیا: ﴿وما ذاک یا ابا عبد اللہ﴾ یا ابوعبداللہ کیا بات ہے؟ فرمایا: ﴿رؤیا رأیتھا فی المنام﴾ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ ﴿قالوا وما ھی﴾ انہوں نے عرض کیا: وہ خواب کیا ہے؟ فرمایا: ﴿رأیت کلاباً تنھشنی اشدھا علی کلب ابقع﴾ ''میں نے دیکھا ہے کہ کچھ کتے مجھے کاٹ رہے ہیں۔ اوران میں سے زیادہ کاٹنے والا ایک سفید داغوں والا کتا ہے۔[2] (شمر بن ذی الجوشن ملعون مراد ہے جو کہ کوڑھی تھا)''۔

گیارہویں منزل: شراف

جناب سید الشہداؑ اوران کے ہمراہیوں نے رات منزل بطن عقبہ میں گزاری۔ اور صبح ہوتے ہی وہاں سے آگے روانہ ہوئے۔ اور منزل شراف میں جا کر قیام فرمایا۔ رات بھر وہاں قیام رہا۔ صبح سویرے وہاں سے آگے بڑھے اور روانگی سے قبل آنجنابؑ کے حکم سے بہت سا پانی ہمراہ لے لیا گیا۔ اور برابر یہ قافلہ رواں دواں رہا۔ حتیٰ کہ دوپہر کا وقت ہوگیا۔ قادسیہ سے چند میل کے فاصلے پر اصحاب حسینؑ میں سے ایک شخص نے اچانک نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا: ﴿اللہ اکبر الم کبرت؟﴾ بے شک خدا بزرگ و برتر ہے مگر اس وقت نعرۂ تکبیر بلند کرنے کا سبب کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: میں کچھ کھجوروں کے درخت دیکھ رہا ہوں۔ اصحاب حسینؑ میں سے بہت سے آدمیوں نے کہا: بخدا ہم نے تو اس جگہ کبھی کوئی کھجور کا درخت نہیں دیکھا۔ امامؑ نے فرمایا: تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہمیں تو گھوڑوں کی کنوتیاں نظر آتی ہیں! امامؑ نے فرمایا: بخدا میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیفیت دیکھ کر امام عالی مقام نے فرمایا: کیا یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جسے پشت پر قرار دیتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کرسکیں۔

بارہویں منزل: ذوحسم اور حُر سے ملاقات

اصحاب نے عرض کیا: یہ آپ کی بائیں طرف ذوحسم کی پہاڑی موجود ہے۔ اگر ہم وہاں دشمن سے پہلے پہنچ جائیں تو یہ مقصد بآسانی حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ امام علیہ السلام بائیں طرف متوجہ ہوئے۔ اصحاب نے بھی اسی طرف کا رخ کیا۔ ادھر دشمن کی فوج بھی قریب آپہنچی جب جنہوں نے امام عالی مقام کے قافلہ کا ادھر رخ دیکھا تو وہ بھی اسی طرف متوجہ ہوگئے۔ مگر امام علیہ السلام نے ان سے پہلے وہاں پہنچ کر اپنے خیمے نصب کرلئے۔ اتنے میں حُر بن یزید ریاحی

---

[1] ارشاد، ص ۲۳۱۔ نفس المہموم، ص ۹۹۔ عاشر بحار، ص ۱۸۹۔

[2] کامل الزیارۃ، ص ۷۵۔

بھی تقریباً ایک ہزار کا دستۂ فوج لے کر قریب آپہنچا۔ مگر بغیر آب و گیاہ اس ریگستانی علاقہ میں امام کے سدِّ راہ ہونے کے سلسلہ میں غیر معمولی تگ و دو کی وجہ سے حُر اور اس کے ہمراہیوں نیز ان کی سواریوں کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ امامؑ جو کہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سروں پر عمامے باندھے اور ہاتھوں میں تلواریں لیے ایستادہ تھے۔ جب امامؑ نے شدت پیاس سے ان کی تباہ حالی دیکھی تو رحمۃ للعالمین کے کریم نواسے سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ آپؑ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ پوری فوج کو مع ان کے گھوڑوں کے سیراب کرو۔ حکم امام ملتے ہی تعمیل شروع ہوگئی۔ لگن اور طشت پانی سے بھرتے اور گھوڑے کے سامنے رکھتے۔ جب وہ تین چار بار منہ بلند کر لیتا۔ تب دوسرے کے سامنے لے جاتے۔ اسی طرح سب سواروں اور سواریوں کو سیراب کیا۔ علی بن طعان محاربی (جو کہ حُر کا سپاہی تھا) بیان کرتا ہے کہ میں شدتِ پیاس سے بالکل نڈھال تھا۔ اور سب کے آخر میں پہنچا۔ جب امام حسینؑ نے میری اور میری سواری کی خستہ حالی کو دیکھا۔ تو آگے بڑھ کر فرمایا: ﴿انخ الراویة!﴾ چونکہ میں "راویہ" کا مطلب مشکیزہ سمجھا تھا۔ اس لیے کلامِ امام کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ امام نے فرمایا: ﴿انخ الجمل﴾ (اونٹ کو بٹھاؤ) میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے مشکیزہ پیش کرتے ہوئے فرمایا: پانی پیو۔ مگر میری پریشان حالی کی یہ حالت تھی کہ پانی پینے کی کوشش کرتا مگر پانی زمین پر بہہ جاتا۔ امامؑ نے فرمایا: دہانے کو اپنی طرف پھیرو۔ مگر میں اپنی بدحواسی کی وجہ سے پھر بھی مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس وقت امام علیہ السلام نے خود اٹھ کر مشکیزہ کے دہانے کو درست کیا۔ تب میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور اپنی سواری کو بھی پلایا۔[1]

ارشادِ رب العزت ہے: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ تم دشمن کا احسن طریقہ پر دفاع کرو۔ تمہارا جانی دشمن تمہارا خالص دوست بن جائے گا۔ امام کے حسن سلوک کا حُر جیسے شریف النفس آدمی پر جس قدر اثر ہوا ہوگا۔ وہ عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔

اس اثناء میں کسی فریق نے بھی ایک دوسرے سے یہاں آنے کا مقصد معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

اسی اثنا میں نمازِ ظہر کا وقت آ گیا۔ امام علیہ السلام نے حجاج بن مسروق جعفی کو اور بقولے شاہزادہ[2] علی اکبر کو حکم دیا کہ اذان کہو۔ چنانچہ انہوں نے اذان کہی۔ اس وقت امام عالی مقام خیمہ سے کاندھوں پر رداء اوڑھے ہوئے (نماز کے مخصوص لباس میں) برآمد ہوئے۔ آتے ہی ایک مختصر سا خطبہ دیا۔ خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ﴿ایها الناس انی لم آتکم حتی اتتنی کتبکم و قدمت رسلکم ان اقدم علینا فانه لیس علینا امام لعل اللّٰه ان یجمعنا بک علی الهدیٰ و الحق فان کنتم علی ذلک فقد جئتکم فاعطونی ما اطمئن الیه من عهودکم و

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۲۷۔ نفس المہموم، ص ۱۰۰۔ عاشر بحار، ص ۱۸۷۔

[2] مقتل، ص ۲۹۶۔

مرائیقکم و ان لم تفعلوا و کنتم لقدومی کارھین انصرفت عنکم الی المکان الذی جئت منه الیکم ﴾۔ ''اے لوگو! میں اس وقت تک تمہاری طرف نہیں آیا۔ جب تک تم نے خطوط لکھ کر اور قاصد بھیج کر یہ درخواست نہیں کی۔ کہ یہاں آیئے کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ شاید آپؑ کی وجہ سے خدا ہمیں ہدایت وحق پر مجتمع کرے۔ پس اگر تم اپنے عہد و پیمان پر قائم ہو تو میں آ گیا ہوں۔ تم مجھے اپنے عہد و پیمان کے ایفاء کا یقین دلاؤ۔ اور اگر تمہیں میرا یہاں آنا ناپسند ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس چلا جاتا ہوں۔'' مجمع میں سے کسی ایک نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ سب ساکت وصامت رہے۔ اس کے بعد امامؑ نے حر سے دریافت کیا۔ کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو گے یا علیحدہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ؟ حر نے کہا: آپ ہی کی اقتداء میں پڑھیں گے۔ چنانچہ اقامت کہی گئی اور آنجناب نے نماز ظہر پڑھائی۔ اس کے بعد سب لوگ اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف چلے گئے۔[1] یعنی امام ؑ اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپؑ کے اصحاب بھی آپؑ کے ہمراہ جمع ہو گئے۔ اور حر اپنے خیمہ میں چلا گیا۔ اور اس کے کچھ ساتھی بھی اس کے ہمراہ خیمہ میں بیٹھ گئے مگر اس کے دوسرے سپاہیوں کی حالت یہ تھی کہ گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں پکڑے ان کے سایہ میں بیٹھے تھے۔[2] جب نماز عصر (کی فضیلت کا) وقت ہوا۔ تو امام حسینؑ نے اپنے ہمراہیوں کو رخت سفر باندھنے کا حکم دیا۔ اور خود باہر تشریف لا کر نماز عصر کا اعلان فرمایا۔ چنانچہ نماز ظہر کی طرح فریقین نے آپؑ کی اقتداء میں نماز عصر پڑھی۔ سلام پھیر کر امام عالی مقامؑ نے خدا کی حمد وثنا کے بعد یہ خطبہ ارشاد فرمایا: ﴿اما بعد ایھا الناس فانکم ان تتقوا اللّٰہ و تعرفوا الحق لاھله تکن ارضی لله عنکم و نحن اھل بیت محمدؐ و اولی بولایة ھذا الامر علیکم من ھؤلاء المدعین ما لیس لھم و السائرین فیکم بالجور و العدوان و ان ابیتم الا الکراھیة لنا و الجھل بحقنا و کان رایکم الأن غیر ما اتتنی به کتبکم و قدمت به علیّ رسلکم انصرفت عنکم ﴾۔ ''ایہا الناس! اگر تم تقویٰ الٰہی اختیار کرو۔ اور اہل حق کا حق پہچانو۔ تو یہ بات باعث خوشنودیٔ خدا ہوگی۔ ہم اہل بیتؑ رسولؐ اسلامی حکومت وفرمانروائی کے ان لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں۔ جنہوں نے غلط طور پر اس کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ اور ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو۔ اور ہمارے حقوق کو نہیں پہچانتے۔ اور اب تمہاری رائے اس کے برخلاف ہے جو کچھ تم نے خطوط اور قاصدوں کے ذریعہ ظاہر کیا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔''

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۴، ۲۲۳۔ الاخبار الطوال، ص ۲۴۸۔ نفس المہموم، ص ۱۰۰۔

[2] ارشاد، ص ۲۲۴۔ الاخبار الطوال، ص ۲۴۷۔

آنجناب کا یہ کلام صداقت التیام سن کر حُر نے مہر سکوت توڑتے ہوئے عرض کیا: ﴿انا و اللّٰہ ما ادری ما هذہ الکتب و الرسل التی تذکر﴾ خدا کی قسم مجھے ان خطوط اور قاصدوں کا کوئی علم نہیں ہے جن کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں؟ یہ سن کر امامؑ نے عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ خطوط والے خرجین لاؤ۔ چنانچہ وہ دو تھیلے لائے جو اہل کوفہ کے خطوط سے بھرے ہوئے تھے۔ امامؑ نے وہ خطوط نکال کر حُر کے سامنے پھیلا دیئے۔ حُر نے (خطوط دیکھ کر) کہا: ﴿انا لسنا من ھؤلاء الذین کتبوا الیک﴾ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے آپ کو یہ خطوط لکھے ہیں۔ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب آپ مل جائیں تو ہرگز آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں یہاں تک کہ ابن زیاد کے دربار میں پیش کریں۔ امامؑ نے حُر کا یہ کلام سن کر فرمایا: ﴿الموت ادنیٰ الیک من ذلک﴾ موت اس سے زیادہ تمہارے قریب ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سوار ہو جاؤ۔ چنانچہ جب سب لوگ حتیٰ کہ مستورات بھی سوار ہو گئیں۔ تو آپؑ نے حکم دیا۔ واپس چلو۔ پس جب قافلہ واپس مڑنے لگا۔ تو حُرؔ مع اپنی سپاہ کے سدِ راہ ہو گیا۔ امامؑ نے حُر سے فرمایا: ﴿ثکلتک امک ما ترید!﴾ تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے تو کیا چاہتا ہے؟ حُر کے دل میں آل رسولؐ کا کس قدر احترام تھا؟ اس کا اندازہ اس کے جواب سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جو اس نے امام عالی مقام کو دیا۔ کہا: ﴿اما لو غیرک من العرب یقولھا لی ھو علی مثل الحال التی انت علیھا ما ترکت ذکر امہ بالثکل کائناً من کان ولکن و اللّٰہ مالی الی ذکر امک من سبیل الا باحسن ما تقدر علیہ!﴾ حاصل مطلب یہ ہے کہ "اگر آپؑ کے علاوہ اور کوئی بھی شخص یہ کلمہ مجھے کہتا۔ تو میں بھی ضرور اسے ویسا ہی جواب دیتا۔ مگر آپؑ کی والدۂ ماجدہ کا بجز خیر و خوبی کے تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔" امامؑ نے فرمایا: ﴿فما ترید﴾ آخر تو چاہتا کیا ہے؟ حُر نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ آپؑ کو امیر عبید اللہ بن زیاد کے پاس لے جاؤں!

امامؑ نے فرمایا: ﴿اذاً و اللّٰہ لا اتبعک﴾ خدا کی قسم میں تیری متابعت نہیں کروں گا۔

حُر نے کہا: ﴿اذاً و اللّٰہ لا ادعک!﴾ بخدا میں بھی آپؑ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ اسی طرح طرفین سے تین بار انہی خیالات کا اظہار ہوا۔ اس کے بعد حُر نے کہا: مجھے آپؑ سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب آپؑ مل جائیں تو آپؑ اس سے اس وقت تک جدا نہ ہوں جب تک آپ کو کوفہ نہ پہنچا دوں۔ لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو پھر انصاف کا صرف ایک اور طریقہ ہے وہ یہ کہ آپ کوئی ایسا درمیانی راستہ اختیار کریں جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف۔ اس کے بعد میں امیر کو صورت حال لکھوں گا۔ شاید خدا مجھے آپ کے ساتھ جنگ کرنے سے بچا لے۔ امام عالی مقامؑ نے حُر کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے عذیب و قادسیہ کے راستہ

سے ہٹ کر بائیں طرف مڑ کر سفر کرنا شروع کیا۔ اور حُر بھی آپؑ کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلے پر چل رہا تھا۔[1] راستے میں حُر نے خدمتِ امامؑ میں حاضر ہو کر عرض کی: ﴿انی اذکرک اللّٰہ فی نفسک فانی اشھد لئن قاتلت لتقتلن﴾ میں آپؑ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اپنے حال پر رحم کریں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپؑ شہید کر دیئے جائیں گے۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ﴿افبا لموت تخوفنی و ھل یعدو بکم الخطب ان تقتلونی و ساقول کما قال اخوا لاوس لابن عمہ و ھو یرید نصرۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و الہ فخوفہ ابن عمہ و قال این ترید فانک مقتول فقال﴾۔ کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ بھی کچھ کر سکتے ہو۔ مجھے قتل کر ڈالو۔ میں تو وہی بات کہوں گا جو بنی اوس کے ایک شخص نے اپنے چچازاد بھائی سے کہی تھی۔ جب کہ وہ نصرتِ رسولؐ کے لیے جا رہا تھا اور اس کے چچازاد بھائی نے اسے موت سے ڈراتے ہوئے کہا تھا کہ تو قتل ہو جائے گا۔ اس نے جواب میں کہا تھا ؎

سامضی فما بالموت عارٌ علی الفتیٰ — اذا ما نویٰ حقا و جاھد مسلماً

و واسی الرجال الصالحین بنفسہ — و فارق مثبوراً و خالف مجرماً

فان عشت لم اندم و ان مت لم الم — کفیٰ بک ذلاً ان تعیش و ترغماً[2]

ایضاح

لہوف سید بن طاؤس اور ناسخ التواریخ[3] سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ حُر کے پاس ابن زیاد کے تہدیدی خط آنے کے بعد امام عالی مقامؑ نے اپنے اصحاب کے عزم و ارادہ کی پختگی کا جائزہ لینے اور انہیں انجام کار سے آگاہ کرنے کے لیے عذیب الہجانات کے مقام پر درج ذیل خطبہ دیا لیکن مؤرخ طبری[4] کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے (اور اکثر علماء[5] نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے) کہ منزل ذی حسم کے مقام پر حُر سے پہلی ملاقات کے بعد یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس لیے ہم بھی اسے اسی مقام پر درج کرتے ہیں۔ حمد و ثنائے خدا و درود بر مصطفیٰؐ کے بعد فرمایا: ﴿اما بعد انہ قد نزل من الامر ما قد ترون و ان الدنیا قد تغیرت و تنکرت و ادبر معروفھا و استمرت خذاء

---

1. ارشاد، ص ۲۲۴۔ طبری، ج ۶، ص ۲۲۸۔ نفس المہموم، ص ۱۰۱۔ عاشر بحار، ص ۱۸۷۔ ناسخ التواریخ، ج ۲، ص ۲۱۶۔ لہوف، ص ۶۸۔
2. ارشاد، ص ۲۲۴۔ عاشر بحار، ص ۱۸۷۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۹۷ وغیرہ۔
3. لہوف، ص ۶۹۔ ناسخ، ج ۲، ص ۲۱۷۔
4. طبری، ج ۶، ص ۲۲۹۔
5. نفس المہموم، ص ۱۰۲۔ مقام، ص ۲۹۹ وغیرہ۔

فلم یبق منها الاصبابة کصبابة الاناء و خسیس عیش کالمرعی الوبیل الا ترون ان الحق لا یعمل به و ان الباطل لا یتناهی عنه لیرغب المؤمن فی لقاء اللّٰہ محقاً فانی لا اری الموت الّا سعادة (شہادۃ) ولا الحیوۃ مع الظالمین الّا برما﴾۔ ''ایہا الناس! جو بلاء ومصیبت نازل ہوئی ہے۔ وہ تم دیکھ رہے ہو۔ دنیا کی حالت یکسر بدل گئی ہے۔ اور اس کی خیر وخوبی منہ پھیر گئی ہے۔ اور اگر کچھ باقی بھی ہے تو وہ اس قدر قلیل ہے جیسے پیالہ میں تلچھٹ۔ ان حالات میں زندگی گزارنا اس طرح مشکل ہے جس طرح وباء والی چراگاہ میں جینا ناگوار ہوتا ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ حق پر عمل درآمد نہیں ہو رہا۔ اور باطل سے روکا نہیں جاتا۔ ان حالات میں مؤمن بارگاہِ احدیت میں حاضر ہونے میں رغبت کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان حالات میں مرجانا شہادت (یا سعادت) ہے اور ظالموں کی جماعت کے ساتھ زندہ رہنا ذلت ورسوائی ہے۔''

امامؑ کا کلام حقیقت ترجمان ختم ہوتے ہی جناب زہیر بن القین کھڑے ہو گئے اور اصحاب حسینؑ سے کہا: تم گفتگو کرو گے یا میں کروں۔ سب نے کہا: تم ہی کرو۔ چنانچہ زہیر نے حمد وثناءِ الٰہی کے بعد کہا: ﴿قد سمعنا ھداک اللّٰہ یابن رسول اللّٰہ مقالتک و اللّٰہ لو کانت الدنیا لنا باقیة و کنا فیها مخلّدین الا ان فراقها فی نصرک و مواساتک لاثرنا الخروج معک علی الاقامة فیها﴾۔ ''فرزند رسولؐ! ہم نے آپ کی گفتگو سنی ہے۔ خدا کی قسم اگر بالفرض دنیا دائمی ہوتی اور ہم نے اس میں ہمیشہ زندہ رہنا ہوتا۔ تب بھی آپ کی نصرت میں اس دائمی زندگی پر آپؑ کے ساتھ مرنے کو ترجیح دیتے۔

امامؑ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ اور وہ بیٹھ گئے۔[1] اس کے بعد جناب نافع بن ہلال کھڑے ہوئے اور کہا: ﴿و اللّٰہ ما کرھنا لقاء ربنا و انا علی نیاتنا و بصائرنا نوالی من والاک و نعادی من عاداک﴾ خدا کی قسم ہم ہرگز بارگاہِ قدرت میں حاضر ہونا ناپسند نہیں کرتے۔ ہم اپنی دینی بصیرت اور صاف نیت پر قائم ہیں۔ ہم اس سے دوستی کریں گے؟ جو آپؑ سے دوستی کرے گا اور اس سے دشمنی کریں گے جو آپ سے دشمنی کرے گا۔

اس کے بعد جناب بریر بن خضیر نے کھڑے ہو کر کہا: ﴿و اللّٰہ یابن رسولؐ اللّٰہ لقد منّ اللّٰہ بک علینا ان نقاتل بین یدیک نقطع فیک اعضائنا ثم یکون جدک شفیعنا یوم القیامة﴾[2]۔ ''اے فرزند رسولؐ! خدا کی قسم! یہ خداوند عالم نے ہم پر احسان فرمایا ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی ہے کہ آپؑ کے ہمرکاب

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۹۹۔

[2] لہوف، ص ۷۰۔

ہو کر دشمنانِ دین سے) جہاد کریں۔ اور اس میں ہمارے اعضاء و جوارح کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور پھر بروز قیامت آپ کے جد نامدار ہمارے شفیع ہوں۔"

تیرہویں منزل: بیضہ

منزل ذی حسم سے روانہ ہو کر جناب سید الشہداؑ منزل بیضہ پر پہنچے جو کہ واقصہ اور عذیب الہجانات کے درمیان واقع ہے۔ اس منزل کا کوئی خاص واقعہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔ سوائے اس خطبۂ مبارکہ کے جو جناب امام حسین علیہ السلام نے اس مقام پر حُر اور اس کی سپاہ کے سامنے دیا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا: ﴿ ایہا النـاس ان رسولَ اللّٰہ قال من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحرام اللّٰہ ناکثاً لعہد اللّٰہ مخالفاً لسنۃ رسول اللّٰہ یعمل فی عباد اللّٰہ بالاثم و العدوان فلم یغیّر علیہ بفعل ولا قول کان حقًا علی اللّٰہ ان یدخلہ مدخلہ الاوان ھؤلاء قد لزموا طاعۃ الشیطان و ترکوا طاعۃ الرحمٰن و اظہروا الفساد و عطلوا الحدود و استأثروا بالفیٔ و احلوا حرام اللّٰہ و حرموا حلالہ و انا احق من غیر و قد اتتنی کتبکم و قدمت علی رسلکم ببیعتکم انکم لا تسلمونی ولا تخذلونی فان اتممتم علی بیعتکم تصیبوا رشدکم فانا الحسینُ ابن علیؑ و ابن فاطمۃ بنت رسولِ اللّٰہ نفسی مع انفسکم و اہلی مع اہلیکم فلکم فی اسوۃ و ان لم تفعلوا و نقضتم عہدکم و خلعتم بیعتی من اعناقکم فلعمری ما ھی لکم بنکر لقد فعلتموہا بابی و اخی و ابن عمی مسلم. و المغرور من اغترّ بکم فحظکم اخطاتم و نصیبکم ضیعتم و من نکث فانما ینکث علی نفسہ و سیغنی اللّٰہ عنکم والسّلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہ[1]۔ "ایہا الناس! جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جو کسی ایسے ظالم بادشاہ کو دیکھے جو خدا کے حرام کو حلال کرنے والا۔ اس کے عہد و پیمان کو توڑنے والا اور سنت رسول کی خلاف ورزی کرنے والا ہو۔ اور بندگانِ خدا کے ساتھ خلاف شرع سلوک کرنے والا ہو۔ اور پھر اپنے قول یا فعل کے ساتھ اسے نہ ٹوکے۔ تو خدا پر لازم ہوگا کہ اسے اپنے مقام (جہنم) میں داخل کرے۔ ان لوگوں (بنی امیہ) نے خدائے رحمٰن کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر شیطان کی پیروی کا قلادہ گلے میں ڈال لیا ہے۔ زمین آتش فتنہ و فساد سے فروزاں کر رکھی ہے۔ اور حدودِ خداوندی کو معطل کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے مالِ خدا کو اپنا ذاتی مال سمجھ لیا ہے۔ یہ لوگ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ میں اس منصب و مقام کا ان تمام لوگوں سے زیادہ حقدار ہوں۔ تمہارے متعدد خطوط اور پیغامبر میرے پاس آئے۔ کہ تم نے میری بیعت کر لی ہے۔ اور یہ کہ تم ہرگز میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ لہٰذا اگر تم اب

---

[1] طبری، ج ۲، ص ۲۲۹۔ نفس المہموم ص ۱۰۲ وغیرہ۔

بھی اپنی کی ہوئی بیعت پر قائم رہو گے۔ تو رشد و ہدایت پاؤ گے۔ میں علیؑ اور فاطمہؑ دختر رسول کا فرزند ہوں۔ اس وقت میری جان تمہاری جانوں کے ساتھ، میرے اہل تمہارے اہل و عیال کے ساتھ ہیں۔ اور میرا کردار تمہارے لیے نمونہ اور قابل تاسی ہے۔ اور اگر تم نے میری بیعت توڑ دی ہے اور اطاعت کا قلادہ گلے سے اتار پھینکا ہے تو یہ بات تم سے کوئی انوکھی اور تعجب خیز نہیں ہے۔ تم اس سے پہلے میرے والدؑ، میرے بھائیؑ، اور میرے ابن عم مسلمؑ کے ساتھ ایسا سلوک کر چکے ہو۔ بے شک فریب خوردہ شخص وہی ہے جو تمہاری وجہ سے دھوکہ کھا جائے۔ بہر حال تم نے (یہ بیعت توڑ کر) اپنے حصہ (ثواب) کو ضائع و اکارت کیا ہے۔ جو بیعت کر کے توڑے گا۔ وہ اپنا نقصان کرے گا۔ خداوند عالم عنقریب مجھے تم سے بے نیاز کر دے گا۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔"

چودھویں منزل: عذیب الہجانات

منزل بیضہ سے روانہ ہو کر جناب سید الشہداؑ نے عذیب الہجانات کے مقام پر قیام کیا۔ تھوڑے فاصلہ پر حُر نے بھی اپنے سپاہیوں سمیت قیام کیا۔ اسی منزل پر کوفہ سے آتے ہوئے چار آدمی اپنی اپنی سواریوں پر سوار وارد ہوئے اور ان کے ہمراہ نافع بن ہلال بجلی کا "کامل" نامی ایک کوتل گھوڑا بھی تھا۔ یہ چار شخص عمر بن خالد صیداوی، اس کا غلام سعد، مجمع بن عبد اللہ مذحجی اور ایک اور شخص تھے۔ اور پانچویں بزرگ جوان کے دلیل (راستہ بتانے والے تھے) وہ طرماح بن عدی تھے۔[1] جب یہ لوگ امام عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حُر (جو کہ ناکہ بندی پر مامور تھا) یہ کہتے ہوئے کہ "یہ اہل کوفہ ہیں اس لیے میں ان کو گرفتار کرتا ہوں۔ یا واپس کوفہ بھجواتا ہوں۔" آگے بڑھا۔ مگر امام علیہ السلام نے یہ فرما کر کہ اب چونکہ یہ لوگ میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا یہ میرے انہی اعوان و انصار کی طرح ہیں جو پہلے سے میرے ساتھ آئے ہیں۔ لہٰذا اب یہ میری حفاظت میں ہیں۔ یہ سن کر حُر رُک گیا۔[2] اس کے بعد جناب امام حسینؑ نے ان سے اہل کوفہ کے حالات دریافت کیے۔ مجمع بن عبد اللہ نے کہا: ﴿اما اشراف الناس فقد اعظمت رشوتهم و ملئت غرائرهم يستمال ودهم و يستخلص به نصيحتهم فهم الب و احد عليك و اما سائر الناس بعدهم فان قلوبهم تهوى اليك و سيوفهم غدا مشهورة عليك﴾ جہاں تک بڑے آدمیوں کا تعلق ہے ان کو بڑی بڑی بھاری رشوتیں دی گئی ہیں اور مال و دولت کے ذریعہ ان کی ہمدردیاں حاصل کی گئی ہیں۔ اس لیے وہ سب کے سب آپ کے برخلاف ہیں۔ باقی رہے عام لوگ تو ان کے دل تو آپ کی طرف مائل ہیں۔ مگر کل ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہی میان سے باہر آئیں گی۔ اس کے بعد امام عالی

---

[1] تمقام، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ نفس المہموم، ص ۱۰۲۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۹۹، ۲۰۰ وغیرہ۔

[2] تمقام، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ نفس المہموم، ص ۱۰۲۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۹۹، ۲۰۰ وغیرہ۔

مقام نے اپنے قاصد قیس بن مسہر صیداوی کا حال دریافت کیا۔ انہوں نے اس کی شہادت کی پوری کیفیت بیان کی۔ امام آبدیدہ ہو کر اس آیت کی تلاوت کی: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾ (پ ۲۱، س احزاب، ع ۱۹) بعد ازاں ان کے حق میں یوں دعا کی: ﴿اللّٰهم اجعل لنا ولهم الجنة نزلاً و اجمع بيننا و بينهم في مستقر رحمتك و غائب مذخور ثوابك﴾ بارالٰہا! ہمارے اوران کے لیے جنت کو قیام گاہ بنا اور ہمیں اوران کو اپنی رحمت کی قرارگاہ اور اپنے ثواب کے پوشیدہ خزائن میں اکٹھی جگہ عطا فرما۔[1]

پھر طرماح بن عدی نے خدمت امامؑ میں عرض کیا: میرے آقا! آپؑ کے ساتھ تو کوئی آدمی ہی نہیں۔ آپ کے ساتھ تو اگر صرف یہی لوگ (حر اور اس کے لشکری) جنگ کریں تو کافی ہوں گے۔ حالانکہ میں نے کوفہ کے باہر اس قدر لشکر کثیر دیکھا ہے کہ اتنا بڑا لشکر اس سے قبل میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ میں نے اس اجتماع کا سبب دریافت کیا تھا۔ تو مجھے بتایا گیا کہ یہ اس لیے جمع کیا گیا ہے کہ یہاں اس کا جائزہ لیا جائے گا پھر اسے حسینؑ کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیجا جائے گا۔ میں آپؑ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر ہو سکے تو ان کی طرف ایک بالشت بھی آگے نہ بڑھئے۔ اور اگر آپؑ کوئی محفوظ جگہ چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارے پہاڑ ''آجا'' پر تشریف لائیے۔ جہاں غسان و حمیر کے بادشاہ اور نعمان بن منذر جیسے سلاطین بھی ہم پر قابو نہیں پا سکے۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ ہفتہ عشرہ کے اندر بنی طے کے پورے بیس ہزار آدمی آپؑ کی نصرت کے لیے حاضر ہوں گے۔ اور جب تک ان کا ایک متنفس آدمی زندہ ہے۔ کوئی دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ امام علیہ السلام نے طرماح کی اس پیش کش پر اسے اور اس کی قوم کو دعائے خیر دی۔ اور یہ فرما کر اسے قبول کرنے سے معذرت چاہی کہ ﴿قد كان بيننا و بين هؤلاء القوم (عهداً و ميثاقاً) قول لسنا نقدر معه على الانصراف و لا ندري على ما تنصرف بنا و بهم الامور في عاقبة﴾[2] ہم اس قوم (اہل کوفہ) سے عہد و پیمان کر چکے ہیں۔ اس کی موجودگی میں ہم کسی اور طرف نہیں جا سکتے۔ نہ معلوم ان کا اور ہمارا معاملہ بالآخر کہاں تک منجر ہو۔

طرماح نے امام علیہ السلام سے اس قدر مہلت طلب کی کہ وہ گھر جا کر اپنے اہل و عیال کو خرچ خوراک پہنچا آئیں۔ پھر جلدی آپؑ کی خدمت میں نصرت کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔ چنانچہ امام علیہ السلام نے ان کو اجازت دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگرچہ حسب وعدہ طرماح بہت جلد اپنے اہل و عیال کو خرچ پہنچا کر واپس آئے مگر جب وہ اسی مقام عذیب الہجانات پر پہنچے تو ان کو اطلاع ملی کہ حضرت امام حسینؑ شہید کر دیے گئے اس لیے واپس چلے گئے۔[3]

---

[1] قمقام، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔ نفس المہموم، ص ۱۰۲۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۱۹۹، ۲۰۰ وغیرہ۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۳۱۔ نفس المہموم، ص ۱۰۳۔

[3] طبری، ج ۶، ص ۲۳۶۔

پندرہویں منزل: قصر بنی مقاتل

عذیب الہجانات سے روانہ ہوکر حضرت امام حسینؑ قصر بنی مقاتل کے مقام پر پہنچے۔ امامؑ نے وہاں قیام فرمایا۔ دیکھا وہاں کچھ خیمے نصب ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عبید اللہ بن حر جعفی کے خیمے ہیں۔ جو کہ کوفہ کے مشہور شہسواروں میں سے تھا۔ امامؑ نے حجاج بن مسروق جعفی رضوان اللہ علیہ کو اسے بلانے کے لیے بھیجا۔ جب قاصد نے جاکر امام کا پیغام دیا تو اس بدقسمت نے کہا: ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾ میں نے تو کوفہ اسی لیے چھوڑا تھا کہ جب امام حسینؑ کوفہ میں داخل ہوں تو میں وہاں موجود نہ ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیکھیں۔ یا میں ان کو دیکھوں۔ قاصد نے خدمتِ امام میں حاضر ہوکر تمام ماجرا بیان کیا۔ امامؑ خود بہ نفس نفیس چل کر اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اور اسے دعوتِ نصرت دی لیکن عبید اللہ نے اپنے سابقہ کلام کا اعادہ کر کے امام کا ساتھ دینے سے معذرت ظاہر کی۔ امامؑ نے دوبارہ اسے اس سعادت کے حاصل کرنے کی دعوت دی۔ مگر اس کے بخت نے یاوری نہ کی اور اس بدقسمت نے اس سعادت کو حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ٹال مٹول سے کام لیا۔ بالآخر امامؑ نے فرمایا: ﴿فان لم تنصرنا فاتق اللّٰہ ان تکون ممن یقاتلنا فو اللّٰہ لا یسمع و اعیتنا احد ثم لا ینصرنا الا ھلک﴾ اگر تم ہماری نصرت نہیں کرتے تو کم از کم خیال رکھنا ان لوگوں میں سے نہ ہونا جو ہم سے جنگ کریں گے کیونکہ جو شخص ہماری آوازِ استغاثہ کو سنے گا اور پھر ہماری نصرت نہیں کرے گا وہ ہلاک و برباد ہو جائے گا۔ اس نے کہا: البتہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ اس کے بعد امامؑ اٹھ کر واپس اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔[1] تاریخ شاہد ہے کہ جب تک عبید اللہ زندہ رہا۔ اس سعادت سے محرومی پر کفِ افسوس ملتا رہا اور وہ امیر مختار کے ساتھ انتقامی کارروائیوں میں شریک بھی ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا ؎

فیا لک حسرۃ ما دمت حیا	تردد بین صدری و التراقی
ولو انی اواسیہ بنفسی	لنلت کرامۃ یوم التلاق
لقد فاز الاولی نصروا حسینا	و خاب الآخرون ذوی النفاق[2]

اسی مقام پر آنجنابؑ کی عمرو بن قیس مشرقی اور اس کے چچازاد بھائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ آپؑ نے ان سے دریافت فرمایا: کیا تم میری نصرت کے لیے آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہم کثیر العیال آدمی ہیں اور ہمارے پاس لوگوں کی امانتیں ہیں۔ نہ معلوم انجام کیا ہو؟ اور کہیں لوگوں کی امانتیں ضائع نہ ہو جائیں۔ ان سے بھی امام عالی

---

[1] ارشاد ص ۲۲۵۔ نفس المہموم ص ۱۰۵۔ عاشر بحار ص ۱۸۸ وغیرہ۔

[2] نفس المہموم ص ۱۰۶۔

مقام نے بالآخر وہی نصیحت فرمائی جو عبید اللہ کو فرمائی تھی کہ "دور ہو جاؤ۔ نہ مجھے دیکھو۔ اور نہ میری آواز استغاثہ کو سنو۔ ورنہ جو اس آواز کو سنے گا اور پھر نصرت نہیں کرے گا تو خدا اسے آتش جہنم میں منہ کے بل اوندھا لٹکائے گا۔"[۱]

جناب امام حسینؑ نے رات قصر بنی مقاتل میں گزاری۔ رات کے آخری حصہ میں جنابؑ نے وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اور روانگی سے قبل آپ کے حکم سے کافی پانی ہمراہ لے لیا گیا۔ چنانچہ قافلہ رواں ہوا۔ ابھی تھوڑا راستہ طے کیا تھا کہ جناب سید الشہداء کو ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ پڑھتے ہوئے سنا گیا۔ دو تین دفعہ آپؑ نے ایسا کہا۔ شہزادہ علی اکبرؑ نے جو گھوڑے پر سوار تھے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ بابائے بزرگوار! ان کلمات کے پڑھنے کا سبب کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ﴿انی خفقت خفقة فعنّ لی فارس علی فرس وھو یقول القوم یسیرون و المنایا تسری الیھم فعلمت انّھا انفسنا نعیت الینا﴾ "(ابھی ابھی گھوڑے پر) میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے عالم خواب میں ایک سوار کو دیکھا جو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ تو چل رہے ہیں۔ اور موت ان کی طرف آ رہی ہے۔ پس میں نے معلوم کر لیا ہے کہ ہمیں موت کی اطلاع دی گئی ہے۔" یہ سن کر شہزادہ نے عرض کیا: ﴿یا ابت لا اراک اللّٰہ سوء السنا علی الحق؟﴾ اے پدر بزرگوار! خدا آپ کو کبھی کوئی برائی نہ دکھائے۔ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: ﴿بلی والذی الیہ مرجع العباد﴾ اس خدا کی قسم جس کی طرف تمام بندوں کی بازگشت ہے۔ یقیناً ہم حق پر ہیں۔ شہزادہ نے کہا: ﴿فاننا اذا لا نبالی ان نموت محقین﴾ پھر ہمیں کوئی اندیشہ نہیں کہ حق پر ہمیں موت آ جائے! شہزادہ کا یہ جواب باصواب سن کر امامؑ نے فرمایا: ﴿جزاک اللّٰہ من ولد خیر ما جزیٰ ولداً عن والدہ﴾ "بیٹا! جو بہترین جزا کسی بیٹے کو باپ کی طرف سے مل سکتی ہے وہ جزا خدا تمہیں عطا فرمائے۔"[۲]

سولھویں منزل: نینوا

سرکار سید الشہداء علیہ السلام قصر بنی مقاتل سے روانہ ہو کر برابر راستہ طے کرتے ہوئے نینوا کی سرزمین میں پہنچے۔ نینوا، غاضریہ اور شفیہ وہاں اس زمانہ میں چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ حُر بھی اپنی سپاہ سمیت ساتھ ساتھ تھا۔ جب قافلہ اس مقام پر پہنچا۔ تو کوفہ کی طرف سے ایک مسلح ناقہ سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر سب رک گئے۔ جب قریب آیا تو اس نے حُر اور اس کے ساتھیوں پر سلام کیا۔ مگر امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کو سلام نہ کیا۔ بعد ازاں اس

۱۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۰۲۔ عقاب الاعمال، ص ۳۵۔ رجال کشی، ص ۷۳۔ بحوالہ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۰۵۔

۲۔ ارشاد، ص ۲۲۵۔ مقتل عوالم میں اس واقعہ کا بمقام عذیب بوقت قیلولہ اور خوارزمی نے بمقام ثعلبیہ بوقت قیلولہ ذکر کیا ہے مگر معتبر روایت وہی ہے جو ارشاد شیخ مفید میں مذکور ہے۔ فلا تغفل۔

نے حُر کو ابن زیاد کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا: ﴿اما بعد فجعجع بالحسینؑ حین تاتیک کتابی هذا و یقدم علیک رسولی ولا تنزله الا بالعراء فی غیر خضر (حصن) و علی غیر ماء و قد امرت رسولی ان یلزمک ولا یفارقک حتی یاتینی بانفاذک امری والسلام﴾۔ ''جب تمہیں میرا خط ملے تو وہیں حسینؑ کو روک لو۔ اور ان کو بے آب و گیاہ جگہ پر اترنے پر مجبور کر دو۔ میں نے اپنے قاصد کو کہہ دیا ہے کہ یہ تمہارے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ میرے حکم کی تعمیل کی مجھے اطلاع دے۔'' معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد کو حُر کی نرم روی کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس لیے اس نے یہ تہدیدی خط لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ جاسوس بھی مقرر کر دیا۔

بہرحال حُر نے امام عالی مقام کو خط کے مضمون سے آگاہ کیا اور کہا کہ اب میں تعمیل حکم کے لیے مجبور ہوں۔ امام نے فرمایا: مجھے غاضریہ، نینوا یا شفیہ میں اترنے کی اجازت دے دو۔ حُر نے کہا: مجھے تو حکم ہے کہ بے آب و گیاہ مقام پر آپ کو اتاروں۔ اور یہ نگران موجود ہے لہٰذا میں ایسا نہیں کر سکتا۔[1] یزید بن مہاجر کندی نے ابن زیاد کے قاصد کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا: ﴿ثکلتک امک ماذا جئت فیه﴾ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے تو یہ کیسا خط لایا ہے؟ ابن زیاد کے قاصد نے (جس کا نام مالک بن نسیر کندی[2] تھا) کہا: ﴿اطعت امامی و وفیت ببیعتی﴾ میں نے امام کی اطاعت کی ہے اور اپنی بیعت کی وفا کی۔ ابن مہاجر نے جواب میں کہا: ﴿بل عصیت ربک و اطعت امامک فی هلاک نفسک و کسبت العار و النار و بئس الامام امامک قال اللّٰه تعالٰی و جعلناهم ائمة یدعون الی النار و یوم القیٰمة لا ینصرون فامامک منهم﴾۔ ''بلکہ تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی ہے اور اپنے امام کی اطاعت کر کے اپنے آپ کو ہلاک و برباد کیا ہے اور عار و نار کو حاصل کیا ہے۔ بہت ہی برا ہے۔ تیرا امام۔ خدا فرماتا ہے: کچھ ایسے امام بھی ہیں جو لوگوں کو جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور بروز قیامت ان کی کوئی امداد نہیں کی جائے گی۔ تیرا امام یزید بھی انہی اماموں میں سے ہے۔''[3]

بہرحال ان حالات میں اصحاب حسینؑ کے اندر غیر معمولی جوش پیدا ہوا۔ چنانچہ جناب زہیر بن قین نے خدمت امام میں عرض کیا: میرے آقا حالات نے جو صورت اختیار کر لی ہے وہ ظاہر ہے۔ ابھی ان لوگوں سے نمٹ لینا چاہیے کیونکہ بعد میں اس قدر کثیر فوج آ جائے گی کہ جس کے مقابلہ کی ہمیں تاب و توانائی نہ ہو گی۔ مگر امامؑ نے یہ جواب باصواب دے کر اپنی صلح جوئی پر مہر ثبت کر دی کہ ﴿ما کنت لابدأ هم بالقتال﴾ میں ہرگز جنگ کی ابتداء نہیں کرنا چاہتا۔[4]

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۶۔ نفس المہموم، ص ۱۰۸۔ مقتل الحسین، ص ۲۰۶۔ الاخبار الطوال، ص ۲۵۲۔
[2] ارشاد، ص ۲۲۶۔ نفس المہموم، ص ۱۰۹۔
[3] نفس المہموم، ص ۱۰۹۔
[4] ارشاد، ص ۲۲۶۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۲ وغیرہ۔

کربلا میں ورود

اس کے بعد امامؑ نے حُر سے فرمایا: ہمیں تھوڑا سا آگے چلنے دو۔ چنانچہ ابھی آپؑ نے تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ حُر اپنی سپاہ کے ساتھ آگے آ کر سدِ راہ ہوگیا۔ امامؑ نے دریافت کیا: ﴿ما اسم هذه الارض﴾ اس جگہ کا کیا نام ہے؟ عرض کیا گیا کہ اسے کربلا کہتے ہیں۔ ﴿فدمعت عيناه و قال اللّٰهم انى اعوذ بك من الكرب و البلاء﴾ سید الشہداءؑ نے آبدیدہ ہو کر کہا: یا اللہ ہم کرب و بلا سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔ پھر یہ بھی فرمایا: ﴿هذا موضع كرب و بلاء﴾ یہ رنج و الم کا مقام ہے۔ اس کے بعد حکم دیا: ﴿انزلوا﴾ یہاں اترو کیونکہ ﴿هاهنا محط رحالنا و مسفك دمائنا و هنا محل قبورنا بهذا حدثنى جدى رسول الله صلى الله عليه و آله﴾ یہی ہماری سواریاں بٹھانے کی جگہ ہے۔ یہی ہمارے خون بہائے جانے کا مقام ہے۔ یہی ہماری قبروں کا محل ہے۔ میرے جد نامدار جناب رسول خداؐ نے مجھے اسی جگہ کی اطلاع دی[1] تھی۔

یہ دو محرم ۶۱ھ بروز پنجشنبہ کا واقعہ ہے۔[2] وہاں اترنے کے بعد آنجنابؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: ﴿الناس عبيد الدنيا و الدين لعق على السنتهم يحوطونه مادرت معايشهم فاذا محصوا بالبلاء قل الديانون﴾ عام لوگ دنیا کے بندے ہیں اور انہوں نے دین کو چاٹنا بنایا ہوا ہے۔ وہ دین سے اس وقت تک وابستہ رہتے ہیں۔ جب تک ان کی معیشت ٹھیک رہے لیکن جب کسی آزمائش کا وقت آجائے تو دیندار لوگ بہت ہی قلیل ثابت ہوتے ہیں۔[3]

جب خیام حسینیؑ نصب ہو چکے تو روایات میں وارد ہے کہ سرکار سید الشہداءؑ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ: ﴿جمع ولده و اخوته و اهل بيته ثم نظر اليهم فبكى ساعة ثم قال اللّٰهم انا عترة نبيك محمد وقد اخرجنا و طردنا و ازعجنا عن حرم جدنا و تعدت بنو امية علينا اللّٰهم فخذلنا بحقنا و انصرنا على القوم الظالمين﴾

آپؑ نے اپنے تمام اعزہ و اقارب کو اکٹھا کیا اور ایک ساعت تک ان کی طرف دیکھنے کے بعد رو دیئے۔ اور بارگاہِ قدرت میں عرض کیا۔ یا اللہ ہم تیرے نبی محمدؐ کی عترت ہیں۔ ہمیں زبردستی اپنے جد نامدار کے حرم سے دور کیا

---

1. لہوف سید ابن طاؤس، ص ۷۱۔ نفس المہموم، ص ۱۱۱۔ عاشر بحار، ص ۱۸۸۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۰۸ وغیرہ۔
2. ارشاد، ص ۲۲۶۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۳۔ کامل، ج ۴، ص ۲۱ وغیرہ۔
3. نفس المہموم، ص ۱۱۱۔

گیا ہے۔ اور بنی امیہ نے ہم پر ظلم و ستم کیا ہے۔ تو ہمارے حق کو حاصل فرما۔ اور ہمیں ظالموں پر فتح و نصرت عطا کر۔[1]

امام حسین علیہ السلام کے کربلا میں تشریف لانے کے بعد یہ پہلی مجلس حسین تھی۔ جو کربلا میں پڑھی گئی۔

بعض اربابِ مقاتل نے اس مقام پر امام عالی مقام کا وہ خطبہ اور اصحابِ حسینؑ کے تائیدی ایمان افروز کلمات نقل کیے ہیں۔ جو ہم منزل ذی حسم کے مقام پر نقل کر چکے ہیں۔ و یمکن الجمع بالتکرار واللہ العالم بالاسرار۔

ایک مشہور واقعہ پر تنقید

''حضرت کے داخلۂ کربلا کے بعد عام طور پر ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ آپؑ نے نینوا، غاضریہ کے باشندوں کو جو اس زمین کے مالک تھے۔ بلوا کر فرمایا کہ میں یہاں قتل کیا جاؤں گا۔ میرے دوست دور دور سے زیارت کو آئیں گے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس زمین کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ وہ لوگ راضی ہوئے تو آپؑ نے ساٹھ ہزار درہم مرحمت فرمائے۔ مگر یہ روایت سوائے معمولی کتابوں کے کسی معتبر کتابوں میں نہیں پائی جاتی۔ مولوی غلام حسنین صاحب مرحوم اپنی کتاب ماتمین، جلد اول کے صفحہ ۲۹۴ میں فرماتے ہیں کہ ''یہ روایت کسی کتاب میں بمضمون مندرجہ بحر المصائب نہیں پائی جاتی۔ اور آج تک مجھ کو اس کی سند نہیں ملی۔ بہر حال علامہ کنتوری نے اس روایت کو محض بحر المصائب کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ حالانکہ بحر المصائب تاریخی کتاب کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ وہ بہت سی بے سروپا روایات کا مجموعہ ہے۔''[2] واللہ العالم۔

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۱۱۔ مقتل الحسین، ص ۲۰۸۔ وقائع ایام محرم، ص ۹۲ وغیرہ۔

[2] مجاہد اعظم، حصہ اول، ص ۱۹۸۔

﴿ بیسواں باب ﴾

دو محرم سے شبِ عاشورا تک کے حالات و واقعات

امام حسین علیہ السلام کے نام ابن زیاد کا خط

بعض کتب سیر و تواریخ میں لکھا ہے کہ جب حر نے امام کے کربلا میں ورود کی اطلاع ابن زیاد کو دی تو ابن زیاد نے اس مضمون کا ایک خط حضرت امام عالی مقام کی خدمت میں بھیجا۔ ﴿**اما بعد فقد بلغنی یا حسینؑ نزولک بکربلاء و قد کتب الی امیر المؤمنین یزید ان لا اتوسد الوثیر ولا اشبع من الخمیر او الحقک باللطیف الخبیر او ترجع الی حکمی و حکم یزید والسلام**﴾ "اے حسینؑ! مجھے آپؑ کے کربلا پہنچنے کی اطلاع ملی ہے اور امیر یزید نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں اس وقت تک نہ نرم تکیہ پر سر رکھوں اور نہ عمدہ خوراک کھاؤں جب تک آپؑ کو قتل نہ کرلوں مگر یہ کہ آپؑ میرے اور یزید کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔" یہ خط امامؑ کو پہنچا۔ تو آپؑ نے پڑھنے کے بعد اسے پھینک دیا اور فرمایا: ﴿**لا افلح قوم اشتروا مرضات المخلوق بسخط الخالق**﴾ وہ گروہ کبھی فلاح حاصل نہیں کرسکتا۔ جو خالق کی ناراضی کے عوض مخلوق کی رضامندی خریدے۔ جب قاصد نے جواب کا تقاضا کیا تو آنجنابؑ نے فرمایا: ﴿**ماله عندی جواب فقد حقت علیه کلمة العذاب**﴾ میرے پاس اس خط کا کوئی جواب نہیں ہے یہ ملعون عذابِ خداوندی کا مستحق بن چکا ہے۔[1]

سوم محرم الحرام کو عمر بن سعد کا چار ہزار لشکر کے ساتھ کربلا میں پہنچنا

جب عراق کے گورنر عبید اللہ بن زیاد کو امامؑ کے ورود کربلا کی اطلاع ملی تو اس نے امام عالی مقامؑ کے قتل و قتال کے لیے کوفہ سے فوجیں بھیجنا شروع کردیں۔ چنانچہ اکثر محقق ارباب تاریخ کے بیان کے مطابق پہلے پہل عمر بن سعد (ملعون) ۳ محرم الحرام کو چار ہزار کا لشکر جرار لے کر قتل امامؑ کے ناپاک ارادہ سے وارد کربلا ہوا۔ اس کی روانگی کا ماجرا اس طرح ہے کہ قزوین (ایران) کے مضافات میں دیلمیوں نے خروج کر کے سرحدی علاقہ میں "دستبیٰ" پر قبضہ کرلیا تھا۔ ابن زیاد نے عمر سعد کو علاقہ رَے و دستبیٰ کا پروانہ دے کر ان لوگوں کی سرکوبی اور مقبوضہ علاقہ کی بازیابی کی مہم پر روانہ ہونے پر مامور کیا تھا۔ اور بعض اخبار و آثار کے مطابق وہ کوفہ سے روانہ ہو کر بمقام "حمام اعین" لاؤ لشکر سمیت خیمہ زن تھا کہ اس اثنا میں حضرت امام حسینؑ کے کربلا میں وارد ہونے کی ابن زیاد کو اطلاع ملی۔ اس لیے اس

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۱۱۔ مقتل الحسین، ص ۲۱۲۔ تمام، ص ۲۱۰ وغیرہ۔

نے ابن سعد کو واپس بلا کر کہا کہ پہلے اس کربلا والی مہم سے فارغ ہو لو۔ اس کے بعد دستبیٰ والی مہم پر روانہ ہونا۔ ابن سعد نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔ اگر آپؑ مجھے معاف کر دیں اور فلاں فلاں آدمیوں کو اس مہم پر روانہ کر دیں تو بہتر ہوگا۔ ابن زیاد نے جھلا کر کہا: ہم نے مشورہ لینے کے لیے تمہیں نہیں بلایا۔ جاتا ہے تو خود کربلا کا رخ کرو۔ ورنہ رے کا پروانہ واپس کر دو۔ ابن سعد نے ایک رات کی مہلت طلب کی۔ واپس گھر آیا۔ احباب و اقارب سے مشورہ کیا۔ سب نے اسے اس مشئوم ارادہ سے روکا۔ بعض (ابن سعد کے بھانجے حمزہ بن مغیرہ) نے تو یہاں تک اسے کہا کہ اگر تو تمام روئے زمین کا بادشاہ ہوتا اور تجھے اپنی تمام بادشاہت سے دستبردار ہونا پڑتا تو یہ بہتر تھا اس سے کہ امام حسینؑ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر کے بارگاہ خدا میں حاضر ہو۔ ابن سعد نے وعدہ بھی کر لیا کہ میں ایسا نہیں کروں گا مگر علاقہ رے کے حاصل کرنے کا بھوت اس کے سر پر کچھ اس طرح سوار تھا کہ وہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مشہور ہے کہ ابن سعد نے وہ رات انتہائی تحیر و سراسیمگی کے عالم میں اور برابر یہ کفریہ اشعار پڑھنے کے عالم میں گزاری ؎

دعانی عبید اللّٰہ من دون قومہ	الی خطۃ فیہا خرجت لحین
فو اللّٰہ لا ادری و انی لحائر	افکر فی امری علی خطرین
و اترک ملک الرایے والری منیتی؟	ام اصبح ماثوماً بقتل حسینؑ
حسینؑ ابن عمی و الحوادث جمۃ	لعمری ولی فی الری قرۃ عین
وفی قتلہ نار التی لیس دونہا	حجاب ولی فی الری قرۃ عین
یقولون ان اللّٰہ خالق جنۃ	ونار تعذیب و غلّ یدین
فان صدقوا فیما یقولون اننی	اتوب الی الرّحمٰن من سنتین
و ان الٰہ العرش یغفر زلّتی	و ان کنت فیہا اعظم الثقلین
و ان کذبوا فزنا بری عظیمۃ	وما عاقل باع الوجود بدین

بالآخر اس شقی ازلی نے یہی فیصلہ کر لیا کہ ہرچہ بادا باد میں ملک رے سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس کا خالص مادی کافرانہ اندازِ فکر یہ تھا کہ حکومت رے نقد ہے۔ اور جنت ادھار۔ اس نقد کو چھوڑ کر اُدھار کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے ابن زیاد سے اپنی رضامندی و آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اور ابن زیاد نے اسے وہی چار ہزار کا لشکر جرار دے کر جو پہلے اسے دیلمیوں کی سرکوبی کے لیے دیا تھا۔ اب نواسۂ رسول کو شہید کرنے، خانوادۂ نبیؐ کے بچوں کو یتیم کرنے، اور مخدراتِ عصمت و طہارت کو بے مقنعہ و چادر کرنے کے لیے کربلا روانہ کیا اور یہ شقی ازلی ۳ محرم

الحرام ۶۱ھ کو وارد کربلا ہوا۔[1]

ابن زیاد کا قتل فرزندِ رسولؐ کے لیے لوگوں کو برانگیختہ کرنا

ادھر کوفہ میں بدنہاد ابن زیاد کی یہ کیفیت تھی کہ وہ لوگوں کو جامع مسجد میں جمع کر کے مال و دولت کا لالچ دے کر نیز تہدید و وعید سے یزید عنید کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ چنانچہ ہر ہر آدمی کے وظائف مقررہ میں نقد سو سو درہم کا اضافہ کر دیا تھا۔ مزید احتیاط کی خاطر کوفہ سے نکل کر مقام "نخیلہ" (جو کہ کوفہ سے کچھ فاصلہ پر کربلا کے راستہ میں واقع ہے) میں اقامت اختیار کر رکھی تھی۔ اس کو یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ لوگ چونکہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جنگ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کچھ لوگ کوفہ سے روانہ ہو کر راستے سے واپس چلے آتے ہیں۔ اس لیے ملعون نے سعد بن عبدالرحمٰن کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ جستجو کرے اور اسے اگر کوئی ایسا شخص ملے تو اسے پکڑ کر دربار میں پیش کرے۔ چنانچہ سعد مذکور نے ایک شامی سپاہی کو جو کسی کام کے لیے لشکر سے واپس کوفہ میں آیا تھا۔ پکڑ کر ابن زیاد کے یہاں پیش کیا اور اس نے اس کے قتل کا حکم صادر کیا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ اس واقعۂ ہائلہ کا یہ اثر ہوا۔ کہ پھر کسی شخص کو لشکر سے واپس آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔[2] ابن زیاد برابر لشکر پر لشکر بھیجتا رہا۔ چنانچہ چوتھی محرم کو شمر بن ذی الجوشن کو چار ہزار، یزید بن رکاب کلبی کو دو ہزار اور حصین بن نمیر کوفی کو چار ہزار کا لشکر جرار دے کر روانہ کیا۔[3] اسی طرح برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ صحیح روایت کی بنا پر نویں ماہِ محرم کو کربلا میں سپاہِ مخالف کی تعداد تیس ہزار کو پہنچ گئی تھی۔ (اس کی تفصیل بعد میں آئے گی انشاءاللہ) نیز بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد نے زحر بن قیس جعفی کو پانچ سو مسلح سپاہی دے کر "پل فرات" (جو کربلا کے راستہ میں واقع تھی) پر اس غرض سے تعینات کیا تھا کہ کوفہ کا کوئی آدمی حضرت امام حسینؑ کی نصرت و امداد کے لیے نہ جا سکے۔[4]

بہر حال جب ابن سعد کربلا میں پہنچا۔ اور حُر بھی اپنے لشکر سمیت اس کے ساتھ شامل ہو گیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ قاصد بھیج کر حضرت امام حسینؑ سے تشریف لانے کا سبب دریافت کیا۔ پہلے اس غرض کے لیے کثیر بن عبد اللہ شعبی کو بھیجا جو کہ بدترین خلائق، بہت جری و جسور اور خون ریز آدمی تھا۔ سرکارِ امامؑ میں پہنچنے سے پہلے جناب ابو ثمامہ صائدی نے اس کا راستہ روک کر کہا کہ تلوار یہیں رکھ کر بارگاہِ امامؑ میں جاؤ۔ اس نے انکار کیا۔ ابو ثمامہ نے کہا:

---

1. ارشاد شیخ مفید، ص ۲۳۹۔ نفس المہموم، ص ۱۱۳۔ تمام، ص ۳۱۱۔ مقتل الحسین، ص ۲۰۶ وغیرہ۔
2. تمام، ص ۳۱۲، بحوالہ روضۃ الصفا۔
3. وقائع ایام محرم، ص ۲۰۹ وغیرہ۔
4. مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۱۷ بحوالہ کتاب الاکلیل للہمدانی، ج ۱۰، ص ۸۷، ۱۰۱۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں تیری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھتا ہوں اور اسی حالت میں خدمت امامؑ میں لے جاؤں گا۔ اس نے ایسا کرنے سے بھی انکار کیا۔ ابو ثمامہ نے دلیری کے ساتھ جواب دیا۔ پھر تم خدمت امامؑ میں بھی نہیں جا سکتے۔ اس پر طرفین میں سخت کلامی ہوئی اور بالآخر وہ شقی واپس چلا گیا۔ پھر ابن سعد نے قرۃ بن قیس حنظلی کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ اس نے امام عالی مقامؑ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر پسر سعد کا پیغام پہنچایا۔ امام علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿ان اهل مصركم كتبوا الیّ ان اقدم علينا فاما اذا كرهتموني انصرفت عنكم﴾ تمہارے شہر (کوفہ) والوں نے مجھے لکھا کہ ہماری طرف آیئے۔ اب اگر تم میرا آنا پسند نہیں کرتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔

قاصد نے واپس جا کر جب ابن سعد کو امامؑ کا یہ مصلحانہ جواب دیا تو اس نے خوش ہو کر کہا کہ ﴿ ارجو ان يعافني الله من حربه ﴾ "امید ہے میں حسینؑ کے ساتھ جنگ کرنے سے بچ جاؤں گا۔" پھر امامؑ کے جواب کی روشنی میں تمام صورت حال ابن زیاد کو لکھ کر بھیج دی۔ حسان بن قائد عبسی بیان کرتا ہے کہ جس وقت پسر سعد کا خط ابن زیاد کو ملا تو میں اس وقت اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے خط پڑھنے کے بعد متکبرانہ و کافرانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

الآن اذا علقت مخالبنا به   يرجوا النجاة ولات حين مناص

"اب جبکہ ان میں ہمارے پنجے گڑ گئے ہیں تو وہ خلاصی کی امید کرتے ہیں۔ اب چھٹکارے کا کوئی وقت نہیں ہے۔"

اس کے بعد عمر بن سعد کو اس مضمون کا خط لکھا: ﴿اما بعد فقد بلغني كتابك و فهمت ما ذكرت فاعرض على الحسينؑ ان يبايع ليزيد هو و جميع اصحابه فاذا هو فعل ذلك راينا راينا والسلام﴾ "مجھے تمہارا خط ملا اور حالات حاضرہ سے آگاہی ہوئی۔ (امام) حسینؑ سے یہ کہو کہ وہ اپنے تمام اصحاب سمیت پہلے یزید کی بیعت کریں پھر ہم ان کے بارے میں اپنی رائے کا جائزہ لیں گے۔ والسلام۔ جب ابن سعد کو ابن زیاد کا یہ تشددانہ خط ملا تو اس نے کہا: ﴿قد خشيت ان لا يقبل ابن زياد العافية﴾ "مجھے پہلے ہی یہ اندیشہ تھا کہ ابن زیاد صلح و آشتی کی گفتگو قبول نہیں کرے گا۔"[1]

عمر بن سعد چونکہ جانتا تھا کہ امام عالی مقامؑ اس نارو امطالبہ کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے اس نے اسے خدمت امامؑ میں پیش کرنے کی جسارت ہی نہیں کی۔[2] مصالحت سے ابن سعد ناامید ہو کر اب فرزند رسولؐ سے

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۷۔ تقام، ص ۳۱۲۔ نفس المہموم، ص ۱۳۳ وغیرہ۔

[2] ماثر بحار الانوار، ص ۱۸۹۔

لڑنے کی تیاری میں ہمہ تن مشغول ہو گیا مگر اخبار و آثار سے جو کچھ واضح و آشکار ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کی مصالحانہ کوششیں اس کے بعد بھی چند دنوں تک جاری رہیں کیونکہ وہ محض طمع دنیا میں اس جرم شنیع کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ ورنہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ اس جرم کا مرتکب ہو۔ یہ سلسلہ اس وقت موقوف ہوا جب خولی بن یزید ملعون نے پسر سعد کی اس روش و رفتار کی شکایت ابن زیاد بدنہاد کو کر بھیجی۔ اور اس بدنہاد کا تہدید آمیز خط ابن سعد کے پاس آیا۔ اس کے بعد یہ بدبخت قتل حسینؑ پر بالکل تل گیا۔ جس کا نتیجہ صبح عاشوراء تمام اہل عالم نے دیکھ لیا۔

ان امور کی تفصیل ناظرین کرام آنے والے بیانات میں ملاحظہ کریں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک ضروری امر کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتی ہے۔

امام عالی مقام کے جواب پر تبصرہ اور ایک مشہور غلط فہمی کا ازالہ

بعض کوتاہ اندیش لوگ امام عالی مقامؑ کے اس جواب باصواب پر جو آپؑ نے عمر بن سعد کے قاصد کو دیا تھا اور اس سے قبل حُر کے ساتھ پہلی ملاقات میں بھی اس بات کا اظہار کر چکے تھے۔ (کہ اگر تم اپنے عہد و پیمان پر قائم نہیں تو مجھے واپس جانے کی اجازت دے دی جائے) مختلف چہ مے گوئیاں کرتے ہیں۔ ''امام حسینؑ کو اپنے انجام کا علم نہ تھا'' ''کسی خاص مشن کو لے کر نہیں اٹھے تھے۔'' ''اگر ابن زیاد کی طرف سے واپسی کی اجازت مل جاتی تو پھر امام کیا کرتے؟ ان کا طریق کار کیا ہوتا؟'' ''اگر دین کی بقا آپؑ کی شہادت میں پوشیدہ تھی اور اسی مقصد کے پیش نظر ہی کربلا کے لق و دق صحراء میں تشریف لائے تھے تو پھر واپس جانے کی تمنا کا اظہار چہ معنی دارد؟'' یہ اور اس قسم کے متعدد سوالات کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے بودے اور رکیک سوالات وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے ذہنوں کی کسی مطلب کی گہرائی تک رسائی نہیں ہو سکتی ﴿و کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه و لما یاتهم تاویله﴾ ورنہ فہم و ذکا اور ذہن رسا رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اس قسم کے مقامات پر اس قسم کے نرم جوابات میں کیا حکمت و مصلحت مضمر ہوتی ہے؟ جناب امام حسین علیہ السلام کو باعلام ایزدی و باعلام نبویؐ و مرتضویؑ ضرور اپنے انجام کا علم تھا جس کا وہ بوقت روانگی بعض اشخاص سے اظہار بھی کر چکے تھے۔ (جیسا کہ ہم قبل ازیں مدینہ سے آپؑ کی روانگی کے حالات میں قلم بند کر چکے ہیں) وہ یقیناً ایک عظیم مقصد کے ماتحت یہاں تشریف لائے تھے اور وہ تھا دین اسلام کی بقاء کا انتظام اور انسانیت کے تحفظ کا اہتمام۔ وہ علم امامت اور حالات حاضرہ کے ماتحت یہ بھی جانتے تھے کہ ابن زیاد بدنہاد ان کی خواہش کو تسلیم نہیں کرے گا۔ امام تو امام خود پسر سعد کا بھی یہی خیال تھا کہ ابن زیاد صلح و آشتی کی گفتگو کو قبول نہیں کرے گا۔ (جیسا کہ ابھی ہم اوپر اس کا یہ عندیہ بیان کر چکے ہیں) اور ظاہر ہے کہ جب تک ابن زیاد منظوری نہ دیتا۔ حُر یا ابن سعد کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ان حقائق کے بعد اس سوال کا تو کوئی محل ہی باقی

نہیں رہ جاتا کہ اگر ابن زیاد آپ کی خواہش کو مان لیتا تو پھر آپ کا طریق کار کیا ہوتا؟" اب صرف یہ بات جواب طلب رہ جاتی ہے کہ امام علیہ السلام کے یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کہ ان کا یہ مطالبہ منظور نہیں ہوگا۔ پھر اس کا اظہار کیوں فرمایا؟ اس کا جواب بالکل واضح وعیاں ہے۔ رمز ناشناس معترضین کے منہ میں لگام دینا چاہتے تھے جو آج بڑی سادگی اور معصومیت کے انداز میں کہتے ہیں۔ "امام نے اس کا اظہار کیوں فرمایا۔" اگر امام ایسا نہ کرتے تو آج یہی لوگ یزید اور اس کے کارپردازانِ حکومت کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے یوں ان کی بے جا وکالت کرتے کہ یزید اور اس کے عمال کا کیا قصور ہے۔ وہ ہرگز امام کو شہید نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن امامؑ نے زبردستی ان پر جنگ مسلط کر دی۔ اور ان کو صلح وآشتی کی گفتگو کرنے کا کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس لیے یزید کو مجبوراً دفاعی اقدام کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں امامؑ کی شہادت واقع ہوگئی۔" حکیم اسلام امام حسین علیہ السلام نے یہ گفتگو کر کے اس قسم کی قیل وقال کا ہمیشہ کیلئے دروازہ بند کر دیا۔ اور بنی امیہ کے ظلم واستبداد کا پردہ اس طرح چاک کر دیا کہ اب اسے قیامت تک رفو نہیں کیا جا سکتا۔ امامؑ نے یہ مصالحانہ گفتگو کر کے ثابت کر دیا کہ یہ ان پر جنگ کو مسلط نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ حکومت شریفوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرے۔ مگر قیصر وکسریٰ کے پوتے نشۂ اقتدار میں اس طرح سرمست اور چور چور تھے کہ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ انسانیت وشرافت کیا چیز ہے؟ اور ان کے تقاضے کیا ہیں؟ انہوں نے بندگانِ خدا کو اپنا غلام اور شریعت محمدی کو گھر کی لونڈی سمجھ رکھا تھا۔ امت مسلمہ کے قویٰ شل ہو چکے تھے اور دماغ ماؤف! اس لیے ان حالات میں ضرورت تھی کہ کوئی جانفروش مرد حُر شمشیر بکف اور کفن بدوش رزمگاہ میں قدم رکھے۔ جو حکومت کی غلط کاریوں کا پردہ چاک کر کے حق وحقیقت کو اس کے حقیقی خد وخال کے ساتھ اصلی لباس میں اہل اسلام کے سامنے پیش کرے۔ یہ سعادت کاتبانِ قضا وقدر نے حضرت سید الشہداءؑ کے مقدر میں لکھ دی تھی۔ انہوں نے اس جمود وخمود کی مہر کو توڑا۔ اور یزید کی جابرانہ بلکہ کافرانہ حکومت کو بے نقاب کر دیا اور اس کا پرچم سرنگوں کر کے عالم انسانیت کو ابدی ہلاکت سے بچا لیا۔ اور دین اسلام کو ایک زندۂ جاوید حقیقت بنا دیا۔

سر داد و نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ

ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء و اللّٰہ ذو الفضل العظیم۔

چوتھی محرم اور کربلا میں فوجیں ہی فوجیں

محرم کی چوتھی تاریخ[1] کو عبید اللہ بن زیاد نے جامع کوفہ میں بنی امیہ کی تعریف اور قتال امامؑ پر تحریص پر مشتمل وہ خطبہ دیا جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اور پھر مقام نخیلہ میں قیام کر کے فوجیں بھیجنے اور دیگر تمام جنگی

---

[1] وقائع ایام محرم ص ۲۰۱۔ بحوالہ وسیلۃ النجاۃ طہرانی۔

امور کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور تیسری محرم کو عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کے ساتھ بھیجنے کے بعد برابر فوج پر فوج بھیجتا رہا۔ فوجوں اور ان کے سربراہوں کی تفصیل مناقب ابن شہر آشوب کے بیان کے مطابق یہ ہے: (۱) حُر: ایک ہزار۔ (۲) عمر بن سعد: چار ہزار۔ (۳) کعب بن طلحہ: تین ہزار۔ (۴) شمر ذی الجوشن: چار ہزار۔ (۵) یزید بن رکاب کلبی: دو ہزار۔ (۶) حصین بن نمیر: چار ہزار۔ (۷) مضایر بن رھینہ مازنی: تین ہزار۔ (۸) نصر بن حرشہ: تین ہزار۔ (۹) شبث بن ربعی: ایک ہزار۔ (۱۰) حجار بن ابجر: ایک ہزار۔ یہ کل تعداد پچیس[1] ہزار ہوتی ہے۔ لیکن محققین اہل سیر و تواریخ کا بیان یہ ہے اور حضرت امام زین العابدینؑ اور جناب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بسند معتبر نقل شدہ روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فوج اشقیاء کی تعداد تیس ہزار تھی۔[2] علامہ مجلسی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ﴿ان ابن زیاد ما زال یرسل الی ابن سعد بالعساکر حتی تکامل عندہ ثلاثون الفاً ما بین فارس و راجل، ثم کتب الیہ ابن زیاد انی لم اجعل لک علۃ فی کثرۃ الخیل و الرجال فانظر لا اصبح ولا امسی الا وخبرک عندی غدوۃً و عشیۃً وکان ابن زیاد یستحثّ ابن سعد لستۃ ایام مضین من المحرّم﴾ ابن زیاد بدنہاد برابر لشکر پر لشکر ابن سعد کے پاس بھیجتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس پیادہ اور سوار لشکریوں کی تعداد کامل تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس وقت ابن زیاد نے پسر سعد کو لکھا کہ میں نے کثرت اسپ و سپاہ کے معاملہ میں تیرے لیے کوئی عذر باقی نہیں چھوڑا۔ دیکھو ہر صبح و شام میرے پاس تمہاری کارکردگی کی رپورٹ موجود ہونی چاہیے۔ ابن زیاد نے چھٹی ماہ محرم کے بعد ابن سعد کو قتال حسینؑ پر زیادہ برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تھا۔[3]

یہ اس قدر لاؤ لشکر، اس قدر خیل و سپاہ، کربلا کے صحرا میں کیوں جمع کیے جا رہے تھے؟ محض فرزند رسولؐ، پروردۂ کنار بتولؑ، جگر گوشۂ امام مبینؑ، ناز پروردۂ جبرئیل امینؑ، برادر امام حسن مجتبیٰؑ، حلیف التقیٰ و سلیل الہدیٰ حضرت سید الشہداء روحی و ارواح العالمین لہ الفداء کی شمع حیات کو گل کرنے کے لیے جن کے تمام اعزہ و انصار کی تعداد بنا بر مشہور کل بہتر (۷۲) نفوس تھی، جن میں سے ۳۲ سوار اور چالیس پیادے تھے ؎

دشمناں چوں ریگ صحرا لا تعد   دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

(اسرار و رموز)

اور بنا بر تحقیق ایک سو پینتالیس (۱۴۵) نفر تھی۔ آہ! کجا ۷۲ (یا ۱۴۵) نفوس زکیہ۔ اور کہاں تیس ہزار انسان نما خونخوار درندوں کا لشکر جرار ؎

---

[1] کذا فی مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۱۸۔

[2] عاشر بحار، ص ۱۲۷، ۱۹۳، نفس المہموم، ص ۱۱۵۔ مقتل الحسین، ص ۲۱۹۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۲۵ وغیرہ۔

[3] عاشر بحار، ص ۱۹۰۔

لمصیبة اردت بلُبّ حشاشتی شُعَلاً یطیش دخانها بدماغی

اس طرح امت مسلمہ خاندان نبوت کے ساتھ یہ سلوک کر کے اجر رسالتؐ ادا کر رہی تھی

تبت یدا ابن زیاد کیف یطمع فی اذلال من لم یزل بالعز مذکوراً

امام حسینؑ اور ابن سعد کی آخری مصالحانہ گفتگو اور ناکامی

قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ابن سعد بدبخت محض دنیائے دوں کے بے پناہ طمع و لالچ کا شکار ہو کر فرزند رسولؐ کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ چاہتا نہیں تھا کہ آپؑ کے خون مقدس سے اپنے ہاتھ رنگین کرے اور اس جرم سنگین کا مرتکب ہو۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح رے کی حکومت بھی ہاتھ سے نہ جائے اور قتل و قتال حسینؑ سے بھی گلو خلاصی ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اس سلسلہ میں پہلی کوشش تو یہ کی کہ آتے ہی قاصد بھیج کر امامؑ سے یہاں تشریف لانے کا سبب دریافت کیا۔ اور امام عالی مقام کے اتمامِ حجت کے لیے مصلحانہ جواب پر اس نے ابن زیاد کو لکھا کہ اب خطرۂ جنگ ٹل گیا مگر ابن زیاد نے اپنی مفسدہ پرواز، شورش پسند طبیعت اور فتنہ پرور ذہنیت کی بنا پر اس کوشش کو بار آور نہ ہونے دیا۔ اب بظاہر حالات ابن سعد مصالحانہ روش و رفتار سے نا امید ہو چکا تھا مگر امام علیہ السلام نے اتمام حجت کے لیے خود دست تعاون دراز کیا۔ یعنی آنجنابؑ نے ابن سعد کے پاس قاصد بھیجا کہ آج رات دونوں لشکروں کے درمیان مجھ سے ملو۔ ابن سعد نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ لیکن سبط ابن جوزی (در تذکرہ خواص الامۃ) کے بیان کے مطابق خود عمر بن سعد نے یہ استدعا کی تھی جسے سرکار سید الشہداؑ نے شرف قبولیت بخشا۔ صاحب ناسخ التواریخ (ج ۶، ص ۲۲۷) نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ درحقیقت یہی بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ابن سعد جنگ سے پہلوتہی کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ جس پر اس کا وہ مکتوب بھی شاہد ہے جو اس نے ملاقات کے بعد ابن زیاد کو لکھا (جس کی تفصیل بعد میں آ رہی ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ امامؑ نے اسے اتماماً للحجہ، نصرت حق کی دعوت دینے کی خاطر بلایا ہو جیسا کہ مکالمہ سے ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ بہرحال ابن سعد مقررہ وقت پر قریباً بیس سواروں کے ہمراہ مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ ادھر امام علیہ السلام بھی اتنے ہی آدمیوں کے ساتھ تشریف لے گئے مگر قریب پہنچ کر امامؑ نے اپنے ہمراہیوں کو علیحدہ کر دیا۔ ابن سعد نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور بروایتے شہزادہ علی اکبرؑ اور جناب ابو الفضل عباسؑ آپؑ کے ہمراہ رہے۔ اسی طرح عمر بن سعد کا بیٹا حفص اور اس کا خاص غلام بھی اس کے ساتھ رہے (مقتل الحسینؑ، ص ۲۲۳) اس طرح تنہائی کے عالم میں امام علیہ السلام اور عمر بن سعد کے درمیان کافی دیر تک سلسلۂ کلام جاری رہا۔[1]

---

[1] صاحب ذبح عظیم، (ص ۲۸۶) نے یہ واقعہ نویں محرم کی رات کے حالات میں لکھا ہے لیکن حالات و قرائن اس کی تائید کی بجائے تردید کرتے ہیں اگرچہ علماء نے اس تاریخ کی تعیین نہیں کی مگر یہ یقیناً نویں محرم سے پہلے کا واقعہ ہے۔ واللہ العالم۔

امام عالی مقام اور عمر بن سعد کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟

یہ گفتگو کس موضوع پر ہوئی؟ کیا کیا امور زیر بحث آئے؟ فریقین نے کن کن خیالات کا اظہار کیا؟ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے! مورخ طبری نے (ج ۶، ص ۲۳۵) پر لکھا ہے: ﴿تحدث الناس فیما بینهما ظناً یظنونه﴾ لوگوں نے ان کی اس باہمی گفتگو کے بارے میں محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے کہ فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ"۔۔۔ہاں جو کچھ بعض اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ:

امام نے فرمایا: ﴿ویحک یابن سعد اما تتقی الله الذی الیه معادک و تقاتلنی و انا بن من علمت. ذر هؤلاء القوم و کن معی فانه اقرب لک الی الله﴾۔ افسوس ابن سعد! کیا تو اس خدا سے نہیں ڈرتا جس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے! تو مجھ سے جنگ کرتا ہے حالانکہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کس کا فرزند ہوں؟ اس قوم کو چھوڑ اور میرا ساتھ دے کہ یہ بات خدا کی خوشنودی کے زیادہ نزدیک ہے۔

عمر بن سعد: ﴿اخاف ان یهدم داری﴾ مجھے اندیشہ ہے کہ میرا گھر ڈھا دیا جائے گا۔

امام علیہ السلام: ﴿انا ابنیها لک﴾ (اگر ان لوگوں نے تیرا گھر گرا دیا تو) میں تمہیں گھر بنا دوں گا۔

عمر بن سعد: ﴿اخاف ان تؤخذ ضیعتی﴾ مجھے خطرہ ہے کہ میری جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔

امام علیہ السلام: ﴿انا اخلف علیک خیراً من مالی بالحجاز﴾ میں اپنے مال حجاز سے تیری موجودہ جائیداد سے بہتر جائیداد تجھے خرید کے دوں گا۔[1]

عمر بن سعد: ﴿لی عیال و اخاف علیهم﴾ میرے اہل وعیال ہیں اور مجھے ان کی تباہی کا خوف ہے۔ یہ کہہ کر ابن سعد نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ جس کے بعد امام یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

امام علیہ السلام: ﴿مالک ذبحک الله علی فراشک عاجلاً ولا غفر لک یوم حشرک فوالله انی لارجو ان لا تاکل من برّ العراق الا یسیراً﴾ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ خدا تجھے تیرے رخت خواب پر ذبح کرے۔ اور بروز حشر تجھے ہرگز معاف نہ کرے۔ بخدا میں امید کرتا ہوں کہ تو زیادہ دیر تک عراق کی گندم نہیں کھائے گا۔

عمر بن سعد: ﴿فی الشعیر کفایة عن البر قاله مستهزئاً﴾ تمسخر کے انداز میں کہا: اگر گندم نہ ملی تو جو کھا کر گزر اوقات کر لوں گا۔[2]

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۲۸۳۔

[2] نفس المہموم حاشیہ، ص ۱۱۷۔ مقتل الحسین، ص ۲۲۲۔ تظلم الزہراء، ص ۱۰۳۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۱، ص ۲۴۵۔ بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۰۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس گفتگو کے دوران میں امام نے یہ بھی فرمایا تھا: ﴿دعونی فلا ذهب فی هذه الارض العریضة حتی ننظر ما یصیر امر الناس﴾ مجھے واگزار کردو تاکہ میں اس طویل و عریض زمین میں کہیں چلا جاؤں۔ یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا انجام واضح ہو جائے۔

چونکہ ابن سعد اس جنگ سے بچنے کے لیے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ اس نے عام مؤرخین کے بیان کے مطابق امامؑ کے اتنے سے کلام کو ابن زیاد کے نام مرسلہ خط میں بہت بڑھا چڑھا کر لکھا۔ ﴿اما بعد فان الله قد اطفأ النائرة و جمع الکلمة و اصلح امر الامة وهذا حسینٌ قد اعطانی ان یرجع الی المکان الذی منه اتی او ان نسیره الی ای ثغر من ثغور المسلمین شئنا فیکون رجلاً من المسلمین له مالهم و علیه ما علیهم او ان یاتی یزید امیر المؤمنین فیضع یده فی یده فیری فیما بینهٗ و بینهٗ رایه وفی هذا لکم رضاً و للامة صلاح﴾۔ "خدا نے فتنہ و فساد کی آگ بجھا دی ہے اور اتحاد اسلامی کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اور امت مسلمہ کے معاملہ کی اصلاح کر دی ہے یہ حسینؑ موجود ہیں جو مجھے یقین دلاتے ہیں کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جاتے ہیں۔ یا کسی اسلامی سرحد کی طرف نکل جاتے ہیں تاکہ وہاں ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکیں۔ یا یزید کے پاس جا کر دو بدو صلح کی گفتگو کریں۔ بظاہر اس امر میں آپ کی رضا اور امت کی صلاح و فلاح ہے یعنی اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔"[1]

یہ بیان جو ابن سعد نے امام کی طرف منسوب کیا ہے۔ روایت و درایت کے مخالف ہے۔ درایت کے خلاف اس طرح ہے کہ جو شخص بھی حضرت امام حسینؑ کی بلند و بالا شخصیت کی تھوڑی سی معرفت رکھتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ امام عالی مقام ایسا سطحی اور گرا ہوا کلام ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ یہی امام حسینؑ تھے جنہوں نے روانگی کے وقت اپنے بھائی عمرو الطرف سے کہا تھا: ﴿والله لا اعطی الدنیة من نفسی﴾ جو ہو سو ہو بخدا میں ہرگز ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اور یہی بزرگوار تھا۔ جس نے اپنے دوسرے بھائی محمد بن الحنفیہ سے فرمایا تھا: ﴿لو لم یکن ملجاء لما بایعت یزید﴾۔ اگر میرے لیے کوئی بھی جائے پناہ نہ ہوئی۔ تب بھی یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔ اور یہی وہ غیور امامؑ تھا جس نے روز عاشورا فرمایا تھا: ﴿الا ان الدعی ابن الدعی قد رکز بین اثنتین بین السلة و الذلة و هیهات منا الذلة یابی الله تعالی ذلک و رسوله و المؤمنون و حجور طابت و طهرت و انوف حمیة و نفوس ابیة من ان تؤثر طاعة اللئام علی مصارع الکرام﴾ حرام زادہ پسر حرام زادہ نے مجھے دو

---

[1] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۳۶۔ تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۳۵۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۲۔

باتوں میں سے ایک کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ موت یا ذلت۔ ہم ذلت قبول کریں یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا، اس کا رسولؐ، اہل ایمان، پاک و پاکیزہ گودیں، باغیرت چہرے اور نفوس عالیہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ہم شریفوں کی شریفانہ موت پر کمینوں کی اطاعت کو ترجیح دیں۔

کیا ان حالات کے پیش نظر کوئی شخص یہ وہم و گمان بھی کر سکتا ہے۔ کہ ایسے غیور امام عالی مقام نے ایسے ذلت آمیز طریقہ سے بیعت یزید کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا ہو؟ حاشا و کلا کوئی باخبر شخص یہ گمان فاسد بھی نہیں کر سکتا کہ شاید آنجنابؑ نے موت کو سامنے منہ کھولے دیکھ کر یہ خود سپردگی کا انداز اختیار کیا ہو (معاذ اللہ) آنجنابؑ کے ذاتی اوصاف اور خاندانی روایات کے پیش نظر آپؑ کے متعلق یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہ جنابؑ اس یکتاز میدان شجاعت کے سپوت تھے۔ جو ہمیشہ یہ فرمایا کرتے ﴿واللّٰہ لابن ابی طالب لانس بالموت من الطفل بثدی امہ﴾ بخدا ابو طالب کا بیٹا اس سے زیادہ موت کے ساتھ مانوس ہے۔ جس قدر بچہ ماں کی چھاتی سے مانوس ہوتا ہے۔ (نہج البلاغہ) عروس موت سے ہمکنار ہونے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا۔ اور جس روز آغوش موت میں جا رہا تھا۔ اس روز بسم اللہ و باللہ و علی ملۃ رسول اللہ کہنے کے بعد جو پہلا جملہ اس کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا: ﴿فزت و رب الکعبۃ﴾ رب کعبہ کی قسم میں آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ امام حسین علیہ السلام جس خانوادۂ عصمت و طہارت کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بزرگ تو بجائے خود خورد سال اطفال کا یہ حال تھا کہ جب ان سے پوچھا جاتا ﴿یا بنی کیف الموت عندک؟﴾ بیٹا تمہارے نزدیک موت کیسی ہے؟ تو بلا جھجک جواب دیتے ﴿یا عم احلی من العسل!﴾ عم بزرگوار! حق کی تائید اور آپ کی نصرت میں موت شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے![1]

باقی رہا اس بات کا خلاف روایت ہونا۔ وہ اس طرح ہے کہ اس مزعومہ روایت کے خلاف ایک معتبر روایت موجود ہے۔ جس میں پُر زور و پُر شکوہ الفاظ میں اس واقعہ کی نفی کی گئی ہے۔ اور وہ ہے واقعۂ ہائلہ کربلا کے عینی شاہد عقبہ بن سمعان کا بیان حقیقت ترجمان۔ عقبہ بیان کرتے ہیں: ﴿صحبت حسیناً فخرجت معہ من المدینۃ الی مکۃ و من مکۃ الی العراق ولم افارقہ حتی قتل علیہ السلام و لیس من مخاطبتہ الناس کلمۃ بالمدینہ ولا بمکۃ ولا فی الطریق ولا بالعراق ولا فی عسکر الی یوم مقتلہ الا وقد سمعتھا الا واللّٰہ ما اعطاھم ما یتذکر الناس وما یزعمون من ان یضع یدہ فی ید یزید بن معاویۃ ولا ان یسیروہ الی ثغر من ثغور المسلمین و لکنہ قال دعونی فلاذھب فی ھذہ الارض العریضۃ حتی ننظر ما

---

[1] جواب جناب قاسم بسید الشہداء، ناسخ، ج ۶، ص ۲۳۶۔

بصیر امر الناس ہے[1] میں مدینہ سے لے کر مکہ اور مکہ سے لے کر عراق تک برابر امام حسینؑ کے ہمراہ رہا۔ اور ان کی شہادت تک میں ان سے علیحدہ نہیں ہوا۔ امام نے مدینہ سے مکہ اور درمیانی راستہ عراق اور لشکر میں جام شہادت نوش کرنے تک کوئی ایسا کلام نہیں کیا جو میں نے نہ سنا ہو۔ یہ جو کچھ لوگ گمان کرتے ہیں کہ آنجنابؑ نے یہ کہا تھا کہ وہ یزید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ (یعنی صلح کرتے ہیں) یا مسلمانوں کی کسی سرحد کی طرف نکل جاتے ہیں۔ بخدا امام علیہ السلام نے ہرگز ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ البتہ یہ ضرور فرمایا تھا کہ میں اس وسیع و عریض زمین میں چلا جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ دیکھیں لوگوں کے معاملہ کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' ان حقائق کی موجودگی میں کیونکر باور کیا جا سکتا ہے؟ کہ عمر بن سعد کا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ وہ سراسر افتراء و بہتان ہے جو بنا بر ثبوت اس نے محض اس لیے تراشا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح علاقہ رے کی حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور قتل امام سے بھی بچ جائے یعنی رند کا رند بھی رہے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ؎ و هذا محال فی القیاس بدیع۔

عمر بن سعد کی ناکامی کے اسباب

اور شاید پسر سعد اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ اس کی کامیابی کے بظاہر کچھ آثار بھی نمایاں تھے کیونکہ ارباب تاریخ نے لکھا ہے کہ جب اس کا مذکورہ بالا مکتوب ابن زیاد کو ملا تو اس نے یہ کہہ کر ﴿هذا کتاب ناصح لامیره مشفق علی قومه﴾ یہ اس شخص کا خط ہے جو اپنے حاکم کا خیرخواہ اور قوم کا ہمدرد ہے[2]۔ اس رائے سے اتفاق کرنے پر اپنا میلان ظاہر کیا مگر خولی بن یزید اصبحی اور شمر بن ذی الجوشن آڑے آئے۔ انہوں نے ابن سعد کے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ خولی جو کربلا میں کئی ہزار کا لشکر لے کر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عمر بن سعد کی شکایت میں ابن زیاد کو اس مضمون کا ایک خط لکھا:

﴿ایها الامیر! ان عمر بن سعد یخرج کل لیلة و یبسط بساطاً و یدعو الحسینؑ و یتحدثان حتی یمضی من اللیل شطره و قد ادرکته علی الحسینؑ الرحمة و الرأفة فامره ان ینزل عن حکمک و یصیر الحکم لی و انا اکفیک امره﴾ اے امیر! عمر بن سعد ہر شب اپنے لشکر سے نکلتا ہے اور حسینؑ کے ساتھ رأفت و ہمدردی کرنا چاہتا ہے اس لیے اسے حکم دیں تاکہ وہ اس خدمت سے سبکدوش ہو جائے اور اس معاملہ کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دے دے۔ میں اس خدمت کو انجام دوں گا۔ ارباب دانش سمجھ سکتے ہیں کہ خولی کے اس مکتوب نے ابن زیاد بدنہاد جیسے مغلوب الغضب خودسر گورنر پر کیا اثر کیا ہوگا ؟ ہو جب دیوانہ را ہوئے بس

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۱۸۔ تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۳۵۔ تاریخ کامل، ج ۳، ص ۲۸۳۔

[2] نفس المہموم، ص ۱۱۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۳۔

است'' اس کے کسی عاجلانہ واحمقانہ اور کافرانہ حکم کے صادر کرنے کے لیے تو یہی مکتوب کافی تھا مگر ملعون شمر بن ذی الجوشن (جو اس وقت دربار میں حاضر تھا) کی تقریر سراپا تخریب نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اس نے جو کچھ کہا۔ اس کا لب لباب وہی تھا جو مروان بن حکم نے مدینہ میں ولید کو امامؑ کے بارے میں مشورہ دیا تھا یعنی شمر نے کہا: ﴿اتقبل هذا منه وقد نزل بارضک و الى جنبک و الله لئن رحل من بلادک ولم يضع يده فى يدک ليكونن اولى بالقوة ولتكونن اولى بالضعف و العجز فلا تعطه هذه المنزلة ولكن لينزل على حكمک هو و اصحابه الخ... ﴾۔ ''بھلا تم حسینؑ کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہو۔ حالانکہ وہ اس وقت تمہاری زمین اور تمہاری گرفت میں ہیں۔ اگر وہ یہاں سے کسی اور جگہ چلے گئے۔ اور تمہارے ہاتھ پر ہاتھ نہ رکھا۔ تو پھر یاد رکھو۔ بخدا وہ طاقت ور اور تم کمزور ہو جاؤ گے۔ (اور پھر ان پر قابو نہیں پاسکو گے) اس لیے ان کی یہ بات ہرگز منظور نہ کرو۔ بلکہ ان کو اپنے اصحاب سمیت آپ کے حکم کے سامنے جھک جانا چاہیے۔'' ابن زیاد نے رائے فاسد و کاسد کو پسند کیا۔ اور فوراً عمر بن سعد کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا۔ اور شمر بن ذی الجوشن کے حوالہ کرتے ہوئے اسے فہمائش کر دی کہ اگر ''پسر سعد میرے خط کے مضمون کے مطابق عمل درآمد کرلے۔ تب تو تو اس کی اطاعت کرنا۔ اور اگر وہ حسینؑ کے ساتھ جنگ کرنے میں پس و پیش کرے تو پھر تو امیر لشکر ہے اور پسر سعد کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دینا۔''

اس خط کا مضمون یہ تھا: ﴿الى عمر بن سعد انى لم ابعثک الى الحسينؑ لتكف عنه ولا لتطاوله ولا لتمنيه السلامة و البقاء ولا لتعذر له عندى ولا لتكون له عندى شافعاً انظر فان نزل الحسينؑ و اصحابه على حكمى و استسلموا فابعث بهم الىّ سلماً و ان ابوا فازحف اليهم حتى تقتلهم و تمثل بهم فانهم لذلک مستحقون و ان قتل الحسينؑ فاوطى الخيل صدره و ظهره فانه عاق ظلوم و لست ارى ان هذا الا يضرّ بعد الموت شيئاً و لكن على قول قد قلتهٗ لو قد قتلته لفعلت هذا به فان انت مضيت لامرنا فيه جزيناک جزاء السامع المطيع و ان ابيت فاعتزل عملنا و جندنا وخلّ بين شمر بن ذى الجوشن و بين العسكر فانا قد امرناه بامرنا﴾[1]

اور بعض روایات کے مطابق خولی کے شکایت نامہ موصول ہونے کے بعد ابن زیاد نے عمر بن سعد کو اس مضمون کا خط لکھا: ﴿اما بعد يابن سعد قد بلغنى انک تخرج فى كلّ ليلة و تبسط بساطاً تدعو الحسينؑ و تتحدث معه حتّى يمضى من الليل شطره فاذا قرات كتابى هذا فامره ان ينزل على حكمى فان اطاع و الا امنعه من الماء فانّى حللته على اليهود و النّصارىٰ و حرّمته عليه و على

[1] نفس المہموم ص ۱۱۸۔ کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۳۳۰ وغیرہ۔

اهلبیته فحل بین الحسینؑ و اصحابه و بین الماء فلا یذوقوا منه قطرةً کما صنع بالتقی النقی عثمان امیر المؤمنین المظلوم﴾

ہر دو (۲) خطوط کا ماحصل یہ ہے کہ اے پسر سعد! میں نے تمہیں حسینؑ کے ساتھ صلح کرنے کے لیے نہیں بھیجا اور نہ اس لیے بھیجا ہے کہ تم ان کی سفارشیں کرو۔ اور نہ اس لیے کہ فرشوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ گفتگو کرو۔ جیسا کہ ان امور کی مجھے اطلاع ملی ہے۔ دیکھو اگر حسینؑ اور ان کے اصحاب میرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو ان کو سلامتی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو۔ اور اگر انکار کریں تو ان سے جنگ کرو۔ اور پانی بند کر دو۔ کیونکہ میں نے یہود و نصاریٰ پر تو اسے حلال کر دیا ہے مگر حسینؑ اور ان کے اہل بیت پر حرام ہے۔ خیال رکھنا کہ ان تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچنے پائے۔ اور جب قتل ہو جائیں تو حسینؑ کی لاش (مقدس) کو زیر سم اسپاں پامال کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہیں مطیع و فرمانبردار والی جزاء دیں گے اور اگر ایسا کرنے کا خیال نہ ہو تو لشکر کی سرداری شمر کے حوالہ کر دو اور خود علیحدہ ہو جاؤ۔ ہم نے شمر کو اپنا خاص حکم دے دیا ہے۔"[1]

راویان اخبار کا بیان ہے کہ شمر ذی الجوشن جب یہ مکتوب مشئوم لے کر ابن سعد کے پاس پہنچا۔ اور وہ مضمون خط پر مطلع ہوا تو بھانپ گیا کہ اس کے منصوبہ کو اسی شمر نے خاک میں ملایا ہے چنانچہ اس نے قہر آلودہ نگاہوں سے شمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ﴿ویلک لا قرب اللّٰہ دارک و قبح اللّٰہ ما قدمت به علی و اللّٰہ انی لاظنک انک نهیة ان یقبل ما کتبت به الیه الخ﴾ وائے ہو تم پر خدا تمہیں دور رکھے اور جو کچھ تم لائے ہو اسے قبیح کرے۔ میرا خیال ہے تم ہی نے ابن زیاد کو میرا مشورہ قبول کرنے سے روکا ہے۔ ﴿لا یستسلم و اللّٰہ حسینؑ ان نفس ابیه لبین جنبیه﴾ خدا کی قسم حسینؑ ہرگز سر تسلیم خم نہیں کریں گے ان کے پہلوؤں میں ان کے غیور باپ کا نفس موجود ہے۔[2] (ابن سعد کے اس کلام سے خود اس کے مکتوب کے مندرجات کی نفی اور ہمارے بیان کی تائید پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ و الفضل ما شهدت به الاعداء)۔

شمر نے کہا: ان باتوں کو چھوڑیے۔ مجھے یہ بتایئے کہ آپ حاکم کے حکم کی تعمیل کریں گے؟ بصورت دیگر زمام قیادت میرے ہاتھ میں دیجیے۔

ظاہر ہے کہ اس سے ابن سعد کی شیطانی "انا" کو ضرور ٹھیس لگتی تھی جسے برداشت کرنا ایسے متکبر مزاج سے بعید تھا چنانچہ یہ شقی ازلی قتل حسینؑ پر بالکل تیار ہو گیا۔ اور کہا: ﴿لا و لا کرامة لک و لکن اتولی ذلک فکن

---

1. تاریخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۲۷۔ تقام، ص ۳۱۹۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۳ وغیرہ۔
2. کامل، ج ۳، ص ۲۸۴۔

انت علی الرجالۃ۔ تمہیں قیادت نہیں مل سکتی۔ میں خود اس کام کو انجام دوں گا۔ البتہ میں پیادہ فوج کی سرداری تمہارے سپرد کرتا[1] ہوں۔

از آب هم مضایقه کردند کوفیان
خوش داشتند حرمت مهمان کربلا

ساتویں ماہ محرم اور خاندان نبوت پر بندش آب

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ آخر ساتویں محرم کو اس بات کی تکمیل کی گھڑی بھی آ گئی۔ جس کی عملی ابتداء دو محرم کو ہو چکی تھی۔ جب کہ ابن زیاد نے حُر کو لکھا تھا: فجعجع بالحسینؑ حین یبلغک کتابی و یقدم علیک رسولی فلا تنزله الا بالعراء فی غیر حصن و علی غیر ماء..... الخ حسینؑ کے ساتھ تشددانہ سلوک کرو۔ اور ان کو بے آب وگیاہ زمین میں اترنے پر مجبور کرو۔[2] چنانچہ حُر نے اس حکم کی تعمیل کر کے امام عالی مقام کو ایسے ہی بے آب وگیاہ مقام پر رحل اقامت ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے امام عالی مقام کو پانی حاصل کرنے میں دقت کا سامنا تو پہلے ہی کرنا پڑتا تھا مگر ساتویں محرم کو ابن زیاد کے اس دوسرے تاکیدی حکم نے جس میں یہ تصریح موجود تھی کہ "حسینؑ اور ان کے ہمراہیوں پر پانی بند کر دو۔ کیونکہ میں اسے یہود و نصاریٰ پر تو حلال کرتا ہوں مگر حسینؑ اور ان کے اہل بیت پر حرام قرار دیتا ہوں۔ خیال رکھنا ان تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچنے پائے۔" یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ چنانچہ عمر بن سعد نے اس کافرانہ حکم امتناعی کی فوری تعمیل کرتے ہوئے عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچ سو سواروں کے ساتھ نہر فرات پر بطور پہرہ دار متعین کر دیا اور ان کو تاکید کر دی کہ حسینی خیام تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچنے پائے۔ یہ شہادت حسینؑ سے تین روز پیشتر کا واقعہ ہے۔[3] لق ودق صحرا میں بندش آب کے بعد حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزہ وانصار اور بالخصوص اطفال خورد سال پر کیا قیامت گزری ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ ہر طرف سے بوجہ شدت پیاس العطش العطش کی جگر گداز آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور ساقی کوثر کا خاندان آج قطرۂ آب کے لیے ترس رہا تھا۔ اسی پہ اکتفا نہیں کی گئی۔ بلکہ دشمنانِ دین کی شماتت آمیز طعن و تشنیع اور بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ اور اس سے سرکار سید الشہداءؑ کو جو روحانی اذیت ہوتی تھی وہ بندش آب سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔

---

1. نفس المہموم، طبری، ج ۶، ص ۲۲۶۔ مقتل الحسین، ص ۲۲۸۔ (نوٹ) بعض نسخوں میں یہ فقرہ یوں وارد ہے: فان نفساً ابیۃ ... بنا بریں اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے دو پہلوؤں میں خوددار نفس موجود ہے۔ (منہ عفی عنہ)
2. طبری، ج ۶، ص ۲۳۲۔
3. تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۳۳۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۸۳۔ مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۲۴۴۔ ارشاد مفید، ص ۲۲۸ وغیرہ۔

بعض بے ادبوں کی گستاخیاں

اس قسم کے متعدد واقعات تاریخ میں ملتے ہیں کہ متعدد گستاخوں نے اس نازک مرحلہ پر گستاخانہ کلام باطل نظام کر کے آنجنابؑ کے زخموں پر نمک پاشی کی۔ (لعنة الله علیهم اجمعین) چنانچہ عمرو بن الحجاج زبیدی نے با آواز بلند کہا: ﴿یا حسینُ هذا الماء تلغ فیه الکلاب و تشرب منه خنازیر اهل السواد و الحمر و الذئاب وما تذوق منه و الله قطرة حتیٰ تذوق الحمیم فی نار الجحیم﴾ اے حسینؑ! یہ نہر فرات کا پانی ہے جسے کتے اور بیابان کے سؤر اور بھیڑیے بھی پی رہے ہیں لیکن تم اس کا ایک قطرہ بھی نہیں پی سکتے۔ یہاں تک کہ آتش جہنم میں کھولتا ہوا پانی پیو (خاک بدہن قائل)۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ ﴿فکان سماع هذا الکلام علی الحسینؑ اشد من منعهم ایاه الماء﴾ جنابؑ پر یہ کافرانہ کلام بندش آب کے صدمہ سے بھی زیادہ گراں تھا۔[1]

اسی طرح ایک اور گستاخ کا بھی طعن آمیز کلام تاریخ میں ملتا ہے۔ وہ عبداللہ بن حصین ازدی تھا۔ اس نے پکار کر کہا: ﴿یا حسینُ! الا تنظر الی الماء کانه کبد السماء والله لا تذوقون منه قطرةً واحدةً حتی تموتوا عطشاً﴾ ''اے حسینؑ! اس پانی کو دیکھ رہے ہو جو اپنی نیلگونی کی وجہ سے جگر پارۂ آسمان معلوم ہوتا ہے۔ بخدا تم اس کا ایک قطرہ بھی نہیں پی سکتے۔ یہاں تک کہ شدت پیاس سے بلک بلک کر دم توڑ دو۔'' امام عالی مقام کو اس بیہودہ کلام کے سننے سے اس قدر اذیت ہوئی کہ بارگاہ قدرت میں دست بدعا ہو کر کہا: ﴿اللّٰهم اقتله عطشاً و لا تغفر له ابداً﴾ ''پروردگار! اس ملعون کو پیاس سے قتل کر اور اس کو کبھی نہ بخش۔'' امام کی بدعا کا جو اثر ہوا۔ وہ حمید بن مسلم کی زبانی سنئے۔ وہ بیان کرتا ہے: ﴿والله لعدته بعد ذلک فی مرضه فوالله الذی لا اله غیره لقد رایته یشرب الماء حتی یبغر ثم یقئی و یصیح العطش العطش فما زال ذالک دابه حتی مات﴾ میں اس شخص کی بیمار پرسی کرنے گیا۔ اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی معبود برحق نہیں کہ میں نے دیکھا کہ وہ پیاس کی شدت سے اس قدر پانی پیتا تھا کہ پانی حلق تک پہنچ جاتا تھا پھر قئے کر دیتا۔ اور بدستور العطش العطش پکارنے لگتا۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں واصل جہنم ہو گیا۔[2]

حصول آب کی کوششیں

کتب سیر و تواریخ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی حاصل کرنے کی کئی کوششیں کی گئیں مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

---

1. وقائع ایام محرم ص ۲۷۰ بحوالہ المنتخب المذاہب سید شافعی، تذکرہ خواص الامۃ۔
2. وقائع ایام محرم ص ۲۷۰۔ عاشر بحار الانوار ص ۱۹۱۔

پہلی کوشش:۔ جب پیاس نے بہت شدت اختیار کی تو امامؑ کے اصحاب میں سے یزید بن حصین ہمدانی (یا بریر بن خضیر ہمدانی) نے خدمت امامؑ میں عرض کیا: فرزند رسولؐ! اگر اجازت ہو تو میں ابن سعد سے اس معاملہ میں کچھ گفتگو کروں۔ شاید وہ اپنی شقاوت سے باز آ جائے۔ امامؑ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ وہ ابن سعد کے پاس گیا مگر اسے سلام نہ کیا۔ پسر سعد نے کہا: اے ہمدانی! تو نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا؟ ﴿الست مسلماً اعرف اللّٰہ و رسوله﴾ کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟ کیا میں خدا اور رسولؐ کو نہیں پہچانتا؟ ہمدانی نے کہا: ﴿لو کنت مسلماً کما تقول لما خرجت الی عترة رسولؐ اللّٰہ ترید قتلهم﴾ اگر تو مسلمان ہوتا اور خدا اور رسول کو پہچانتا تو عترت رسولؐ کے قتل کے ارادہ سے یہاں نہ آتا۔ اس کے بعد اپنے حاضر ہونے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا: پسر سعد! تمہیں شرم نہیں آتی۔ ﴿فهذا ماء الفرات یشرب کلاب السواد و خنازیرها و هذا الحسین بن علی علیه السلام و اخوته و نساءه و اهلبیته یموتون عطشاً قد حلت بینهم و بین ماء الفرات ان یشربوه و تزعم انک تعرف اللّٰہ و رسوله﴾ یہ دریائے فرات کا پانی ہے جسے صحرائی سگ و خوک پی رہے ہیں لیکن یہ حسینؑ اور ان کے اہل و عیال اس کے کنارے شدتِ پیاس سے دم توڑ رہے ہیں۔ اور پھر بھی تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تو مسلمان ہے اور خدا اور رسول کو پہچانتا ہے؟ ہمدانی کا یہ کلام حقیقت ترجمان سن کر کچھ دیر کے لیے ابن سعد نے سر جھکا لیا۔ اس کے بعد بولا: ﴿واللّٰہ یا اخا همدان انی اعلم حرمة اذاهم لکن ۔ دعانی عبید اللّٰہ من دون قومه الخ﴾ اے ہمدانی! خدا کی قسم میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس خاندان کو اذیت پہنچانا حرام ہے مگر کیا کروں۔ مجھے ابن زیاد نے اس مہم کے لیے بلایا (پھر اپنے وہ کافرانہ اشعار پڑھے جس کا تذکرہ قبل ازیں[1] کیا جا چکا ہے) تاریخ میں اس شقی کا جواب بایں الفاظ مروی ہے: ﴿یا اخا همدان ما اجد نفسی تجیبنی الی ترک الرای﴾ اے ہمدانی میرا نفس مجھے علاقہ رے کے ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔[2] چنانچہ جناب بریرؓ بے نیل مرام واپس آ گئے۔

دوسری کوشش:۔ خود جناب سید الشہداءؑ نے قوم اشقیاء سے پُر زور مطالبہ کیا۔ چنانچہ سید اجل سید ابن طاؤس لکھتے ہیں: ﴿فضیقوا علی الحسینؑ حتی نال منه العطش و من اصحابه فقامؑ و اتکأ علی قائم سیفه و نادیٰ باعلیٰ صوته فقالؑ انشدکم اللّٰہ هل تعرفونی؟ قالوا نعم انت ابن رسولؐ اللّٰہ و سبطه. قال هل تعلمون جدی قالوا اللّٰهم نعم. قالؑ انشدکم اللّٰہ. هل تعلمون ان امی فاطمةؑ الزهراء بنت محمدؐ المصطفیٰ؟ قالوا اللّٰهم نعم. قالؑ انشدکم اللّٰہ هل تعلمون ان جدتی خدیجة بنت خویلد

---

1. مقتل ابو مخنف ص ۳۱۶۔ نفس المہموم ص ۱۱۶۔ ذبح عظیم ص ۲۸۵ بحوالہ مطالب السئول وغیرہ۔
2. ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۲۸۔

اوّل نساء هذه الامة اسلامًا؟ قالو: اللّٰهم نعم. قال انشدكم اللّٰه هل تعلمون ان حمزة سيّد الشهداء عمّ ابیؑ؟ قالوا اللّٰهم نعم. قالَ انشدكم اللّٰه هل تعلمون ان جعفر الطّيار فی الجنة عمی. قالوا اللّٰهم نعم. قالَ انشدكم اللّٰه. هل تعلمون ان هذا سيف رسولؐ اللّٰه انا متقلده؟ قالوا اللّٰهم نعم. قالَ انشدكم اللّٰه هل تعلمون ان هذه عمامة رسول اللّٰه انا لا بسها؟ قالوا اللّٰهم نعم. قال انشدكم هل تعلمون انّ عليًا كان اول القوم اسلاماً و اعلمهم علماً و اعظم حكما و انه ولی كل مومن و مومنة؟ قالوا اللّٰهم نعم. قال فبم تستحلون دمی و ابی صلوات اللّٰه عليه الزائب عن الحوض يزود عنه رجالاً كما يزاد البعير الصادر عن الماء ولواء الحمد فی يد ابی يوم القيامة﴾ جب امامؑ اور اصحاب امامؑ شدت پیاس سے نڈھال ہو گئے تو امام علیہ السلام تلوار کی ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور قوم اشقیاء کو یوں خطاب فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ مجھے سچ بتاؤ کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ سب نے جواب میں کہا: ہاں پہچانتے ہیں۔ آپؑ فرزند رسولؐ اور ان کے نواسے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: میں تمہیں خدا یاد دلا کر دریافت کرتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ میرے والد ہیں۔ انہوں نے کہا: ہاں ہم جانتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ میری والدہ ہیں۔ انہوں نے کہا: ہاں ہم جانتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ جناب خدیجۃ الکبریٰؑ میری جدہ ماجدہ ہیں۔ جو امت مسلمہ کی پہلی اسلام لانے والی خاتون ہیں؟ سب نے کہا: ہاں درست ہے! امامؑ نے فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جناب حمزہؑ سید الشہداءؑ میرے باپؑ کے چچا ہیں؟ جواب میں ان لوگوں نے کہا: ہاں! امامؑ نے فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جعفر طیار فی الجنۃ میرے چچا ہیں؟ سب نے کہا: ہاں! امامؑ نے فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہ جناب رسولؐ خدا والی تلوار اس وقت میں حمائل کئے ہوئے ہوں؟ سب نے کہا: ہاں ہم جانتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: میں تم کو خدا یاد دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ اسوقت میں جو عمامہ باندھے ہوئے ہوں یہ جناب رسولؐ خدا کا عمامہ ہے؟ سب نے کہا: ہاں۔ امامؑ نے فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں مجھے سچ بتاؤ کیا تم جانتے ہو کہ میرے والد ماجد وہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اظہار اسلام کیا۔ جو تمام لوگوں سے بڑے عالم اور از روئے حلم سب سے عظیم ہیں۔ تمام مومنین و مومنات کے مولا و آقا ہیں۔ سب نے کہا: ہاں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ اس وقت امامؑ نے فرمایا: اگر تم یہ سب کچھ جانتے ہو۔ تو پھر کس طرح میرے خون بہانے کو حلال سمجھتے ہو؟ حالانکہ کل بروز قیامت میرے پدر عالی قدر کچھ لوگوں کو اس طرح حوض کوثر سے دور لے جائیں گے جس طرح اونٹ کو مشرع سے دور کیا جاتا ہے اور فردائے قیامت کو لواء الحمد میرے

ہی والد کے ہاتھ میں ہوگا۔

امام علیہ السلام کے اس ناقابل رد احتجاج واستدلال کا اثر ان ملاعین پر یہ ہوا کہ آخر میں جواب دیا: ﴿وقد علمنا ذلک کله و نحن غیر تارکیک حتی تذوق الموت عطشاً﴾ جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک آپ بحالت پیاس شربت موت نوش نہ کر لیں۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ جب جناب سید الشہداء نے یہ خطبہ دیا اور ظالموں نے یہ جواب دیا اور آنجناب کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنا تو انہوں نے نالہ وشیون اور گریہ وبکا کی آواز بلند کی۔ امام الصابرینؑ نے اپنے بھائی حضرت ابوالفضل عباسؑ اور شہزادے علی اکبرؑ کو خیام میں بھیجا کہ وہ بی بیوں کو تسلی دے کر خاموش کریں کیونکہ ابھی ان کے رونے کے لیے کافی وقت پڑا ہے۔"[1]

دوبار خیام حسینؑ میں پانی کا پہنچنا

یہ حقیقت ناقابل انکار حد تک تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ بندش آب کی اس پوری مدت میں دو بار کچھ پانی خیام حسینی تک پہنچا ہے۔ ایک مرتبہ آنجنابؑ نے باعجاز امامت اس کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔ اور دوسری بار سقائے بنی ہاشم اور ان کے چند مخلص رفقائے کار کی جدوجہد سے اطفال اہل بیتؑ کی نخل تمنا بار آور ہوئی ہے۔ ان ہر دو واقعات کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے۔

(۱) جب امام حسینؑ اور ان کے اعزہ واصحاب پر شدت پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو اس وقت آنجنابؑ نے ایک بیلچہ لیا۔ اور اپنے خیام سے بجانب قبلہ انیس (۱۹) قدم کے فاصلہ پر بیلچہ سے زمین کو تھوڑا سا کھودا۔ اچانک پانی کا سرد و شیریں چشمہ برآمد ہوا۔ آنجنابؑ اور آپ کے سب ہمراہیوں نے پیا اور چند مشکیں بھی پُر کیں۔ اس کے بعد اس چشمہ کا وہاں نام ونشان تک نہ رہا۔[2]

اس واقعہ کی نسبت صاحب "مواعظ حسنہ" صفحہ ۲۱۰ (طبع سیوم) پر قمطراز ہیں: "کیسا تعجب کا مقام ہے کہ سیراب کنندۂ عالم، باعث نجات عالم، فرزند ساقی کوثر قطرۂ آب کو محتاج رہے۔ اور دنیا سے پیاسا ہی جائے۔ ششم محرم الحرام یا ہفتم کو جب نہر سے پانی کی قطعاً بندش ہوگئی تو حضرت نے خیمہ گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر حکم دیا کہ یہاں زمین کھودی جائے۔ وہاں سے ایک چشمۂ آب جاری ہوا۔ تقریباً پچاس مشک پُر کیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ نویں اور

---

[1] لہوف، ص ۷۵، ۷۶۔

[2] عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۰۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۲۸۔ نفس المہموم، ص ۱۱۶۔ مقتل الحسین، ص ۲۲۱۔ تظلم زہرا، ص ۳۱۴۔ ماتمین علامہ کنتوری، ج ۱، ص ۳۰۳۔

دسویں کو وہ چشمۂ آب کہاں گیا۔ جو بچے ایک ایک بوند کو ترستے تھے اور پانی نہ ملتا تھا۔ اس دن وہ چشمہ کیوں نہ ظاہر ہوا۔"[1]

تعجب ہے کہ جاسوسوں نے اس قدر مختصر واقعہ کی اطلاع بھی ابن زیاد کو دے دی۔ چنانچہ اس نے یہ اطلاع ملنے پر اس مضمون کا ایک مکتوب عمر بن سعد کو لکھا: ﴿اما بعد بلغنی ان الحسینؑ یحفر الآبار و یصیب الماء فیشرب ھو و اصحابہ فانظر اذا ورد علیک کتابی ھذا فامنعھم من حفر الآبار ما استطعت و ضیق علیھم ولا تدعھم یذوقوا الماء و افعل بھم کما فعلوا ابا لزکی عثمان﴾ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ حسینؑ کنوئیں کھودتے ہیں۔ خود بھی پانی پیتے ہیں اور اپنے اصحاب کو بھی پلاتے ہیں۔ دیکھو جب میرا یہ خط پہنچے۔ تو ان کو حتی الامکان کنوئیں کھودنے سے بھی روک دو۔ اور پوری کوشش کرو کہ وہ پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پی سکیں۔ جیسا کہ عثمان کے ساتھ کیا گیا تھا۔[2]

(۲) جب پیاس نے بہت شدت اختیار کی اور حضرت امام حسینؑ نے اپنے اہل بیت اطہار و اصحاب اخیار کی نازک حالت دیکھی۔ تو جناب ابو الفضل عباسؑ کو تیس سوار و بیس پیادہ اور بیس مشکیں دے کر پانی لانے کے لیے روانہ کیا۔ نافع بن ہلال بجلی آگے آگے تھے۔ جب نافع نہر میں داخل ہوا تو عمرو بن حجاج زبیدی نے آواز دی۔ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ نافع نے اپنا نام و نسب بتاتے ہوئے کہا: تمہارا چچازاد بھائی نافع ہوں۔ پانی لینے آیا ہوں۔ عمرو نے کہا: بڑی خوشی سے لے سکتے ہو۔ نافع نے کہا: نہیں بخدا۔ جب تک حسینؑ اور ان کے اہل و عیال پیاسے ہیں۔ میں ایک قطرہ بھی نہیں پی سکتا۔ اس اثناء میں عمرو نے دیکھ لیا کہ کئی آدمی مشکیزے ہاتھ میں لئے پانی لینا چاہتے ہیں۔ اس نے نافع سے کہا: کہتے تو تم سچ ہو۔ مگر ہمیں اسی کام پر مامور کیا گیا ہے۔ کہ خیام حسینیؑ تک پانی کا ایک قطرہ نہ پہنچنے دیں۔ نافع نے اس کی بات کی کوئی پروانہ کی۔ اور پیادہ کو حکم دیا کہ پانی میں داخل ہو کر مشکیں پُر کر لو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت عمرو بن حجاج نے اپنے فوجیوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ادھر حسینیؑ سپاہ نے بھی جوابی کارروائی کی۔ بالخصوص قمر بنی ہاشمؑ جو اس مختصر جماعت کی حفاظت کے لیے ہی ہمراہ گئے تھے، نے وہ جوہر شجاعت دکھائے کہ دشمنوں کو راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی سلامتی نظر آئی۔ اس کے باوجود ان کے کئی آدمی واصل جہنم ہوئے۔ مگر حسینیؑ سپاہ کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ اور وہ پانی کے بیس مشکیزے لے کر سلامتی کے ساتھ خیام میں پہنچ گئے۔ اسی

---

[1] مواعظ حسنہ، ص ۳۱۰، مولانا سید محمد سبطین صاحب مرحوم۔

[2] بحار، ج ۱۰، ص ۱۹۰۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۳۸۔ مقتل، ص ۱۳ وغیرہ۔

وقت سے جناب ابوالفضلؑ کا لقب سقاء مشہور ہوا۔[1] لیکن ظاہر ہے کہ امام عالی مقامؑ کے اہل وعیال اور ان کے اعوان وانصار کے لیے جو شب عاشوراء تک کافی تعداد میں تھے۔کل بیس مشکیں کہاں تک کافی ہو سکتی تھیں؟ اور ان سے کہاں تک شدت پیاس میں کمی ہو سکتی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ بایں ہمہ مورخین متفق ہیں کہ خیام حسینیؑ سے العطش العطش کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ اور امامؑ کے تمام اعزّہ وانصار اور آنجنابؑ سمیت قطرۂ آب کے لیے ترس ترس کر شہید ہوئے۔ رضوان اللّٰہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نویں محرم کے واقعات

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں: ﴿تاسوعا یوم حوصر فیہ الحسین علیہ السلام و اصحابہ رضی اللّٰہ عنہم بکربلاء و اجتمع علیہ خیل اہل الشام و اناخوا علیہ و فرح ابن مرجانۃ و عمر بن سعد بتوافر الخیل و کثرتہا و استضعفوا فیہ الحسین علیہ السلام و اصحابہ و ایقنوا انہ لا یاتی الحسینؑ علیہ السلام ناصر و لا یمدّہ اہل العراق بابی المستضعف الغریب﴾ نویں محرم کا دن وہ دن تھا جس میں امام حسینؑ اور ان کے اصحابؓ کربلا کے اندر پوری طرح زرغۂ اعداء میں گھر گئے تھے۔ اور سپاہ شام جمع ہو گئی تھی۔ اور ابن مرجانہ (عبید اللہ ابن زیاد) اور عمر بن سعد اپنی کثرت سپاہ کی وجہ سے خوش وخرم تھے۔ اور امام حسینؑ اور ان کے اصحابؓ کو کمزور سمجھ رہے تھے۔ اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب امام حسینؑ کا کہیں سے کوئی ناصر و مددگار نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی اہل عراق ان کی امداد کریں گے۔ میرا باپ قربان ہو جائے اس کمزور مسافر پر۔[2]

چنانچہ کثرت سپاہ کے گھمنڈ اور مادی طاقت وقوت کے نشہ سے سرشار ہو کر عمر بن سعد نے نویں محرم کو عصر کے بعد یہ کہہ کر ﴿یا خیل اللّٰہ ارکبی و بالجنۃ ابشری﴾ (اے خدا کے سوارو! سوار ہو جاؤ اور تم کو جنت کی بشارت ہو)۔[3] خیام حسینیؑ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس وقت امام حسین علیہ السلام دروازۂ خیام کے سامنے قبضۂ تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی حالت میں آنکھ لگ گئی۔ جب جناب شریکۃ الحسینؑ زینب

۱۔ بحار، ج ۱۰، ص ۱۹۰۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۳۸۔ مقتل، ص ۲۶۵۔ نفس المہموم، ص ۱۱۷۔ مقتل الحسین، ص ۲۲۳۔ ذبح عظیم، ص ۲۸۳،۲۸۴، صاحب مواعظ حسنہ نے بھی صفحہ ۲۶۷ طبع سیوم میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ نفس المہموم، ص ۱۲۰۔

۳۔ مقتل، ص ۳۲۱ وغیرہ۔

عالیہ نے ہتھیاروں کی جھنکار، گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اور فوجوں کا شور و شغب سنا تو اپنے بھائی سید الشہداءؑ کے قریب آکر کہا۔ ﴿اما تسمع الاصوات قد اقتربت!﴾ بھائی جان! آپؑ یہ آوازیں نہیں سن رہے جو قریب ہیں؟ امامؑ عالی مقام نے سر بلند کیا۔ اور فرمایا: ﴿رایت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و الہٖ الساعة فی المنام فقال لی انک تروح الینا﴾ میں نے جناب رسول خدا کو خواب میں دیکھا ہے کہ مجھ سے فرما رہے ہیں۔ تم عنقریب ہماری طرف آ رہے ہو۔ سید بن طاؤس کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿یا اختاہ انی رأیت الساعة جدی محمداً و ابی علیاً و امی فاطمةً و اخی الحسنَ وھم یقولون یا حسینُ انک رائح الینا عن قریب وفی بعض الروایات غداً﴾[1] بہن میں نے ابھی ابھی اپنے جد نامدارؐ، پدرؑ بزرگوار، مادرؑ گرامی وقار اور برادرؑ عالی مقدار کو خواب میں دیکھا ہے۔ جو مجھ سے فرما رہے تھے کہ اے حسینؑ تم شام کو ہماری طرف آ رہے ہو۔ اور بعض روایات کی بنا پر یوں فرمایا: ''تم کل ہماری طرف آ رہے ہو۔'' (وھو صحیح علی الظاھر)۔ امام حسینؑ کا یہ کلام حقیقت ترجمان سن کر جناب زینبؑ عالیہ نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ امام علیہ السلام نے ان کو تسکین و تسلی دی۔ اور صبر و سکون کی تلقین فرمائی۔ اس کے بعد جناب ابوالفضل عباسؑ سے فرمایا: ﴿ارکب انت یا اخی حتیٰ تلقاھم و تقول لھم ما لکم وما بدا لکم و تسئالھم عما جاءھم؟﴾ بھائی جان! سوار ہو کر ان کے پاس جاؤ۔ اور ان سے اس وقت چڑھ آنے کا سبب معلوم کرو؟ چنانچہ جناب قمر بنی ہاشمؑ بیس سواروں کے ساتھ جن میں جناب زہیر بن قین اور حبیب بن مظاہر (مظہر) بھی تھے۔ قوم جفاکار کے پاس تشریف لے گئے اور جا کر ان سے اس وقت اس طرح آنے کا سبب پوچھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حاکم (ابن زیاد بدنہاد) کا حکم نامہ آیا ہے کہ ہم تمہیں انکے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو کہیں۔ پس اگر آپ منظور کر لیں۔ تو فبہا ورنہ فوراً آپ سے فیصلہ کن جنگ کریں۔ جناب عباسؑ نے فرمایا: ٹھہرو! میں جا کر سب صورت حال امامؑ کے گوش گزار کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: ہاں ضرور جائیں۔ اور ان کو تازہ صورت حال سے آگاہ کریں۔ اور پھر جو کچھ فرمائیں۔ اس کی ہمیں بھی اطلاع دیں۔

چنانچہ جناب عباسؑ نے خدمت امامؑ میں حاضر ہو کر حقیقت حال گوش گزار کی۔ اور ان کی آمد و رفت تک جناب حبیب اور جناب زہیر اشقیاء سے مخاطبہ فرماتے رہے۔ اور ان کو قتل امامؑ سے باز رکھنے کے لیے وعظ و پند کرتے رہے۔ ﴿ولا کن لا تغنی الایات و النذر عن قوم لا یؤمنون﴾ اسی گفتگو کے ضمن میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب جناب زہیر ان کو وعظ و نصیحت کر رہے تھے تو عزرہ بن قیس نے ان سے کہا: ﴿یا زھیر ما کنت عندنا من شیعة اھل ھذا البیت انما کنت عثمانیا؟﴾ اے زہیر ہم تو تمہیں اس خاندان کا شیعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ تم تو عثمانی تھے!

---

[1] ملہوف۔

جناب زہیر نے جواب دیا: ﴿افلست تستدل بموقفي هذا اني منهم﴾ کیا میرے یہاں کھڑے ہونے سے تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ میں انہی کے شیعوں میں سے ہوں۔[1] (اس سوال و جواب سے انصار امامؑ اور ان کے مخالفین کے مذہب پر خاصی روشنی پڑتی ہے فتدبر)۔ بہرکیف امام علیہ السلام نے شہزادہ سے فرمایا: ﴿ارجع اليهم فان استطعت ان تؤخرهم الى غدوة و تدفعهم عنا العشية لعلنا نصلي لربنا الليلة و ندعوه و نستغفره فهو يعلم اني كنت احب الصلوة له و تلاوة كتابه و كثرة الدعا و الاستغفار﴾ واپس جاؤ اور ہو سکے تو ان کو کل تک مؤخر کرو تاکہ ہم آج رات (دل کھول کر) نماز، دعا اور استغفار کر لیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنے، تلاوت قرآن کرنے اور بکثرت دعا و استغفار کرنے سے کس قدر محبت ہے۔ (دعا ہے کہ خداوند عالم امام حسینؑ کے نام لیواؤں کو بھی یہ شوق و ذوق عبادت عطا فرمائے) چنانچہ جناب ابوالفضلؑ نے واپس جا کر مخالفین کو اس بات پر آمادہ کر لیا۔ واپسی پر عمر بن سعد نے یہ پیغام دے کر اپنا قاصد بھی خدمت امامؑ میں بھیجا کہ ہم آپؑ کو کل تک مہلت دیتے ہیں۔ اگر آپؑ نے سر تسلیم خم کر دیا تو ہم آپؑ کو اپنے امیر عبیداللہ بن زیاد کے پاس لے چلیں گے۔ اور اگر آپؑ اپنے انکار پر تلے رہے۔ تو پھر ہم آپؑ کو چھوڑ نہیں سکتے۔[2] یعنی ضرور جنگ کریں گے۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ امام عالی مقام کو ایک رات کی مہلت دینے میں عمر بن سعد نے پہلے کچھ پس و پیش کی۔ جس پر عمرو بن حجاج زبیدی نے اس سے کہا: تمہیں شرم نہیں آتی۔ اگر ہماری ترک و دیلم کے کفار سے بھی جنگ ہوتی اور وہ ایک رات کی مہلت مانگتے تو ضرور ہم ان کو مہلت دے دیتے۔ اور یہ تو فرزند رسولؐ ہیں۔ جو صرف ایک رات کی مہلت طلب کر رہے ہیں۔ اس پر عمر بن سعد شرمندہ ہوا اور مہلت دے دی۔[3]

شبِ عاشورا کے واقعات

شبِ عاشوراء اہل بیت رسولؐ کے لیے سخت ترین راتوں میں سے ایک رات تھی جو مختلف شدائد و مصائب سے گھری ہوئی تھی۔ شدید خطروں کا الارم بج رہا تھا۔ ظاہری اسباب حیات منقطع ہو چکے تھے۔ مخدرات کو اپنے شوہروں، بھائیوں، بیٹوں اور عزیزوں کی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ اور آنے والے محن و آلام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس لیے ان کا قلق و اضطراب ایک فطری امر تھا۔ اسی طرح شدت پیاس سے نڈھال اطفال خورد سال کا گریہ و بکا بھی ایک لازمی تقاضا تھا۔ جو بڑوں کے لیے سوہان روح تھا۔

---

[1] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۳۷۔ نفس المہموم، ص ۱۲۱۔

[2] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۱۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۸۔

[3] مقتل الحسینؑ، ص ۲۳۲۔ مقام، ص ۳۲۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۳۶ وغیرہ۔

ایک رات کی مہلت لینے کے مصالح

سرکار سید الشہداء نے بڑی کوشش کر کے شب عاشوراء کی جو مہلت طلب فرمائی تھی اس میں کئی مصلحتیں اور حکمتیں پوشیدہ تھیں۔

پہلی مصلحت:۔ سب سے بڑی مصلحت تو وہی تھی جس کا خود آنجناب نے اظہار بھی کر دیا تھا کہ دل کھول کر پروردگار عالم کی عبادت کر سکیں۔ اور بکثرت دعا واستغفار کر لیں۔ چنانچہ امام حسینؑ اور ان کے اعزہ وانصار نے شب عاشوراء جس طرح عبادت واستغفار میں گزاری۔ اس کا نقشہ مؤرخین نے ان لفظوں میں کھینچا ہے: ﴿فقام اللیل کلہ یصلّی و یستغفر و یدعو و یتضرع و قام اصحابہ کذلک یصلّون و یدعون و یستغفرون فباتوا ولھم دویٌّ کدوّی النحل مابین راکع و ساجد و قائم و قاعد الخ﴾ جناب سید الشہداء نے تمام رات نماز، دعا و پکار اور تضرع واستغفار میں گزاری۔ اور یہی کیفیت اصحاب حسینؑ کی تھی۔ خیام حسینیؑ سے تسبیح وتہلیل کی یوں بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی جیسے شہد کے چھتہ سے بھنبھناہٹ کی آواز آتی ہے۔ کوئی رکوع میں تھا۔ کوئی سجود میں۔ کوئی قیام میں تھا تو کوئی قعود میں۔[1] الغرض ع

زمین جگمگا اٹھی، وہ دل سے کیں عبادتیں

دوسری مصلحت:۔ اس مہلت کے طلب کرنے میں دوسری مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام علیہ السلام اپنے ہمراہیوں میں سے کسی کو تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ صورت حال کو واضح کر کے ان کو اپنے عزم وارادہ کا امتحان لینے کا موقع دینا چاہتے تھے تاکہ جو جانا چاہے وہ ابھی چلا جائے اور جو باقی رہے اور ساتھ دے۔ وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام کی روایت کے مطابق آنجنابؑ نے شب عاشوراء اپنے تمام اعزہ واحباب کو جمع کر کے یہ خطبہ ارشاد فرمایا: ﴿اُثنی علی اللّٰہ احسن الثناء و احمدہ علی السّراء و الضّراء اللّٰھم انی احمدک علی ان اکرمتنا بالنبوۃ و علّمتنا القرآن و فقّھتنا فی الدّین و جعلت لنا اسماعًا و ابصارًا و افئدۃً فاجعلنا من الشاکرین اما بعد فانّی لا اعلم اصحاباً اوفیٰ ولا خیراً من اصحابی ولا اھل بیتٍ ابرّ ولا اوصل من اھل بیتی فجزاکم اللّٰہ عنی خیراً. الا و انی لا اظن یوماً لنا من ھؤلاء. الا و انی قد اذنت لکم فانطلقوا جمیعاً فی حل لیس علیکم حرج منی ولا ذمام ھذا اللّیل قد غشیکم فاتخذوہ جملاً. ثم لیاخذ کل رجل منکم بید رجل من اھلبیتی ثم تفرّقوا فی سوادکم و مدائنکم حتّٰی یفرّج اللّٰہ فان القوم انما یطلبونی فلو قد اصابونی لَلَھوا عن طلب غیری﴾ میں

---

[1] بحار، ج ۱۰، ص ۱۹۲۔ نفس المہموم، ص ۱۲۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۰۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۶۔

خدا کی بہترین حمد و ثنا اور رنج و راحت (ہر حال) میں اس کی بہترین حمد کرتا ہوں۔ یا اللہ! میں تیری حمد کرتا ہوں۔ کہ تو نے ہمارے خاندان کو نبوت کی عزت بخشی۔ ہمیں علم قرآن عطا فرمایا۔ دین میں بصیرت مرحمت فرمائی۔ اور گوش شنوندہ چشم بینندہ اور دل دانندہ کرامت فرمایا۔ امابعد میں اپنے اصحاب سے زیادہ وفادار اور بہتر اصحاب کسی کے نہیں جانتا۔ اور نہ اپنے اعزہ و اقارب سے زیادہ نیکوکار اور صلۂ رحمی کرنے والے کسی کے عزیز و اقرباء کو جانتا ہوں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے جزائے خیر دے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری جنگ ان لوگوں سے ضرور ہوگی میں تم سب کو بطیب خاطر اجازت دیتا ہوں اور تم سے بیعت کا بوجھ اٹھائے لیتا ہوں۔ رات تاریک ہے اسے سواری بنا کر جہاں جی چاہے وہاں چلے جاؤ۔ نہ صرف خود جاؤ بلکہ تم میں سے ہر شخص میرے اعزا و اقارب میں سے ایک ایک شخص کا ہاتھ بھی پکڑ کر ہمراہ لیتا جائے۔ کیونکہ ان لوگوں کو صرف میری طلب ہے۔ جب مجھے پالیں گے (اور شہید کر دیں گے) تو پھر کسی اور سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔[1] بعض آثار غیر معتبرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کے اس اعلان کے بعد کئی کمزور ارادہ و ایمان والے لوگ امام کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ اور صرف آپؑ کے قرابت دار اور مخلص اصحاب جبدار باقی رہ گئے۔[2]

جناب امام حسینؑ کا یہ خطبہ سن کر سب سے پہلے جناب شہزادہ ابوالفضل عباسؑ اٹھے۔ اور خدمت امامؑ میں عرض کیا: ﴿ولم نفعل؟ لنبقی بعدک؟ لا اَرانا اللّٰہ ذلک ابداً﴾ ''ہم ایسا کیوں کریں؟ محض اس لیے کہ آپؑ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا ہمیں یہ دن کبھی نہ دکھائے۔'' ان کے بعد جنابؑ کے دوسرے بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں نے بھی متفق اللفظ ہو کر ایسا ہی ایمان افروز جواب دیا۔ اس کے بعد امام عالی مقامؑ نے اولاد عقیلؑ کو بالخصوص خطاب کر کے فرمایا: ﴿یا بنی عقیلؑ حسبکم من القتل بمسلم فاذھبوا انتم فقد اذنت لکم!﴾ اے اولاد عقیلؑ تمہارے لیے شہادت مسلمؑ کافی ہے۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ تم چلے جاؤ۔ انہوں نے جو جواب باصواب دیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا: ﴿لا واللّٰہ لا نفعل ذلک ولکن نفدیک انفسنا و اموالنا و اھلینا و نقاتل معک حتی نرد موردک فقبح اللّٰہ العیش بعدک!﴾ نہیں بخدا۔ ہم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے بلکہ ہم اپنی جانیں، اپنے مال اور اپنے اہل و عیال سب آپؑ پر قربان کریں گے۔ اور آپؑ کے ہمراہ ہو کر جنگ کریں گے۔ تا کہ جو انجام آپؑ کا ہو۔ وہی ہمارا ہو۔ بُرا کرے خدا اس زندگانی دنیا کا جو آپؑ کے بعد ہو۔[3]

---

[1] ارشاد، ص ۲۵۱۔ حاشیہ بحار الانوار، ص ۱۹۱۔ نفس المہموم، ص ۱۲۱۔ مقتل الحسین، ص ۲۳۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۵۔

[2] ناسخ، ج ۶، ص ۲۳۷۔ اسرار الشہادت، ص ۲۲۷، ۲۲۸ وغیرہ۔

[3] ارشاد، ص ۲۵۱۔ بحار الانوار، ص ۱۹۱۔ نفس المہموم، ص ۱۲۱۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۸ وغیرہ۔

بنی ہاشم کے اظہار وفاداری وعزم شہادت وغمگساری کے بعد اصحاب حسینؑ نے یکے بعد دیگرے امامؑ کو بڑے جرأت مندانہ اور والہانہ انداز میں اپنی نصرت اور ہر قسم کی قربانی کا یقین دلایا۔ چنانچہ سب سے پہلے جناب مسلم بن عوسجہؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ﴿انحن نخلی عنک وبما نعتذر الی اللّٰہ فی اداء حقک! اما واللّٰہ لا افارقک حتی اطعن فی صدورھم برمحی. و اضربھم بسیفی، ما ثبت قائمہ فی یدی، ولو لم یکن معی سلاح اقاتلھم بہ لقذفتھم بالحجارۃ حتی اموت. معک﴾ کیا ہم آپؑ کا ساتھ چھوڑ دیں؟ پھر خدا کی بارگاہ میں کیا عذر پیش کریں گے؟ خدا کی قسم میں ہرگز اس وقت تک آپؑ سے جدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک اپنا نیزہ ان کے سینوں میں اس قدر نہ ماروں کہ وہ ٹوٹ جائے۔ پھر تلوار سے لڑوں گا۔ جب تک اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں رہے گا اور جب کوئی ہتھیار لڑنے کے قابل نہ رہا۔ تو پھر ان کو پتھر ماروں گا۔ حتیٰ کہ اس طرح لڑتے لڑتے آپ کی معیت و رفاقت میں اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کر دوں۔

پھر جناب سعید بن عبداللہ حنفیؓ نے کہا: ﴿واللّٰہ لا نخلیک حتی یعلم اللّٰہ انا قد حفظنا غیبۃ رسولہ فیک اما واللّٰہ لو قد علمت انی اقتل ثم احیٰ ثم احرق ثم احیی ثم احرق حیا ثم اذری یفعل ذلک بی سبعین مرۃ ما فارقتک حتی القی حمامی دونک و کیف لا افعل ذلک و انما ھی قتلۃ واحدۃ ثم ھی الکرامۃ التی لا انقضاء لھا ابداً﴾ ”بخدا ہم ہرگز آپؑ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک بارگاہ ایزدی میں اپنے کردار سے ثابت نہ کر دیں کہ ہم نے آپ کے بارے میں رسول خداؐ کے غائبانہ حق کو ادا کر دیا ہے۔ خدا کی قسم! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں قتل کیا جاؤں گا۔ پھر دوبارہ زندہ ہوں گا۔ بعد ازاں زندہ جلایا جاؤں گا۔ پھر میری راکھ ہوا میں اڑا دی جائے گی۔ اور ستر بار میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ تب بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑتا۔ بھلا اب کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ جبکہ یقین ہے کہ صرف ایک مرتبہ قتل ہونا ہے۔ اور اس کے بعد وہ ابدی عزت و کرامت حاصل ہو گی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔“

ان کے بعد جناب زہیر بن القینؓ نے کہا: ﴿واللّٰہ لوددت انی قتلت ثم نشرت ثم قتلت حتی اقتل ھکذا الف مرۃ و ان اللّٰہ عزوجل یدفع بذلک القتل عن نفسک و عن انفس ھؤلاء الفتیان من اھلبیتک!﴾ ”خدا کی قسم میں اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ میں قتل کیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں۔ حتیٰ کہ ہزار بار میرے ساتھ یہی سلوک کیا جائے۔ اور خداوند عالم میرے اس قتل و قتال کی وجہ سے آپ کی جان عزیز اور آپ کے عزیز نوجوانوں کی عزیز جانیں بچالے۔“

بعد ازاں دوسرے اصحاب نے انہی کے ساتھ ملتے جلتے الفاظ میں اپنی اپنی ہمدردیوں اور جاں نثاریوں کا

اظہار کیا۔ امام عالی مقامؑ نے اپنے تمام انصار و اعوان کو جزائے خیر کی دعا دی اور اندر خیام میں تشریف لے گئے۔[1]

لـلـّٰـہ درّھـم مـن فتیۃ صبـروا ۔۔۔ ما ان رأیت لھم فی الناس امثالاً

تلک المکارم لا قعبان من لبن ۔۔۔ شیبا بماء فصارا بعد ابوالاً

بعض روایات میں وارد ہے کہ جب امام عالی مقامؑ نے اصحاب کا امتحان لیا۔ اور جانے والے جا چکے اور کامیاب ہونے والے کامیاب ہو گئے۔ اور بعد ازاں آنجنابؑ خیام میں تشریف لے گئے۔ تو جناب زینبؑ عالیہ نے دریافت کیا۔ بھائی جان! کیا آپؑ نے اپنے باقی ماندہ اصحاب کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ عین حالتِ جنگ میں ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں؟ امام نے بہن کو تسلی دی کہ میں نے اچھی طرح ان کے حالات کا جائزہ لے لیا ہے۔ وہ تائید حق میں میرے ساتھ موت سے اس طرح مانوس ہیں جیسے بچہ ماں کے سینہ سے مانوس ہوتا ہے۔ جناب نافع بن ہلال در خیمہ پر بھائی اور بہن کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے اصحاب کے پاس جا کر کہا: تم یہاں آرام سے بیٹھے ہو حالانکہ بنت زہراؑ کو تمہاری وفاداریوں پر یقین نہیں ہے۔ چلو اور بی بی عالم کو اپنی وفاداری کا جا کر یقین و اطمینان دلاؤ۔ یہ سن کر جناب حبیب بن مظاہر اور دوسرے اصحاب باصفا در خیمہ پر حاضر ہوئے۔ اور بڑے زور دار الفاظ کے ساتھ بنات رسول کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔ بی بیوں نے روتے اور دعائے خیر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ایھا الطیبون حاموا عن بنات رسول اللّٰہ و حرائر امیر المؤمنین ﴾ "اے پاکیزہ نفس صحابیو! بنات نبیؐ و علیؑ کی حمایت و حفاظت تمہارے ذمہ ہے۔"

امامؑ اصحاب کو جنت میں ان کے مکانات دکھاتے ہیں

جب اعزا و اصحاب اس ابتلا و آزمائش میں پورے اترے اور امام عالی مقامؑ نے اچھی طرح ان کا امتحان لے لیا۔ تو ان کو شہادت کی بشارت دیتے ہوئے جنت میں ان کے مقامات عالیہ ان کو دکھا دیئے۔ چنانچہ کتاب الخرائج راوندی و علل الشرائع، (ج ۱، ص ۲۱۸) صدوقؒ میں حضرت امام زین العابدینؑ سے مروی ہے کہ جب شب عاشوراء امامؑ نے اصحاب سے بیعت اٹھالی۔ اور ان کو جانے کی اجازت دے دی۔ مگر انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو آنجنابؑ نے ان سے فرمایا: ﴿انکم تقتلون غدا ولا یفلت منکم ﴾ "تم سب کے سب کل شہید کر دیئے جاؤ گے۔ اور تم میں سے کوئی شخص بھی زندہ نہیں بچے گا۔" اس وقت اصحاب نے کہا: ﴿الحمد للّٰہ الذی شرفنا بالقتل معک ﴾ خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں آپؑ کی معیت میں جان قربان کرنے کا شرف عطا فرمایا ہے

---

[1] ارشاد، ص ۲۵۲۔ طبری، ج ۳، ص ۲۳۹۔ عاشر بحار، ص ۱۹۲۔ نفس المہموم، ص ۱۲۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۵۔

[2] الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۲۵ وغیرہ۔

اس کے بعد امامؑ نے ان سے فرمایا: ﴿ارفعوا رؤسکم و انظروا فجعلوا ینظرون الی مواضعهم و منازلهم من الجنة وهو یقول لهم هذا منزلک یا فلان..... الخ﴾ ”(آسمان کی طرف) سر بلند کرو اور دیکھو (اس وقت حجاب ہٹ گئے) اور انہوں نے جنت الفردوس میں اپنے اپنے منازل دیکھ لئے۔ امامؑ ایک ایک صحابی کو اس کی منزل دکھاتے اور فرماتے اے فلاں یہ تیرا مقام ہے۔ اے فلاں یہ تیری منزل ہے۔“ یہی وجہ تھی کہ روز عاشورا شمع حسینیؑ کے جانباز پروانے دیوانہ وار نیزے، تیر اور تلواریں اپنے مونہوں اور سینوں پر کھاتے تھے۔ تا کہ جلد از جلد جنت کے اندر اپنی منزل میں پہنچ جائیں۔[1]

بعض روایات میں وارد ہے کہ جس وقت امام عالی مقام اپنے اعزا و اعوان کو شہادت کی بشارت دے رہے تھے تو جناب شہزادہ قاسم بن حسنؑ نے عرض کیا: ﴿و انا فیمن یقتل؟﴾ عم معظم! کیا میں بھی ان (خوش نصیب) لوگوں میں داخل ہوں جو جام شہادت نوش کریں گے؟ امامؑ نے از راہ مہر و محبت پوچھا: ﴿یا بنیّ کیف الموت عندک؟﴾ بیٹا! تمہارے نزدیک موت کیسی ہے؟ شہزادہ نے برجستہ جواب دیا: ﴿یا عمّ احلی من العسل﴾ عم بزرگوارا (تائید حق اور آپؑ کی نصرت میں) موت مجھے شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت امامؑ نے فرمایا: ﴿ای واللّٰه فداک عمک انک لاحد من یقتل من الرجال معی بعد ان تبلو ببلاء عظیم و ابنی عبد اللّٰه﴾ ہاں بخدا تیرا چچا تجھ پر نثار ہو جو لوگ شہید ہوں گے ان میں سے بڑے ابتلاء و آزمائش کے بعد تم بھی شربت شہادت پیو گے۔ بلکہ میرا بیٹا عبداللہ (معروف بعلی اصغرؑ) بھی۔ شہزادہ قاسمؑ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: ﴿یا عم و یصلون الی النساء حتّٰی یقتل عبد اللّٰه وهو رضیع﴾ کیوں چچا جان! کیا ظالم خیام میں مستورات تک پہنچ جائیں گے۔ کہ شیر خوار عبداللہ شہید ہوگا؟ اس وقت امامؑ نے شہزادے کی شہادت کی پوری تفصیل بیان کی۔ کہ جب شدت پیاس سے میرا دم نکل رہا ہوگا۔ اور میرا بچہ بلک رہا ہوگا۔ اس وقت میں خیام میں جاؤں گا۔ اور شہزادے کو ہمراہ لے کر میدان کارزار میں قوم جفا کار سے پانی کا مطالبہ کروں گا۔ اور وہ پانی کے عوض اسے تیر ستم کا نشانہ بنا کر شہید کر دیں گے۔“[2]

تیسری مصلحت:۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امامؑ چاہتے ہوں کہ مخالف ایک رات اور مزید سوچ بچار کر لیں۔ اور دین یا دنیا میں سے جسے اختیار کرنا ہے۔ اسے مکمل غور و فکر کے بعد اختیار کر لیں۔ شاید کچھ سعید روحیں باطل سے کنارہ کشی کر کے ان کے دامن حق کے ساتھ متمسک ہونے کی سعادت حاصل کر لیں۔ چنانچہ جناب حرؑ کا فوج

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۲۳۔ مقتل الحسینؑ، ص ۲۳۶۔

[2] نفس المہموم، ص ۱۲۳۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۳۶۔

مخالف سے کٹ کر خدمتِ امامؑ میں تائب ہو کر حاضر ہونا اور نصرتِ امام میں جامِ شہادت نوش کرنا تو معلوم ہی ہے۔
ان کے علاوہ سید اجل سید بن طاؤس علیہ الرحمۃ کے بیان کے مطابق شبِ عاشوراء کو بتیس آدمی لشکر مخالف سے چھٹ کر امام عالی مقامؑ کے قدموں میں آ گئے۔ اور اصحاب حسینؑ میں داخل[1] ہو گئے۔ امامؑ کے اپنے مقصد میں کامیابی کی یہ ایک بڑی دلیل ہے۔

چوتھی مصلحت:۔ ممکن ہے اس مہلت کے طلب کرنے میں امام (علیہ السلام) کا یہ مقصد بھی پیش نظر ہو کہ نظر بظاہر اسباب حرب و ضرب کی کچھ تیاری بھی کر لی جائے۔ اور امکانی حد تک حفاظتِ خود اختیاری کی عملی تدابیر اختیار کر لی جائیں۔ چنانچہ شبِ عاشوراء اس سلسلہ میں سید الشہداءؑ نے دو کام کیے۔

(۱) اصحاب کو حکم دیا کہ خیموں کو اس طرح باہم ملا دیں کہ ہر خیمہ کی طناب دوسرے خیمہ کے ساتھ باندھ دیں۔[2]

(۲) پشت خیام کی طرف خندق کھدوا کر اس میں لکڑیاں جمع کرا دیں۔ اور صبح عاشوراء ان کو آگ لگا دی گئی۔ تاکہ مخالف پشت خیام کی طرف سے حملہ نہ کر سکے۔ بلکہ صرف سامنے کی طرف سے ہی مقابلہ کرے۔[3]

شبِ عاشوراء کا ایک خاص واقعہ

حضرت امام زین العابدینؑ روایت کرتے ہیں کہ میں شبِ عاشوراء بستر بیماری پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور میری پھوپھی جناب زینبؑ عالیہ میرے پاس تیمارداری کے لیے تشریف فرما تھیں۔ اس اثناء میں میرے والد ماجد (حضرت امام حسین (علیہ السلام)) علیحدہ اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ (جو میرے خیمہ کے قریب تھا) اس وقت جناب ابوذر غفاری کا غلام حوی[4] (اور بروایتے جون[5]) بھی آپؑ کی خدمت میں موجود تھا۔ جو آپؑ کی تلوار کی جلا اور اس کی اصلاح کر رہا[6] تھا (اور بروایتے خود آنجنابؑ یہ کام انجام دے رہے[7] تھے)۔

اس وقت آنجنابؑ یہ اشعار پڑھ رہے تھے ؎

---

[1] لہوف، ص ۸۲، نفس المہموم، ص ۱۲۹۔
[2] ارشاد، ص ۲۵۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۳۰ وغیرہ۔
[3] طبری، ج ۶، ص ۲۴۱۔ نفس المہموم، ص ۱۲۳۔ مقتل الحسین، ص ۲۳۰۔
[4] ارشاد، ص ۲۵۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۵۔
[5] مقاتل الطالبین، ص ۸۲، (وھو الصحیح)۔
[6] ارشاد، ص ۲۵۳۔ نفس المہموم، ص ۱۳۳۔
[7] لہوف، ص ۷۱۔ مقتل الحسینؑ، ص ۲۳۹۔

یا دھر اف لک من خلیل　　　　کم لک بالاشراق و الاصیل

(من باب المجاز زمانہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں) اے دہر کج رفتار وائے ہو تجھ پر۔ تو کس قدر بُرا دوست ہے تیرے ہاتھوں صبح وشام کس قدر

من طالب و صاحب قتیل　　　　والدھر لا یقنع بالبدیل

طالب حق اور ساتھی قتل کئے جاتے ہیں۔ اور تو (اے زمانہ) بدل وعوض پر قناعت نہیں کرتا (بلکہ اصل مطلوب کو ہی مارتا ہے)

و کلّ حیّ سالک سبیل　　　　ما اقرب الوعد من رحیل

ہر زندہ اس راہ (موت) پر چلنے والا ہے۔ جس پر میں چل رہا ہوں۔ دنیا سے کوچ کرنے کا وعدہ کس قدر جلدی آ گیا۔

و انما الامر الی الجلیل

تمام معاملات کی باگ ڈور رب جلیل کے قبضۂ قدرت میں ہے۔"

جب پدر بزرگوارؑ نے دو تین باران اشعار کا تکرار کیا تو میں سمجھ گیا کہ مصیبت نازل ہو چکی ہے۔ میں تو صبر کر کے چپ ہو رہا۔ مگر جب میری پھوپھی نے امامؑ کے یہ اشعار سنے تو چونکہ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں۔ اس لیے پھوپھی جان تاب ضبط نہ لا سکیں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھیں۔ درآنحالیکہ آپ کی چادر کا دامن زمین پر خط دیتا جا رہا تھا۔ اور سیدھی بھائی کے خیمہ میں پہنچ کر بڑی بے چینی کے ساتھ بھائی کی خدمت میں عرض کیا: ﴿یا اخی ھذا کلام من ایقن بالموت!﴾ بھائی جان! ایسا کلام تو وہ شخص کرتا ہے جسے اپنی موت کا یقین ہو۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿نعم یا اختاہ!﴾ ہاں بہن حقیقت یہی ہے۔ امام کا یہ جواب سن کر بی بی اور بیتاب ہو گئیں۔ کہا: ﴿ واثکلاہ لیت الموت اعدمنی الحیوۃ الیوم ماتت امی فاطمۃؑ و ابی علیؑ و اخی الحسنؑ یا خلیفۃ الماضین و ثمال الباقین!﴾ ہائے۔۔۔ کاش آج موت میری شمع حیات کو گل کر دیتی۔ اے جانشین رفتگان وجائے پناہ زندگان۔ میں سمجھتی ہوں آج ہی میری ماں فاطمۃؑ زہراء، بابا علی مرتضیٰؑ اور بھائی حسن مجتبیٰؑ کی موت واقع ہوئی ہے۔ بی بی کی یہ بے تابی دیکھتے ہوئے پدر گرامی نے تسلی کے انداز میں بہن سے فرمایا: ﴿یا اختی لا یذھبن حلمک الشیطان﴾ پیاری بہن! بے صبری نہ کرو! مگر بہن کی یہ حالت دیکھ کر آپؑ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ﴿ترقرقت عیناہ بالدموع﴾ آبدیدہ ہو کر فرمایا: ﴿لو ترک القطا لیلاً لنام﴾ اگر قطا (نامی پرندہ) کو رات کے وقت چھوڑ دیا جاتا تو وہ سو جاتا۔ (مطلب یہ تھا کہ اگر ہمیں نانا کی امت آرام سے بیٹھنے دیتی) تو ہم سکھ کا سانس لیتے۔ مگر اب ناممکن ہے)

یہ سن کر پھوپھی اماںؑ نے ہمہ تن سوال بن کر پوچھا: ﴿یا ویلتاہ افتغصب نفسک اغتصاباً فذلک اقرح لقلبی و اشد علی نفسی﴾ ہائے افسوس (بھائی جان) کیا آپؑ مجھ سے چھین لیے جائیں گے؟ یہ بات تو اور بھی میرے دل کو مجروح کرنے والی۔ اور مجھ پر سخت گراں ہے۔ یہ کہا اور پھر تاب و ضبط نہ رہی۔ ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا۔ اور گریباں چاک کر دیا۔ بعد ازاں غش کھا کر گر گئیں۔ والد ماجد نے اٹھ کر بہن کو افاقہ میں لانے کی کوشش کی۔ جب طبیعت ذرا سنبھلی۔ تو فرمایا: ﴿یا اختاہ تعزّی بعزاء اللّٰہ و اعلمی ان اھل الارض یموتون و ان اھل السماء لا یبقون و ان کل شی ھالک الا وجہ اللّٰہ الذی خلق الخلق بقدرتہ و یعث الخلق و یعیدھم وھو فرد وحدہٗ جدّی خیر منی و ابیؑ خیر منّی و اخی خیر منّی. لکلّ مسلم برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و الہٖ اسوۃ الخ﴾ بہن! صبر و ضبط سے کام لو۔ یقین رکھو۔ سب اہل زمین مر جائیں گے۔ اور اہل آسمان بھی ہمیشہ زندہ نہ رہیں گے۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ سوائے ذات احدیت کے جس نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ اور پھر اپنی قدرت کے ساتھ انہیں دوبارا اٹھائے گا۔ وہ ذات و صفات میں واحد و یگانہ ہے۔ میرا نانا مجھ سے بہتر تھا۔ میرا باپؑ مجھ سے بہتر تھا۔ اور میرا بھائی مجھ سے بہتر تھا (جب وہ دار دنیا سے اٹھ گئے تو میں کیوں کر ہمیشہ یہاں رہ سکتا ہوں)۔ ہر مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی سیرت میں تقلید و تاسی کے نمونے ہیں۔ امامؑ نے اس قسم کے کلمات کے ساتھ بہن کو تسلی دی۔ اور پھر فرمایا: ﴿یا اختی انی اقسمت علیک فابری قسمی لا تشقی علیّ جیباً ولا تخمشی علی وجھا ولا تدعی علی بالویل و الثبور اذا انا ھلکت﴾ بہن میں تمہیں قسم دیتا ہوں۔ میری قسم کو پورا کرنا کہ جب میں شہید ہو جاؤں تو نہ مجھ پر گریبان چاک کرنا۔ نہ منہ نوچنا۔ اور نہ واویلا کرنا۔ بعد ازاں والد معظم پھوپھی جانؑ کو میرے پاس لائے۔ اور ان کو وہاں بٹھا کر خود اصحاب کے پاس تشریف لے گئے۔[1] اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

(ایضاح) بعض کوتاہ اندیش حضرات امامؑ کی اس وصیت کو مراسم عزاء کے خلاف بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ یہ ممانعت صرف تسکین و تسلی کی خاطر فرمائی گئی ہے۔ امام علیہ السلام نے دیکھا کہ جس شخصیت نے میرے بعد قافلہ کا سالار بننا ہے جب اس کی یہ حالت ہے کہ صرف میری شہادت کی خبر سن کر غش کھا رہی ہیں تو میری شہادت کے بعد ان کی کیا حالت ہوگی؟ اور اگر ان کی یہ کیفیت ہوئی تو اطفال خورد سال کا کیا حال ہوگا؟ جیسا کہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اس قسم کے مواقع پر بزرگ اپنے عزیزوں کو ایسے تسلی آمیز کلمات کہا کرتے ہیں۔

---

[1] ارشاد، ص ۲۵۲، ۲۵۳۔ عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۲۔ تتمہ نزخار، ص ۳۲۵۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۱۹۔ نفس المہموم، ص ۱۲۴۔ لہوف، ص ۴۳۔ ذبح عظیم، ص ۳۲۸، طبع قدیم۔ مقتل الحسین، ص ۲۳۹ وغیرہ۔

◆ اکیسواں باب ◆

روزِ عاشوراء[1]

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اور ان کے اعزّہ و اعوان کی بے مثال قربانیاں

شب عاشوراء اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی۔ اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا۔ حضرت امام حسینؑ نے اصحاب و اقرباء کے ساتھ نماز صبح بجماعت ادا کی۔ ... نماز جس کے تعقیبات میں کربلا کا جہاد تھا۔[2]

بہرحال صبح عاشوراء ہر قسم کے قلق و اضطراب کے ساتھ نمودار ہوئی۔ وہ صبح جسے ابتدائے آفرینش سے لے کر فردائے قیامت تک ہر طلوع کرنے والی صبح پر شرف و فوقیت حاصل ہے وہ صبح عاشورا تھی یا صبح قیامت؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے ؎

گر خوانمش قیامتِ صغریٰ بعید نیست!

---

[1] روز عاشوراء اہل بیتِ رسولؐ اور ان کے نام لیواؤں کے لیے بڑے رنج و آلام کا روز ہے۔ اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام اس روز بہت گریہ و بکاء فرماتے تھے اور شعار حزن و ملال قائم کرتے تھے۔ اور اسے تمام ایام غم و عزا پر فوقیت دیتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن فضل ہاشمی حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے: ﴿یابن رسول اللہ کیف صار یوم عاشوراء یوم مصیبة و جزع و بکاء﴾ یوم عاشوراء کیونکر حزن و ملال کا دن قرار پایا ہے؟ آپ نے فرمایا: ﴿ان یوم الحسین علیه السلام اعظم مصیبة من جمیع سائر الایام و ذلک ان اصحاب الکساء الذین کانوا اکرم الخلق علی اللہ عزوجل کانوا خمسة فکان ذهابه کذهاب جمیعهم کما کان بقائه کبقائهم جمیعهم فلذلک صار یومه اعظم الایام مصیبة﴾ (وقائع ایام محرم، ص ۳۷۰) امام حسینؑ کی شہادت کا دن تمام ایام سے زیادہ باعث غم ہے۔ کیونکہ اصحاب کساء پانچ افراد تھے جو تمام خلق خدا سے خدا کے نزدیک زیادہ مکرم و معظم تھے۔ ان سے امام حسینؑ آخری فرد تھے۔ لہٰذا ان کا دنیا سے چلا جانا مثل تمام اصحاب کساء کے جانے کے تھا جس طرح ان کی بقاء تمام کی بقاء کے قائم مقام تھی۔

حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿ان یوم الحسین اقرح جفوننا و اسبل دموعنا و اذل عزیزنا بارض کرب و بلاء و اورثنا الکرب و البلاء الی یوم الانقضاء فعلی مثل الحسین علیه السلام فلیبک الباکون فان البکاء علیه یحط الذنوب العظام. ثم قال کان ابی اذا دخل شهر المحرم لم یر ضاحکاً و کانت الکآبة تغلب علیه حتی یمضی منه عشرة ایام فاذا کان یوم العاشوراء کان ذلک الیوم یوم مصیبة و حزنه و بکائه و یقول هو الیوم الذی قتل فیه الحسین﴾ (نفس المہموم، ص ۴۱) [بقیہ صفحہ نمبر ۳۱۶ پر]

[2] شہید انسانیت، ص ۳۶۹۔

اس صبح نے یہ انوکھا و نرالا منظر بھی دیکھا کہ ایک طرف تیس ہزار کے لشکر جرار کا سیل بے کراں اسلحۂ جنگ سے لیس، مادی طاقت و قوت کے نشہ سے سرشار اور چور چور، خونخوار درندوں کو مات کر رہا ہے اور دوسری طرف مٹھی بھر نجابت و متانت اور شرافت و انسانیت کے پیکر بھوکے اور پیاسے انسان واجب الاحترام امام عالی مقام کی نصرت اور دین اسلام کی حمایت، حق کے احقاق اور باطل کے ابطال یعنی حق کا بول بالا و باطل کا منہ کالا کرنے کے لیے جذبۂ شہادت سے سرشار، قوت ایمانی سے مثل سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے سینہ تان کر اور اہل باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے سکینہ و وقار کے ساتھ اذن جہاد کے منتظر کھڑے ہیں۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آہ وہ ریگستانی میدان، وہ آفت کی گرمی، وہ بلا کی دھوپ اور پانی کی بندش۔ گویا کربلا کا میدان عرصۂ محشر کا نمونہ تھا بلکہ اس سے زیادہ ہولناک، کیونکہ قیامت کے دن لوگ جس کی بدولت سایۂ رحمت کے امیدوار ہوں گے اور جس کے تصدق میں ساقی کوثر سے پانی پئیں گے۔ وہ کربلا کی تابستانی مصیبت اور پیاس کی شدت اٹھا رہا تھا اور اہل بیت رسالت کا ہر چھوٹا بڑا تشنگی سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ خیمۂ مبارک میں ہر سمت العطش العطش کے نعرے بلند تھے۔ عابدؑ بیمار اور اصغرؑ شیر خوار کی حالت کسی سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔[1]

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ۳۱۵]

امام حسینؑ کے دن (یوم عاشوراء) نے ہماری آنکھوں کو زخمی کر دیا ہے اور ہمارے آنسوؤں کو بہا دیا اور زمین کربلا میں ہمارے عزیز کو ذلیل کر کے قیامت تک ہمیں حزن و ملال دے دیا۔ رونے والوں کو حسینؑ جیسے مظلوم امام پر رونا چاہیے کیونکہ ان پر رونا بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ پھر فرمایا: جب ہلال محرم نمودار ہو جاتا تھا تو میرے والد کو کوئی شخص ہنستے ہوئے نہیں دیکھتا تھا اور روز عاشوراء تو ان کے لیے خاص گریہ و بکاء کا دن ہوتا تھا۔

عبداللہ بن سنان بیان کرتے ہیں کہ میں بروز عاشوراء حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ﴿فالفیتہ کاسف اللون ظاھر الحزن و دموعہ تنحدر عن عینیہ کاللؤلؤ المتساقط﴾ دیکھا آپ کا رنگ متغیر ہے۔ حزن و ملال ظاہر ہے اور آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح ٹپک رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: ﴿یابن رسول اللہ مما ابکی اللہ عینیک؟﴾ آپ کیوں گریہ فرما رہے ہیں۔ ﴿فقال اوفی غفلۃ انت ما علمت ان الحسین بن علی علیھما السلام اصیب فی مثل ھذا الیوم﴾ امام نے فرمایا: کیا تم اس بات سے غافل ہو کہ آج کے دن ہی امام حسینؑ شہید ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا: آج کے روزہ کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرمایا: ﴿صمہ من غیر تبییت و افطرہ من غیر تشمیت ولا تجعلہ یوم صوم کملاً و لیکن افطارک بعد صلوٰۃ العصر بساعۃ علی شربۃ من ماء فانہ فی مثل ذلک الوقت تجلت الھیجا عن آل رسول اللہ الخ﴾ بغیر نیت صوم کے نماز عصر تک فاقہ کریں۔ (وقائع ایام محرم، ص ۳۷۲، بحوالہ عاشر بحار و مصباح طوسی) لہٰذا ان احادیث شریفہ کی روشنی میں مومنین کرام کو چند عمل بجا لانے چاہئیں۔

---

[1] ذبح عظیم، ص ۳۲۸، بحوالہ الہلال الکبین، ص ۶۰۔

[بقیہ صفحہ نمبر ۳۱۷ پر]

بہرکیف عمر بن سعد نے اس طرح اپنے لشکر کو مرتب کیا کہ میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی، میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن، سواروں پر عزرہ بن قیس احمسی، اور پیادوں پر شبث بن ربعی کو افسر مقرر کر کے علم اپنے غلام درید کے حوالہ کیا۔[۱]

ادہر امام عالی مقام نے اپنی مختصری جماعت کو بایں طور ترتیب دے کر میمنہ پر زہیر بن قین، میسرہ پر حبیب بن مظاہر کو افسر مقرر کر کے علمدار جناب شہزادہ ابوالفضل العباس کو مقرر فرمایا۔[۲]

لشکر مخالف کی تعداد کس قدر تھی؟

قبل اس کے کہ روز عاشوراء کے اصل حالات لکھے جائیں۔ یہاں اس امر کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے کہ لشکر مخالف کی تعداد کس قدر تھی؟ اور سپاہ امام کی تعداد کس قدر؟

سو پہلے امر کے متعلق مخفی نہ رہے کہ اہل سیر و تواریخ میں شدید اختلاف ہے۔ جس کی مختصر کیفیت مندرجہ ذیل بیانات سے بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ٣١٦]

(١) مجالس عزا کا انعقاد کریں اور دل کھول کر گریہ و بکاہ کریں۔ یہ عمل بہترین عبادت اور بخشش گناہان کا بہترین ذریعہ ہے۔ (٢) اس روز جب مؤمن آپس میں ملیں تو یہ کلمات تعزیت کہیں جو کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہیں۔ ﴿عظم اللّٰه اجورنا و اجورکم بمصابنا بالحسین و جعلنا و ایاکم من الطالبین بثارہ مع ولیہ المھدی من ال محمد علیھم السلام﴾ (کامل الزیارہ ص ١٧٥)۔ (٣) زیارت عاشورہ پڑھیں اور دوسرے وہ اعمال بجالائیں جو کتب عبادات مثل مفاتیح الجنان، زاد المعاد اور مصباح المتہجد وغیرہ میں مذکور ہیں۔ (۴) بغیر روزہ کی نیت کے فاقہ رکھیں اور عصر کے بعد غروب آفتاب سے ٢ گھنٹہ ٢٨ منٹ کے پہلے سادہ غذا اور پانی کے ساتھ فاقہ شکنی کریں۔ (۵) اس روز بغیر کسی اشد ضرورت کے کوئی دنیوی کاروبار نہ کریں اور نہ مال و دولت جمع کر کے ذخیرہ اندوزی کریں۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے، فرمایا: ﴿من ترک السعی فی حوائجہ یوم عاشوراء قضی اللّٰه لہ حوائج الدنیا و الاخرۃ ومن کان یوم عاشوراء یوم مصیبتہ و حزنہ و بکائہ جعل اللّٰه عزوجل یوم القیامۃ یوم فرحہ و سرورہ و قرت بنا فی الجنان عینہ ومن سمی یوم عاشوراء یوم برکۃ و ادخر فیہ لمنزلہ شیئاً لم یبارک لہ فیما ادخر و حشر یوم القیامۃ مع یزید و عبید اللّٰه بن زیاد و عمر بن سعد لعنھم اللّٰه فی اسفل درک من الجحیم﴾ (نفس المہموم، ص ٢١)۔ (٦) قاتلان حسینؑ اور ان کے اقرباء و اصحاب کے قاتلوں پر بکثرت لعنت کریں۔ کم از کم ایک ہزار بار یہ ورد کریں: ﴿اللّٰھم العن قتلۃ الحسین و اصحابہ﴾۔ (٧) ہر قسم کی ہنسی و مذاق سے بھی اجتناب کریں۔ (٨) ہر قسم کی اچھی خوراک کھانے سے اور پوشاک پہننے سے اجتناب کریں۔ (٩) قمیص وغیرہ کے بٹن کھول دیں۔ آستین الٹ دیں۔ سر و پیشانی پر قدرے خاک یا راکھ ڈالیں غرضیکہ اہل حزن و ملال والی شکل بنائیں۔ (١٠) ان تمام مظاہر غم کی روح رواں یہ بات ہے کہ حسینی کردار و رفتار اختیار کریں اور یزیدی افعال سے اجتناب کرنے کا عزم کریں اور اس کا اپنی زندگی میں عملی ثبوت پیش کریں۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔ (منہ عفی عنہ)

---

[۱] تاریخ طبری، ج ٦، ص ٢٤١۔ نفس المہموم، ص ١٢٧ وغیرہ۔

[۲] عاشر بحار، ص ١٩٢۔ لہوف، ص ٨٨۔ نفس المہموم، ص ١٢٦۔ تاریخ، ج ٦، ص ٢٤٢۔ طبری، ج ٦، ص ٢٤١۔

[۳] منتخب التواریخ، ص ٢٢٨۔

(۱) چھ ہزار (تذکرہ خواص الامہ سبط ابن جوزی)۔ (۲) بیس ہزار (لہوف سید بن طاؤس و تاریخ اعثم کوفی)۔ (۳) بائیس ہزار (مرآۃ الجنان یافعی، مطالب السئول، روضۃ الشہداء)۔ (۴) تیس ہزار (عاشر بحار۔ ناسخ التواریخ وغیرہ)۔ (۵) پینتیس ہزار (مناقب شہر ابن آشوب)۔ (۶) پچاس ہزار (شرح شافیہ ابی فراس)۔ (۷) اکیاون ہزار (ناسخ التواریخ)۔ (۸) اسی ہزار (مقتل ابی مخنف ازدی)۔

یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئے کہ بعض نے ایک لاکھ بعض نے دو لاکھ، بعض نے تین لاکھ، بعض نے آٹھ لکھ اور بعض نے نو لاکھ تک لکھ دیا۔ ان سب کی تفصیل مفصل موجب طوالت ہے۔ آقائے دربندی اس مبالغہ میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ ان کا قول ہے کہ میدان کربلا میں چھ لاکھ سوار اور دو کروڑ پیادے جدال وقتال کے واسطے موجود تھے۔[1] ان تمام اقوال میں سے (جو اکثر افراط وتفریط پر مشتمل ہیں) جس قول کو اکثر علماء محققین نے اختیار کیا ہے اور جس کو ارشاد معصومؑ کی تائید بھی حاصل ہے وہ یہ ہے کہ لشکر مخالف کی تعداد تیس ہزار تھی۔ عام اہل علم یا اہل تاریخ کے اقوال کی اس وقت تک وقعت ہوتی ہے جب تک قول معصوم معلوم نہ ہو۔ یا جب تک وہ اقوال ارشاد معصومؑ سے متصادم نہ ہوں مگر جب ارشاد معصوم مل جائے تو پھر ظاہر ہے کہ وہی حجت ہوگا اور اس کے بالمقابل دوسرے اقوال وآراء کی ہرگز کوئی قدر وقیمت نہیں ہوگی۔ یہی مذہب شیعہ کا طغرائے امتیاز ہے کہ وہ قول معصومؑ کے بالمقابل کسی بڑے سے بڑے عالم یا مؤرخ کے بیان کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔ بنابریں اس سلسلہ میں جب حضرت امام زین العابدینؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد موجود ہے کہ لشکر مخالف کی مجموعی تعداد تیس ہزار تھی تو پھر اس کے بعد دوسرے اقوال کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔[2] لہٰذا ماننا پڑے گا کہ فوج مخالف کی تعداد تیس ہزار ہی تھی۔

سپاہِ حسینیؑ کی تعداد کس قدر تھی؟

باقی رہی دوسرے امر کی تحقیق کہ امام عالی مقام کے انصار واعوان کی تعداد کس قدر تھی؟ اس میں بھی شدید اختلاف ہے۔ (۱) مشہور ومعروف یہ ہے کہ کل تعداد بہتر تھی۔ بایں تفصیل ۳۲ سوار اور ۴۰ پیادے (حیات القلوب، مقتل عوالم، ارشاد شیخ مفیدؒ، کامل ابن اثیر، اخبار الدول، فتوح البلدان بلاذری، روضۃ الواعظین وغیرہ)۔ (۲) ۳۳ سوار، ۴۰ پیادے۔ کل تعداد تہتر (اعلام الوریٰ شیخ ابو علی طبرسی)۔ (۳) کل تعداد ستتر (۷۷) یا ساٹھ (حیوۃ الحیوان، دمیری)۔ (۴) اٹھہتر (۷۸) (فصول مہمہ ابن صباغ مالکی)۔ (۵) بیاسی (۸۲) (مرآۃ الجنان یافعی الدمعۃ

---

[1] مجاہد اعظم، ج ۱، ص ۱۹۸۔

[2] عاشر بحار، ص ۱۹۳۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۲۵۔ نفس المہموم، ص ۱۱۵۔ منتخب التواریخ، ص ۲۳۳۔

السا کبہ۔ مطالب السئول)۔ (۶) اکسٹھ (۶۱) (اثبات الوصیۃ۔ (۷) بتیس (۳۲) سوار، ۸۲ پیادے، کل ۱۱۴ (مقتل محمد بن ابی طالب)۔ (۸) ۴۰ سوار، ۱۰۰ پیادے، کل ۱۴۰ (تاریخ طبری)۔ (۹) ۴۵ سوار، ۱۰۰ پیادے، کل ۱۴۵ (لہوف سید ابن طاؤس)۔ (۱۰) ۷۰ سوار، ۱۰۰ پیادے، جملہ ۱۷۰ (تذکرہ خواص الامت)۔ (۱۱) ایک ہزار (شرح شافیہ ابی فراس)۔[1] (۱۲) کل ۳۳۴ تھے (فرسان الہیجاء)۔

اقوال و آراء کا یہ مختصر سا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے۔ جہاں تک روایات اہل بیتؑ کا تعلق ہے۔ ان سے نویں قول (۱۴۵) کی تائید ہوتی ہے۔ یہ روایات جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہیں۔[2] لہٰذا اسے قبول کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

صاحب ناسخ التواریخ مذکورہ بالا تمام تفصیلات لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ﴿همانا آنچه من بنده از این استقراء و استیعاب بدست کردم انستکه سپاه امام حسینؑ از یکصد و چهل و پنج تن بزیادت نبوده. و لشکر ابن زیاد از بیست هزار کم تر نبوده و اگر پذیرائی روایات مختلفه شویم منتهائی پذیرائی پنجاه و یکزار است چه من بنده نام سر هنگان و شمار لشکری که در تحت فرمان هر یك بوده مرقوم داشتم. لکن از اجتهاد بنده چنان بر می آید که ابن زیاد پنجاه و یکزار تن لشکر را عرض داد و سرهنگان را بگماشت و از پس یکدیگر روان می داشت اما افزون از سی هزار کس حاضر کربلا نشد. چون حسین علیه السلام شهید شد حاجت بدیگران نیفتاد والعلم عند الله﴾[3]

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ میدانِ کربلا میں فوج مخالف بیس ہزار سے کم اور تیس ہزار سے زیادہ نہ تھی اور سپاہ حسینیؑ کی تعداد ایک سو پینتالیس سے زیادہ نہ تھی۔ واللہ العالم و علمه اتم و اکمل۔

جب مخالف کا ٹڈی دل لشکر پرے جما کر کھڑا ہو گیا۔ اور ادھر امام کا جو تعداد کمتر و بعظمت بہتر لشکر بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مقابلۂ اہل باطل کے لیے ڈٹ گیا تو امام عالی مقام نے بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہو کر یہ دعا پڑھی۔

---

[1] مقتل الحسین، ص ۲۵۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۳۴۔

[2] عاشر بحار، ص ۱۹۲۔ لہوف، ص ۸۸۔ نفس المہموم، ص ۱۲۶۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۳۴۔

[3] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۳۵ طبع جدید۔

مخفی نہ رہے کہ اس دعائے مبارک کے راوی حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ہیں۔[1]

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ ثِقَتِیْ فِیْ کُلِّ کَرْبٍ وَ اَنْتَ رَجَائِیْ فِیْ کُلِّ شِدَّۃٍ وَ اَنْتَ لِیْ فِیْ کُلِّ اَمْرٍ نَزَلَ بِیْ ثِقَۃٌ وَ عُدَّۃٌ کَمْ مِنْ ھَمٍّ یَضْعُفُ فِیْہِ الْفُؤَادُ وَ تَقِلُّ فِیْہِ الْحِیْلَۃُ وَ یَخْذُلُ فِیْہِ الصَّدِیْقُ وَ یَشْمُتُ فِیْہِ الْعَدُوُّ اَنْزَلْتُہٗ بِکَ وَ شَکَوْتُہٗ اِلَیْکَ رَغْبَۃً عَمَّنْ سِوَاکَ فَفَرَّجْتَہٗ عَنِّیْ وَ کَشَفْتَہٗ وَ کَفَیْتَہٗ فَاَنْتَ وَلِیُّ کُلِّ نِعْمَۃٍ وَ صَاحِبُ کُلِّ حَسَنَۃٍ وَ مُنْتَھٰی کُلِّ رَغْبَۃٍ۔

بعض بے دینوں کی گستاخیاں اور سزا پائیاں

جیسا کہ شب عاشوراء کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔ حضرت سید الشہداءؑ نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر اپنے خیام کے تین جانب (دائیں، بائیں اور عقب) خندق کھدوا کر اسے لکڑیوں سے بھروا دیا تھا۔ اب صبح ہوتے ہی اس میں آگ روشن کرا دی۔ ابن سعد کے فوجی امام عالی مقام کے خیام کے ارد گرد گھومتے اور یہ منظر دیکھتے تھے۔ اسی اثناء میں شمر بن ذی الجوشن ملعون اسلحۂ جنگ سے لیس ہو کر وہاں سے گزرا۔ اور بآواز بلند امامؑ کو خطاب کرکے یہ گستاخانہ بلکہ کافرانہ جملہ کہا: ﴿یا حسین! اتعجلت بالنار قبل یوم القیامۃ﴾ اے حسینؑ! قیامت کی آگ سے پہلے آگ روشن کرنے میں جلدی کی ہے۔ (خاک بدہن قائل) امامؑ نے اس کا یہ کلام نافرجام سن کر فرمایا: ﴿من ھذا کانہ شمر بن ذی الجوشن؟﴾ یہ کون ہے؟ شاید شمر ہے؟ اصحاب نے عرض کی ہاں وہی ہے! امامؑ نے اس سے فرمایا: ﴿یابن راعیۃ المعزی انت اولی بھا منّی صلیاً﴾ او بکریاں چرانے والی عورت کے بیٹے! تو آگ کا مزہ چکھنے کا زیادہ سزاوار ہے۔ جناب مسلم بن عوسجہ نے چاہا کہ اس ملعون کو تیر کا نشانہ بنائے۔ مگر امامؑ نے اسے روک دیا۔ ابن عوسجہ نے عرض کی: فرزند رسولؐ! یہ فاسق دشمن خدا اور بڑا زبردست جابر و سرکش ہے۔ اور اس وقت میرے تیر کی زد میں ہے۔ آپ مجھے نہ روکیں تو میں اسے اس کے کیفر کردار تک پہنچا دوں۔ مگر مصلحت شناس امامؑ نے یہ سمجھ کر کہ ابتداء جنگ کا الزام آپ پر عائد نہ ہو۔ یہ فرما کر اسے منع فرمایا کہ ﴿فانی اکرہ ان ابداھم بقتال﴾ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میری طرف سے جنگ کی ابتداء ہو۔[2]

اس کے بعد ایک اور خبیث نے اپنی شقاوت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ابن ابی جویریہ مزنی تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر خندق کے کنارے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور اس منظر کو بنظر تعجب دیکھ کر یوں کفر آمیز کلمے کہنے شروع کئے۔ ﴿یا حسینؑ و یا اصحاب الحسین! ابشروا بالنار فقد تعجلتموھا فی الدنیا﴾ اے حسین و اصحاب حسین! تمہیں آتش

---

[1] ارشاد، ص ۲۵۳۔ نفس المہموم، ص ۱۲۷۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۳۔

[2] ارشاد، ص ۲۵۳۔ نفس المہموم، ص ۱۲۷۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۲ وغیرہ۔

دوزخ کی بشارت ہو۔ کہ تم نے دنیا ہی میں اس کے حاصل کرنے میں جلدی کی ہے (خاک بدہن قائل باد) امام نے دریافت کیا: یہ کون ہے؟ عرض کیا گیا کہ ابن ابی جویریہ ہے۔ امام نے فرمایا: ﴿اتعیّرنی بالنار و انا قادم علی رب کریم﴾ کیا تو مجھے آتش دوزخ کا طعنہ دیتا ہے؟ حالانکہ میں تو کریم و رحیم پروردگار کی بارگاہ میں جا رہا ہوں۔ اس کے بعد بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: ﴿اللّٰھم اذقہ عذاب النار فی الدنیا﴾ بارالٰہا! اسے دنیا میں عذاب آتش کا ذائقہ چکھا۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ ادھر امام نے بددعا کی اور ادھر اس شقی کے گھوڑے نے بدکنا شروع کیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ ملعون زین سے زمین پر اس طرح گرا کہ اس کی ایک ٹانگ رکاب میں اٹک گئی۔ اس حالت میں گھوڑے نے اسے خندق میں لا ڈالا۔ جہاں آگ روشن تھی اور وہ ملعون جل کر خاکستر ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اصحاب حسینؑ نے فرحت و انبساط کے عالم میں کہا: ﴿یا من دعوۃ ما اسرع اجابتھا﴾ سبحان اللہ یہ دعا کس قدر جلد قبول ہوئی ہے۔[1]

بعض کتابوں میں ایک اور گستاخ کا واقعہ بھی ملتا ہے۔ اور وہ ہے تمیم بن الحصین الفزاری، اس بدبخت نے امام عالی مقام اور ان کے اصحاب ذی شان کو خطاب کرتے ہوئے یوں اپنی خباثت و شقاوت کا اظہار کیا۔ ﴿یا حسین و یا اصحاب الحسین اما ترون الی ماء الفرات یلوح کانہ بطون الحیات و اللّٰہ لا ذقتم منہ قطرۃ حتی تذوقوا الموت جزعا﴾ اے حسین و اصحاب حسین! کیا آپ فرات کو دیکھ رہے ہو جو شکم مار کی طرح روشن و رواں ہے؟ خدا کی قسم تم اس کا ایک قطرہ بھی نہیں پی سکتے۔ حتیٰ کہ اسی تشنگی کی حالت میں آب مرگ پیو۔ امام نے اس کا یہ گستاخانہ کلام سن کر دریافت کیا: یہ کون ہے؟ اصحاب نے عرض کیا: تمیم بن حصین ہے! امامؑ نے فرمایا: ﴿ھذا و ابوہ من اھل النار اللّٰھم اقتل ھذا عطشا فی ھذا الیوم﴾ یہ اور اس کا باپ دونوں جہنمی ہیں۔ اس کے بعد بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: بارالٰہا! اس کو آج ہی پیاس سے ہلاک کر۔ اس بدعا کا یہ اثر ہوا کہ وہ ملعون اسی وقت شدت پیاس میں کچھ اس طرح گرفتار ہوا کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکا۔ گر پڑا اور بلک بلک کر زیر سم آسپاں دم توڑ دیا۔[2] لعنۃ اللہ علیھم اجمعین۔

---

[1] تاریخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۲۸۔ و مجمع الزوائد للہیثمی، ج ۹، ص ۱۹۳۔ لواعج الاشجان، ص ۱۰۰۔ کامل ابن الاثیر، ج ۴، ص ۲۷۔ کامل میں اس ملعون کا نام عبداللہ بن حوزہ تمیمی لکھا ہے۔ نیز کامل میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسروق بن وائل حضرمی یہ اعجاز امام دیکھ کر لشکر ابن سعد سے علیحدہ ہو گیا۔

[2] تاریخ، ج ۶، ص ۲۲۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۰۱۔

اتمامِ حجت کے لیے امامؑ کا بروزِ عاشوراء خطبہ

واقعاتِ کربلا کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزِ عاشوراء طرفین سے صف بندی ہو جانے کے بعد بھی کافی دیر تک جنگ شروع نہیں ہوئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہر فریق ابتداءِ جنگ کی ذمہ داری دوسرے فریق پر ڈالنا چاہتا تھا۔ دشمن کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح امام حسینؑ کی طرف سے پہل ہو۔ اور امام علیہ السلام چاہتے تھے کہ جارحیت کی ابتداء ابن سعد ہی کی طرف سے ہو۔ بلکہ آپ ہر ممکن طریقہ سے مخالفین کو راہِ راست پر لانے کی برابر کوشش فرما رہے تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی امام علیہ السلام کا وہ تاریخی خطبہ بھی ہے جو آپؑ نے اتمامِ حجت کے لیے اس دن بین الصفین اپنی ناقہ پر سوار ہو کر اور قرآن کو سامنے رکھ کر بلند آواز سے ارشاد فرمایا۔ جبکہ حضرت رسولِ خدا کا عمامہ برسر اور آپ کی رداء در بر اور پہلو میں آں حضرت کی تلوار لٹکائے ہوئے تھے۔

(نہضۃ الحسینؑ، ص ۹۴)*

﴿ایها الناس اسمعوا قولی و لا تعجلو حتی اعظکم بما یحق لکم علی و حتی اعذر الیکم من مقدمی علیکم فان قبلتم عذری و صدقتم قولی و اعطیتمونی النصف کنتم بذلک اسعد و لم یکن لکم علیّ سبیل و ان لم تقبلوا منّی العذر و لم تعطوا النصف من انفسکم فاجمعوا امرکم و شرکائکم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃً ثم اقضوا و لا تنظرون ان ولیّ اللّٰہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصّالحین﴾

ایہا الناس! میری بات سنو۔ اور جلدی نہ کرو تاکہ وعظ و نصیحت کا جو حق میرے ذمہ ہے وہ میں پورا کرلوں۔

---

* اکثر کتب سیر و تواریخ میں مرقوم ہے کہ جب سرکار سید الشہداؑ اپنا یہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے میدانِ کارزار میں نکلے تو آپؑ کے چند اصحاب بھی ہمراہ تھے۔ آگے آگے جناب بریر ہمدانی تھے۔ جب قوم اشقیاء کا آمنا سامنا ہوا تو آنجنابؑ نے بریر کو حکم دیا: ﴿کلّم القوم﴾ تم ان لوگوں سے بات کرو۔ چنانچہ جناب بریر نے فرمایا: ﴿یا قوم اتقوا اللّٰہ فان ثقل محمد قد اصبح بین اظهر کم هؤلاء ذریته و عترته و بناته و حرمه فهاتوا ما عندکم و ما الذی تریدون ان تصنعوا بهم؟﴾ اے قوم! اللہ سے ڈرو! اس وقت خانوادۂ نبوت تمہارے درمیان فروکش ہے۔ بتاؤ تم ان سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟ قوم اشقیاء نے جواب دیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو امیر عبید اللہ ابن زیاد کے حوالہ کریں تاکہ وہ جو چاہے۔ ان کے ساتھ سلوک کرے۔ بریر نے فرمایا: ﴿افلا تقبلون منهم ان یرجعوا الی المکان الذی جاؤا منه ویلکم یا اهل الکوفة انسیتم کتبکم و عهودکم التی اعطیتموها و اشهدتم اللّٰہ علیها یا ویلکم ادعوتم اهل بیت نبیکم و زعمتم انکم تقتلون انفسکم دونهم حتی اذا اتوکم اسلمتموهم و حلئتموهم عن ماء الفرات بئس ما خلفتم نبیکم فی ذریته مالکم لا سقاکم اللّٰہ یوم القیامة فبئس القوم انتم﴾ کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ یہ واپس چلے جائیں؟ اے اہل کوفہ! تم پر افسوس ہے کیا تم اپنے خطوط اور وہ عہد و پیمان بھول گئے جو تم نے ان کے ساتھ کیے تھے۔ [بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۴ پر]

اور اپنے یہاں حاضر ہونے کی وجوہ کی وضاحت بھی کر دوں۔ پس اگر تم نے میری بات قبول کر لی اور انصاف سے کام لیا تو سعید اور نیک ہو جاؤ گے اور تمہیں مجھ سے لڑنے جھگڑنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ اور اگر میری بات نہیں سنو گے اور نہ ہی انصاف سے کام لو گے تو پھر تم اپنی قوت مجتمع کر لو۔ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ میرا سرپرست وہ خدا ہے جس نے قرآن نازل کیا ہے اور وہی نیک بندوں کی سرپرستی فرماتا ہے۔

راویانِ اخبار کا بیان ہے کہ جب امام عالی مقام کا یہ کلام اس مقام تک پہنچا اور خیام میں آپ کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنا تو خیام میں گریہ و بکاء کا کہرام مچ گیا۔ آنجنابؑ نے قمر بنی ہاشم ابوالفضلؑ اور شہزادہ علی اکبرؑ کو بھیجا کہ جا کر مخدرات کو خاموش کرائیں۔ ان کے رونے کا وقت بہت پڑا ہے۔[1] جب بیبیاں خاموش ہو گئیں تو آنجنابؑ نے اس شان فصاحت و بلاغت سے خدائے واحد و یکتا کی حمد و ثنا اور جناب رسول خدا ﷺ اور ملائکہ و انبیاء پر اس انداز سے درود و سلام بھیجا کہ اہل تاریخ کا بیان ہے: ﴿لم یسمع متکلم قط قبله و لا بعده ابلغ فی منطق منه﴾ ان سے پہلے اور ان کے بعد ان سے زیادہ کوئی فصیح و بلیغ متکلم نہیں سنا گیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿اما بعد فانسبونی و انظروا من انا؟ ثم ارجعوا الی انفسکم فانظروا هل یصلح لکم قتلی و انتهاک حرمتی الست ابن نبیکم و ابن وصیه و ابن عمه و اول المؤمنین المصدق لرسول الله صلی الله علیه و اله بما جاء به من عند ربه او لیس حمزة سید الشهداء عم ابی او لیس جعفر الطیار فی الجنة بجناحین عمی او لم یبلغکم ما قال رسول الله صلی الله علیه و اله لی ولاخی هذان سیدا شباب اهل الجنة فان صدقتمونی بما اقول وهو الحق و الله ما تعمدت کذبا منذ علمت ان الله یمقت علیه اهله و ان کنتم کذبتمونی فان فیکم من ان سئلتموه عن ذلک اخبرکم سلوا جابر بن عبد

---

[1] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۸۷۔

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ۳۲۲]

تم نے تو اہل بیت رسول کو یہ کہہ کر بلایا تھا کہ ان پر اپنی جانیں قربان کرو گے۔ مگر جب وہ تشریف لائے تو تم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور آب فرات سے دور کر دیا تم نے آں حضرتؐ کے بعد ان کی عترت سے بہت ہی برا سلوک کیا۔ اور تم بہت برے لوگ ہو۔ کچھ لوگوں نے جواب میں کہا۔ ہم نہیں سمجھے تم کیا کہہ رہے ہو؟ بریر نے فرمایا: ﴿الحمد لله الذی زادنی فیکم بصیرة اللّٰهم انی ابرا الیک من فعال هؤلاء القوم اللّٰهم الق الباس بینهم حتی یلقوک و انت علیهم غضبان﴾ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے تمہارے متعلق زیادہ بصیرت عطا فرمائی ہے۔ یا اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں کے افعال سے اظہار بیزاری کرتا ہوں۔ یا اللہ ان کے درمیان باہمی اختلاف و قتال واقع کر تاکہ جب تیری بارگاہ میں حاضر ہوں تو تو ان پر غضبناک ہو۔" قوم اشقیاء نے اس وقت ان پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ جناب بریر مایوس ہو کر واپس پلٹ آئے اور جناب سید الشہداءؑ نے آگے بڑھ کر خطبہ ارشاد فرمانا شروع کیا۔

(لواعج الاشجان، ص ۱۰۱۔ نفس المہموم، ص ۱۳۰۔ ناسخ التواریخ، ج ۲، ص ۲۳۹ وغیرہ)

اللّٰہ الانصاری و ابا سعید الخدری و سھل بن سعد الساعدی و زید بن ارقم و انس بن مالک، یخبروکم انھم سمعوا ھذہ المقالۃ من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و الہ لی ولاخی اما فی ھذا حاجز لکم عن سفک دمی؟﴾

اے لوگو! میرے حسب ونسب پر غور کرو اور دیکھو میں کون ہوں؟ پھر اپنے آپ کی ملامت کرو اور سوچو کہ آیا تمہارے لیے میرا قتل کرنا اور میری ہتک حرمت کرنا روا ہے؟ کیا میں تمہارے پیغمبر کا فرزند نہیں ہوں! اور کیا میں تمہارے پیغمبرؐ کے وصی۔ ان کے ابن عم اور سب سے پہلے تصدیق نبوت ورسالت کرنے والے بزرگوار کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا جناب حمزہ سید الشہداء میرے والد کے چچا نہیں ہے؟ کیا جعفر طیار میرے چچا نہیں؟ کیا جناب رسولؐ خدا کا یہ ارشاد تمہارے گوش گزار نہیں ہوا جو انہوں نے میرے اور میرے بھائی (امام حسنؑ) کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانان جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم اس بات میں میری تصدیق کرتے ہو جو کہ بالکل برحق ہے کیونکہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تو فبہا ورنہ ابھی وہ آدمی زندہ موجود ہیں جن سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ جابر بن عبداللہ انصاری اور ابوسعید خدری، سہل بن سعد ساعدی، زید بن ارقم اور انس بن مالک سے دریافت کرو! وہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے بگوش خود جناب رسولؐ خدا کی زبانی یہ حدیث سنی ہے جو آپؐ نے میرے اور میرے بھائی کے حق میں ارشاد فرمائی ہے۔ کیا میرا خون بہانے کے اس میں مانع موجود نہیں ہے؟

جب آنجنابؑ کا کلام حقیقت ترجمان اس مقام تک پہنچا تو شمر ذی الجوشن ملعون نے کلام کو قطع کرتے ہوئے کہا: ﴿ھو یعبد اللّٰہ علی حرف ان کان یدری ما تقول﴾ کہ میں خدا کی ایک حرف پر عبادت کروں (منافق ہوں) جو میری سمجھ میں کچھ آ رہا ہو کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ امامؑ نے اس خبیث کو کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ جناب حبیب بن مظاہر نے اس کے جواب میں کہا: ﴿واللّٰہ انی لاراک تعبد اللّٰہ علی سبعین حرفاً و انا اشھد انک صادق ما تدری ما یقول قد طبع اللّٰہ علی قلبک!﴾ بخدا میں دیکھ رہا ہوں کہ تو ستر حرفوں پر خدا کی عبادت کرتا ہے (بہت بڑا مکار و عیار ہے) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہہ رہا ہے۔ واقعاً تو کچھ نہیں سمجھ رہا کہ آنجنابؑ کیا فرما رہے ہیں کیونکہ خدا نے تیرے دل پر (تیرے کفر ونفاق کی وجہ سے) مہر لگا دی ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فان کنتم فی شک من ھذا فتشکون انی ابن بنت نبیکم فواللّٰہ ما بین المشرق و المغرب ابن بنت نبیّ غیری فیکم ولا فی غیرکم و یحکم اتطلبونی بقتیل قتلتہ او مال استھلکتہ او بقصاص جراحۃ﴾ اگر تمہیں میرے سابقہ بیان میں شک ہے تو کیا اس بات میں بھی شک کر سکتے ہو کہ میں تمہارے پیغمبر کی دختر کا فرزند ہوں؟ خدا کی قسم اس وقت مشرق سے لے کر مغرب تک

میرے علاوہ کہیں بھی نبی کی دختر کا بیٹا موجود نہیں ہے! وائے ہو تم پر کیا میں نے تمہارا کوئی آدمی قتل کیا ہے جس کا مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟ یا میں نے تمہارا کچھ مال ضائع کیا ہے؟ جس کا مجھ سے مطالبہ کرتے ہو؟ یا کسی کو زخمی کیا ہے جس کا تم مجھ سے قصاص لینا چاہتے ہو؟

راویانِ اخبار کا بیان ہے کہ جب امام علیہ السلام دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا یہ کلام بلاغت نظام کر رہے تھے تو مجمع پر بالکل سناٹا طاری تھا۔ فوج مخالف ہمہ تن گوش بنی ہوئی ساکت و صامت کھڑی تھی۔ اس وقت امام علیہ السلام نے فوج مخالف کے چند سربر آوردہ اشخاص کو نام بنام پکارتے ہوئے فرمایا: ﴿یا شبث بن ربعی و یا حجار بن ابجر و یا قیس بن الاشعث و یا یزید بن الحارث الم تکتبوا الیّ ان قد اینعت الثمار و اخضرت الجنات و انما تقدم علی جند لک مجنّد فاقبل﴾ اے شبث بن ربعی! کیا تم نے اپنے دعوتی خطوط میں مجھے نہیں لکھا تھا کہ پھل پک چکے ہیں اور باغات سرسبز و شاداب ہیں۔ جب آپ آئیں گے تو لشکر آپ کی نصرت کے لیے آمادہ ہوں گے؟ مگر فسق و فجور کے ان پیکروں نے حکومت وقت کے خوف سے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نے اس قسم کے کوئی خطوط نہیں لکھے تھے۔ امام علیہ السلام نے تعجب کے لہجہ میں فرمایا: ﴿سبحان اللّٰہ بلی و اللّٰہ فعلتم، سبحان اللّٰہ﴾ خدا کی قسم ضرور تم نے ایسا کیا تھا، پھر فرمایا: ﴿ایھا الناس اذ کرھتمونی فدعونی انصرف عنکم الی مامنی من الارض؟؟﴾ اے لوگو! اگر تمہیں میرا یہاں آنا گوارا نہیں ہے تو پھر مجھے چھوڑ دو تاکہ میں کسی جائے امن میں چلا جاؤں!

اس وقت قیس بن الاشعث نے کہا: ہم نہیں سمجھتے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپؑ یزید کا مطالبہ بیعت کیوں نہیں تسلیم کر لیتے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لا و اللّٰہ لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل و لا اقرّ اقرار العبید﴾ نہ بخدا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں کبھی ذلیل آدمی کی طرح اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دوں گا اور نہ ہی غلاموں کی طرح اس بات کا اقرار کروں گا۔

پھر پکار کر فرمایا:

﴿یا عباد اللّٰہ انی عذت بربی و ربکم ان ترجمون انی اعوذ بربی و ربکم من متکبر لا یؤمن بیوم الحساب﴾

اے خدا کے بندو! میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے پناہ مانگتا ہوں کہ تم مجھے کوئی گزند پہنچاؤ۔ اور اپنے اور تمہارے پروردگار سے ہر اس متکبر اور سرکش سے پناہ مانگتا ہوں جو روز قیامت پر ایمان نہیں لاتا۔

اس کے بعد امام نے اپنی ناقہ بٹھا دی۔ اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دے۔ چنانچہ اس نے اسے باندھ دیا۔[1]

آنجناب کا یہ تاریخی خطبہ قدرے مختلف الفاظ و عبارات کے ساتھ تمام کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے۔ حتیٰ کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والا آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ آنجنابؑ نے روز عاشورا کئی بار قوم اشقیا کو خطاب کیا ہے اگرچہ یہ احتمال بعید از عقل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض اہل علم کا یہی خیال ہے۔[2] لیکن پورے واقعات کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعد اس خیال کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آنجنابؑ نے ایک ہی خطبہ ارشاد فرمایا ہے جس کے الفاظ میں قدرے اختلاف ہے۔ جسے ہم نے مستند کتب سے پیش کر دیا ہے۔ بعض ناقلان آثار کے قول کے مطابق اسی خطبہ میں آنجنابؑ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿الا و ان الدعی بن الدعی قد رکزبین اثنتین بین السلة و الذلة و هیهات منا الذلة یابی الله ذلک لنا و رسوله و المؤمنون و حجور طابت و طهرت و انوف حمیة و نفوس ابیة من ان نؤثر طاعة اللئام علی مصارع الکرام﴾ حرام زادے اور حرام زادے کے بیٹے نے مجھے دو باتوں میں سے ایک کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ موت یا ذلت (کی زندگی) لیکن خدا، رسولؐ، اہل ایمان، پاک و پاکیزہ گودیں، باحمیت چہرے اور ذلت قبول کرنے سے انکار کرنے والے نفوس عالیہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ہم کمینوں کی اطاعت کو شریفوں کی شریفانہ موت پر ترجیح دیں۔[3]

تاریخی شواہد و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ آنجنابؑ کے اس خطبہ شریف کے بعد آپ کے بعض اصحاب اطیاب نے بھی مزید اتمام حجت کی خاطر قوم اشقیا سے خطاب کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جناب زہیر بن قین کا اسم گرامی نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ اس حال میں قوم اشقیا کے سامنے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے کہ سر سے پاؤں تک اسلحۂ جنگ میں غرق تھے۔ انہوں نے یوں سلسلۂ کلام کا آغاز کیا۔

﴿یا اهل الکوفة نذار لکم من عذاب الله نذار ان حقا علی المسلم نصیحة اخیه المسلم و نحن حتی الان اخوة علی دین واحد و ملة واحدة مالم یقع بیننا و بینکم السیف و انتم للنصیحة منا اهل فاذا وقع السیف انقطعت العصمة و کنا نحن امة و انتم امة ان الله قد ابتلانا و ایاکم بذریة

---

[1] تمام ارباب مقاتل نے آنجناب کا یہ خطبہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ارشاد، ص ۲۵۶۔ عاشر بحار، ص ۱۹۳۔ نفس المہموم، ص ۱۲۶، ۱۲۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۰۳۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۴۱۔ نہضۃ الحسین، ص ۹۹۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۲۸۔

[2] مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۵۴ وغیرہ۔

[3] نفس المہموم، ص ۱۳۲۔ اللہوف، ص ۸۲۔ لواعج الاشجان، ص ۱۰۶۔ النہضۃ الحسینیہ، ص ۹۶ وغیرہ۔

نبیه محمد صلی اللّٰہ علیه و اله لینظر ما نحن و انتم عاملون انا ندعوکم الی نصرهم و خذلان الطاغیة بن الطاغیة عبید اللّٰہ بن زیاد فانکم لا تدرکون منهما الا سوء یسملان اعینکم و یقطعان ایدیکم و ارجلکم و یمثلان بکم و یرفعانکم علی جذوع النخل و یقتلان اماثلکم و قرائکم امثال حجر بن عدی و اصحابه و هانی بن عروة و اشباهه﴾

اے اہل کوفہ اللہ کے عذاب سے ڈرو۔ مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو نصیحت کرے۔ ابھی تک ہم تم بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک ہی ملت پر ہیں۔ ہاں جب جنگ شروع ہوگئی تو پھر یہ رشتہ منقطع ہو جائے گا اور ہم تم علیحدہ علیحدہ ملتوں کے تابعدار ہو جائیں گے۔ خدا نے جناب رسولؐ خدا کی ذریت کے معاملہ میں ہماری اور تمہاری آزمائش کی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم اور تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ہم تم کو ذریت رسول کی نصرت اور سرکش پسر سرکش ابن زیاد کے چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یاد رکھو یزید اور ابن زیاد تم سے سوائے برائی کے اور کوئی اچھا سلوک نہیں کریں گے وہ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھراتے ہیں اور تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹتے ہیں اور تمہارا مثلہ کراتے ہیں اور تمہیں سولیوں پر لٹکواتے ہیں۔ اور جناب حجر بن عدی اور ہانی بن عروہ جیسے صالح اور معزز اشخاص کو قتل کراتے ہیں۔

جب جناب زہیر کا کلام یہاں تک پہنچا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مخالفین نے جناب زہیر پر سب وشتم اور ابن زیاد کی مدح وثنا شروع کر دی اور کہا: ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلیں گے جب تک آپ کے امام اور ان کے ہمراہیوں کو شہید نہ کر دیں گے۔ یا ان کو اور ان کے ساتھیوں کو زندہ پکڑ کر ابن زیاد کے پاس نہ لے جائیں گے۔

- اس پر جناب زہیر نے فرمایا: ﴿یا عباد اللّٰہ ان ولد فاطمة علیها السلام احق بالود و النصر من ابن سمیّة فان لم تنصروهم فاعیذکم باللّٰہ ان تقتلوهم خلّوا بین هذا الرجل و بین ابن عمه یزید بن معاویة فلعمری ان یزید لیرضی عن طاعتکم بدون قتل الحسین علیه السّلام﴾

اے اللہ کے بندو! ابن سمیہ کی نسبت فرزند فاطمہؑ نصرت ومحبت کے زیادہ مستحق ہیں۔ لہٰذا اگر تم ان کی امداد نہیں کرتے تو کم از کم ان کو قتل تو نہ کرو۔ تم ان کو اور یزید کو ان کے حال پر چھوڑ دو بخدا یزید قتل حسینؑ کے بغیر تمہاری اسی قدر اطاعت پر بھی تم سے راضی ہو جائے گا۔

جناب زہیر کا سلسلۂ کلام جاری تھا کہ شمر ذی الجوشن ملعون نے انہیں تیر مارا اور یہ کہہ کر کہ خاموش ہو، خدا تجھے خاموش کرے۔ تو نے طول کلام سے ہمارا دماغ پریشان کر دیا ہے۔ سلسلۂ کلام قطع کر دیا۔ جناب زہیر نے فرمایا: اے ایڑیوں پر پیشاب کرنے والے (جاہل) کے بیٹے! میں تجھ سے خطاب نہیں کر رہا تو ایک وحشی جانور ہے۔ بخدا

تمہیں تو کتاب خدا کی دو آیتیں بھی درست یاد نہیں۔ میں تمہیں بروز قیامت ذلت و رسوائی اور عذاب الٰہی کی خبر سناتا ہوں۔ شمر نے کہا: ابھی ابھی تمہارے اور تمہارے ساتھی کا کام تمام ہوا چاہتا ہے۔ جناب زہیر نے فرمایا: ﴿افبالموت تخوفنی فو اللّٰه للموت معه احبّ الیّ من الخلد معکم﴾ کیا تو مجھے موت سے ڈراتا ہے؟ خدا کی قسم امام برحق کے ساتھ مرنا مجھے تمہارے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے سے زیادہ پسند ہے۔ پھر بآواز بلند لوگوں نے فرمایا: ﴿عباد اللّٰه لا یغرنکم من دینکم هذا الجلف الجافی و اشباهه فو اللّٰه لا تنال شفاعة محمّد صلی اللّٰه علیه و اله قوماً اهرقوا دماء ذریته و اهلبیته و قتلوا من نصرهم و ذبّ عن حریمهم﴾ اے اللہ کے بندو! یہ احمق اور ظالم اور ایسے قسم کے لوگ تمہیں دھوکہ نہ دیں۔ جناب رسولؐ خدا کی شفاعت ہرگز ان لوگوں کو نصیب نہ ہوگی۔ جو ان کی ذرّیت طاہرہ کا خون بہائیں گے اور ان کے اعوان و انصار کو قتل کریں گے۔ باوجود شدید مزاحمت و مقاومت کے شاید جناب زہیر کچھ اور بھی کہتے مگر ایک آدمی نے جناب زہیر کو پکار کر کہا کہ تمہیں حضرت امام حسینؑ واپس بلا رہے ہیں اور فرماتے ہیں: ﴿اقبل فلعمری لئن کان مؤمن ال فرعون نصح لقومه و ابلغ فی الدعاء لقد نصحت لهؤلاء و ابلغت لو نفع النصح والابلاغ﴾ زہیر! واپس آجاؤ۔ اگر مؤمن آل فرعون نے اپنی قوم کو دعوت الی الحق دے کر نصیحت کا حق ادا کر دیا تھا تو یقیناً تم نے بھی نصیحت کا حق ادا کر دیا ہے بشرطیکہ نصیحت و تبلیغ کچھ فائدہ دے۔ یہ حکم امام سن کر زہیر واپس آ گئے۔[1]

اس کے بعد جناب امام حسین علیہ السلام نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کا مرتجز نامی گھوڑا طلب فرمایا۔ اور اس پر سوار ہو کر اپنے اصحاب کو آمادہ قتال و جدال کرنے لگے۔ اور فوج اشقیا نے پیش قدمی شروع کر دی۔[2]

حُر کا بارگاہِ حسینیؑ میں حاضر ہونا

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اصحاب حسینؑ یا خود امام حسینؑ کا یہ ناصحانہ کلام حقیقت ترجمان بالکل رائیگاں گیا اور کسی پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ سعادت مند روحیں اس سے یقیناً متاثر ہوئیں (وقلیل ماهم) اور شقی و بدبخت اس سعادت کے حصول سے محروم رہے۔ ﴿وما تغنی الایات و النذر عن قوم لا یؤمنون﴾ کسی داعی حق کی یہ نمایاں کامیابی ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک شخص کو بھی راہ راست پر لا سکے۔ چنانچہ حُر بن یزید ریاحی (وہی حُر جس نے ایک ہزار فوج کے ساتھ امام علیہ السلام کا راستہ روکا تھا اور ان کو گھیر کر کربلا لایا تھا اور دریائے فرات کے کنارے امامؑ کو خیام نہیں لگانے دیئے

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۳۰۔ لواعج الاشجان، ص ۱۰۸۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۸۸۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۳۔

[2] لواعج الاشجان، ص ۱۰۷۔ نفس المہموم، ص ۱۳۳۔

تھے) جس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس طرح قتال وجدال تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اب وہ حالات کی رفتار دیکھ کر اندر ہی اندر غلطان و پیچاں ہو رہا تھا۔ صبح عاشوراء اس نے لشکر کو مرتب ہوتے بھی دیکھا (بلکہ خود اسے بھی ایک حصہ کا افسر مقرر کیا گیا) امامؑ عالی مقام کا ناصحانہ خطبہ عالیہ بھی سنا۔ بریر وزہیر کی بے نظیر تقریر بھی سنی۔ مگر اس نے دیکھا کہ امامؑ اور ان کے اصحاب کی ان مصالحانہ ومخلصانہ کوششوں کا جواب گالیوں اور تیروں سے دیا جا رہا ہے اور اب حسینیؑ جماعت پر حملہ کی مکمل تیاری ہوگئی ہے اس کے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا۔ سیدھا عمر بن سعد کے پاس پہنچا اور جا کر یہ سوال کیا: ﴿امقاتل انت هذا الرجل؟﴾ کیا تم واقعی ان (حسینؑ) سے جنگ کرو گے؟ عمر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ﴿ای واللّٰه قتالاً ایسره ان تسقط الرؤس و تطیح الایدی﴾ ہاں بخدا۔ ان سے ایسی جنگ کی جائے گی جس کا کم از کم نتیجہ یہ ہوگا کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ کٹ کر زمین پر گریں۔ حُر نے دریافت کیا: ﴿افمالکم فیما عرضه علیکم رضی﴾ حسینؑ نے صلح کی جو تجویزیں پیش کی ہیں آیا وہ تمہارے لیے قابل قبول نہیں ہیں؟ عمر بن سعد نے جواب میں کہا: اگر معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو ضرور منظور کر لیتا۔ مگر تمہارا امیر (ابن زیاد) ان کی کسی تجویز کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے بعد حُر واپس آ گیا۔ اور دل ہی دل میں حسینیؑ جماعت میں شمولیت کا عزم بالجزم کر لیا مگر ان کو یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر کسی طرح ان کے اس ارادہ کا اظہار ہوگیا تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس وقت اس کے قبیلہ کا قرہ بن قیس نامی ایک شخص ان کے قریب تھا۔ حُر کسی طرح اس کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ قرہ سے پوچھا: کیا تو نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟ قرہ نے کہا: نہیں۔ حُر نے کہا: کیا پلانے کا ارادہ نہیں ہے؟ قرہ نے یہ سمجھ کر کہ اس وقت میرا اس کے نزدیک رہنا اسے گوارا نہیں۔ گھوڑے کو پانی پلانے کے بہانے علیحدہ ہوگیا۔ اس کے علیحدہ ہوتے ہی حُر نے آہستہ آہستہ اپنا گھوڑا خیام حسینیؑ کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ حُر کی یہ کیفیت دیکھ کر مہاجر بن اوس نے دریافت کیا: حُر کیا ارادہ ہے۔ کیا حسینؑ پر حملہ کرنا چاہتے ہو؟ حُر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کا ذہن جو غالباً پہلے ہی مختلف وساوس واوہام کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مہاجر کے اس سوال نے اس کو بھونچکا کر دیا۔ اور اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہوگئی۔ مہاجر نے یہ حالت دیکھ کر کہا: حُر تیری حالت بڑی مشکوک ہے۔ میں نے آج تک تجھے ایسی حالت میں نہیں دیکھا۔ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے بڑا بہادر کون ہے؟ تو میں تیرا ہی نام لیتا۔ اس وقت میں تمہاری یہ کیا کیفیت دیکھ رہا ہوں؟

حُر نے واشگاف الفاظ میں جواب دیا: ﴿انی واللّٰه اخیر نفسی بین الجنة والنار فواللّٰه لا اختار علی الجنة شیئاً و لو قطعت و حرقت﴾ بخدا میں اپنے آپ کو جنت وجہنم کے درمیان پا رہا ہوں۔ خدا کی قسم میں جنت پر کسی بھی چیز کو مقدم نہیں سمجھ سکتا۔ چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اور مجھے جلا بھی دیا جائے۔

بعد ازاں گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چشم زدن میں بارگاہِ حسینیؑ میں پہنچ گیا۔[1] حُر جاتے وقت سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا جاتا تھا: ﴿اللّٰھم الیک انبت فتب علیّ فقد ارعبت قلوب اولیائک و اولاد بنت نبیک ﴾ یا اللہ میں تیری بارگاہ میں رجوع ہوتا ہوں۔ میری توبہ منظور فرما۔ کیونکہ میں نے تیرے اولیاء اور تیرے نبی کی اولاد کے دلوں کو خوف زدہ کیا ہے۔ سپاہِ حسینیؑ کے قریب پہنچ کر سپر کو پلٹ دیا۔ جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ بارادۂ جنگ نہیں آرہا۔ چنانچہ کسی نے مزاحمت نہ کی۔ سید عالی سرکار سید الشہداءؑ کی بارگاہ میں پہنچ کر عرض کیا: ﴿جعلت فداک یابن رسول اللّٰہ انا صاحبک الذی حبستک عن الرجوع و سایرتک فی الطریق و جعجعت بک فی ھذا المکان و ما ظننت ان القوم یردّون علیک ما عرضتہ علیھم ولا یبلغون منک ھذہ المنزلۃ واللّٰہ لو علمت انھم ینتھون بک الی ما اری ما رکبت و انا تائب الی اللّٰہ افتری لی من ذلک توبۃ؟ ﴾ فرزندِ رسولؐ! میں آپ پر قربان ہوں! میں وہی ہوں جس نے آپ کو واپس تشریف لے جانے سے روکا اور (کربلا تک) راستہ میں آپ کے ساتھ چلتا رہا۔ اور بالآخر اس (لق و دق صحراء میں) آپ کو اترنے پر مجبور کیا۔ مجھے ہرگز یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ لوگ آپ کی پیش کردہ تجاویز مصالحت کو رد کردیں گے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ خدا کی قسم اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ یہ لوگ ایسا کریں گے تو میں کبھی یہ طرز اختیار نہ کرتا۔ بہرحال اب میں بارگاہِ ایزدی میں توبہ کرتا ہوں۔ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ امام عالی مقام نے فرمایا: ﴿نعم یتوب اللّٰہ علیک ﴾۔ ہاں! خداوند عالم تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔ پھر فرمایا: ﴿انزل ﴾ گھوڑے سے نیچے اترو۔ حُر نے عرض کیا: ﴿فانا فارساً خیر منی راجلاً اقاتلھم علی فرسی ساعۃً والی النزول ما یصیر اٰخر امری ﴾ میرا فرسِ حق میں گھوڑے پر سوار رہنا اترنے سے بہتر ہے۔ ان لوگوں سے کچھ دیر جنگ کرلوں اور بالآخر (شہید ہو کر) نیچے اترنا ہی ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿فاصنع یرحمک اللّٰہ ما بدا لک ﴾ جو جی چاہے کرو خدا تم پر رحم فرمائے۔

تبصرہ

مخفی نہ رہے کہ جناب حُرؓ کے خدمتِ امام میں حاضر ہونے اور توبہ کرنے کی جو کیفیت ہم نے اُوپر بیان کی ہے۔ کتب معتبرہ و مستندہ میں اسی طرح مذکور ہے۔ مگر بعض کتب میں ان کے بارگاہِ امامؑ میں حاضر ہونے کی کیفیت اس طرح مرقوم ہے کہ جب حُر حضرت امام حسینؑ کے بالکل نزدیک پہنچا تو گھوڑے سے اتر کر زمین کو بوسہ دیا اور پیشانی زمین پر رگڑنی شروع کردی۔ امام نے نرمی کے ساتھ فرمایا: ﴿من تکون ارفع راسک؟ ﴾ تو کون ہے؟ سر بلند کر؟

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۴۴۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۸۔ ارشاد مفید، ص ۲۵۶۔ لواعج الاشجان، ص ۱۰۹۔ نفس المہموم، ص ۱۳۶۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۳۰۔

حُر نے جواب میں عرض کیا: ﴿انا صاحبک الذی حبستک عن الرجوع[1]...﴾ (تا آخر سوال و جواب جو اوپر ذکر ہو چکا ہے)۔

شیخ نجم الدین ابن نما حلی علیہ الرحمہ نے اپنے مقتل مثیر الاحزان میں یہ روایت درج کی ہے کہ حُر نے خدمت امام میں عرض کیا: ﴿یابن رسول اللّٰہ لما وجھنی عبید اللّٰہ الیک خرجت من القصر فنودیت من خلفی ابشر یا حُر بالخیر فقلت فی نفسی واللّٰہ ما ھذہ بشارۃ و انا اسیر الی الحسین وما احدث نفسی باتباعک﴾ فرزند رسولؐ! جس روز عبید اللہ بن زیاد نے مجھے آپ کی طرف روانہ کیا اور میں دار الامارہ سے باہر نکلا تو پس پشت سے مجھے آواز آئی: اے حُر! تجھے خیر و خوبی کی بشارت ہو۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کسی کو نہ پایا۔ میں نے دل میں کہا: یہ کیسی بشارت ہے؟ حالانکہ میں فرزند رسولؐ امام حسینؑ سے خلاف نبرد آزمائی کے لیے جا رہا ہوں۔ اس وقت تو آپ کی اتباع کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ امام عالی مقام نے فرمایا: ﴿لقد اصبت اجراً و خیراً﴾ یقیناً تو نے اجر و ثواب اور خیر و خوبی کو حاصل کر لیا ہے۔[2]

حُر کی فوج یزید کو نصیحت

بہرکیف جناب حُرؒ اپنی خطائیں معاف کرانے اور میدان کارزار میں جانے کی اجازت حاصل کرنے کے بعد سیدھا فوج اشقیا کے سامنے گیا تاکہ بطور اتمام حجت ان کو راہ راست پر آنے کی دعوت دے۔ چنانچہ افواج یزید کو خطاب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تقریر کی:

﴿یا اھل الکوفۃ لامکم الھبل و العبر ادعوتم ھذا العبد الصالح حتی اذا جاء کم اسلمتموہ و زعتم انکم قاتلوا انفسکم دونہ ثم عدوتم علیہ لتقتلوہ و امسکتم بنفسہ و اخذتم بکظمہ و احطتم بہ من کل جانب لتمنعوہ التوجہ فی بلاد اللّٰہ العریضۃ فصار کالاسیر فی ایدیکم لا یملک لنفسہ نفعاً ولا یدفع عنھا ضراً و حلاتموہ و نسائہ و صبیۃ و اھلہ عن ماء الفرات الجاری یشربہ الیھود و النصاری و المجوس و تمرغ فیہ خنازیر الوادی و کلابہ فھاھم قد صرعھم العطش بئس ما خلفتم محمداً فی ذرّیتہ لاسقاکم اللّٰہ یوم الظمأ﴾

اے کوفہ والو! تمہاری مائیں تمہارے ماتم میں بیٹھیں۔ تم نے اس عبد صالح کو بلایا۔ اور جب وہ آیا تو تم نے اسے دشمن کے حوالہ کر دیا۔ حالانکہ تم نے ارادہ یہ ظاہر کیا تھا کہ ان پر جانیں قربان کر دو گے۔ تم نے کیا یہ کہ ان کے

---

[1] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۶۸۔ وقائع ایام محرم، ص ۲۹۸۔

[2] وقائع ایام محرم، ص ۲۹۹۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۳۰۔ نفس المہموم، ص ۱۳۷، سب میں بحوالہ مقتل ابن نما لکھا ہے۔

خلاف لشکر کشی کر دی۔ تم نے ان کے نفس کی آمد و رفت کو بند کر دیا ہے اور ان کے لیے قافیۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ تم نے ان کو چہار طرف سے گھیر لیا ہے تا کہ خدا کے وسیع و عریض شہروں میں ان کو حسب منشاء جانے سے روک سکو۔ اب وہ تمہارے ہاتھوں میں قیدی کے مانند ہو گئے ہیں اور بالکل بے بس کر دیے گئے ہیں۔ نیز تم نے ان کو ان کے اہل حرم، بچوں اور ان کے اصحاب و انصار سمیت فرات کے آب جاری سے روک دیا ہے جسے یہودی، مجوسی اور نصرانی بھی پی رہے ہیں۔ اور عراق کے سور اور کتے اس میں لوٹ پوٹ رہے ہیں مگر یہ لوگ شدت پیاس سے جان بلب ہو رہے ہیں۔ تم نے جناب رسولؐ خدا کے بعد بہت ہی برا سلوک ان کی ذریت کے ساتھ کیا ہے۔ خدا تمہیں شدت پیاس والے دن سیراب نہ کرے۔

پسر سعد کی طرف سے آغاز جنگ

جب حُر کا کلام حق ترجمان یہاں تک پہنچا تو اثر لینے کی بجائے کچھ لوگوں نے جواب میں تیر چلائے۔ یہ حالت دیکھ کر حُر نے تقریر بند کر دی اور واپس آ کر خدمت امام میں کھڑے ہو گئے۔[1] کیونکہ ابھی باقاعدہ آغاز جنگ نہیں ہوا تھا۔

دن کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ اور دھوپ چڑھ چکی تھی۔ افواج یزید کا سپہ سالار عمر بن سعد پہلے بھی بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر تاخیر کر رہا تھا۔ ورنہ وہ تو جلدی اس قصہ کو کوتاہ کرنے اور اس مہم کو سر کرنے کا خواہش مند تھا۔ اب جناب حُر کی علیحدگی اور پُر جوش تقریر نے حالات کا نقشہ بدل دیا۔ اور اب ابن سعد نے تاخیر مزید کو خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے اس طرح جنگ کا آغاز کیا کہ اپنے غلام درید کو (جو کہ علمبردار لشکر تھا) حکم دیا: ﴿یا درید ادن رایتک﴾ اے درید! علم لشکر قریب لاؤ۔ چنانچہ اس نے علم قریب کیا۔ پھر پسر سعد نے اپنا تیر چلہ کمان پر چڑھایا اور زور سے جماعت حسینیؑ کی طرف چھوڑا اور ساتھ ہی فوج اشقیاء سے کہا: ﴿اشھدوا انی اوّل من رمی﴾ تم گواہ رہنا کہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے تیر مارا ہے وہ میں ہوں۔ ابن سعد کا تیر چلانا تھا کہ یکا یک ہزاروں تیروں کی بارش ہونے لگی۔[2]

امام حسینؑ نے اپنے اصحاب باصفا کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿قوموا رحمکم اللّٰه الی الموت الذی لا بد منه فان ھذه السھام رسل القوم الیکم﴾ خدا تم پر رحم کرے۔ استقبال موت کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ جس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ یہ تیر در حقیقت قوم اشقیاء کے قاصد ہیں۔ جو پیام مرگ کی خاطر تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

---

[1] ارشاد شیخ مفید، ص ۲۵۷۔ طبری، ج ٦، ص ۲۴۵۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۳۰ وغیرہ۔

[2] ارشاد شیخ مفید، ص ۲۵۷۔ تاریخ طبری، ج ٦، ص ۲۴۵۔ لہوف، (و اقبلت السھام من القوم کانھا القطر)۔

تیروں کی اس بارش سے اصحاب حسینؑ کی صفوں میں کوئی انتشار پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ امام عالی مقام کے اس اذن جہاد ملتے ہی وہ لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اور بڑی دلجمعی کے ساتھ تیروں کا جواب تیروں سے دیا اور یکبارگی فوج مخالف پر حملہ کر دیا۔ قریباً ایک گھنٹہ تک یہ حالت و جنگ مغلوبہ ● جاری رہی۔ جب غبار جنگ چھٹا تو معلوم ہوا کہ آنجنابؑ کے کئی انصار جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ جن کی تعداد پچاس بیان کی جاتی ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر سرکار سید الشہداءؑ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مقدس پر رکھ کر فرمایا: ﴿اشتد غضب الله تعالیٰ علی الیهود اذ جعلوا له ولداً و اشتد غضب الله تعالیٰ علی النصاریٰ اذ جعلوه ثالث ثلاثة و اشتد غضبه علی المجوس اذ اعبدو الشمس و القمر دونه و اشتد غضبه علی قوم اتفقت کلمتهم علی قتل ابن نبیهم اما والله لا اجیبهم الی شیء مما یریدون حتی القی الله و انا مخضب بدمی﴾ خداوند عالم کا قہر و غضب اس وقت یہودیوں پر سخت ہوا جب کہ انہوں نے خدا کے لیے فرزند تجویز کیا اور خدا کا قہر شدید ہوا نصاریٰ پر جب کہ انہوں نے خدا کو تین میں سے تیسرا قرار دیا۔ اور خدا کا غضب سخت ہوا مجوسیوں پر جبکہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر شمس و قمر کی پرستش شروع کر دی۔ اور خدا کا قہر و غضب سخت ہوا اس قوم پر جس نے اپنے پیغمبرؐ کے فرزند کے قتل پر اتفاق کر لیا۔ بخدا میں وہ بات ہرگز قبول نہیں کروں گا جو یہ لوگ چاہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے خون کا خضاب لگائے ہوئے بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوں۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد سے سنا وہ فرماتے تھے: ﴿التقی الحسین علیه السلام و عمر بن سعد لعنه الله و قامت الحرب انزل الله النصر حتی رفرف علی راس الحسین علیه السلام ثم خیّر بین النصر علی اعدائه و بین لقاء الله فاختار لقاء الله تعالیٰ﴾ جب امام حسینؑ اور عمر بن سعد کی مڈبھیڑ ہوئی اور جنگ شروع ہو گئی تو خداوند عالم نے نصرت کو نازل کیا یہاں تک کہ وہ امام حسینؑ کے سر مقدس پر منڈلانے لگی۔ پھر آنجنابؑ کو ظاہری نصرت اور لقاءِ پروردگار کے

● صاحب وقائع ایام محرم اپنی کتاب کے صفحہ ۳۹۱ پر لکھتے ہیں: ﴿آنچه از کلمات و مقاتل اکابر علماء رضوان الله علیهم بدست می آید آن ست که تا ظهر عاشورا سه مرتبه جنگ مغلوبه واقع شده. یکی قبل از مبارزت حر علیه الرحمة و دوم قبل از شهادت مسلم بن عوسجه وسیم قبل از نماز ظهر و بقیه مبارزه بطریق مبارزت واقع شده﴾
یعنی جو کچھ اکابر علماء کے مقاتل اور کلمات سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ظہر عاشوراء تک تین بار جنگ مغلوبہ ہوئی۔ ایک بالکل ابتداء میں حر علیہ الرحمہ کی مبارزت سے پہلے۔ دوسرے جناب مسلم بن عوسجہ کی شہادت سے قبل۔ تیسرے نماز ظہر سے کچھ پہلے۔
باقی تمام جنگ بطور مبارزت واقع ہوئی۔

[1] عاشر بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۱۹۵۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۲۹۔ نفس المہموم، ص ۱۳۲۔ مقتل مقرم، ص ۲۳۰۔ مقتل العوالم، ص ۸۲۔

درمیان اختیار دیا گیا۔ آنجنابؑ نے بارگاہ ایزدی میں حاضری کو اختیار کر لیا۔[1] بعد ازاں مبارزت طلبی اور یکے بعد دیگرے جنگ کا سلسلہ شروع ہوا جس کی تفصیل بعد میں آ رہی ہے۔

بعض تحقیقات انیقہ

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھانے سے پہلے یہاں چند امور کی تحقیق ضروری معلوم ہوتی ہے۔

جناب حُر کس وقت جماعت حسینی میں شامل ہوئے؟

(ا) اس میں قدرے اختلاف ہے کہ جناب حُر حملۂ اولیٰ سے پہلے خدمت امامؑ میں تشریف لائے یا اس کے بعد؟ ارشاد شیخ مفید (صفحہ ۲۵۶)، عاشر بحار الانوار (صفحہ ۱۹۳)، امالی شیخ صدوق (صفحہ ۹۷)، الدمعۃ الساکبہ (صفحہ ۳۳۰)، نفس المہموم (صفحہ ۱۳۵)، لواعج الاشجان (صفحہ ۱۰۸)، شہید انسانیت (صفحہ ۳۹۲) وغیرہ کتب معتبرہ سے پہلے نظریہ کی تصدیق وتائید ہوتی ہے البتہ لہوف جناب سید بن طاؤس علیہ الرحمہ صفحہ ۹۰، بحر ۃ صفحہ ۱۹۵ و کشف الغمہ صفحہ ۱۹۰، فصول مہمہ صفحہ ۱۷۲ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ابتدائی حملہ (جنگ مغلوبہ) کے بعد جب قریباً پچاس اصحاب حسینؑ جام شہادت نوش کر چکے اور سرکار سید الشہداءؑ نے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ رکھ کر آوازِ استغاثہ بلند فرمائی: ﴿اما من مغیث یغیثنا لوجہ اللہ. اما من ذاب یذبّ عن حرم رسول اللہ﴾ اور جناب حُر نے یہ آواز سنی تو پکار کر کہا: ﴿انا یابن رسول اللہ﴾ میں آپ کی نصرت کے لیے حاضر ہوں اور اس کے بعد لشکر یزید سے نکل کر حسینی جماعت میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ جناب سید ابن طاؤس نے جناب حُر کے طلب اذن جہاد کے اس جملہ ﴿فاذا کنت اول من خرج علیک فاذن لی ان اکون اول قتیل بین یدیک لعلی اکون ممن یصافح جدک محمدا غدا یوم القیامۃ﴾ چونکہ میں نے پہلے پہل آپ کے خلاف اقدام کیا تھا اب مجھے اذن جہاد دیں تاکہ آپ کے سامنے سب سے پہلے جام شہادت بھی میں نوش کروں کی یہ تاویل کی ہے: ﴿انما اراد اوّل قتیل من الان لان جماعۃ قتلوا قبلہ کما ورد﴾ (لہوف، ص ۱۹۲) ان کی مراد یہ تھی کہ اس وقت کے بعد وہ پہلے شہید قرار پائیں۔ کیونکہ ان سے قبل ایک جماعت شہید ہو چکی تھی۔ ولکن المشہور وهو المنصور و علیہ الجمہور. ھو القول الاول کما لا یخفی علی من لہ ادنی شعور۔

جناب حُر تنہا آئے یا بھائی بیٹا اور غلام بھی ہمراہ تھے؟

تمام کتب معتبرہ سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ جناب حُر تنہا نصرت حسینؑ کے لیے حاضر ہوئے تھے اور یہ سعادت ان کے متعلقین میں سے کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی تھی۔ مگر تاریخ اعثم کوفی، مقتل الحسین اسفرائنی، سر الشہادتین،

---

[1] عاشر بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۱۹۵۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۲۹۔ نفس المہموم، ص ۱۲۳۔ مقام، ص ۳۳۰۔ مقتل العوالم، ص ۸۲۔

روضۃ الشہداء اور مقتل ابی مخنف جیسی کتب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا بیٹا حجر، بھائی مصعب اور عروہ نامی ایک غلام بھی ان کے ہمراہ آئے تھے اور نصرتِ امام کا فرض انجام دیتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا تھا۔ جناب ریاض بنارسی مرحوم نے اپنی کتاب شہید اعظم حصۂ دوئم میں اور صاحب ناسخ التواریخ نے جلد ششم میں ان کی شہادتوں کی تفصیل بھی درج کی ہے مگر چونکہ ہماری نظر قاصر میں ان کی آمد کا واقعہ مستند نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ اگر کوئی صاحب تفصیل دیکھنے کے شائق ہوں تو مذکورہ بالا کتب کی طرف رجوع کریں۔ فلا نطیل الکلام بذکر القصص التی لا حقیقۃ لھا عند العلماء الاعلام۔

آیا حملۂ اولیٰ میں انصارِ حسینیؑ کا کوئی جانی نقصان ہوا؟

آیا پہلے حملہ کی تیر بارانی (جنگِ مغلوبہ) میں سپاہِ حسینیؑ کا کوئی جانی نقصان ہوا یا نہیں اور اگر ہوا تو کس قدر؟ اس میں قدرے اختلاف ہے۔ جناب سید بن طاؤس نے لکھا ہے: ﴿حتی قتل من اصحاب الحسین جماعۃ﴾ اس حملہ کے نتیجہ میں اصحاب حسینؑ کی ایک جماعت شہید ہوئی۔[1] جناب سید محمد بن ابی طالب حسینی حائری نے اپنے مقتل میں لکھا ہے: ﴿قیل فلما رموھم ھذہ الرمیۃ قل اصحاب الحسین علیہ السلام و قتل فی ھذہ الحملۃ خمسون رجلاً﴾ کہا جاتا ہے کہ جب فوج یزید نے یہ تیر بارانی کی تو اصحاب حسینؑ کی تعداد کم ہوگئی۔ یعنی اس حملہ میں پچاس آدمی شہید ہوگئے[2] ایسا ہی اکثر اربابِ مقاتل نے لکھا ہے لیکن شہید انسانیت کے فاضل مصنف مدظلہ صفحہ ۳۹۴ پر لکھتے ہیں: ''مگر تیروں کی اس ابتدائی بارش سے جماعت حسینیؑ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بے شک وہ عملی طور پر ایک جنگ کا اقدام تھا جس کی ابتداء فوج دشمن کی طرف سے ہوگئی۔ اور یہ ایک آخری حجت تھی۔ جس کے تمام ہونے کے امام منتظر تھے۔'' تاریخی شواہد سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ خود جناب مولانا نے اس عبارت سے ایک صفحہ پہلے (صفحہ ۳۹۳ پر) لکھا ہے: ''عمر سعد نے تیر چلۂ کمان میں جوڑ کر فوج حسینیؑ کی طرف رہا کیا۔ اور لشکر یزید کو مخاطب کرتے ہوئے پکار کر کہا: ''گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے لگایا ہے۔ سپہ سالار لشکر ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کرتے ہوئے تیر رہا کرے اور لشکریوں میں جوش و خروش پیدا نہ ہو؟ یہ ناممکن ہے۔ یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں۔ ہزاروں چلے کھنچے۔ اور ہزاروں تیر روانہ ہوئے۔'' قطع نظر دیگر تاریخی شواہد کے کیا عقل سلیم

---

[1] لہوف، ص ۸۹ اور علامہ مجلسیؒ نے اس کلام کے یہ معنی بیان کیے ہیں: ''اول قتیل من المبارزین و الالان جماعۃ قد قتلوا فی الحملۃ الاولیٰ۔'' (عاشر بحار، ص ۱۹۵) یعنی ان کا مقصد یہ تھا کہ مبارزت طلبی میں شہید ہونے والوں سے پہلے شہید ہوں۔ ورنہ ان سے پہلے حملۂ اولیٰ (جنگ مغلوبہ) میں ایک جماعت شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوچکی تھی۔ (منہ عفی عنہ)

[2] بہت سے اربابِ مقاتل نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: نفس المہموم، ص ۱۳۸، قمقام، ص ۳۳۰، ۳۳۱، و عاشر بحار، ص ۱۹۴ وغیرہ۔

یہ باور کر سکتی ہے کہ ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلے کھنچیں اور ہزاروں تیر روانہ ہوں مگر اس کے باوجود کوئی نقصان نہ ہو؟ لا واللہ۔ بنابریں پہلا قول ہی قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ صاحب شہید انسانیت دام ظلہ نے اس حملہ (جنگ مغلوبہ) کو جو نماز ظہر سے قریباً ایک گھنٹہ قبل وقوع میں آیا۔ حملۂ اولیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ شہید انسانیت صفحہ ۳۲۱ پر اس حملہ کی تفصیل لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "یہی وہ عظیم الشان حملہ اور گھمسان کی جنگ ہے جو تاریخوں میں حملۂ اولیٰ کے نام سے مذکور ہے۔ اور یہ ظہر سے ایک گھنٹہ قبل کا واقعہ ہے۔" پھر آگے صفحہ ۳۲۲ پر لکھا ہے کہ "اس حملہ کے ذیل میں جو پچاس انصار حسینؑ شہید ہوئے۔ ان میں نہیں کہا جا سکتا کہ کون پہلے شہید ہوا اور کون بعد کو۔" حالانکہ تمام ارباب سیر و تواریخ کی تصریحات کے مطابق حملۂ اولیٰ وہ تھا جو عمر بن سعد کے پہلے پہل تیر چلانے کے بعد ہوا۔ اور اسی میں پچاس یا کم و بیش اصحاب حسینؑ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ جس حملہ کو جناب مولانا حملۂ اولیٰ قرار دے رہے ہیں۔ درحقیقت یہ تیسرا حملہ تھا۔ کیونکہ اس روز تین حملے ہوئے تھے۔ ایک ابن سعد کے تیر چلانے کے بعد، دوسرا مسلم بن عوسجہ کی شہادت سے پہلے، "تیسرا نماز ظہر سے پہلے۔" جیسا کہ ارباب مقاتل نے تصریحات فرمائی ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کے لیے وقائع ایام محرم، ص ۳۹۱۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۶۷۔ نفس المہموم، ص ۱۳۷۔ عاشر بحار، ص ۱۹۴۔ لہوف، ص ۹۴۔ لواعج الاشجان، ص ۱۱۰ وغیرہ کتب مقاتل دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہاں یہ درست ہے کہ بعض ارباب مقاتل نے یہی لکھا ہے کہ یہ پچاس شہید اس حملہ میں ہوئے تھے جو ہنگام ظہر سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے ہوا تھا جسے ہم نے تیسرا حملہ قرار دیا ہے۔ بنابریں صرف اصطلاح کا فرق رہ جائے گا کہ اس حملہ کو حملۂ اولیٰ قرار دینا چاہیے یا حملۂ ثالثہ۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاح کما لا یخفی علی اھل الحجی. واللہ العالم۔

انصارِ حسینؑ کے مختصر حالات وشہادات اوران کے زرّیں کارنامے

اگرچہ کتاب کی غیر معمولی ضخامت وحجم بڑھ جانے کا اندیشہ دامنِ بیان کو کوتاہ کرنے کا تقاضا کرتا ہے مگر یہ شہداء کربلا (فداھم امی و ابی) کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اگر ان کی حیرت انگیز قربانیوں اور ولولہ انگیز کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے مختصر حالات زندگی کا تذکرہ نہ کردیا جائے۔ عربی، فارسی اور اُردو میں اس موضوع پر متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جیسے "ابصار العین فی انصار الحسین"، "ذخیرۃ الدارین فیما یتعلق بالحسین واصحابہ"، "فرسان الہیجا" اور "شہداءِ کربلا" نیز شہید انسانیت میں بھی ان بزرگواروں کے مختصر مگر جامع حالات زندگی اور خصوصیات شخصی کا تذکرہ موجود ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ واقعاتی ترتیب کے مطابق (اگرچہ اس کا لحوظ رکھنا قریباً ناممکن ہے)[1] ان نفوسِ زاکیہ کا مختصر مگر مستند خاکہ پیش کرکے ان کے زرّیں کارناموں اور مقدس شہادتوں سے اپنی کتاب کے قارئین کرام کو روشناس کرائیں۔ تفصیلی حالات وکوائف دیکھنے کے شائقین مذکورہ بالا کتابوں کی طرف رجوع کرکے اپنے ذوقِ تحقیق وتفصیل کی تسکین فرماسکتے ہیں۔

اصل مقصد میں وارد ہونے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث اور عقل سلیم کی روشنی میں عام شہداء کے بالعموم اور شہداءِ کربلا کے بالخصوص کچھ فضائل ومحامد کا اجمالی تذکرہ کردیا جائے تاکہ ان کی عظیم قربانیوں کی

---

[1] **تبصرہ**:۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہداء کی ترتیب شہادت میں فریقین کے مؤرخین، محدثین اور ارباب مقاتل میں شدید اختلاف ہے۔ بعض نے تو صرف شہداء کے اسماء گرامی لکھ دیے ہیں اور ترتیب کے جنجال میں پڑے ہی نہیں۔ اور جنہوں نے ترتیب وار نام درج کیے ہیں۔ ان میں سخت اختلاف ہے۔ ایک مؤرخ ایک شہید کی شہادت کا تذکرہ پہلے کرتا ہے دوسرا بعد میں۔ بلکہ یہ معلوم کرنا بھی سخت دشوار ہے کہ جنگ مغلوبہ میں کن کن بزرگواروں نے جام شہادت نوش کیا اور مبارزت طلبی میں کون کون بزرگ شہید ہوئے؟ بلکہ اس امر پر بھی ارباب تاریخ متفق نظر نہیں آتے کہ ہنگام ظہر سے پہلے کون شہید ہوا۔ اور بعد میں کس نے شربت شہادت پیا۔ ارشاد شیخ مفیدؒ میں ترتیب کچھ ہے۔ امالی شیخ صدوق میں کچھ؟ بحار میں کچھ لکھا ہے اور عوالم میں کچھ۔ لہٰذا جو ایک میں مقدم ہے۔ وہ تاریخ میں مؤخر وعلیٰ ہذا القیاس۔ طبری میں جو ترتیب ہے کامل میں اس کے خلاف موجود ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ ترتیب شہادت کے مطابق (جو کہ جنگ مغلوبہ میں تو ویسے بھی ناممکن ہے) شہداء کرام کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس تلخ حقیقت کا صرف ہم نے ہی اعتراف نہیں کیا بلکہ اور بھی بعض صاف گو ارباب مقاتل نے کیا ہے۔ [بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۳۸ پر]

رفعت وعظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اور اس طرح ان مقدس ہستیوں کی بارگاہ معلیٰ میں ارمغانِ عقیدت بھی پیش ہو جائے ؎

شمع ہا بردہ ام از صدق بخاک شہداء
تا دل و دیدۂ خونفشاں بہ فشانم دادند!

فضیلتِ شہادت عقلِ سلیم کی روشنی میں

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ کسی کام کی قدر و منزلت کا تعین اس کی غرض وغایت کی بلندی یا پستی سے کیا جاتا ہے۔ کسی فعل کی غرض وغایت جس قدر بلند اور عظیم ہوگی اسی قدر وہ فعل ارفع و اعلیٰ قرار دیا جائے گا۔ اور جس قدر غرض وغایت دنی اور پست ہوگی وہ فعل اسی قدر حقیر اور دنی متصور ہوگا۔ واضح ہے کہ شہادت چونکہ خدا کی رضا جوئی کی خاطر اس کے دین کی بقاء اور شرف و مجد انسانی کے تحفظ کے لیے واقع ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ غرض وغایت دوسری تمام اغراض وغایات سے اشرف و اعلیٰ ہے۔ اس لیے بدیہی طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ رضائے الٰہی حاصل کرنے والے تمام افعال میں سے شہادت اجل و ارفع ہے۔ کیونکہ ؏

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

فضیلتِ شہادت قرآنِ حکیم کی روشنی میں

قرآن کریم میں اس قسم کی متعدد آیات شریفہ موجود ہیں۔ جن میں شہیدانِ راہِ خدا کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ (پ ۲، س بقرہ، ع ۳) "اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں کبھی مردہ نہ کہنا (وہ لوگ) زندہ

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ۳۳۷]

چنانچہ محدث خبیر جناب شیخ عباس قمی نفس المہموم، ص ۱۵۲ پر لکھتے ہیں: ﴿يقول مؤلف هذا الكتاب عباس القمي حشره الله مع اصحاب الحسين قدس الله ارواحهم انه اختلفت كلمات المورخين و المحدثين و ارباب المقاتل من الفريقين في ترتيب شهادة اصحاب الحسين و رجزهم و عددهم فبعض قدم منهم المؤخر و اخر اخر من قدمه الاخر و بعض اكتفى بذكر اساميهم و رجزهم و جملة منهم اقتصر على ذكر معدود منهم و سكت عن بقيتهم الخ.....﴾ خلاصہ مطلب یہ کہ محدثین و مؤرخین اور ارباب مقاتل میں شہداء کربلا کی ترتیب، ان کے رجز اور عدد میں شدید اختلاف ہے۔ اسی طرح مؤرخ بصیر شہزادہ فرہاد مرزا القمقام، ص ۲۵۳ پر رقمطراز ہیں: ﴿بر بصير متتبع پوشيده نيست كه هيچيك از محدثين و مؤرخين فريقين اسامی شهداء را بترتيب ايراد نه كرده اند و در تقديم و تاخير اصحاب و نسبت رجز بهر يك بس اختلاف است بعضی به ذكر اسامی و بيان او اجيز اكتفا نموده اند بلكه اكثر بذكر معدودی اختصار فرموده اند الخ﴾ مطلب وہی ہے جو اوپر درج ہے۔ والحق احق ان يتبع۔ (منہ عفی عنہ)

ہیں مگر تم (ان کی زندگی کی حقیقت کا) کچھ بھی شعور نہیں رکھتے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (پ ۴، س ال عمران، ع ۴) اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ جیتے (جاگتے موجود) ہیں اپنے پروردگار کے ہاں سے وہ (طرح طرح کی) روزی پاتے ہیں۔ (ترجمۂ فرمانؒ)

انہی حقائق کی بناء پر کہا گیا ہے: ''دنیا میں ہر چیز مر جاتی ہے کہ فانی ہے مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لیے جو اپنے اندر حیاتِ الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں کبھی بھی فنا نہیں ہے۔'' ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است[1]

فضیلتِ شہادت احادیثِ معصومینؑ کی روشنی میں

حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے آباء واجداد کے سلسلۂ سند سے روایت فرماتے ہیں کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا: ﴿للجنة باب يقال له باب المجاهدين يمضون اليه فاذا هو مفتوح وهم متقلدون بسيوفهم و الجمع في الموقف و الملائكة ترحب لهم[2]﴾ جنت کا ایک دروازہ جس کا نام باب المجاہدین ہے، کھلا ہوگا اور شہیدانِ راہِ خدا اس حال میں سب سے پہلے اس سے داخل ہوں گے کہ گلے میں تلواریں لٹکائے ہوئے ہوں گے اور ملائکہ بڑھ کر ان کو خوش آمدید کہیں گے حالانکہ ابھی دوسرے لوگ موقفِ حساب میں کھڑے ہوں گے۔

امام محمد باقرؑ اپنے آباء کرام کے سلسلۂ سند سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: ﴿ما من قطرة احب الى الله عز و جل من قطرة دم في سبيل الله﴾ خداوند عالم کو اس قطرۂ خون سے زیادہ کوئی قطرہ محبوب نہیں جو اللہ کی راہ میں بہایا جائے۔[3]

جناب زید شہید بن امام زین العابدینؑ اپنے بزرگوں کے سلسلۂ سند سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿للشهيد سبع خصال من الله قطرة من دمه مغفور له كل ذنب الثانية يقع راسه في حجر زوجته من الحور العين و تمسحان الغبار عن وجهه و تقولان مرحباً بك و يقول هو مثل ذلك لهما و الثالثة يكسى من كسوة الجنة والاربعة تبتدره خزنة الجنة بكل ريح طيبة ايهم

---

[1] شہادت حسینؑ، از: آزاد، ص ۵۵۔
[2] وسائل الشیعہ، ج ۲، کتاب الجہاد۔
[3] وسائل الشیعہ، ج ۲، باب الجہاد۔

یاخذہ معہ و الخامسۃ ان یری منزلہ و السادسۃ یقال لروحہ اسرح فی الجنۃ حیث شئت و السابعۃ ان ینظر فی وجہ اللہ و انہا لراحۃ لکل نبی و شہید﴾

شہید کو من جانب اللہ سات خوبیاں حاصل ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کے پہلے قطرۂ خون کے گرتے ہی اس کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ دوسری اس کا سر حوران جنت میں سے دو زوجاؤں کی گود میں ہوتا ہے۔ تیسری اس کو جنتی لباس زیب تن کرایا جاتا ہے۔ چوتھی: خازنان جنت ہر اچھی خوشبو لے کر اس کے پاس آتے ہیں تا کہ جسے وہ پسند کرے اپنے ہمراہ لے جائے۔ پانچویں: وہ جنت میں اپنے مکان کو دیکھ لیتا ہے۔ چھٹی: اس کی روح کو کہا جاتا ہے کہ جنت میں جہاں جی چاہے سیر و تفریح کر۔ ساتویں: وہ پروردگار کی عظمت و جلالت کے جمال باکمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جو ہر نبی و شہید کے لیے باعث راحت و سکون ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء و اجداد علیہم السلام کے سلسلۂ سند سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿ان فوق کل بر بر حتی یقتل فی سبیل اللہ فاذا قتل فی سبیل اللہ فلیس فوقہ بر﴾ ہر نیکی کے اوپر کوئی اور نیکی ہوتی ہے لیکن جب انسان راہ خدا میں شہید ہو جائے تو یہ وہ نیکی ہے جسکے اوپر اور کوئی نیکی نہیں ہے۔[2]

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿فان الجہاد باب من ابواب الجنۃ﴾ جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔[3] امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے: ﴿الخیر کلہ فی السیف و تحت السیف و فی ظل السیف﴾ تمام تر خیر و خوبی تلوار میں، تلوار کے اندر اور تلوار کے سایہ میں ہے۔[4]

شہداء کربلا کی خصوصی فضیلت

فضیلت شہادت کے بارے میں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے (جو کہ قطرہ از دریا اور دانہ از انبار کی حیثیت رکھتا ہے) یہ عام شہادت اور شہداء کے بارے میں ہے ظاہر ہے کہ کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح شہادت کے افراد میں بھی باہمی درجات کا تفاوت و اختلاف موجود ہے اور شہداء کربلا شہادت کے جس بلند مقام پر فائز ہیں وہ محتاج دلیل و برہان نہیں ہے خود سرکار سید الشہداء نے بڑی وضاحت کے ساتھ تصریح فرما دی ہے کہ ﴿فانی لا اعلم اصحاباً اوفی ولا خیراً من اصحابی ولا اھلبیت ابرو لا اوصل ولا افضل من اھل بیتی فجزاکم اللہ عنی خیر الجزاء﴾[5] میں اپنے اصحاب سے زیادہ بہتر اور باوفا اصحاب نہیں جانتا۔ اور نہ ہی اپنے اہل بیت

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۲، کتاب الجہاد۔
[2] وسائل الشیعہ، ج ۲، کتاب الجہاد۔
[3] وسائل، ج ۲، باب الجہاد۔
[4] وسائل، ج ۲، باب الجہاد۔
[5] ارشاد شیخ، ص ۲۵۱۔ عاشر بحار، ص ۱۹۱ وغیرہ۔

سے زیادہ نیکوکار، صلۂ رحمی کرنے والے اور افضل کوئی اہل بیت جانتا ہوں۔ آپ کے اس ارشاد باسداد سے واضح و عیاں ہے کہ دیگر انبیاء و مرسلین کے اصحاب تو بجائے خود آنجنابؑ کے اصحاب باصفا کا مقام و مرتبہ خود سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت امیر المومنینؑ اور جناب امام حسن مجتبیٰؑ کے اصحاب باوفا سے بھی بلند و بالا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے اپنی شہادت سے پہلے یہ روایت نقل فرمائی کہ آنحضرت نے مجھ سے فرمایا: ﴿انّ رسول اللّٰہ قال لی یا بنیّ انک ستساق الی العراق وھی ارض قد التقی بھا النبیون و اوصیاء النبیین وھی ارض تدعی عموراء و انک تستشھد و یستشھد معک جماعۃ من اصحابک لا یجدون الم مسّ الحدید و قلنا یا نار کونی برداً و سلاماً علی ابراھیم کذا یکون الحرب برداً و سلاماً علیک و علیھم فابشروا فو اللّٰہ لان قتلونا فانا نرد علی نبینا﴾[1]

تجھے عنقریب زمین عراق کی طرف لے جایا جائے گا یہ وہ زمین ہے جہاں نبیوں و وصیوں کی باہمی ملاقاتیں ہوئی ہیں اسے عمورا بھی کہا جاتا ہے وہاں تو شہید کیا جائے گا۔ اور تیرے ہمراہ ایک گروہ بھی شہید کیا جائے گا۔ جو ہتھیاروں کی تکلیف محسوس نہیں کرے گا۔ پھر آنحضرتؐ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: ''ہم نے کہا اے آگ! تو ٹھنڈی ہو جا۔ اور ابراہیم کے لیے باعث سلامتی بن جا'' اسی طرح آتش جنگ تمہارے اور ان کے لیے سرد اور باعث سلامتی ہوگی پھر امام نے فرمایا: تمہیں بشارت ہو کہ اگر ان لوگوں نے ہمیں شہید کر دیا تو ہم اپنے پیغمبر کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ روز عاشوراء اصحاب حسینی موت کے منہ میں جانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور ایسے جانگداز اور حوصلہ شکن حالات میں ان کے چہرے تمتماتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور وہ مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے ؎

لبسوا القلوب علی الدروع کانھم = یتھافتون الی ذھاب الانفس

وارد ہے کہ روز عاشوراء جناب بریر ہمدانی نے عبدالرحمٰن کے ساتھ کچھ مزاح کیا۔ جناب عبدالرحمٰن نے کہا: بھلا یہ بھی کوئی مزاح کا وقت ہے؟ اس پر بریر نے کہا: میری قوم جانتی ہے کہ میں نے جوانی اور بڑھاپے میں کبھی بھی مزاح نہیں کیا۔ لیکن آج میں اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے خوش ہوں۔ ﴿واللّٰہ ان بیننا و بین الحور العین الا ان یمیل علینا ھؤلا باسیافھم و لوددت انھم قد مالوا علینا باسیافھم﴾[2] ہمارے اور حور العین کے درمیان

---

[1] قمقام، ص ۳۳۸۔

[2] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۳۱۔ مقتل الحسین، ص ۳۳۸۔ نفس المہموم، ص ۱۲۷۔

صرف اس قدر فاصلہ ہے کہ ادھر یہ لوگ تلواروں سے ہم پر حملہ کریں گے۔ ادھر ہم جنت الفردوس میں پہنچ جائیں گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ ابھی ہم پر حملہ کر دیں۔

مجاہد فی سبیل اللہ ایسے کم نظر آئے قیامت ہو جنہیں اک اک گھڑی شوق شہادت میں

ایسا ہی جواب جناب حبیب بن مظاہر (مظہر) نے دیا تھا جب کہ ان کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر یزید بن حصین نے ان پر اعتراض کیا تھا۔[1] یقین کی یہ دولت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

شب عاشورا کے واقعات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ سرکار سید الشہداءؑ نے اپنے خالص اصحاب کو باعجاز امامت جنت میں اپنے اپنے مقامات و منازل دکھا دیئے تھے کہ اے فلاں یہ تیری منزل ہے۔ اور اے فلاں یہ تیرا مقام ہے۔[2] یہ سب شواہد ایک طرف صرف حضرت صادق آل محمدؑ کا شہدائے کربلا کی زیارت میں یہ فرمانا ہی ان کی فوق العادت عظمت وجلالت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ﴿بابی انتم و امی طبتم و طابت الارض التی فیھا دفنتم و فزتم فوزاً عظیما﴾ اے شہداء کربلا! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ تم پاک و پاکیزہ ہو گئے اور وہ زمین بھی پاک و پاکیزہ ہو گئی جس میں تم دفن ہوئے۔[3] اور تم نے فوز عظیم حاصل کیا۔ یلیتنا کنا معھم فنفوز فوزاً عظیماً ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

بابی الذین تسرعوا الحمامھم دون الحسین فاحرزو اعین الرضاء

افادہ راجع بطریق ہائے جنگ

مخفی نہ رہے کہ عربوں میں جنگ کے دو طریقے رائج تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ ایک ایک جوان میدان کار زار میں نکل کر داد شجاعت دیتا تھا (اور کبھی کبھی یہی طریقہ دو، دو، تین تین اور چار چار کی صورت بھی اختیار کر لیتا تھا) اسے مبارزت طلبی کہا جاتا ہے اور زیادہ تر اسی طریقہ پر عمل درآمد ہوتا تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک فریق سارے کا سارا یا اس کا کثیر حصہ دوسرے فریق پر یک بارگی دھاوا بول دیتا اور فریقین گتھم گتھا ہو جاتے۔ ایسے جنگ مغلوبہ کہا جاتا ہے۔ اکابر علماء کے کلمات و مقاتل سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے (جیسا کہ قبل ازیں بھی بیان ہو چکا ہے) کہ روز عاشورہ صرف تین بار جنگ مغلوبہ واقع ہوئی۔ (۱) حملۂ اولیٰ۔ (۲) جناب مسلم بن عوسجہ کی شہادت سے قبل۔ (۳) اور نماز ظہر سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے۔ اس کے علاوہ باقی

---

[1] رجال کشی، ص ۵۳۔ مقتل الحسین، ص ۲۸۸۔ نفس المہموم، ص ۱۲۷۔ [2] نفس المہموم، ص ۱۲۳ وغیرہ۔

[3] مفاتیح الجنان، ص ۴۳۳۔

تمام جنگ پہلے طریقہ (مبارزت طلبی) کے مطابق ہوئی ہے۔[1] ہم پہلے مبارزت طلبی میں شہید ہونے والے اصحاب کے حالات زندگی اور شہادات لکھتے ہیں۔ بعد میں جنگ مغلوبہ میں شہید ہونے والوں کے حالات قلمبند کیے جائیں گے انشاء اللہ۔

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی

نام عبداللہ بن عمیر بن عباس بن عبد قیس بن علیم بن جناب الکلبی العلیمی ہے اور کنیت ابو وہب ہے۔ جناب شیخ طوسی نے فہرست میں انہیں جناب امیر علیہ السلام کے اصحاب میں سے شمار کیا ہے۔ کوفہ میں محلہ بنی ہمدان کے نزدیک چاہ سعد کے پاس گھر تھا۔ جس میں اپنی زوجہ ام وہب کے ہمراہ (جو بنی حربن قاسط سے تھیں) رہائش پذیر تھے۔ اس نے ایک دن مقام نخیلہ کے پاس (جو کہ کوفہ سے باہر تھا) لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ حسین بن فاطمہ بنت رسولؐ کے ساتھ جنگ کے لیے بھیجے جا رہے ہیں۔ عبداللہ نے (دل میں) کہا: بخدا میں حصول ثواب وسعادت کی خاطر مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے کا بڑا شائق تھا۔ میں سمجھتا ہوں دختر رسولؐ کے فرزند کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے ساتھ جہاد کرنے کا ثواب کفار ومشرکین کے ساتھ جہاد کرنے سے زیادہ ہی ہوگا۔ چنانچہ عبداللہ گھر پہنچا اور اپنی نیک بخت بیوی سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ اس نے اس کے ارادہ کی تائید کرتے ہوئے اسے بھی ہمراہ لے جانے کی استدعا کی۔ چنانچہ عبداللہ اسے ہمراہ لے کر آٹھویں محرم کی شب کو امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ روز عاشورا تک خدمت امام میں رہا۔ روز عاشوراء جب پسر سعد کے تیر مارنے سے آغاز جنگ ہو گیا۔ اور اس حملۂ اولیٰ میں کافی انصار حسینؑ عروس موت سے ہمکنار بھی ہو گئے تو اس کے بعد مبارزت طلبی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے پہل فوج مخالف سے دو آدمی نکل کر مبارزت طلب ہوئے۔ ایک زیاد بن ابیہ کا آزاد کردہ غلام یسار۔ دوسرا عبید اللہ بن زیاد کا غلام سالم بن عمرو۔ ادھر حسینی جماعت سے جناب حبیب بن مظاہر (مظہر) اور جناب بریر بن خضیر اٹھے۔ مگر جناب امام حسین علیہ السلام نے ان کو روک دیا۔ اس اثناء میں جناب عبداللہ بن عمیر کلبی نے اذن جہاد طلب کیا۔ امامؑ نے اس کے قد وقامت پر نگاہ ڈالی دیکھا کہ گندم گوں رنگ، لانبا قد، طاقتور کلائیاں اور چوڑے کاندھوں والا جوان ہے۔ پھر فرمایا: میرا خیال ہے کہ یہ مقابلہ میں آنے والوں کو خوب قتل کرے گا۔ خلاصۂ کلام امام نے اسے اذن جہاد دیا اور عبداللہ میدان میں نکلے۔ ان دونوں نے اس سے نام ونسب دریافت کیا۔ عبداللہ نے اپنا حسب و نسب بیان کیا۔ انہوں نے کہا: ہم تمہیں نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ میں زہیر بن القین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر نکلے۔ یسار، سالم کے آگے تھا۔ جناب عبداللہ نے یہ کہہ کر کہ ﴿یا ابن الزانیۃ و بک رغبۃ عن مبارزۃ

۱۔ وقائع ایام محرم ص ۳۹۱۔

احد﴾ اے زن زانیہ کے بیٹے! تم میرے مقابلہ سے روگردانی کرتے ہو؟ پھر اس پر حملہ کر دیا۔ اور تلوار اس کے جسم میں گھونپ دی۔ وہ اسے قتل کرنے میں مشغول تھا کہ سالم نے اس پر حملہ کر دیا۔ اصحاب حسینؑ نے پکار کر کہا: خیال کرنا غلام نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔ جناب عبداللہ نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ جب یسار کو واصل جہنم کر دیا تو سالم کی طرف متوجہ ہوا۔ سالم نے تلوار کا وار کیا۔ عبداللہ نے اپنے بائیں ہاتھ پر اسے روکا۔ جس سے اس کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں مگر اس کے باوجود عبداللہ نے جواب میں ایسا سخت وار کیا کہ سالم جہنم رسید ہو گیا۔ ہر دو ناریوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد عبداللہ یہ رجز پڑھنے لگا:

ان تنکرونی فانا ابن الکلبی	حسبی بیتی فی علیم حسبی
انی امرء ذو مرّة و عصب	ولست بخوّار عند النکب
انی زعیم لک ام وهب	بالطعن فیهم مقدماً و الضرب

ضرب غلام مؤمن بالربّ

یہ رجزیہ اشعار سن کر ان کی زوجہ ام وہب نے ایک گرز ہاتھ میں لیا اور یہ کہتی ہوئی کہ ﴿فداک ابی و امی قاتل دون الطیبین ذریة محمدؐ﴾ (میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں ذریت پیغمبرؐ کے لیے خوب جنگ کرو) اپنے شوہر کی طرف میدان کارزار میں بڑھی۔ عبداللہ نے ہر چند اسے واپس کرنا چاہا۔ مگر اس نے عبداللہ کا کپڑا پکڑ کر کہنا شروع کیا۔ میں اس وقت تم سے جدا نہ ہوں گی جب تک تمہارے ساتھ جام شہادت نوش نہ کروں گی۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت امام حسینؑ نے بآواز بلند فرمایا: ﴿جزیتم من اهل البیت خیراً ارجعی رحمک اللّٰه الی النساء فاجلسی معهن فانه لیس علی النساء قتال﴾ خدائے تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ عورتوں کی طرف واپس پلٹ آؤ۔ خدا تم پر رحم کرے ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ کیونکہ عورتوں پر جہاد نہیں ہے۔ حکم امام سن کر وہ مؤمنہ واپس لوٹ آئی۔

ادھر چونکہ فوج مخالف سے پھر کوئی مبارز نہ نکلا۔ اس لیے جناب عبداللہ بھی خدمت امام میں واپس آ گئے۔ اس کے بعد جناب مسلم بن عوسجہ میدان جنگ میں گئے (جس کی تفصیل بعد میں آ رہی ہے) اور اس وقت شمر بن ذی الجوشن نے فوج کے میسرہ سے حسینی سپاہ کے میسرہ پر حملہ کیا۔ اور اصحاب حسینؑ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس وقت اس جنگ مغلوبہ میں جناب عبداللہ بن عمیر نے پھر خوب داد شجاعت دی۔ مخالف کے اور دو سپاہیوں کو واصل جہنم کیا۔ اس کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی اور بکیر بن حی تیمی کے ہاتھوں شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوا۔ جب اس کی زوجہ ام وہب نے یہ منظر دیکھا تو تاب ضبط نہ رہی۔ میدان کارزار میں پہنچ کر اپنے عزیز شوہر کے چہرہ سے گرد و غبار

صاف کرنا شروع کی اور ساتھ ہی یہ کہتی جاتی تھی: ﴿هنیئاً لک الجنة اسئل الله الذی رزقک الجنة ان یصحبنی معک﴾ تمہیں جنت مبارک ہو! جس خدائے بزرگ و برتر نے تمہیں شہادت کا درجہ عطا فرمایا ہے اس سے دعا کرو کہ مجھے بھی تمہارے ساتھ بلا لے۔ شمر نے اپنے غلام رستم سے کہا کہ اس کے سر پر گرز مار کر اس کا کام تمام کر دو۔ چنانچہ اس شقی نے اس مظلومہ کو شہید کر دیا۔ اس طرح اس محترم خاتون کا خون ناحق بھی تصویر کربلا میں رنگ بھرنے کے کام آیا ؎

چہ خوش رسمے بنا کردند بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را [1]

(۲) حر بن یزید بن ناجیہ بن قعنب بن عتاب بن ہرمی بن ریاح بن یربوع التمیمی الیربوعی الریاحی

ان کا خاندان قدیم الایام سے عزت و عظمت کا مالک تھا۔ حُر کا جدِ اعلیٰ عتاب بادشاہ حیرہ نعمان بن منذر کے مخصوصین میں سے تھا۔ خود جناب حُر کا شمار کوفہ کے رؤساء و صنادید میں ہوتا تھا اور سپاہ ابن زیاد میں ایک دستۂ فوج کے افسر اعلیٰ تھے۔ پہلے پہل ابن زیاد نے انہی کو ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ امام حسینؑ کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے بعد روز عاشوراء تک جو جو واقعات درپیش آئے وہ آپ سابقہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ عبداللہ بن عمیر کی دلیرانہ جنگ کے نتیجہ میں جب یسار اور سالم قتل ہو چکے تو احساس شکست کو کم کرنے نیز مغلوب الغضب ہو کر عمرو بن الحجاج زبیدی نے جو فوج یزید کے میمنہ کا افسر تھا۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ حسینی مجاہدین کے میمنہ پر حملہ کر دیا۔ مگر سپاہ حسینی نے اس موقع پر صبر و ثبات کا عجیب مظاہرہ کیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ﴿نسوالہ علی الرکب و اشرعوا الرماح نحوھم﴾ انہوں نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک کر نیزوں کی انیاں حملہ آوروں کے سامنے کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مخالف کے گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور جب مایوس ہو کر واپس ہونے لگے تو اصحاب حسینؑ نے ان کو تیروں کی زد پر دیکھ کر تیر مارنے شروع کیے جس سے مخالف کے کچھ آدمی قتل ہوئے اور کچھ زخمی۔ [2]

یہ حالت دیکھ کر حُر خدمت امام میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ﴿اذا کنت اول من خرج علیک فاذن لی ان اکون اول قتیل بین یدیک لعلی اکون ممن یصافح جدک محمداً غداً یوم القیامة﴾ فرزند رسولؐ! میں نے سب سے پہلے آپ پر خروج کیا۔ اب مجھے اجازت مرحمت فرمایئے تاکہ سب سے پہلے آپ پر جان قربان کروں تاکہ اس وسیلہ سے بروز قیامت آپ کے جد نامدارؐ کے ساتھ مصافحہ کر سکوں۔ سید اجل ابن طاؤس نے

---

1. ذخیرۃ الدارین فیما یتعلق بسیدنا الحسینؑ، ص ۲۰۳۔ فرسان الہیجا در حالات اصحاب سید الشہداء، ص ۲۵۳۔ کامل ج ۳، ص ۲۸۹ وغیرہ۔
2. عاشر بحار، ص ۱۹۵۔ نفس المہموم، ص ۱۲۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۸۹۔

جناب حُر کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿انما اراد اول قتيل من الان لان جماعة قتلوا قبله كما ورد﴾ (لہوف، ص ۹۲) یعنی ان کی مراد یہ تھی کہ (حملۂ اولیٰ کے بعد) اب جو شہید ہوں ان سے میں پہلے درجۂ شہادت پر فائز ہوں۔ کیونکہ ان سے قبل ایک جماعت جام شہادت نوش کر چکی تھی۔ بہرحال جناب حُر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں نکل آئے۔

انی انا الحر وماوی الضيف　　اضرب فی اعناقكم بالسيف

عن خير من حل بارض الخيف　　اضربكم ولا ارىٰ من حيف

اس کے بعد فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے۔ بعض ارباب تاریخ کا بیان ہے کہ جب حُر لشکر ابن سعد سے علیحدہ ہو کر حسینی جماعت میں شامل ہوئے تھے تو مخالف فوج کے ایک سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا: بخدا اگر مجھے اس وقت حُر کے جانے کا علم ہوتا تو میں ایک ہی نیزے سے اس کا کام تمام کر دیتا۔ اب جب کہ جناب حُر تن تنہا نرغۂ اعداء میں گھس کر شمشیر زنی کر رہے تھے اور یہ شعر بھی پڑھتے جاتے تھے جو بالکل موجودہ حالت کی ترجمانی کر رہا تھا کیونکہ ان کا گھوڑا تلواریں لگنے سے بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔

ما زلت ارميهم بثغرة نحره　　ولبانه حتى تسربل بالدم

میں ان کو اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینہ سے برابر مارتا رہا۔ یہاں تک کہ گھوڑے نے خون کی چادر اوڑھ لی۔

حصین بن تمیم نے (جو کہ عبید اللہ بن زیاد کا پولیس افسر تھا) شخص مذکور یزید بن تمیمی سے کہا: یہی حُر ہے جس کے قتل کی تمہیں تمنا تھی۔ یہ سن کر یزید مقابلہ کے لیے نکلا اور حُر سے دریافت کیا: کیا مقابلہ کرو گے؟ جناب حُر نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد حُر نے اس پر ایک ایسا زبردست وار کیا کہ یزید واصل جہنم ہو گیا۔ حصین بن تمیم کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یزید کی موت حُر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد چونکہ فوج مخالف سے کوئی شخص مقابلہ کے لیے نہ نکلا۔ اس لیے حُر واپس آ گئے۔ اگرچہ کئی مختصر کتب مقاتل میں یہ تفصیل مذکور نہیں لیکن کتب مبسوطہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب حُر نماز ظہر کے ہنگامۂ رستخیز کے بعد درجۂ رفیعہ شہادت پر فائز ہوئے۔ چنانچہ جناب حبیب بن مظاہر (مظہر) کی شہادت کے بعد جناب حُر جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر میدان کارزار میں یہ رجز پڑھتے ہوئے دوسری بار نکلے۔

اليت لا اقتل حتى اقتلا　　اضربهم بالسيف ضرباً معضلاً

لا ناكلاً عنهم ولا معللاً　　لا حاجزاً عنهم ولا مبدلاً

احمي الحسين الماجد المؤملا

پھر صفوف اعداء کے بالمقابل پہنچ کر یہ رجز پڑھا۔

انی انا الحر و نجل الحر	اشجع من ذی لبد هزبر
و لست بالجبان عند الکر	لکننی الوقاف عند الفر

جناب زہیر بھی آپ کے ساتھ شریک جہاد ہو گئے۔ اور دونوں نے بڑھ بڑھ کر کوفیوں کو واصل جہنم کرنا شروع کیا۔ اگر ایک نرغۂ اعداء میں گھر جاتا تھا تو دوسرا اسے چھڑاتا تھا۔ ایوب ابن مشرح خیوانی نے جناب حُر کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں۔ گھوڑا گرنے لگا تو جناب حُر بپھرے ہوئے شیر کی طرح جست لگا کر اتر پڑے اور پھر پیادہ پا جنگ شروع کی۔ اسی اثناء میں حُر نے کچھ اوپر چالیس[1] ناریوں کو اور بروایتے کچھ اوپر اسی[2] کو جہنم رسید کیا۔ اس وقت یہ رجز ان کی زبان پر تھا ؎

ان تعقرونی فانا ابن الحر	اشجع من ذی لبد هزبر

کچھ وقت یہی کیفیت جاری رہی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد دشمن کی پیادہ فوج نے جناب حُر کو اس طرح گھیرے میں لے لیا کہ زہیر کی مدافعت بھی بے کار ثابت ہوئی۔ ایوب ابن مشرح خیوانی اور شہسواران کوفہ میں سے ایک شخص نے مل کر ان کو شہید کر دیا۔ اصحاب حسینؑ ان کی لاش اٹھا کر خدمت امامؑ میں لائے۔ امامؑ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: ﴿قتلة مثل قتلة النبیین و آل النبیین﴾ اس کا قتل انبیاء اور اولاد انبیاء کی طرح ہے۔[3] ابھی ان میں کچھ رمق حیات باقی[4] تھے۔ آنجنابؑ نے ان کے چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿انت الحر کما سمتک امک و انت الحر فی الدنیا و الآخرة﴾ واقعاً تم حُر (آزاد) ہو۔ جیسا کہ تمہاری ماں نے تمہارا نام رکھا تھا۔ تم دنیا و آخرت میں حُر (آزاد) ہو۔[5] اس کے بعد جناب سید الشہداءؑ نے حُر کا یہ مرثیہ پڑھا:

لنعم الحر حر بنی ریاح	صبور عند مشتبک الرماح
و نعم الحر اذ نادی حسینًا	و جاد بنفسه عند الصباح[6]

کتاب فرسان الہیجا (ص ۱۲۷) اور ناسخ التواریخ (ج ۶، ص ۲۵۱) میں مندرجہ ذیل تین اور اشعار بھی مذکور ہیں:

و نعم الحر فی رهج المنایا	اذا الابطال تخفق بالصفاح

---

[1] مناقب شہر ابن آشوب، ج ۳، ص ۹۲۔

[2] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۵۱۔

[3] نفس المہموم، ص ۱۱۸؛ ۱۳۔ اعاشر بحار، ص ۱۱۷؛ ۱۳۔ بحار، ص ۱۲۵؛ کامل، ج ۳، ص ۳۰۔

[4] مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۷۸۔

[5] ناسخ، ج ۶، ص ۲۵۱۔ نفس المہموم، ص ۱۹۶۔ مقتل الحسین، ص ۲۷۸۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۰۰۔ فرسان الہیجا، ص ۱۲۷۔

[6] روضۃ الواعظین، فتال نیشاپوری، ص ۱۶۰۔ بعض مورخین نے اس مرثیہ کو بعض اصحاب حسینؑ کی طرف اور بعض نے حضرت امام زین العابدینؑ کی طرف نسبت دی ہے۔ (مقتل العوالم، ص ۸۵)

و نعم الحر اذ واسی حسینا	و فاز بالهدایة و الفلاح
فیا رب اضفه فی جنان	و زوّجه مع الحور الملاح

(۳) مسلم بن عوسجہ اسدی

جناب کا نام مسلم بن عوسجہ بن ثعلبہ بن رودان بن اسد بن خزیمہ الاسدی السعدی اور کنیت ابوالحجل ہے۔ یہ بزرگوار صائم النہار شب زندہ دار، قاری قرآن، بڑے بہادر و مرد میدان تھے۔ اور حضرت امیر المومنین کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ ان کے ہمراہ تینوں لڑائیوں (جمل، صفین اور نہروان) میں شریک رہ کر داد شجاعت دے چکے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں انہیں صحابہ رسولؐ میں شمار کیا ہے۔ اور شعبی نے ان سے روایت حدیث بھی کی ہے۔ آقای مامقانی نے اپنے رجال میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کی جلالت قدر، عدالت، قوت ایمان اور شدت ورع و تقویٰ احاطۂ تقریر و تحریر سے باہر ہے یہ وہی بزرگوار ہیں کہ جب شب عاشوراء سید الشہداءؑ نے اپنے تاریخی خطبے میں اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی تو انہوں نے عرض کیا تھا: بھلا یہ ممکن ہے کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ اگر ایسا کریں تو فردائے قیامت بارگاہ ایزدی میں آپ کے جد نامدار کو کیا جواب دیں گے؟ بخدا اگر مجھے یقین ہوتا کہ قوم جفاکار مجھے قتل کرے گی۔ پھر زندہ ہو جاؤں گا۔ وہ پھر مجھے قتل کر دے گی اور لاش کو جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دے گی۔ اسی طرح اگر ستر بار بھی مجھ سے یہ سلوک کیا جائے گا۔ تب بھی آپ کی تائید و نصرت سے دست برداری اختیار نہ کروں گا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ صرف ایک بار ہی شہید ہونا ہے۔

اس سے پہلے جب حضرت مسلمؑ کوفہ میں تشریف لے گئے تھے تو یہی مسلم ان کے معتمد خصوصی تھے اور لوگوں سے ان کے لیے بیعت لیتے تھے۔ بہر حال روز عاشوراء جب دوسری بار جنگ مغلوبہ واقع ہوئی (جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے) اور عمرو بن الحجاج نے سپاہ حسینؑ کے میمنہ پر اور شمر بن ذی الجوشن نے میسرہ پر حملہ کر دیا اور اس حملہ کی وجہ یہ تھی کہ دست بدست لڑائی میں مخالف کا بڑا نقصان ہو رہا تھا۔ چنانچہ عمر بن الحجاج نے اپنی فوج کو پکار کر کہا۔ اے احمقو! کچھ پتہ بھی ہے کہ کس سے جنگ کر رہے ہو؟ یہ خاص شہسوار اور جان پر کھیلنے والے لوگ ہیں۔ اکیلا کوئی جنگ کے لیے نہ نکلے۔ ان کی تعداد ہی کیا ہے۔ اگر تم سب مل کر ان کو پتھر بھی مارو تو یہ سب ختم ہو سکتے ہیں۔ ابن سعد نے بھی اس کی تجویز کو پسند کیا۔ مزید برآں عمرو نے آگے بڑھ کر اپنی فوج کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے کہا:

﴿یا اهل الکوفة الزموا طاعتکم و جماعتکم ولا ترتابوا فی قتل من مرق من الدین﴾ اے کوفہ والو! اپنی اطاعت و جماعت کو لازم پکڑے رہو۔ اور جو دین سے نکل گئے ہیں ان کے قتل کے جواز میں شک نہ کرو۔ (معاذ

---

[1] قرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۱۸۔

اللہ) امام حسینؑ نے جواب میں فرمایا: ﴿یا عمرو بن الحجاج اعلی تحرض الناس انحن مرقنا من الدین و انتم ثبتم علیه اما واللہ لتعلمن لو قد قبضت ارواحکم و متم علی اعمالکم اینا مرق من الدین و من هو اولی بصلی النار﴾ اے عمرو بن الحجاج! تو لوگوں کو میرے قتل پر آمادہ کرتا ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم دین سے خارج ہو گئے اور تم اس پر ثابت قدم ہو؟ جب تمہاری روحیں قبض ہوں گی اور موجودہ کردار پر تمہاری موت واقع ہوگی تو پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ دین سے کون خارج ہوا ہے اور آتش جہنم میں جلنے کا سزاوار کون ہے؟ اس وقت جناب مسلم حسینی لشکر کے میسرہ میں تھے جس کے سالار زہیر بن القین تھے۔ جناب مسلمؓ اگرچہ سن رسیدہ وضعیف العمر تھے مگر قوت ایمانی اور جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر بپھرے ہوئے شیر کی طرح گھوڑے کو ایڑ لگا کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں آ گئے۔

ان تسئلوا عنی فانی ذو لبد ۔۔۔ من فرع قوم من ذری بنی اسد

اگر تم میرا نام و نسب پوچھتے ہو تو میں شیر بیشۂ شجاعت ہوں اور بنی اسد کے اشراف سے تعلق رکھتا ہوں۔

فمن بغانی حائد عن الرشد ۔۔۔ و کافر بدین جبار الصمد

جو لڑنے کے لیے میرا طلبگار ہے وہ طریق رشد و ہدایت سے برگشتہ ہے اور جبار و صمد کے دین کا منکر ہے۔

یہ کہہ کر برق خاطف اور صرصر عاصف کی مانند سپاہ خون آشام پر ٹوٹ پڑے۔ اور حرب و ضرب کا تنور گرم کر دیا۔ جو سامنے آیا کسی کو نیزہ سے اور کسی کو تلوار سے واصل جہنم کیا۔ چنانچہ ابن سعد کا ایک لشکری مقابلہ کے لیے نکلا۔ جناب مسلمؓ نے اس کے داہنے پہلو میں نیزے کا ایک ایسا سخت وار کیا کہ بائیں پہلو سے باہر نکل آیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا پھر دوسرا نکلا۔ اس کا بھی یہی انجام ہوا۔ اسی طرح کشت و خون کرتے ہوئے پچاس سواروں کو جہنم رسید کیا۔

بہر حال اصحاب حسینؑ نے اس دلیری و پامردی کے ساتھ مخالف کے حملہ کا مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے اور اسے واپس ہونا پڑا مگر اس دوران میں جناب مسلمؓ بُری طرح زخمی ہو کر گر گئے تھے ان کو شہید کرنے میں مسلم بن عبداللہ الضبابی و عبدالرحمٰن بن ابی خشکارہ البجلی باہم شریک تھے۔ ان دونوں کو جناب مختارؓ نے واصل جہنم کیا تھا۔[1]

جب غبار جنگ چھٹا تو دیکھا گیا کہ جناب مسلمؓ بن عوسجہ خاک و خون میں لت پت پڑے ہیں۔ جناب سید الشہداء علیہ السلام عقاب کی طرح جھپٹ کر مسلم کے بالین سر تشریف لے گئے۔ اس وقت جناب حبیبؓ بن مظاہر بھی آپؑ کے ہمراہ تھے۔ امامؑ نے دیکھا کہ ابھی کچھ رمق حیات باقی ہیں۔ فرمایا: ﴿یرحمک اللہ یا مسلم﴾ اے مسلم! خدا تم پر رحمت نازل کرے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَهٗ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ وَمَا

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ﴾ کچھ جانے والے جا چکے۔ اور کچھ منتظر بیٹھے ہیں۔ کسی نے بھی عہد و پیمان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ پھر جناب حبیب نے قریب جا کر کہا: ﴿عز علیّ مصرعک یا مسلم ابشر بالجنة ﴾ مسلم! تمہاری موت مجھ پر شاق ہے تمہیں جنت کی بشارت ہو۔ جناب مسلم نے کمزور آواز کے ساتھ جواب میں کہا: ﴿بشرک اللّٰہ بخیر ﴾ خدا تمہیں بھی خیر و خوبی کی بشارت دے۔ جناب حبیب نے کہا: ﴿لو لم اعلم انی فی الاثر لاحببت ان توصی الی بما اھمک ﴾ اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ میں بھی عنقریب آپ کے پیچھے آ رہا ہوں تو ضرور تم سے کہتا کہ جو وصیت کرنا ہو کرو۔ جناب مسلم نے کہا: ﴿اوصیک بھذا (و اشار الی الحسینؑ) ان تموت دونہ ﴾ امام حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں اس بزرگوار کے متعلق وصیت کرتا ہوں کہ ان پر اپنی جان نثار کرنا۔ جناب حبیب نے کہا: ﴿افعل و ربّ الکعبہ ﴾ رب کعبہ کی قسم! میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔ اسی اثناء میں جناب مسلم بن عوسجہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

جناب مسلم کی کنیز نے یہ جانگداز منظر دیکھ کر ندبہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا: ﴿وا مسلماہ یا سیداہ یابن عوسجتاہ ﴾ ہائے مسلم! ہائے میرے سردار! کنیز کی آواز سن کر عمرو بن الحجاج کے سپاہیوں نے مسرت و شادمانی کے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ ہم نے مسلم کو قتل کر دیا۔ شبث بن ربعی نے کہا: ﴿ثکلتکم امھاتکم ایقتل مثل مسلم و تفرحون؟ ﴾ تمہاری مائیں تمہارے ماتم میں بیٹھیں۔ مسلم بن عوسجہ جیسے بزرگوار کے قتل پر تم خوشی کا اظہار کرتے ہو؟ میں نے اسلامی جنگوں میں ان کے بڑے بڑے عمدہ کارنامے دیکھے ہیں۔ فتح آذر بائیجان والے دن میں نے ان کو دیکھا کہ مسلمانوں کی صف بندی بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مسلم نے چھ مشرک قتل کر ڈالے تھے۔[1]

(۴) بُرَیر بن خضیر ہمدانیؒ

جناب بریر بن خضیر (بر وزن زبیر) الہمدانی المشرقی خاندان ہمدان کے قبیلہ بنی مشرق کے اشراف و اکابر میں سے ہیں۔ حضرت امیر المومنینؑ اور جناب حسنین علیہم السلام کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ علماء سیر و تراجم نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ﴿کان بریر شجاعاً تابعیاً ناسکاً قارئاً للقرآن من شیوخ القراء و من اصحاب امیر المؤمنین و کان من اشراف اھل الکوفة من الھمدانیین ﴾ یہ سن رسیدہ بزرگ تابعی بہت بڑے شجاع، عبادت گزار، قاری قرآن (جن کو لوگ سید القراء کہتے تھے) امیر المومنینؑ کے صحابی اور قبیلۂ ہمدان کے اشراف میں سے تھے" انہوں نے "کتاب القضایا و الاحکام" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں حضرت

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۳۔ ابصار العین / فرسان الہیجاء، ص ۱۲۹۔ مقتل الحسین، ص ۲۷۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۹۔

امیر المومنین اور جناب امام حسن مجتبیٰ علیہما السلام سے روایات نقل کی ہیں۔ یہ کتاب اصول معتبرہ سے سمجھی جاتی ہے۔[1]

جب ان کو حضرت امام حسینؑ کے مدینہ سے بجانب عراق سفر کرنے کی اطلاع ملی تو ذخیرۃ الدارین صفحہ ۲۶۰ اور فرسان الہیجاء ج ۱، ص ۴۰ کے بیان کے مطابق یہ بزرگوار بنفس نفیس مکہ پہنچ کر آنجنابؑ کے ہمرکاب ہو گئے۔ اور دوسرے اکثر مورخین کے بیان کے مطابق راستہ میں کسی منزل پر جا ملے۔ (بظاہر یہی قول قرین صواب معلوم ہوتا ولیس ھٰذا محل التفصیل) راستہ میں سید الشہداؑ کے ساتھ حُر کی ملاقات کے وقت جب امامؑ نے دل برداشتہ ہوکر خطبہ پڑھا اور اصحاب امامؑ نے اپنی جاں سپاری اور خدمت گزاری کا اظہار کیا جس کا قبل ازیں اپنے مقام پر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ تو ان مخلصین میں جناب بریر پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اسی طرح روز عاشوراء ان کے عبد الرحمٰن کے ساتھ مذاق کرنے اور ان کے ٹوکنے پر ان کے جواب دینے کہ میری قوم وقبیلہ کے لوگ جانتے ہیں کہ میں مذاق کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن آج مستقبل کی تابناکی و درخشندگی کہ ادھر یہ لوگ ہم پر تلواروں سے حملہ کریں گے۔ ادھر ہم جنت الفردوس میں حور العین کی رفاقت میں پہنچ جائیں گے۔ مجھے اس مزاح پر آمادہ کر رہی ہے۔ اس سے ان کے درجۂ ایمان وایقان اور جذبۂ شوق شہادت پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے۔ یہ ان کا شوق شہادت ہی تھا کہ جب پہلے پہل فوج مخالف سے سالم و یسار میدان کارزار میں آئے تو ادھر سے فوراً جناب بریر اور جناب حبیب مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے مگر امامؑ نے ان کو روک دیا۔ جیسا کہ پہلے اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

بہرحال جنگ مغلوبہ کے بعد جناب بریر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں نکلے۔

انا بریر و ابی خضیر	لیث یروع الاسد عند الزیر
یعرف فینا الخیر اھل الخیر	اضربکم ولا اری من ضیر
کذلک فعل الخیر من بریر	وکل خیر فلہ بریر

اس کے بعد تابڑ توڑ حملے شروع کیے۔ مخالفین کو قتل بھی کرتے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے: «اقتربوا منی یا قتلۃ المؤمنین. اقتربوا منی یا قتلۃ اولاد البدریین اقتربوا منی یا قتلۃ اولاد رسول رب العالمین و ذریۃ السابقین» میرے قریب آؤ۔ او مومنوں کو قتل کرنے والو! میرے نزدیک آؤ! اور اہل بدر کی اولاد کو قتل کرنے والو! میرے پاس آؤ۔ او۔ رسول خدا کی اولاد و ذریت کو قتل کرنے والو! انہی حملوں میں علاوہ مجروحین کے تین ناریوں کو فی النار وسقر کیا۔[2] اسی اثناء میں فوج یزید سے یزید بن معقل نکلا جو کہ بنی عمیرہ بن

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۶۰۔ فرسان الہیجاء، ص ۴۰۔ (مگر افسوس اصول کثیرہ کی طرح آج کل یہ کتاب بھی ناپید ہے)۔

[2] عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۵۔

ربیعہ کا فرد اور بنی سلیمہ بن عبدالقیس کا حلیف تھا۔ ادھر حسینی جماعت سے جناب بریر آگے بڑھے۔ یزید نے کہا: ﴿یا بریر بن خضیر کیف تری اللہ صنع بک؟﴾ اے بریر! خدا نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے؟ جناب بریر نے جواب دیا: ﴿صنع اللّٰہ بی و اللہ خیراً و صنع اللہ بک شراً﴾ بخدا! خدا نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ ہاں البتہ تیرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے! یزید نے کہا: ﴿کذبت وما کنت قبل الیوم کذاباً﴾ تم جھوٹ کہتے ہو حالانکہ تم اس سے پہلے جھوٹ نہیں بولتے تھے! پھر کہا: بریر! کیا وہ وقت بھی یاد ہے کہ جب ہم تم بنی لوذان کے محلّے سے گزر رہے تھے اور تم کہتے تھے ﴿ان عثمان بن عفان کان علی نفسہ مسرفاً. و ان معویۃ بن ابی سفیان ضال مضلّ و ان امام الھدیٰ و الحق علی بن طالبٌ؟﴾ کہ عثمان بن عفان اپنے نفس پر ظلم کرنے والے (گنہگار) اور معاویہ بن ابی سفیان خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے تھے۔ اور امام برحق صرف علی بن ابی طالب ہیں۔ جناب بریر نے کہا: ﴿اشھد ان ھذا رائی و قولی﴾ ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور اب بھی میں گواہی دیتا ہوں کہ میرا وہی سابقہ عقیدہ ہے۔ یزید نے کہا: ﴿انی اشھد انک من الضالین﴾ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم گمراہوں میں سے ہو۔ بریر نے فرمایا: اگر خیال ہے تو آیئے میں اس سلسلہ میں تم سے مباہلہ کرتا ہوں۔ آؤ دونوں بارگاہِ قدرت میں دعا کریں کہ ﴿ان یلعن الکاذب و ان یقتل المبطل﴾ وہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس پر لعنت کرے اور سچے کے ہاتھوں جھوٹے کو قتل کرے۔ چنانچہ دونوں نے ہاتھ بلند کر کے دعا کی کہ ﴿ان یلعن الکاذب و ان یقتل المحق المبطل﴾ اس کے بعد مقابلہ کے لیے آگے بڑھے۔ یزید بن معقل نے بریر پر وار کیا۔ تلوار اچٹتی ہوئی گئی اور بریر کو کوئی خاص گزند نہ پہنچا۔ اس کے بعد جناب بریر نے ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ تلوار خود کو کاٹتی ہوئی یزید کے دماغ تک پہنچ گئی۔ یزید فوراً زین سے زمین پر دھڑام سے گرا۔ اس حالت میں بھی جناب بریر کی تلوار اس کے سر میں گڑی ہوئی تھی۔ عفیف بن زہیر کا بیان ہے کہ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ بریر اس کے سر سے تلوار کو حرکت دے کر کھینچ رہے ہیں۔ اس اثناء میں رضی بن منقذ عبدی نے جناب بریر پر حملہ کر دیا۔ دونوں باہم گتھم گتھا ہو گئے اور کچھ دیر تک باہم کشتی لڑتے رہے۔ بالآخر بریر نے اس کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ گئے۔ رضی نے امداد کے لیے اپنے ہمراہیوں کو پکارتے ہوئے کہا: ﴿این اھل المصاع و الدفاع﴾ شمشیر زن، دفاع کرنے والے کہاں ہیں؟ چنانچہ کعب بن جابر بن عمرو ازدی آگے بڑھا (بروایتے اس کا نام بحیر بن اوس ضبی تھا) عفیف بن زہیر کہتا ہے میں نے کعب کو حملہ سے باز رکھنے کے لیے کہا۔ کعب! یہ وہی بریر بن خضیر ہے جو مسجد (کوفہ) میں تمہیں قرآن پڑھاتے تھے۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی اور نیزہ سے جناب بریر پر حملہ کر کے نیزہ ان کی پشت میں گاڑ دیا۔ جناب بریر نے نیزہ کی تکلیف محسوس کی تو رضی بن منقذ کو خوب نیچے روندا۔ اور اس کی ناک کا کنارہ کاٹ دیا لیکن نیزہ

چونکہ بڑے زور سے لگا تھا۔ بریر نیچے گرے۔ پھر کعب نے تلوار کے متعدد وار کر کے ان کو شہید کر دیا۔ عفیف کہتا ہے گویا کہ میں اب آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ ابن منقذ عبدی جسے بریر نے پچھاڑا تھا اس حال میں اٹھا کہ کپڑوں سے گرد و غبار جھاڑ رہا تھا۔ اور کعب ازدی سے کہہ رہا تھا: ﴿لقد انعمت علی یا اخا الازد نعمة لن انساها ابداً﴾ اے ازدی! تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ جب کعب واپس پلٹ کر کوفہ گیا تو اس کی زوجہ یا بہن نوار نے اس سے کہا: تو نے فرزند فاطمہؑ کے خلاف یورش کی اور سید القراء کو قتل کر کے ایک گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لیے میں کبھی تم سے کلام نہیں کروں گی[1] اس پر کعب نے کہا ؎

سلی تجری عنی و انت ذمیمة   غداة حسین و الرماح شوارع

الم ات اقصی ما کرهت ولم یحل   علیّ غداة الروع ما انا صانع

معی یزنی لم تخنه کعوبه   و ابیض مخشوب الغرارین قاطع

فجردته فی عصبة لیس دینهم   بدینی و انی بابن حرب لقانع

ولم ترعینی مثلهم فی زمانهم   ولا قبلهم فی الناس اذ انا یافع

اشد قراعا بالسیوف لدی الوغی   الاکل من یحمی الزمار مقارع

وقد صبروا للطعن و الضرب حسّراً   وقد نازلوا لو ان ذلک نافع

فابلغ عبید اللّٰه عما لقیتهٗ   بانی مطیع للخلیفة سامع

قتلت بریراً ثم حملت نعمة   ابا منقذ لما دعا من یماصح[2]

(۵) وہب بن حباب الکلبیؓ

مشہور یہ ہے کہ جناب وہب نصرانی المذہب تھے۔ وہ اپنی والدہ اور بیوی کے ساتھ سرکار سید الشہداءؑ کے دست حق پرست پر اسلام لائے تھے۔ جیسا کہ روضۃ الواعظین نیشاپوری ص ۲۲۴، عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۲، امالی شیخ صدوق، ص ۹۷، لواعج الاشجان، ص ۱۲۶، اور نفس المہموم، ص ۱۵۳ وغیرہ کتب سے ظاہر ہے۔ صاحب فرسان الہیجاء نے صفحہ ۱۳۷ پر لکھا ہے: "وہب مذکور کی تازہ شادی ہوئی تھی۔ روز عاشورا وزفاف کو ابھی سترہ روز سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب انہوں نے نصرت فرزند رسولؐ میں جام شہادت پینے کا ارادہ کیا تو ان کی زوجہ ان کو خدمت امامؑ میں

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۲۹۰۔

[2] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۹۰۔ فرسان الہیجاء، ص ۳۰۔ عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۵۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۳۱۔ نفس المہموم، ص ۱۲۹۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۸۵۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۷۔ لواعج الاشجان، ص ۱۱۳۔ ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۵۴ وغیرہ وغیرہ۔

لائیں۔ اور عرض کیا: فرزندِ رسولؐ دو باتیں عرض کرنا چاہتی ہوں ایک تو یہ کہ میرا شوہر تو عنقریب نیزہ و تلوار کے وار سے رہ سپارِ جنت ہو جائے گا اور چونکہ میرا یہاں کوئی مونس و غمگسار نہیں ہے اس لیے مجھے اپنے اہلِ حرم کے حوالہ کر دیجئے تاکہ وہ میرے نگرانِ حال رہیں۔ دوسرے یہ کہ وہب سے وعدہ لیجئے کہ فردائے قیامت مجھے فراموش نہ کریں۔

امامؑ اس معظمہ کی ان باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور گریہ کرتے ہوئے فرمایا: تیری ہر دو باتیں منظور ہیں۔

بہر حال والدۂ وہب نے حکم دیا: ﴿قم یا بنیّ وانصر ابن بنت رسول اللّٰہ!﴾ بیٹا اٹھو اور دخترِ رسولؐ کے بیٹے کی نصرت کا حق ادا کرو۔ وہب نے کہا: ﴿افعل ولا اقصرّ﴾ مادرِ گرامی! میں ایسا ہی کروں گا اور کوئی کوتاہی نہ ہوگی چنانچہ اس کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے میدانِ وغا میں قدم رکھا۔

ان تنکرونی فانا ابن الکلبی	سوف ترونی و ترون ضربی
و حملتی و صولتی فی الحرب	ادرک ثاری بعد ثار صحبی
و ادفع الکرب امام الکرب	لیس جھادی فی الوغا باللعب

اس کے بعد خوب جانفشانی سے لڑے اور ایک جماعت کو واصلِ جہنم کرنے کے بعد اپنی ماں اور زوجہ کے پاس واپس آگئے اور والدہ سے پوچھا: ﴿یا اماہ ارضیت؟﴾ اے مادرِ محترم! کیا آپ میری کارکردگی سے خوش ہیں؟ ماں نے فرمایا: ﴿ما رضیت او تقتل بین یدی الحسینؑ﴾ میں اس وقت تک ہرگز راضی نہ ہوں گی جب تک تم امام کے سامنے جامِ شہادت نوش نہ کرو۔ یہ سن کر اس کی زوجہ نے کہا: ﴿باللّٰہ لا تفجعنی فی نفسک﴾ خدا کے لیے مجھے اپنا دکھ نہ پہنچایئے۔ مادرِ وہب نے کہا: ﴿یا بنی لا تقبل قولھا و ارجع فقاتل بین یدی ابن رسول اللّٰہ فیکون غداً فی القیامۃ شفیعاً لک بین یدی اللّٰہ!﴾ بیٹا اس کی باتوں پر توجہ نہ کرو۔ اور میدان میں جا کر فرزندِ رسول کی نصرت میں جہاد کرو تاکہ بروزِ قیامت جنابِ رسولِ خدا بارگاہِ ایزدی میں تمہاری شفاعت کریں۔ چنانچہ وہب یہ رجز پڑھتے ہوئے پھر میدانِ کارزار میں داخل ہو گئے۔

انی زعیم لک ام وھب	بالطعن فیھم تارۃً و الضرب
ضرب غلام مومن بالرب	حتی یذیق القوم مرّ الحرب

پھر بڑھ بڑھ کر حملے شروع کیے۔ یہاں تک کہ انیس (۱۹) سواروں اور بارہ پیادوں اور بروایتے چوبیس سواروں اور بارہ پیادوں کو واصلِ جہنم کیا۔ لڑتے لڑتے یکے بعد دیگرے ان کے دونوں ہاتھ قلم ہو گئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر ان کی زوجہ ایک گرز لے کر میدان میں نکل آئی۔ وہب نے کہا: یا تو تو مجھے روکتی تھی یا اب یہ عالم ہے؟ کہنے لگی: مجھ سے آلِ رسولؐ کی مظلومیت دیکھی نہیں جاتی۔ وہب نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مگر وہ کنیزِ خدا جوشِ شہادت میں نہ

مانی۔ اور جام شہادت نوش کرنے کی ٹھان لی۔ وہب نے امام سے استغاثہ کیا۔ امام علیہ السلام تشریف لائے اور سمجھا بجھا کر اسے واپس خیمہ میں لے گئے۔ بروایتے شہادت وہب کے بعد اس کی زوجہ اس کی لاش پر پہنچی اور ان کے چہرہ سے گرد و خاک صاف کرنا شروع کی۔ اس اثنا میں شمر بن ذی الجوشن کے غلام نے اس کے حکم سے اسے گرز مار کر شہید کر دیا۔ (بحار، ج ۱۰، ص ۱۹۶) اور بالآخر جناب وہب جنگ کرتے کرتے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ بروایتے ان کو زندہ پکڑ کر پسر سعد کے پاس لے جایا گیا۔ پسر سعد نے کہا: ﴿ما اشد صولتک؟﴾ اے جوان! تیرا حملہ کس قدر سخت ہے! پھر ان کو شہید کر دیا گیا۔ اور ظالموں نے ان کا سر قلم کر کے سپاہِ حسینی کی طرف پھینک دیا۔ وہب کی والدہ نے وہ سر اٹھایا۔ اسے بوسہ دیا اور پھر شاید یہ سمجھ کر کہ جو چیز راہِ خدا میں دے دی جائے وہ واپس نہیں لی جاتی۔ اسے اٹھا کر لشکر ابن سعد کی طرف زور سے پھینک دیا۔ اتفاق سے وہ ایک شریر کو لگا (بروایتے وہی وہب کا قاتل تھا) اور وہ اسی وقت واصل جہنم ہو گیا۔ پھر گرز لے کر میدان جنگ میں نکل پڑی۔ اور دو سپاہیوں کو جہنم رسید کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ارجعی یا ام وھب انت و ابنک مع رسول اللہ فان الجھاد مرفوع عن النساء﴾ اے ام وہب! واپس پلٹ آؤ! کیونکہ عورتوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔ ام وہب! تم اور تمہارا بیٹا دونوں بارگاہ رسالت میں ہو گے! امام عالی مقام کا ارشاد سن کر وہ مومنہ یہ کہتے ہوئے واپس لوٹی: ﴿اللّٰھم لا تقطع رجائی!﴾ بار الہا! میری امید کو قطع نہ کرنا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لا تقطع اللہ رجاک یا ام وھب!﴾ اے ام وہب! خدا تیری امید کو ہرگز قطع نہیں کرے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

تبصرہ

مخفی نہ رہے کہ اس مقام پر مؤرخین نے حالات کو بالکل خلط ملط کر دیا ہے۔ عبد اللہ بن عمیر کلبی کے حالات وہب بن حباب کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ اور وہب کے واقعات عبد اللہ کی طرف۔ چنانچہ طبری اور ابن اثیر نے یہ لکھا ہے کہ شمر کے غلام رستم نے جس عورت کو قتل کیا تھا وہ عبد اللہ کی زوجہ تھی۔ اور بعض نے اس واقعہ کو وہب کی اہلیہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ نیز طبری و ابن اثیر نے گرز لے کر میدان میں نکلنے کے واقعہ کو عبد اللہ کی زوجہ کی طرف نسبت دی ہے۔ مگر سید بن طاؤس نے اسے زوجۂ وہب کی طرف منسوب کیا ہے۔ چونکہ طبری وغیرہ کے بیان کے مطابق عبد اللہ بن عمیر کی زوجہ کا نام ام وہب ہے۔ اس سے بھی مادر وہب بن حباب کے حالات کے ساتھ گڈمڈ ہونے میں مدد ملی۔ آقائے سماوی نے ابصار العین میں وہب بن حباب کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ حالانکہ جناب وہب کربلا کے مشہور شہداء میں سے ہیں۔ انہوں نے ان کے یہ تمام حالات و واقعات عبد اللہ بن عمیر کی طرف منسوب کیے ہیں۔ اور

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۶۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۶۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۳۸۔

بحارالانوار، منتہی الامال، ناسخ اور مہیج الاحزان وغیرہ کتب میں یہ تفصیل وہب بن حباب کے حالات میں مذکور ہے اور مقتل خوارزمی میں یہ سب واقعات وہب کی شہادت میں ذکر کیے گئے ہیں۔ اور عبداللہ کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ علامہ سید محسن امین عاملی نے (لواعج الاشجان، ص ۱۱۶) پر یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے دونوں ایک شخصیت کے دو عنوان ہوں۔ اصل میں وہی ایک شخص عبداللہ بن عمیر بن عباس بن عبدقیس بن علیم بن حباب الکلبی ہے۔ جس کی کنیت ابو وہب ہے۔ لہٰذا مورخین سے اشتباہ ہوا، انہوں نے ابو وہب کو وہب اور اس کے جداعلیٰ جناب کو حباب قرار دے دیا۔

اگرچہ یہ احتمال ناممکن نہیں لیکن بعید ضرور ہے۔ کیوں کہ عبداللہ بن عمیر کوفہ کے مشہور و معروف شیعوں میں سے تھے اور کتب رجال میں ان کا تذکرہ باقاعدہ موجود ہے لیکن وہب بن حباب پہلے نصرانی تھے۔ منزل قصر بنی مقاتل[1] میں حضرت سیدالشہداء سے ملاقات ہوئی اور اپنی والدہ اور زوجہ سمیت مشرف باسلام ہوئے۔ اور روز عاشوراء شہید ہوگئے۔ اسی لیے کتب سیر و تراجم میں ان کے حالات کم ملتے ہیں۔ واقعات کی باہمی مشابہت سے دونوں کا اتحاد لازم نہیں آتا۔ کما لا یخفی۔ واللہ العالم بحقیقۃ الحال۔

(۶) نافع بن ہلال الجملی المرادیؒ

اگرچہ جناب نافع کی شہادت روز عاشوراء نماز ظہر کے ہنگامہ قیامت خیز کے بعد واقع ہوئی مگر انہوں نے اس سے قبل کئی بار میدان کارزار میں کود کر اپنی خداداد شجاعت و شہامت کے جوہر دکھائے۔ اس لیے ان کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ ان کا اسم گرامی نافع بن ہلال بن نافع بن جمل بن سعد العشیرۃ بن مذحج الجملی المرادی ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ اور آنجنابؑ کے ساتھ تینوں جنگوں میں شریک ہوکر اور داد شجاعت دے کر اپنے ایمان و ایقان کا عملی ثبوت پیش کر چکے تھے۔ ارباب سیر و تراجم نے ان کے حالات میں لکھا ہے: ﴿کان نافع سیداً ریفاً سریاً شجاعاً و کان قارئاً کاتباً من حملۃ الحدیث و من اصحاب امیر المومنین﴾ جناب نافع اپنے قبیلہ کے شریف سردار اور سخی بہادر بزرگوار تھے۔ قاری قرآن تھے، کاتب اور حاملان حدیث اور اصحاب امیرالمومنینؑ میں سے تھے۔ جب جناب امام حسینؑ عراق تشریف لا رہے تھے تو یہ راستہ میں منزل عذیب الہجانات میں جاکر آپ کے قافلہ میں شامل ہوئے۔ چونکہ وہ اپنا ''کامل'' نامی مشہور گھوڑا کوفہ میں چھوڑ کر آئے تھے اور اہل خانہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان کو پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ جب عمرو بن خالد صیداوی اور ان کے ساتھی مجمع بن عبد اللہ عائذی وغیرہ آئے تو ان کا گھوڑا بھی ہمراہ لائے تھے۔ یہ وہی نافع تھے کہ جب سیدالشہداء نے حُر کی دارو گیر سے دلگیر ہوکر اپنا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا تو اختتام خطبہ پر نافع نے اٹھ کر عرض کیا تھا: فرزند رسولؐ! آپ کو اچھی طرح علم

---

[1] فرسان الہیجاء، ص ۳۰۵۔

ہے کہ آپ کے جد نامدار سب لوگوں کو اپنی محبت اور اوامر و نواہی کی تعمیل پر متحد نہ کر سکے۔ ان کے دور میں بکثرت منافق موجود تھے جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور جلوت کچھ اور خلوت کچھ اور تھی۔ پھر ان کے بعد آپ کے والد ماجد کی بھی یہی کیفیت رہی کچھ لوگ ان کے موافق تھے جو حروب ثلاثہ میں ان کے ہمرکاب ہو کر ان کے مخالفوں سے لڑتے رہے۔ کچھ ان کے مخالف رہے۔ یہاں تک کہ آپ بھی راہی ملک بقا ہوئے۔ اب آپ کی کیفیت بھی انہی دونوں بزرگواروں جیسی ہے۔ جو آپ کی مخالفت کرے گا۔ وہ اپنا نقصان کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بے نیاز کرے گا۔ آپ چاہے ہمیں مغرب کی طرف لے جائیں اور چاہیں تو مشرق کی طرف۔ ہم آپ کے ہمرکاب ہیں ہم نہ قضاوقدر سے ڈرتے ہیں اور نہ موت سے جی چراتے ہیں۔ ہم اپنی نیات و بصائر پر قائم ہیں جو آپ سے محبت کرے گا ہم اس سے محبت کریں گے۔ اور جو آپ سے دشمنی کرے گا ہم اس سے دشمنی کریں گے۔ نیز یہ وہی نافع بن ہلال ہیں کہ جب خیام حسینؑ میں پیاس نے شدت اختیار کر لی تھی تو سید الشہداء نے جناب شاہزادہ ابوالفضل اور نافع بن ہلال کو تیس (۳۰) سوار اور بیس پیادے سپاہی اور بیس مشکیزے دے کر پانی لینے کے لیے بھیجا تھا اور وہ پانی لائے تھے اور راستے میں جوہر شجاعت بھی دکھائے تھے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ بہر حال روز عاشورا جناب نافع یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں آئے ؎

ان تنکرونی فانا ابن الجملی   دینی علی دین حسین و علی

اضربکم ضرب غلام بطل   و یختم اللّٰہ بخیر عملی

ان اقتل الیوم فھذا املی   فذاک رائی و الاقی املی

ان کے مقابلہ کے لیے ایک شخص نکلا جس کا نام تھا: مزاحم بن حریث۔ اس نے کہا: ﴿انا علی دین عثمان﴾ میں عثمان کے دین پر ہوں۔ نافع نے جواب میں کہا: ﴿انت علی دین شیطان﴾ بلکہ تو شیطان کے دین پر ہے۔ یہ کہہ کر اس پر تلوار سے حملہ کیا اس نے پیٹھ دکھانا چاہی مگر تلوار اپنا کام کر چکی تھی۔ قتل ہو کر گھوڑے کی زین سے زمین پر آ گرا۔

ارباب مقاتل نے لکھا ہے کہ جناب نافع بن ہلال بڑے اچھے تیر انداز تھے۔ انہوں نے اپنے تیروں کو زہر میں بجھایا ہوا تھا اور ان کے سوفار پر اپنا نام بھی کندہ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ عاشوراء کے قیامت خیز منظر میں برابر تیر بھی چلائے جاتے تھے اور یہ رجز بھی پڑھتے تھے ؎

ارمی بھا معلمۃ افواقھا   مسمومۃ تجری بھا اخفاقھا!

لاملأن الارض من اطلاقھا   و النفس لا ینفعھا اشفاقھا

جب تیر ختم ہو گئے تو پھر تلوار سونت لی۔ اور یہ رجز پڑھتے ہوئے شمشیر زنی شروع کر دی

انـا الهـزبـر الـجـمـلـی (ن ل)

انـا الـغـلام الـجـمـلـی انـا عـلـی دیـن عـلـی

حتیٰ کہ زخمیوں کے علاوہ بارہ سوار و پیادہ ناریوں کو واصل جہنم کیا۔[1] اسی حالت میں جنگ کرتے کرتے ان کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ جب جنگ کے قابل نہ رہے تو شمر ذی الجوشن اور اس کے ہمراہی ان کو پکڑ کر ابن سعد کے پاس لے گئے۔ ابن سعد نے کہا: ﴿ویحک یا نافع ما حملک علی ما صنعت بنفسک؟﴾ افسوس ہے تیری حالت پر اے نافع! تجھے اپنے ساتھ ایسا کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ جناب نافع نے جواب دیا: ﴿ان ربی یعلم ما اردت﴾ میرا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ میرا ارادہ اور نیت کیا تھی؟ اس وقت جناب نافع کے سر و چہرہ سے ان کی ریش پر خون بہہ رہا تھا یہ حالت دیکھ کر ابن سعد کے ایک آدمی نے کہا: ﴿اما تری ما بک؟﴾ کچھ اپنی حالت کا بھی پتہ ہے؟ جناب نافع نے کہا: ﴿واللّٰہ لقد قتلت منکم اثنا عشر رجلا سوی ما جرحت وما الوم نفسی علی الجهد ولو بقیت لی عضد و ساعد ما اسرتمونی ابدا﴾ بخدا میں نے تمہارے پورے بارہ آدمی قتل کیے ہیں علاوہ ان کے جن کو زخمی کیا ہے۔ جدوجہد کرنے میں میں اپنے نفس کی ملامت نہیں کرتا۔ اگر میرے بازو نہ ٹوٹ گئے ہوتے تو تم ہرگز مجھے گرفتار نہ کر سکتے۔ شمر نے پسر سعد سے کہا: اسے قتل کر دو۔ ابن سعد نے کہا: تم ہی اسے لائے ہو تمہیں اختیار ہے۔ شمر نے تلوار میان سے کھینچی۔ یہ منظر دیکھ کر جناب نافع نے کہا: ﴿اما واللّٰہ لو کنت من المسلمین لعظم علیک ان تلقی اللّٰہ بدمائنا فالحمد للّٰہ الذی جعل منایانا علی ایدی شرار خلقه﴾ خدا کی قسم اگر تو مسلمان ہوتا تو یقیناً تجھے یہ بات شاق گزرتی کہ ہمارے خون سے ہاتھ رنگین کر کے خدا کی بارگاہ میں جائے۔ اس خدا کا شکر ہے جس نے ہماری موت اپنی بدترین مخلوق کے ہاتھوں پر قرار دی ہے۔ اس کے بعد اس ملعون نے ان کو شہید کر دیا۔[2]

(۷) عمرو بن قرظہ الانصاریؓ

ان کا نام و نسب یہ ہے: عمرو بن قرظہ بن کعب بن عمرو بن عائذ بن زید مناۃ بن ثعلبہ بن کعب بن الخزرج الانصاری الخزرجی الکوفی۔ ان کے والد ماجد جناب قرظہ حضرت رسول خدا ﷺ کے اصحاب میں سے تھے۔ جنگ احد

---

[1] صاحب الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۳۳ نے مقتل محمد بن ابی طالب کے حوالے سے جناب نافع کے مقتولین کی تعداد ستر درج کی ہے۔ کذا فی المناقب، ج ۴، ص ۹۵۔

[2] ذخیرہ، ص ۲۰۷۔ قرسان، ج ۲، ص ۱۳۱۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۵۶۔ لوعج، ص ۱۱۹۔ مقتل، ص ۲۸۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۳۔ البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۸، ص ۱۸۳۔

اور اس کے بعد والے تمام غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ آنحضرت کی وفات حسرت آیات کے بعد کوفہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اور جنگ جمل و صفین اور نہروان میں حضرت امیر علیہ السلام کے ہمرکاب ہوئے۔ نصر بن مزاحم کا بیان ہے کہ جنگ صفین میں انصار کا علم قرظہ الانصاری کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت امیر علیہ السلام نے فارس کی ولایت ان کو عطا فرمائی تھی۔ ۵۱ھ میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ عمرو اور علی۔ معرکۂ کربلا میں عمرو جناب سید الشہداء کے ہمرکاب تھے اور علی پسر سعد کے لشکر میں شامل تھا۔

سید الشہداء علیہ السلام کے کربلا میں رحل اقامت ڈالنے کے بعد عمرو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ روز عاشوراء تک جب بھی سید الشہداء نے عمر بن سعد سے کسی سلسلہ میں کچھ گفتگو کرنا ہوتی تھی تو انہی عمرو بن قرظہ کو ہی پیغام دے کر بھیجتے تھے۔ بہرحال جب بروز عاشوراء آغاز جنگ ہوا تو جناب عمرو بن قرظہ نے جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اپنے آپ کو یہ رجز پڑھتے ہوئے دریائے لشکر میں ڈال دیا۔

قد علمت کتیبة الانصار ان سوف احمی حوزة الذمار

ضرب غلام غیر نکس شاری دون حسین مھجتی و داری

جناب سید ابن طاؤس نے ان کے قتال و جدال کی شدت کے بارے میں لکھا ہے: ﴿فقاتل قتال المشتاقین الی الجزاء و بالغ فی خدمة سلطان السماء حتی قتل جمعاً کثیراً من حزب ابن زیاد و جمع بین سداد و جهاد﴾ انہوں نے اس طرح زور شور سے جہاد کیا جیسے مشتاقان جزاء کرتے ہیں اور شہنشاہ ارض وسماء کی خدمت میں بہت مبالغہ سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ابن زیاد بدنہاد کے لشکر کی ایک جماعت کثیرہ کو واصل جہنم کیا۔ اس طرح انہوں نے سداد و صواب اور جدال و جہاد کو جمع کر دکھایا۔ حمایت امام و نصرت حق کا یہ اہتمام تھا کہ جب بھی امام علیہ السلام کی طرف کوئی تیر آتا تھا تو اسے اپنے ہاتھ سے روک لیتے تھے اور جب کوئی تلوار سے وار کرتا تو اپنے سینہ کو سپر بنا لیتے تھے۔ اس طرح امام حسینؑ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔ بالآخر زخموں سے نڈھال ہو گئے۔ اس وقت امام کی طرف متوجہ ہو کر عرض کیا: ﴿یابن رسول اللّٰہ اوفیت؟﴾ فرزند رسول! کیا میں نے حق وفا ادا کر دیا ہے۔ آنجنابؑ نے فرمایا: ﴿نعم﴾ ہاں۔ پھر فرمایا: ﴿انت امامی فی الجنة فاقرا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و اله و سلّم عنی السلام و اعلمه انی فی الاثر﴾ تم جنت میں مجھ سے پہلے جاؤ گے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور ان کو بتانا کہ میں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ اس کے بعد دم توڑ کر لڑتے لڑتے اپنی جان جان آفرین کے حوالہ کر دی۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عمرو کا دوسرا بھائی علی بن قرظہ عمر بن سعد کی فوج میں شامل تھا۔ جب اسے اپنے بھائی عمرو کی موت کا علم ہوا تو اس گستاخ نے بآواز بلند امام کو خطاب کر کے کہا:

(نقل کفر کفر نہ باشد) ﴿یا کذاب بن الکذاب اضللت اخی و غررتہ حتی قتلتہ﴾ اے۔۔۔۔۔۔آپ نے میرے بھائی کو گمراہ کر کے دھوکہ سے قتل کرا دیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿ان اللہ لم یضل اخاک بل ھدی اخاک و اضلک ا﴾ خدا نے تیرے بھائی کو گمراہ نہیں کیا بلکہ اسے راہِ راست کی ہدایت فرمائی۔ البتہ تجھے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ جواب سن کر وہ ملعون آپے سے باہر ہو گیا اور کہا: ﴿قتلنی اللہ ان لم اقتلک او اموت دونک ا﴾ خدا مجھے غارت کرے اگر تمہیں قتل نہ کروں یا اس کوشش میں خود نہ مر جاؤں۔ یہ کہہ کر آنجنابؑ پر حملہ کر دیا۔ نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر اسے ایک ایسا نیزہ لگایا کہ وہ زین سے زمین پر آ رہا۔ اس کے ہمراہیوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ ورنہ اسی وقت وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا۔ بعد ازاں اس کا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ شقی و بدبخت تندرست ہو گیا۔[1]

(۸) جونؓ بن حوی مولیٰ ابی ذرؓ

جناب جون حبشی النسل سیاہ رنگ کے غلام تھے۔ پہلے فضل بن عباس بن عبد المطلبؓ کے غلام تھے۔ جناب امیر علیہ السلام نے ڈیڑھ سو اشرفی میں خرید کر جناب ابوذرؓ کو مرحمت فرمایا۔ پھر جونؓ برابر حضرت ابوذرؓ کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب خلیفہ ثالث نے جناب ابوذر کو ربذہ کی طرف جلاوطن کیا تو یہ جون ان کے ہمراہ تھے۔ جناب ابوذر کی وفات کے بعد ۳۲ ہجری یا ۳۳ ہجری میں واپس مدینہ آ گئے۔ اور جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں زندگی بسر کرنا شروع کی۔ حضرت امیر علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور ان کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہمرکاب رہے۔ اور امام زین العابدین علیہ السلام کے دولت کدہ میں فرائض خدمت انجام دیتے رہے۔ جب جناب سید الشہداء علیہ السلام مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق تشریف لے گئے تو جناب جون اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔ طبری، کامل اور مقاتل الطالبین میں لکھا ہے کہ جون اسلحہ شناسی اور اسکی اصلاح میں مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شب عاشوراء جون جناب سید الشہداء علیہ السلام کے خاص خیمہ میں بیٹھ کر کچھ وقت اسلحۂ جنگ کی اصلاح میں مشغول رہے۔

بہر حال جب روز عاشوراء قتل و قتال کا بازار گرم ہوا۔ اور اصحاب حسینؑ یکے بعد دیگرے شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہونے لگے تو جناب جون نے بھی خدمت امام میں حاضر ہو کر اذن جہاد طلب کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿یا جون انت فی اذن منی فانما تبعتنا طلبا للعافیۃ فلا تبتل بطریقتنا﴾ اے جون! میں اپنی اطاعت کا قلادہ تمہارے گلے سے اتار کر تجھے چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں تو ہمارے ساتھ طلب عافیت کے لیے آیا تھا۔ اس

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۸۶۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۸۔ نفس المہموم، ص ۱۳۰۔ لواعج، ص ۱۳۰۔ بحار، ج ۱۰، ص ۱۹۷۔ طبری، ج ۶، ص ۲۴۸۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۰۔

لیے اپنے آپ کو ہماری وجہ سے مصیبت میں گرفتار نہ کر۔ جون نے (بروایتے امام کے قدموں پر گر کر) عرض کیا: ﴿یابن رسول اللہ انا فی الرخاء الحس قصاعکم وفی الشدۃ اخذ لکم﴾ فرزند رسولؐ! کیا یہ ممکن ہے کہ آسائش و آرام کے دنوں میں تو آپ کی کاسہ لیسی کروں اور شدت و تنگی کے وقت میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اس کے بعد احتجاج کرتے ہوئے عرض کیا: ﴿واللہ ان حسبی للئیم ولونی لاسود و ریحی لمنتن فتنفس علیّ بالجنۃ فتطیب ریحی و یشرف حسبی و یشرق لونی لا واللہ لا افارقکم حتی یختلط ھذا الدم الاسود مع دمائکم﴾ بخدا اس لیے کہ میرا حسب و نسب پست رنگ سیاہ اور جسم بدبودار ہے۔ آپ مجھے (اجازت جنگ دینے اور) جنت میں داخل ہونے میں پس و پیش فرما رہے ہیں تاکہ میری بدبوئی خوشبوئی سے بدل جائے۔ میرا حسب و نسب شریف ہو جائے اور میرا رنگ سفید ہو جائے؟ نہیں بخدا میں اس وقت تک آپ سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ جب تک میرا یہ کالا خون آپ کے خون مقدس کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے۔ جناب سید الشہداءؑ نے ان کا یہ جذبۂ شوق شہادت دیکھ کر اجازت جہاد دے دی۔ جناب جون یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں آئے۔

کیف تری الفجار ضرب الاسود	بالمشرفی القاطع المھند
احمی الخیار من بنی محمد	اذب عنھم باللسان و الید
ارجو بذاک الفوز عند المورد	من الالہ الواحد الموحد

اذ لا شفیع عندہ کاحمد

اس کے بعد تابڑ توڑ حملے شروع کیے۔ منتہی الامال اور مناقب بن شہر آشوب کے بیان کے مطابق پچیس سپاہیوں کو دار البوار میں پہنچانے کے بعد خود فیض شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد سرکار سید الشہداءؑ ان کے بالین سر تشریف لے گئے۔ اور بارگاہ احدیت میں عرض کیا: ﴿اللّٰھم بیض وجھہ و طیب ریحہ و احشرہ مع الابرار و عرف بینہ و بین محمد و ال محمد﴾ بارالہا! اس کے چہرہ کو روشن کر دے۔ اس کی بدبو کو خوشبو سے بدل دے۔ ابرار و اخیار کے ساتھ اس کو محشور فرما اور سرکار محمدؐ و آل محمدؐ اور اس کے درمیان شناسائی فرما کر دوستی قرار دے۔ سرکار سید الشہداءؑ کی دعائے مبارک کا یہ اثر تھا کہ امام محمد باقرؑ اپنے پدر بزرگوارؑ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب بنی اسد نے شہدائے کربلا کی لاشیں دفن کیں تو اتفاقاً جناب جون کی لاش دفن ہونے سے رہ گئی۔ دس دن کے بعد جب ان کی لاش مبارک ملی تو دیکھا گیا کہ اس سے مشک و عنبر کی خوشبو آ رہی تھی۔[۲] زہے نصیب کہ یہی جون

---

[۱] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۷۹۔

[۲] ذخیرہ، ص ۲۱۸۔ فرسان، ج ۱، ص ۸۰۔ اوعج، ص ۱۲۰۔ نفس، ص ۱۵۵۔ عاشر بحار، ص ۱۹۷۔ مناقب، ج ۴، ص ۹۵۔

عظمت وجلالت کے اس اوج کمال پر پہنچا کہ امام ششم زیارت شہداء میں فرماتے ہیں: ﴿بابی انتم و امی﴾ میرے ماں باپ تم پر نثار ہوں۔

(۹) شبیب بن عبداللہ النہشلیؓ

علماء سیر وتراجم نے لکھا ہے کہ جناب شبیب بن عبداللہ تابعی تھے۔ اور جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے اصحاب اخیار میں سے تھے اور ان کی تینوں جنگوں میں ان کے ہمرکاب رہے۔ آنجنابؑ کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں رہے اور آپ کی شہادت کے بعد امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ سے منسلک رہے۔ حتیٰ کہ جب سرکار شہادت مدینہ سے بجانب مکہ اور مکہ سے عراق روانہ ہوئے تو یہ بزرگوار ابتداء سے ورود کربلا تک برابر ہمراہ رہے حتیٰ کہ روز عاشوراء نصرت امام وتائید حق کا فریضہ ادا کرتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[1]

رضوان اللہ تعالیٰ علیہ و علی جمیع اخوانہ المؤمنین۔

(۱۰) ابوالشعثاء الکندیؓ

نام ونسب یزید بن زیاد بن مہاصر الکندی البہدلی کوفہ کے نامور بہادروں اور شریفوں میں سے تھے۔ نیز بہت قابل تیرانداز تھے۔ بعض ارباب سیر وتراجم نے یہ لکھا ہے کہ یہ پہلے لشکر ابن سعد میں تھے لیکن جب روز عاشوراء سید الشہداء علیہ السلام نے تجاویز امن پیش فرمائیں اور قوم اشقیاء نے ان کو مسترد کر دیا تو انہوں نے امام کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا فیصلہ کر لیا اور آکر حسینی جماعت میں شامل ہو گئے۔[2] مگر تاریخی شواہد وقرائن کی روشنی میں یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ پہلے سے ہی امام علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ امامؑ کی آمد کی اطلاع سن کر راستہ میں حُر کی ملاقات سے بھی پہلے کسی منزل میں شریک قافلہ ہو گئے۔ حُر کے ساتھ ملاقات کے بعد جب کوفہ سے ایک قاصد حُر کے نام تازہ مکتوب لایا۔ جس میں درج تھا: ﴿اما بعد فجعجع بالحسین و اصحابه الخ﴾ تو اس قاصد کے ساتھ انہی ابوالشعثاء الکندی کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔[3] اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ یہ کربلا پہنچنے سے پہلے خدمت امامؑ میں حاضر تھے۔ اور یہی قول قرین صواب ہے۔ بہرحال روز عاشوراء جب تنور حرب وضرب گرم ہوا تو ابوالشعثاء اجازت لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے نکلے۔

انا یزید و ابی مہاصر اشجع من لیث بغیل خادر

---

1. ذخیرہ، ص ۲۱۸، فرسان، ج ۱، ص ۱۶۷ وغیرہ۔
2. لواعج الاشجان، ص ۲۷۵، نفس المہموم، ص ۱۵۱۔
3. ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۹ وغیرہ۔

یا رب انی للحسین ناصر　　　ولابن سعد تارک و ھاجر

پھر بڑھ چڑھ کر حملے شروع کیے۔ اس اثناء میں ان کا گھوڑا پے ہوگیا تو انہوں نے واپس آ کر خدمت امام میں گھٹنے ٹیک کر دشمنوں پر تیر چلانے شروع کیے۔ ان کے ترکش میں کل ایک سو تیر تھے۔ جب وہ تیر پھینکتے تو ساتھ یہ بھی کہتے۔

انا ابن بھدلہ　　　فرسان العرجلہ

اور امامؑ فرماتے: ﴿اللّٰھم سدد رمیتہ و اجعل ثوابہ الجنۃ﴾ بارالہا! اس کی تیر اندازی کو درست رکھ اور اس کا ثواب جنت قرار دے۔ جب سب تیر ختم ہوگئے تو معلوم ہوا کہ صرف پانچ تیر نشانہ سے چوکے ہیں۔ باقی سب اپنے نشانہ پر لگے۔ جب تیر ختم ہوگئے تو شمشیر بکف ہو کر میدان میں نکلے۔ زخمیوں کے علاوہ اٹھارہ اور بروایتے انیس آدمیوں کو واصل جہنم کیا۔ پھر پلٹ کر خدمت امامؑ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ﴿اوفیت یابن رسول اللّٰہ؟﴾ فرزند رسولؐ! کیا میں نے عہد وفا پورا کر دیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿نعم﴾ ہاں۔ ﴿انت امامی فی الجنۃ﴾ تم مجھ سے پہلے جنت میں پہنچو گے۔ پھر پلٹ کر جہاد شروع کیا۔ بالآخر دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر ان کو شہید کر دیا۔[1]

آخری جنگ مغلوبہ

آغاز جنگ سے لے کر قریباً دوپہر تک مبارزت طلبی میں فوج یزید کو جو برابر نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس نے سالاروں کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ باوجودیکہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، بھوک و پیاس کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ اور دوسری طرف مٹھی بھر چند بھوکے پیاسے سپاہی ہیں مگر چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے۔ ایک بھی شہید ہوتا ہے تو بیسیوں ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد۔ اس بات نے مخالف کو بوکھلا دیا۔ چنانچہ شمر ذی الجوشن نے یکبارگی میسرۂ حسینیؑ پر حملہ کر دیا جسے اصحاب حسینیؑ نے بڑی جانفشانی اور دلیری سے پسپا کر دیا۔[2]

جناب زہیر بن القین نے اپنے دس ہمراہیوں کے ساتھ شمر اور اس کے سپاہیوں پر تابڑ توڑ حملے کر کے انہیں بھگا دیا۔ حسینیؑ سواروں کی تعداد اگرچہ کل کم و بیش بتیس تھی۔ مگر وہ جس صف پر حملہ کرتے اس کو تتر بتر کر کے رکھ دیتے۔ یہی کیفیت دیکھ کر عزرہ بن قیس جو سپاہ ابن سعد کے سواروں کا سردار تھا۔ اس نے پسر سعد کے پاس پیغام بھیجا کہ کیا آپ صبح سے دیکھ نہیں رہے جو اس مختصر جماعت سے میرے سواروں کی حالت ہو رہی ہے۔ اس لیے لڑنے والوں اور تیر اندازوں سے میری کمک کرو۔ عمر بن سعد نے پہلے تو شبث بن ربعی کی طرف جو کہ پیادہ فوج کا افسر تھا کمک کے

---

1. ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۳۰۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۷۶۔
2. کامل، ج ۳، ص ۲۹۱ وغیرہ۔

لیے آدمی بھیجا مگر شبث کے لیت ولعل کرنے کی وجہ سے حصین بن تمیم (نمیر[1]) کو پانچ سو تیر انداز دے کر عزرہ کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے سپاہ حسینی کے قریب پہنچ کر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ مگر واہ رے طاقت حق۔ اصحاب حسینی نے اس جرأت و دلیری سے ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہوگی۔ حتیٰ کہ مخالف کے دانت کھٹے ہو گئے۔ لیکن اس جنگ میں اصحاب حسینی کا نقصان یہ ہوا کہ علاوہ کئی اصحاب کی شہادت کے جتنے گھوڑے تھے وہ سب کے سب بے پے ہو گئے۔ اب سب اصحاب پیادہ تھے۔[2] گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ مخالف چاہتا تھا کہ اس مٹھی بھر فوج کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لے۔ مگر موجودہ صورت میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ دوسری جانب خیام تھے جو امامؑ نے شب عاشورہ اپنے حسن تدبر سے باہم ملا دیے تھے۔ اس لیے ابن سعد نے حکم دیا کہ خیموں کی طنابیں کاٹ دی جائیں۔ چنانچہ اشقیاء طنابیں کاٹنے کے لیے دوڑے۔ ادھر حسینی جماعت نے بڑی حکمت عملی سے کام لیا۔ دو، دو، چار، چار ہو کر اپنے خیام کے اندر گھس گئے۔ جونہی کوئی سپاہی طنابیں کاٹنے لگتا اسے قتل کر دیتے اور اس کی نجس لاش باہر پھینک دیتے۔ یہ کیفیت دیکھ کر پسر سعد نے حکم دیا کہ حسینی خیام کو (جو دوسرے خیام سے قدرے علیحدہ تھے) آگ لگا دی جائے۔ اصحاب نے مزاحمت کرنا چاہی مگر امامؑ نے فرمایا: انہیں ایسا کرنے دو۔ اس طرح بھی ان کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ آگ کے شعلوں کی وجہ سے ادھر سے حملہ نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ان کی یہ تدبیر ضائع ہو گئی۔[3]

مذکورہ بالا واقعہ پر تنقید

اگرچہ اکثر ارباب مقاتل نے طبری اور ابن اثیر کے بیان کے مطابق یہی لکھا ہے کہ خیام کو جلا دیا گیا مگر حالات پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید الشہداءؑ کے حین حیات میں ایسا نہیں ہوا۔ ہاں اس انتہائی گھناؤنے جرم شنیع کی دھمکی اور اس کے اقدام کی ناکام کوشش ضرور کی گئی۔ چنانچہ اکثر کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے کہ شمر بن ذی الجوشن نے آگے بڑھ کر خیام حسینی پر نیزہ مارتے ہوئے کہا: ﴿علی بالنار حتی احرق هذا البیت علی اهله﴾ آگ لاؤ۔ تاکہ میں اس گھر کو گھر والوں سمیت جلا دوں۔ یہ منحوس آواز سن کر سراپردہ عفت و عصمت سے نالہ و شیون کی صدا بلند ہوئی۔ امام حسینؑ نے یہ منظر دیکھ کر آواز بلند فرمایا: ﴿انت تدعوا بالنار لتحرق بیتی علی اهلی احرقک الله بالنار﴾ تو چاہتا ہے کہ میرے خیام کو ان کے اہل سمیت جلائے۔ خدا تجھے آتش (جہنم) میں

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۲۹۱۔

[2] کامل، ج ۳، ص ۲۹۱ وغیرہ۔

[3] طبری، ج ۶، ص ۲۹۱۔

جلائے۔ حمید بن مسلم نے شمر سے کہا: ﴿ان ھذا لا یصلح لک أترید ان تجمع علی نفسک خصلتین اتعذب بعذاب اللّٰہ و تقتل الولدان والنساء واللّٰہ ان فی قتلک الرجال لما ترضٰی بہ امیرک؟﴾ بخدا مردوں کے قتل سے ہی تمہارا حاکم خوش ہو جائے گا۔

شمر نے حمید کے اس مشورہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اس اثناء میں شبث بن ربعی نے آگے بڑھ کر اس کی سرزنش کرتے ہوئے کہا: ﴿ما رایت مقالاً اسوا من قولک ولا موقفاً اقبح من موقفک امرعباً للنساء صرت﴾ میں نے تیری گفتگو سے بری گفتگو اور تیرے موقف سے برا موقف آج تک نہیں دیکھا۔ کیا تم مستورات کو ڈرانے دھمکانے آئے ہو۔ اس پر شمر جھیپ گیا اور واپس لوٹ گیا۔[1]

امام حسینؑ کی نماز ظہر کا قیامت خیز منظر

یہ قیامت خیز ہنگامہ زوال سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے شروع ہوا جس نے زوال تک طول کھینچا۔ جب ملاعین واپس لوٹے تو اس وقت امام کی جماعت جو پہلے ہی قلیل تھی اب قلیل سے قلیل تر ہو چکی تھی مگر فوج مخالف میں باوجود نقصان عظیم کے بوجہ غیر معمولی کثرت کے کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت جناب ابوثمامہ الصید اوی نے خدمت امام میں عرض کیا: ﴿یا ابا عبد اللّٰہ نفسی لنفسک الفداء ھؤلاء اقتربوا منک لا واللّٰہ لا تقتل حتی اقتل دونک و احب ان القی اللّٰہ ربی وقد صلیت ھذہ الصلوٰۃ التی دنا وقتھا یا ابا عبد اللّٰہ!﴾ میں آپ پر قربان ہوں! یہ ملاعین بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں۔ یہ آپ تک نہیں پہنچ سکتے۔ میری خواہش ہے کہ جب خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو یہ آخری نماز جس کا وقت قریب ہے آپ کے ساتھ پڑھ کر۔ ابوثمامہ کی یہ درخواست سن کر امام حسینؑ نے آسمان کی طرف نگاہ بلند کی۔ پھر فرمایا: ﴿ذکرت الصلوٰۃ جعلک اللّٰہ من المصلین نعم ھذا اول وقتھا﴾ تو نے (ایسے کٹھن حالات میں) نماز کو یاد کیا ہے۔ خدا تیرا حشر ونشر نماز گزاروں کے ساتھ کرے۔ ہاں یہ نماز ظہر کا اول وقت۔ ہے پھر امام عالی مقام علیہ السلام نے حکم دیا: ﴿سلوھم ان یکفوا عنا حتی نصلی﴾ فوج جفا کار سے کہو کہ اتنی دیر جنگ روک دیں کہ ہم نماز خدا پڑھ لیں۔ چنانچہ جب حسب الحکم قوم اشقیاء کے سامنے یہ درخواست پیش کی گئی تو حصین بن نمیر نے کہا: ﴿انھا لا تقبل﴾ تمہاری یہ نماز قبول نہیں۔ اس کا یہ گستاخانہ کلام بے ہنگام سن کر جناب حبیب بن مظاہر (مظہر) نے فرمایا: ﴿لا تقبل زعمت الصلوٰۃ من ال رسول اللّٰہ و انصارھم و تقبل منک یا خمار﴾ اے شراب خوار! تیرا گمان فاسد

---

[1] تاریخ الطبری، ج ۶، ص ۲۵۱۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۱۔ بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۷۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۳۔ نفس المہموم، ص ۱۲۳۔ تمام، ص ۲۲۷۔ مقتل الحسین، ص ۲۷۲ وغیرہ۔

ہے کہ آلِ رسولؐ اور ان کے انصار کی نماز نامقبول اور تیری مقبول ہے؟

(۱۱) حضرت حبیب بن مظاہرؓ

حصین بن تمیم اور جناب حبیب[۱] کے اس تلخ سوال و جواب سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جناب حبیب کا جواب باصواب سن کر حصین نے ان پر حملہ کر دیا۔ جناب حبیب نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کے منہ پر تلوار لگائی۔ جس سے گھوڑا بدکا۔ اور وہ ملعون نیچے آرہا۔ اس کے ہمراہیوں نے دوڑ کر اسے بچا لیا۔ اس کے بعد جناب حبیب نے یہ رجز پڑھنا شروع کیا ؎

انا حبیب و ابی مظهر   فارس هیجاء و حرب تسعر

انتم اعدّ عدة و اکثر   و نحن اوفی منکم و اصبر

و نحن اعلی حجة و اظهر   حقا و اتقی منکم و اعذر

اس کے بعد اس سن رسیدہ اور ضعیف العمر مگر قوی العزم والایمان بزرگوار نے میدان کارزار میں اپنی

---

[۱] **مختصر حالات حبیب بن مظاہر اسدیؓ**:۔ نام و نسب حبیب بن مظاہر (مظہر) بن رئاب بن اشتر بن حجوان بن فقعس بن طریف بن عمرو بن قیس بن الحارث بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ الاسدی ثم الفقعسی۔ کنیت ابو القاسم۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے انہیں صحابہ رسولؐ میں شمار کیا ہے۔ [illegible] حضرت شیخ طوسی نے [illegible] اور حضرت [illegible] علیہ الرحمہ نے مجالس المومنین میں انہیں جلیل القدر تابعی قرار دیتے ہوئے حضرت امیرؑ اور سیدا شباب اهل الجنة کے اصحاب باصفا میں شمار کیا ہے۔

جناب حبیب تینوں جنگوں میں حضرت امیر علیہ السلام کے ہمرکاب رہے۔ ارباب سیر و تراجم نے ذکر کیا ہے کہ جناب حبیب کا شمار حضرت امیرؑ کے خواص اصحاب اخیار اور آپ کے حملہ علوم و آثار میں ہوتا ہے۔ چنانچہ رجال کشی طبع بمبئی ص ۵۲ میں مذکور ہے کہ ایک دن جناب میثم تمار اور جناب حبیب گھوڑوں پر سوار مختلف سمتوں سے آرہے تھے کہ راستہ میں مجلس بنی اسد کے نزدیک ملاقات ہوگئی۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس وقت وہ باہم اس قدر قریب تھے کہ دونوں حضرات کے گھوڑوں کی گردنیں باہم ملی ہوئی تھیں۔ پھر جناب حبیب نے کہا: میں گویا ایک عمر رسیدہ بزرگ کو دیکھ رہا ہوں جن کے سر کے اگلے حصہ پر بال نہیں۔ پیٹ بڑا ہے اور دار الرزق کے پاس خربوزے بیچتا ہے۔ اسے محبت اہل بیت کے جرم کی پاداش میں سولی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ سن کر جناب میثم تمار نے کہا: میں بھی ایک ایسے شخص کو پہچانتا ہوں جس کا رنگ سرخ و سفید ہے اور سر پر دو گیسو ہیں جو اپنے رسولؐ کی دختر کے فرزند کی نصرت کے لیے نکلے گا اور قتل کر دیا جائے گا۔ اور پھر اس کے سر کو کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جائے گا۔ اس گفتگو کے بعد وہ جدا ہو گئے۔ کچھ لوگ جو ان دونوں بزرگواروں کی اس پُر اسرار گفتگو کو سن رہے تھے۔ کہنے لگے: ہم نے ان سے زیادہ کوئی جھوٹا نہیں دیکھا۔ ابھی اہل مجلس اسی جگہ پر موجود تھے کہ جناب رشید ہجری ان دونوں کو تلاش کرتے ہوئے وہاں آپہنچے اور اہل مجلس سے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی وہ یہاں موجود تھے اور اس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ جناب رشید نے ان کا باہمی مکالمہ سن کر فرمایا: خدا میثمؑ پر رحم فرمائے۔ وہ اس قدر بات بھول گئے کہ جو دختر رسولؐ کے اس ناصر کا سر دربار میں پیش کرے گا اسے دوسروں سے ایک سو درہم زائد انعام دیا جائے گا۔ یہ بیان کر کے جناب رشید چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے کہا: بخدا یہ ان دونوں سے بھی زیادہ جھوٹا ہے۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ [بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۷ پر]

اصابہ، ج ۲، ص ۵۸، طبع مصر۔

شجاعت کے جوہر دکھانا شروع کیے جو سامنے آتا اسے مولی گاجر کی طرح کاٹ کے رکھ دیتے۔ اسی طرح بنا بر مشہور باسٹھ کوفیوں کو واصل جہنم کیا۔ بالآخر ایک تمیمی مرد نے تیر مارا جس سے جناب حبیب گر پڑے۔ اٹھنا چاہتے مگر حصین بن تمیم (نمیر) نے جناب کے سر پر تلواریں مار مار کر نڈھال کر دیا۔ جناب پھر منہ کے بل گر پڑے اور تمیمی ملعون نے گھوڑے سے اتر کر ان کا سر مبارک قلم کر دیا اور بروایتے بدیل بن صریم نے سر قطع کیا۔[1]

جناب سید الشہداء علیہ السلام پر جناب حبیبؓ کی شہادت بہت شاق گزری۔ فرمایا: ﴿احتسب نفسی و حماۃ اصحابی﴾ میں اپنے نفس اور اپنے حامی اصحاب کی جزاء کا بارگاہ ایزدی سے متمنی ہوں۔ پھر کئی بار کلمۂ استرجاع زبان پر جاری کیا۔[2] بعض کتب میں لکھا ہے کہ آنجنابؑ نے جناب حبیبؓ کی لاش پر یہ بھی فرمایا: ﴿للّٰہ درک یا حبیب کنت فاضلا تختم القرآن فی لیلۃ واحدۃ﴾ اے حبیب! خدا تجھے جزائے خیر دے۔ تو مرد فاضل تھا اور ایک رات میں پورا قرآن ختم کیا کرتا تھا۔[3]

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ۳۶۶]

کوئی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ہم نے کوفہ کے اندر عمرو بن حریث کے دروازہ پر جناب میثم تمارؓ کو سولی پر لٹکا ہوا اور جناب حبیبؓ بن مظاہر کے سر کو کوفہ کے بازاروں میں پھراتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح ان بزرگواروں نے جو کچھ کہا تھا ہم نے وہ چشم خود دیکھ لیا۔

ارباب سیر و تواریخ کا بیان ہے کہ جناب مسلم بن عقیلؑ کی کوفہ میں تشریف آوری کے بعد جناب حبیبؓ اور جناب مسلم بن عوسجہ ان کے سرگرم رکن تھے جو لوگوں سے سرکار سید الشہداءؑ کے لیے بیعت لیتے تھے لیکن جب اہل کوفہ نے جناب مسلمؑ کا ساتھ چھوڑ دیا اور جناب مسلم گرفتار کر لیے گئے تو ان دونوں حضرات کو ان کی قوم و قبیلہ نے روپوش کر دیا۔ تا آنکہ جب ان کو حضرت امام حسینؑ کے کربلا میں تشریف لانے کی اطلاع ملی تو یہ دونوں بزرگوار بمشکل تمام گھر سے نکل کر دن کو چھپتے اور رات کو منازل سفر طے کرتے ہوئے ساتویں یا آٹھویں شب محرم کو بارگاہ امامؑ میں پہنچ گئے۔ ❁

اس سلسلہ میں جو کہا جاتا ہے کہ سرکار سید الشہداءؑ نے کربلا پہنچنے کے بعد جناب حبیب کو خصوصی خط لکھا تھا۔ جس کا مضمون یہ تھا: ﴿بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم من الحسین بن علی الی الرجل الفقیہ حبیب بن مظاہر الاسدی اما بعد فقد نزلنا بکربلا و انت تعلم قرابتی من رسول اللّٰہ فان اردت نصرتنا فاقدم الینا عاجلاً﴾ اور پھر خط وصول کرنے کے بعد ان کا اپنی زوجہ کے ساتھ جو طول طویل مکالمہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ سب بظاہر بے اصل ہے اور اس سے جعل و وضع کے آثار بالکل واضح و آشکار نظر آتے ہیں۔ یہ واقعہ صرف اسرار الشہادت میں موجود ہے اور وہ بھی بے ماخذ و بے مدرک۔ اور چونکہ اس کتاب میں متعدد بے سروپا روایات موجود ہیں اور ہر قسم کا رطب و یابس سواد موجود ہے۔ اس لیے جب تک اس کے مندرجات کی تائید دوسری کتب معتمدہ سے نہ ہو جائے اس کے متفردات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنے کے لیے لؤلؤ و مرجان محدث نوریؒ کی طرف رجوع کیا جائے۔ جناب حبیب کی جلالت قدر کی ایک یہ بھی بین دلیل ہے کہ باوجود پیرانہ سالی کے [بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۶۸ پر]

❁ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۸۹۔

---

[1] بحار، ج ۱۰، ص ۱۹۷۔ تاریخ، جلد ۶، ص ۲۵۸۔ لہوف، ص ۲۳۸۔ مقتل الحسین، ص ۲۷۷۔

[2] تاریخ، ج ۱، ص ۲۵۸، لواعج الاشجان، ص ۱۲۸۔

[3] نفس المہموم، ص ۱۳۵۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۵۹۔

نمازِ ظہر کا قیامت خیز منظر

بہر کیف جب قوم جفا کار نے وارثِ رسول کو نماز پڑھنے کی مہلت نہ دی اور نابکار جنگ موقوف کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ تو امامؑ نے بطور نمازِ خوف نمازِ ظہر ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ:

(۱۱) جناب زہیر بن القینؓ اور (۱۲) سعید بن عبداللہ الحنفیؓ کو حکم دیا کہ تم دونوں میرے آگے کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگوار اور بروایتے صرف جناب سعید بن عبداللہ کو یہ حکم دیا تھا) [1] جو کہ ایمان وایقان کے پیکر تھے امامؑ کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے جدھر سے تیر یا تلوار یا نیزہ کا کوئی وار ہوتا تھا یہ آگے بڑھ کر اپنے سینہ پر لے لیتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادھر امامؑ نے نماز کا سلام پھیرا اور ادھر جناب سعید جو زخموں سے چھلنی ہو چکے تھے زخموں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر گئے۔ راویانِ اخبار کا بیان ہے کہ جناب سعید کے بدن پر تلواروں اور نیزوں کے زخموں کے علاوہ تیرہ تیر جسم مبارک میں پیوست تھے۔ گرتے ہوئے کہا: ﴿اللّٰھم العنھم لعن عاد و ثمود اللّٰھم ابلغ نبیک عنی السلام و ابلغہ ما لقیت من الم الجراح فانی اردت ثوابک فی نصرۃ ذریۃ نبیک﴾ بارالٰہا! ان لوگوں پر اس طرح لعنت کر جس طرح قوم عاد وثمود پر کی تھی اور جناب رسولؐ خدا کو میرا سلام پہنچا۔ نیز میرے رنج والم کی ان کو اطلاع دے۔ کیونکہ میں نے تیرے ثواب کی خاطر ذریت رسول کی نصرت کی ہے۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۵۸ و ذخیرۃ الدارین، ص ۱۷۸ میں لکھا ہے کہ سعید نے آخری وقت سید الشہداءؑ کو مخاطب کر کے عرض کیا: ﴿یابن رسول اللّٰہ اوفیت﴾ فرزند رسولؐ! کیا میں نے عہد پورا کر دیا ہے؟ امامؑ

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ۳۶۷]

امامؑ نے اپنے مختصر لشکر کے میسرہ کی کمان انہی کے ہاتھ میں دی تھی۔ جیسا کہ پہلے ترتیب لشکر کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اسی طرح شب عاشوراء جناب زینب عالیہ کا امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرنا کہ باقی ماندہ اصحاب کا امتحان لے لیا ہے؟ اور امامؑ کا ان کو تسلی دینا۔ نافع بن ہلال کا جناب حبیب کو اس واقعہ کی اطلاع دینا اور جناب حبیب کا دیگر اصحاب حسینؑ کو اطلاع دے کر شمشیر بکف اور سروں سے عمامے اتار کر خیام حسینی کے دروازہ پر حاضر ہو کر مخدرات عصمت وطہارت کو اپنی نصرت وتائید کا یقین دلانا اور بی بیوں کا ان کو فرمانا: ﴿ایھا الطیبون حاموا عن الفاطمیات﴾ جو کہ شب عاشوراء کے واقعات میں گزر چکا ہے۔ یہ سب حقائق جناب حبیبؓ کی عظمت کے انمٹ نقوش ہیں۔

(**نوٹ**) جناب حبیبؓ کے والد کا اسم گرامی بنا بر مشہور مظاہر ہے مگر محقق علماء تراجم کی تحقیق یہ ہے کہ اس اسم کا صحیح تلفظ مظہر بروزن محمد و مظفر ہے۔ ملاحظہ ہو: ذخیرۃ الدارین، ص ۱۹۲۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۸۷۔ تاریخ، ج ۲، ص ۲۵۸)۔

اس بات کی تائید ان کے مندرجہ متن رجز سے بھی ہوتی ہے جس میں مظہر موجود ہے۔ اگر اسے "مظاہر" پڑھا جائے تو وزن ٹوٹ جاتا ہے۔ واللہ العالم۔ (منہ عفی عنہ)

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۸۷۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۸۷۔ تاریخ، ج ۲، ص ۲۵۹۔ عاشر بحار، ص ۱۹۷ وغیرہ۔

نے فرمایا: ﴿نعم﴾ ہاں۔ ﴿و انت امامی فی الجنة﴾ تم مجھ سے پہلے جنت میں جاؤ گے۔ اس کے بعد ان کی روح قفس عنصری سے جنت الفردوس کی طرف پرواز کر گئی۔[1]

جناب سید الشہداء علیہ افضل التحیۃ والثناء نے ایسے زہرہ گداز حالات میں نماز پڑھ کر اور وہ بھی جماعت کے ساتھ اس کی اہمیت وعظمت پر وہ مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے جسے طلوع آفتاب قیامت تک کوئی نہیں توڑ سکتا۔ نیز جناب سرکار شہادت نے جس انوکھے انداز سے نماز خدا ادا فرمائی ہے اس منظر کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔ کربلا والوں نے دنیا والوں کو دکھا دیا کہ کس طرح ؂

نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

دعا ہے کہ خداوند عالم امام حسین علیہ السلام کے تمام نام لیواؤں کو آپؑ کے اس اسوۂ حسنہ سے درس عمل حاصل کرنے کی توفیق رفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبی و آلہ الطاہرینؑ۔

---

[1] مورخ طبری (ج ۶، ص ۲۵۲) نے ان کی شہادت کا واقعہ قدرے ترمیم کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب سرکار سید الشہداء نے نماز ظہر بطور خوف ادا فرمائی اور پھر زور کی جنگ شروع ہوئی تو جناب سعید بن عبداللہ الحنفی امام کے آگے آکر کھڑے ہو گئے۔ دائیں بائیں جدھر سے کوئی تیر یا تلوار کا وار کرتا۔ جناب سعید آگے بڑھ کر اپنے سینہ یا پہلو یا سر یا ہاتھ پر اسے روک لیتے تھے اور امام کے جسم مبارک تک کوئی تیر وغیرہ نہ پہنچنے دیتے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے: ﴿اللّٰہم العنہم لعن عاد و ثمود. الخ...﴾ اسی طرح دفاع کرتے کرتے زخموں سے چھلنی ہو گئے اور بالآخر زخموں کی تاب نہ لا کر زمین پر گرے اور روح مبارک قفس عنصری سے جنت الخلد کی طرف پرواز کر گئی۔ (کذا ذکرہ الجزری و ابن نما)

بہرحال جناب سعید بن عبداللہ الحنفی کوفہ کے شیعیان علی میں سے جانی پہچانی اور معزز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا مشہور عابدوں اور زاہدوں اور دلیروں میں شمار ہوتا تھا۔ اہل کوفہ نے جو خطوط امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں بھیجے ان میں سے آخری خط لے جانے والے یہی سعید بن عبداللہ الحنفی اور ہانی بن ہانی سبیعی تھے۔ امام نے دریافت کیا: یہ خط کن لوگوں نے لکھا ہے؟ آپ نے عرض کیا کہ ایک جماعت کثیر نے لکھا ہے کہ من جملہ ان کے شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن الحارث، قیس بن الاشعث، عروہ بن قیس، عمرو بن الحجاج اور محمد بن عمیر وغیرہ ہیں۔ امامؑ نے اہل کوفہ کے نام مناسب جواب لکھ کر ان کے حوالہ کیا۔ اور ان کے بعد جناب مسلمؑ کو کوفہ بھیجا۔ جناب مسلم نے ابتداء میں اہل کوفہ کی بیعت کرنے کے حالات وکوائف پر مشتمل جو مکتوب سید الشہداء کو بھیجا وہ انہی سعید بن عبداللہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ جناب سعید خدمت امام میں پہنچ کر انہی کے ہمرکاب رہے تا آنکہ روز عاشوراء مذکورہ بالا کیفیت سے جام شہادت نوش فرمایا۔ یہی وہ سعید بن عبداللہ الحنفی تھے کہ جب شب عاشوراء امامؑ نے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ تو جناب مسلم بن عوسجہ کی پر اخلاص تقریر کے بعد اظہار خلوص و ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا۔ خدا کی قسم ہم ہرگز آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ یہ تو صرف ایک بار کی شہادت ہے بخدا اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں قتل کیا جاؤں گا پھر جلا دیا جاؤں گا اور میری راکھ ہوا میں اڑا دی جائے گی۔ پھر زندہ کیا جاؤں گا۔ حتیٰ کہ مجھ سے ستر (۷۰) بار ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ پھر بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑتا۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ سعید نے جو کچھ کہا تھا وہ اپنے عمل و کردار سے پورا کر دکھایا۔[1] لقد سعد فی الدنیا و الآخرة...!!

[1] ذخیرہ، ص ۱۷۷، فرسان، ج ۱، ص ۱۵۸، ص ۱۸۷ وغیرہ۔

(۱۳) نماز ظہر کے ہنگامہ کے بعد جناب **سوید بن عمرو بن ابی المطاع الخثعمیؓ** بپھرے ہوئے شیر کی طرح میدان کارزار میں نکلے جو کہ ایک شریف النفس، عمر رسیدہ، تجربہ کار بہادر اور عبادت گزار بزرگوار تھے۔ اور بڑی دلیری و جانفشانی سے دادِ شجاعت دی۔ اس وقت وہ یہ رجز بھی پڑھ رہے تھے ؎

اقدم حسین الیوم نلقی احمدا — و شیخک الخیر علیًا ذا الندی

و حسنا لبدر و الفی الاسعدا — و عمک القرم الهمام الا رشدا

و حمزة لیث الله یدعی اسدا — وذ الجناحین تبوأ مقعدا

فی جنت الفردوس یعلو صعدا

لڑتے لڑتے زخموں سے نڈھال ہو کر مقتولین میں گر پڑے۔ عام لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ شہید ہو گئے ہیں مگر درحقیقت ان میں ہنوز کچھ رمق باقی تھی۔ چنانچہ وہ اسی حالت میں مدہوش پڑے رہے۔ حتیٰ کہ جب ان کے کان میں شہادتِ حسینؑ کی آواز پڑی تو بوجہ افاقہ اور کچھ شدت جوش سے بے تاب ہو کر کھڑے ہو گئے اور ایک چھرا جوان کے پاس تھا اس سے انہوں نے یکایک قوم اشقیاء پر حملہ کر دیا اور کچھ دیر قتال و جدال کرنے کے بعد درجۂ رفیعہ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کو عروہ بن بکار التغلبی و زید بن ورقاء الجہنی نے مل کر شہید کیا۔ کئی ارباب مقاتل نے تصریح کی ہے کہ ﴿کان اخر قتیل من اصحاب الحسین﴾[1]

(۱۴) زہیر بن القین البجلی

جناب زہیر کا شمار عرب کے مشہور اشراف روزگار اور نامی گرامی شاہسواران میدان کارزار میں ہوتا تھا۔ کوفہ کے باشندہ تھے۔ جناب زہیر پہلے عثمانی المسلک تھے۔ مگر ۶۰ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور واپسی پر راستہ میں حضرت خامس آل عبا سے منزل زرود پر ان کی دعوت پر ملاقات ہوئی اور پھر امام کی نظر کیمیا اثر سے ان کی کایا پلٹ گئی اور علوی المذہب ہو گئے۔ امام علیہ السلام نے منزل ذوحسم پر حر کے سدِ راہ ہونے کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس وقت جناب زہیر نے جس طرح والہانہ اخلاص کا اظہار کیا تھا اور شب عاشوراء امام کے اصحاب کو اذن رخصت دینے کے وقت جناب زہیر نے دوسرے فداکار اور مخلص اصحاب کی طرح جن فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا تھا ان سب باتوں کی تفصیل قبل ازیں اپنے اپنے مقام پر گزر چکی ہے۔ ان کے اخلاص و ایمان اور جنگی امور میں پوری مہارت رکھنے کا نتیجہ تھا کہ صبح عاشوراء جب امام علیہ السلام نے اپنے مختصر لشکر کو مرتب فرمایا تو میمنۂ لشکر کی زمام قیادت جناب زہیر کے سپرد فرمائی۔ صبح عاشوراء امام الشہداءؑ کے تاریخی خطبہ کے بعد (وہ بروایتے پہلے) اہل ضلال کو وعظ و پند کیا۔ اور

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۵۲۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۶۴ وغیرہ۔

آغاز جنگ ہوتے ہی جناب زہیر نے کئی بار اپنی خداداد شجاعت وشہامت کا عملی ثبوت دیا۔ قبل از ظہر جب شمر نے حسینی سپاہ کے میسرہ پر حملہ کر کے خیام حسینی کے جلانے کا ارادہ کیا تو دست بدست جنگ میں بڑی جانفشانی کے ساتھ جہاد کیا۔ بعد ازاں جب سرکار سید الشہدا نے نماز ظہر ادا فرمائی تو ایک قول کے مطابق جناب سعید بن عبداللہ الحنفی کے ساتھ انہوں نے بھی حفاظت امام کا بے مثال فریضہ انجام دیا۔ نماز ظہر کے قیامت خیز منظر کے بعد جب پھر بڑی شدت سے میدان کارزار گرم ہوا تو جناب زہیر نے آخری بار جذبۂ شوق شہادت سے سرشار ہو کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدانِ کارزار میں قدم رکھا ؎

انا زهير و انا ابن القين　　اذودكم بالسيف عن حسينٌ

ان حسينا احد السبطين　　من عترة البر التقی الزين

ذاک رسول اللّٰه غير المين　　اضربكم ولا اری من شين

يا ليت نفسی قسمت قسمين

پھر جناب سید الشہدا کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

فدتک نفسی هاديا مهديا　　فاليوم القی جدک النبيّاً

وحسنا والمرتضی عليا　　وذاالجناحين الفتی الکميا

واسد اللّٰه الشهيد الحيّا

پھر اس زور شور سے فریضۂ جہاد ادا کیا کہ اُنیس اور ایک روایت کے مطابق ایک سو بیس ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ بالآخر لڑتے لڑتے خود بھی زخموں سے نڈھال ہو گئے۔ اس اثناء میں کثیر بن عبداللہ الشعبی اور مہاجر بن اوس التمیمی نے حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا۔ اور وہ ریاض رضوان کی طرف سدھار گئے۔ جب جناب زہیر زمین پر گرے تو سرکار سید الشہدا نے فرمایا: ﴿لا يبعدک اللّٰه يا زهير و لعن قاتلک لعن الذين مسخو القردة و خنازير﴾ اے زہیر! خدا تمہیں دور (ہلاک) نہ کرے! اور تیرے قاتل پر اس طرح لعنت کرے جس طرح ان لوگوں پر کی تھی جو بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ ہو گئے تھے۔[1]

رفت با ايمان کامل زيں جہاں　　در رياض قرب حق کرد يے مکاں

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۸۱۔ نفس المہموم، ص ۱۲۸۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۷۔ لہوف، ص ۳۵۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۴۲ وغیرہ۔

(۱۵) شوذب بن عبداللہ الہمدانی الشاکریؒ مولیٰ شاکر

(۱۶) عابسؒ بن ابی شبیب بن شاکر بن ربیعہ بن مالک بن صعب بن معاویہ بن کثیر بن مالک بن جشم بن حاشد الہمدانی الشاکری

بنی شاکر قبیلۂ ہمدان کی ہی ایک شاخ ہے۔ جو ولایت اہل بیتؑ میں نہایت مخلص اور راسخ ہے۔ انہی کے بارے میں جناب امیر المومنینؑ نے جنگ صفین میں فرمایا تھا۔ جیسا کہ نصر بن مزاحم منقری نے اپنی کتاب ''وقعۃ الصفین'' میں ذکر کیا ہے کہ ﴿لو تمت عدتهم الفاً لعبد الله حق عبادته﴾ اگر اس قبیلہ کی تعداد ایک ہزار بھی ہوتی تو ان کی بدولت خدا کی اس طرح صحیح عبادت کی جاتی جیسا کہ اس کا حق ہے۔ نیز آنجناب کا یہ شعر بھی اسی خانوادہ کی مدح میں ہے ؎

ولو كنت بوّاباً على باب جنة　　لقلت لهمدان ادخلي بسلام[1]

جناب شوذب کے بارے میں ایک تحقیق

اس قبیلہ کے لوگ بڑے نامی گرامی شاہسوار اور جری و جرار تھے۔ جناب شوذب بن عبداللہ مولیٰ شاکر کے بارے میں عام تاثر تو یہی ہے کہ جناب عابس بن ابی شبیب کے جد شاکر کے غلام تھے۔ ان کی وفات کے بعد جناب عابس سے وابستہ ہوئے۔ اور یہ تاثر لفظ ''مولیٰ شاکر'' سے اس مطلب کے متبادر الی الذہن ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مگر ارباب علم و بصیرت جانتے ہیں کہ لفظ ''مولیٰ'' چند معانی میں مشترک ہے۔ من جملہ ان معانی کے ایک معنی حلیف (ہم قسم) اور دوسرے معنی نزیل بھی ہیں۔ عمدۃ المحدثین جناب شیخ عباس قمی غلام والے معنی کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کو ''مولیٰ شاکر'' صرف اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ بنی شاکر کے حلیف یا نزیل تھے۔[2] اسی طرح آقائے شیخ ذبیح اللہ محلاتی نے بھی ان کی غلامی کا انکار کرتے ہوئے ان کو مولیٰ شاکر کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ درمیان قبیلۂ بنی شاکر مسکن داشت۔ یعنی ان کا گھر بنی شاکر کے محلہ میں تھا۔[3] بہرکیف جناب شوذب کوفہ کے مشہور شیعیان علیؑ اور عرب کے معدودے چند شاہسواروں میں سے ایک اور حضرت امیر المومنینؑ کی احادیث کے حامل تھے۔ شیعیانِ کوفہ ان کی مجلس میں حاضر ہو کر ان سے علمی استفادہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح جناب عابس بن ابی شبیب شاکری شیعیانِ کوفہ کے اعیان و شجعان میں سے تھے۔ نیز آپ ایک اچھے خطیب، شب زندہ دار اور تہجد گزار بزرگوار تھے۔ جب جناب مسلم نے اہل کوفہ کے حالات پر مشتمل مکتوب سید الشہداءؑ کے نام سعید بن عبداللہ کے ہاتھ ارسال کیا۔ اس وقت جناب شوذب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس طرح یہ دونوں بزرگوار مکۂ مکرمہ سے کربلا تک برابر امام

---

[1] وقعۃ الصفین، ص ۲۷۴۔　[2] نفس المہموم، ص ۱۵۰۔　[3] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۶۸۔

حسینؑ کے ہمرکاب رہے۔ حتیٰ کہ روزِ عاشوراء نمازِ ظہر کے ہنگامہ کے بعد عابس نے شوذب سے دریافت کیا: ﴿یا شوذب ما فی نفسک تصنع؟﴾ بتاؤ اب کیا ارادہ ہے؟ شوذب نے برجستہ جواب دیا: ﴿ما اصنع؟ اقاتل معک دون بن بنت رسول اللّٰہ حتی اقتل!﴾ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ میں کیا کروں گا؟ میں آپ کے ساتھ مل کر دخترِ رسولؐ کے فرزند کی نصرت میں جہاد کروں گا۔ یہاں تک کہ شہید ہو جاؤں۔ جناب عابس نے فرمایا: ﴿ذلک الظن بک﴾ مجھے آپ سے یہی حسن ظن تھا! آگے بڑھ کر امام سے اذن جہاد لو۔ تاکہ امام دوسرے اصحاب کی طرح تمہاری مصیبت کا صدمہ بھی برداشت کریں (اور اس طرح اجر و ثواب بے حساب کا استحقاق حاصل کریں) اور میں بھی تمہاری مصیبت کا صدمہ جھیلوں۔ بنا بریں اگر اس وقت تم سے زیادہ مجھے کوئی عزیز ہوتا تو میری یہی خواہش ہوتی کہ وہ میرے سامنے جام شہادت نوش کرے اور میں اس کا صدمہ برداشت کروں۔ آج کا دن غنیمت ہے۔ جس قدر ممکن ہو آج اجر و ثواب حاصل کر لینا چاہئے کیونکہ آج کے بعد سوائے حساب و کتاب کے اور کسی عمل کا موقع نہیں ملے گا۔

اصحاب کے رخصت ہونے اور امامؑ کے اجازت دینے کا طریقہ

چنانچہ شوذب نے خدمت امام میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا: ﴿السلام علیک یابن رسول اللّٰہ﴾ امام نے سلام کا جواب دیا: ﴿و علیک السلام و نحن خلفک﴾ ارباب مقاتل نے لکھا ہے کہ اصحاب کرام اور امام عالی مقام کا یہی طریقہ تھا کہ وہ بوقت رخصت اسی طرح سلام کرتے اور امامؑ اسی طرح جواب دیتے اور پھر یہ آیت تلاوت فرماتے: ﴿فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾[1] اجازت ملنے کے بعد میدان قتال میں گئے اور اس طرح لڑے جس طرح بہادر شاہسوار لڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ قوم جفاکار کی ایک جماعتِ کثیرہ کو واصل جہنم کرنے کے بعد خود بھی راہی فردوس بریں ہوئے۔

شوذب کی شہادت کے بعد جناب عابس بن ابی شبیب شاکری خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا: ﴿یا ابا عبد اللّٰہ! اما واللّٰہ ما امسٰی علی وجہ الارض قریب ولا بعید اعز علیّ ولا احبّ الی منک ولو قدرت علی ان ادفع عنک الضیم او القتل بشیٔ اعز علیّ من نفسی و دمی لفعلت السلام علیک یا ابا عبد اللّٰہ اشھد اللّٰہ انی علی ھداک و ھدی ابیک!﴾ اے ابوعبداللہ! خدا کی قسم اس وقت تمام روئے زمین پر مجھے نزدیک یا دور کا کوئی رشتہ دار یا تعلقدار آپ سے زیادہ عزیز اور محبوب نہیں ہے۔ اگر میرے پاس اپنی جان اور اپنے خون سے زیادہ عزیز و نفیس کوئی چیز موجود ہوتی جس کے ذریعہ آپ سے ظلم و

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۶۰۔ مقتل المقرم، ص ۲۸۱۔ مقتل العوالم، ص ۸۵۔ مقتل الحسین للخوارزمی، ج ۲، ص ۲۵۔ عاشر بحار، ص ۱۹۵ وغیرہ۔

تعدی اور قتل کو دور کر سکتا تو یقیناً اس کے صرف کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ بلکہ اسے نثار کرتا۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ کہ میں آپ کے اور آپ کے والد ماجد کے (برحق) طریقہ پر قائم ہوں۔ اذن جہاد ملنے کے بعد تلوار کو میان سے نکال کر میدان وغا میں کود پڑے۔ جناب عابس بن ابی شبیب کے منہ پر تلوار کے زخم کا ایک نشان تھا۔ جو آپ کو جنگ صفین میں لگا تھا۔ فوج مخالف کے ایک فوجی ربیع بن تمیم ہمدانی کا بیان ہے۔ جب میں نے عابس کو میدان جنگ میں آتے دیکھا تو انہیں فوراً پہچان لیا کیوں کہ قبل ازیں میں ان کو کئی جنگوں میں بالخصوص جنگ صفین میں دیکھ چکا تھا۔ اور ان کی شجاعت کے عظیم کارناموں کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ میں نے پکار کر کہا: ﴿ھذا اسد الاسود ھذا ابن ابی شبیب لا یخرجن الیہ احد منکم﴾ لوگو! یہ زبردست شیر ہے۔ یہ ابن ابی شبیب ہے۔ خبردار تم میں سے کوئی بھی اس کے مقابلہ میں نہ نکلے۔ چنانچہ جناب عابس نے بار بار مبارز طلب کیا۔ مگر فوج مخالف سے کوئی نہ نکلا۔ ابن سعد نے فوج کو حکم دیا کہ ان پر ہر طرف سے پتھر برساؤ۔ جب جناب عابس نے یہ کیفیت دیکھی تو (غصہ میں) آ کر زرہ اور خود اتار پھینکی اور پھر شمشیر بکف ہو کر فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے۔ شخص مذکور بیان کرتا ہے کہ بخدا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان تابڑ توڑ حملوں میں عابس نے دو سو سے زیادہ لوگوں کو پچھاڑا۔ یہ حالت دیکھ کر لوگ ان پر ہر چہار طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کو شہید کر کے ان کا سر قلم کر لیا۔ میں نے متعدد آدمیوں کو اپنی ناموری کی خاطر جھگڑتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک شخص یہ کہتا تھا کہ میں نے عابس کو قتل کیا۔ جب ان کو ابن سعد کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر ان کا جھگڑا ختم کیا کہ ان کو کسی ایک شخص نے قتل نہیں کیا بلکہ تم سب نے مل کر کیا ہے۔[1]

(۱۷) حنظلہ بن اسعد الشبامی الہمدانیؓ

جناب حنظلہ بنی شبام کے چشم و چراغ تھے جو کہ بنی ہمدان ہی کا ایک قبیلہ ہے۔ صاحب ابصار العین نے لکھا ہے کہ ﴿کان حنظلۃ بن اسعد الشبامی وجھاً من وجوہ الشیعۃ ذلقاً و فصاحۃ شجاعاً قارئاً و کان لہ ولد یدعی علیا لہ ذکر فی کتب التواریخ﴾ یعنی جناب حنظلہ بن اسعد شبامی نامور شیعوں میں سے تھے خوش تقریر اور صاحب فصاحت و بلاغت تھے۔ نیز بہادر و دلیر اور قاری قرآن تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا جس کا نام علی تھا جس کا ذکر کتب تواریخ میں موجود ہے۔ جناب سید الشہداء کے کربلا میں نزول اجلال فرمانے کے بعد حنظلہ جماعت حسینی میں آ کر شامل ہوئے۔ آغاز جنگ سے پہلے امام علیہ السلام انہیں پسر سعد کے ساتھ پیام و کلام کے لیے بھیجتے تھے۔

روز عاشوراء جب امام علیہ السلام کے اعوان و انصار بالکل تھوڑے رہ گئے تو جناب حنظلہ اذن جہاد حاصل کرنے

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۱۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۶۸، ۱۸۰۔ نفس المہموم، ص ۱۵۰۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۷۔ عاشر بحار، ص ۱۹۹۔ تمقام، ص ۲۵۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۶۳ وغیرہ۔

کے لیے امامؑ کے آگے آ کر کھڑے ہو گئے۔ جدھر سے کوئی تیر یا تلوار یا نیزہ سے وار کرتا تھا۔ جناب حنظلہ آگے بڑھ کر اپنے منہ یا سینہ یا ہاتھوں پر اسے روک لیتے تھے۔ اور بآواز بلند قوم اشقیاء کو مخاطب کر کے کہتے تھے۔ ﴿یٰا قَوْمِ اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْ ، بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ وَ یَا قَوْمِ اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ مَالَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (سورۂ مومن، آیت ۳۰ تا ۳۳)

اے میری قوم! مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں تم پر پچھلی امتوں کے سے دن نہ پڑ جائیں (یعنی) قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والوں کی سی حالت نہ گزرے۔ حالانکہ اللہ بندوں کے حق میں ظلم نہیں چاہتا۔ اور اے میری قوم! مجھے تمہارے بارے میں قیامت کے دن کا بھی اندیشہ ہے جس دن تم روگرداں ہو کر چلو گے (تو) اس دن اللہ کی طرف سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور جس سے خدائے تعالیٰ توفیق ہدایت سلب کر لے پس اس کا رہبر کوئی ہوتا ہی نہیں۔ اس کے بعد پکار کر کہا: ﴿یا قوم لا تقتلوا حسیناً فیسحتکم اللّٰہ بعذاب وقد خاب من افتری﴾ اے قوم! امام حسینؑ کو شہید نہ کرو۔ ورنہ خدا تمہیں اپنے عذاب کے ذریعہ نیست و نابود کر دے گا۔ اور ہمیشہ وہ آدمی خائب و خاسر ہوتا ہے جو افترا پردازی کرتا ہے۔

ان کا کلام سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿یابن اسعد رحمک اللّٰہ انھم قد استوجبوا العذاب حین ردوا علیک ما دعوتھم الیہ من الحق و نھضوا الیک لیستبیحوک او اصحابک فکیف بھم الان و قد قتلوا اخوانک الصالحین﴾ اے پسر اسعد! خدا تم پر رحم کرے۔ یہ لوگ عذاب و عقاب خداوندی کے مستحق تو اسی وقت سے ہو چکے ہیں۔ جب صبح عاشورہ تمہاری دعوت الی الحق کو مسترد کرتے ہوئے تجھے اور تیرے ہمراہیوں کو قتل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب ان کی نجات کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ جب کہ تیرے کئی صالح بھائیوں کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین کر چکے ہیں۔ ابن اسعد نے کہا: ﴿صدقت یابن رسول اللّٰہ جعلت فداک انت اعلم و احق بذلک افلا نروح الی ربنا و نلحق باخواننا الصالحین﴾ ہاں فرزند رسولؐ! آپ سچ فرما رہے ہیں۔ میری جان آپ پر قربان اگر یہ تو فرمائیں۔ کیا ہم اپنے پروردگار کی بارگاہ میں نہ جائیں؟ اور اپنے نیک بھائیوں کے ساتھ جا کر شامل نہ ہوں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رح الی ماھو خیر لک من الدنیا وما فیھا و الی ملک لا یبلی﴾ بیشک اس عالم کی طرف جاؤ جو دنیا و مافیہا سے بہتر و برتر ہے اور ایسی سلطنت کی طرف جو کبھی کہنہ نہ ہوگی۔ اجازت جہاد ملتے ہی حنظلہ نے کہا: ﴿السلام علیک یا ابا عبد اللّٰہ صلی اللّٰہ علیک و علی اھل بیتک و جمع اللّٰہ بیننا

وبينک في الجنة ﴾فرزند رسولؐ! آپ پر اور آپ کے اہل بیت پر درود و سلام ہو۔ خدا کرے کہ جنت الفردوس میں ہم اور آپ اکٹھے ہوں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: آمین آمین۔ پھر شمشیر بکف ہو کر دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی دیر بڑا دلیری اور جانفشانی سے جہاد کیا پھر دشمن ہر طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو شہید کر دیا۔[1] رضوان اللہ تعالی علیہ۔

(۱۸) عبدالرحمٰن بن عبداللہ الیزنیؒ

جناب عبدالرحمٰن جن کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں نکلے ؎

انا ابن عبد اللّٰه من آل يزن	ديني علي دين حسين و حسن
اضربكم ضرب فتي من اليمن	ارجو بذاك الفوز عند المؤتمن

اس کے بعد اپنے آپ کو مخالف کے دریائے لشکر میں ڈال دیا اور چند ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد خود دولت شہادت حاصل فرمائی۔[2]

(۱۹) سعد بن حنظلہ التمیمیؒ

ان کے حالات بھی نہیں مل سکے۔ محدث قمی وغیرہ نے صرف اس قدر لکھا ہے: ﴿كان من اعيان عسكر الحسينؑ﴾ یعنی یہ بزرگوار حضرت سید الشہداءؑ کے لشکر کے نامور لوگوں میں سے تھے۔ یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان وغا میں نکلے ؎

صبراً على الاسياف و الاسنة	صبراً عليها لدخول الجنّة
و حور عين ناعمات هنّه	لمن يريد الفوز لا بالظنّة
يا نفس للراحة فاجهدنّه	وفي طلاب الخير فارغبنّه[3]

پھر قوم اشقیاء پر ٹوٹ پڑے۔ سخت جنگ کرنے کے بعد شربت شہادت نوش فرمایا۔ رضوان اللہ علیہ۔

(۲۰) ابوثمامہ الصیداویؒ

نام و نسب عمرو بن عبداللہ الہمدانی الصائدی اور کنیت ابوثمامہ ہے۔ جناب ابوثمامہ مشہور تابعی، شاہسوار حضرت امیرالمومنینؑ کے مخصوص اصحاب اور کوفہ کے مشہور شیعیان حیدر کرار میں سے تھے۔ حضرت امیر کے ہمراہ تینوں

---

[1] ذخیرۃ، ص ۲۲۷۔ نفس، ص ۱۴۹۔ لوعج، ص ۱۲۱۔ مقتل، ص ۳۵۱۔ فرسان، ج ۱، ص ۱۳۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۵۴۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۴ وغیرہ

[2] نفس، ص ۱۵۴، لوعج، ص ۱۳۰، فرسان، ج ۱، ص ۲۳۳۔

[3] نفس، ص ۱۵۳، فرسان، ص ۱۵۷، تاریخ، ج ۶، ص ۲۵۴، ۲۶۱ وغیرہ۔

جنگوں میں رہ کر دادِ شجاعت وایمان دے چکے تھے۔ آنجناب کی وفات کے بعد امام حسنؑ سے وابستہ رہے۔ صلح حسنیؑ کے بعد جب امامؑ واپس مدینہ تشریف لے گئے تو یہ کوفہ ہی میں مقیم رہے۔ حتیٰ کہ ہلاکت معاویہ کے بعد جب شیعیان علی سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر جمع ہوئے اور امام کو کوفہ تشریف لانے کا دعوت نامہ لکھا تو یہ بھی ان لوگوں میں شریک تھے۔ جب حضرت مسلم بن عقیلؑ کوفہ میں تشریف لائے تو یہ بزرگوار جناب مسلمؑ کے حکم سے شیعیان علی سے رقم جمع کر کے اس سے اسلحۂ جنگ خریدتے تھے۔ کیونکہ یہ اسلحہ شناسی میں بڑے ماہر تھے۔ شہادت مسلمؑ کے بعد روپوش ہو گئے۔ ابن زیاد نے ان کو بہت تلاش کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر جب ان کو جناب سید الشہداءؑ کے بجانب عراق تشریف لانے کی اطلاع ملی تو جناب نافع بن ہلال جملی کے ساتھ پوشیدہ طور پر خدمت امام میں حاضری کے لیے روانہ ہوئے۔ اور راستہ میں کسی منزل پر قافلۂ حسینی کے ساتھ شریک ہو گئے۔ یہی وہ بزرگوار تھے جنہوں نے روزِ عاشوراء زوال آفتاب کے وقت فرض شناسی کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہوئے خدمت امام میں عرض کیا تھا کہ میری خواہش ہے کہ آخری نماز حضور کی اقتداء میں پڑھ کر بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوں۔ اور امام علیہ السلام نے خوش ہو کر ان کو دعا دی تھی کہ تو نے اس وقت نماز کو یاد کیا ہے۔ خدا تمہیں نماز گزاروں میں شمار کرے۔

ایک تحقیق

اب قابل غور یہ امر ہے کہ آیا جناب ابوثمامہ کی یہ تمنا پوری ہوئی یا نہ؟ بعض کتب مقاتل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی بلکہ اسی ہنگام ظہر کے ہنگامہ میں اپنے ایک چچازاد بھائی قیس بن عبداللہ الصائدی کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ چنانچہ کتاب مستطاب شہید انسانیت کے لائق مؤلف رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''یہ سوچ کر نہایت تکلیف ہوتی ہے کہ ابوثمامہ کی یہ تمنا کہ وہ نماز ظہر امامؑ کی اقتداء میں پڑھ لیں۔ پوری نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی ہنگامہ میں اپنے قبیلہ کے ایک شخص کے ہاتھ سے جو فوج یزید میں تھا وہ شہید ہوئے۔'' تاریخ طبری وکامل کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے مگر ہماری متعدد کتب سیر وتراجم سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یہ معلوم کر کے روحانی مسرت وشادمانی حاصل ہوتی ہے کہ ان کی یہ تمنا پوری ہو گئی تھی۔

چنانچہ ذخیرۃ الدارین میں ص ۲۴۶ پر لکھا ہے: ﴿ثم ان ابا ثمامة قال للحسین و قد صلی بھم الحسین شدۃ صلوۃ الخوف لان القوم کانوا مھاجمین علیھم یا ابا عبد اللّٰہ! انی قد ھممت ان الحق باصحابی و کرھت ان اتخلف و اراک وحیداً من اھلک قتیلا﴾ جب امام حسینؑ نماز خوف کے طریقہ پر نماز ظہر پڑھا چکے تو اب ابوثمامہ الصائدی نے آگے بڑھ کر خدمت امام میں عرض کیا: ﴿یا ابا عبد اللّٰہ!﴾ میں نے اب یہ عزم کر لیا ہے کہ اپنے بھائیوں سے ملحق ہوں۔ اور میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ آپ کو یکہ وتنہا

دیکھتے ہوئے جاں سپاری میں پس و پیش کروں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿تقدم فانا لاحقون بک عن ساعة﴾ جاؤ۔ ہم بھی تھوڑی دیر کے بعد تمہارے ساتھ ملحق ہونے والے ہیں۔ اذن جہاد ملتے ہی جناب ابوثمامہ نے خوب جنگ کی۔ یہاں تک کہ زخموں سے چور چور ہو گئے۔ اس وقت ان کے چچازاد بھائی قیس بن عبداللہ نے جسے آپ سے کوئی سابقہ عداوت تھی آپ کو شہید کر دیا۔

ایسا ہی فرسان الہیجاء، ج۱، ص۶ پر لکھا ہے: ﴿ابو ثمامہ پس از ادائی نماز خوف آمادۂ جاں نشانی شد۔ بخدمت آں حضرت عرض کرد یابن رسول اللہ! بدرستیکه من مهیّا شدم که خود مرا باصحاب و یاران خود برسانم و دوست ندارم که اذانها بازمانم و مرا طاقت نباشد که ترا چنیں غریب و بے مددگار نیگرم یاترا مقتول به بینم۔ آں حضرت فرمود قدم پیش گزار اے ابا ثمامه که عنقریب باهم بشما ملحق خواهیم شد﴾ (تا آخر) اس عبارت کا مطلب بھی وہی ہے جو ذخیرہ کی عبارت کا ہے۔ ان حقائق سے معلوم ہوا کہ جناب ابوثمامہ کی شہادت فریضۂ ظہر ادا کرنے کے بعد ہوئی ہے۔

نفس المہموم میں صفحہ ۱۶۱ پر جنگ ظہر کے بعد جناب ابوثمامہ کا یہ رجز پڑھنا بھی مذکور ہے ۔

عزاء لال المصطفیٰ و بناته	علی حبس خیر الناس سبط محمدٍ
عزاء لبنت المصطفیٰ و زوجها	خزانة علم اللّٰه من بعد احمدٍ
عزاء لاهل الشرق و الغرب کلهم	و حزناً علی حبس الحسین المسددٍ
فمن مبلغ عنی النبیّ و بنتهٗ	بان ابنکم فی مجهدای مجهدٍ

(۲۱) یحییٰ بن سلیم مازنیؓ

ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ ظہر کے قیامت خیز ہنگامہ کے بعد امامؑ سے اجازت جہاد لے کر میدان کارزار میں یہ رجز پڑھتے ہوئے نکلے ؎

لاضربن القوم ضرباً معضلاً ضرباً شدیداً فی العدیٰ معجلاً

لا عاجزاً فیھا ولا مولولا ولا اخاف الیوم موتا مقبلاً

لکننی کالليث یحمی اشبلا

پھر کچھ دیر جنگ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[1]

(۲۲) یحییٰ بن کثیر انصاریؓ

جناب یحییٰ اذن جہاد حاصل کرنے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں نکلے ؎

ضاق الخناق بابن سعد و ابنه بلقاھما الفوارس الانصار

و مھاجرین مخضبین رماحھم تحت العجاجة من دم الکفار

خضبت علی عھد النبی محمدٍ والیوم تخضب من دم الفجار

خانوا حسیناً و الحوادث جمة و رضوا یزیداً و الرضا فی النار

(الیٰ آخرہا)

پھر بڑی شجاعت و دلیری کے ساتھ جہاد کیا۔ حتیٰ کہ بقول صاحب شرح شافیہ ابی فراس چالیس اور بقول ابی مخنف پچاس آدمیوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد خود شربت شہادت نوش کیا۔[2]

(۲۳) یحییٰ بن ہانی بن عروۃ المرادیؓ

ابی مخنف اور صاحب ذخیرۃ الدارین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب یحییٰ، عمرو بن الحجاج الزبیدی کے بھانجے تھے کیونکہ عمرو کی بہن روعہ ہانی بن عروہ کی زوجیت میں تھیں جن کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوئے۔ جناب مسلم و ہانی کی شہادت کے بعد یحییٰ ابن زیاد کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے جب سید الشہداءؑ کے کربلا پہنچنے کی اطلاع ملی تو کسی نہ کسی طرح خدمت امامؑ میں پہنچ گئے۔ اور روز عاشوراء بقول بعضے حملۂ اولیٰ میں۔ اور بقول سید محمد بن ابی طالب مبارزت طلبی میں یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں نکلے ؎

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۸۔ نفس المہموم، ص ۱۵۳۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۳۶۔ تمام، ص ۳۵۶۔

[2] شرح شافیہ ابی فراس ہمدانی، ص ۱۳۱۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۶۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۳۶ وغیرہ۔

اغشاکم ضرباً بحد السیف	لاجل من حل بارض الخیف
بقدرۃ الرحمٰن رب الکیف	اضربکم ضرباً بغیر حیف

اس طرح متعدد ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔[1]

(۲۴) جنادہ بن حارث الانصاری

نام ونسب جنادہ بن کعب بن الحارث الانصاری الخزرجی۔ یہ بزرگوار ولایت اہل بیتؑ میں اخلاص رکھنے والے اصحاب حسینیؑ میں سے تھے۔ یہ مکہ مکرمہ سے اپنے اہل وعیال سمیت سفر عراق میں جناب امام حسینؑ کے ساتھ آئے تھے۔ روز عاشوراء جب معرکہ کربلا شروع ہوا تو یہ بزرگوار اذن جہاد حاصل کرکے یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں نکلے ؎

انا جناد و ابن الحارث	لست بخوّار ولا بناکث
عن بیعتی حتی یرثنی وارثی	الیوم شلوی فی الصعید ماکث

پھر لشکر فجار پر حملہ کرکے سولہ ناریوں کو دار البوار میں پہنچایا۔ اس کے بعد خود فیض شہادت پر فائز[2] ہوئے۔

(۲۵) ایک نوخیز صاحبزادے کی شہادت

ارباب مقاتل لکھتے ہیں کہ ایک نوخیز لڑکا میدان کارزار میں نکلا جس کی عمر زیادہ سے زیادہ گیارہ[3] سال تھی۔ اور اس کا والد پہلے جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ اس بچے کی والدہ نے جو اس سفر میں اس کے ہمراہ تھی یہ حکم دے کر کہ ﴿یا بنی قاتل بین یدی ابن رسول اللّٰہ﴾ بیٹا جاؤ! اور فرزند رسولؐ کی حمایت میں جہاد کرکے جان نثار کرو، روانہ کیا چنانچہ جب وہ لڑکا اذن جہاد کے لیے بارگاہ امام میں حاضر ہوا تو سید الشہداءؑ نے اسے دیکھ کر اصحاب سے فرمایا: ﴿ھذا شاب قتل ابوہ و لعل امہ تکرہ خروجہ﴾ یہ نوخیز لڑکا ہے اس کا والد پہلے شہید ہو چکا ہے شاید اس کی والدہ اس کے میدان جنگ میں جانے پر راضی نہ ہو؟ لڑکے نے عرض کیا: ﴿امی امرتنی بذلک﴾ میرے آقا! میری والدہ نے ہی تو مجھے حکم دے کر اور جنگی لباس پہنا کر بھیجا ہے۔ اذن حاصل کرنے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان وغا میں نکلا ؎

امیری حسین و نعم الامیر	سرور فؤاد البشیر النذیر

۱۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۶۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۲۷۔

۲۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۳۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۷۶۔ بحار، ج ۱۰، ص ۹۸۔

۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۳۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۹۰۔

علی و فاطمة والداه   فهل تعلمون له من نظیر

له طلعة مثل شمس الضحی   له غرة مثل بدر منیر

پھر جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ستمگر قاتل نے اس کا سر قلم کر کے سپاہ حسینی کی طرف پھینک دیا۔ اس کی دلیر ماں نے سر کو اٹھا کر کہا: ﴿احسنت یا سرور قلبی و یا قرة عینی﴾ شاباش! اے میرے دل کے سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک بیٹا۔ پھر سر اٹھا کر ایک ظالم کو زور سے دے مارا جس سے وہ واصل جہنم ہو گیا۔ اور بعد ازاں عمود خیمہ لے کر یہ کہتی ہوئی حملہ آور ہوئی ۔

انا عجوز سیدی ضعیفة   خاویة بالیة نحیفة

اضربکم بضربة عنیفة   دون بنی فاطمة الشریفة

اسی طرح دو ناریوں کو واصل جہنم کر دیا۔ سید الشہداءؑ نے اسے واپس خیام میں پلٹ آنے کا حکم دیا۔ اور اسے دعائے خیر دی[1] اور بروایتے لڑنے سے قبل امام نے اسے واپس لوٹا دیا۔[2]

ولو کان النساء کمثل هذی   لفضلت النساء علی الرجال

وضاحت

بعض ارباب مقاتل کا خیال ہے کہ یہ نوخیز لوکا جناب جنادہ بن کعب بن الحرث الانصاری مذکور کا ہی صاحبزادہ تھا۔ اور اس کا نام عمرو بن جنادہ[3] ہے۔ واللہ العالم۔

(۲۶) سید الشہداءؑ کے ترکی غلام کی شہادت

سید الشہداءؑ کا ایک ترکی غلام جو کہ قاری قرآن تھا۔ ان کا نام نامی غالباً "واضح" تھا۔ جیسا کہ بعض کتابوں سے واضح ہوتا ہے۔ مگر صاحب قمقام نے (صفحہ ۳۵۸ پر) ان کا نام "قارب" لکھا ہے۔ اور صاحب فرسان الہیجاء نے ان کا نام اسلم بن عمرو لکھا ہے۔ (ج ۱، ص ۳۴، ۳۵) واللہ العالم۔

یہ اذن جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں نکلے ۔

البحر من طعنی و ضربی یصطلی   والجو من سهمی و نبلی یمتلی

اذا حسامی فی یمینی ینجلی   ینشق قلب الحاسد المبجلی

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۵۶۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۲۔ بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۸۔

[2] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۳۔

[3] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۳۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۹۰۔

پھر سیاہ یزید پر تابڑ توڑ حملے کرنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ ایک جماعت کو اور بقول ابن شہر آشوب ستر کوفیوں کو جہنم رسید کیا۔ پھر زخموں سے نڈھال ہو کر گرے۔ ابھی کچھ رمق حیات باقی تھے کہ سید الشہداءؑ ان کے سرہانے پہنچے اور روئے اور اپنا رخسار اقدس غلام کے رخسار پر رکھ دیا اسی اثناء میں غلام نے آنکھیں کھولیں اور شاید اپنے اقبال کو اوج کمال پر دیکھ کر تبسم کیا۔ پھر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے جنت الفردوس میں پہنچ گئی۔[1] رضوان اللہ علیہ۔

(۲۷) انس بن الحارث الکاہلی

نام و نسب انس بن حارث بن نبیہ بن کاہل بن عمرو بن صعب بن اسد بن خزیمہ الاسدی الکاہلی عسقلانی و ابن عساکر وغیرہ علماء تراجم نے اسے صحابۂ رسولؐ میں شمار کیا ہے۔ اور لکھا ہے: ﴿کان انس بن الحرث بن نبیہ الکاهلی صحابیاً کبیراً ممن رای النبیؐ و سمع حدیثہ﴾ (تاریخ ابن عساکر، ج ۲)

جناب انس نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہی سے آنحضرتؐ کی یہ حدیث مروی ہے کہ ایک بار جناب امام حسینؑ سرکار رسالت مآبؐ کی گود میں بیٹھے تھے۔ جناب رسولؐ خدا نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ان ابنی هذا یقتل بارض یقال لها کربلا فمن ادرکه منکم فلینصره﴾ میرا یہ بیٹا سرزمین کربلا میں شہید کیا جائے گا تم میں سے جو شخص ان کو اس حال میں پائے ان کی نصرت کرے۔

چنانچہ اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار انہی چند خوش نصیب اصحاب رسولؐ میں سے تھے جنہوں نے جناب سید الشہداءؑ کا یہ دور ابتلاء و آزمائش دیکھا۔ اور ان کی نصرت کا حق ادا کرتے ہوئے درجۂ رفیعہ شہادت پر فائز ہوئے۔[2] سید الشہداءؑ کے کربلا میں وارد ہونے کے بعد کسی نہ کسی طرح جناب انس نے راتوں رات اپنے آپ کو آنجنابؑ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ چونکہ بہت ضعیف اور عمر رسیدہ تھے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ جنگ بدر و حنین میں شریک ہو چکے تھے اس لیے جب روز عاشوراء اذن جہاد کے لیے خدمت امام میں حاضر ہوئے اور امام نے اذن مرحمت فرمایا تو انہوں نے عمامہ سے اپنی خمیدہ کمر کس کے باندھی اور ایک پٹی لے کر بھوؤں کو جو آنکھوں پر لٹکی ہوئی تھیں بلند کر کے پیشانی پر باندھا۔ جناب امام حسینؑ ان کی یہ حالت دیکھ کر رو پڑے اور دعائے خیر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿شکر اللہ لک یا شیخ!﴾ اے شیخ! خدا تیری اس سعی کو مشکور فرمائے! پھر جناب انس یہ رجز پڑھتے ہوئے قوم اشقیاء پر ٹوٹ پڑے ؎

---

[1] ماثر بحار، ص ۱۹۹۔ نفس المہموم، ص ۱۵۲۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۳۔

[2] اصابہ، ج ۱، ص ۶۸، ۶۹، طبع مصر۔ تاریخ ابن عساکر، ج ۳۔ خصائص سیوطی، ج ۲، ص ۱۲۵۔

قد علمت کاهلها و دودان — والخندفون و قیس عیلان

بان قومی آفة الاقران — لدی الوغی و سادة الفرسان

مباشر و الموت بطعن آن — اذا لنا تری العجز عن الطعان

ال علیؑ شیعة الرحمٰن — و ال حرب شیعة الشیطان

پھر شیر بیشہ شجاعت کی طرح دادِ شجاعت دی اور اس ضعیفی و پیرانہ سالی کے عالم میں علاوہ زخمیوں کے بقول ابن شہر آشوب (ج ۴، ص ۹۵) چودہ اور بقول دیگر بعض ارباب مقاتل اٹھارہ ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ اس کے بعد خود بھی شربت شہادت پی کر جنت کو سدھارے۔[1]

(۲۸) حجاج بن مسروق الجعفی

نام ونسب حجاج بن مسروق بن عوف بن عمیر بن کلب بن ذہل بن جوف بن سعد العشیرہ المذحجی الجعفی۔ جناب حجاج مشہور تابعی اور جناب امیر المومنینؑ کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ کوفہ میں رہائش تھی۔ جب انہیں امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑ کر مکہ میں تشریف لے جانے کی اطلاع ملی تو زیارتِ امامؑ کی غرض سے مکہ پہنچے اور پھر مکہ سے کربلا تک اس سفر عراق میں آپ کے ہمراہ رہے۔ اس سفر میں یہی حجاج اوقات نماز میں آنجنابؑ کے مؤذن تھے۔ روز عاشوراء یہ مؤذن امامؑ اذن جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں نکلے

اقدم حسیناً هادیاً مهدیا — الیوم القی جدک النبیا

ثم اباک ذا الندی علیاً — ذاک الذی نعرفه وصیا

امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿نعم و انا القاهما علی اثرک﴾ تیرے بعد میں بھی ان بزرگواروں کی بارگاہ میں آرہا ہوں۔ پھر میدان جہاد میں مشتاقان شہادت کی طرح دادِ شجاعت دی۔ یہاں تک کہ پندرہ بقولے اٹھارہ اور بروایتے پچیس کوفیوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد خود شربتِ شہادت پیا۔[2] رضوان اللّٰہ علیہ۔

(۲۹) ابوعمرو النہشلی

یہ بزرگوار کوفہ کے شیعیان حیدر کرارؑ شجاعان روزگار میں سے نہایت متقی و پرہیزگار اور تہجد گزار تھے۔ مہران

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۸۔ فرسان الہیجاء، ج ا، ص ۳۷۔ قمقام، ص ۳۵۷۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۲۸۔ عاشر بحار، ص ۱۹۸۔ نفس المہموم، ص ۱۵۴، وغیرہ۔

[2] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۸۔ فرسان الہیجاء، ج ا، ص ۱۰۲۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۹۱۔ عاشر بحار، ص ۱۹۸۔ قمقام، ص ۳۵۷۔ نفس المہموم، ص ۱۱۵ وغیرہ۔

موسیٰ بن عاکل کا بیان ہے جو واقعۂ کربلا میں موجود تھا کہ میں نے روز عاشوراء اصحاب حسینؑ میں سے شیر بیشۂ شجاعت کی طرح ایک ایسے بہادر کو جنگ کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ جدھر حملہ کرتا تھا لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں نے دریافت کیا: یہ کون ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ ابو عمرو النہشلی (یا الخنظلی) ہے۔ اس دار و گیر کے ہنگامہ میں ایک جماعت کو واصل جہنم کیا۔ پھر خدمت امامؑ میں حاضر ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

ابشر هديت الرشد تلقى احمداً　　　فى جنة الفردوس تعلوا صعداً

پھر میدان کارزار میں پلٹ کر جنگ کرنا شروع کی۔ یہاں تک کہ بنی لات کے ایک شخص عامر بن نہشل نے ان پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا اور سر تن سے جدا کر دیا۔[1]

(۳۰) انیس بن معقل الاصبحی

ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ ابن شہر آشوب صاحب مناقب ابن آشوب' اعثم کوفی، آقائے محسن الامین العاملی اور محدث قمی وغیرہم نے ان کو شہداء کربلا میں شمار کیا ہے۔ ان سب حضرات نے لکھا ہے کہ امام سے اجازت جہاد لینے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان وغا میں کود پڑے ؎

انا انيس وانا ابن معقل　　　وفى يمينى نصل سيف مصقل

اعلوبه الهامات وسط القسطل　　　عن الحسين الماجد المفضل

ابن رسول الله خير مرسل

پھر سیل بے کراں یا شیر گرسنہ کی طرح قوم اشقیاء پر ٹوٹ پڑے اور کشت و خون کا بازار گرم کر دیا۔ یہاں تک کہ ابن شہر آشوب کے بیان کے مطابق کچھ اوپر بیس افراد کو دار البوار میں پہنچانے کے بعد خود جام شہادت نوش کیا۔[2]

(۳۱) ابراہیم بن الحصین

صاحب مناقب و اعیان الشیعہ وغیرہ بہت سے علماء سیر و تواریخ کے نزدیک یہ بزرگوار شہدائے کربلا میں سے شمار کیے گئے ہیں۔ ابی مخنف کے بیان کے مطابق ان کا شمار جناب امام حسن و امام حسین علیہما السلام کے اصحاب میں ہوتا ہے۔ دوسرے حالات تاریکی میں ہیں۔ روز عاشوراء اذن جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے جنگ کے ہنگامۂ رستخیز میں نکلے ؎

اضرب منكم مفصلا وساقا　　　ليهرق اليوم دمى مهراقا

---

[1] تمقام، ص ۳۵۹۔ ناسخ التواریخ، ج ۲، ص ۲۶۵۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۵۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۵۳ وغیرہ۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۳۸۔ نفس المہموم، ص ۱۵۵۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۱۔ ناسخ، ج ۲، ص ۲۶۷ وغیرہ۔

و یرزق الموت ابو اسحاقا   اعنی بنی الفاجرة الفساقا

اس کے بعد غضبناک شیر کی طرح ابن سعد کی لومڑیوں پر حملہ کر کے سیف دستان سے پچاس اور بروایتے چوراسی کو تباہ کرنے کے بعد خود عالم جاودانی کی طرف منتقل ہو گئے۔[1]

(۳۲) عمیر بن عبداللہ المذحجی

ان کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ بروایت عالم ربانی محمد بن علی بن شہرآشوب مازندرانی وغیرہ۔ ان کا شمار بھی شہدائے کربلا میں ہوتا ہے۔ امام عالی مقام سے اذن جہاد حاصل کرنے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے عرصۂ جنگ میں قدم رکھا ؎

قد علمت سعد وحی مذحج   انی لدی الهیجاء غیر مخرج

اعلو بسیفی هامة المذحج   و اترک القرن لدی التعرج

فریسة الذئب الازل الاعرج

پھر داد شجاعت دیتے ہوئے عبداللہ بجلی و مسلم ضبابی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔[2]

(۳۳) عمرو بن مطاع الجعفی

تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ مناقب و ناسخ وغیرہ کے بیان کے مطابق یہ بزرگوار بھی شہداء کربلا کی فہرست میں شامل ہیں۔

امام عالی وقار سے اجازت جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے سپاہ ابن زیاد پر حملہ آور ہوئے ؎

انا بن جعف و ابی مطاع   فی یمینی مرهف قطاع

و اسمر فی راسه لمّاع   یری له من ضوئه شعاع

الیوم قد طاب لنا القراع   دون الحسین الضرب و الصراع

یرجی بذاک الفوز والدفاع   عن حرّ نارٍ حین لا انتفاع

صلی علیه الملک المطاع

اور کچھ ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ■۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۵۔ نفس المہموم، ص ۱۵۷۔ مناقب للخوارزمی، ج ۲، ص ۱۸۔ تقام، ص ۳۶۰۔ مناقب، ج ۴، ص ۹۶۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۹۔ نفس المہموم، ص ۱۵۴۔ مناقب للخوارزمی، ج ۲، ص ۱۸۔ تقام، ص ۳۶۰۔ مناقب، ج ■، ص ۹۴۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۰۔

(۳۴) سیف بن حارث (۳۵) مالک بن عبد

بعض ارباب مقاتل نے لکھا ہے کہ اصحاب حسینؑ نے جب دیکھا کہ حملہ اولیٰ اور بعد والے حملوں اور دست بدست لڑائی میں ان کے بہت سے آدمی جام شہادت نوش کر چکے اور اب ان کی تعداد (جو پہلے بھی بے حد مختصر تھی) برابر کم ہوتی جاتی ہے تو انہوں نے دو، دو۔ تین، تین اور چار، چار ہو کر حریم اسلام اور ناموس رسالت کی حفاظت کی خاطر لڑنا شروع کیا۔ چنانچہ جناب سیف بن الحارث بن سریع اور مالک بن عبد بن سریع جابری۔ جو کہ باپ کی طرف سے چچازاد اور ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ روتے ہوئے میدان کارزار کی طرف نکلے۔ امامؑ نے سبب گریہ دریافت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿جعلنا فداک ما علی انفسنا نبکی و لکن نبکی علیک نراک قد احیط بک ولا نقدر ان ننفعک!﴾ ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں ہم اپنے متعلق نہیں رو رہے بلکہ ہم آپ کی مظلومیت پر آنسو بہا رہے ہیں کہ آپ ہر طرح نرغۂ اعداء میں گھر گئے ہیں۔ اور ہم آپ کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچا سکتے! امام عالی مقام نے ان کو جزائے خیر کی دعا دی۔ پھر دونوں نے میدان وغا میں لڑنا شروع کیا۔ اور خوب داد شجاعت دی۔ کئی ناریوں کو فی النار کرنے کے بعد دونوں شہید ہو گئے۔[1]

(۳۶) عبداللہ (۳۷) عبدالرحمٰن فرزندان عروہ غفاری

بعد ازاں ان دونوں جانبازوں نے خدمت امام میں حاضر ہو کر عرض کیا: دشمن ہم سے بڑھ کر آپ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا دفاع کرتے ہوئے آپ کے سامنے جام شہادت نوش کریں۔ امام نے اجازت دی اور یہ دونوں بزرگوار یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں نکلے ؎

قد علمت حقًا بنو غفار	و خندف بعد بنی نزار
لنضربن معشر الفجار	بکل عضب ذکر بتار
یا قوم ذو دوا عن بنی الاخیار	بالمشرفی والقنا الخطار

اور پھر امامؑ کے روبرو لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔[2]

(۳۸) عمرو بن الخالد صیداوی (۳۹) سعد غلام عمرو بن خالد

(۴۰) جابر بن الحارث سلمانی (۴۱) مجمع بن عبداللہ العائذی

یہ چاروں حضرات میدان وغا میں نکلے۔ اور یکبارگی سپاہ ابن سعد پر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ مخالفین نے حملہ کر کے ان کو اپنے اصحاب سے جدا کر دیا۔ اور یہ بزرگوار نرغۂ اعداء میں بری طرح گھر گئے۔ امام عالی

---

[1] مقتل الحسین، ص ۲۰۷۔ کامل ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۹۲۔ [2] لواعج الاشجان، ص ۱۴۸۔

مقام نے حضرت ابوالفضل العباس کو بھیجا۔ انہوں نے بزور شمشیر ان کو نرغہ سے نکالا مگر اس وقت یہ سب کے سب سخت زخمی ہو چکے تھے واپسی پر پھر دشمنوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ زخمی تو پہلے ہی ہو چکے تھے مگر پھر بھی بڑی جگر کاوی سے مقابلہ کیا حتیٰ کہ لڑتے لڑتے سب کے سب وہیں شہید ہو گئے۔[1]

(۴۲) یزید بن مغفل عامری

فاضل سماوی نے ابصار العین فی انصار الحسین میں ان کے بارے میں لکھا ہے: ﴿کان احد الشجعان من الشیعة و الشعراء المجیدین﴾ شیعیان حیدر کرار کے بہادروں اور نغز گو شاعروں میں سے تھے۔ علامہ عسقلانی نے ان کا شمار اصحاب رسولؐ میں کیا ہے۔[2] مورخ طبری وغیرہ ارباب سیر و تواریخ کے بیان کے مطابق یہ اصحاب نہیں بلکہ تابعین اور اصحاب امیر المومنینؑ میں سے ہیں۔ یہ کوفہ کے باشندے تھے کسی طرح مکہ ہی میں حسینی جماعت میں شامل ہو گئے تھے اور پھر اس سفر عراق میں امام کے ہمراہ رہے۔ بروز عاشوراء جنگ شروع ہونے کے بعد اذن جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں گئے ؎

ان تنکرونی فانا ابن مغفل　　شاک لدی الهیجاء غیر اعزل

وفی یمینی نصل سیف منصل　　اعلو به الفارس وسط القسطل

اس کے بعد بے نظیر حرب و ضرب کا مظاہرہ کیا۔ یہاں تک کہ قوم فجار کی ایک جماعت کو دار البوار میں پہنچانے کے بعد شربت شہادت پی کر دار القرار کی طرف سدھار گئے۔[3]

(۴۳) جندب بن حجیر (بروزن زبیر) الخولانی الکندی

شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے فہرست میں ان کا شمار اصحاب حسینؑ اور ممتاز شیعیان علیؑ میں کیا ہے۔ بعض دوسرے تاریخی شواہد سے ان کا اصحاب امیر المومنینؑ سے ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فاضل مامقانی نے (تنقیح المقال) میں لکھا ہے کہ جنگ صفین میں جناب امیر علیہ السلام کے نہ صرف ہمرکاب رہے بلکہ قبیلۂ کندہ و ازد کے افسر بھی تھے۔ ابن عساکر نے بھی اپنی تاریخ میں ایسا ہی لکھا ہے۔ اور یہی قول صحیح ہے۔ صاحب ذخیرہ نے تو ان کے صحابی رسولؐ ہونے کا بھی ایک قول نقل کیا ہے۔ بہر حال جب ان کو امام عالی مقام کی کوفہ کی طرف تشریف آوری کی اطلاع ملی تو یہ کوفہ سے

---

[1] مقتل الحسین، ص ۲۰۷۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۳۔

[2] اصابہ جزء ۶، ص ۳۶۲، قسم ثالث۔

[3] فرسان، ج ۱، ص ۸۷۔ ذخیرہ، ص ۳۳۶۔

روانہ ہو کر راستہ میں منزل حاجز پر خدمت امامؑ میں پہنچے۔ مؤرخ طبری اور صاحب الحدائق الوردیہ کے بیان کے مطابق روز عاشوراہ نصرت امامؑ کا حق ادا کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔[۱]

(۴۴) حجاج بن زید السعدی

اصابہ میں انہیں صحابۂ رسولؐ میں شمار کیا گیا ہے۔ حجاج بصرہ کے باشندہ تھے اور بنی سعد بن تمیم میں سے تھے۔ سید الشہداءؑ نے قیام مکہ کے دوران جن بعض مقتدر شخصیات کو خطوط روانہ کیے تھے۔ ان میں ایک بصرہ کے یزید بن مسعود نہشلی بھی تھے۔ یزید نے جوابی خط انہی جناب حجاج بن زید السعدی کے ہاتھ امامؑ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ مکتوب خدمت امامؑ میں پہنچانے کے بعد خود امامؑ کے ہمرکاب رہے۔ یہاں تک کہ روز عاشوراہ نصرت امامؑ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے بڑی ثابت قدمی اور اولوالعزمی کے ساتھ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔[۲]

(۴۵) عباد بن مہاجر الجہنی

یہ عباد بن مہاجر ان اشخاص میں سے تھے جو مدینہ کے نزدیک واقع شدہ چشمۂ جہینہ سے آپ کے ہمرکاب ہوئے تھے اور آخر دم تک ہمرکاب رہے۔ منازل سفر طے کرتے ہوئے جب امامؑ منزل زبالہ میں پہنچے جہاں انہوں نے جناب مسلم بن عقیل کی شہادت کی اطلاع اہل قافلہ کو دی اور بہت سے وہ بدوی لوگ آپ سے علیحدہ ہو گئے جو کسی دنیوی طمع و لالچ کی خاطر آپ کے ہمراہ ہو گئے تھے۔ تو یہ عباد اس مرحلہ پر ثابت قدم رہے۔ حتیٰ کہ شب عاشوراہ کو جدا ہونے والے لوگوں کا ساتھ بھی نہ دیا یہاں تک کہ روز عاشوراہ میدان کارزار میں نصرت امامؑ کا حق ادا کرتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[۳]

(۴۶) عبدالرحمٰن بن عبدرب الانصاری الخزرجی

یہ بزرگوار صحابۂ رسولؐ میں سے تھے۔ عسقلانی نے اصابہ اور جزری نے اسد الغابہ میں ان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ حدیث مناشدہ میں جب جناب امیرالمومنینؑ نے بعض صحابۂ رسول کو حکم دیا تھا کہ جس جس نے پیغمبر اکرمؐ کی زبان وحی ترجمان سے حدیث غدیر سنی ہے وہ اٹھ کر گواہی دے تو یہ عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری ان تیرہ اصحاب میں سے ایک تھے جنہوں نے بلا جھجک کھڑے ہو کر یہ شہادت دی تھی کہ ہم نے اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کو غدیر خم کے مقام پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ﴿ان اللّٰہ ولیّ و انا ولیّ المؤمنین فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم

۱۔ فرسان الہیجاء، ج ا، ص ۷۸۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۳۶۔

۲۔ فرسان الہیجاء، ج ا، ص ۱۰۲۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۳۲۹۔

۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۸۔ فرسان الہیجاء، ج ا، ص ۱۸۶۔ ابصار العین، ص ۱۳۸ وغیرہ۔

وال من والاه و عاد من عاداه و احب من احبه و ابغض من ابغضه و اعن من اعانه[1] یہ بزرگ جناب امیرؑ کے دینی تربیت یافتہ تھے۔ آنجنابؑ نے خود ان کو تعلیم قرآن دی تھی۔ بہر کیف یہ بزرگوار مکہ مکرمہ سے ہی حضرت امام الشہداءؑ کے ہمرکاب ہو گئے تھے اور بالآخر دین اسلام کی حفاظت، امام وقت کی نصرت اور عالم انسانیت کے تحفظ کی خاطر جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔[2] رضوان اللہ علیہ۔

(۴۷) عبدالرحمٰن بن مسعود التیمی

یہ بزرگ حضرت امام حسینؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ان کے والد جناب مسعود جو حملۂ اولیٰ میں جام شہادت پی چکے تھے۔ حضرت امیرؑ کے مشہور اور نامور بہادر شیعوں میں سے تھے۔ دونوں باپ بیٹا ساتویں محرم الحرام کو کربلا میں خدمت امام میں پہنچے اور بالآخر بروز عاشوراء نصرت امام میں داد شجاعت دیتے ہوئے دنیائے دوں سے منہ موڑتے ہوئے دار الآخرت کی طرف منتقل ہو گئے۔[3]

(۴۸) عبداللہ بن بشر الخثعمی

عسقلانی (در اصابہ) اور مامقانی (در تنقیح) نے ان کے حالات درج کیے ہیں اور لکھا ہے کہ عبداللہ مذکور اور ان کے والد کا تذکرہ اسلامی جنگوں میں ملتا ہے۔ ان کے والد بشر مشہور شہسوار تھے اور جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ ارباب مقاتل نے لکھا ہے کہ عبداللہ پہلے عمر بن سعد کے لشکر میں تھے۔ روز عاشوراء سے پہلے بخت نے یاوری کی۔ اور حسینی جماعت میں شامل ہو گئے حتیٰ کہ روز عاشوراء نصرت امامؑ میں شہادت کا جام نوش کیا۔[4]

(۴۹) قاسم بن حبیب بن ابی بشر الازدی

ارباب مقاتل نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ شیعیان کوفہ میں سے مشہور شاہسوار اور نامی گرامی دلیر و بہادر تھے۔ پہلے لشکر ابن سعد میں شامل ہو کر کربلا پہنچے۔ پھر مخفی طریقہ سے جماعت حسینی میں شامل ہو گئے۔ اور جب روز عاشوراء میدان کارزار گرم ہوا تو اس کے اندر کود پڑے اور امام وقت کی نصرت کا فریضہ ادا کرتے ہوئے شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوئے۔[5]

---

[1] اصابہ فی تمیز الصحابہ، ج ۲، ص ۱۶۹ قسم اول۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۳۱۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۰۔

[3] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۳۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۳۔

[4] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۳۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۶۔

[5] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۳۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۴۔ فہرست شیخ طوسی، ص ؟؟، طبع النجف۔ ابصار العین، ص ۱۲۷۔

(۵۰) قعنب بن عمرو النمیری

ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ روز عاشوراء جنگ شروع ہونے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں نکلے ؎

الیکم من مالک الضرغام | ضرب فتی یحمی عن الکرام
یرجو ثواب اللّٰہ ذی الانعام | سبحانہ من ملک علام

اس کے بعد خوب داد شجاعت دی۔ حتیٰ کہ شرح شافیہ ابی فراس کے مطابق پندرہ اور ابو مخنف و صاحب ناسخ کے بیان کے مطابق ساٹھ ناریوں کو دار البوار میں پہنچانے کے بعد خود جام شہادت نوش کیا۔[۱] رضوان اللّٰہ علیہ۔

(۵۲) مجمع بن زیاد الجہنی

اصابہ میں ان کا سلسلۂ نسب یوں درج ہے۔ مجمع بن زیاد بن عمرو بن کعب بن عمرو بن عدی بن عمرو بن رفاعہ بن کلب بن موودعہ الجہنی۔ اور صاحب الاستیعاب نے یہ لکھا ہے کہ یہ بزرگوار آنحضرتؐ کے ساتھ جنگ بدر و احد میں شریک ہو چکے تھے۔ یہ چشمہ ہائے جہینہ پر مقیم تھے۔ جب جناب امام حسینؑ مکہ سے عراق تشریف لے جاتے وقت ان کے پاس سے گزرے تو کچھ اور حضرات کے ساتھ مجمع بھی آنجنابؑ کے ہمراہ ہو گئے۔ پھر برابر ہمراہ رہے۔ حتیٰ کہ روز عاشوراء جنگ شروع ہونے کے بعد میدان کارزار میں نکلے اور بہت سے ناریوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد خود شربت شہادت نوش کیا۔[۲]

(۵۳) بشر بن عمرو الحضرمی الکندی

استیعاب، اسد الغابہ، اصابہ اور اعیان الشیعہ وغیرہ کتب سیر و تراجم میں ان کے حالات مذکور ہیں۔ حضر موت کے باشندہ اور جلیل القدر تابعی تھے۔ بعد میں کوفہ کے محلہ بنی کندہ میں رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے کندی کہلاتے تھے۔ سید الشہداءؑ کے کربلا پہنچنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ارباب مقاتل نے لکھا ہے کہ شب عاشوراء جب کہ جنگ کربلا کی ہولناکیاں سر پر منڈلا رہی تھیں ان کو اطلاع ملی کہ ان کا ایک لڑکا رے کی سرحد میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اعیان الشیعہ کے بیان کے مطابق ان کو یہ اطلاع روز عاشوراء جنگ شروع ہونے کے بعد ملی۔ یہ سن کر بشر نے کہا: میں اس معیبت کا اجر و ثواب خدا کی بارگاہ سے چاہتا ہوں۔ البتہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ میرا بیٹا گرفتار ہو۔ اور میں اس کے بعد زندہ رہوں! جب حضرت امامؑ نے اس کا یہ کلام سنا تو فرمایا:

---

[۱] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۳۸۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۶۷۔ شرح شافیہ، ص ۱۳۰۔

[۲] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۵۰۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۹ وغیرہ۔

﴿رحمک الله انت فی حلّ من بیعتی فاذهب و اعمل فی فکاک ابنک!﴾ خدا تم پر رحم کرے! میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں تم جا کر اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے جدوجہد کرو! بشر نے کہا: ﴿اکلتنی اذاً السباع حیّا ان فارقتک و اسئل عنک الرکبان و اخذک لک مع قلة الاعوان لا یکون هذا ابداً یا ابا عبد الله!﴾ یا ابا عبداللہ! اگر اس حالت میں کہ آپ کے اعوان و انصار کی تعداد بالکل قلیل ہے میں آپ کو نرغۂ اعداء میں چھوڑ کر چلا جاؤں تو مجھے درندے زندہ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد جناب سید الشہداءؑ نے ان کو کچھ نفیس کپڑے (بروایتے پانچ کپڑے جن کی قیمت ایک ہزار دینار[1] تھی) دے کر فرمایا کہ یہ کپڑے اپنے بیٹے محمد کو دو کہ لے جا کر اپنے بھائی کی رہائی کے سلسلہ میں صرف کرے۔ ۞ بہر حال جب محاربۂ کربلا شروع ہوا تو جناب بشر بن عمرو الحضرمی نصرت امام علیہ السلام کا فریضہ ادا کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر کے جنت الفردوس کی طرف سدھار گئے۔[2] رضوان الله علیه۔

(۵۴) منجح بن سہم مولیٰ الحسین

ربیع الابرار زمخشری سے نقل کیا گیا ہے کہ نوفل بن الحارث بن عبد المطلب کی ''حسینیہ'' نامی ایک کنیز تھی۔ جسے حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان سے خریدا تھا اور بعد میں ''سہم'' کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی جس سے منجح متولد ہوئے۔ یہ حسینیہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے دولت کدہ میں کام کرتی تھیں۔ جب جناب سید الشہداء علیہ السلام نے سفر عراق کیا تو وہ بھی اپنے بیٹے سمیت اس سفر میں ہمراہ گئیں۔ روز عاشوراء منجح نے اپنے آقا کی نصرت کا حق ادا کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ حسان بن بکر حنظلی نے انہیں شہید کیا۔

استر آبادی، ابو علی حائری اور فاضل مامقانی وغیرہ علماء رجال کا اس بات پر اتفاق ہے کہ منجح شہیدان کربلا میں داخل ہیں۔[3]

۞ اسی وجہ سے محمد بن بشر کی شہادت میں اختلاف ہے کہ آیا وہ کپڑے لے کر چلا گیا تھا یا نہیں۔ کیونکہ تواریخ اس کے جانے کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس لیے ظن غالب یہی ہے کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ صاحب فرسان الہیجاء (ج ۲، ص ۵۷) نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ جناب سید ابن طاؤس اور محدث قمی نے تو مذکورہ بالا تفصیل جو از باب مقاتل نے بشر بن عمرو کے حالات میں درج کی ہے۔ محمد بن بشر کے حالات میں لکھی ہے۔ واللہ العالم۔

[1] شرح شافیہ ابی فراس، ص ۱۳۸۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۳۲۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۳۔ ابصار العین، ص ۱۲۵ وغیرہ۔

[3] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۲۲۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۳۔ ابصار العین، ص ۹۲ وغیرہ۔

(۵۵) عبد الرحمٰن الکدری

صاحب فرسان الہیجاء نے (ج ۱، ص ۱۳۴) پر بحوالہ شرح شافیہ ابی فراس ہمدانی، لکھا ہے کہ جناب موصوف نے حفاظت اسلام و امامؑ میں پے در پے کئی سخت حملے کیے اور بہت سے ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ بالآخر خود بھی درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔[1]

(۵۶) معلٰی بن المعلٰی

ان کے تفصیلی حالات نہیں مل سکے۔ البتہ شرح شافیہ ابی فراس، ص ۱۳۸ اور ناسخ، ج ۶، ص ۲۶۷ میں اس قدر لکھا ہے کہ یہ معلٰی شجاعت و شہامت میں مشہور روزگار تھے۔ روز عاشوراء جب تنور حرب و ضرب گرم ہوا تو یہ رجز پڑھتے ہوئے اس میں کود پڑے ؎

انا المعلٰی حافظا لا اجلی	دینی علی دین محمدؐ و علیؑ
اذب حتی ینقضی اجلی	ضرب غلام لا یخاف الوجلی
ارجوا ثواب الخالق الازلی	لیختم اللّٰہ بخیر عملی

اس کے بعد اس جوش و خروش اور جانفشانی سے لڑے کہ چوبیس ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ پھر سپاہ ابن سعد یکبارگی ان پر ٹوٹ پڑی۔ جب معلٰی زخموں سے نڈھال ہو گئے تو انہیں پکڑ کر ابن سعد کے پاس لے جایا گیا۔ پسر سعد نے کہا: ﴿ما اشد نصرتک لصاحبک الحسینؑ﴾ تو نے امام حسینؑ کی کس طرح اچھی نصرت کی ہے؟ اس کے بعد اس کے حکم سے ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔[2] رضوان اللّٰہ علیہ۔

(۵۷) نصر بن ابی نیزر

فاضل مامقانی در تنقیح المقال، سماوی (در ابصار) اور محدث قمی (دار الکنی والالقاب) نے لکھا ہے کہ یہ نصرانی نیزر کے فرزند اور بہت بڑے دلیر و بہادر شہسوار تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ ابی نیزر کون تھے۔ اس میں اختلاف ہے۔ ابو العباس المبرد نے (الکامل میں) لکھا ہے کہ یہ بعض سلاطین عجم کی اولاد میں سے تھے۔ اور محدث نوری علیہ الرحمۃ نے خاتمۂ مستدرک اور عسقلانی نے اصابہ میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے فرزند تھے۔ صغر سنی میں مدینہ پہنچ کر مشرف با اسلام ہوئے۔ خود آنحضرتؐ ان کی نگرانی و سرپرستی فرماتے تھے۔ جب نجاشی کا انتقال ہوا تو اہل حبشہ نے ان سے استدعا کی کہ اپنے باپ کی مسند خلافت پر متمکن ہوں۔ تو آپ نے یہ

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۳۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۲۶۔ ابصار العین، ص ۱۲۷ وغیرہ۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۲۲۔ شرح شافیہ ابی فراس، ص ۱۳۸۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۶۷ وغیرہ۔

کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے نزدیک جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں ایک گھنٹہ زندگی بسر کرنا تمہاری زندگی بھر کی بادشاہت سے بہتر و برتر ہے۔ آنحضرتؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت امیرؑ سے وابستہ رہے۔ حوالیٔ مدینہ میں جناب امیرؑ کی جو جائیداد تھی آنجنابؑ نے اس کی اصلاح و نگرانی انہی کے سپرد فرمائی ہوئی تھی۔ جو مزرعۂ ہفیفہ اور مزرعۂ ابی نیزر کے نام سے مشہور تھی۔ جسے آنجنابؑ نے ابناء السبیل اور فقراء مدینہ پر وقف فرما دیا تھا۔[1] ابی نیزر کے فرزند نصر کی زندگی کا آغاز و شباب حضرت امیر المومنین اور ان کے شہزادگان کونین حسنؑ و حسینؑ کی خدمت کرنے میں گزرا جب امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے تو یہ نصر بن ابی نیزر بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ حتیٰ کہ آغاز جنگ ہونے کے بعد یہ بزرگوار فیض شہادت پر فائز ہوئے۔[2]

(۵۸) جابر بن حجاج

اہل سیر و تواریخ کا بیان ہے کہ یہ عامر بن نہشل کے آزاد کردہ غلام اور کوفہ کے رہنے والے اور بڑے جنگ آزما تھے۔ کوفہ میں جناب مسلم کی بیعت کی۔ مگر جب لوگ ان کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو یہ بھی اپنی قوم کے ہاں روپوش ہو گئے۔ جب حضرت امام حسینؑ کے کوفہ تشریف لانے کی اطلاع ملی تو خدمت امام میں پہنچنے کی یہ تدبیر کی کہ ابن سعد کے لشکر میں شامل ہو کر کربلا پہنچے۔ اور فرصت پا کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور بالآخر روز عاشوراء نصرت امامؑ میں داد شجاعت دیتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[3]

(۵۹) جمجاف بن المہند الراسبی

یہ جمجاف بصرہ کے باشندے تھے۔ اور حضرت امیرؑ کے مخلص صحابی۔ ان کا شمار بصرہ کے مشہور شجاعان روزگار میں ہوتا تھا۔ جنگ صفین میں قبیلہ ازد کے افسر تھے۔ حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد جناب امام حسنؑ کے ہمرکاب رہے۔ ان کی شہادت کے بعد بصرہ میں مقیم ہو گئے۔ جب ان کو سید الشہداءؑ کے سفر عراق کی اطلاع ملی تو راہ و بے راہ منازل طے کرتے رہے۔ عصر عاشوراء کو میدان کربلا میں وارد ہوئے۔ سپاہ ابن سعد سے پوچھا: میرے آقا امام حسینؑ کہاں ہیں؟ انہوں نے پوچھا: تو کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟ جمجاف نے کہا: میں بصرہ کا رہنے والا جمجاف بن مہند راسبی ہوں۔ انہوں نے کہا: ہم نے حسینؑ اور ان کے انصار و اقرباء کو شہید کر دیا ہے۔ مستورات کے علاوہ صرف ان کا ایک بیمار بیٹا زندہ ہے۔ ابھی ابھی ہم خیام حسینیؑ کی غارت گری سے فارغ ہوئے

---

[1] الکنیٰ والالقاب، ج ۳، ص ۱۱۲، ۱۱۳۔ اصابہ، ج ۳، ص ۱۹۵۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۳۲۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۹۔

[3] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۵۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۳۲۰۔

ہیں۔ یہ سنتے ہی دنیا ہفہاف کی نظروں میں تیرہ وتار ہوگئی اور شمشیر بکف ہو کر بپھرے ہوئے شیر کی طرح یہ رجز پڑھتے ہوئے قوم اشقیاء پر ٹوٹ پڑے ۔

یا ایھا الجند المجند انا الھفہاف بن المھند

احمی عیالات محمد

اور بے نام و ننگ سپاہ کو مولیوں گاجروں کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ کئی تابڑ توڑ حملے کر کے بہت سے ناریوں کو جہنم رسید کیا۔ بالآخر سپاہ ابن سعد نے ہجوم کر کے پہلے ان کے گھوڑے کو پے کیا۔ بعد ازاں ہفہاف نے پیادہ داد شجاعت دی۔ بالآخر زخموں کی تاب نہ لا کر زمین پر گرے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر کے شہداء کربلا کے مقدس زمرہ میں جا ملی۔[1]

(۶۰) یزید بن حصین المشرقی الہمدانی

قبیلہ ہمدان کی شاخ بنو مشرق سے تعلق رکھتے تھے۔ اصحاب امام حسین علیہ السلام سے بڑے بہادر و شہسوار تھے۔ یہی یزید بن حصین تھے کہ جب امام اور ان کے اعزہ و اعوان پر تشنگی کا غلبہ ہوا تو جناب مشرقی نے خدمت امام میں عرض کیا کہ مجھے اجازت مرحمت فرمایئے تاکہ میں اس سلسلہ میں ابن سعد سے جا کر بات چیت کروں۔ امام نے اجازت دی۔ یہ ابن سعد کے پاس گئے مگر سلام نہ کیا۔ ابن سعد نے کہا: اے ہمدانی! تو نے سلام کیوں نہیں کیا۔ کیا ہم مسلمان نہیں اور خدا و رسول کو نہیں پہچانتے؟ ہمدانی نے کہا: اگر تو مسلمان ہوتا تو عترت رسولؐ پر خروج نہ کرتا۔ ان کے قتل کا ارادہ نہ کرتا۔ یہ آب فرات جو شکم مار کی طرح بل کھا رہا ہے۔ جسے یہود و نصاریٰ استعمال کر رہے ہیں اور جنگل کے درندے پی رہے ہیں مگر تو نے ذریت رسولؐ پر اسے بند کر دیا ہے تاکہ وہ شدت پیاس سے بلک بلک کر دم توڑ دیں اس کے باوجود تم یہ دعویٰ بھی کرتے ہو کہ تم مسلمان ہو اور خدا و رسول کو پہچانتے ہو؟ ابن سعد نے ہمدانی کا کلام سن کر سر نیچے جھکا لیا اور کچھ دیر تامل کرنے کے بعد کہا: اے ہمدانی! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حسینؑ کے ساتھ جنگ کرنا سیدھا آتش جہنم میں جانے کے مترادف ہے۔ پھر یہ اشعار پڑھے ۔

دعانی عبید اللہ من دون قومہ علی خطر لا ارتضیہ امین

أ اترک ملک الری و الری منیتی ام ارجع ماثوماً بقتل حسین

وفی قتلہ النار التی لیس دونھا حجاب و ملک الری قرۃ عین

بالآخر کہا: اے ہمدانی! حقیقت یہ ہے کہ میرا نفس اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ میں ملک الرے سے دست بردار ہو جاؤں اور کوئی دوسرا اسے حاصل کر لے۔ جناب ہمدانی اس ملعون کا یہ جواب سن کر مایوس ہوئے اور واپس خدمت امام

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۴۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۷۔

میں حاضر ہو کر سب ماجرا گوش گزار کیا۔ بہر حال جب روز عاشوراء جنگ کربلا کا آغاز ہوا تو جناب مشرقی نصرت امام کا فریضہ ادا کرتے ہوئے شہادت کے درجہ رفیعہ پر فائز ہوئے۔[۱]

(۶۱) سالم بن عمرو موالی بن المدینہ الکلبی

جناب سالم بنی مدینہ جو کہ بنی کلب کی ایک شاخ ہے، کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفہ کے ممتاز شیعوں میں سے تھے۔ جب جناب مسلم بن عقیل کوفہ میں تشریف لائے تو ان کی بیعت کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے اور جب آنجناب گرفتار کیے گئے تو کثیر بن شہاب نے شیعیان کوفہ کی ایک جماعت کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پیش کرنا چاہا اس میں سالم بھی شامل تھے مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس کے چنگل سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اپنی قوم کے پاس روپوش ہو گئے۔ جب سنا کہ امام حسینؑ کا کربلا میں ورود مسعود ہو چکا ہے تو مخفی طریقہ سے کربلا پہنچ کر امام علیہ السلام کی خدمت میں مشرف ہوئے۔ بالآخر جب معرکہ حرب و ضرب قائم ہوا تو راہ خدا میں جہاد کرتے ہوئے قوم اشقیاء کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کیا۔[۲]

(۶۲) عمرو بن جندب الحضرمی

ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ میں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ عمرو بن جندب بن کعب بن عبداللہ بن جزء بن عامر بن مالک بن وہماء الحضرمی کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔ شیعیان علیؑ میں سے تھے اور ان کے ساتھ جنگ جمل و صفین میں شریک ہو چکے تھے۔

طبرانی کا بیان ہے کہ عمرو بن جندب جناب حجر بن عدی کے احباب میں شامل تھے۔ جب حکومت نے حجر بن عدی کو گرفتار کیا تو عمرو نے روپوشی اختیار کر لی اور یہ سلسلہ زیاد بن ابیہ کے واصل جہنم ہونے تک قائم رہا۔ اس کے بعد وہ کوفہ واپس آ گئے۔ یہاں تک کہ امیر شام بھی مر گیا۔ اور یزید نے مسند اقتدار سنبھالی۔ اسی اثناء میں جب جناب مسلم کوفہ تشریف لائے تو ان کی بیعت کر لی۔ مگر ان کے گرفتار ہو جانے اور سید الشہداءؑ کے عراق کی طرف متوجہ ہونے کی اطلاع پا کر راہ و بے راہ منازل طے کرتے ہوئے راستہ میں کسی مقام پر خدمت امام میں پہنچ گئے اور پھر برابر آپ کے ہمرکاب رہے۔ یہاں تک کہ روز عاشوراء نصرت امام میں فریضۂ جہاد ادا کرتے ہوئے فیض شہادت پر فائز ہوئے۔[۳]

۱۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۳۹۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۷۹۔

۲۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۵۴۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۳۴۲۔ ابصار العین، ص ۱۳۰ وغیرہ۔

۳۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۳۳۳۔

(۶۳) جبشہ بن قیس النہمی

حافظ عسقلانی نے ان کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ جبشہ بن قیس بن سلمہ بن ظریف بن ابان بن سلمہ بن حارثہ بن فہم النہمی، جبشہ کے دادا "سلمہ" رویت رسولؐ سے مشرف ہو چکے تھے۔ اور جنگ صفین میں حضرت امیر علیہ السلام کے ہمرکاب تھے۔ جبشہ مذکور کربلا میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں تک کہ جب روز عاشوراء آتش جنگ شعلہ زن ہوئی تو جبشہ جوش جہاد میں آ کر اس میں کود پڑے اور خوب داد شجاعت دی۔ یہاں تک کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر کے شہداء کربلا کے مقدس زمرہ میں جا ملی۔[1]

(۶۴) نعمان بن عمرو الازدی الراسبی

بنی ازد کی ایک شاخ کا نام راسب ہے۔ یہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حلاس کے بھائی ہیں۔ غزوات و حروب میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ جنگ صفین میں دونوں بھائی حضرت امیر علیہ السلام کے ہمرکاب تھے۔ دونوں بھائی عمرو بن سعد کے لشکر میں کربلا پہنچے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ابن سعد انصاف و انسانیت کے تمام تقاضوں کو ٹھکرا کر بالکل آمادۂ پیکار ہے تو ان کے بخت نے یاوری کی اور آٹھ محرم کی رات کو لشکر پسر سعد سے علیحدہ ہو کر جماعت حسینیؑ میں شامل ہو گئے۔ اور روز عاشوراء جب آغاز جنگ ہوا تو حلاس حملۂ اولیٰ میں اور نعمان مبارزت طلبی میں شہادت کی منزلت جلیلہ پر فائز ہوئے۔[2]

(۶۵) شبیب بن جراد الکلابی الوحیدی

عسقلانی[3] نے ان کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ شبیب بن جراد بن طہیۃ بن ربیعہ بن الوحید بن کعب بن عامر بن کلاب الکلابی الوحیدی۔ ان کے والد جراد نے جاہلیت اور اسلام کے دونوں دور دیکھے تھے۔

صاحب حدائق وردیہ نے لکھا ہے کہ شبیب کوفہ کے نام آور جنگ آزماؤں میں سے تھے۔ اور حضرت امیر علیہ السلام کے اصحاب اور شیعوں میں سے تھے۔ اسلامی جنگوں بالخصوص جنگ صفین میں ان کے کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت مسلم کے کوفہ آنے کے بعد انہوں نے نہ صرف ان کی بیعت کی تھی بلکہ لوگوں سے ان کے لیے بیعت لیتے بھی تھے۔

حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد جب ابن زیاد نے قتال حسینؑ کے لیے کربلا فوجیں بھیجیں تو شبیب بھی ابن

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۸۵۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۷۔ اصابہ، ج ۳، ص ۱۵۹، قسم ثانی۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۳۱۔ ج ۲، ص ۱۳۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۹۸۔

[3] اصابہ، ج ۱، ص ۲۷۲، قسم ثالث۔

سعد کے ہمراہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید قتل وقتال تک نوبت نہیں پہنچے گی۔ مگر نویں محرم کی شب کو شبیب کو یقین ہو گیا کہ قوم اشقیاء جناب سید الشہداءؑ سے لڑنے کا عزم بالجزم کر چکی ہے تو اسی رات حسینیؑ جماعت میں آ کر شامل ہو گئے اور حضرت قمر بنی ہاشم اور ان کے سگے بھائیوں کے پاس قیام کیا۔ کیونکہ قمر بنی ہاشم کی والدۂ ماجدہ انہی شبیب کے قبیلہ سے تھیں۔ بہر کیف صبح عاشوراہ جب جنگ شروع ہوئی تو مبارزت طلبی میں اور بروایتے حملۂ اولیٰ میں نصرت امام کا حق ادا کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔[1]

(۶۶) رافع بن عبداللہ غلام مسلم بن کثیر ازدی

رافع مذکور جناب مسلم بن کثیر ازدی صحابیؓ جناب امیرؑ (شہید حملۂ اولیٰ) کے غلام تھے۔ نصرت امام علیہ السلام کے ارادہ سے اپنے آقا مسلم کے ہمراہ کوفہ سے روانہ ہو کر کربلا میں خدمت امامؑ میں حاضر ہوئے۔ روز عاشوراہ جب آتش جنگ مشتعل ہوئی تو جناب مسلم تو حملۂ اولیٰ میں شہید ہو گئے۔ مگر رافع نے نماز ظہر کے بعد مبارزت طلبی میں کئی ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد خود جام شہادت پیا۔[2]

(۶۷) عمرو بن عبداللہ الجندعی الہمدانی

کوفہ کے باشندے تھے۔ بنی جندع قبیلہ ہمدان کی ایک شاخ ہے۔ یہ بزرگ اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ابن شہر آشوب نے ان کو حملۂ اولیٰ کے شہداء میں شمار کیا ہے۔ لیکن بعض اہل سیر وتواریخ کا بیان یہ ہے کہ یہ ان آخری تین اصحاب میں سے ایک ہیں جو تمام اصحاب حسینیؑ کی شہادت کے بعد باقی رہ گئے تھے۔ جب قوم اشقیاء نے خیام حسینیؑ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ تو یہ آگے بڑھے۔ اور دم توڑ کر لڑے۔ اس اثناء میں ان کے سر پر سخت ضربت لگی۔ جس کی وجہ سے گر گئے۔ چنانچہ ان کے ہم قوم و بنی عم (جو ابن سعد کی فوج میں تھے) ان کو اٹھا کر لے گئے۔ اور علاج معالجہ کیا مگر زخم درست نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ پورے ایک سال صاحب فراش رہنے کے بعد ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر کے شہداء کربلا میں جا کر ملحق ہو گئی۔[3]

(۶۸) حباب بن عامر التیمی

نام ونسب حباب بن عامر بن کعب بن الارت بن ثعلبہ التیمی۔ جب حضرت مسلمؑ کوفہ میں تشریف لائے تو ان کی بیعت کی۔ پھر جب لوگوں نے ان کو دھوکہ دیا اور جناب مسلم گرفتار کر لئے گئے تو حباب بن عامر ابن زیاد کے

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۶۸۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۲۹۔ اصابہ، ج ۳، ص ۱۵۹۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۳۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۷۱۔ ابصار العین، ص ۱۳۱۔

[3] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۳۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۸۔

خوف سے روپوش ہوگئے۔ جب امام حسین علیہ السلام کے بجانب کوفہ متوجہ ہونے کی اطلاع ملی تو راتوں رات کوفہ سے پوشیدہ طور پر نکل کر راستہ میں کسی جگہ حسینی قافلہ سے جاکر ملحق ہوگئے اور برابر آنجنابؑ کے ہمرکاب رہے۔ یہاں تک کہ روز عاشوراء جب آغاز جنگ ہوا تو نصرت امامؑ میں سخت قتال کے بعد اپنی جان نثار کی۔[۱]

(۶۹) شبیب بن عبداللہ نہشلی غلام حارث (حرث) بن سریع الہمدانی الجابری

پورا نام ونسب اس طرح ہے: شبیب بن عبداللہ بن مشکل بن حی بن جدیۃ۔ یہ حارث بن سریع ہمدانی کے غلام تھے۔ نساب کلبی وغیرہ کا بیان ہے کہ یہ واقعہ کربلا میں بہت سن رسیدہ تھے کیونکہ جناب رسولؐ خدا کے شرف صحبت سے مشرف ہو چکے تھے۔ اور حضرت امیر علیہ السلام کے ساتھ ان کی تمام دفاعی جنگوں میں شریک بھی رہ چکے تھے کوفہ کے باشندہ بہت بڑے بہادر اور جنگ آزما تھے۔ سیف بن الحارث بن سریع اور مالک بن سریع کے ہمراہ خدمت امامؑ میں حاضر ہوئے اور روز عاشوراء آغاز جنگ کے بعد بقاءِ اسلام کی خاطر جہاد کرتے ہوئے اپنی جان جانِ آفرین کے حوالہ کردی۔[۲]

(۷۰) عقبہ بن الصلت بن مالک الجہنی

جو لوگ میاہ جہینہ سے جناب امام حسینؑ کے ہمراہ ہوگئے تھے۔ ان میں ایک عقبہ بن الصلت بھی تھے۔ باوجودیکہ منزل زُبالہ پر جناب مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ کی خبر شہادت سن کر کئی ہمراہی امام عالی مقام کا ساتھ چھوڑ گئے مگر عقبہ ثابت قدم رہے۔ اور تمام سفر میں امام کے ہمرکاب رہے۔ حتیٰ کہ روز عاشوراء امامؑ کی نصرت میں داد شجاعت دیتے ہوئے شربت شہادت نوش کیا۔[۳]

(۷۱) سلمان بن مضارب بن قیس البجلی

یہ سلمان زہیر بن القین کے چچازاد بھائی تھے۔ یہ بھی ۶۰ھ میں زہیر کے ہمراہ حج بیت اللہ سے واپس آرہے تھے کہ راستہ میں جناب سید الشہداءؑ سے ملاقات ہوئی۔ جب زہیر جماعت حسینیؑ میں شامل ہوئے تو سلمان نے بھی ان سے اتحاد عمل کیا۔ اور روز عاشوراء نماز ظہر کے بعد جناب زہیر سے پہلے جام شہادت نوش کیا۔[۴]

---

۱ فرسان الہیجاء، ج۱، ص۸۵۔ ذخیرۃ الدارین، ص۲۶۷۔ ابصار، ص۱۳۶ وغیرہ۔

۲ ذخیرۃ الدارین، ص۳۵۲۔ فرسان الہیجاء، ج۱، ص۱۶۷۔

۳ فرسان الہیجاء، ج۱، ص۲۶۵۔ ذخیرۃ الدارین، ص۳۶۵۔

۴ فرسان الہیجاء، ج۲، ص۱۶۰۔ ابصار العین، ص۱۳۱۔

(۷۲) مرقع بن ثمامہ الاسدی الصیداوی

مرقع تابعین میں سے تھے۔ اور پہلے لشکر ابن سعد میں شامل تھے مگر انہوں نے دیکھا کہ ابن سعد نے سرکار سید الشہداءؑ کی تمام تجاویز امن و آشتی کو نامنظور کر دیا ہے۔ اور اب فرزند رسولؐ سے جنگ ناگزیر ہوگئی ہے تو راتوں رات پوشیدہ طور پر بعض اور لوگوں کے ساتھ جن کا تذکرہ اپنے اپنے مقام پر کیا جا چکا ہے بارگاہ امام میں حاضر ہوگئے اور روز عاشوراء تیر کمان سے جنگ کر کے خوب داد شجاعت دی۔ حتیٰ کہ جب تیر ختم ہوگئے تو گھٹنے ٹیک کر دفاع کرتے رہے۔ جب زخموں سے نڈھال ہو کر گرے تو ہنوز کچھ رمق حیات باقی تھے کہ ان کی قوم بنی اسد کے کچھ لوگ انہیں اٹھا کر لے گئے۔ اختتام جنگ کے بعد پسر سعد نے ابن زیاد کو حقیقت حال سے آگاہ کیا تو ابن زیاد نے چاہا انہیں شہید کرائے۔ مگر بنی اسد کے بعض بااثر آدمیوں کی سفارش کرنے سے ان کی جان بخشی کر دی۔ مگر پابزنجیر کر کے مقام زارہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔ علاج معالجہ سے وہ زخم جو جنگ میں لگے تھے درست نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ انہی کی وجہ سے ایک سال کے بعد ان کی روح شہداء کربلا کے ساتھ ملحق ہوگئی۔[1]

(۷۳) ابو الحتوف بن الحارث (الحرث) الانصاری العجلانی

(۷۴) سعد بن الحارث (الحرث) الانصاری العجلانی

کتاب الکنی والالقاب، اعیان الشیعہ، رجال مامقانی وغیرہ میں بحوالہ حدائق وردیہ ان دونوں بھائیوں کو شہداء کربلا میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ دونوں پہلے خارجی العقیدہ تھے۔ اور عمر بن سعد کے لشکر میں امامؑ کے ساتھ جنگ کی غرض سے وارد کربلا ہوئے تھے۔ جب اس تاریخی محاربہ میں آنجنابؑ کے تمام اصحاب شربت شہادت نوش کر چکے اور آنجنابؑ نے آواز استغاثہ بلند فرمائی اور خیام سے نالہ وشیون کی صدائیں بلند ہوئیں اور ان دونوں بھائیوں کے گوش گزار ہوئیں تو رحمت ایزدی ان کے شامل حال ہوگئی۔ کہا: ﴿لا طاعة لمن عصى الله﴾ جو شخص خدا کا نافرمان ہے اس کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ یہ حسینؑ ہمارے رسولؐ کے فرزند ہیں۔ جن کی شفاعت کے بروز قیامت ہم امیدوار ہیں جو اس وقت بے یار و مددگار ہیں اگر ہم ان کے ساتھ جنگ کریں گے تو پھر آنحضرتؐ کس طرح ہماری شفاعت فرمائیں گے؟ یہ کہہ کر تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور آنجنابؑ کی خدمت میں پہنچ کر دشمنان خدا و رسولؐ کے ساتھ جہاد شروع کیا۔ ایک گروہ کو زخمی اور ایک جماعت کو دار البوار میں پہنچانے کے بعد خود بھی سعادت ابدی پر فائز ہوگئے۔[2]

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۸۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۲۵، وغیرہ۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۵۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۶ وغیرہ۔

(۷۵) ضرغامہ بن مالک تغلبی کی شہادت

فاضل سماوی نے ابصار العین میں لکھا ہے کہ یہ شیعیان کوفہ میں سے اسم با مسمّی تھے۔ چونکہ ضرغام کے معنی شیر کے ہیں یہ بزرگوار بھی بڑے شجاع شیر افگن اور شاہسوار صف شکن تھے۔ جب جناب مسلم وارد کوفہ ہوئے تو ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے اور ان کی شہادت کے بعد ابن سعد کے لشکر میں شامل ہو کر کربلا پہنچے۔ پھر خدمت امام میں حاضر ہو گئے۔ اور فاضل مازندرانی کے بیان کے مطابق حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ مگر ابی مخنف کے بیان کے مطابق نماز ظہر کے بعد مبارزت میں یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں گئے ؎

الیکم من ابن مالک ضرغام — ضرب فتی یحمی عن الکرام

یرجو ثواب اللّٰہ بالتمام — سبحانہٗ من ملک علام

پھر دشمنانِ خدا و رسولؐ کے ٹڈی دل لشکر پر ٹوٹ پڑے اور زخمیوں کے علاوہ ساٹھ روزخیوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[1]

(۷۶) زیاد بن عریب الصائدی الہمدانی

یہ بزرگوار بنی صاعد کے چشم و چراغ تھے۔ جو کہ بنی ہمدان کی ایک شاخ ہے۔ استیعاب، اسد الغابہ اور اصابہ میں ان کے والد عریب کو اصحاب رسولؐ میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ جناب زیاد شجاعان نامدار، روزہ دار، شب زندہ دار اور عبادت گزاروں میں سے شمار ہوتے ہیں۔ روز عاشوراء میں مبارزت طلبی میں سخت لڑائی کے بعد شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوئے۔[2]

(۷۷) عائذ ابن مجمع العائذی

یہ بزرگوار جناب مجمع ابن عبد اللہ عائذی کے فرزند ہیں۔ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ کربلا پہنچے اور نصرت امام کا فریضہ انجام دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔[3]

حملۂ اولیٰ کے شہداء کے اجمالی حالات و کوائف

جیسا کہ قبل ازیں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے کہ روز عاشوراء جب عمر بن سعد کے پہلا تیر چلانے کے بعد جنگ کا آغاز ہوا۔ اور فریق مخالف کی ہزاروں کمانیں کڑکیں اور تیروں کی بارش ہوئی۔ ادھر اصحاب حسینیؑ نے بھی

---

[1] قمقام، ج ۱، ص ۱۴۹۔ ذخیرۃ، ص ۲۲۳۔

[2] قمقام، ج ۱، ص ۱۵۳۔ ذخیرہ، ج ۹، ص ۲۶۹ وغیرہ۔

[3] قمقام، ج ۲، ص ۵۱، ذخیرہ، ج ۱، ص ۲۲۳۔

جوابی کارروائی کی۔ قریباً ایک گھنٹہ کی جنگ کے بعد بنابر مشہور اس حملۂ اولیٰ میں امام کے پچاس اصحاب باصفا شہادت کی ابدی سعادت پر فائز ہوئے۔[1]

مناقب شہر بن آشوب[2] میں ان شہداء میں سے صرف بیالیس اصحاب باوفا کے اسمائے مبارکہ موجود ہیں۔ ہم یہاں پورے پچاس شہداء کے اسماءِ مبارکہ درج کر کے ان کا اجمالی تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

(۱/۷۸) نعیم بن عجلان انصاری خزرجی

یہ بزرگوار جناب امیر علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں اور نعمان بن عجلان کے بھائی ہیں جو جناب امیر علیہ السلام کی طرف سے بحرین و عمان کے حاکم تھے۔ ان دونوں بھائیوں کا شمار تیسرے بھائی نضر سمیت شجاعان روزگار و شعرائے کامگار میں ہوتا ہے۔ یہ جنگ صفین میں آنجنابؑ کے ہمرکاب تھے۔ نعیم کے دونوں بھائیوں کا واقعۂ کربلا سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ نعیم جو کوفہ میں رہتے تھے۔ نصرت امامؑ کے لیے کربلا میں حاضر ہوئے۔ اور حملۂ اولیٰ میں جام شہادت نوش کیا۔[3]

(۲/۷۹) عمران بن کعب بن حارث الاشجعی

ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ منتہی الآمال[4] میں صرف اس قدر درج ہے کہ حضرت شیخ طوسیؒ نے اپنے رجال میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

(۳/۸۰) حنظلہ بن عمرو الشیبانی

ان کے حالات بھی معلوم نہیں ہو سکے۔ مناقب میں ان کا شمار بھی حملۂ اولیٰ کے شہداء میں کیا گیا ہے۔

(۴/۸۱) قاسط بن زہیر تغلبی (۵/۸۲) کردوس بن زہیر تغلبی (۶/۸۳) مقسط ابن زہیر تغلبی

رجال مامقانی وغیرہ کتب میں ہر سہ بھائیوں کا شمار حضرت امیر علیہ السلام کے اصحاب میں کیا گیا ہے۔ ان تینوں بھائیوں نے حضرت امیر علیہ السلام کے ہمراہ جنگ صفین میں شرکت کی۔ اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ پھر یہ تینوں سعادت مند بھائی میدان کربلا میں نصرت امامؑ کا حق ادا کرتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں فیض شہادت پر فائز

---

[1] لہوف، ص ۳۳۰۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۳۹۔ شرح شافیہ ابی فراس، ص ۱۲۸۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۶۸ وغیرہ۔

[2] ج ۴، ص ۹۹، طبع بمبئی۔

[3] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۰۔ فرسان، ج ۲، ص ۱۳۳۔ ذخیرہ، ص ۱۸۱۔

[4] ج ۱، ص ۳۵۰۔

ہوئے۔[1]

ب جادوا بانفسهم فی حب سیدهم والجود بالنفس اقصٰی غایة الجود

(۷/۸۴) کنانہ بن عتیق تغلبی

جناب کنانہ کا کوفہ کے مشہور روزگار ابطال وقراء اور عبادت گزاران کامگار میں شمار ہوتا تھا۔ روزِ عاشوراء حملۂ اولیٰ میں شہادت کی دائمی سعادت پر نائل ہوئے۔[2]

(۸/۸۵) عمرو بن ضبیعہ تمیمی

بہت بڑے بہادر وشہسوار تھے۔ اسلامی جنگوں میں ان کا نام ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے عمر بن سعد کی فوج میں شامل تھے۔ جب جناب سید الشہداء کی امن دوستی اور مظلومیت اور ابن سعد کے ظلم وتعدی کو دیکھا تو حسینی لشکرگاہ میں داخل ہوگئے اور روز عاشوراء حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[3]

(۹/۸۶) بکر بن حی

عسقلانی نے ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ذکر کیا ہے: بکر بن حی بن علی بن تیم اللہ بن ثعلبہ۔ اور لکھا ہے کہ انہوں نے زمانہ رسول کو درک کیا تھا۔ ان کا شمار بھی شہداء کربلا کے مقدس زمرہ میں کیا جاتا ہے۔ پہلے پسر سعد کی سپاہ میں شامل تھے۔ روز عاشوراء جب جنگ شروع ہوئی تو رحمت الٰہی شامل حال ہوگئی۔ اور آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوکر بنا بر مشہور حملۂ اولیٰ میں فیض شہادت حاصل کیا۔[4]

(۱۰/۸۷) ادہم بن امیہ عبدی (۱۱/۸۸) عبداللہ (۱۲/۸۹) عبیداللہ فرزندان یزید بن ثبیط (۱۳/۹۰) عامر بن مسلم عبدی (۱۴/۹۱) ان کے غلام سالم (۱۵/۹۲) سیف بن مالک عبدی

جناب ادہم کا نام ونسب اس طرح ہے: ادہم بن امیہ بن ابی عبیدہ بن ہمام بن الحارث بن بکر بن زید بن مالک بن زید العبدی۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔ عسقلانی وغیرہ علماء سیر وتراجم کے بیان کے مطابق ان کے والد امیہ صحابی رسولؐ تھے۔ بصرہ میں ماریہ بنت منقذ (یا سعید) عبدیہ نامی ایک خاتون شیعیان علیؑ میں سے اس قدر جلالت قدر کی مالک تھیں کہ تمام (اہم امور پر صلاح ومشورہ کے لیے ان کے مکان پر شیعوں کے اجتماع ہوتے تھے)۔ جب

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۲۶۔ ابصار العین، ص ۱۳۷۔

[2] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۰۔

[3] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۰۔ فرسان، ج ۲، ص ۷۔ ذخیرہ، ص ۲۲۳۔

[4] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۵۱۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۶۰۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۳ وغیرہ۔

یزید نے ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کر کے کوفہ بھیج دیا اور دوسری طرف جناب امام حسینؑ کے عراق کی طرف روانہ ہونے کی خبریں زبان زد خاص و عام تھیں۔ بصرہ کے قائم مقام گورنر نے اس اعلان کے ساتھ ساتھ کہ یہاں سے کوئی شخص نصرت حسینؑ کے لیے نہ جائے۔ ناکہ بندی کا بھی انتظام کر دیا۔ اس اثنا میں یزید بن ثبیط قیسی نے ماریہ مذکورہ کے مکان پر شیعوں کے ایک خصوصی اجتماع میں نصرت امامؑ کے لیے جانے کا عزم ظاہر کیا۔ اور اپنے دس بیٹوں کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش کیا۔ جن میں سے صرف عبداللہ اور عبیداللہ نے باپ سے اتفاق رائے کیا۔ وہیں ادہم بن امیہ عامر بن مسلم العبدی اور اس کے غلام سالم و سیف بن مالک العبدی نے بھی ان سے اتحاد عمل کیا۔ دوسرے لوگ ناکہ بندی کی شدت نیز دوسرے بعض خطرات کے ماتحت اس سعادت کو حاصل نہ کر سکے۔ البتہ بعد میں کچھ لوگ کف افسوس ملتے رہے اور بعض قافلے نصرت امامؑ کی غرض سے روانہ بھی ہوئے۔ مگر راستہ میں شہادت حسینؑ کی خبر دہشت اثر سن کر واپس لوٹ گئے۔[1] بہر حال چھ آدمیوں کا یہ مختصر قافلہ اپنی جانوں کو شدید خطرے میں ڈال کر اور مشکلات میں گھر کر سید الشہداءؑ کے مکہ سے روانہ ہونے کے بعد راستہ میں حسینی قافلہ کے ساتھ جا کر شامل ہو گیا۔ پھر اس تمام سفر میں ہمرکاب رہا۔ حتیٰ کہ روز عاشوراء جب میدان کارزار گرم ہوا تو ان سب شمع حسینیؑ کے پروانوں نے نصرت امام کا فریضہ انجام دیتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہادت کی سعادت حاصل کی۔[2] رضوان اللہ علیہم۔

(۱۶/۹۳) حارث بن نبہان

ارباب مقاتل نے لکھا ہے کہ حارث کے والد نبہان حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے غلام اور بڑے جنگ آزما اور شہسوار تھے۔ جناب حمزہ کی شہادت کے دو سال بعد وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند حارث حضرت امیرؑ سے وابستہ رہے۔ ان کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کی خدمت میں رہنا اختیار کیا اور آپ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کی خدمت فیض درجت میں رہے۔ حتیٰ کہ جب انقلاب روزگار کی وجہ سے جناب خامس آل عبا اپنا وطن مالوف چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ تو حارث آپ کے ہمرکاب ہوئے۔ اور برابر روز عاشوراء تک ہمراہ رہے۔ جب کربلا کے قیامت خیز محارب کی ابتدا ہوئی تو انہوں نے نصرت امامؑ میں شہادت کا جام نوش کیا۔[3]

(۱۷/۹۴) منیع بن زیاد

حضرت شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے اپنے رجال میں ان کا شمار حضرت امام حسینؑ کے اصحاب میں کیا ہے

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۵۱ وغیرہ۔

[2] ذخیرہ، ص ۲۲۹، ۲۲۴۔ فرسان، ج ۱، ص ۲۷ و ج ۲، ص ۱۳۸۔

[3] ذخیرہ، ص ۲۶۷۔ فرسان، ج ۱، ص ۸۳۔ ؟؟؟

مگر انہوں نے منیع بن رقاد لکھا ہے۔ اس بزرگوار کا شمار بھی روزِ عاشوراء حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ہوتا ہے۔ مگر کتب رجال سے ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔[۱]

(۱۸/۹۵) عبدالرحمٰن بن عبداللہ الارحبی

یہ وہی بزرگوار ہیں جن کو اہل کوفہ نے بہت[۲] سے دعوتی خطوط دے کر قیس بن مسہر صیداوی کے ہمراہ حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں مکہ روانہ کیا تھا اور یہ بارہ ماہِ رمضان ۶۰ھ کو بارگاہِ امامت میں باریاب ہوئے تھے۔[۳] اسی بات سے ان کی دیانت و امانت پر بہت تیز روشنی پڑتی ہے۔ بہرحال روزِ عاشوراء حملۂ اولیٰ میں اور بقولے مبارزت طلبی میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[۴]

(۱۹/۹۶) حلاس بن عمرو الازدی الراسبی

کوفہ کے باشندہ اور حضرت امیر علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ اور آنجنابؑ کے ظاہری دورِ خلافت میں پولیس افسر تھے۔ اپنے بھائی نعمان بن عمرو (جن کی شہادت کا قبل ازیں تذکرہ کیا جا چکا ہے) کے ساتھ ابن سعد کی فوج میں کربلا پہنچے اور شبِ ہشتم محرم کو مخفی طریقہ پر سپاہِ امامؑ میں شامل ہو گئے۔ روزِ عاشوراء حلاس حملۂ اولیٰ میں اور نعمان حملۂ اولیٰ اور ظہر کے درمیان مبارزت طلبی میں شہادت کی سعادت پر فائز ہوئے۔[۵]

(۲۰/۹۷) زاہر بن عمرو اسلمی مولیٰ عمرو بن الحمق الخزاعی

یہ بزرگ جناب عمرو بن الحمق الخزاعی کے مصاحب تھے۔ اربابِ سیر نے آپ کا شمار اصحابِ رسولؐ میں کیا ہے۔ اور یہ کہ آپ بیعتِ شجرہ، صلح حدیبیہ اور جنگ خیبر میں شریک تھے۔ محبت خاندانِ نبوتؐ ان کا طغرائے امتیاز تھا۔ ۶۰ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے۔ واپسی پر امام حسینؑ کے ہمراہ کربلا پہنچے۔ اور بالآخر روزِ عاشوراء حملۂ اولیٰ میں شرف شہادت حاصل کر کے زندگانی جاوید پر فائز ہوئے۔[۶]

(۲۱/۹۸) جبلہ بن علی الشیبانی

کوفہ کے شیعیانِ علیؑ میں سے نامور اور بہادر تھے۔ جنگ صفین میں آنجنابؑ کے ہمرکاب تھے۔ جناب مسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کی شہادت کے بعد روپوش ہو گئے۔ جب امامؑ کے کربلا میں ورودِ مسعود کی اطلاع ملی تو ان

۱۔ فرسان، ج ۲، ص ۱۳۳۔
۲۔ فرسان، ج ۱، ص ۲۳۳۔
۳۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۲۵۰۔
۴۔ فرسان، ج ۱، ص ۲۳۲۔
۵۔ فرسان، ج ۱، ص ۱۳۱۔ ذخیرہ، ص ۲۶۸۔
۶۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۳۸، بحوالہ اصابہ وغیرہ

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روز عاشوراء حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔[۱] صاحب حدائق وردیہ نے ان کی شہادت بطور مبارزت ذکر کی ہے۔[۲]

(۲۲/۹۹) مسعود بن الحجاج التیمی (۲۳/۱۰۰) عبدالرحمٰن بن مسعود التیمی

یہ دونوں باپ بیٹا شجاعان روزگار میں سے تھے۔ سپاہ ابن سعد میں شامل تھے۔ جن دنوں ہنوز جنگ کا آغاز نہ ہوا تھا بلکہ طرفین سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری تھا۔ بغرض سلام خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ پھر اس طرح رحمت ایزدی شامل حال ہوئی کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور روز عاشوراء حملہ اولیٰ میں جام شہادت نوش کر کے ابدی سعادت پر فائز ہوئے۔[۳]

(۲۴/۱۰۱) سوار بن ابی عمیر النہمی

اگرچہ مناقب شہر ابن آشوب میں ان کا شمار حملۂ اولیٰ کے شہداء میں کیا گیا ہے۔ مگر اکثر ارباب سیر و تواریخ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حملۂ اولیٰ میں زخموں سے نڈھال ہو کر گر گئے۔ بعد ازاں ان کو گرفتار کر کے پسر سعد کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے قتل کرانا چاہا مگر ان کے ہم قوم سپاہی آڑے آئے۔ سفارش کر کے ان کو زندہ گھر لے گئے۔ علاج معالجہ کیا۔ لیکن زخم اتنے کاری لگے تھے کہ نہ بچ سکے۔ اور چھ ماہ تک صاحب فراش رہ کر راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ اور روح شہدائے کربلا میں شامل ہوگئی۔[۴]

(۲۵/۱۰۲) زہیر بن بشر الخثعمی

حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کے بھائی عبداللہ بن بشر کی شہادت کا تذکرہ قبل ازیں (نمبر ۵۴ پر) کیا جا چکا ہے)۔ بنابر روایت مناقب زہیر نے حملۂ اولیٰ میں شہادت پائی۔[۵]

(۲۶/۱۰۳) عمار بن حسان بن شریح الطائی

جناب عمار (جن کا اسم گرامی بعض کتب رجال میں عامر لکھا ہے) مخلص شیعیان حیدر کرار میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے والد جناب حسان حضرت امیر علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور جنگ صفین میں آنجناب کے ہمرکاب تھے۔ عمار مکہ سے حضرت امام علیہ السلام کے ہمراہ کربلا پہنچے۔ اور روز عاشوراء حملۂ اولیٰ میں شرف شہادت سے مشرف ہوئے۔[۶]

۱۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۱۔
۲۔ فرسان، ج ۱، ص ۵۵۔
۳۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۱۔ ذخیرہ، ص ۲۳۶۔
۴۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۱۔
۵۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۳۲۔
۶۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۱۔ فرسان، ج ۱، ص ۲۲۷۔

(۲۷/۱۰۴) عبداللہ بن عمیر

فاضل مازندرانی نے ان کا شمار حملہ اولیٰ کے شہداء میں کیا ہے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عبداللہ بن عمیر سے کون بزرگوار مراد ہیں۔ اگر ابن عمیر کلبی ہیں تو ان کے حالات ابتداء میں (نمبرا) پر لکھے جا چکے ہیں۔ مگر وہ حملۂ اولیٰ میں شہید نہیں ہوئے اور اگر کوئی اور بزرگ ہیں تو ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ واللہ العالم۔

(۲۸/۱۰۵) مسلم بن کثیر الازدی الاعرج

فاضل مامقانی نے ان کا شمار حضرت امیر علیہ السلام کے اصحاب میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ جنگ جمل میں آنجنابؑ کے ہمرکاب تھے۔ اسی جنگ میں پاؤں پر ایک تیر لگا۔ جس کی وجہ سے لنگڑے ہو گئے۔ اور عسقلانی کے بیان سے ان کا صحابی رسولؐ ہونا واضح ہوتا ہے۔ کوفہ میں رہائش تھی۔ بہرحال کربلا میں خدمت امام میں شرف یاب ہوئے۔ اور روز عاشوراء حملۂ اولیٰ میں شہد شہادت پیا۔[1]

(۲۹/۱۰۶) زہیر بن سلیم ازدی

یہ بزرگوار پہلے عمر بن سعد کی فوج میں تھے۔ شب عاشوراء رحمت پروردگار شامل حال ہوئی اور آ کر امام علیہ السلام کی جماعت میں شامل ہو گئے اور روز عاشوراء حملۂ اولیٰ میں جام شہادت نوش کیا۔[2]

(۳۰/۱۰۷) امیہ بن سعد الطائی

امیہ کوفہ کے باشندہ، حضرت امیر علیہ السلام کے صحابی اور قبیلۂ طئے کے بہادر اور شہسوار تھے۔ کتب سیر و تواریخ کے اندر اسلامی جنگوں میں بالعموم اور جنگ صفین میں بالخصوص آپ کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب ان کو امام علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کی اطلاع ملی تو کسی نہ کسی طرح اپنے تئیں شب ہشتم محرم کو خدمت امام میں پہنچایا۔ اور پھر برابر آپ کے ہمراہ رہے۔ حتیٰ کہ روز عاشوراء آغاز جنگ کے بعد تائید حق میں داد شجاعت دیتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں واصل بحق ہوئے۔[3] رضوان اللہ علیہ۔

(۳۱/۱۰۸) حارث بن امرالقیس بن عابس الکندی

یہ بزرگوار شجاعان نامدار و شہسواران و عبادت گزاران روزگار میں شمار ہوتے تھے۔ پہلے لشکر ابن زیاد میں شامل تھے مگر جب انہوں نے کربلا میں فریقین کا رویہ و کردار دیکھا اور دیکھا کہ کس طرح بے دردی کے ساتھ ابن سعد

---

[1] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۲۔ فرسان، ج ۲، ص ۳۶۔

[2] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۵۲۔ فرسان، ج ۱، ص ۱۳۱۔

[3] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۳۶۔ ذخیرہ، ص ۲۶۲۔ ابصار، ص ۱۳۷۔

نے سرکار سید الشہداءؑ کے شرائطِ امن وصلح کو نامنظور کر دیا ہے تو اس سے متاثر ہو کر امام حسینؑ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ جب روزِ عاشوراء تاریخی محاربۂ کربلا شروع ہوا تو جہاد کرتے ہوئے شربت شہادت نوش کیا۔[۱]

(۳۲/۱۰۹) عمارہ (عمار) ابن ابی سلامہ الہمدانی الدالانی

دالان قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ ہے۔ جناب عمارہ کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ ان کا شمار حضرت امیر المومنینؑ کے اصحاب مجاہدین میں ہوتا تھا۔ چنانچہ آنجنابؑ کی تینوں جنگوں (جمل، صفین اور نہروان) میں آپ کے ہمرکاب رہ کر کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔ بعض اہل سیر نے ان کا شمار اصحاب رسولؐ میں کیا ہے۔ روزِ عاشوراء نصرت امام و اسلام کا فریضہ انجام دیتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہادت کا مقدس جام نوش کر کے ابدی سعادت پر فائز ہوئے۔[۲]

(۳۳/۱۱۰) جنادہ بن کعب بن حارث الانصاری

یہ بزرگوار شیعیان علیؑ میں سے ہیں۔ مکہ مکرمہ سے اپنے اہل و عیال سمیت امام علیہ السلام کی ہمراہی میں کربلا پہنچے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ (فرسان، ج۱، ص ۷۵)

(۳۴/۱۱۱) جوین بن مالک التمیمی

کوفہ کے باشندہ ہیں۔ اور حضرت امام حسینؑ کے صحابی شمار ہوتے ہیں۔ جب کوفہ کے تمام قبائل کربلا میں امام علیہ السلام سے جنگ کرنے کے لیے بھیجے گئے تو موصوف بھی پسر سعد کے لشکر میں شامل ہو کر کربلا پہنچے اور موقع پا کر سپاہ امامؑ میں داخل ہو گئے۔ اور حملۂ اولیٰ میں شہادت کے مرتبۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ (فرسان، ج۱، ص۸۲)

(۳۵/۱۱۲) حباب بن حارث

فاضل مازندرانی نے ان کا شمار حملۂ اولیٰ کے شہداء میں کیا ہے۔ مگر کتب مقاتل و تراجم میں ان کے حالات زندگی معلوم نہیں ہو سکے۔ (کذا فی نفس المہموم، ص ۱۵۷)

(۳۶/۱۱۳) ربیعہ بن خوط

کوفہ کے شیعیان علیؑ میں سے تھے۔ صاحب فرسان الہیجاء نے جلد۱، صفحہ ۱۳۶ میں ان کا شمار شہداء کربلا میں کیا ہے۔

(۳۷/۱۱۴) زُمیط بن عمرو

صاحب فرسان الہیجاء نے بحوالہ رجال شیخ طوسیؒ ان کا شمار شہداء کربلا میں کیا ہے۔ (ج۱، ص ۱۳۷)

۱۔ فرسان الہیجاء، ج۱، ص ۸۳۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۲۶۷۔ ابصار العین، ص ۱۴۴۔

۲۔ منتہی، ج۱، ص ۳۵۱۔

(۳۸/۱۱۵) ضبیعہ بن عمرو

زیارت رجبیہ میں (جو کتاب اقبال سید بن طاؤسؒ میں مذکور ہے) ان کا نام شہداء کربلا کی فہرست میں دیا گیا ہے۔ (فرسان، ج ۱، ص ۱۷۱) ان کے حالات نہیں مل سکے۔

(۳۹/۱۱۶) عامر بن مالک

صرف زیارت رجبیہ میں ان کو شہداءِ کربلا میں شمار کیا گیا ہے۔ (فرسان، ج ۱، ص ۱۸۵) واللہ العالم۔

(۴۰/۱۱۷) عمیر بن کناد

زیارت رجبیہ میں شہداءِ کربلا کے ضمن میں ان پر سلام وارد ہے۔ (فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۷) اس کے علاوہ کتب رجال میں کچھ نہیں مل سکا۔

(۴۱/۱۱۸) منذر بن سلیمان

شیخ طوسیؒ نے ان کو امام حسینؑ کے اصحاب میں شمار کیا ہے اور زیارت رجبیہ میں ان کا شمار شہداءِ کربلا میں کیا گیا ہے۔ (فرسان، ج ۲، ص ۱۲۳)

(۴۲/۱۱۹) سلیم

امام حسنؑ کا باوفا غلام کربلا میں نصرت امام حسینؑ میں شہید ہوا۔ (شہید انسانیت، ص ۳۹۰، طبع اول)

(۴۳/۱۲۰) سید الشہداءؑ کے آٹھ عدد غلاموں کی شہادت

مخفی نہ رہے کہ فاضل شہر بن آشوب مازندرانی نے اپنی کتاب مناقب میں سرکار سید الشہداءؑ کے دس غلاموں کی شہادت کا تذکرہ حملۂ اولیٰ کے شہداء کے ضمن میں کیا ہے جن میں سے بعض جیسے غلام ترکی اور منجح کے حالات کا تو پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے جو مبارزت طلبی میں شہید ہوئے۔ ہاں البتہ باقی آٹھ حضرات نے حملۂ اولیٰ میں شربتِ شہادت نوش کیا۔ (ان کے اسمائے مبارکہ پردۂ خفاء میں ہیں)۔

نتیجۂ کلام

سابقہ بیانات سے واضح وعیاں ہو گیا کہ سرکار سید الشہداءؑ کے انصار کی کل تعداد ایک سو ستائیس (۱۲۷) ہے جن میں سے ستر (۷۰) حضرات مبارزت طلبی میں اور پچاس (۵۰) بزرگوار جنگ مغلوبہ میں شہید ہوئے۔ اور جب ان میں اٹھارہ عدد شہداء بنی ہاشم بھی شامل کر دیے جائیں تو سب شہداء کربلا کی تعداد ایک سو پینتالیس (۱۴۵) بن جاتی ہے۔ (وهو الحق، و الحق احق ان يتبع. والله الهادى الى سواء السبيل)۔

شہداءِ کربلا پر عمومی تبصرہ

اب جب کہ اصحاب و انصار حسینؑ کے تذکرۂ شہادت کے ساتھ ان کے مختصر حالات زندگی بھی بیان کئے جا چکے ہیں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مستطاب ''شہید انسانیت'' سے اس مقدس جماعت کی نوعیت و حیثیت پر ایک عمومی تبصرہ کر دیا جائے۔ چنانچہ کتاب مذکور میں لکھا ہے:

''ان اصحاب کے ان حالات سے جو سلسلہ وار پیش ہوئے ہیں۔ یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ گمنام اور غیر معروف شخصیتوں کے مالک نہیں تھے۔ بلکہ اعداد و شمار کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں مندرجہ ذیل اشخاص کو اصحاب رسولؐ ہونے کا شرف حاصل تھا:

اصحاب حسینؑ میں اصحاب رسولؐ

(۱) مسلم بن عوسجہ — (۲) زاہر بن عمرو اسلمی کندی
(۳) شبیب بن عبداللہ مولیٰ ہمدان — (۴) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری خزرجی
(۵) عمار بن ابی سلامہ دالانی — (۶) مسلم بن کثیر
(۷) حبیب بن مظاہر — (۸) انس بن حارث اسدی

وفات رسولؐ سے واقعۂ کربلا تک پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس لیے ان میں سے کسی کی عمر پچپن یا ساٹھ برس سے کم نہیں قرار پا سکتی۔ اور ان میں سے بعض کی عمر اس سے یقیناً زیادہ تھی۔ جیسے انس بن حارث، عبد الرحمٰن، بن عبدرب، حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ، ان کے علاوہ سوید بن عمرو خشعمی عام انسانی طبیعت کے تقاضوں کے لحاظ سے بوڑھے مجاہدین میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی وقتی جوش یا ولولۂ جنگ کی وجہ سے میدان داری پر تیار ہو گئے تھے۔

اصحاب حسینؑ میں تابعین

حسب ذیل اصحاب حضرت علیؑ تھے۔ جو اصطلاحاً تابعین میں داخل ہیں اور تابعین کا مرتبہ صحابہ کے بعد سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے:

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی — (۲) مجمع بن عبداللہ مذحجی
(۳) جنادہ بن حارث سلمانی — (۴) جندب بن حجیر کندی
(۵) امیہ بن سعد طائی — (۶) جبلہ بن علی شیبانی
(۷) حارث بن نبہان — (۸) حلاس بن عمرو ازدی

(۹)	شبیب بن عبداللہ نہشلی	(۱۰)	قاسط بن زہیر تغلبی
(۱۱)	کردوس بن زہیر تغلبی	(۱۲)	مقسط بن زہیر تغلبی
(۱۳)	نعمان بن عمرو ازدی	(۱۴)	نعیم بن عجلان انصاری
(۱۵)	ابوثمامہ صائدی	(۱۶)	شوذب بن عبداللہ
(۱۷)	جون غلام ابوذر غفاری	(۱۸)	حجاج بن مسروق جعفی
(۱۹)	سعد بن حارث	(۲۰)	یزید بن مغفل جعفی
(۲۱)	عمر بن جندب حضرمی		

ان میں سے اکثر جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں جنگ کر چکے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو حضرت علیؑ کے زمانہ خلافت میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ اور بعض شاگردی کی حیثیت سے علمی استفادہ کر چکے تھے۔

حسینی جماعت میں حفاظِ قرآن

حسب ذیل حفاظِ قرآن تھے: (۱) بریر بن خضیر ہمدانی جو سید القراء کے لقب سے ملقب تھے۔ اور کوفہ میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ (۲) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری۔ (۳) کنانہ بن عتیق تغلبی۔ (۴) نافع بن ہلال جملی۔ (۵) حنظلہ بن اسعد شبامی۔ (۶) غلام ترکی۔

اصحابِ حسینؑ میں علماءِ ابرار و راویانِ اخبار

حسب ذیل علماء اور راویانِ حدیث تھے:

(۱)	مسلم بن عوسجہ۔	(۲)	حبشہ بن قیس نہمی۔
(۳)	زاہر بن عمر اسلمی۔	(۴)	سوار بن ابی عمیر نہمی۔
(۵)	عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری۔	(۶)	حبیب بن مظاہر اسدی۔
(۷)	نافع بن ہلال جملی۔	(۸)	شوذب بن عبداللہ۔
(۹)	انس بن حارث اسدی۔		

حسینی جماعت میں شجاعانِ روزگار

حسب ذیل شجاعانِ روزگار تھے۔ جن کی لڑائیوں کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے:

(۱)	حر بن یزید ریاحی	(۲)	مسلم بن عوسجہ اسدی

(۳) حارث بن امرء القیس کندی (۴) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحی

(۵) سعید بن عبداللہ حنفی (۶) مسعود بن حجاج تیمی

(۷) زہیر بن قین بجلی (۸) عابس بن ابی شبیب شاکری

(۹) زیاد بن عریب ہمدانی (۱۰) سوید بن عمرو بن ابی المطاع خثعمی

اصحابِ حسینؑ میں عبادت گزارانِ نامدار

اس کے علاوہ عبادت اور زہد و تقویٰ میں تو ان میں سے اکثر افراد جن کے نام مندرجہ بالا مختلف عناوین کے تحت میں درج کئے جا چکے ہیں، شہرۂ آفاق تھے بلکہ بعض اپنی مخصوص شجاعت کے ساتھ عبادت و ریاضت کے لیے بھی مشہور تھے جیسے: عابس بن ابی شبیب اور زیاد بن عریب۔ جن کے متعلق تاریخ میں صراحت ہے کہ وہ شب زندہ دار تھے۔ اور سعید بن عبداللہ حنفی جن کے اوصاف میں عبادت کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ سب کے سب وہ مایہ ناز افراد تھے جن کی زندگیاں مکمل طور پر معیاری حیثیت رکھتی تھیں اور اسلامی اخلاق واوصاف کی زندہ تصویر تھیں۔

امام حسین علیہ السلام کو میدان کربلا میں ایسے ہی افراد کی ضرورت تھی۔ آپؑ جانتے تھے کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کی وجہ سے کتنی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اسی لیے آپ عوام کے مجمع کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سفر عراق اور کربلا کے قیام کے دوران میں حتیٰ کہ روز عاشورا تک برابر ہر موقع پر یہ کوشش جاری رکھی کہ جن اشخاص میں کچھ بھی خامی ہو۔ وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔

درحقیقت آپ ایک ایسے اہم مقصد کی تکمیل کے لیے جو آپ کے پیش نظر تھا عوام پر بھروسہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ''حسینؑ کو جس طرح کا مقابلہ منظور تھا اس کی نوعیت سطحی نظریں کبھی سمجھ ہی نہ سکتی تھیں۔۔۔''

امام حسین علیہ السلام کو طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا نہیں تھا۔ بلکہ طاقت کا مقابلہ کردار سے باطل کا مقابلہ حق سے۔ تشدد کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرنا تھا۔ آپ کو اپنے خون کے چھینٹوں سے ایک ایسی دنیا کو خواب غفلت سے جگانا مقصود تھا۔ جس پر بے حسی اور بے ہوشی چھائی ہوئی تھی۔ آپ کردار کے ایسے نمونے پیش کرنا چاہتے تھے جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکیں۔ یہ مرحلہ بڑا نازک تھا۔ یہاں ساتھ والوں کے انتخاب کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔

امام حسین علیہ السلام کو اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو آپؑ نے ایسے انتظام کیے ہوتے مگر چونکہ آپؑ کا مقصد یہ نہ تھا بلکہ آپؑ چاہتے تھے کہ بے ہوش اسلامی دنیا میں احساس و بیداری پیدا کریں۔ اس کے لیے آپؑ کے ساتھ ملک عرب کے چیدہ اور منتخب عابد، زاہد، متقی اور پارسا افراد ہی ہو سکتے تھے۔

آپؑ نے اپنے ساتھ ایسے ضعیف افراد لیے جن کی عمروں کا بیشتر حصہ محراب عبادت میں گزر چکا تھا۔ کیونکہ ایسے ہی افراد کے کمریں کس کر، تلواریں سونت کر میدان میں آنے سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل سکتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتے تھے کہ اسلام پر کیا ایسا وقت آپڑا ہے۔ کہ ایسے ایسے عابد و زاہد بھی تلواریں کھینچ کر میدان جنگ میں آگئے ہیں۔ ان اصحاب کی شرکت واقعۂ کربلا کی نوعیت برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے اگر امام حسینؑ صرف اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ کربلا کی سرزمین پر آگئے ہوتے تو یہ کہا اور سمجھا جاتا کہ یہ ایک خاندانی جنگ تھی جیسا کہ عام طور پر بتلایا جاتا ہے کہ امیہ اور بنی ہاشم ایک ہی خاندان کی دو شاخیں تھیں۔ اور ان میں برابر خانہ جنگی رہا کرتی تھی۔ مگر امام حسینؑ کے ساتھ تقریباً ملک عرب کے ہر قبیلہ اور مختلف مقامات کے ممتاز اور سربرآوردہ افراد موجود تھے جن میں نقطۂ مشترک صرف اُصول کا احساس اور ایک وجہ خاص یعنی فریضۂ دینی کا اتحاد ہی ہو سکتا تھا اور بس۔[1]

---

[1] شہید انسانیت، ص ۳۹۰۔

﴿ تئیسواں باب ﴾

واقعۂ کربلا میں بنی ہاشم کی عظیم الشان قربانیاں

تاریخ عالم کا یہ نہایت تعجب خیز واقعہ ہے اور اصحاب حسینی کے خلوص و ایثار کا زندہ ثبوت کہ ان میں سے جب تک ایک متنفس بھی زندہ رہا۔ باوجودیکہ تیروں اور تلواروں کی بارش ہوتی رہی۔ کئی بار جنگ مغلوبہ بھی ہوئی۔ مگر کوئی تاریخ نہیں بتاتی کہ امام عالی مقام کے اعزا و اقارب کو کوئی معمولی سے معمولی گزند پہنچا ہو۔ یا کسی عزیز کو میدان جنگ کی طرف جانے دیا گیا ہو۔ ہاں البتہ جب تمام اصحاب حسینی جام شہادت نوش کر کے جنت الفردوس کو سدھار چکے تو اب امام کے اعزاء و اقرباء نے اپنی بے مثال قربانیاں دینا شروع کیں۔

شہداءِ بنی ہاشم کی تعداد کتنی ہے؟

اس امر میں شدید اختلاف ہے کہ جناب سید الشہداء کے علاوہ دیگر شہداء بنی ہاشم کی تعداد کس قدر ہے؟ (۱) حضرت شیخ مفیدؒ (در ارشاد) اور ابن عبدالبر اندلسی (در عقد فرید) نے سترہ (۱۷) شہداء کا تذکرہ کیا ہے۔ (۲) سبط ابن جوزی (در تذکرہ) نے انیس (۱۹) شہیدوں کا ذکر کیا ہے۔ (۳) مدائنی نے اکیس (۲۱) نفوس بتائے ہیں (بحوالہ نفس المہموم ص ۳۰۹)۔ (۴) ابوالفرج اصفہانی (در مقاتل الطالبین) نے بائیس (۲۲) حضرات کا ذکر خیر کیا ہے۔ (۵) حسن بصری سے سولہ (۱۶) ذوات مقدسہ منقول ہیں۔ (بحوالہ نفس المہموم ص ۳۱۱) (۶) جناب شیخ محمد بن علی مازندرانی (در مناقب) نے ستائیس (۲۷) سے زائد ظاہر کئے ہیں۔ (۷) صاحب ذخیرۃ الدارین نے پورے تیس (۳۰) عدد شہداء بنی ہاشم کا ذکر خیر کیا ہے۔ (۸) بعض محققین نے اٹھارہ نفوس مقدسہ کی شہادتیں بیان کی ہیں۔ اور یہی قول سب اقوال میں سے اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم قبل ازیں بھی کئی بار اس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں کہ مورخین وغیرہ کے اقوال و آراء کی اس وقت تک قدر و قیمت ہوتی ہے۔ جب تک ان کے اقوال قول معصوم سے متصادم نہ ہوں۔ یا جب تک ارشاد معصوم معلوم نہ ہو۔ ان اقوال میں سے اگرچہ پہلے قول کی تائید میں بھی ایک روایت ملتی ہے۔ (نفس المہموم ص ۳۰۹) مگر ان اقوال میں سے جس قول کو حضرت امام رضا علیہ السلام کی صحیح السند حدیث شریف کی تائید مزید حاصل ہے وہ آٹھواں قول ہے۔ اس حدیث شریف میں وارد ہے: ﴿یا بن شبیب ان کنت باکیاً فابک للحسین بن علیؑ بن ابی طالب علیہما السلام فانہ ذبح کما یذبح الکبش و قتل معہ من اھلبیتہ ثمانیۃ عشر رجلاً مالھم شبیھون فی الارض۔ الخ﴾ اے ریان بن شبیب! اگر روتا ہے تو حسینؑ بن

علیؑ پر روز جو دنبے کی طرح ذبح کیے گئے۔ اور ان کے ہمراہ ان کے اہل بیت میں سے ایسے اٹھارہ نفوس عالیہ شہید کیے گئے جن کا تمام روئے زمین پر کوئی شبیہ و ہمسر نہ تھا۔ (نفس المہموم ص ۱۷۔ عاشر بحار، ص ۱۶۵ وغیرہ) بنابریں اسی قول کو معتبر سمجھنا چاہیے۔

پہلے شہید کی تحقیق

اس بارے میں ارباب تاریخ میں قدرے اختلاف ہے۔ کہ خاندان نبوت میں سے پہلا شہید کون ہے؟ بعض ارباب مقاتل کا خیال ہے۔ کہ جناب عبداللہ بن مسلم بن عقیل پہلے شہید ہیں۔ لیکن اکثر ارباب تحقیق کا اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ کہ اس مقدس خانوادہ کی عدیم النظیر قربانیوں سے پہلے شہید ہم شکل پیغمبرؐ جناب شہزادہ علیؑ اکبر ہیں۔[1] ذیل میں ہم ان ذوات مقدسہ کی عدیم النظیر قربانیوں اور شہادتوں کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کے مختصر مگر جامع حالات زندگی سے بھی ناظرین کرام کو روشناس کراتے ہیں۔

(۱) شہزادہ علی اکبرؑ

شہزادہ کا نام و نسب

جناب شہزادہ کا اسم گرامی علیؑ ۔ لقب اکبر اور کنیت ابوالحسن ہے۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ والد ماجد حضرت امام حسین علیہ السلام اور والدہ جناب ام لیلیٰ بنت ابی مرہ ابن عروہ بن مسعود ثقفی ہیں۔ جد پدری حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ، جد اعلیٰ حضرت رسول خداؐ اور جد مادری عروہ بن مسعود اور یہ وہی بزرگوار ہیں۔ جن کے متعلق ابن جزری نے اسد الغابہ میں بروایت ابن عباس جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ﴿اربعة سادة في الاسلام بشر بن هلال العبدي . و عدي بن حاتم و سراقة بن مالك المدلجي و عروة بن مسعود الثقفي﴾

اسلام میں چار شخص سردار ہیں: بشر بن ہلال ۔۔۔۔۔ بنابر تصریح مفسرین یہی عروۃ ان دو عظیم شخصوں میں سے ایک ہیں۔ جن کے بارے میں کفار قریش کہا کرتے تھے۔ ﴿لو لا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم﴾۔ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی عظیم الشان (مالدار) شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۴۴۳، طبع مصر وغیرہ)

---

[1] ارشاد شیخ مفید، ص ۲۶۰۔ لہوف، ص ۹۹۔ نفس المہموم، ص ۱۹۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔ تمام ص ۲۶۰، ۲۶۲۔ مقاتل الطالبین، ص ۵۶۔ الاخبار الطوال للدینوری، ص ۲۲۹۔ وقائع ایام محرم، ص ۳۳۲ وغیرہ۔

معاویہ کی زبانی شہزادہ علی اکبرؑ کی تعریف

جناب شہزادہ کی یہی نسبی خصوصیات تھیں (علاوہ حسبی شمائل وخصائل کے) جن کی بنا پر معاویہ بن ابی سفیان بھی ان کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ مغیرہ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک بار معاویہ نے حاضرین دربار سے استفسار کیا: ﴿من احق بهذا لامر؟﴾ امر خلافت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ سب نے کہا ''انت'' آپ! معاویہ نے کہا: ﴿لا﴾ یہ درست نہیں ہے۔ پھر خود ہی کہا: ﴿اولی الناس بهذا الامر علی بن الحسین بن علیؑ بن ابی طالب جده رسول اللّٰه وفيه شجاعت بنی هاشم و سخاء بنی امية و زهو بنی ثقیف﴾ امر خلافت کے سب سے زیادہ حقدار علی بن الحسینؑ بن علی بن ابی طالب ہیں۔ جن کے جد رسولؐ خدا ہیں۔ جن میں بنی ہاشم کی شجاعت، بنی امیہ کی سخاوت اور بنی ثقیف کا حسن وجمال اور فخر ومباہات موجود ہے۔[1]

شہزادہ کی شکل وشمائل

ارباب مقاتل وسیر کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جناب شہزادہ علی اکبرؑ شکل وصورت، اخلاق وخصائل اور شکل وشمائل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آئینۂ جمال وکمال تھے۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ بنا بریں وہ جملہ حالات وخصائل از قسم طلاقت لسان، ذلاقت بیان، صباحت رخسار، ملاحت دیدار، نیکوئی خلق، موزوئی خلق، غرضکہ تمام شکل وشمائل اور عادات وخصائل میں ہو بہو تصویر پیغمبرؐ ہوں گے۔ اسی بنا پر تو جناب سید الشہداءؑ نے ان کو میدان کارزار میں بھیجتے وقت بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا: ﴿اللّٰهم اشهد علی هؤلاء القوم لقد برز اليهم غلام اشبه الناس خلقاً و خُلقاً و منطقا برسولک و کنا اذا اشتقنا الی زيارة نبيک نظرنا اليه. الخ﴾ بھلا اس شہزادۂ عالی وقار کے عادات وخصائل جمیلہ کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جس نے اپنی فطری استعداد وخصوصیات کے علاوہ نام وکنیت اور شجاعت وشہامت اپنے دادا علی مرتضیٰؑ سے، ہیبت وسیادت اپنے دادا رسول خدا سے، جود وسخا اپنے چچا حسن مجتبیٰ سے۔ اور خودداری ودلیری اپنے بابا حسینؑ شہید کربلا سے وراثت میں پائی ہو۔ اور کم وبیش زندگی کی پچیس بہاریں حضرت امیر المومنینؑ اور جناب امام حسنؑ اور حسینؑ کی زیر سرپرستی گذاری ہوں۔ آیا ایسے شخص کے کردار کی بلندی۔ سیرت کی پاکیزگی، اخلاق کی وسعت، عادات کی رفعت، شمائل کی عظمت، خصائل کی جلالت، اور فضائل کے تکامل غرضکہ اس کے انسان کامل ہونے میں کچھ تامل وکلام ہوسکتا ہے؟ گویا کہ شیخ سعدی نے اسی ثمرۂ شجرۂ نبوت وامامت وعصارۂ دوحۂ ولایت کے بارے میں یہ شعر کہا ہے ۔

کس در نیامده است بدین خوبی ازدرے ۔۔۔ هرگز نیارد رد همچو تو فرزند مادرے

اسی شہزادۂ والا تبار کے حق میں کہا گیا ہے ۔ لم تر عین نظرت مثله ۔۔۔ من محتف یمشی ولا ناعل

---

[1] مقاتل الطالبین ص ۵۶ طبع النجف۔

شہزادہ علی اکبرؑ کے فضائل و محامد

اخبار و آثار کے مطالعہ سے واضح و آشکار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی اوپر اجمالاً بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ جناب شہزادہ صرف شکل و صورت میں ہی جمال محمدی کا نمونہ نہ تھے۔ بلکہ تمام حرکات و سکنات اور خصائل و عادات میں بھی سرتاپا آئینہ نمائے رسولؐ خدا تھے۔ اور اس حد تک انسانی صفات کمالیہ کے جامع تھے۔ کہ اگر امامت منجانب اللہ منصوص و معین نہ ہوتی تو یقیناً درجہ امامت پر فائز ہوتے۔ ان کی انہی ظاہری و باطنی خصوصیات کا نتیجہ تھا۔ کہ سرکار سید الشہداء کو آپؑ سے بے پناہ محبت و الفت تھی۔ اور ان کی دلجوئی و حاجت برآری کو حاصل حیات سمجھتے تھے۔ بعض کتب مناقب میں وارد ہے۔ کثیر بن شاذان بیان کرتا ہے کہ ایک بار میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا۔ کہ شہزادہ علی اکبرؑ نے آپؑ سے انگوروں کی خواہش کی۔ حالانکہ اس وقت انگوروں کا موسم نہ تھا۔ امام نے ستون مسجد کی طرف ہاتھ بلند کر کے انگوروں کا گچھا شہزادہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا۔ جو کچھ خدائے عز وجل کے پاس اپنے اولیاء کے لئے ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔[1]

شہزادہ علی اکبرؑ کے کمال ایمان و ایقان کا ایک واقعہ

مندرجہ ذیل واقعہ سے جناب شہزادہ کی قوت ایمان و ایقان پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے۔ عقبہ بن سمعان بیان کرتے ہیں۔ کہ جب امام حسینؑ منزل قصر بنی مقاتل سے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں امامؑ نے اپنا سر مبارک زین کے قربوس پر رکھا۔ اور تھوڑی سی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی۔ تو ادھر ادھر دیکھنے کے بعد سر بلند کر کے دو تین بار کہا: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ شہزادہ علی اکبر نے امامؑ کی یہ کیفیت دیکھ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور فوراً والد ماجد کی خدمت میں پہنچے۔ اور کلمہ استرجاع پڑھنے کا سبب دریافت کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ کہ میں نے اسی عالم میں ایک سوار کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ﴿القوم یسیرون و المنایا تسیر الیهم﴾ کہ یہ لوگ جا رہے ہیں۔ اور موت ان کی طرف آ رہی ہے۔ یہ سن کر شہزادہ نے عرض کیا: ﴿یا ابتا او لسنا علی الحق﴾ بابا جان! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿بلی و الذی الیه مرجع العباد﴾ ہاں بیٹا! اس ذات کی قسم جس کی طرف لوگوں کی بازگشت ہے۔ یقیناً ہم حق پر ہیں۔ شہزادہ نے کہا: ﴿اذن لا نبالی بالموت﴾ پھر ہمیں موت کی کیا پروا ہے؟ شہزادہ کا یہ مخلصانہ و مومنانہ جواب سن کر سید الشہداءؑ نے ان کو دعائے خیر دی: ﴿جزاک الله من ولد خیر ما جزی ولدا عن والده﴾۔[2]

---

[1] مدینۃ المعاجز، ص ۲۳۹۔ ضیاء العالمین (علی ما نقل عنہ)۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۹۹۔

[2] عاشر بحار، ص ۱۸۸۔ نفس المہموم، ص ۱۰۸۔ لواعج الاشجان، ص ۸۰۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۲۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۳۰۰۔

چند امور مبہمہ کی تنقیح

جب جناب شہزادہ کی زندگی کے مختصر حالات بیان ہو چکے تو یہاں چند امور کی تحقیق و تنقیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

پہلا امر اینکہ بنی ہاشم میں سے پہلا شہید کون ہے؟

آیا بنی ہاشم میں سے پہلے شہید آپؑ ہیں۔ یا عبداللہ بن مسلم بن عقیل؟ بعض مورخین نے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو آل ہاشم میں سے پہلا قتیل قرار دیا ہے۔ اور [۱] بعض نے جناب شہزادہ علی اکبرؑ کو۔ اور بعض [۲] نے آل ہاشم میں سے پہلا شہید عبداللہ کو اور آل ہاشم کی شاخ آل ابی طالبؑ سے پہلا شہید علی اکبرؑ کو قرار دیا ہے۔ اور بعض [۳] نے تمام خاندان نبوت کے آخر میں شہزادہ کی شہادت متعین کی ہے۔ ہم اس باب کی ابتداء میں لکھ آئے ہیں۔ کہ اہل سیرو تواریخ میں سے اکثر ارباب تحقیق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خاندان بنی ہاشم سے پہلے شہید جناب شہزادہ علی اکبرؑ ہی ہیں۔ و هو المشهور و المنصور و ان کان القول الثالث من هذاه الاقوال لا یخلو عن قوة فتامل۔

دوسرا امر شہزادہ علی اکبرؑ بڑے تھے یا امام زین العابدینؑ؟

شہزادہ علی اکبرؑ کی شہادت کے وقت عمر کیا تھی؟ اور آیا آپ سید الشہداءؑ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ یا جناب امام زین العابدینؑ بڑے ہیں؟ اس سلسلہ میں ارباب تاریخ و مقاتل میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ جناب شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے یہ لکھا ہے۔ کہ ان کی عمر انیس برس تھی [۱] جناب ابن شہر آشوب نے اٹھارہ سال [۲] جناب شیخ ابن نما حلی نے پچیس (۲۵) سال [۳] فاضل مقرم نجفی نے ستائیس سال [۴] اور شیخ ذبیح اللہ محلاتی نے اٹھائیس [۵] سال لکھی ہے۔ حالانکہ جناب امام زین العابدین علیہ السلام کی عمر مبارک واقعہ کے وقت کل تیئس (۲۳) سال تھی۔ [۶] اور ان کے شہزادہ امام محمد علیہ السلام کی عمر تین سال اور کچھ ماہ تھی۔ [۷] بنا بریں اگر شہزادہ علی اکبرؑ کی عمر اٹھارہ یا انیس سال تسلیم کی جائے۔ تو پھر آپ امام زین العابدین علیہ السلام سے چھوٹے قرار پاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی عمر پچیس، ستائیس یا اٹھائیس سال مانی جائے۔ تو پھر معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ ہم نے جہاں تک کتب تاریخ و تراجم اور مقاتل و انساب کی ورق گردانی کی ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شہزادہ علی اکبرؑ ہی درحقیقت اکبر تھے۔ اس کے بعض

۱۔ ارشاد، ص ۲۶۰۔

۲۔ مناقب، ج ۳، ص ۹۷، طبع بمبئی۔

۳۔ مقتل ابن نما۔

۴۔ مقتل الحسین مقرم، ص ۲۹۳۔

۵۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۸۷۔

۶۔ عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب، ص ۱۷۲، طبع بمبئی۔

۷۔ وقائع ایام محرم، ص ۳۶۶۔

وجوہ وشواہد درج ذیل ہیں۔

شہزادہ علی اکبرؑ کے اکبر ہونے کے شواہد

شاہد اوّل:۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ عقلی تو نہیں کہ محض عقل پر اعتماد کر کے کوئی فیصلہ صادر کیا جائے۔ بلکہ یہ خالص نقلی مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس بارے میں اہل سیر و نسب ہی کے اقوال و آراء پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے اقوال سے جناب شہزادہ کی کم از کم پچیس سال ثابت ہوتی ہے ورنہ بظاہر ستائیس اور اٹھائیس سال والے قول کی تائید مزید ہوتی ہے۔ (۱) صاحب حدائق وردیہ نے عتقی، کلبی، مصعب بن زبیر، اور اکثر طالبیین کے اقوال سے ثابت کیا ہے۔ کہ خلافت عثمان کے دور میں، شہزادہ علی اکبر کی ولادت باسعادت ہوئی۔[۱] کتاب مقتل الحسین للمقرم (ص ۲۹۴) میں بحوالہ کتاب انیس الشیعہ (مخطوط) لکھا ہے۔ کہ جناب شہزادہ کی ولادت گیارہ شعبان ۳۳ھ میں واقع ہوئی۔ اس طرح جناب شہزادہ کی عمر ستائیس سال قرار پاتی ہے۔ ابوالفرج اصفہانی نے بھی ان کی ولادت خلافت عثمان کے دور میں لکھی ہے۔[۲] اب اگر اسے اس خلافت کے آخری ایام میں بھی تسلیم کیا جائے۔ تب بھی پچیس سال تو بنتے ہی ہیں۔

چنانچہ جناب محدث نوری نور اللہ مرقدہ نے بھی اسی پچیس سال والے قول کو اختیار کیا ہے۔

شاہد دوم:۔ اکثر ارباب سیر و تراجم نے جناب شہزادہ کو علی اکبرؑ اور جناب امام زین العابدینؑ کو علی اصغر لکھا ہے۔ چنانچہ:

(۱) مؤرخ طبری نے (ج ۶، ص ۲۶۰) حمید بن مسلم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے علی بن الحسینؑ الاصغر کو دیکھا۔ جب کہ وہ بیمار تھے۔

(۲) ابن قتیبہ نے (معارف ص ۹۳ پر) لکھا ہے: ﴿ولد للحسین علی الاکبر امه بنت ابی مرة و علی الاصغر امه ام ولد﴾. (پھر ص ۹۴ پر) لکھا ہے: ﴿اما علیؑ بن الحسین الاصغر بلیس للحسین عقب الامنه﴾۔

(۳) اسی طرح دینوری نے (اخبار طوال ص ۲۵۴ پر) شہزادہ شہید کو علی اکبر قرار دینے کے بعد (ص ۲۵۶ پر) لکھا ہے: ﴿ولم ینج من اصحاب الحسین الا ابنه علی الاصغر﴾.

(۴) تاریخ یعقوبی (ج ۲ ص ۲۳) میں لکھا ہے: ﴿اما علی بن الحسین الاصغر بلیس للحسین عقب

---

[۱] ذخیرة الدارین، ص ۱۲۷۔ صاحب ابصار العین نے تو اس کے ساتھ ساتھ ان کا جناب امیر علیہ السلام سے روایت کرنا بھی ثابت کیا ہے۔ (ص ۲۳)۔ ابصار، طبع نجف۔

[۲] مقاتل الطالبیین ص ۵۶۔

الامة﴾۔

(۵) سبط ابن الجوزی نے (تذکرۃ الخواص ص ۱۵۶ پر) لکھا ہے کہ علی اکبرؑ اپنے والد ماجد کے ساتھ شہید ہو گئے۔

(۶) لواقح الانوار (ج ۱ ص ۲۳) میں لکھا ہے: ﴿کان للحسین من الاولاد علی الاکبر والعقب لعلی الاصغر﴾۔

(۷) تاریخ خمیس (جلد ۲ ص ۳۱۹) میں لکھا ہے۔ امام زین العابدین اپنے والد کے ہمراہ کربلا میں تھے۔ جو کہ علی اصغرؑ کے نام سے مشہور تھے۔ اور علی اکبرؑ اپنے والد کے ساتھ شہید ہو گئے۔

(۸) شبلنجی (نور الابصار ص ۱۳۷) میں لکھتے ہیں کہ علی اکبرؑ شہید ہو گئے اور علی اصغرؑ امام زین العابدین ہیں۔

(۹) ابن خلکان اپنی تاریخ میں امام زین العابدین کے حالات میں لکھتا ہے: ﴿یقال لزین العابدین علیؑ الاصغر ولیس للحسینؑ عقب الامنہ﴾۔

(۱۰) اسی طرح کامل ابن اثیر (ج ۴ ص ۳۰)

(۱۱) مروج الذہب مسعودی (ج ۳ ص ۱۹)

(۱۲) کتاب التنبیہ والاشراف (ص ۲۶۳)

(۱۳) شذرات الذہب (ج ۲ ص ۹۶)

(۱۴) فصول مہمہ ابن صباغ مالکی (ص ۱۸۱) میں جناب شہزادہ کو علی اکبرؑ اور امام زین العابدین کو علی اصغر لکھا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تمام عبارات والفاظ کا لب لباب یہی ہے کہ جناب علی اکبرؑ اپنے والد کے ساتھ کربلا میں شہید ہو گئے اور امام حسینؑ کی نسل ان کے شہزادے علی اصغر سے بڑھی۔ جن کو امام زین العابدینؑ کہا جاتا ہے۔ ان حقائق کے بعد اس تاویل کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ کہ ان کو علی اکبرؑ صرف اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ علی اصغرؑ (شہید کربلا) سے عمر میں بڑے تھے۔ جبکہ مؤرخین امام زین العابدینؑ کو اصغر اور شہزادہ کو ان کے بالمقابل اکبر لکھ رہے ہیں۔ بنابریں اٹھارہ سال والا قول بلا دلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

شاہد سیوم:۔ جس طرح اکثر علماء سیر وتراجم کا اس بات پر اتفاق ہے۔ جیسا کہ ابھی اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح ہمارے اکثر علمائے اعلام کا بھی اسی قول کی طرف رجحان ہے۔ چنانچہ: (۱) فاضل ابن ادریس حلیؒ نے سرائر میں بڑی شد و مد کے ساتھ اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔ (۲) جناب شیخ کفعمی اور (۳) حضرت شہید اول نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ (۴) نیز محدث نوری نے بھی اسی قول کی تقویت کی ہے۔ (۵) محدث قمی نے بھی اسی قول کو ھذا ھو الاصح الاشھر قرار دیا ہے۔ (نفس المہموم، ص ۱۶۶)۔ (۶) صاحب ذخیرۃ الدارین نے (ص ۳۷ پر)

اسی قول کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿و یلقب بالاکبر لانہ الاکبر علی اصح الروایات﴾ اور (۷) صاحب فرسان الہیجاء نے بھی (ج ا، ص ۲۸۷ پر) یہ کہہ کر اسی نظریہ کی صحت پر مہر تصدیق کی ہے کہ ﴿الاقوی و الاصح این است کہ عمر علی اکبرؑ بہنگام شہادت یا بیست و پنج یا بیست و ہشت بودہ است﴾۔ (۸) صاحب وقائع ایام محرم نے بھی (ص ۴۲۶ پر) اسی قول کی تائید مزید کی ہے۔ (۹) صاحب مقتل الحسینؑ نے بھی (ص ۲۹۴ پر) اسی قول کو اختیار کیا ہے: ﴿تقدم ابو الحسن علی الاکبر و عمرہ سبع و عشرون سنۃ﴾۔ (۱۰) صاحب مجاہد اعظم نے بھی (ص ۲۶۲، حصہ اوّل) پر بڑے شد و مد کے ساتھ اسی نظریہ کو ثابت کیا ہے۔ (۱۱) فاضل نراقی (حضرت ملا احمد) نے اپنی کتاب الخزائن، ص ۹۰، طبع ایران میں سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی اولاد امجاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "علی اکبر، و علی اوسط زین العابدین، و علی اصغر عبداللہ۔" (۱۲) فاضل سماوی نے اپنی کتاب ابصار العین فی انصار الحسین، ص ■ پر لکھا ہے: ﴿و لقب بالاکبر لانہ الاکبر علی اصح الروایات﴾ شہزادہ کا لقب اکبر ہے۔ کیونکہ صحیح روایات کی بنا پر آپ ہی بڑے ہیں۔

ان حالات میں اس نظریے کی صداقت بالکل بے غبار ہو جاتی ہے۔ کما لا یخفی

وجہ چہارم: ۔ کتاب الخرائج والجرائح جناب راوندی اور کفایۃ الاثر للخراز الرازی میں عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے روایت کی گئی ہے وہ بیان کرتا ہے کہ میں امام حسینؑ کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ کہ علی بن الحسینؑ الاصغر داخل ہوئے۔ امام علیہ السلام نے ان کو دیکھ کر ان کو دعائے خیر دی۔ اور فرمایا: ان کی دو آنکھوں کے درمیان علامت امامت ظاہر و ہویدا ہے۔ الخ

وجہ پنجم: ۔ بعض آثار سے خود امام زین العابدینؑ کا اقرار واضح و آشکار ہوتا ہے۔ کہ شہزادۂ شہیدان سے بڑے تھے۔ چنانچہ بعض کتب میں لکھا ہے۔ کہ جب یہ لٹا ہوا قافلہ دربار یزید میں پہنچا۔ تو یزید نے امام زین العابدینؑ سے دریافت کیا: ﴿ما اسمک ؟﴾ آپ کا نام کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿علیؑ﴾۔ ملعون نے کہا: ﴿او لم یقتل اللّٰہ علیاً﴾ کیا خدا نے علیؑ کو قتل نہیں کر دیا؟ امام نے فرمایا: ﴿قد کان لی اخ اکبر منی یسمّٰی علیا فقتلتموہ﴾ وہ میرا بڑا بھائی تھا جس کا نام علی تھا۔ جسے تم نے شہید کر دیا ہے۔[1] بموجب مثل مشہور لیس وراء عبادان قریۃ جب خود امام زین العابدینؑ کا فرمان بھی مل گیا۔ کہ شہزادہ شہیدان سے عمر میں بڑے تھے۔ تو آیا اب بھی مزید کسی ثبوت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ کہ شہزادہ شہید ہی فی الحقیقت اکبر اولاد حسینؑ تھے۔ و ھو الحق و الحق احق ان یتبع فماذا البعد الحق الا الضلال۔

---

[1] مقاتل الطالبین، ص ۸۸، طبع النجف۔

تیسرا امر: آیا شہزادہ علی اکبرؑ متاہل تھے یا نہ؟

آیا جناب شہزادہ علی اکبرؑ متاہل تھے یا مجرد؟ غالباً جناب محدث قمی قدس سرہ سے پہلے نفیاً یا اثباتاً علماء کرام اس سلسلہ میں متعرض نہیں ہوئے۔ غالباً سب سے پہلے محدث قمی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اور ثابت کیا کہ جناب شہزادہ متاہل تھے۔ ان کے گھر ایک ام ولد تھی۔ پھر ان کے بعد والے علماء بلکہ خود ان کے استاد محترم جناب محدث نوری نور اللہ مرقدہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا۔[1] اس نظریہ کے دلائل درج ذیل ہیں:

جناب شہزادہ کے متاہل ہونے کی پہلی دلیل

اس بات کی سب سے بڑی مضبوط دلیل فروع کافی کی صحیح السند روایت ہے۔ احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی بیان کرتے ہیں۔ کہ میں نے امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا: ﴿الرجل یتزوج المرئة و یتزوج ام ولد ابیھا فقال لا باس ا﴾ آیا یہ جائز ہے کہ ایک شخص بیک وقت ایک عورت سے اور اس عورت کے والد کی ام ولد کنیز سے شادی کرے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر میں نے عرض کیا: ﴿بلغنا عن ابیک ان علی بن الحسین علیھما السلام تزوج ابنة الحسن وام ولد الحسن علیه السلام و ذلک انّ رجلا من اصحابنا سئلنی ان اسئلک عنھا﴾ ہمیں آپ کے والد ماجد سے یہ روایت پہنچی ہے کہ جناب علی بن الحسینؑ (زین العابدینؑ) نے امام حسن مجتبیٰؑ کی دختر اور ان کی ام ولد کنیز سے شادی کی تھی؟ اور یہ سوال میں نے اس لئے کیا ہے۔ کہ ہمارے بعض اصحاب نے مجھے یہ کہا تھا۔ کہ آپ سے یہ مسئلہ دریافت کروں! امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لیس ھکذا انّما تزوج علی بن الحسین علیه السلام ابنة الحسن علیه السلام وام ولد لعلیؑ بن الحسینؑ المقتول عند کم... الخ﴾ حقیقت حال اس طرح نہیں۔ بلکہ اصل حقیقت اس طرح ہے۔ کہ امام زین العابدینؑ نے امام حسن علیہ السلام کی دختر (جناب فاطمہؑ) اور علی بن حسین شہید کی ام ولد سے ازدواج کیا تھا۔[2]

دوسری دلیل:۔ جناب شہزادہ علی اکبرؑ کی وہ زیارت جو بروایت یوسف کناسی حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔ اس میں یہ فقرہ بھی وارد ہے: ﴿صلی اللّٰہ علیک و علی اھلبیتک﴾[3] اس مطلب پر اس زیارت کی دلالت محتاج بیان نہیں ہے۔

---

[1] بشرطیکہ یہ ثابت ہو کہ محدث نوری نے کتاب تحیۃ الزائر، محدث قمی کی نفس المہموم کے بعد تالیف کی ہے ورنہ یہ شرف تقدم جناب محدث نوری کو حاصل ہوگا۔ (منہ عفی عنہ)

[2] فروع کافی، ج ۲، ص ۱۴۸، طبع لکھنؤ۔ بحار الانوار، ج ۱۱، ص ۳۲۔ مستدرک الوسائل، ج ۲، ص ۳۳۳ وغیرہ۔

[3] کامل الزیارۃ لابن قولویہ، ص ۲۴۰، باب ۷۹، طبع ایران۔ بحار، ج ۲۲، ص ۱۴۷۔

تیسری دلیل:۔ جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔ کہ واقعۂ کربلا کے وقت شہزادہ کی کم از کم پچیس سال عمر تھی۔ بنابریں یہ امر اہل بیتؑ کی خاندانی روایات کے خلاف ہے۔ کہ اس قدر عمر تک ان کی کوئی فرد تجرد کی زندگی بسر کرے جیسا کہ تتبع و استقراء سے ثابت ہے۔ بالخصوص جب یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے۔ کہ اسی خانوادۂ عصمت نے متاہلانہ زندگی پر بہت زور دیا ہے۔ اور مجردانہ زندگی بسر کرنے کی شدید مذمت فرمائی ہے۔ پھر خود کیونکر اس کی خلاف ورزی کر سکتے تھے؟

انہی وجوہ کی بنا پر علماء سیر و تراجم نے تصریحات فرمائی ہیں۔ کہ جناب شہزادہ مجرد نہ تھے بلکہ متاہل تھے۔

چنانچہ:

(۱) جناب شیخ عباس قمی فرماتے ہیں: ﴿اعلم انه يظهر من بعض الروايات و الزيارات ان له عليه السلام ولدًا و اهلا[1]﴾ جاننا چاہیے کہ بعض روایات و زیارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جناب شہزادہ کے اہل و عیال تھے۔ (بعد ازاں مذکورہ بالا روایت و زیارت نقل کی ہے)۔

(۲) صاحب وقائع الایام نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

(۳) فاضل محلاتی نے بڑی شد و مد کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿باید دانست این شهرت که علی اکبرؑ اولاد نداشت تهمت و افترا است. و مخالف با آداب و رسوم و شئون ملّی اسلامی است و البته سیرت اهل بیتؑ هرگز چنین نبوده که پسر بیست و هشت ساله را داماد نکنند﴾[3] "یعنی یہ کہنا کہ شہزادہ علی اکبر صاحب اولاد نہ تھے۔ سراسر تہمت ہے۔ یہ بات اسلامی آداب اور سیرت اہل بیتؑ کے خلاف ہے کہ ۲۸ سالہ جوان کی شادی نہ کی جائے۔"

(۴) ثقۃ المحدثین جناب محدث نوری قدس سرہٗ جناب شہزادہ کے پچیس یا اٹھائیس سالہ ہونے والے قول کی تقویت کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ﴿بنا برین پس آنچه بعض ذاکرین در مصیبت حضرت علی اکبرؑ میخوانند در ضمن نثر و نظم که مشعر است برانیکه ان حضرت داماد نگشته. از دنیا رفت. کلامی است بے اصل و بے وقع چه دوراست از سیرة خانوادۂ اهل بیت نبوتؐ که تا این مقدار از سن رادرک کنند و بدون تزویج بمانند. با آنهمه تحریصاتیکه بشیعیان خود می

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۶۷۔

[2] وقائع ایام محرم، ص ۳۳۳۔

[3] قرآن الجبار، ج ۱، ص ۲۹۳۔

کردند[1] یعنی جناب شہزادہ علی اکبرؑ کی مصیبت میں بعض ذاکرین نظم ونثر میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ہنوز جناب شہزادہ کا ازدواج نہ ہوا تھا۔ کہ راہیِ ملکِ بقا ہوگئے یہ بالکل بے اصل و بے حقیقت بات ہے۔ یہ بات خاندان نبوت کی سیرت کے خلاف ہے۔ کہ ایک شخص اس (کم از کم پچیس) سن وسال کا ہو جائے۔ اور ازدواج کے بغیر رہے۔ حالانکہ وہ اپنے شیعوں کو متاہلانہ زندگی بسر کرنے کی بہت تحریص وترغیب دلاتے تھے"۔ انہی چار شہادتوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

چوتھا امر: آیا جناب شہزادہ علی اکبرؑ کی والدہ ماجدہ واقعہ کربلا میں موجود تھیں؟

آیا جناب شہزادہ علی اکبرؑ کی والدہ ماجدہ جناب ام لیلیٰ واقعہ کربلا میں موجود تھیں یا نہ؟ اس سلسلہ میں متعدد کتب مقاتل وتراجم میں کوئی تصریح نظر قاصر سے نہیں گذری۔ اسی طرح کئی علماء کبار نے اس بات کا اعتراف واقرار کیا ہے۔ (۱) چنانچہ محدث قمیؒ رقمطراز ہیں: ﴿و اما امه علیه السلام هل کانت فی کربلا ام لا؟ لم اظفر بشئی من ذلک والله العالم[2]﴾۔ آیا جناب شہزادہ کی والدہ کربلا میں موجود تھیں۔ یا نہ؟ اس سلسلہ میں مجھے کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی۔ (۲) صاحب وقائع ایام محرم نے بھی بلا تبصرہ محدث قمی کا یہ قول نقل کردیا[3] ہے۔ جس سے ان کی تائید سکوتی مترشح ہوتی ہے۔ (۳) جناب محدث محلاتی نے بڑی فیصلہ کن بات تحریر فرمائی ہے: ﴿و اما بودن ام لیلیٰ در کربلا بلکہ زندہ بودن اولو در مدینہ تاکنوں بنظر نرسیدہ. و آنچہ راکہ می خوانند. امر کردن حسینؑ لیلیٰ راکہ درحق علی دعا کن. حاجی نوری می فرماید اصلی ندارد. وایں نسبت دروغ است و بسیارے از ارباب تواریخ وفات لیلی را قبل از واقعۂ کربلا نوشتہ اند. معلوم نیست در دنیا چقدر زندگانی کردہ است و الله العالم[4]﴾ یعنی جناب ام لیلیٰ کا کربلا میں بلکہ مدینہ میں بھی اس وقت زندہ ہونا کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ یہ جو (بعض اہل منبر) پڑھتے ہیں۔ کہ جب شہزادہ جنگ کررہے تھے۔ تو امام حسینؑ نے جناب ام لیلیٰ کو حکم دیا۔ کہ بیٹے کے حق میں دعا کرو۔ جناب حاجی نوری فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اور یہ امامؑ پر افتراء ہے۔ بہت سے ارباب تاریخ نے واقعہ کربلا سے پہلے ان کی وفات کا تذکرہ کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ کس قدر دنیا میں زندہ رہیں۔"

(۴) جناب محدث نوری قدس سرہٗ نے لؤلؤ ومرجان میں بڑے زور سے مذکورہ بالا واقعہ کی رد فرمائی ہے۔ ان حقائق سے بعض اہل منبر کی ان تمام دروغ بافیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ جو جناب شہزادہ علی اکبرؑ اور ان کی

---

[1] تحیۃ الزائر۔
[2] نفس المہموم، ص ۱۶۷۔
[3] وقائع ایام محرم، ص ۳۳۳۔
[4] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۸۷۔

والدۂ ماجدہ کے بارے میں کیا کرتے ہیں۔ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

جناب شہزادہ علی اکبر کی شہادت کی تفصیل

بہرحال جب امام عالی وقارؑ کے تمام اعوان و انصار شربت شہادت نوش کر کے دارالقرار کا سفر اختیار کر چکے۔ اور اب سوائے جوانان بنی ہاشم کے اور کوئی مددگار نہ رہا۔ تو سب سے پہلے شبیہ پیغمبرؐ جناب شہزادہ علی اکبرؑ نے خدمت امام میں حاضر ہو کر اذن جہاد طلب کیا۔ کتب مقاتل و تواریخ سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام نے اپنے لاڈلے بیٹے کو میدان موت کی طرف بھیجنے میں دیر و درنگ تو نہیں فرمائی۔ مگر آپؑ کے باطنی جذبات میں جو تلاطم اور قلب حزیں میں جو اضطراب رونما ہوا ہے۔ وہ آپ کے ان کلمات سے ٹپک رہا ہے جو آپؑ نے شہزادہ کی روانگی کے وقت زبان پر جاری فرمائے۔ یا ان کیفیات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے جو آنجناب پر رونما ہوئے۔

میدان کارزار کی طرف روانگی

جناب ابن طاؤس نے لکھا ہے کہ جب شہزادہ نے اذن جہاد طلب کیا تو ﴿نظر الیہ نظر آیس منہ و ارخی علیہ السلام عینیہ و بکی﴾ امام نے اپنے فرزند پر ایک مایوسانہ نظر ڈالی۔ اور پھر رو پڑے۔[1] پھر جیسا کہ ناسخ التواریخ میں لکھا ہے امام نے اپنے ہاتھ مبارک سے شہزادہ کو اسلحہ جنگ پہنایا۔ حضرت امیر علیہ السلام سے جو فولادی خود ورثہ میں ملا تھا۔ وہ سر پر رکھا۔ زرہ جسم پر اوڑھائی۔ کمر بند سے کمر مضبوط باندھی۔ تلوار پہلو میں لٹکائی۔ اور عقاب نامی گھوڑے پر سوار کر کے میدان جنگ کی طرف روانہ کیا۔[2]

لیکن فاضل شہرستانی نے النہضۃ الحسینیۃ (ص ۱۰۳ پر) لکھا ہے: ﴿اما الغلام فقد تجلّی علی القوم بوجہ رسول اللّٰہ و عمامۃ رسول اللّٰہ و اسلحۃ رسول اللّٰہ و علی فرس رسول اللّٰہ﴾ یعنی شہزادہ اس شان کے ساتھ قوم اشقیاء کے سامنے آیا۔ کہ چہرہ تھا تو رسولؐ خدا کا، عمامہ تھا تو رسولؐ خدا کا۔ اسلحہ جنگ تھا تو رسولؐ خدا کا۔ سواری کا گھوڑا تھا تو رسولؐ خدا کا۔ اور گفتار تھی تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔" بہرکیف جب اس حالت میں شہزادہؑ میدان کارزار کی طرف روانہ ہونے لگا۔ تو سرکار سید الشہداءؑ نے اشک آور آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف منہ کر کے بارگاہ ایزدی میں یوں عرض کیا: ﴿اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلٰی هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَیْهِمْ غُلَامٌ اَشْبَهُ النَّاسِ خَلْقًا وَ خُلُقًا وَ مَنْطِقًا بِرَسُوْلِکَ وَ کُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰی نَبِیِّکَ نَظَرْنَا اِلَیْهِ (اِلٰی وَجْهِهٖ)﴾ بارالہا! اس قوم جفاکار کے ظلم و جور پر گواہ رہنا کہ اب ان کی طرف وہ جوان جا رہا ہے جو شکل و صورت اور

---

[1] لہوف، ص ۹۹۔ [2] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۸۱۔

سیرت و کردار میں سب لوگوں سے زیادہ تیرے نبیؐ کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا اور جب ہم تیرے رسول کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے۔ تو اس کے چہرہ پر نگاہ کر لیتے تھے“ انہی فقروں سے امام علیہ السلام کے قلبی تاثرات و جذبات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد باواز بلند عمر بن سعد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿مالک قطع اللّٰہ رحمک ولا بارک اللّٰہ فی امرک و سلّط علیک من یذبحک بعدی علی فراشک کما قطعت رحمی ولم تحفظ قرابتی من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و الہ﴾ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ خدا تیرے رحم کو قطع کرے اور تجھے اپنے معاملات میں برکت نہ دے۔ اور میرے بعد تجھ پر ایسے شخص کو مسلط کرے جو تجھ کو تیرے بستر پر ذبح کرے۔ جس طرح تو نے مجھ سے قطع رحمی کی ہے۔ اور میری قرابت داری رسول کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے۔“

جب شہزادہ میدان جنگ کی طرف بڑھا۔ تو امام علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَ نُوحًا وَ آلَ إِبْرٰهِيمَ وَ آلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ ذُرِّيَّةً
بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (سورۂ آل عمران، آیت ۳۳و۳۴)

شہزادہ نامدار خورشید خاور کی طرح خیام حسینؑ کے افق سے میدان کارزار پر طالع ہوا۔ اور یہ رجز پڑھتے ہوئے مبارز طلبی کی۔

نحن وبیت اللّٰہ اولیٰ بالنبیؐ (ن ل)

انا علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ	من عصبة جدُّ ابیهم النبیؐ
واللّٰہ لا یحکم فینا ابن الدعی	اطعنکم بالرمح حتی ینثنی
اضربکم بالسیف احمی عن ابی	ضرب غلام هاشمی علوی

شہزادہ کا جہاد

شہزادہ نے ہر چند مبارز طلبی کی۔ مگر قوم جفاکار سے کوئی شخص اس شیر بیشۂ شجاعت کے مقابلہ میں نہ نکلا۔ یہ حالت دیکھ کر شجاعت علویہؑ کے وارث نے تلوار میان سے کھینچ کر قوم اشقیاء پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کر دیا۔ اور ناریوں کو مولیوں گاجروں کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ جدھر کا رخ کرتے کشتوں کے پشتے لگا دیتے۔ جناب شیخ مفید نے لکھا ہے۔ کہ ﴿اهل الکوفة یتقون قتله و قتاله﴾ اہل کوفہ آپؑ کے قتل و قتال سے کنی کتراتے تھے۔ (الارشاد، ص۲۶۰)۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ﴿من کثرة من قتل منهم﴾ دشمن اپنے مقتولین کی کثرت سے بلبلا اٹھے۔ حتی کہ بار بار کے ان تابڑ توڑ حملوں میں بعض روایات کے مطابق ایک سو بیس ناریوں کو واصل جہنم کر دیا۔ اس اثنا میں جناب کے جسم نازنین پر کافی زخم لگ چکے تھے۔ پیاس کا شدید غلبہ تھا۔ گھوڑے کی باگیں موڑیں اور خونی لباس پہنے

زخموں سے چور امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ﴿یا اَبَۃَ الْعَطَشُ قَدْ قَتَلَنِی وَ ثِقْلُ الْحَدِیْدِ اَجْھَدَنِی فَھَلْ اِلٰی شَرْبَۃٍ مِنَ الْمَاءِ سَبِیْلٌ اَتَقَوّٰی بِھَا عَلَی الْاَعْدَاءِ﴾ بابا جان! مجھے پیاس نے مار دیا ہے۔ اور ہتھیاروں کے بوجھ نے تھکا دیا ہے۔ کیا تھوڑا سا پانی دستیاب ہو سکتا ہے؟ تا کہ میں اس سے (تازہ دم ہو کر) دشمنوں سے لڑنے کے لئے تقویت حاصل کروں"۔

امام علیہ السلام نے جب اپنے جواں سال بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو نہایت بے کسی کے عالم میں رو کر فرمایا: ﴿وَ اغَوْثَاہُ یَا بُنَیَّ مِنْ اَیْنَ آتِیْ لَکَ بِالْمَاءِ قَاتِلْ قَلِیْلًا فَمَا اَسْرَعَ اَنْ تَلْقٰی جَدَّکَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ فَیَسْقِیْکَ بِکَاسِہِ الْاَوْفٰی شَرْبَۃً لَا تَظْمَاءُ بَعْدَہٗ اَبَدًا﴾ ہائے افسوس بیٹا! میں کہاں سے تمہارے لئے پانی لاؤں؟ بیٹا تھوڑی دیر اور جہاد کرو۔ بہت جلد اپنے جد نامدار سے ملاقات کرو گے۔ اور وہ تمہیں (شراب طہور کا) وہ جام پلائیں گے۔ کہ اس کے بعد پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی۔

بروایتے فرمایا: ﴿یَا بُنَیَّ یَعِزُّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَ عَلٰی عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْھِمُ السَّلَامُ اَنْ تَدْعُوْھُمْ فَلَا یُجِیْبُوْکَ یَا بُنَیَّ ھَاتِ لِسَانَکَ﴾۔ بیٹا حضرت محمد مصطفیٰؐ و علی مرتضیٰؑ پر یہ بات بہت ہی شاق ہے کہ تم ان کو پکارو اور وہ تمہیں جواب نہ دیں۔ بیٹا اپنی زبان میرے منہ میں دیدو۔ نیز اپنی ایک انگشتری ان کو عنایت کی۔ اور فرمایا اسے چوسو اس سے کچھ تسکین ہو جائے گی۔ چنانچہ شہزادہ نے واپس میدان کارزار میں لوٹ کر یہ رجز پڑھتے ہوئے پھر شجاعت ہاشمیہ کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔

الحرب قد بانت لنا الحقائق	و ظھرت من بعد ھا مصادق
واللّٰہ رب العرش لا نفارق	جموعکم او تغمد البوارق

اور دائیں بائیں بڑھ بڑھ کے حملے شروع کئے۔ یہاں تک کہ مزید اسی (۸۰) دشمنان خدا اور رسول کو واصل جہنم کیا۔

شہادت

اس طرح جب پورے دو سو ناریوں[1] کو واصل جہنم کر چکے۔ تو مرۃ بن منقذ عبدی نے شہزادہ کو دیکھ کر قسم کھائی ﴿علی اثام العرب. ان مربی یفعل مثل ما کان یفعل ان لم اثکلہ اباہ﴾ مجھ پر تمام عرب کے گناہوں کا بوجھ ہو۔ اگر یہ شہزادہ اسی طرح حملہ کرتے ہوئے میرے پاس سے گذرے۔ اور میں اس کے والد کو اس کے سوگ میں نہ بٹھا دوں۔

---

[1] شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے آپ کے مقتولین کی تعداد چوالیس (۴۴)۔ صاحب مناقب نے ستر (۷۰) اور سید محمد بن ابی طالب نے پورے دو سو (۲۰۰) لکھی ہے۔ و ھو المشھور. و اللّٰہ العالم۔ (منہ عفی عنہ)

چنانچہ شہزادہ جنگ کرتے کرتے جب اس شقی کے پاس سے گذرا تو بروایت مقاتل الطالبین اس ملعون نے جناب شہزادہ کے گلوئے اقدس میں تیر مارا۔ اور بروایت مناقب چھپ کر پشت مبارک پر نیزہ مارا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اس شقی نے جناب کے سر اقدس پر اس زور سے تلوار ماری۔ کہ شہزادہ کا سر اقدس شگافتہ ہوگیا اور ان کیلئے اب زین پر سنبھلنا مشکل ہوگیا چنانچہ شہزادہ نے اپنی باہیں گھوڑے کے گلے میں ڈال دیں سوئے اتفاق سے گھوڑا ان کو لشکر اعدا کی طرف لے گیا۔ ظالموں نے شہزادہ کو بے دست و پا دیکھ کر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ (قطعوہ باسیافھم اربا اربا) ابھی کچھ رمق حیات باقی تھے۔ کہ زین فرس سے فرش زمین پر گرتے ہوئے بابا کو آواز دی: ﴿یـا ابتـاہ علیک السـلام. ھذا جدی رسـول اللّٰہ قد سقانی بکاسہ الاوفی شربۃ لا اظماء بعدۃ ابداً و ھو یقرئک السلام و یقول لک عجل القدوم الینا﴾ بابا جان! میرا (آخری) سلام قبول ہو۔ یہ میرے جد امجد جناب رسولؐ خدا ہیں۔ انہوں نے مجھے ایسا جام پلایا ہے۔ کہ اب مجھے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ اور وہ فرما رہے ہیں۔ کہ آپ بھی جلدی آئیں۔ اس کے بعد شہزادہ نے دم توڑ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

جواں مرگ بیٹے کی لاش پر بے کس باپ کی آمد

جب بے کس باپ نے اپنے بے بس شہزادہ کا آخری سلام سنا۔ تو فوراً افتاں و خیزاں شہزادہ کی لاش مقدس پر پہنچے اور ﴿وضـع خـدہ عـلـی خـدہ ثم انھملت عیناہ بالدموع ثم قال عَلَی الدُّنْیَا بَعْدَکَ الْعَفَا﴾ اپنا رخسارہ شہزادے کے رخسارے پر رکھ دیا۔ اور زار و قطار روتے ہوئے فرمایا۔ بیٹا! تیرے بعد اب زندگانی دنیا پر خاک ہے۔" پھر فرمایا: ﴿یَا بُنَیَّ لَقَدِ اسْتَرَحْتَ مِنْ ھَمِّ الدُّنْیَا وَ غَمِّھَا وَ بَقِیَ اَبُوْکَ فَرِیْدًا﴾ بیٹا تم دنیا کے ہم و غم سے نجات پا گئے۔ لیکن تمہارا باپ یک و تنہا رہ گیا ہے" بعض ارباب مقاتل کے بیان کے مطابق امام شہزادہ کا سر مبارک گود میں لے کر ان کے چہرۂ انور سے خون صاف کرتے جاتے تھے۔ اور رو رو کر رخ مبارک پر بوسہ دیتے ہوئے یہ بھی فرماتے جاتے تھے: ﴿یَا بُنَیَّ لَعَنَ اللّٰہُ / قتل اللّٰہ قَوْمًا قَتَلُوْکَ. مَا اَجْرَاَھُمْ عَلَی النَّارِ وَ عَلَی انْتِھَاکِ حُرْمَۃِ الرَّسُوْلِ﴾۔ بیٹا! خدا اس قوم جفاکار کو غارت کرے۔ جس نے تجھے شہید کیا۔ انہیں کس چیز نے آتش جہنم میں داخل ہونے پر اور حرمت رسول کی ہتک کرنے پر جرأت دلائی؟ صاحب روضۃ الصفاء کا بیان ہے کہ ﴿رفع الحسین صوتہ بالبکاء ولم یسمع احد الی ذلک الزمان صوتہ بالبکاء﴾ ہم شکل پیغمبر شہزادہ کی شہادت کا امام علیہ السلام پر اس قدر اثر ہوا۔ کہ بلند آواز سے گریہ و بکا فرمایا۔ حالانکہ اب تک ان کے گریہ کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ بعد ازاں جوانان بنی ہاشم کو حکم دیا۔ کہ شہزادہ کی لاش خیام کی طرف اٹھا لائیں۔[1]

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔ مگر مناقب کی روایت کے مطابق خود اٹھا کر لائے۔ ج ۴، ص ۹۷، طبع بمبئی۔

صاحب دمعۂ ساکبہ نے بعض کتب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب جناب سید الشہداءؑ باچشم و دل گریاں و بریاں خیمہ میں داخل ہوئے۔ تو امامؑ کی یہ حالت زار دیکھ کر جناب سکینہ نے دوسری پردگیان عصمت وطہارت سے آگے بڑھ کر عرض کیا: ﴿مالی اراک تنعی نفسک و تدیر طرفک این اخی علی؟﴾ بابا جان! آپ کی حالت کیوں دگرگوں ہے؟ اور پریشان ہو کر ادھر ادھر کیوں دیکھتے ہیں؟ میرا بھائی علی کہاں ہے؟

امامؑ نے فرمایا: ﴿قتلوہ اللئام﴾ بیٹی! قوم اشقیاء نے انہیں شہید کر دیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ بی بی نے وااخاہ وامہجۃ قلباہ کے جگر خراش بین کرتے ہوئے خیمہ سے باہر قدم رکھنا چاہا۔ مگر امامؑ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اتقی اللہ واستعملی الصبر﴾ بیٹی سکینہ! خدا سے ڈرو۔ اور صبر کرو۔ بی بی نے عرض کیا: ﴿یا ابتاہ کیف تصبر من قتل اخوھا و شرد ابوھا﴾ بابا جان! بھلا جس بی بی کا بھائی شہید ہو جائے۔ اور باپ بے یار و مددگار اور وطن سے دور ہو جائے۔ وہ کیونکہ صبر کر سکتی ہے؟ امامؑ نے بی بی کا کلام حزن التیام سن کر فرمایا: ﴿انا للہ و انا الیہ راجعون﴾[1]۔

اسی مخدرہ کے جگر خراش حالات سے دوسری مخدرات عصمت وطہارت کی گریہ وزاری اور پریشان حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اولاد عقیل بن ابی طالب کی قربانیاں

(۲) جناب عبداللہ بن مسلمؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ کی شہادت

یہ وہی عبداللہ بن مسلم ہیں جو بہت سے ارباب مقاتل کے نزدیک میدان کربلا میں خانوادہ ہاشمیہ میں سے پہلے شہید ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں اس اختلاف پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ جناب عبداللہ کے والد ماجد حضرت مسلم بن عقیل شہید کوفہ اور والدہ ماجدہ جناب رقیہ بنت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔ اس طرح یہ جناب سید الشہداءؑ کے چچازاد بھائی کے فرزند ہونے کے علاوہ آنجنابؑ سید الشہداءؑ سے نسبی قرابت بھی رکھتے ہیں (فراجع) انہی وجوہ کی بنا پر امامؑ کو آپ سے خاص قلبی لگاؤ تھا۔

صاحب بحر المصائب نے لکھا ہے: ﴿علی ما نقل عنہ﴾[2] کہ جب جناب عبداللہ بن مسلم نے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اذن جہاد طلب کیا۔ تو آنجناب نے فرمایا تمہارے لئے اپنے والد مسلم کی شہادت کافی ہے جسے

---

[1] ارشاد، ص ۲۴۰۔ مناقب، ج ۳، ص ۹۷۔ عاشر بحار، ص ۲۰۲۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۳۹۔ نفس المہموم، ص ۱۹۵۔ وقائع ایام محرم، ص ۳۹۱۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۶۲۔ تظلم الزہراء، ص ۱۹۵۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۷۔ قمقام، ص ۳۶۲۔ لہوف، ص ۱۰۰۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔ شافیہ شرح ابی فراس، ص ۱۴۱ وغیرہ۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۵۵۔ تاریخ، ج ۲، ص ۲۴۹۔

بہت عرصہ نہیں گذرا۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ کہ تم اپنی ضعیف والدہ کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ جناب عبداللہ نے عرض کیا۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ دار جاودانی کے عوض دار فانی کو اختیار کروں؟ بالآخر عبداللہ کے اصرار سے متاثر ہو کر امام نے اذن جہاد مرحمت فرمایا۔ اور جناب عبداللہ یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان کارزار میں تشریف لے گئے۔

الیوم القی مسلماو هوابی　　و فتیة با دوا علی دین النبیؐ

لیسوا بقوم عرفو ابالکذب　　لکن خیار و کرام النسب

من هاشم السادات اهل الحسب

پھر بڑھ بڑھ کر تین حملے کیے۔ اور بقول صاحب لواعج الاشجان تین افراد کو ہلاکت ابدی کے گھاٹ اتارا۔ (ص ۱۳۸) اور صاحب مناقب[1] کے بیان کے مطابق اٹھانوں (۹۸) ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ اسی اثنا میں عمرو بن صبیح صدائی نے تیر سے آپ کی پیشانی کو تاکا۔ شہزادہ نے بتقاضائے طبیعت ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ تیر اس زور سے لگا۔ کہ ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب عبداللہ کا ہاتھ پیشانی کے ساتھ پیوست ہو گیا۔ تو عبداللہ نے بارگاہ ایزدی میں یوں عرض کیا اللهم انهم استقلو ناواستذلونا اللهم فاقتلهم کما قتلونا واذلهم کما استذلونا '' خداوندا ان لوگوں نے ہمیں کمزور سمجھ کر ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بارالہا! انہیں اسی طرح قتل کر جس طرح انہوں نے ہمیں قتل کیا ہے اور ان کو ذلیل و خوار کر۔ ایک دوسرے ظالم (یزید بن رقاد الجہنی)[2] نے آپ کے سینہ پر نیزہ مارا۔ جو دل میں لگا۔ جس سے شہزادہ جانبر نہ ہو سکا۔ اور شہادت پائی۔ ظالم تیر انداز نے آپ کی شہادت کے بعد تیر کو کھینچنا چاہا۔ مگر پھل پیشانی میں ٹوٹ گیا۔[3] اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

آل ابی طالبؑ کا یکبارگی حملہ

بعض ارباب سیر و مقاتل نے لکھا[4] ہے کہ جناب عبداللہ بن مسلم کی شہادت کے بعد اولاد ابی طالب نے ایک ساتھ قوم اشقیاء پر حملہ کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر جناب امام عالی مقام نے فرمایا: ﴿صبراً علی الموت! بنی عمومتی واللّٰہ لا رایتم هواناً بعد هذا الیوم ابداً﴾ (ملہوف، ص ۱۰۱) و (مقتل خوارزمی، ج ۲، ص ۲۸) اے

---

[1] مناقب شہر ابن آشوب، ج ۴، ص ۹۸۔

[2] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۵۹۔ اس بیان سے اس اختلاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جو جناب عبداللہ بن مسلم کے قاتل کے بارے میں ہے کہ آیا عمرو بن صبیح ہے یا یزید بن رقاد؟ صحیح یہ ہے کہ دونوں آپ کے قتل میں شریک ہیں۔ عمرو نے تیر مارا۔ اور یزید نے نیزہ۔

[3] ارشاد، ص ۲۶۱۔ نفس المہموم، ص ۱۶۸۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۸۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۶۰۔ فرسان الہیجا، ج ۱، ص ۲۵۵۔ مقتل الحسین، ص ۳۰۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔

[4] مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۰۴۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۶۲۔ شہید انسانیت، ص ۳۹۸۔ طبری وغیرہ۔

میرے چچا کے بیٹو! موت پر صبر کرو۔ آج کے بعد کبھی ذلت نہ دیکھو گے۔ اور متعدد دشمنان خدا و رسول کو دارالبوار میں پہنچانے کے بعد درج ذیل حضرات نے بھی شربت شہادت نوش کیا:

(۱) عونؑ بن عبداللہ بن جعفر طیارؑ۔ (۲) ان کے بھائی محمدؒ بن عبداللہؒ۔ (۳) عبدالرحمٰنؒ بن عقیلؑ۔ (۴) ان کے بھائی جعفر بن عقیلؑ۔ (۵) محمدؒ بن مسلمؑ بن عقیلؑ۔ امام حسن مجتبیٰ کے صاحبزادے حسن مثنیٰ کو اٹھارہ زخم لگے۔ اور دایاں ہاتھ بھی قلم ہوگیا۔ مگر شہید ہونے سے بچ گئے[۱] مگر ہم قول مشہور و منصور کی اتباع کرتے ہوئے ذیل میں واقعاتی ترتیب کے مطابق بطور مبارزت طلبی ان بزرگواروں کی شہادت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۳) محمدؒ بن مسلمؑ بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ کی شہادت

آپ کی والدہ ماجدہ ام ولد تھیں۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر کل بارہ یا تیرہ برس تھی۔ جب اپنے بھائی عبداللہ بن مسلمؑ کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا تو بے تاب ہوگئے۔ اذن جہاد لے کر میدان میں تشریف لائے۔ اور سخت نبرد آزمائی کے بعد ابو مرہم (جرہم) ازدی اور لقیط بن ایاس جہنی کے ہاتھ سے جام شہادت نوش فرمایا۔[۲]

(۴) جعفر بن عقیلؑ بن ابی طالبؑ کی شہادت

جناب جعفر حضرت عقیلؑ کے چشم و چراغ ہیں۔ والدہ ماجدہ کا نام خوصا، کنیت ام الثغر بنت عمرو بن عامر کلابی ہیں۔[۳] جناب محمد بن مسلم کی شہادت کے بعد جناب جعفر یہ رجز پڑھتے ہوئے۔ شعلۂ نار کی طرح لشکر اشرار پر ٹوٹ پڑے۔

انا الغلام الابطحی الطالبی — من معشر فی ھاشم و غالب

ونحن حقاً سادۃ الذوائب — ھذا حسین اطیب الاطائب

من عترۃ البر التقی الثاقب

پھر شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے بنا بر مشہور پندرہ ناریوں کو دارالبوار میں پہنچانے کے بعد خود بشر بن حوط ہمدانی ملعون اور بروایتے عروہ بن عبداللہ خثعمی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔[۴]

۱۔ مقتل الحسین، ص ۲۰۲۔

۲۔ عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۸۔ فرسان الہیجا، ج ۲، ص ۶۰۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۶۰۔ مقاتل الطالبین، ص ۶۲ وغیرہ۔

۳۔ فرسان الہیجا، ج ۱، ص ۵۶۔

۴۔ فرسان الہیجا، ج ۱، ص ۵۶۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۵۶۔ عاشر بحار الانوار، ص ۱۹۹۔ قمقام زخار، ص ۳۶۶۔ ناسخ التواریخ، ج ۲، ص ۲۶۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۸۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔ مقاتل، ص ۶۶ وغیرہ۔

(۵) عبدالرحمٰن بن عقیل بن ابی طالب کی شہادت

جناب عبدالرحمٰن کے والد ماجد جناب عقیل اور والدہ ام ولد ہیں۔ جعفر بن عقیل کی شہادت کے بعد آپ اذن جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں تشریف لے گئے۔

ابی عقیل فاعرفوا مکانی	من ھاشم و ھاشم اخوانی
کھول صدق سادۃ الاقران	ھذا حسین شامخ البنیان
و سید الشیب مع الشبان	وسید الشباب فی الجنان

پھر سخت جنگ کی۔ یہاں تک کہ لشکر اشرار کے سترہ (۱۷) ناہنجاروں کو دارالبوار میں پہنچانے کے بعد عثمان بن خالد جہنی اور بشر بن حوط ہمدانی کے ہاتھوں شہادت کے درجۂ عالیہ پر فائز ہوئے[۱]

(۶) محمد بن ابی سعید بن عقیل بن ابی طالب کی شہادت

بعض ارباب مقاتل کا خیال ہے کہ جناب محمد بن ابی سعید بن عقیل واقعۂ کربلا میں سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ میدان کارزار میں گئے۔ اور جہاد کرتے ہوئے لقیط بن ایاس جہنی ملعون کے تیر سے رہسپار ملک بقا ہوئے۔[۲]

اولادِ جعفر طیارؑ کی قربانیاں

(۷) محمد بن عبداللہ بن جعفر طیارؑ کی شہادت

آپ امام علیہ السلام کے چچازاد بھائی جناب عبداللہ بن جعفرؑ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاضل عاملی نے لواعج الاشجان (ص ۱۳۹) میں عقیلۂ بنی ہاشم جناب زینبؑ بنت امیرالمومنینؑ ذکر کیا ہے۔ اس طرح آپ جناب عونؑ بن عبداللہ کے سگے بھائی قرار پاتے ہیں اور امام کے بھانجے لیکن دیگر ارباب سیر و مقاتل کے بیان کے مطابق آپ جناب عونؑ کے مختلف البطن بھائی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام خوصاء بنت حفص بن ثقیف ہے۔ جو بکر بن وائل کے قبیلہ سے تھیں۔[۳] ان کو خود جناب عبداللہ نے اپنی نیابت میں ان کے دوسرے بھائی عونؑ کے ساتھ مکہ سے امام کی روانگی کے بعد بھیجا تھا۔ جو پہلی منزل پر آکر شریک قافلۂ حسینی ہو گئے تھے۔

۱۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۳۵۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۵۷۔ بحارالانوار، ج ۱۰، ص ۱۹۹۔ مناقب شہر ابن آشوب، ج ۲، ص ۹۶۔ نفس المہموم، ص ۱۲۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۹۔

۲۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۶۰۔ عاشر بحارالانوار، ص ۲۰۰۔ قمقام زخار، ص ۳۶۲۔

۳۔ قمقام، ص ۳۹۷۔ نفس المہموم، ص ۱۹۹۔ فرسان، ج ۲، ص ۵۹۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۵۵۔ مقاتل، ص ۶۵۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۸۔

بہر حال اولاد عقیل کی قربانیوں کے بعد اولاد عبداللہ بن جعفر طیار نے میدان کارزار کا رخ کیا۔ اور سب سے پہلے جناب محمد بن عبداللہ اذن جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں تشریف لے گئے۔

اشکو الی اللہ من العدوان　　　　فعال قوم فی الردیٰ عمیان

قد بدلو امعالم القرآن　　　　و محکم التنزیل والتبیان

واظہر والکفر مع الطغیان

پھر مسلسل کئی حملے کر کے دس (۱۰) ناریوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد عامر بن نہشل تیمی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔[1]

(۸) عونؑ بن عبداللہ بن جعفر الطیار کی شہادت

بنا بر مشہور آپ کی والدہ ماجدہ عقیلہ قریش جناب زینب بنت علی علیہ السلام ہیں۔ اس طرح آپ امام حسین علیہ السلام کے حقیقی بھانجے ہوتے ہیں۔ اور بنا بریں کہ شہزادہ محمد کی والدہ جناب عقیلہ نہ ہوں۔ آپ محمد بن عبداللہ کے مختلف البطن بھائی ہیں۔ اپنے بھائی محمد کی شہادت کے بعد اذن جہاد حاصل کر کے یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان وغا میں نکلے۔

ان تنکرونی فان ابن جعفر　　　　شہید صدق فی الجنان ازہر

یطیر فیہا بجناح اخضر　　　　کفیٰ بہذا شرفاً فی المحشر

پھر داد شجاعت وشہامت دیتے ہوئے تین سواروں اور اٹھارہ پیادوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد خود شہادت کے درجہ رفیعہ پر فائز ہوئے۔ عبداللہ بن قطبہ طائی نے آپ کو شہید کیا۔[2]

اولاد امام حسنؑ کی قربانیاں

(۹) شہزادہ قاسمؑ بن حسنؑ بن علی علیہ السلام کی شہادت

جناب عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی اولاد کے بعد جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ افضل التحیۃ والثنا کی اولاد امجاد نے قربان گاہ کربلا میں اپنی عدیم النظیر قربانیاں پیش کیں۔ سب سے پہلے جناب شہزادہ قاسم میدان میں آئے شہزادہ قاسم حضرت امام حسن علیہ السلام کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی والدہ ام ولد ہیں۔ جن کا اسم گرامی برملہ تھا۔ اور صاحب

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۵۶۔ فرسان الہیجا، ج ۲، ص ۵۹۔ عاشر بحار الانوار، ص ۲۰۰۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔ مناقب، ج ۳، ص ۲۶۔ مقاتل، ص ۶۵ وغیرہ۔

[2] لواعج الاشجان، ص ۱۳۹۔ نفس المہموم، ص ۱۶۸۔ قمقام، ص ۳۶۷۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔ مقاتل الطالبیین، ص ۶۳ وغیرہ۔

فرسان الہیجاء (ج ۲ ص ۲۶) کے بیان کے مطابق واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔ شب عاشورا کے واقعات میں وہ واقعہ لکھا جا چکا ہے۔ جس میں جناب شہزادہ کا نصرت امام و تائید حق میں اشتیاق موت کا تذکرہ موجود ہے۔ ان کی شہادت کا تذکرہ کرنے سے پہلے یہاں چند امور مہمہ کی تحقیق و تنقیح نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

چند امور کی تنقیح

امر اول:۔ یہ ہے کہ شہادت کے وقت شہزادہ کی عمر کیا تھی؟ سن و سال کی حتمی تعیین کے متعلق تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ کتب سیر و تواریخ میں ایسی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ اکثر علماء محققین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ جناب ہنوز سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ علامہ مجلسی فرماتے ہیں: ﴿**وهو غلام صغير لم يبلغ الحلم**﴾[1] شہزادہ چھوٹا لڑکا تھا۔ جو سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ ایسی ہی تصریحات فاضل قزوینی نے تظلم الزہراء (ص ۱۹۵) میں اور فاضل عاملی نے لواعج الاشجان (ص ۱۳۰) میں اور محدث محلاتی نے فرسان الہیجاء (ج ۲ ص ۲۶) میں اور جناب فاضل نجفی نے مقتل الحسینؑ (ص ۳۰۶) میں فرمائی ہیں۔ ناسخ میں لکھا ہے: ﴿**قاسم باتفاق علمائے سیر حدود تکلیف را مالك و مشرف نبود**﴾ (ناسخ، ج ۶، ص ۲۷۳) ان تصریحات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ جناب قاسم ہنوز بالغ نہ تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ عمر بارہ تیرہ برس تھی۔

شہزادہ قاسمؑ کے عقد کی تحقیق

امر دوم:۔ آیا شہزادہ قاسمؑ کی بوقت شہادت شادی ہو چکی تھی یا نہ؟ یہ مسئلہ مدت سے معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے جس پر بعض مقامات پر ہنگامہ خیز بحثیں ہو چکی ہیں۔ اور اس کی نفی اور اثبات پر متعدد مستقل رسائل لکھے جا چکے ہیں۔ مدت ہوئی بدقسمتی سے متحدہ ہندوستان میں اس مسئلہ نے بعض علمی خانوادوں میں ذاتی وقار کی حیثیت اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے یہ مسئلہ مزید الجھ کر رہ گیا۔ حالانکہ اگر ہر قسم کے گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر اس مسئلہ پر معمولی سا بھی غور و فکر کیا جائے۔ تو یہ امر روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے۔ کہ ازدواج قاسمؑ کا قصہ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اور اس کے وجوہ درج ذیل ہیں:

اولاً: جب بیان بالا میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ شہزادہ ہنوز سن بلوغ کو پہنچے ہی نہ تھے تو ان حالات میں ان کی شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ **کما لا یخفی**

ثانیاً: تمام کتب سیر و تواریخ اس واقعہ کے ذکر سے خالی نظر آتی ہیں۔ پھر کیونکر آنکھیں بند کر کے اسے صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ سب سے پہلے اس افسانہ کا تذکرہ ملا حسین واعظ کاشفی نے روضۃ الشہداء کے اندر بلا سند و حوالہ

---

[1] بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۰۔

کیا۔ جو نویں (۹) صدی میں گذرے ہیں۔ ان سے صاحب منتخب (طریحی) نے لیا اور ان سے صاحب اسرار الشہادۃ نے یہ بھی عجیب بات ہے کہ کاشفی نے صرف عقد نکاح کا تذکرہ کیا تھا۔ صاحب منتخب نے شادی کا اضافہ کیا۔ اور صاحب اسرار الشہادت تک پہنچتے پہنچتے اس شادی کے نتیجہ میں ایک بچہ کی ولادت کا اضافہ بھی ہو گیا۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے؟

ثالثاً: اگر چہ اکابر علماء کی کتب کا اس واقعہ سے خالی ہونا ہی اس کے بے اصل ہونے کے لئے کافی تھا۔ چہ جائیکہ انہوں نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی تصریحات بھی فرما دی ہیں۔ (جن کا ایک شمہ بعد ازیں پیش کیا جا رہا ہے)۔

رابعاً: روز عاشوراء عقد یا ازدواج کرنے کے لئے جو امور شرعاً یا عرفاً مطلوب ہو سکتے ہیں۔ ان سب کا فقدان نظر آتا ہے۔ کما لا یخفی۔ پھر ان حالات میں یہ کام انجام دینا عبث ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ امام عالی مقامؑ کی شان اس سے اجل وارفع ہے۔ کہ کوئی عبث و بے فائدہ کام انجام دیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ امامؑ نے صرف امام حسن علیہ السلام کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے ایسا کیا تھا۔ یہ تاویل بالکل علیل ہے۔ کیونکہ امام حسنؑ کی ایسی کوئی وصیت ہرگز ثابت نہیں ہے۔ بلکہ یہ افتراء علی المعصوم ہے۔ و الدلیل علی من ادعی۔

اس اجمالی بیان کے بعد ذیل میں اس مسئلہ کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر ذرا تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر کتاب لؤلؤ و مرجان، مجاہد اعظم حصہ اول رسالہ نزھۃ المشتاق اور رسالہ البیان البرہان میں اس قدر لکھا جا چکا ہے۔ کہ اس پر مزید اضافہ کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلئے ہم ان ہی نامبردہ کتب و رسائل سے اس واقعہ کی رد کے مختصر مگر جامع دلائل کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔ تا کہ اس سلسلہ میں ہر قسم کی قیل وقال کا دروازہ بند ہو جائے۔ اور ثابت ہو جائے کی یہ قصہ بالکل بے بنیاد و بے اصل ہے اور سراسر افتراء علی الامام پر مبنی ہے۔ اعاذنا اللہ و جمیع المومنین منہ۔

پہلی دلیل:۔ علمائے متقدمین کی کتابوں میں اس قصہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اور متاخرین جو روایات و واقعات کی صحیح جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی اس واقعہ کو نقل نہیں کیا۔ البتہ اخیر زمانہ میں کتاب روضۃ الشہداء سے جو نہ صرف ضعاف بلکہ بہت سی موضوع روایات کا مجموعہ ہے۔ یہ بلا نکلی اور اس سے صاحب منتخب نے نقل کی۔ اور ان سے اور بعض جدت پسند لوگوں نے نقل کی۔ اور اس طرح یہ کورانہ تقلید آئندہ نسلوں کے لئے حجت بن گئی۔ چنانچہ جناب محدث نوری فرماتے ہیں: ﴿قصہ عروسیٔ قاسم قبل از روضہ در ہیچ کتابے دیدہ نشدہ﴾ مولانا سید حسین لکھنوی نے بھی مجالس مفجعہ (ص ۲۱۵) میں تصریح کی ہے کہ صاحب منتخب نے اس

واقعہ کو کاشفی سے لیا ہے: ﴿روایۃ تزویج القاسم لم تذکر فی اکثر الکتب المعتبرۃ و لذا ترکھا مولانا المجلسیؒ لکن ذکرھا فخر الدین فی جامعہ و کان ماخذہ تاریخ الحسین للکاشفی﴾ ظاہر ہے کہ اگر اتنے بڑے عظیم واقعہ کی کوئی واقعیت وحقیقت ہوتی تو دوسرے علماء متقدمین کیوں اسے نظر انداز کرتے؟ اس بنا پر جناب محدث نوری قدس سرہ کا یہ تعجب برمحل ہے کہ ﴿چگونہ می شود قصیۂ بایں عظمت و قصہ چنیں آشکار را محقق و مضبوط باشد بنظر تمام ایں جماعت نرسیدہ باشد حتیٰ مثل شھر بن آشوبؒ کہ تصریح کردہ اند۔ کہ ھزار جلد کتاب مناقب نزد او بود﴾۔ بنابریں کس طرح اس قصہ کو صحیح باور کیا جا سکتا ہے۔

دوسری دلیل:۔ اکابر علماء وارباب سیر وتواریخ نے نہ صرف یہ کہ یہ قصہ اپنی کتب میں درج نہیں کیا۔ بلکہ اس کے من گھڑت اور بے اصل ہونے کی تصریحات بھی فرمادی ہیں۔ ذیل میں چند شہادتیں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) علامہ مجلسی علیہ الرحمہ جلاء العیون، ص ۲۰۴ میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿روایت دامادیٔ قاسم درکتب معتبرہ بہ نظر فقیر نرسیدہ﴾ یعنی دامادیٔ قاسم والی روایت نظر حقیر سے نہیں گذری۔

(۲) فاضل رضی قزوینی تظلم الزہراء (ص ۱۹۵) میں فرماتے ہیں: ﴿اقول لم انہ نقل فی الکتب بروز قاسم بن الحسنؑ و مبارزتہ ولیس فیھا ذکر مصاھرتہ الافی المنتخب فانہ ذکر قصہ مصاھرتہ.... صفحنا نحن ایضاً عن نقلہ لان الناقل ایضاً لم ینسب الی احد.. الخ﴾ یعنی تمام کتب مقاتل میں جناب قاسم کی مبارزت طلبی کا واقعہ تو درج ہے مگر سوائے منتخب طریحی کے اور کسی کتاب میں ان کی دامادی کا ذکر نہیں۔ اور صاحب منتخب نے بھی اسے کسی مستند کتاب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ اس لئے ہم نے اسے نقل نہیں کیا۔"

(۳) صاحب ذخیرۃ الدارین (ص ۱۵۴) لکھتے ہیں: ﴿اقول انہ نقل فی الکتب المعتبرۃ مبارزۃ القاسم یوم الطف کما ذکرنا انفاً تفصیلہ من طریق المخالف و المؤالف ولم یذکر فی تلک الکتب تزویجہ فی وقعۃ الطف الا فی المنتخب فانہ ذکر قصۃ تزویجہ نقلاً عن الغیر فقال ان ھذہ القصۃ لم نظفر بھا فی الکتب المعتبرۃ والروایات المعتمدۃ فکانہ رہ لم یعتمد علی ذلک النقل و نحن ایضاً قد تصفحنا بمقد اروسعنا عما نقل ولم نجد فیہ ما یعتمد علیہ من آلاثار المثبۃ لتلک القضیۃ و ذلک الفاضل ایضا لم ینسبہ الی احد بل نسبہ الی قیل ولا یثبت بہ شی﴾ یعنی واقعہ کربلا میں شہزادہ قاسم کا جنگ کرنا تو کتب معتبرہ میں موجود ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی تفصیل ذکر کر دی ہے مگر انکی شادی کا قصہ سوائے منتخب طریحی کے اور کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے اور صاحب منتخب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ انہیں یہ قصہ

کتب معتبرہ اور روایات معتمدہ میں نہیں مل سکا۔ بلکہ اسے ﴿قیل﴾ (کہا گیا ہے) کہہ کر نقل کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خود اپنے نقل کردہ قصہ پر اعتماد نہیں ہے۔ ہم نے بھی اپنی بساط کے مطابق کتب کی ورق گردانی کی ہے۔ ہمیں اس واقعہ کے بارے میں کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں مل سکی جس پر اعتماد کیا جا سکے۔''

(۴) محدث محلاتی فرسان الہیجا (ج ص ۳۱) میں تحریر فرماتے ہیں کہ ﴿عروسی قاسم ابداً اصل ندارد۔ چند انکه کتب معتبره و روایات معتمده راسیر کردیم۔ اثر و اطلاعی از این عروسی قاسم بدست نیاوردیم و آنچه در السنه سند برائے خود درست کردند۔ که طریحی در منتخب گفته ایشان این مطلب راکه ازغیر نقل میکند میفرماید۔ "ان هذا القضية لم نظفر بها في الكتب المعتبرة و الروايات المعتمدة " و شك نیست که این عبارت بتمام صراحت دلالت دارد۔ که خود طریحی هم اعتماد باین نقل ندارد و گفتن او بلفظ "قیل واضح است که این مطلب در آثار مثبته و کتب معتبره وجود ندارد﴾۔

اس عبارت کا مطلب قریباً وہی ہے۔ جو صاحب ذخیرہ کی عبارت کا ہے۔ فلا نطيل الكلام بتوضيح المرام۔

(۵) مولانا ناصر الملۃ لکھنوی مرحوم سے سوال کیا جاتا ہے: ''عقد قاسم بن الحسن علیہ السلام کا میدان کربلا میں ہونا صحیح ہے یا ضعیف یا افترائے محض؟'' آپ جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''قصہ عقد حضرت قاسم بن الحسن علیہ السلام بے اصل محض ہے۔''[۱]

اسی طرح ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں۔ ''جناب قاسم کی شادی فاطمہ کبریٰ سے میدان کربلا میں ہونا بالکل غلط ہے۔ مہندی اٹھانے کی منت درست نہیں۔ مہندی اٹھانے والوں پر کذب علی المعصومؑ کے سب آثار مرتب ہوں گے۔ مہندی قاسم کی بجائے تابوت اٹھائیں۔ شہادت قاسم پڑھیں۔ یا علم یا تعزیہ یا گہوارۂ اصغر اٹھانے کی صحیح یادگار قائم کریں۔''[۲]

(۶) حجۃ الاسلام آقا سید محمد کاظم طباطبائی صاحب عروۃ الوثقیٰ فرماتے ہیں: ﴿وقوع این قضیه معلوم نیست هر چند در بعض کتب بدون سند معتبر مذکور باشد﴾ اس قضیہ کا واقع ہونا معلوم نہیں ہے۔ اگرچہ بعض کتب میں سند معتبر کے بغیر مذکور ہے۔''

---

[۱] ہدایات ناصریہ۔

[۲] اخبار شیعہ، لاہور، محرم نمبر بابت ۱۳۵۳ھ، ہر دو فتویٰ بحوالہ رسالہ تحقیقات روایات محرم ص ۲۱، ۳۶۔

(۷) حجۃ الاسلام آقا آخوند ملا کاظم خراسانی صاحب کفایۃ الاصول فرماتے ہیں: ﴿منشاء الشتهار این قضیه را در السنه و افواه و عدم ذکر آں درکتب تواریخ معتمد علیها مرحوم علیین مقام ثقة الاسلام وحید عصره آقائے حاجی نوری قدس سره در کتاب لؤلؤ و مرجان که برائے سر مشق اهل منبر تصنیف فرموده اند مشروحاً بیان فرموده اندباں کتاب مراجعه شود﴾ اس قضیہ کے صرف مشہور ہونے مگر کتب معتبرہ میں موجود نہ ہونے کی تفصیل ثقۃ الاسلام وحید عصر آقائے حاجی نوری قدس سرہ نے اپنی کتاب لؤلؤ و مرجان میں بیان کر دی ہے اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۸) شریعتمدار آقا شیخ عبداللہ مازندرانی فرماتے ہیں: ﴿الی الآن مستندے که بتواں اعتماد نمود. در باب وقوع ایں قضیه بدست نیاید﴾ اس قضیہ کے متعلق اب تک کوئی قابل اعتماد چیز معلوم نہیں ہو سکی۔"

(۹) جناب آقا شیخ حسین مازندرانی تحریر فرماتے ہیں: ﴿اما اصل ایں قضیه پس هنوز بدرجهٔ تحقیق و ثبوت و یقین نرسیده بلکه عدمش محقق است﴾ "اس قضیہ کا واقع ہونا درجۂ تحقیق تک نہیں پہنچا۔ بلکہ اس کا عدم وقوع مسلم ہے۔"

(۱۰) جناب آقا غلام حسین الاصفہانی لکھتے ہیں: ﴿خواندن آں مقدارے که در منتخب مذکور است بانسبت هماں کتاب هم غیر جائز است﴾ "بلاشک و شبہ صرف اس مقدار کا پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ جو منتخب طریحی میں مذکور ہے۔"

ان تمام علماء اعلام کے تفصیلی فتاوی عقد قاسم کی نفی کے سلسلہ میں رسالہ "نزهة المشتاق" فی فتاوی علماء العراق میں مفصل مذکور ہیں۔ نیز ان اعاظم میں سے اکثر نے جناب محدث نوری کی کتاب مستطاب اللؤلؤ والمرجان کی توثیق کرتے ہوئے مزید تحقیق و تسلی کے لئے اس کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ بنظر اختصار ان حضرات کے فتاوی کے مختصر اجزاء نقل کئے گئے ہیں۔ شائقین تفصیل مذکورہ بالا رسالہ کی طرف رجوع کریں۔

(۱۱) صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں: ﴿دامادی قاسم در کربلا و تزویج کردن حسین علیه السلام فاطمہؑ را باد از اکاذیب روات است و حسین علیه السلام را از دو دختراں افزوں نبود. یکے فاطمہؑ زوجه حسن مثنیٰ و آں دیگرے سکینه بود﴾ (ناسخ ج ۶ ص ۱۷۱) "جناب قاسم کی دامادی کا قصہ یعنی یہ کہ امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں جناب قاسم کی اپنی دختر فاطمہ کے ساتھ تزویج کی تھی۔ بالکل جھوٹی روایت ہے۔ کیونکہ امام حسینؑ کی صرف دو ہی صاحبزادیاں تھیں۔ ایک فاطمہ جو حسن مثنیٰ کی زوجیت میں تھیں

اور دوسری سکینہ۔"

(۱۲) صاحب قمقام ذخار لکھتے ہیں: ﴿مورخین و محدثین فریقین در عدد اولاد امجاد حضرت امام صلوات الله و سلامه علیه اختلاف نموده اند﴾ "اکثر اصحاب خبر و ارباب سیر چهار پسر و دو دختر و زمرهٔ ده نفر گفته۔ فریقین کے محدثین و مورخین نے جناب امام حسینؑ کی اولاد کی تعداد کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر اصحاب خبر اور ارباب سیر نے چار لڑکے اور دو لڑکیاں اور بعض نے دس اولادوں کا ذکر کیا ہے۔" (ص ۵۴۸)

(۱۳) سرکار علامہ علی الحائری مجتہد پنجاب اس موضوع کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں "عروسی جناب قاسم کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے میرے نزدیک عروسی قاسم کا پڑھنا درست نہیں ہے اور یہ قصہ بالکل بے اصل اور افتراء محض ہے۔ اس جھوٹے قصے کا پڑھنا اور سننا معصیت میں داخل ہے۔ وھو العالم" (رسالہ الحافظ لاہور، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۶ء، مطابق محرم الحرام ۱۳۴۵ھ، ج ۲، نمبر ۵)

تیسری دلیل:۔ خود اس قصہ کے نقل کرنے والے حضرات کے بیانات سے اس کی نفی ہوتی ہے اور اس کا بے اصل و بے بنیاد ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس اجمال کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ کاشفی نے روضۃ الشہداء میں دامادیٔ قاسم کا قصہ بیان کرتے وقت یہ وضاحت نہیں کی۔ کہ جناب سید الشہداء کی کس صاحبزادی سے ان کا عقد ہوا تھا؟ انہوں نے ایک اور مقام پر تصریح کی ہے کہ جناب سید الشہداء کی کل دو صاحبزادیاں تھیں فاطمہ اور سکینہ پھر لکھا ہے کہ سکینہ صغیر السن تھیں اور فاطمہ کی شادی حسن مثنیٰ سے ہو چکی تھی۔ سید الشہداء کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "اورا چهار پسر و دو (۲) دختر بوده" (روضۃ الشہداء ص ۴۳۰ طبع بمبئی)۔ اسی صفحہ کے آخر میں لکھا ہے: ﴿و چون فاطمه خواهر زین العابدین هم از شهر بانو بوده و به حسن بن حسن داده اند پس اولاد حسن مثنی را هیا مبری و بادشاهی جمع شد﴾ ان عبارتوں پر نظر کرنے سے صاحب روضۃ الشہداء کے کلام کا باہم متناقض اور قصہ مذکور کا بے اصل و بے بنیاد ہونا مخفی نہیں رہ جاتا۔ باقی رہ گئے جناب شیخ طریحی صاحب منتخب انہوں نے بھی خود تصریح کر دی ہے۔ کہ انہوں نے بھی یہ قصہ کتب معتبرہ اور روایات معتمدہ میں کہیں نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی مستند ماخذ کا حوالہ دیا ہے بلکہ صرف "نقل" کہ کر اس کے ضعیف ہونے پر نص قائم کر دی ہے۔ (منتخب ص ۱۸۳ طبع بمبئی) اور یہی کیفیت اسرار الشہادت کے بیان و کلام کی ہے کیونکہ انہوں نے اس قصہ کو منتخب کے حوالہ سے نقل کیا ہے (اسرار ص ۲۸۶) اور اسکے (ص ۲۸۷) پر اعتراف کیا ہے کہ ارباب مقاتل کے جم غفیر نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ بعض ماہرین فن نے کہا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی قابل اعتبار ماخذ نہیں ہے۔ پھر صفحہ ۲۸۸ پر اس بے

سرو پا قصہ کے بعض مضحکہ خیز مؤیدات ذکر کیے ہیں مثلاً (۱) یہ کہ ایسا واقعہ ہونا چاہیئے تا کہ مصائب کی تکمیل ہو (۲) مرثیہ گو اور مجالس خواں اس واقعہ کو برابر پڑھتے ہیں (۳) عرب وعجم اور ہند وغیرہ کے شعراء نے برابر اس واقعہ کو نظم کیا ہے (۴) بعض خوابوں سے بھی اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔ ان مؤیدات کا اہل علم وتحقیق کے نزدیک جو وزن ومقام ہے۔ وہ صاحبان علم وعرفان پر مخفی ومستور نہیں ہے۔

ع کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

پس جب اس قصہ کے ناقلین خود اپنے بیانات سے شعوری یا لاشعوری طور پر اس کی تضعیف کر رہے ہیں تو پھر کس طرح اس کی صحت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ ہم قبل ازیں سید الشہداء کی اولاد کے ضمن میں تاریخی شواہد وحوالہ جات کے ساتھ آنجناب کی صاحبزادیوں کا صرف دو عدد ہونا ثابت کر چکے ہیں۔ میرزا سپہر کاشانی نے ناسخ میں لکھا ہے: ﴿و آنحضرت را از دو دختران افزوں نبود۔ نخستین فاطمہؑ واں دیگر سکینہ﴾ حتیٰ کہ خود صاحب منتخب نے بھی ایک مقام پر تسلیم کیا ہے کہ کان للحسین بنتان سکینۃ و فاطمۃ الصغریٰ۔ اور ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی جناب قاسمؑ کی شادی متصور نہیں ہو سکتی۔

ابھی تھے وہ جناب [illegible] پاک ہو گئے

چوتھی دلیل:۔ روضۃ الشہداء اور منتخب طریحی کسی میں بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ جناب قاسمؑ کا یہ مفروضہ عقد آنجناب کی کس صاحبزادی کے ساتھ ہوا؟ اب بفرض تسلیم اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا جناب فاطمہ سے ہوا ہوگا جیسا کہ قزوینی نے ریاض الشہادۃ میں لکھا ہے"۔ یا جناب سکینہؑ سے جیسا کہ بحر الانساب کے مؤلف نے ایک نسخہ کی بناء پر لکھا ہے۔ پہلی شق اس لئے غلط ہے کہ واقعہ کربلا سے پہلے اس مخدرہ کی شادی امام حسنؑ کے بڑے صاحبزادے حسن مثنیٰؑ کے ساتھ ہو چکی تھی۔[1] اور وہ واقعہ کربلا میں موجود بھی تھے۔[2] اور جناب سکینہؑ بنابر مشہور بوجہ صغر سنی شادی کے قابل نہ تھیں اور اگر ان کو قابل ازدواج تسلیم کر لیا جائے تو پھر جن کتب میں ان کا اس قابل ہونا مذکور ہے ان میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ ان کا ازدواج عبداللہ بن حسنؑ کے[3] ساتھ ہو چکا تھا۔ اور عبداللہ بن حسنؑ بھی واقعہ کربلا میں موجود تھے"۔

بحر الانساب کے مجہول الحال مؤلف نے اس مفروضہ کو زبیدہ بنت الحسینؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔

---

1. ارشاد شیخ مفید، ص ۱۰۹۔ کشف الغمہ اربلیؒ، ص ۱۷۲۔ عاشر بحار الانوار، ص ۱۳۸۔ مقاتل الطالبین، ص ۱۳۹ وغیرہ۔
2. مذکورہ بالا حوالہ جات۔
3. مجاہد اعظم، ج ۱، ص ۲۳۰۔ اعلام الوریٰ طبرسی، ص ۱۲۷۔ اسعاف الراغبین بر حاشیہ نور الابصار، ص ۲۰۲۔

حالانکہ باتفاق مورخین آنجناب کی کوئی اس نام کی دختر تھی ہی نہیں۔ بہرکیف جب اس قصہ کی تمام شقیں باطل ہیں۔ تو بعد ازاں مجبوراً اس واقعہ کو بے اصل اور بے سروپا تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔

ایک خیال کا ابطال

باقی رہا یہ احتمال کہ شاید جناب سید الشہداءؑ کی دو صاحبزادیاں بنام فاطمہؑ تھیں: (۱) فاطمہ کبریٰ۔ (۲) فاطمہؑ صغریٰ۔ اور ایک کی شادی حسن مثنیٰ اور دوسری کی شادی قاسم سے ہوئی تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہم اسی کتاب میں اولاد امامؑ کے ضمن میں لکھ آئے ہیں۔ کہ امامؑ کی اس نام کی ایک ہی صاحبزادی تھیں۔ انہی کو کبریٰ وصغریٰ کہا جاتا ہے۔ کبریٰ اس وجہ سے کہ وہ جناب سکینہؑ سے بڑی تھیں۔ اور صغریٰ اس لئے کہ اپنی ہم نام جدہ ماجدہ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے چھوٹی تھیں۔[1]

پانچویں دلیل :۔ ایک ضرب المثل ہے کہ ﴿نقل را عقل باید﴾ اگر چند لمحوں کے لئے سابقہ تمام دلائل وبراہین سے قطع نظر بھی کر لیا جائے۔ اور صرف روز عاشوراء کے عدیم النظیر اور جانگداز اور روح فرساہ حالات۔ امام اور ان کے اصحاب واعزا کی پریشاں حالی مخدرات کے قلق واضطراب کو دیکھتے ہوئے دوسری طرف اس قصہ دامادی کے مندرجات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے کہ جن میں وارد ہے "آپؑ نے قاسمؑ کا ہاتھ تھاما۔ اور خیمہ میں تشریف لائے۔ اپنے بھائیوں عونؑ، محمدؑ اور عباسؑ کو طلب فرمایا۔ اور والدہ قاسمؑ نے ارشاد کیا۔ قاسمؑ کے نئے کپڑے نہیں ہیں؟ انہوں نے عرض کی نہیں۔ تب آپؑ نے اپنی بہن زینبؑ سے فرمایا کہ میرے پاس کپڑوں کا صندوق اٹھالاؤ۔ وہ لے آئیں اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ آپؑ نے صندوق کھول کر امام حسنؑ کی قبا نکالی۔ اور قاسمؑ کو پہنائی پھر ان کے سر پر امام حسنؑ کا عمامہ باندھا۔ اور اپنی بیٹی کو جو قاسمؑ سے منسوب تھیں۔ ہاتھ تھام کر قاسمؑ سے عقد کر دیا۔ ایک خیمہ ان کے لئے خالی کرا دیا۔ اور بیٹی کا ہاتھ تھام کر قاسم کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور خیمہ سے باہر تشریف لے گئے۔

۔۔۔۔ یکایک انہوں نے سنا کہ دشمن "ھل من مبارز" کی آواز دے رہے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی زوجہ کو چھوڑ دیا۔ خیمہ سے باہر آنے کا ارادہ کیا۔ فرمانے لگے۔۔۔۔۔۔۔ (یہاں محبت اور فرقت کے جذبات سے لبریز چند اشعار درج ہیں۔ جو بجائے خود شہزادہ کی شان کے منافی ہیں) اور اس وقت ان کی دلہن نے ان کا دامن تھام لیا۔ باہر جانے سے روکا۔ اور کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ اور کس کام کا ارادہ کر رہے ہو؟ قاسمؑ نے کہا کہ دشمنوں کا مقابلہ کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور وہ لڑائی کے لئے بلا رہے ہیں۔۔۔۔۔ ان کی عروس نے پھر روکا۔ قاسمؑ نے فرمایا میرا دامن چھوڑ دو۔ ہماری عروسی ختم ہوئی اس پر وہ دلی رنج سے روئیں۔ نوحہ کیا ان کے رخساروں پر آنسو جاری تھے۔ پھر کہا میں قیامت

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۶۷۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۹۔ عاشر بحار، ص ۴۵۔ کشف الغمہ، ص ۱۷۴ وغیرہ۔

کے دن تم کو کس طرح پہچانوں گی؟ اور تم کس جگہ ملو گے؟ یہ سن کر قاسم نے اپنی آستین چاک کر کے الگ کی اور کہا کہ اے چچا کی بیٹی! تم مجھ کو اس آستین سے پہچان لینا۔ قاسم کی ان باتوں سے اہل بیت میں بہت رقت وزاری ہوئی۔

(ترجمہ قصہ دامادیٔ قاسم مندرجہ روضۃ الشہداء و منتخب طریحی وغیرہ)

پھر ارباب عقل و انصاف خدا کو حاضر جان کر اور بالکل خالی الذہن اور غیر جانبدار ہو کر بتائیں۔ کہ آیا ان حالات میں ایسے واقعہ کا رونما ہونا ممکن ہے؟ اور کیا یہ مندرجہ بالا واقعات و کوائف اہل بیت رسول کی شان اقدس کے مطابق ہیں؟ یا ان سے سراسر ان کی توہین و تذلیل کا پہلو نکلتا ہے؟ ایک غیر مسلمان یا آل رسول کی امامت کا منکر اس قصہ کو پڑھ کر اس خانوادۂ عصمت و طہارت کے متعلق کیا تاثر لے گا؟ بہر کیف عقل و خرد ایک لحہ کے لئے اس قصہ کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

پس ان حقائق کی روشنی میں روز روشن سے بھی زیادہ واضح و آشکار ہو جاتا ہے۔ کہ دامادیٔ قاسمؑ کا قصہ غلط محض اور بالکل بے بنیاد اور سراسر افتراء علی المعصوم ہے۔ جو بالاتفاق حرام ہے۔ لہٰذا اس واقعہ کا مجالس عزا میں پڑھنا یا سننا قطعاً حرام ہے۔ اہل منبر کو ایسے مہمل اور بے سروپا قصص و حکایات بیان کرنے سے اجتناب کرنا واجب و لازم ہے۔ واللہ الموفق والمعین و یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

امر سیوم: شہزادہ قاسمؑ کی پامالی لاش کی تحقیق

اس باب میں ارباب مقاتل میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ جناب شہزادہ کی لاش مقدس پامال سم اسپاں ہوئی تھی یا نہ؟ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جلاء العیون میں لکھا ہے: ﴿آں طفل معصوم در زیر سم اسپاں کوفتہ شد﴾۔ اور بحار الانوار (ج ۱۰ ص ۲۰۰) میں لکھا ہے: ﴿و وطئتہ حتی مات الغلام﴾ گھوڑوں نے اپنی ٹاپوں کے نیچے شہزادہ کو روند دیا۔ یہاں تک اس سے ان کی موت واقع ہوگئی"۔ جناب موصوف کے کلام سے متاثر ہو کر مہیج الاحزان، ناسخ التواریخ، ریاض الشہادۃ اور مخزن البکاء کے مؤرخین نے بھی ایسا ہی لکھا ہے مگر تحقیقی قول یہ ہے۔ کہ شہزادہ کی لاش مقدس پامال نہیں ہوئی۔ اس تحقیقی نظریہ پر شواہد پیش کرنے سے پہلے اس اختلاف کے منشاء کی نشاندہی کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سو مخفی نہ رہے کہ اس اختلاف کا منشاء شہادت قاسم کے واقعہ میں وارد شدہ بعض ضمیروں کے مرجع کی تعیین ہے کہ وہ ضمیر جناب قاسمؑ کے قاتل کی طرف لوٹتی ہیں۔ یا خود جناب شہزادہ کی طرف؟

اس اجمال کی بقدر ضرورت توضیح یہ ہے۔ کہ جب عمرو بن سعد بن نفیل ازدی نے شہزادہ کے سر پر تلوار کا وار کیا۔ اور شہزادہ گھوڑے کی زین سے زمین پر تشریف لایا۔ تو اس وقت اپنے عم معظم کو آواز دی: ﴿یا عماہ﴾ اس مقام پر تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ ﴿جلی الحسین کما یجلی الصقر﴾ کہ جناب سید الشہداءؑ بھتیجے کی آخری آواز سن

کر اس طرح تیزی سے ان کے پاس جھپٹ کر گئے۔ جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ﴿ثم شد شدة ليث المغضب﴾ پھر قاتل پر غضب ناک شیر کی طرح حملہ کیا اب ابن نفیل نے ہاتھ سے وار کو روکا۔ جس سے اس کا بازو کٹ گیا۔ اس نے اس قدر بلند آواز سے شور مچایا کہ تمام لشکر نے اس کی آواز سنی: ﴿و حملت خيل اهل الكوفة ليستنقذوا عمرواً فاستقبلته بصدورها اجالت فتوطأته حتى مات﴾[1] اہل کوفہ نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ تا کہ عمرو کو امام کے پنجہ سے چھڑائیں۔ وہ گھوڑوں کے دوڑتے وقت ان کے سموں کے نیچے آگیا۔ گھوڑوں نے اسے روند ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ سب اختلاف اس میں ہے۔ کہ فتوطأته، استقبلته اور مات کی خط کشیدہ ضمیروں کا مرجع کون ہے ابن نفیل؟ یا شہزادہ قاسم جناب علامہ مجلسیؒ اور ان کے ہم خیال حضرات نے ان کا مرجع جناب قاسم کو قرار دیا ہے۔ لیکن مورخین کی جو عبارت ہم نے نقل کی ہے۔ اس کے سیاق و سباق اور خود نفس عبارت پر تامل صادق کرنے سے یہ بات واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔ کہ ان تمام ضمائر کا مرجع ابن نفیل" ہے۔ نہ کہ جناب قاسم۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اہل تحقیق ارباب مقاتل نے بالتصریح ان ضمائر کا مرجع ابن نفیل ازدی کو قرار دیا ہے۔

قارئین کرام کے اطمینان قلب کے لئے چند اہل علم حضرات کی عبارات نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) محدث قمی نفس المہموم (ص ۱۷۱) میں لکھتے ہیں: ﴿فلما حملت الخيل استقبلته بصدورها و جالت فتوطأته فلم يرم حتى مات لعنه الله و اخزاه﴾ یہ عبارت بطور نص دلالت کرتی ہے۔ کہ ضمیروں کا مرجع قاتل ہے۔

(۲) فاضل عاملی لواعج الاشجان (ص ۱۳۱) میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿و حمل اهل الكوفة ليستنقذوه فوطأت الخيل عمرواً بارجلها حتى مات﴾ اس عبارت میں ضمیر کے مرجع کی تصریح موجود ہے کہ عمر روندا گیا۔

(۳) صاحب ذخیرۃ الدارین نے (ص ۱۵۳ پر) لکھا ہے: ﴿و حملت خيل عمر بن سعد ليستنقذوه من الحسين فلما حملت الخيل فاستقبلته بصدورها فوطأته فلم يرم حتى مات اللعين﴾ اس عبارت میں بھی تصریح موجود ہے۔ کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے اس ملعون نے دم توڑ دیا۔"

(کذا فی ابصار العین، ص ۴۲)

(۴) صاحب تقام ذخار (ص ۳۶۸ پر) لکھتے ہیں: ﴿سواران کوفه از هر طرف بیامدند مگر بتوانند او را خلاصی دهند. جنگ مغلوبه شد. وجثهٔ خبیث او در زیر سم ستوران خورد گشت. و روح ناپاک بما لکان جهنم بسپرد﴾ یہ عبارت بھی عیاں راچہ بیاں کی مصداق ہے۔ کہ عمر بن سعد

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۲۹۳۔

بن نفیل پامال سم اسپاں ہو کر واصل جہنم ہوا۔

(۵) فاضل معاصر شہید انسانیت (ص ۵۰۰ پر) لکھتے ہیں: ''حسینؑ غضب ناک شیر کی طرح جھپٹ کر قریب پہنچے۔ عمر بن سعد بن نفیل جس نے قاسم کو قتل کیا تھا۔ ابھی پاس ہی موجود تھا۔ آپؑ نے اس پر تلوار کا وار کیا۔ جس سے اس کا ہاتھ کہنی سے کٹ کر گر گیا۔ لشکر مخالف اس کو بچانے کے لئے حسینؑ پر ٹوٹ پڑا۔ مگر اس طرح چاروں طرف سے بے تحاشا گھوڑے دوڑا کر وہ لوگ اس کی کمک کو آئے کہ وہ خود اپنے ہوا خواہوں کے گھوڑوں سے پامال ہو کر ہلاک ہو گیا۔'' اس مطلب پر ایک قرینہ یہ بھی ہے۔ کہ سم اسپاں کے نیچے آنے والا مر گیا تھا۔ مگر شہزادہ کے متعلق قریباً قریباً سب مؤرخین نے لکھا ہے۔ کہ جب یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ اور غبار جنگ چھٹا۔ تو حسینؑ شہزادے کے پاس کھڑے تھے۔ اور شہزادہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ بعد ازاں روح مقدس جنت الفردوس کی طرف پرواز کر گئی۔

بحمدہ تعالیٰ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جناب شہزادہ قاسم کی لاش مقدس پامال نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے قاتل کی نجس لاش پامال ہوئی۔ جس سے وہ واصل جہنم ہوا۔

چوتھا امر: شہزادہ قاسمؑ کی ارزق شامی اور اس کے بیٹوں کے ساتھ جنگ کرنے کی تحقیق :۔

کتب غیر معتبرہ میں یہ قصہ بڑے شد و مد کے ساتھ درج ہے۔ مگر چونکہ تمام علماء متقدمین اور علماء متاخرین میں سے حضرات محققین کی کتب مقاتل میں اس قصہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اس لئے اسے ہرگز صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

واقعات کربلا کی صحت و سقم معلوم کرنے کا معیار

ارباب بصیرت جانتے ہیں۔ کہ واقعات و روایات کربلا کی صحت و سقم معلوم کرنے کا وہ طریقہ نہیں جو دوسری فقہی روایات کے صحت و سقم معلوم کرنے کا ہے۔ کیونکہ اگر اس معیار پر ان واقعات کو جانچا جائے۔ تو نتیجہ بہت ہی مایوس کن نکلے گا۔ بلکہ واقعات کربلا کی صحت یا عدم صحت معلوم کرنے کا میزان محقق علماء کی لکھی ہوئی کتب میں کسی واقعہ کا درج ہونا یا نہ ہونا ہے۔ اگر انہوں نے کوئی واقعہ لکھ دیا ہے۔ تو اسے صحیح تسلیم کیا جائے گا۔ اور اگر انہوں نے کسی واقعہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تو اسے غلط تصور کیا جائے گا۔ بنابریں چونکہ تمام کتب سیر و مقاتل اس طلسم ہوشربا سے خالی ہیں۔ اس لئے اسے صحیح تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ اس قدر تمہیدی و تحقیقی بیانات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف عود کرتے ہیں۔

شہزادہ قاسمؑ کی شہادت

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ شہادت اولاد عبداللہ بن جعفر طیارؓ کے بعد اولاد امام حسنؑ نے

میدان جنگ کا رخ کیا۔ اور سب سے پہلے شہزادہ قاسم بن حسنؑ میدان میں جانے کے لئے خیام سے نکلے۔ راویان اخبار کا بیان ہے۔ کہ ان کی تیاری دیکھ کر سرکار سید الشہداء نے اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال دیں اور دونوں چچا بھتیجا اس قدر روئے۔ کہ ان پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جب افاقہ ہوا۔ تو شہزادہ نے اذن جہاد طلب کیا۔ اور امامؑ نے بھائی کی نشانی کو اجازت دینے میں پس و پیش کیا۔ شہزادہ نے بڑی الحاح وزاری کے ساتھ اپنے عم بزرگوار کے ہاتھ اور پاؤں چوم چوم کر اجازت حاصل کی۔ اور شہزادہ اس حال میں میدان کی طرف نکلا کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے[1]۔ منتخب طریحی[2] میں ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿یا وَلَدِیْ اَتَمْشِیْ بِرِجْلِکَ اِلَی الْمَوْتِ؟﴾ بیٹا قاسم! کیا تم اپنے قدموں سے چل کر موت کی طرف جاتے ہو؟ شہزادہ نے جواب میں عرض کیا ﴿کَیْفَ لَا یا عَمَّا وَ اَنْتَ بَیْنَ الْاَعْدَاءِ صِرْتَ وَحِیْدًا فَرِیْدًا لَمْ تَجِدْ مُحَامِیًا وَّلَا صَدِیْقًا. رُوْحِیْ لِرُوْحِکَ الْفِدَاءُ وَ نَفْسِیْ لِنَفْسِکَ الْوِقَاءُ﴾ عم بزرگوار! بھلا میں کیونکر ایسا نہ کروں۔ جبکہ آپ کو زغہ اعداء میں بے یار و مددگار یکا و تنہا گھرا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میری جان آپ پر نثار ہو نیز اسی کتاب[3] میں یہ بھی لکھا ہے کہ ﴿ثم ان الحسینؑ شق ازیاق القاسم و قطع عمامته نصفین ثم اولاها علی وجهه ثم البسه ثیابه بصورة الکفن و شد سیفه بوسط القاسم وارسله الی المعرکه﴾ پھر امام حسینؑ نے قاسمؑ کے گریبان کو چاک کر دیا اور عمامہ کے دو حصے کر کے چہرہ پر لٹکا دیئے۔ اور کفن کی طرح لباس پہنا کر اپنی تلوار ان کی کمر کے ساتھ لٹکائی۔ پھر معرکہ جنگ کی طرف روانہ کیا۔ شہزادہ یہ رجز پڑھتے ہوئے ہنگامۂ حرب و ضرب میں کود پڑا۔

ان تنکرونی فانا ابن الحسن	سبط النبی المصطفیٰ المؤتمن
هذا حسینؑ کالا سیر المرتهن	بین الناس لا سقوا صوب المزن

حمید بن مسلم کہتا ہے۔ میں لشکر پسر سعد میں موجود تھا کہ ﴿خرج الینا غلام کان وجهه شقه قمر و فی یده السیف و علیه قمیص و ازار و نعلان قد انقطع شسع احدهما ما انسی انها الیسری﴾۔ خیام حسینی سے ہماری طرف ایک نوخیز لڑکا نکلا۔ جس کا چہرہ شدت حسن و جمال سے چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ میں تلوار تھی۔ قمیص پہنے ہوئے اوپر چادر اوڑھے ہوئے۔ پاؤں میں جوتے اور ایک جوتے کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا میں نہیں بھولتا۔ کہ وہ بایاں جوتا تھا۔ پھر شجاعت علویہ کے اس وارث نے بڑھ بڑھ کے حملے شروع کئے۔ شدت پیاس اور

---

[1] نفس المہموم ص ۱۷۰۔ عاشر بحار، ص ۲۰۰۔ لواعج الاشجان، ص ۱۴۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۲۷ وغیرہ۔

[2] منتخب طریحی۔

[3] ایضاً۔

صغر سنی کے باوجود پینتیس اور بروایتے ستر (۷۰)[1] ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ حمید بن مسلم کہتا ہے کہ جب شہزادہ جنگ کر رہا تھا۔ تو عمر بن سعد بن نفیل ازدی جو میرے پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ میں ضرور اس پر حملہ کروں گا۔ میں نے کہا تجھے حملہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آیا اس قدر فوج کثیر تھوڑی ہے؟ ابن نفیل نے کہا: نہیں میں ضرور اس پر حملہ کروں گا۔ اسی اثنا میں جب شہزادہ اس کے قریب پہنچا۔ تو اس نے آگے بڑھ کر تلوار سے شہزادہ کے فرق مبارک پر ایسا وار کیا۔ جس سے شہزادہ کا سر مبارک شگافتہ ہوگیا۔ اور شہزادہ تیورا کر زین اسپ سے منہ کے بل فرش زمین پر گر پڑا۔ اور اپنے عم نامدار کو آواز دی۔ یا عماہ۔ امام عالی مقام شہزادہ کی آواز استغاثہ سن کر اس طرح جھپٹ کر شہزادے کے پاس پہنچے۔ جس طرح باز شکار پر گرتا ہے۔ دیکھا کہ ہنوز قاتل وہیں کھڑا ہے۔ امام نے غضبناک شیر کی طرح اس پر حملہ کیا۔ اس نے ہاتھ سے وار روکنا چاہا جس سے اس کا بازو کٹ کر زمین پر جا گرا۔ ملعون نے آواز داد و فریاد بلند کی۔ ابن سعد کے کئی گھڑ سوار اسے بچانے کے لئے بے تحاشا دوڑے۔ اسی اثنا میں وہ شقی گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے آکر کچلا گیا۔ او رواصل جہنم ہوگیا۔

جب غبار جنگ چھٹا۔ تو لوگوں نے دیکھا کہ امام علیہ السلام شہزادے کے سرہانے کھڑے ہیں۔ شہزادہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اور امام علیہ السلام نہایت غم واندوہ کے لہجہ میں فرما رہے ہیں: ﴿بُعْداً لِقَوْمٍ قَتَلُوکَ وَ مَنْ خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیامَةِ فِیکَ جَدُّکَ﴾ ہلاکت ہو اس قوم کے لیے جس نے تمہیں قتل کیا ہے اور ان کے لیے جن کے تمہارے جد نامدار قیامت کے دن دشمن ہوں گے۔ پھر فرمایا: ﴿عَزَّ وَاللّٰہِ عَلٰی عَمِّکَ اَنْ تَدْعُوَهُ فَلاَ یُجِیْبُکَ اَوْ یُجِیْبُکَ فَلاَ یَنْفَعُکَ صَوْتُهُ. هٰذَا یَوْمٌ وَاللّٰهِ کَثُرَ وَ اتِرُهُ وَ قَلَّ نَاصِرُهُ﴾ بخدا تمہارے چچا پر یہ چیز بہت ہی شاق ہے کہ تم انہیں پکارو۔ اور وہ جواب نہ دے سکیں۔ یا اگر جواب دیں تو ان کا جواب تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ بخدا آج انتقام لینے والے (دشمن) زیادہ اور یار و مددگار (دوست) کم ہیں۔"

پھر شہزادہ کی لاش مقدس کو خیام کی طرف اٹھا لائے۔ حمید یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے کہا کرتا تھا: ﴿کانی انظر الی رجلی الغلام تخطان علی الارض﴾ گویا میں ابھی دیکھ رہا ہوں کہ شہزادے کے دونوں پاؤں زمین پر خط دیتے ہوئے آرہے تھے۔ پھر لا کر شہزادہ کو اس خیمہ کے سامنے لٹا دیا۔ جو مرکز سپاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں شہزادہ علی اکبرؑ کی لاش مقدس پڑی ہوئی تھی۔ پھر فرمایا: ﴿اَللّٰهُمَّ اَحْصِهِمْ عَدَداً وَ اقْتُلْهُمْ بَدَداً وَلاَ تُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَداً وَلاَ تَغْفِرْ لَهُمْ اَبَداً۔﴾[2] ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾

---

[1] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۷۳۔

[2] عاشر بحار، ص ۲۰۰۔ نفس المہموم، ص ۱۷۱۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۱۔ فرسان الهیجاء، ج ۲، ص ۲۷۔ مقتل مقرم، ص ۳۶۸۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۶۔

(۱۰) ابوبکر بن حسنؑ بن علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کی شہادت

یہ قاسم ابن الحسنؑ کے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے سگے بھائی تھے۔ ارباب سیر و مقاتل کے کلام میں شدید اضطراب و اختلاف ہے۔ کہ آیا ابوبکر ابن الحسنؑ اور عبداللہ ابن الحسن الاکبر دو شخص ہیں یا ایک ہی شخصیت کے دو عنوان ہیں۔ بظاہر صاحب ناسخ کی تحقیق قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی شخص کے دو عنوان ہیں۔ ان کا نام عبداللہ اور کنیت ابوبکر تھی۔ یہ شہزادہ قاسم سے بڑے تھے۔ صاحب مقتل الحسینؑ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ ان کے عین الفاظ یہ ہیں:۔ ﴿و خرج ابوبکر بن الحسنؑ بن امیر المومنینؑ وهو عبدالله الاكبر الخ﴾ (ص ۳۰۶) صاحب فرسان الہیجاء نے بھی (ج ۱ ص ۲۳۸) یہی احتمال ذکر کیا ہے کہ ﴿احتمال می رود که همین عبد الله بن الحسنؑ (الاكبر) ابو بكر بن الحسن المتقدم باشد﴾ لیکن اس صورت میں اشکال یہ لازم آتا ہے۔ کہ اہل مقاتل نے ابوبکر کے قاتل کا نام عبداللہ بن عقبہ غنوی اور عبداللہ اکبر کے قاتل کا نام ہانی بن ثبیت حضرمی یا حرملہ لکھا ہے۔ البتہ اس طرح اس اشکال کا ازالہ ممکن ہے۔ کہ ہر دو ملعون شہزادہ کے قتل میں شریک ہوں۔ واللہ العالم بالعدد و الاتحاد۔ بہرکیف شہزادہ قاسمؑ کی شہادت کے بعد یہ اذن جہاد لے کر اور یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں تشریف لائے۔

ان تنکرونی فانا ابن حیدره ... ضرغام آجام ولیث قسوره
علی الاعادی مثل ریح صرصره   اکیلکم بالسیف کیل السندره

پھر داد شجاعت دیتے ہوئے چودہ ناریوں کو واصل جہنم کیا بالآخر عبداللہ بن عقبہ الغنوی اور بروایتے حرملہ بن کاہل کے تیر سے درجہ شہادت پر فائز ہوئے[1]

(۱۱) عبداللہ (الاصغر) بن الحسنؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ کی شہادت

آپ کی والدہ رملہ بنت شلیل بن عبداللہ البجلی تھیں۔ شلیل صحابی رسولؐ تھے۔ اور بعض نے یہ لکھا ہے کہ ان کی والدہ ام ولد تھیں۔ یہ شہزادہ صغیر السن تھے۔ زیادہ سے زیادہ عمر گیارہ[2] سال۔ اور نو سال سے کم تو متصور ہی نہیں ہو سکتی۔[3] ان کی شہادت اگرچہ بعد میں واقع ہوئی۔ مگر اولاد امام حسنؑ کی قربانیوں کی مناسبت سے یہاں درج کی جاتی ہے۔ ارباب مقاتل کا بیان ہے۔ کہ جب حضرت سید الشہداء علیہ السلام میدان قتال میں زین فرس سے فرش زمین پر

---

[1] عاشر بحار ص ۲۰۷۔ لواعج الاشجان ص ۱۳۱۔ تاریخ ج ۶ ص ۲۷۳ وغیرہ۔

[2] مقتل الحسینؑ للمقرم ص ۳۴۸۔

[3] فرسان الہیجاء ج ۱ ص ۲۳۹۔

تشریف لا چکے۔ اور ہر طرح نرغہ اعداء میں گھر گئے۔ اور ظالم آپؑ کا سر مبارک تن سے جدا کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ اور شہزادہ نے اپنے عم معظم کے گرداب مصائب میں گھرنے کا یہ جانگداز منظر دیکھا۔ تو مخدرات عصمت کے خیمہ سے دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ جناب زینبؑ نے ان کو پکڑنے کی کوشش کی۔ امام علیہ السلام نے بھی یہ منظر دیکھ کر باواز بلند فرمایا: ﴿احبسیہ یا اختی﴾ بہن اسے روک لو۔ مگر شہزادہ نہ رکا۔ اور کہا: ﴿واللّٰہ لا افارق عمّی﴾ خدا کی قسم میں اپنے عم بزرگوار سے جدا نہیں ہوں گا۔ بالآخر خدمت امامؑ میں پہنچ کر آپؑ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ اسی اثنا میں ابجر بن کعب تلوار لے کر شہادت امام کے قصد سے آگے بڑھا۔ شہزادہ نے چلا کر کہا: ﴿وَیلَکَ یَابنَ الخبیثۃ اتقتل عمّی؟﴾ افسوس ہے تجھ پر اے زن خبیثہ کے بیٹے۔ کیا تو میرے چچا کو شہید کرتا ہے؟ یہ سن کر شقی کو طیش آ گیا۔ اور عبداللہ پر تلوار سے بھرپور وار کیا۔ عبداللہ نے ہاتھ پر روکا۔ جس سے ان کا بازو کٹ گیا۔ کچھ چمڑا بچا اور ہاتھ لٹکنے لگا۔ شہزادہ نے صدائے استغاثہ بلند کی: ﴿یا غمّاہُ﴾ سید الشہداء علیہ السلام نے شہزادہ کو گلے سے لگا لیا۔ اور دلاسا دیتے ہوئے فرمایا: ﴿یَابنَ اَخِی اِصبِر عَلٰی مَا نَزَلَ بِکَ وَ احتَسِبْ فِی ذٰلِکَ الخَیرَ فَاِنَّ اللّٰہَ یُلحِقُکَ بِآبَائِکَ الصَّالِحِینَ﴾ اے بھتیجا! اس مصیبت پر صبر کرو۔ اور خیر و ثواب کی توقع رکھو۔ خداوند عالم تمہیں اپنے آباء و اجداد صالحین کے ساتھ ملحق کرے گا۔ پھر دست دعا بلند کر کے بارگاہ ایزدی میں یوں عرض کیا: ﴿اَللّٰھُمَّ فَاِنْ مَتَّعتَھُم اِلٰی حِینٍ فَفَرِّقھُم فِرَقًا وَاجعَلھُم طَرَائِقَ قِدَدًا وَلَا تُرضِ الوُلَاۃَ مِنھُم اَبَدًا فَاِنَّھُم دَعَونَا لِیَنصُرُونَا فَقَتَلُونَا﴾ اسی حالت میں کہ شہزادہ امامؑ کی گود میں استراحت کر رہا تھا کہ حرملہ بن کاہل اسدی ملعون نے تیر مارا جس سے شہزادہ نے تڑپ کر دم توڑ دیا۔ اور روح قفس عنصری سے پرواز کر کے جنت الفردوس میں شہداءِ کربلا کے ساتھ ملحق ہو گئی۔[1]

---

[1] ارشاد، ص ۲۲۳۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۳۹۔ نفس المہموم، ص ۱۹۱۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۱۵۰۔ بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۲۰۲۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۲۵۔ مثیر الاحزان، ص ۳۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۵۰ وغیرہ۔

اولاد امیر المومنینؑ کی قربانیاں

(۱۲) ابو بکر بن علیؑ بن ابی طالبؑ کی شہادت

جب امام حسن علیہ السلام کی اولاد قربان گاہ کربلا میں اپنی بے مثال قربانیاں پیش کر چکی۔ تو اب حیدر کرار کی اولاد نامدار کی نوبت آئی۔ سب سے پہلے جناب ابو بکر میدان کارزار میں نبرد آزمائی کے لئے نکلے۔ ان کا اصل نام معلوم نہیں ہو[1] سکا۔ بعض نے ان کا نام عبید اللہ تحریر[2] کیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ عبید اللہ بن علیؑ کی شہادت کربلا میں ثابت نہیں ہے۔ بلکہ یوم المذار (مصعب بن زبیر اور مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کی فیصلہ کن جنگ میں شریک تھے اور اسی میں کام آئے۔[3]

بعض نے ان کا اصل نام عبداللہ (الاصغر[4]) بتایا ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ حضرت امیر المومنینؑ کے ایک ہی صاحبزادے کا نام عبداللہ ہے جو جناب ابو الفضلؑ کے سگے بھائی ہیں۔ اور ان کنیت ابو محمد ہے۔ نہ ابو بکر[5] واللہ العالم۔ اور ان کی والدہ لیلیٰ بنت مسعود بن خالد دارمیہ ہیں۔[6]

بہر حال آپ رخصت جہاد لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان وغا میں تشریف لائے۔

شیخی علیٌ ذو الفخار الاطول	من هاشم الصدق الكريم المفضل
هذا حسين بن النبی المرسل	عنه نحامي بالحسام المصقل

تفديه نفسی من اخ مبجل

پھر زبردست جنگ کی۔ یہاں تک کہ بروایت روضۃ الاحباب اکیس (۲۱) ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد خود جام شہادت نوش کیا۔ قاتل کا نام زجر بن قیس بن بدر نخعی ہے۔ مگر صاحب مقاتل الطالبین کہتے ہیں کہ قاتل کا نام معلوم نہیں بقول مدائنی ان کی لاش شہدائے کربلا کی جماعت میں پڑی ہوئی ملی تھی اس لئے قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ اور بعض نے ہانی بن ثبیت حضرمی لکھا ہے۔[7] و الاصح الاول۔

(۱۳) محمدؑ بن علیؑ بن ابی طالب الاصغر کی شہادت

ان کی والدہ ام ولد تھیں۔ ان کو اصغر اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ جناب محمد بن الحنفیہ سے چھوٹے تھے۔ امامؑ

---

1. مقاتل الطالبین، ص ۶۰، طبع النجف۔
2. بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۰۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۲۔
3. اعیان الشیعہ، ج ۳، ذیل ترجمہ ابی بکر بن علی۔
4. تاریخ التواریخ، ج ۶، ص ۲۷۳۔
5. فرسان الہیجا، ج ۱، ص ۹۔
6. مقاتل الطالبین، ص ۶۰۔
7. بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۰۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۶۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۲۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۷۳۔ قمقام، ص ۳۷۰ وغیرہ۔

سے اذن جہاد لے کر میدان کارزار میں تشریف لے گئے۔ اور جنگ کرتے ہوئے قبیلہ ابان بن دارم کے ایک شخص کے ہاتھوں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔[1] کہا جاتا ہے کہ اس ملعون کا نام زرعہ بن شریک تھا۔ جو مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر اس طرح واصل جہنم ہوا تھا۔ کہ پانی پیتے پیتے اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا۔

(۱۴) عبداللہ بن علیؑ بن ابی طالب کی شہادت

جناب عبداللہ حضرت امیر المومنینؑ کے فرزند۔ والدہ ماجدہ ام البنینؑ فاطمہ بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن وحید بن کعب بن عامر بن کلاب کلابیہ ہیں۔ جناب عبداللہ حضرت قمر بنی ہاشمؑ سے چھوٹے اور اپنے دوسرے دونوں بھائیوں جو جعفر بن علیؑ و عثمان بن علیؑ) سے بڑے تھے جب اولاد ام البنینؑ کی شہادت کی نوبت پہنچی تو قمر بنی ہاشمؑ نے اپنے تینوں بھائیوں کو جمع کر کے فرمایا: ﴿تقدموا یا بنی امی! حتی اراکم قد نصحتم للہ و رسولہ فانہ لا ولد لکم﴾ میری ماں کے بیٹو! آگے بڑھو تا کہ تمہاری جاں نثاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ کیونکہ تمہاری اولاد نہیں ہے۔[2]

پھر عبداللہ کو خطاب کر کے فرمایا جو اپنے دونوں بھائیوں سے بڑے تھے: ﴿تقدم یا اخی حتی اراک قتیلاً واحتسبک!﴾ اے برادر اتم آگے بڑھو تا کہ تمہیں راہ خدا میں کشتہ دیکھ لوں۔ اور اسے اپنے لئے ذخیرۂ آخرت قرار دوں۔

چنانچہ اس کے بعد جناب عبداللہ امامؑ سے اذن جہاد حاصل کر کے میدان کارزار میں گئے۔ اور زبردست حرب و ضرب کے بعد بالآخر ھبیت حضرمی ملعون کے ہاتھوں جام شہادت نوش[3] کیا۔ آپ کی عمر بوقت شہادت پچیس سال[4] تھی۔

(۱۵) عثمان بن علیؑ بن ابی طالبؑ کی شہادت

جناب ابوالفضلؑ کے دوسرے سگے بھائی ہیں۔ جو عبداللہ سے چھوٹے اور جعفر سے بڑے تھے۔ ارباب تاریخ نے لکھا ہے کہ جب ان کی ولادت ہوئی۔ تو جناب امیر المومنینؑ نے یہ فرما کر ان کا نام عثمان رکھا کہ ''انــمــا

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۵۵۔ ذخیرۃ، ص ۱۳۸۔ عاشر بحار، ص ۲۰۱۔ نفس المہموم، ص ۱۴۳۔ مقاتل، ص ۶۰ وغیرہ۔

[2] عاشر بحار، ص ۲۰۱۔ نفس المہموم، ص ۱۷۲۔ مقتل الحسین، ص ۳۰۹ وغیرہ۔ مخفی نہ رہے کہ طبری وغیرہ بعض مورخین نے اس جملہ کے غلط معنی مراد لئے ہیں۔ کہ جناب شہزادہ کا مقصد یہ تھا کہ میں تمہاری وراثت حاصل کروں۔ حالانکہ یہ معنی درایت اور روایت کے قانون کے خلاف ہیں۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ﴿فینقطع نسلکم فیشتد بالی و یعظم اجری﴾ (ذخیرۃ الدارین، ص ۲۵۱)۔ اس طرح تمہاری نسل منقطع ہو جائے گی جس کی وجہ سے مجھے زیادہ رنج و الم پہنچے گا۔ اور اس طرح میرا اجر و ثواب زیادہ ہوگا۔ (منہ عفی عنہ)

[3] بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۱۔ مناقب، ج ۳، ص ۲۷۶۔ قمقام، ص ۲۷۲۔

[4] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۲۰۱۔

سمیتہ باسم اخی عثمان بن مظعون "میں نے ان کا نام اپنے دینی بھائی عثمان بن مظعون کے نام پر رکھا ہے۔[1] (جو کہ ایک جلیل القدر عابد وزاہد صحابیٔ رسول مقبولؐ تھے) بوقت شہادت بنا بر مشہور ان کی عمر اکیس (۲۱) اور سید داؤد نسابہ صاحب عمدۃ الانساب کے بیان کے مطابق تیئس (۲۳) برس تھی۔ بایں تفصیل کہ اپنے بھائی عبداللہ سے دو برس بعد متولد ہوئے۔ چار سال اپنے والد ماجد کے زیر سایہ رہے۔ اور چودہ برس بڑے بھائی امام حسن کی رفاقت اور امام حسینؑ کے ساتھ پورے تیئس برس گزارے۔ اور یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہرکیف جناب عبداللہ کی شہادت کے بعد جناب قمر بنی ہاشمؑ نے ان کو میدان وغا کی طرف روانہ کیا۔ فرزند حیدر کرارؑ امام علیہ السلام سے اذن جہاد حاصل کرنے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے شعلۂ نار کی طرح لشکر اشرار پر ٹوٹ پڑا ؎

انی انا عثمان ذوالمفاخر — شخیی علی ذو الفعال الظاہر

ھذا حسین خیرۃ الاخایر — وسید الصغائر والکبائر

شدید جنگ کے بعد اس طرح شہادت پائی۔ کہ خولی بن یزید اصبحی ملعون نے ایسا زبردست تیر مارا کہ شہزادہ زین فرس سے زمین پر گرا۔ اس اثنا میں ابان بن دارم کے قبیلہ کے ایک شخص نے بڑھ کر ان کو شہید کر کے سر مبارک قلم کر لیا۔[2] رضوان اللہ علیہ

(۱۶) جعفر بن علیؑ بن ابی طالب کی شہادت

یہ شہزادہ جناب قمر بنی ہاشم کے سب سے چھوٹے تیسرے پدری و مادری بھائی ہیں۔ ان کی عمر بالعموم کتب مقاتل میں ۱۹ برس درج ہے۔ جو بظاہر اشتباہ ہے۔ کیونکہ جناب امیر المومنینؑ کی شہادت ۴۰ھ میں واقع ہوئی اور واقعہ کربلا ۶۱ھ میں درپیش آیا۔ اس طرح ان کی عمر کم از کم اکیس (۲۱) برس ہونی چاہئے (اگرچہ پہلے قول کی بھی تاویل بعید ممکن ہے) اس لئے صاحب ابصار العین کا قول صحیح ہے۔ کہ ان کی عمر اکیس (۲۱) برس تھی۔ اور چونکہ یہ جناب عثمان سے دو برس چھوٹے تھے۔ اس لئے ان کی عمر تیئس اور وہ جناب عبداللہ سے دو برس کم تھے۔ اس لئے ان کی پچیس سال تسلیم کرنا پڑے گی۔ بعض آثار سے آشکار ہوتا ہے کہ جناب امیرؑ نے اپنے بھائی جعفر طیار کے نام پر ان کا نام جعفر رکھا۔[3] عثمان بن علیؑ کی شہادت کے بعد ابوالفضلؑ نے ان کو میدان قتال کی طرف بھیجا۔ چنانچہ یہ رخصت جنگ حاصل کرنے کے بعد یہ رجز پڑھتے ہوئے لشکر اعداء پر حملہ آور ہوئے۔

---

[1] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۲۷۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۶۳۔

[2] عاشر بحار، ص ۲۰۱۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۶۲۔ ذخیرہ، ص ۱۲۷۔ نفس المہموم، ص ۱۷۳۔ لواعج الاشجان، ص ۱۳۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۵۷ وغیرہ۔

[3] ذخیرۃ الدارین، ص ۱۳۶۔

الی انا جعفر ذو المعالی — ابن علی الخیر ذی النوال

حسبی بعمی شرفاً و خالی — احمی حسیناً ذا الندی المفضال

پھر داد شجاعت دیتے ہوئے ہانی بن ثبیت ملعون کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ اور بروایتے خولی بن یزید اصبحی نے نیزہ مارا جوان کی پیشانی یا آنکھ میں لگا۔ جس سے ان کی شہادت واقع[1] ہوئی۔

(۱۷) قمر بنی ہاشم عباس بن علی بن ابی طالب کی شہادت

آپ کی ولادت با سعادت مدینہ منورہ میں ۴ شعبان[2] المعظم ۲۶ھ[3] کو واقع ہوئی۔ ۱۴ سال اپنے والد ماجد حضرت امیر المومنینؑ کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ ان کے حین حیات میں بعض جنگوں کے موقع پر حاضر تھے۔ مگر آنجنابؑ نے انہیں جنگ کی اجازت نہیں دی۔[4] اپنے عظیم والد کی شہادت کے بعد دس سال جناب امام حسن علیہ السلام کی زیر تربیت رہے۔ اور ان کی شہادت کے بعد قریباً دس سال امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں گذارے۔ اس طرح بوقت شہادت ان کی عمر چونتیس (۳۴) سال تھی۔

جناب ام البنینؑ کے مختصر حالات

آپ کی والدہ ماجدہ جناب ام البنین فاطمہ بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن عامر الکلابی تھیں۔

جناب امیر علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیل سے فرمایا تھا۔ (جو علم الانساب میں بڑے ماہر تھے) کہ میں چاہتا ہوں کہ دلیر اور شجاع ترین خاندان عرب میں شادی کروں۔ اس لئے کسی ایسے خاندان کا انتخاب کرو۔ تاکہ اس سے بہادر اولاد پیدا ہو۔ جناب عقیلؓ نے عرض کیا۔ کہ اس مقصد کے لئے بنی کلاب کی ام البنین سے عقد کیجئے۔ کیونکہ عربوں میں اس کے آباؤ اجداد سے زیادہ کوئی شجاع و دلیر نہیں ہے۔ چنانچہ آنجنابؑ نے اس طرح ان محترمہ سے شادی کی۔[5] یہ خاندان تمام عربوں میں صف شکنی اور شیر افگنی میں مشہور و معروف تھا۔ عرب کے مشہور شاعر لبید نے جو خود اسی خاندان سے تھا۔ اپنے خاندان کے بارے میں یہ شعر کہا اور تمام قبائل عرب نے سنا۔ مگر کسی کو یارائے انکار نہ ہوسکا۔

نحن بنوام البنین الاربعة — ونحن خیر عامر بن صعصعة

الضاربون الهام وسط الجمجمة

۱؎ عاشر بحار، ص ۲۰۱۔ فرسان الہیجا، ج ۱، ص ۲۷۔ ذخیرہ، ص ۱۳۹۔ قمقام، ص ۲۷۱۔ لواعج، ص ۱۴۳۔ مناقب، ج ۴، ص ۱۰۷ وغیرہ۔

۲؎ وقائع الایام بیرجندی۔ انوار نعمانیہ۔ العباس للمقرم۔ فرسان، ج ۱، ص ۱۸۷ وغیرہ۔

۳؎ المجالس السنیہ للعاملی، ج ۱، ص ۱۳۹۔ بحوالہ العبد الصالح للشامی وغیرہ۔

۴؎ عمدۃ الطالب، ص ۳۲۳، طبع بمبئی۔

۵؎ فرسان الہیجا، ج ۱، ص ۱۸۷۔

اسی خاندان کی ایک فرد ملاعب الاسنہ ابو براء بھی ہیں جو تمام قبائل عرب میں اپنی شجاعت وشہامت میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح طفیل فارس قرزل اور عامر بن طفیل بھی اسی خاندان کے نامی گرامی جنگ جو بہادر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس معظمہ کے بطن سے خداوند عالم نے جناب امیر المومنینؑ کو چار فرزندار جمند عطا فرمائے: (۱) ابوالفضل العباسؑ۔ (۲) عبداللہ۔ (۳) عثمان۔ (۴) جعفر۔ جو سب کے سب روز عاشورا نصرت امامؑ میں کام آئے۔ اور دنیا کے سوتیلے بھائیوں کے لئے وفاداری و جاں نثاری کی گرانقدر مثال قائم کر دی۔ یہ مخدرہ واقعہ کربلا کے وقت زندہ اور مدینہ منورہ میں موجود تھیں۔ آپ کے جگر خراش مراثی کتب مقاتل و سیر میں موجود ہیں۔

القاب والکنیٰ

جناب قمر بنی ہاشمؑ کی مشہور کنیت ابوالفضل ہے۔ علاوہ بریں دو کنیتیں اور بھی بیان کی جاتی ہیں: (۱) ابوالقاسم۔ (۲) ابوالقربہ، جو زیارت جناب جابر بن عبداللہ انصاری سے ماخوذ ہیں۔ آپ کے زیادہ مشہور القاب قمر بنی ہاشم اور سقائے اہل بیتؑ ہیں۔ علاوہ بریں باب الحوائج، الشہید، العبدالصالح، صاحب اللواء بھی آپ کے القاب جلیلہ ہیں۔[1]

شکل وشمائل

آپ کشیدہ قامت متناسب اعضاء کے نہایت وجیہہ نوجوان تھے۔ تمام ارباب سیر و تراجم نے آپ کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ ﴿ان العباس کان وسیماً جسیماً جمیلاً یرکب الفرس المطھم و رجلاہ یخطان علی الارض و یقال لہ قمر بنی ھاشم﴾ یعنی جناب عباسؑ بہت حسین وجمیل اور جسیم ووسیم تھے۔ وہ رکاب گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ مگر پھر بھی پائے مبارک زمین پر خط دیتے تھے۔ ان کے خداداد حسن و جمال کی وجہ سے ان کو قمر بنی ہاشم کہا جاتا تھا۔[2] صاحب فرسان الہیجاء نے ان کے حسن و جمال کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ اگر کبھی شہزادہ ابوالفضلؑ اور شہزادہ علی اکبرؑ اکٹھے مدینہ کے کسی گلی کوچہ سے گذر ہوتا۔ تو سب زن ومردان کے جمال باکمال کا نظارہ کرنے کے لئے جمع ہو جاتے۔ اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔[3] اسی طرح آنجناب شجاعت وشہامت اور بہادری میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے۔

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۸۹۔

[2] مقاتل الطالبین، ص ۵۹۔ عاشر بحار، ص ۲۰۱۔ نفس المہموم، ص ۱۷۷ وغیرہ۔

[3] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۸۸۔

فضائل ومناقب کا ایک شمہ

مذکورہ بالا ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ قمر بنی ہاشمؑ کا دامن باطنی وروحانی خوبیوں سے بھی لبریز تھا۔ اور ایمان وعمل کی اوج کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ اور مکارم اخلاق وفضائل نفسانیہ کے بلند درجہ پر فائز تھے۔ ان کے بچپن کا ایک عجیب واقعہ بعض کتب میں ملتا ہے۔ ایک مرتبہ قمر بنی ہاشمؑ، جناب عباسؑ اور عقیلۂ بنی ہاشم جناب زینبؑ اپنے عظیم والد جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے۔ شہزادہ دائیں جانب اور شہزادی بائیں طرف۔ امیر علیہ السلام نے شہزادہ سے فرمایا: ﴿قل واحد﴾ کہو: ایک۔ شہزادہ نے کہا: ﴿واحد﴾۔ پھر فرمایا: ﴿قل اثنان﴾ کہو: ''دو'' شہزادہ نے عرض کیا: ﴿استحی ان اقول باللّسان الذی قلت واحد اثنان﴾ جس زبان سے ایک بار ایک کہہ دیا ہے۔ اب اس سے دو کہتے ہوئے حیاد امنگیر ہوتی ہے۔ جناب امیرؑ نے شہزادہ کا یہ موحدانہ جواب سن کر ان کی آنکھوں پر بوسہ دیا۔ پھر جناب زینبؑ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بی بی نے معصومانہ انداز میں سوال کیا: ﴿یا ابتاہ اتحبناہ؟﴾ بابا جان! کیا آپ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿نعم یا بنیہ! اولادنا اکبادنا﴾ ہاں بیٹی! ہماری اولاد ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ بی بی نے عرض کیا: ﴿یا ابتاہ حبّان لا یجتمعان فی قلب مؤمن. حب اللّٰہ و حبّ الاولاد﴾ بابا جان! بھلا مؤمن کے دل میں خدا اور اولاد دونوں کی محبت کیونکر جمع ہو سکتی ہے؟ پھر جناب امیرؑ کے جواب ارشاد فرمانے سے پہلے باپ کی زینت بیٹی نے خود ہی یہ عقدہ یوں حل کر دیا۔ بابا جان! آپؑ کا مطلب یہ ہوگا کہ ﴿الشفقة لنا و الحب للّٰہ خالصًا﴾ شفقت ہمارے لیے اور محبت خالصاً خدا کے لیے؟ جناب امیر علیہ السلام اپنے شہزادے اور شہزادی کا یہ کلام حقائق ترجمان سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ اور شفقت پدری میں اضافہ ہو گیا۔ سچ ہے۔[1]

فی المهد ینطق عن سعادة جده   اثر النّجابة ساطع البرهان

جناب شہزادہؑ کا ایمان وایقان

جناب قمر بنی ہاشمؑ کی بلندیٔ کردار وایثار اور ایمان وایقان کا یہ عالم ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام ان کی تعریف وتوصیف میں رطب اللّسان نظر آتے ہیں۔ چنانچہ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: ﴿رحم اللّٰہ عمّی العباس فلقد آثر و ابلٰی و فدیٰ اخاہ بنفسہ حتّٰی قطعت یداہ فابدلہ اللّٰہ عزّ و جلّ منہما جناحین یطیر بہما مع الملائکة فی الجنة کما جعلہ لجعفر بن ابی طالبؑ و ان للعباس عند اللّٰہ منزلة یغبطہ بہا جمیع الشہداء یوم القیامة﴾۔ ''خدا میرے چچا عباسؑ پر رحمت نازل کرے۔ جنہوں نے بڑے مصائب و

---

[1] مستدرک الوسائل، ج ۳، ص ۶۳۵۔ مقتل الحسین للخوارزمی، ج ۲، ص ۱۲۲۔

شدائد جھیلے، ایثارکاری وجاں نثاری کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جان اپنے بھائی پر قربان کر دی۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں ان کے دونوں بازو بھی قلم ہوگئے۔ جن کے عوض خداوند عالم نے ان کو دو پر عطا فرمائے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وہ جنت میں فرشتوں کے ساتھ اڑتے پھرتے ہیں۔ جس طرح جناب جعفر بن ابی طالبؑ کو عطا فرمائے تھے۔ خداوند عالم کے نزدیک جناب عباس کا مقام اس قدر بلند ہے کہ بروز قیامت تمام شہداء ان کے اوپر رشک کریں گے۔"[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿كان عمنا العباس نافذ البصيرة صلب الايمان جاهد مع اخيه الحسينؑ و ابلى بلاءً حسناً و مضى شهيداً﴾ ہمارے عم بزرگوار عباس علمدارؑ کی بصیرت تیز اور ایمان (مانند چٹان) مضبوط تھا۔ اپنے بھائی امام حسینؑ سے مل کر عظیم جہاد کیا۔ اور بڑے عمدہ صبر وثبات کے ساتھ شدائد جنگ کو برداشت کیا۔ یہاں تک کہ نصرت امام میں شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز ہوئے۔[2]

اسی طرح ائمہ اطہار علیہم السلام سے جناب شہزادہ ابوالفضل کی زیارت میں جو فقرے وارد ہیں۔ ان سے بھی ان کے مقام ومنزلت کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے زیارت صادقؑ کے یہ فقرے: ﴿اشهد انك قد بالغت في النصيحة و اعطيت غاية المجهود..... اشهد انك لم تهن ولم تنكل و انك مضيت على بصيرة من امرك..... فنعم الصابر المجاهد المحامي الناصر و الاخ الدافع عن اخيه المجيب الى طاعة ربه الراغب فيما زهد فيه غيره من الثواب الجزيل و الثناء الجميل[3]..... الخ﴾

جناب ابوالفضل کا شمار فقہاء اہل بیت میں ہوتا تھا۔ چنانچہ فاضل بیرجندی نے لکھا ہے: ﴿ان العباس من اكابر الفقها و افاضل اهل البيت... الخ﴾ جناب عباسؑ اکابر فقہاء اور فضلائے اہل بیتؑ میں سے تھے۔[4]

اسی طرح صاحب فرسان الہیجاء نے بعض کتب کے حوالہ سے ان کے بارے میں لکھا ہے: ﴿و كان من فقهاء اولاد الائمة﴾ جناب عباسؑ ائمہ طاہرینؑ کی اولاد میں سے فقیہہ تھے۔[5]

جناب شہزادہؑ کے اہل وعیال

جناب قمر بنی ہاشمؑ کی زوجۂ محترمہ لبابہ بنت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب تھیں۔ جن کے بطن سے جناب

---

[1] خصال شیخ صدوق، ص ۴۳، مع ترجمہ فارسی۔

[2] عمدۃ الطالب، ص ۳۲۳، نفس المہموم، ص ۱۷۶۔ فرسان، ج ۱، ص ۱۹۱۔

[3] کامل الزیارۃ، ص ۲۵۷۔ مفاتیح الجنان، ص ۴۳۶۔

[4] کبریت احمر، ج ۲، ص ۴۵۔

[5] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۹۱۔

کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک فضل۔ دوسرے عبید اللہ۔ جناب کی نسل کا سلسلہ عبید اللہ سے آگے بڑھا[1] یہی قول مشہور ہے۔ مگر کتاب العباس للمقرم میں جناب کی پانچ بلکہ چھ عدد اولاد امجاد کا تذکرہ موجود ہے۔ دو تو یہی صاحبزادے جو جناب لبابہ کے بطن سے تھے۔ تیسرے حسن جو کہ ایک کنیز کے بطن سے تھے۔ بحوالہ معارف ابن قتیبہ، چوتھے قاسم جسے بعض کتب مقاتل نے نقل کیا ہے۔ پانچویں ایک دختر نام نہیں لکھا۔ بحوالہ حدائق الانس۔ چھٹے محمد، جنہیں ابن شہر آشوب نے شہداء کربلا کی فہرست میں درج کیا ہے۔ اس کے بعد مؤلف نے بعض تفصیلات کا ذکر کیا ہے جن کے یہاں درج کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔ اس سلسلہ میں کتب انساب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

کربلا میں جناب ابوالفضلؑ کے جلیل القدر خدمات

واقعۂ کربلا سے پہلے بعض کتب غیر معتبرہ میں حضرت امیرالمومنینؑ کی بعض لڑائیوں میں شہزادہ ابوالفضل کی شجاعت کے بعض محیر العقول واقعات درج ہیں لیکن وہ چونکہ ناقابل اعتماد ہیں۔ اس لیے ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ البتہ شہادت سے پہلے واقعۂ کربلا میں جناب شہزادہ کی جلیل القدر خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں:

(۱) جناب شہزادہ ہر وقت سایہ کی طرح امام علیہ السلام کے ہمراہ رہتے۔ مبادا ان کو کوئی گزند پہنچ جائے۔

(۲) عصر عاشوراء جب لشکر اعداء ہجوم کرکے خیام حسینی کے قریب پہنچ گیا۔ تو اس وقت امامؑ نے انہی کو بھیجا تھا کہ معلوم کریں کہ اس وقت ان کے اس طرح آدھمکنے کا مقصد کیا ہے؟ جو جناب شہزادہ کی معاملہ فہمی اور نظر امامؑ میں ان کے انتہائی قابل اعتماد ہونے کی دلیل ہے۔

(۳) شب عاشوراء امامؑ کے تاریخی خطبہ کے بعد جناب شہزادہ نے مومنانہ اور شجاعانہ انداز میں نصرت امامؑ کے عہد کی تجدید کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿لا اراناَ اللہ ذلک الیوم ابداً﴾ (خدا ہمیں وہ دن کبھی نہ دکھائے کہ چشم زدن کے لیے بھی آپ کو تنہا چھوڑ کر آپؑ سے علیحدہ ہوں)۔

(۴) اسی طرح شدت پیاس کے وقت جن مشکلات میں گھر کر جناب خیام حسینی میں پانی لائے تھے۔

(۵) اور روز عاشوراء جب عمرو بن خالد صیداوی اور ان کے ساتھی نرغۂ اعداء میں گھر گئے تھے تو بحکم امامؑ جس طرح قمر بنی ہاشم ان کی نصرت کے لیے میدان میں پہنچے۔ اور دشمنوں کے نرغہ سے ان کو نکالا۔ یہ سب واقعات قبل ازیں اپنے اپنے مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر کیے جا چکے ہیں۔ جو آپ کے کمال شجاعت و شہامت اور صلابت ایمان و استقامت ایقان پر دلالت کرتے ہیں۔

---

[1] عمدۃ الطالب، ص ۳۴۴۔

(۶) وہ واقعہ بھی جناب ابوالفضل کے کمال ایمان وایقان اور مصائب وآلام پر صبر واستقامت کا شاہکار ہے کہ جب شمر ذی الجوشن (جو ماں کی طرف سے آپ کا رشتہ دار تھا) ابن زیاد سے جناب شہزادہ اور ان کے تینوں بھائیوں کے لیے امان نامہ لکھوا کر لایا تھا۔ اور پھر خیام حسینی کے قریب آ کر بآواز بلند کہا: ﴿این بنو اختنا؟﴾ ہماری بہن کے بیٹے کہاں ہیں؟ شہزادوں نے سنا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اجیبوہ و ان کان فاسقاً فانه بعض اخوالکم﴾ "جواب دو۔ اگرچہ وہ فاسق وفاجر ہے۔ لیکن پھر بھی تمہارا دور کا ماموں ہوتا ہے۔" اس وقت جناب ابوالفضل نے باہر نکل کر دریافت کیا: ﴿ما شانک؟﴾ کیا بات ہے؟ شمر نے کہا: ﴿یا بنی اختی! انتم امنون. فلا تقتلوا انفسکم مع اخیکم الحسینؑ والزموا طاعة امیر المومنین یزید﴾ اے میری بہن کے بیٹو! تمہیں امان ہے تم خواہ مخواہ اپنے بھائی حسینؑ کے ہمراہ اپنی جانیں ضائع نہ کرو۔ بلکہ امیر یزید کی اطاعت قبول کرلو۔ یہ سنتے ہی جناب عباسؑ نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ فرمایا: ﴿تبت یداک و بئس ما جئتنا به من امانک یا عدو اللّٰہ اتامرنا ان نترک اخانا و سیدنا الحسینؑ بن فاطمة و ندخل فی طاعة اللعنا و اولاد اللعناء﴾ تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں او خدا کے دشمن! تو کس قدر برا امان نامہ لایا ہے؟ کیا تو یہ کہتا ہے کہ ہم اپنے بھائی اور سردار حسینؑ بن فاطمہؑ کو چھوڑ دیں۔ اور لعین بن لعین کی اطاعت قبول کرلیں۔ یہ جواب سن کر شمر غیظ و غضب سے بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔[1] نعم ما قیل [illegible]

اسلام کے وقار کی اونچی چٹان پر ۔۔۔ عباسؑ کی وفا کے ہیں جھنڈے گڑے ہوئے

ابوالفضل عباسؑ کی شہادت

ارباب سیر ومقاتل میں جناب کی شہادت اور طرح مشہور ہے۔ لیکن جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ اور جناب سید بن طاؤس علیہ الرحمہ نے اور طرح رقم فرمائی ہے۔ بطریق مشہور اس واقعہ ہائلہ کو قلمبند کرنے سے پہلے حضرت شیخ وسید کے بیان کے مطابق اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں: کہ اصحاب واقرباء کی شہادت کے بعد جب پیاس کا اور بھی زیادہ غلبہ ہوا تو جناب سید الشہداءؑ نے اپنی ناقہ پر سوار ہو کر دریائے فرات کا رخ کیا۔ اور شہزادہ ابوالفضل آپؑ کے آگے آگے حفاظت امامؑ میں معروف جہاد ہو گئے۔ جدھر جدھر سید الشہداءؑ رخ کرتے۔ جناب شہزادہ بھی ادھر ہی مڑ جاتے اور داد شجاعت دیتے جاتے۔ ایک دارمی شخص نے بآواز بلند لشکر ابن سعد سے کہا: ﴿ویلکم حولوا بینه وبین الفرات ولا تمکنوه من الماء﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ان کے اور نہر فرات کے درمیان حائل ہو جاؤ۔ اور انہیں پانی تک نہ پہنچنے دو۔ امامؑ نے اس کا یہ گستاخانہ کلام سن کر فرمایا: ﴿اللّٰھم اظماہ﴾

---

[1] ملہوف ص ۷۷، ۷۸، وغیرہ۔

خداوندا! اسے شدت پیاس میں مبتلا کر۔[1] امامؑ کے اس کلام سے دارمی نے غضب ناک ہوکر زور سے ایک تیر مارا۔ جو جناب سید الشہداءؑ کے سینہ اقدس میں پیوست ہوگیا۔ جب جنابؑ نے اسے کھینچا تو خون کا فوارہ چھوٹا۔ آپؑ نے دونوں چلو نیچے رکھے جب خون سے بھر گئے تو فرمایا: ﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَشْکُوْ اِلَیْکَ مَا یُفْعَلُ بِابْنِ بِنْتِ نَبِیِّکَ﴾ خداوندا! میں تیری بارگاہ میں اس سلوک کی شکایت کرتا ہوں۔ جو تیرے رسول کی دختر کے فرزند کے ساتھ کیا جارہا ہے۔"

(چونکہ سپاہ ابن سعد راستہ میں پرہ باندھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس لیے جناب سید الشہداءؑ نے آگے بڑھنے کی مزید کوشش کو بے سود سمجھ کر) واپس لوٹنے کا قصد فرمایا۔ اس اثنا میں قوم اشقیاء قمر بنی ہاشم پر ٹوٹ پڑی اور ان کو امامؑ سے علیحدہ کردیا۔ اب شہزادہ نے تن تنہا خدمت اسلام و نصرت امامؑ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے زبردست جنگ کی۔ حتیٰ کہ جب زخموں سے چور چور ہوکر زین فرس سے زمین پر تشریف لائے۔ اور لڑنے کے قابل نہ رہے۔ تو زید بن ورقا حنفی اور حکیم بن طفیل سنبسی نے ان کو شہید کردیا۔[2] رضوان اللّٰہ تعالےٰ علیہ

جناب ابن طاؤس کا بیان ہے کہ ﴿فبکی الحسین لقتله بکاءً شدیداً﴾ شہادت عباسؑ پر جناب سید الشہداء پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اسی بنا پر شاعر کہتا ہے ۔

احق الناس ان یبکی علیه ۔۔۔ فتیً ابکی الحسین بکربلا

اخوه و ابن والده علی ۔۔۔ ابو الفضل المضرج بالدماء

ومن واساه لایثنیه شیء ۔۔۔ وجادله علی عطش بماءٍ[3]

کیفیت شہادت ابوالفضل العباسؑ بطریق مشہور

عموماً کتب مقاتل میں جناب ابوالفضل عباسؑ کی شہادت کی کیفیت اس طرح مرقوم ہے اور یہی ہمارے نزدیک اصح ہے کہ جب امامؑ کے تمام کے تمام اصحاب و اعوان شہادت کا جام نوش کر چکے۔ اور جناب قمر بنی ہاشمؑ نے سید الشہداءؑ کی بے کسی اور تنہائی دیکھی۔ تو خدمت امامؑ میں حاضر ہوکر عرض کیا: ﴿یا اخی هل من رخصة؟﴾ بھائی جان! کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں؟ یہ سن کر ﴿بکی الحسینؑ بکاءً شدیداً﴾ جناب امام حسین علیہ السلام نے سخت گریہ وبکا کیا۔ پھر فرمایا: ﴿یا اخی انت صاحب لوائی﴾ بھائی جان تم میرے علمدار ہو۔ تمہارے چلے جانے

---

[1] روایان اخبار کا بیان ہے کہ یہ ملعون اسی وقت مرض استسقاء میں مبتلا ہوگیا۔ جس قدر پانی پیتا تھا پیاس نہیں بجھتی تھی حتیٰ کہ شدت پیاس سے بلک بلک کر اور آب آب کرتے ہوئے واصل جہنم ہوگیا۔ ﴿و ان عذاب الآخرة اشد و ابقی﴾۔ (قمقام، ص ۳۲۵۔ نفس المہموم، ص ۱۷۵ وغیرہ)۔

[2] ارشاد شیخ مفید، ص ۲۶۲۔ لہوف سید ابن طاؤس، ص ۱۰۳۔

[3] لہوف، ص ۱۰۳۔

سے سب سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ جناب عباسؑ نے عرض کیا ﴿قد ضاق صدری وسئمت من الحیوۃ وارید ان اطلب ثاری من ہؤلاء المنافقین﴾ (حالات حاضرہ دیکھ کر) میرا سینہ تنگ ہو گیا ہے۔ اور زندگانی دنیا سے تنگ ہو گیا ہوں۔ اس لیے اب چاہتا ہوں کہ ان منافقوں سے انتقام لوں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ﴿فاطلب لھؤلاء قلیلاً من الماء﴾ اچھا (اگر جنگ کا خیال ہے) تو پھر ان اطفال خورد سال کے لئے کچھ تھوڑا سا پانی لاؤ۔۔ جناب ابوالفضلؑ گھوڑے کو ایڑ لگا کر قوم اشقیاء کے پاس تشریف لے گئے۔ اور ان کو پند و نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿یا عمر بن سعد! ھذا الحسین بن بنت رسول اللّٰہ یقول انکم قتلتم اصحابہ واخوتہ وبنی اعمامہ وبقی فریداً مع اولادہ وعیالہ وھم عطاش قد احرق الظماء قلوبھم﴾ اے پسر سعد! یہ حسینؑ دختر رسولؐ کے بیٹے! فرماتے ہیں کہ تم نے ان کے اصحاب اور اعزا کو شہید کر دیا ہے۔ اب وہ مخدرات عصمت اور اطفال خورد سال کے ساتھ یکا و تنہا رہ گئے ہیں۔ جن کے دلوں کو شدت پیاس نے جلا دیا ہے۔ (یعنی ان کے لئے کچھ پانی کا انتظام کر دو) جناب قمر بنی ہاشمؑ کے اس کلام کا یہ اثر ہوا۔ کہ فوج مخالف کے بعض لوگ رونے لگے۔ اور بعضوں نے سر نیچے جھکا لئے یہ حالت دیکھ کر شمر اور شبث بن ربعی آگے بڑھے اور کہا: ﴿یابن ابی تراب! لو کان کل وجہ الارض ماء وھو فی ایدینا ما اسقینا کم منہ قطرۃً واحدۃ الا ان تدخلوا فی بیعۃ یزید﴾ اے ابوترابؑ کے بیٹے! اگر بالفرض تمام روئے زمین پر پانی ہی پانی ہو جائے۔ اور پھر وہ سب ہمارے قبضہ میں ہو تب بھی ہم اس وقت تک تمہیں ایک قطرہ نہ دیں گے۔ جب تک یزید کی بیعت نہ کرو۔" ان کا یہ کافرانہ جواب سن کر جناب عباسؑ مایوس ہو کر واپس خدمت امامؑ میں پلٹ آئے اور سارا ماجرا گوش گذار کیا۔ سید الشہداؑ سر نیچا کر کے اس قدر روئے کہ گریبان تر ہو گیا۔ اسی اثنا میں خیام حسینیؑ سے بچوں کی صدائے العطش العطش بلند ہوئی۔ امام علیہ السلام شہزادہ کو پانی لانے کا حکم تو پہلے ہی دے چکے تھے۔ اب بچوں کا نالہ و شیون سن کر سقائے اہل بیتؑ کو تاب صبر و ضبط نہ رہی۔ آسمان کی طرف منہ کر کے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: ﴿الٰھی و سیدی ارید ان اعتد بعدتی واملأ لھؤلاء الاطفال قربۃ من الماء﴾ خداوندا! میں چاہتا ہوں۔ اپنی امکانی کوشش کو بروئے کار لاتے ہوئے ان بچوں کے لئے پانی کا ایک مشکیزہ بھر لاؤں۔ اس کے بعد مشکیزہ و تلوار ہاتھ میں لیکر اور گھوڑے پر سوار ہو کر نہر فرات کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت یہ رجز زبان پر جاری تھا ؎

لا ارھب الموت اذا الموت رقا　　حتی اواری فی المصالیت لقا

نفسی لنفس المصطفیٰ الطھر وقا　　انی انا العباس اغدو بالسقا

ولا اخاف الشر یوم الملتقی

پھر صاعقہ آتش بار کی طرح لشکر فجار کی صفوں کو چیرتے ہوئے نہر فرات کی طرف بڑھے۔ ادھر جب سپاہ ابن سعد کو فرزند حیدر کرار کے عزم وارادہ کا علم ہوا۔ تو چار ہزار کا لشکر جرار جو نہر فرات پر متعین تھا۔ یکبارگی حرکت میں آ گیا۔ یہ حالت دیکھ کر شجاعت علویہ کے وارث نے تلوار میان سے کھینچ لی اور برق خاطف وصرصر عاصف کی مانند دشمنان اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ اور کشتوں کے پشتے لگانے شروع کر دیے۔ اور ان کی صفوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ چنانچہ میمنہ کو میسرہ پر اور میسرہ کو میمنہ پر الٹ دیا۔ اسی زد وخورد میں اسی (۸۰) ناریوں کو داصل جہنم کیا اس وقت یہ رجز پڑھ رہے تھے ؎

اقاتل القوم بقلب مهتد — اذب عن سبط النبی احمدٌ

اضربکم بالصارم المهنّد — حتی تحید واعن قتال سیدیٌ

انی انا العباس ذوالتوّدد — نجل علی المرتضیٰ المؤیّد

شجاعت ہاشمیہ کے مالک کا یہ محیر العقول کارنامہ دیکھ کر سپاہ نے پسپائی اختیار کی۔ اور راستہ چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ جناب نے اپنا گھوڑا نہر فرات میں ڈال دیا۔ چونکہ شدت پیاس سے قلب وجگر کباب ہو رہے تھے ﴿فلما اراد ان یشرب غرفةً من الماء ذکر عطش الحسین ؑ و اهلبیته فرمی الماء﴾ پانی کا چلو بھرا۔ اور چاہا کہ پئیں لیکن معاً حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ کی پیاس یاد آ گئی۔ (تو شاید یہ سوچ کر کہ یہ طریقہ شان وفا کے خلاف ہے) چلو سے پانی انڈیل دیا۔ اس کے بعد مشکیزہ پانی سے پر کیا۔ باہر نکلے۔ اس وقت تک پھر فوج مخالف پرا باندھ کر راستہ پر کھڑی ہو چکی تھی۔ جناب ابوالفضلؑ کی پوری کوشش تھی۔ کہ کسی طرح یہ پانی خیام حسینیؑ تک پہنچ جائے۔ دوسری طرف مخالفین کی بھی بھرپور کوشش تھی۔ کہ پانی خیام تک نہ پہنچے۔ چنانچہ فوج نے شہزادہ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ تیروں کی بارش ہونے لگی۔ مگر شیر خدا کا بیٹا۔ حملے پر حملہ کر کے سپاہ ابن سعد کو پسپا کر رہا تھا۔ کہ اچانک کمین گاہ سے چھپ کر ایک کمینے نوفل ارزق (اور بروایتے زید بن ورقاء) نے جناب کے دائیں بازو پر ایسا وار کیا کہ بازو قلم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ شہزادہ نے نہایت پھرتی سے مشکیزہ کو بائیں کاندھے پر ڈالا۔ اور بائیں ہاتھ میں تلوار لے کر دفاع کرنا شروع کیا۔ اس وقت یہ اشعار آپ کی زبان اقدس پر جاری تھے ؎

واللّٰه ان قطعتم یمینی — انی احامی ابداً عن دینی

وعن امام صادق الیقین — نجل النبی الطاهر الامین

یہ اشعار زبان پر جاری تھے۔ اور کشت وخون کا بازار بھی گرم تھا۔ مگر بریدہ بازو سے بکثرت خون بہ جانے کی وجہ سے قدرے نقاہت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ کہ اسی اثنا میں اس ملعون نے پھر وار کر کے جناب کا بایاں

بازو بھی قلم کر دیا۔ اس وقت شہزادہ نے یہ اشعار پڑھے ؎

یا نفس لا تخافی من الکفار	وابشری برحمة الجبار
مع النبی السید المختارؐ	قد قطعو البغیهم یساری

فاصلهم یارب حر النار

اگرچہ شہزادہ کے دونوں بازو قلم ہو چکے تھے۔ اب وہ لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مگر مشکیزہ کو دانتوں سے دبا کر اب بھی کوشش یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح پانی کا یہ مشکیزہ خیام تک سلامتی کے ساتھ پہنچ جائے۔ ہائے افسوس سقائے آل محمد کی امیدوں اور آرزوؤں پر اس وقت پانی پھر گیا۔ جب ایک تیر آ کر مشکیزہ میں پیوست ہو گیا اور سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا تیر شہزادہ کے سینہ اقدس پر لگا۔ اور بروایتے حکیم بن طفیل سنبسی نے آہنی گرز اس زور سے سر اقدس پر مارا۔ کہ شہزادہ کا فرق اقدس شگافتہ ہو گیا۔ اور اب گھوڑے کی زین پر سنبھل نہ سکے ناچار فرش زمین پر تشریف لائے۔ گرتے ہوئے امام علیہ السلام کو آواز دی: ﴿یا ابا عبد اللہ علیک من السلام﴾ ابو عبداللہ! میرا آخری سلام قبول ہو۔ جناب سید الشہداء افتاں و خیزاں جناب کی لاش پر تشریف لے گئے۔ اور جب پیکر وفا اور جوان سال بھائی کو اس حال میں کشتہ دیکھا کہ ہاتھ ساتھ نہیں۔ سر شگافتہ ہے۔ بدن زخموں سے چھلنی ہے تو روتے ہوئے فرمایا: ﴿الان انکسر ظهری وقلت حیلتی﴾ عباسؑ اب میری کمر ٹوٹ گئی۔ اور رشتہ تدبیر وقوت کمزور ہو گیا۔

اب خواہ اس وجہ سے کہ عباسؑ ایسے جوان بھائی کی موت نے کمر توڑ دی تھی۔ اس لئے جنابؑ کو لاش اٹھانے کی تاب نہ تھی۔ یا اس وجہ سے کہ بوجہ کثرت جراحات لاش اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ بہر حال جو وجہ بھی ہو۔ مشہور یہی ہے کہ جناب سید الشہداءؑ قمر بنی ہاشم کی لاش مقدس کو وہیں کنار فرات پر چھوڑ کر اور حزن و ملال کے کوہ گراں کو اٹھا کر گریاں و باکاں واپس خیام میں تشریف[1] لائے۔ خیام میں اس قدر گریہ و بکا ہوا کہ مخدرات عصمت و طہارت کے نالہ و شیون سے یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ زمین کربلا تھرتھرا رہی ہے۔[2] بعض روایات کی بنا پر امامؑ نے اس مقام پر یہ اشعار پڑھے ؎

تعدیتم یا شر قوم ببغیکم	و خالفتم دین النبی محمد

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۰۱۔ نفس المہموم، ص ۱۷۹۔ وقائع ایام محرم، ص ۳۹۶۔ منتخب للطریحی۔ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۲۰۵۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۸۰۔ مقتل مقرم، ص ۳۲۷ وغیرہ۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۲۰۵۔

اما کان خیر الرسل او صاکم بنا | اما نحن من نسل النبی المسدد
اما کانت الزهراء امی دونکم | اما کان من خیر البریه احمدً
لعنتم و اخزیتم بما قد جنیتم | فسوف تلاقو حرّ نار توقد[1]

سرکار سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ

آخر وہ حشر ساماں وقت آ گیا کہ حضرت امام حسینؑ کے تمام اصحاب و اعزا ایک ایک کر کے داغ مفارقت دے گئے ؎

نہ لشکر ہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت النا ہے | نہ قاسمؑ نہ علی اکبرؑ ہے نہ عباسؑ ہے

محرم کا اصلی وقت قریب آ گیا۔ سورج ڈھل چکا ہے۔ عصر کا وقت قریب ہے۔ حسینؑ یکہ و تنہا رہ گئے ہیں۔ ﴿نظر یمینا و شمالا﴾ دائیں بائیں نظر کرتے ہیں۔ سب اعوان و انصار اور اعزا و اقرباء کے لاشے خاک و خون میں غلطاں پڑے ہیں۔ اور کوئی یار و مددگار اور مونس و غمگسار نظر نہیں آتا۔ چند انصار کو نام بنام پکار کر فرماتے ہیں۔

یا ابطال الصفا و یا فرسان الهیجا | مالی انادیکم فلا تجیبون و ادعو کم فلا تسمعون[2]

اے شجاعان باصفا و شیران بیشہ وغا۔ کیا بات ہے کہ میں تمہیں پکارتا ہوں مگر تم جواب نہیں دیتے۔ اور میں تمہیں بلاتا ہوں مگر تم نہیں سنتے۔

سب انصار و اقرباء داغ مفارقت دے چکے ہیں۔ جن کے غم میں حسینؑ دل شکستہ ہیں۔ عباسؑ کی موت نے کمر توڑ دی ہے۔ علی اکبرؑ کی شہادت نے گویا آنکھوں کی بصارت زائل کر دی ہے۔ کئی دن کی بھوک و پیاس۔ کربلا کی قیامت خیز تپش سر پر پڑ رہی ہے۔ ستاون سال کا سن ہے۔ ان حالات میں جنگ کریں تو کیونکر؟ اگر حسینؑ کی جگہ کوئی اور انسان ہوتا تو اپنا سر خود شمشیر قاتل کے سپرد کر دیتا۔ مگر شجاعت نبویہ و صولت حیدریہ کے وارث حسینؑ کے لئے ایسا کرنا ناممکن تھا کیونکہ خود سپردگی قوانین اسلام کے خلاف ہے اور حفاظت خود اختیاری لازم ہے۔ حسینؑ نے آخر وقت تک اپنے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر ظاہری اسباب کی بنا پر جنگ کرنے کا لطف تو جب ہی تھا کہ جب آپؑ تلوار لے کر حملہ آور ہوتے۔ اور ایک طرف حضرت عباسؑ داد شجاعت دیتے ہوتے۔ ایک طرف علی اکبرؑ معرکہ جنگ میں جوہر دکھاتے ہوتے۔ ایک طرف اصحاب حفاظت کے لئے ساتھ ساتھ ہوتے۔ اس صورت میں جنگ کا منظر دوسرا ہی ہوتا مگر حسینؑ نے سب کو دنیا سے ایک ایک کر کے رخصت ہو جانے

---

[1] وقائع الایام محرم ص ۳۹۶۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۸۳۔ مقتل ص ۳۷۳ وغیرہ۔

[2] فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۳۳۔

دیا۔ اور ان کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کی۔[1] مزید برآں یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے۔ کہ اگر امام کا مقصد کوئی مادی جنگ لڑ کر ظاہری اقتدار پر قبضہ کرنا ہوتا۔ تو مذکورہ بالا بیان کے مطابق جہاں واقعہ کربلا میں موجود حضرات کو ایک ایک کر کے رخصت نہ کرتے وہاں شیر بیشہ شجاعت مسلم بن عقیلؑ کو تنہا کوفہ نہ بھیجتے۔ اور شجاعت حیدریہ کے مظہر اتم محمد بن حنفیہ کو مدینہ نہ چھوڑتے۔ اگر یہ حضرات بھی ہمراہ ہوتے اور پھر امامؑ ان کے ساتھ مل کر جنگ کرتے۔ تو پھر معرکۂ کربلا کا ظاہری نقشہ کچھ اور ہی ہوتا مگر یہاں تو باطل کے ساتھ حق ظلم کے ساتھ مظلومیت، مادی طاقت کے ساتھ روحانیت کا مقابلہ تھا۔ اس لئے اس کے تقاضے وہی تھے۔ جن کو حکیم امت ونباض اسلام امام عالی مقامؑ نے پورا کیا۔ ہاں جہاد آخر سے پہلے ایک بار پھر سیدؑ ابرار نے اتمام حجت کے لئے آواز استغاثہ بلند کی:

﴿هَلْ مِنْ ذَابٍّ يَذُبُّ عَنْ حَرَمِ رَسُولِ اللّٰهِ؟ هَلْ مِنْ مُوَاحِدٍ يَخَافُ اللّٰهَ فِيْنَا؟ هَلْ مِنْ مُغِيْثٍ يَرْجُوْ اللّٰهَ بِاِغَاثَتِنَا هَلْ مِنْ مُعِيْنٍ يَرْجُوْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بِاِعَانَتِنَا؟﴾

کوئی ہے جو حرم رسولؐ سے دشمنوں کے شر کو دور کرے؟ کوئی خدا پرست ہے جو ہمارے معاملہ میں خدا سے ڈرے؟ کوئی فریادرس ہے جو ثواب خداوندی کی خاطر ہماری فریادرسی کرے؟ کوئی مددگار ہے جو حصول اجر کے لئے ہماری مدد کرے؟

اگرچہ سنگدل مخالفین پر امامؑ کے اس استغاثہ کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ مگر بعض آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے۔ کہ امام کی اس آواز استغاثہ سے تمام عوالم امکانیہ میں تلاطم برپا ہوگیا۔[2] کائنات کے ذرہ ذرہ میں کھلبلی مچ گئی۔ چونکہ ندائے استغاثہ مطلق ہے اس میں کوئی استثنا نہیں۔ بظاہر تو خداوند عالم بھی اس اطلاق میں شامل ہے کہ "کوئی ہے جو ہماری مدد کرے۔" اس لئے سب سے پہلے خداوند عالم نے اس کا عملی جواب دیا۔

هست از ملال گرچه بری ذات ذوالجلال   او درد دل است و هیچ دلے نیست بے ملال

چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿انزل اللّٰہ تعالٰی النصر حتی رفرف علی راس الحسینؑ ثم خیر بین النّصر علی اعدائه وبین لقاء اللّٰه تعالٰی فاختار لقاء اللّٰه﴾ خدا نے نصرت کو (ایک پرندہ کی شکل میں) نازل کیا۔ اس نے حسینؑ کے سر اقدس پر پر مارے۔ خدا نے آپ کو اختیار دیا۔ کہ چاہو تو تمہیں دشمنوں پر ظاہری فتح وفیروزی دے دوں اور چاہو تو میری لقا کو اختیار کرو؟ آپؑ نے برضا ورغبت لقاء پروردگار کو اختیار کیا۔ (اصول کافی)

---

[1] شہید انسانیت، ص ۵۱۶۔

[2] الخصائص الحسینیہ، ص ۱۵۳۔

بعض اخبار کے مطابق چار ہزار فرشتوں نے لبیک کہتے ہوئے کربلا میں حاضر ہو کر اپنی خدمات کی پیش کش کی۔ مگر جناب سید الشہداء نے ان کو جہاد کی اجازت نہ دی۔ [1]

اسی طرح بعض آثار سے آشکار ہوتا ہے۔ کہ جنات نے بھی حاضر ہو کر اپنی خدمات پیش کیں۔ مگر مصلحت شناس امام زمانؑ نے ان کی خدمات کو بھی شرف قبولیت نہ بخشا [2] اور جب امامؑ کی آواز استغاثہ خیام میں پہنچی تو پردگیان عصمت وطہارت کی صدائے گریہ وبکا بلند ہوئی۔ [3]

امام زین العابدینؑ اگرچہ سخت بیمار تھے۔ اور حس وحرکت کرنے سے معذور تھے۔ مگر حجت خدا کی آواز استغاثہ کا یہ اثر ہوا۔ کہ عصاء کی ٹیک لیتے ہوئے افتاں وخیزاں شمشیر بکف ہو کر میدان کارزار کی طرف چل پڑے۔ جناب ام کلثوم نے ان کو تھامنے کی کوشش کی۔ مگر امام بیمار نے فرمایا: ﴿یاعمتاه ذرنی اقاتل بین یدی ابن رسول اللّٰہ؟﴾ پھوپھی جان مجھے چھوڑ دیجیے تاکہ میں فرزند رسولؐ پر جان نثار کروں۔ جب جناب سید الشہداء نے یہ عجیب منظر دیکھا تو جناب ام کلثوم کو آواز دی۔ ﴿احبسیه لئلا تخلو الارض من نسل آل محمدؐ﴾ بہن ان کو روک لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین آل رسول کی نسل سے خالی ہو جائے۔ چنانچہ بی بی نے ان کو واپس کر کے اپنے بستر بیماری پر لٹا دیا۔ [4] اس وقت امام حسین علیہ السلام نے یہ دعا پڑھی: ﴿اَللّٰھُمَّ اَنْتَ مُتَعَالِی الْمَکَانِ عَظِیْمُ الْجَبَرُوْتِ، شَدِیْدُ الْمِحَالِ، غَنِیٌّ عَنِ الْخَلَائِقِ، عَرِیْضُ الْکِبْرِیَاءِ، قَادِرٌ عَلٰی مَا تَشَاءُ قَرِیْبُ الرَّحْمَةِ، صَادِقُ الْوَعْدِ، سَابِغُ النِّعْمَةِ، حَسَنُ الْبَلَاءِ، قَرِیْبٌ اِذَا دُعِیْتَ، مُحِیْطٌ بِمَا خَلَقْتَ قَابِلُ التَّوْبَةِ لِمَنْ تَابَ اِلَیْکَ قَادِرٌ عَلٰی مَا اَرَدْتَ، مُدْرِکٌ مَا طَلَبْتَ، وَ شَکُوْرٌ اِذَا شُکِرْتَ، وَ ذَکُوْرٌ اِذَا ذُکِرْتَ، اَدْعُوْکَ مُحْتَاجًا، وَ اَرْغَبُ اِلَیْکَ فَقِیْرًا وَ اَفْزَعُ اِلَیْکَ خَائِفًا وَ اَبْکِیْ اِلَیْکَ مَکْرُوْبًا وَ اَسْتَعِیْنُ بِکَ ضَعِیْفًا وَ اَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ کَافِیًا، اُحْکُمْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا فَاِنَّھُمْ غَرُّوْنَا وَ خَذَلُوْنَا وَ غَدَرُوْا بِنَا وَ قَتَلُوْنَا وَ نَحْنُ عِتْرَةُ نَبِیِّکَ وَ وَلَدُ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الَّذِیْ اصْطَفَیْتَهٗ بِالرِّسَالَةِ وَ ائْتَمَنْتَهٗ عَلٰی وَحْیِکَ فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا فَرَجًا وَ مَخْرَجًا بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ﴾ [5]

---

1. کامل الزیارۃ، ص ۸۳۔ مقتل ذخار، ص ۴۷۸۔
2. منتخب للطریحی، ص ۳۲۹۔
3. ملہوف، ص ۳۴۹۔
4. خصائص حسینیہ، ص ۱۵۳، طبع ایران۔
5. مفاتیح الجنان، ص ۱۹۲۔ مقتل، ص ۴۷۷۔ مصباح کفعمی، ص ۴۳۲ طبع لکھنؤ۔

فائدہ

یہاں جناب سید الشہداءؑ کی ایک اور دعائے مبارکہ کا تذکرہ بھی خالی از فائدہ نہیں ہے۔ محدث قمیؒ نے بحوالہ دعوات قطب راوندی امام زین العابدینؑ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ کہ آنجناب کا بیان ہے۔ کہ روز عاشورا میرے بابا بزرگوار نے مجھے سینہ سے لگا کر جب کہ جسم مبارک سے خون بہ رہا تھا۔ یہ دعا تعلیم فرمائی اور فرمایا کہ یہ دعا مجھے اپنی والدہ ماجدہؑ نے اور ان کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم فرمائی تھی۔ ہر شدت اور سخت مصیبت کے وقت اسے پڑھنا چاہیے۔ وہ دعا یہ ہے: ﴿بِحَقِّ يٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ وَ بِحَقِّ طٰهٰ وَ الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ. يَا مَنْ يَقْدِرُ عَلٰى حَوَائِجِ السَّائِلِيْنَ. يَا مَنْ يَعْلَمُ مَا فِي الضَّمِيْرِ يَا مُنَفِّسُ عَنِ الْمَكْرُوْبِيْنَ يَا مُفَرِّجُ عَنِ الْمَغْمُوْمِيْنَ يَا رَاحِمَ الشَّيْخِ الْكَبِيْرِ يَا رَازِقَ الطِّفْلِ الصَّغِيْرِ. يَا مَنْ لَّا يَحْتَاجُ إِلَى التَّفْسِيْرِ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَافْعَلْ بِيْ كَذَا وَ كَذَا﴾[1] (یہاں اپنی حاجات کا تذکرہ کیا جائے)۔

(۱۸) امامؑ کے طفل شیر خوار کی شہادت

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جب امام علیہ السلام نے آواز استغاثہ بلند کی تو اس وقت خیام حسینیؑ سے مخدرات عصمت وطہارت کی صدائے نالہ وشیون بلند ہوئی۔ غیور امامؑ کے کانوں میں جب بیبیوں کے رونے کی آواز پڑی تو ان کو تسلی دینے کی غرض سے فوراً خیام میں تشریف لائے۔ اور بی بیوںؑ کو خاموش کیا۔ اسی اثنا میں خیمہ سے امامؑ کے طفل شیر خوار کے رونے کی آواز آئی۔ امامؑ نے زینب عالیہؑ سے فرمایا: ﴿نَاوِلِيْنِيْ وَلَدِيَ الصَّغِيْرَ حَتّٰى أُوَدِّعَهُ﴾ میرے چھوٹے بچے کو لاؤ تا کہ میں اس سے وداع کرلوں۔ چنانچہ شہزادہ کو خدمت امامؑ میں پیش کیا گیا۔ امامؑ نے اسے گود میں لیا۔ اور بوسہ دینے کے لئے جھکے مگر اس سے پہلے حرملہ بن کاہل اسدی (اور بروایتے عقبہ بن بشر[2]) کا تیر لگا۔ جس سے بچہ جاں بحق ہو گیا۔ جہاں تیر لگا تھا۔ وہاں سے خون کا فوارہ چھوٹا۔ امامؑ نے نیچے چلو رکھ لیا۔ جب چلو لبریز ہو گیا۔ تو اسے آسمان کی طرف پھینک دیا۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں ﴿فلم یسقط من ذلک الدم قطرة الی الارض﴾ اس مقدس خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرا۔ اس کے بعد شہزادہ کی لاش بی بی کو دیتے ہو فرمایا: ﴿هَوَّنَ عَلَيَّ مَا نَزَلَ بِيْ أَنَّهُ بِعَيْنِ اللّٰهِ﴾ اس یقین نے میرے مصائب کو آسان کر دیا ہے۔ کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ خدا کے سامنے ہے۔[3]

دمعۂ ساکبہ میں بعض کتب کے حوالہ سے شہزادہ کی شہادت قدرے تفصیل سے مذکور ہے۔ جناب عقیلہ بنی

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۸۴۔
[2] مقاتل الطالبین۔
[3] خصائص حسینیہ، ص ۱۵۳۔
[4] نفس المہموم، ص ۱۸۵۔ ملہوف سید ابن طاؤس، ص ۱۰۱۲۔

ہاشم بچہ کو امام حسین علیہ السلام کے پاس لائیں اور عرض کیا کہ بچے نے کئی دن سے پانی کا قطرہ نہیں پیا۔ اس لئے اب شدت پیاس سے بلک رہا ہے۔ اس کے لئے کچھ پانی کا انتظام کرو۔ چنانچہ امامؑ شہزادہ کو لے کر قوم جفا کار کے سامنے تشریف لے گئے۔ اور فرمایا: ﴿یا قوم قد قتلتم شیعتی و اهل بیتی قد بقی هذا الطفل ویلکم اسقوا هذا الرضیع اما ترونه یتلظی عطشاً من غیر ذنب﴾ اے قوم (اشقیاء) تم نے میرے شیعیان اور اہل خاندان کو قتل کر دیا ہے۔ یہ طفل شیرخوار باقی ہے۔ اسے پانی کا گھونٹ پلا دو۔ ذرا دیکھو تو سہی کس طرح بلا گناہ شدت پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ امامؑ کا سلسلہ کلام ابھی جاری تھا کہ حرملہ بن کاہل اسدی نے تیر مارا۔ جس سے شہزادہ نے امامؑ کی گود میں ہی دم توڑ دیا۔[1] تذکرۃ الخواص کی روایت کے مطابق فرمایا: ﴿ان لم ترحمونی فارحموا هذا الطفل!﴾ اگر مجھ پر رحم نہیں کرتے تو اس بچے پر تو رحم کرو۔[2]

بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کے اس کلام کا یہ اثر ہوا کہ فوج اشقیا میں ہمہمہ پیدا ہوا۔ اور ایک دوسرے کو کہنے لگے: اگر اس بچے کو قطرۂ آب دے دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ (ریاض القدس، ج ۲، ص ۱۰۱) پسر سعد نے حرملہ کو حکم دیا: ﴿یا حرملة اقطع کلام الحسینؑ﴾ اے حرملہ! حسینؑ کا کلام قطع کر دے۔ چنانچہ سہ شعبہ تیر فرّاٹے لیتا ہوا آیا اور شہزادہ کے نازک کان میں لگا: ﴿فذبحه من الاذن الی الاذن﴾ اور کان کو چھیدتا ہوا دوسرے کان سے پار ہو گیا۔ اور بچہ نے دم توڑ دیا۔[3]

اس وقت امامؑ نے فرمایا: ﴿اللّٰهم احکم بیننا و بین قوم دعونا لینصرونا فقتلونا﴾ خداوندا تو ہی ہمارے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کر۔ جس نے ہمیں بلایا تا کہ نصرت کریں۔ اور جب ہم آئے تو ہمیں قتل کرنا شروع کر دیا۔[4] ہاتفِ غیبی کی آواز آئی: ﴿یا حسین دعه فان له مرضعاً فی الجنة!﴾ اے حسینؑ! اسے چھوڑ دو کہ اس کے لیے جنت میں دایہ موجود ہے۔[5]

بعض روایات میں وارد ہے کہ امامؑ اس شہزادہ کی لاش واپس لائے۔ اور دوسرے شہداء اہل بیتؑ کے پاس رکھ دی۔[6] لیکن مشہور یہ ہے کہ امامؑ گھوڑے سے اترے اور تلوار سے ننھی سی قبر کھودی پھر نماز جنازہ پڑھی اور بچہ کو خون میں رنگین کر کے اس میں دفن کر دیا۔ اور اس وقت یہ اشعار غم شعار پڑھے ؎

کفر القوم و قدماً رغبوا   عن ثواب اللّٰه رب الثقلین

---

[1] الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۴۰۔
[2] تذکرۃ الخواص، ص ۲۵۲، طبع النجف۔
[3] منتخب طریحی، ص ۳۴۔
[4] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۲۰۳۔
[5] مقتل مقرم، ص ۳۴۵۔
[6] ارشاد، ص ۲۶۲، نفس المہموم، ص ۱۸۶۔

قتلوا قدماً علیاً و ابنه | حسن الخیر کریم الابوین[1]

ننھی سی قبر کھود کے اصغرؑ کو گاڑ کے | شبیرؑ اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

تبصرہ

ارباب مقاتل کے درمیان اس بات میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس طفل شیر خوار کا نام کیا تھا۔ چنانچہ بعض نے عبداللہ اور بعض نے علی اصغر لکھا ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ شہزادے ہیں۔ علی اصغر جناب رباب کے بطن سے تھے۔ جن کی عمر واقعۂ کربلا کے وقت چھ ماہ سے زائد تھی۔ اور عبداللہ کی ولادت اسی روز عاشوراء کربلا میں ہوئی تھی لیکن تحقیقی قول یہ ہے کہ یہ ایک ہی صاحبزادے کے دو عنوان ہیں۔ اصل میں شہید ہونے والا یہ بچہ وہی ہے جو شہزادہ علی اصغرؑ[2] کے نام سے مشہور ہے۔ واللہ العالم۔

سید الشہداءؑ کا مخدرات سے الوداع ہونا

وہ گھڑی بڑی قیامت خیز تھی۔ جب سرکار سید الشہداءؑ مخدرات سے روانہ ہونے کے لیے مہیا ہو رہے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ تھوڑی دیر کے بعد ان اطفال خورد سال اور پردگیان عصمت وطہارت کا کوئی ظاہری ملجا و ماوا اور پرسان حال نہ ہوگا بلکہ قریباً تین ہزار کے بے رحم لشکر جرار کے ہاتھوں گرفتار ہوں گی۔ اہل حرم کو بھی اس بات کا اندازہ تھا۔ نیز یہ احساس بھی تھا کہ امامؑ تھوڑی دیر کے مہمان ہیں۔ آپؑ سیدزادیوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ سب کے چہروں پر حسرت ویاس برس رہی ہے۔ اسی لیے بعض آثار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جناب امام حسینؑ کا آخری وداع عظیم ترین مصائب تھا۔ ؎

گر خوانمش قیامت صغری بعید نیست

اسرار امامت وودائع نبوت کی تحویل

اس وقت امامؑ نے دو کام انجام دیے۔ (۱) پہلا کام اسرار وودائع امامت کی تحویل کی۔ بعض اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ ودائع و اسرار امامت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ وہ جو بلاواسطہ امام سابق سے امام لاحق کی طرف منتقل ہوتے ہیں جیسے اسم اعظم وغیرہ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بالواسطہ بھی منتقل ہو سکتے ہیں۔ اول قسم کے ودائع و اسرار امامت تو جناب امام حسینؑ نے آخری رخصت کے وقت امام زین العابدینؑ کو سپرد فرمائے۔[3] اور

---

[1] مقتل الحسین خوارزمی، ج ۲، ص ۳۲۔ احتجاج طبرسی، ص ۱۶۳۔ [2] کبریت احمر، ص ۱۴۱۔ وقائع ایام محرم، ص ۵۲۰۔

[3] جلاء العیون مجلسی، ص ۱۹۶۔

دوسری قسم کے ودائع وتبرکات بتوسط جناب ام سلمہؓ امامؑ کو پہنچائے۔ جیسا کہ بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ سے روانگی کے وقت ان کے سپرد کیے تھے۔ جو انہوں نے رہائی کے بعد امام سجادؑ کے حوالے کیے[1] اور بعض اپنی دختر فاطمہ کبریٰؑ کے ذریعہ سے امامؑ تک پہنچائے[2] کتاب کمال الدین صدوقؒ کی ایک روایت سے جناب عقیلہؑ بنی ہاشم کا توسط بھی ظاہر ہوتا[3] ہے۔

امامؑ کا آخری وقت لباس کہنہ طلب فرمانا

دوسرا کام یہ انجام دیا کہ جناب زینب عالیہؑ سے فرمایا: ﴿یا اختاه ایتینی بثوب عتیق لا یرغب فیه احد من القوم. اجعله تحت ثیابی لئلا اجرد منه بعد قتلی﴾ ''بہن زینب! مجھے ایسا پرانا پیراہن لا کر دو جس میں کوئی بھی رغبت نہ کرے کہ اسے اپنے لباس کے نیچے پہن لوں تاکہ شہادت کے بعد مجھے برہنہ نہ کیا جائے۔'' امامؑ کا یہ کلام سن کر بی بیوں میں گریہ وبکا کا کہرام مچ گیا۔ پھر قدرے تنگ اور بہت ہی بوسیدہ لباس پیش کیا گیا۔ امامؑ نے یہ فرما کر کہ ﴿ذاک لباس من ضربت علیه الذلت﴾ ''یہ تو اس شخص کا لباس ہے جس پر پوری طرح بے کسی و بے نوائی مسلط ہو جائے۔'' اس کو پہننے سے انکار کر دیا پھر ایک کھلا مگر قدرے پرانا لباس پیش خدمت کیا گیا۔ امامؑ نے اسے جابجا سے پارہ پارہ کر دیا۔ اور زیر لباس زیب تن فرمایا۔[4] مگر افسوس کہ ایسی احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کے باوجود بھی امامؑ کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ آپؑ کی شہادت کے بعد جہاں آپ کا دوسرا لباس اتارا گیا۔ وہاں وہ لباس کہنہ بھی ابجر بن کعب ملعون نے اتار[5] لیا۔ (تفصیل بعد میں آرہی ہے۔ انشاء اللہ) اسی طرح پھر بردیمانی کی سلی ہوئی شلوار طلب فرمائی۔ اسے بھی جابجا سے چاک کر کے پہن لیا۔[6] اس کے بعد اسلحۂ جنگ سے مسلح ہوئے۔ جب باہر تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا تو پردگیان عصمت وطہارت کو الوداعی سلام کرتے ہوئے فرمایا: ﴿یا سکینة و یا فاطمة یا زینب یا ام کلثوم علیکن منی السلام﴾[7] اس وقت عجیب درد انگیز اور رقت خیز منظر تھا کیونکہ ؎

عصر کا وقت آ گیا وعدہ وفا ہونے کو ہے — زیر خنجر آج سبط مصطفیٰ ہونے کو ہے
خشک ذروں میں نمایاں ہوں گے آثار جناں — آج دشت ماریہ اک پُر فضا ہونے کو ہے

---

1. اثبات الوصیہ مسعودی، ص۔۔۔؟
2. جلاء العیون، ص ۱۹۶۔
3. اکمال الدین واتمام النعمۃ۔
4. ملہوف، ص ۱۰۹۔
5. ملہوف، ص ۱۰۹۔ نفس المہموم، ص ۱۹۳۔
6. طبری، ج ۶، ص ۲۵۹۔ مقتل الحسین، ص ۳۱۶۔
7. عاشر بحار، ص ۲۰۳۔ وقائع، ص ۵۲۷۔

آج آثار قیامت ہیں نمایاں دہر میں | سجدۂ خالق میں کس کا سر جدا ہونے کو ہے
جس کی خاطر زینب مغموم نے چھوڑا وطن | عالم غربت میں بھائی سے جدا ہونے کو ہے

یہ جگر خراش منظر دیکھ کر جناب سکینہ خاتون آگے بڑھیں۔ اور عجیب معصومانہ انداز میں سوال کیا: ﴿یا اَبَتَاهُ اَوَ اِسْتَسْلَمْتُ لِلْمَوْتِ؟﴾ بابا جان! کیا آپ نے مرنے کے لیے بالکل تیاری کر لی ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿کَیْفَ لَا یَسْتَسْلِمُ لِلْمَوْتِ مَنْ لَا نَاصِرَ لَهُ وَلَا مُعِیْنَ﴾ بیٹی! جس شخص کا کوئی یار و مددگار نہ ہو۔ اگر وہ موت کے لیے تیار نہ ہو تو اور کیا کرے؟ سکینہ نے عرض کیا: ﴿یا ابة ردنا الی حرم جدنا!﴾ بابا جان! پھر ہمیں جد نامدارؐ کے حرم کی طرف لوٹا دیجئے۔ امامؑ نے جواب میں مشہور ضرب المثل زبان پر جاری فرمائی کہ ﴿هَیْهَاتَ لَوْ تُرِکَ الْقَطَا لَنَامَ﴾ افسوس اگر قطا پرندہ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو آرام کی نیند سو جاتا۔ مطلب یہ تھا کہ واپس لوٹانے کی فرصت نہیں۔ باپ بیٹی کا یہ سوال و جواب سن کر مخدرات کی آواز گریہ و بکا بلند ہوئی۔ امامؑ نے ان کو صبر و شکیب کی تلقین کر کے خاموش[1] کیا۔ اور جناب سکینہؑ کو پیار کرتے ہوئے دلاسا دیتے ہوئے فرمایا ؎

سیطول بعدی یا سکینة فاعلمی | منک البکاء اذ الحمام دهانی
لا تحرقی قلبی بدمعک حسرة | مادام منی الروح فی جثمانی
فاذا قتلت فانت اولی بالذی | تاتینه یا خیرة النسوان[2]

اس کے بعد آخری جہاد کے لیے باہر تشریف لائے۔ اس وقت اہل خیام کی کیا حالت تھی؟ مرزا صاحب مرحوم نے اس کی تصویر کشی یوں کی ہے ؎

شبیرؑ برآمد ہوئے یوں خیمہ کے در سے | جیسے کہ نکلتا ہے جنازہ کسی گھر سے

شبیرؑ جہانگیر عرصۂ رزم گاہ کربلا میں

اس وقت جنابؑ نے سیاہی مائل خز کا جبہ در بر اور گلابی رنگ کا عمامہ بر سر، چادر رسولؐ بر دوش، زرہ رسولؐ بر بدن اور شمشیر رسولؐ بکف[3] کر رکھی تھی اور ریش مبارک پر وسمہ کا خضاب لگایا ہوا[4] تھا۔ اسی حالت میں قوم اشقیاء کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور بعض روایات کی بنا پر وہ اشعار پڑھے جن کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے ؎

کفر القوم و قد مارغبوا | عن ثواب[5] الله رب العالمین

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۰۳۔ [2] نفس المہموم، ص ۱۸۳۔
[3] مقتل الحسین للمقرم، ص ۲۹۵ بحوالہ منتخب للطریحی، ص ۳۱۵ طبع النجف۔
[4] کامل ابن اثیر، ج ۴، ص ۲۹۵۔ [5] عاشر بحار، ص ۲۰۳۔

پھر مبارز طلب کیا۔ اب امام حسینؑ نظر یہ نظر حالات جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ جنگ کرنے کے قابل نہ رہے تھے مگر شجاعت نبویہؐ صولت حیدریہؑ اور ہیبت الٰہیہ کے مالک امامؑ نے وہ جوہر شجاعت و شہامت دکھائے کہ شجاعان عالم کے جنگی کارنامے ان کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ جو مقابلہ میں آیا اسے واصل جہنم کیا۔ اس طرح ایک جماعت کثیرہ کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا۔[1] اب جبکہ مخالف مقابلہ میں نکلنے سے پس و پیش کرنے لگے۔[2] تو امام علیہ السلام نے یہ رجز پڑھتے ہوئے مخالف کے میمنہ لشکر پر حملہ کر دیا۔

الموت اولٰی من رکوب العار	و العار اولٰی من دخول النار

اس طرح دشمنان خدا و رسولؐ کے ایک جم غفیر کو واصل جہنم کرنے کے بعد پھر میسرہ پر یہ رجز پڑھتے ہوئے ٹوٹ پڑے۔

انا الحسینؑ بن علیؑ	الیت ان لا انثنی
احمی عیالات ابیؑ	امضی علی دین[3] النبیؐ

اس طرح پھر ایک جماعت کثیرہ کو جہنم رسید کیا۔

فرزند حیدرؑ کرار کی بے مثال بہادری کے کارنامے

بعض راویان اخبار (حمید بن مسلم[4] یا عبداللہ بن عمار[5] بن یغوث) کا بیان ہے کہ ﴿واللہ ما رایت مکثوراً قط قد قتل ولدہ و اھل بیتہ و اصحابہ اربط جاشا منہ علیہ السلام و ان کانت الرجالۃ لتشد علیہ فیشد علیھا بسیفہ فتنکشف عنہ انکشاف المعزیٰ اذ اشد فیھا الذئب و لقد کان یحمل فیھم و قد تکملوا ثلثین الفاً فینھزمون بین یدیہ کانھم الجراد المنتشر ثم یرجع الی مرکزہ وھو یقول لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم﴾ بخدا میں نے کسی نرغۂ اعداء میں گھرے ہوئے شخص کو نہیں دیکھا جس کا سارا گھرانہ آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا ہو۔ اور پھر حسینؑ ایسا شجاع، ثابت قدم، مطمئن، اور جری ہو۔ حالت یہ تھی کہ چاروں طرف سے ان پر پیادے حملہ کرتے تھے مگر جب حسینؑ تلوار سونت کر ان پر جوابی حملہ کرتے تھے۔ تو وہ اس طرح بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ جس طرح بھیڑیئے کے حملہ کے وقت بکریاں بھاگ جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کی تعداد تیس ہزار تھی۔ مگر جب امامؑ ان پر تابڑ توڑ حملہ کرتے تو ان کے سامنے سے یہ اس طرح بھاگ نکلتے۔ اور ادھر ادھر تتر بتر ہو جاتے گویا کہ پراگندہ ٹڈیاں ہیں۔ ہر حملہ کے بعد امامؑ اپنے مرکز پر واپس لوٹ آتے اور

---

[1] مقتل عوالم، ص ۹۷۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۲، ص ۳۳۔ مقتل المقرم، ص ۳۱۹۔

[2] جلاء العیون، ص ۱۹۶، طبع النجف۔

[3] عاشر بحار، ص ۱۰۳۔ نفس المہموم، ص ۱۸۷۔

[4] ارشاد، ص ۲۶۳۔

[5] مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۳۰۔

پڑھتے ﴿لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم﴾[1] بعض روایات میں اس کے ساتھ ﴿العلی العظیم﴾ موجود نہیں ہے۔امامؑ نے اسی طرح مسلسل کئی حملے کئے۔علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جناب سید محمد بن ابی طالب کے مقتل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان شدید حملوں میں اسد اللہ الغالب کے فرزند نے ایک ہزار نو سو پچاس لعینوں کو دارالبوار میں پہنچایا۔[2] یہ فوق العادۃ شجاعت کا مظاہرہ دلیل امامت ہے فوج کی یہ سراسیمگی اور ابتری دیکھ کر عمر بن سعد نے سپاہیوں کو للکار کر کہا: ﴿ویل لکم اتدرون لمن تقاتلون هذا ابن الانزع البطین هذا بن قتال العرب فاحملوا علیه من کل جانب و کانت الرماة اربعة آلاف فرموه بالسهام﴾ افسوس ہے۔تم پر کچھ جانتے بھی ہو کہ تم کس سے جنگ کر رہے ہو؟ یہ انزع بطین اور عرب کے سب سے بڑے جنگجو بہادر (علی بن ابی طالبؑ) کا فرزند ہے۔ان پر چاروں طرف سے ایک ساتھ حملہ کر دو۔فوج مخالف میں صرف چار ہزار تو تیرانداز تھے۔ حکم کا ملنا تھا کہ امامؑ پر ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔[3]

شمر ذی الجوشن کا خیام امامؑ کو لوٹنے کا ارادہ کرنا

اسی اثناء میں شمر بن ذی الجوشن فوج کا ایک دستہ لے کر اہل حرم کی غارتگری کے منحوس ارادہ سے امامؑ کے خیام کی طرف متوجہ ہوا اور یہ دستہ فوج امامؑ اور ان کے خیام کے درمیان حائل ہو گیا۔امامؑ نے سپاہ ابن سعد کو مخاطب کر کے فرمایا۔﴿و یحکم یا شیعة آل ابی سفیان ان لم یکن لکم دین و کنتم لا تخافون المعاد فکونوا احرارا فی دنیاکم و ارجعوا الی احسابکم اذ کنتم اعرابا﴾ اے آل ابوسفیان کے شیعو اگر تمہیں مذہب کا خیال اور آخرت کا خوف نہیں ہے تب بھی آخر تم عرب ہونے کے دعویدار ہو۔اپنی قومی غیرت وحمیت کا ثبوت دو۔ شمر نے کہا۔﴿ما تقول یا بن فاطمة؟﴾ فرزند فاطمہ کیا کہتے ہو؟۔غیور امامؑ نے فرمایا۔﴿ اقول انا الذی اقاتلکم و تقاتلونی والنساء لیس علیهن جناح فامنعوا عتاتکم عن التعرض لحرمی ما دمت حیا﴾ میں کہتا ہوں کہ میں تم سے جنگ کر رہا ہوں اور تم مجھ سے۔عورتوں کا اس میں کیا قصور ہے؟ جب تک میں زندہ ہوں اپنے سرکش گستاخوں کو منع کرو کہ میرے خیام سے تعرض نہ کریں۔یہ سن کر شمر نے قدرے شرمندہ ہو کر کہا۔﴿لک ذالک﴾ آپ کا یہ مطالبہ منظور ہے۔پھر اس نے اس دستہ فوج کو پکار کر کہا۔﴿الیکم عن حرم الرجل فاقصدوه فی نفسه فلعمری لهو کفو کریم﴾ اس شخص (امامؑ) کے خیام سے دور ہو جاؤ اور خود اس کی طرف متوجہ ہو۔مجھے اپنی زندگی کی قسم یہ کفو کریم ہے۔[4]

---

[1] لہوف، ص ۱۰۵۔
[2] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۲۰۳۔
[3] بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۳۔نفس المہموم ص ۱۸۸۔
[4] بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۳۔طبری، ج ۶، ص ۲۵۹۔

چنانچہ اس حکم کے بعد تمام فوج امامؑ کی طرف متوجہ ہوگئی اور ہر طرف سے آپ پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کی بارش ہونے لگی۔ شدت پیاس سے امامؑ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پانی کا مطالبہ کرتے تھے مگر ظالم استہزاء کرتے تھے اور گستاخانہ جواب دیتے تھے۔[1] امام شریعۂ فرات کی طرف رخ کرتے، بے حیا فوج سامنے حائل ہو جاتی۔ فوج مخالف کے ٹھٹ کے ٹھٹ بڑھے چلے آتے تھے مگر یہ امام حسینؑ کی شمشیر خارا شگاف تھی جو انہیں اناج کے دانوں کی طرح بکھیر کر رکھ دیتی تھی۔ یہ امام حسینؑ کا ہی حوصلہ تھا کہ زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود بھی اس طرح بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا دل چھوڑ گیا ہوتا۔

نہر فرات پر ساقیؑ کوثر کے فرزند کا قبضہ

اثناء جہاد میں ایک ایسا موقع آیا کہ ساقیؑ حوض کوثر کے فرزند نے اعور اسلمی اور عمرو بن الحجاج زبیدی (نہر فرات کی حفاظتی چار ہزار فوج کا سردار تھا) پر حملہ کرتے ہوئے اور تمام فوج کو بھگاتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے ہوئے نہر فرات تک پہنچ کر گھوڑا نہر میں ڈال دیا۔ چاہا کہ پانی پییں مگر ایک ظالم حصین بن تمیم لعین نے تیر مارا جو آپؑ کے حلق مبارک میں پیوست ہو گیا۔ آپؑ نے تیر کھینچا، خون کا فوارہ نکلا۔ امامؑ نے ہاتھ نیچے دھرا۔ دونوں چلو خون سے بھر گئے۔ آپؑ نے خون آسمان کی طرف اچھالا اور خدا کا شکر ادا کیا اور کہا۔ ﴿یا رب الیک مشتکیٰ من قوم ارا قوا دمی و منعونی شرب الماء﴾ بارالٰہا! میں اس قوم جفاکار کا شکوہ تیری بارگاہ میں کرتا ہوں، جس نے میرا خون بہایا اور مجھے پانی پینے سے روکا۔[2]

بعض روایات میں وارد ہے کہ جب سید الشہداءؑ نے گھوڑا نہر میں ڈال دیا اور گھوڑے نے پانی پینے کے لئے منہ نیچے کیا تو امامؑ نے فرمایا۔ ﴿انت عطشان وانا عطشان واللہ لاذقت الماء حتیٰ تشرب﴾ گھوڑا! تو بھی پیاسا ہے اور میں بھی۔ بخدا میں اس وقت تک پانی نہیں پیوں گا جب تک تو نہ پی لے۔ گویا اسپ وفادار امامؑ کا کلام سمجھ گیا اس لئے منہ اوپر اٹھا لیا۔ امامؑ نے فرمایا۔ ﴿اشرب فانا اشرب﴾ تو پانی پی، میں بھی پانی پیتا ہوں۔ پھر پانی کا چلو بھرا، چاہا کہ پییں کہ اس اثناء میں ایک مکار نے کہا۔ ﴿یا ابا عبداللہ تتلذذ بشرب الماء وقد ھتکت حرمک﴾ ابو عبداللہ! آپ پانی پی رہے ہیں اور ادھر آپؑ کے خیام لوٹے جا رہے ہیں۔ امامؑ نے پانی پھینک دیا اور حملہ کر کے فوجوں کو ہٹاتے ہوئے جب خیام کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ خیام صحیح و سالم ہیں۔[3]

---

[1] مقاتل الطالبین، ص ۸۶۔

[2] طبری، ج ۶، ص ۲۵۸۔

[3] بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۳۔ نفس المہموم، ص ۱۸۸۔ ناسخ، ۶، ص ۲۸۹۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۳۱، بحوالہ کتاب متعددہ۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۸۹۔

امام کا دوسری بار اہل حرم کو الوداع کہنا

امام علیہ السلام پھر ایک بار خیام میں تشریف لے گئے اور اپنے اہل بیت کو صبر وشکر کی تلقین کی اور اجر و ثواب عظیم کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا: ﴿استعدوا للبلاء و اعلموا ان اللّٰہ تعالیٰ حافظکم و حامیکم سینجیکم من شر الاعداء و یجعل عاقبۃ امرکم الیٰ خیر ویعذب اعادیکم بانواع البلاء و یعوضکم عن ھذہ البلیۃ بانواع النعم والکرامۃ فلا تشکوا و لا تقولوا بالسنتکم ما ینقص من قدرکم﴾[1] اب تم بلاد مصیبت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یقین رکھو کہ خدا تمہارا حافظ و مددگار ہے۔ وہ تمہیں شرِ اعداء سے محفوظ رکھے گا۔ تمہارا انجام بخیر کرے گا اور تمہارے دشمنوں کو مختلف قسم کے عذاب و عقاب میں مبتلا کرے گا اور تمہیں اس بلا و مصیبت کے عوض مختلف انعام و اکرام سے نوازے گا۔ پس تم کسی قسم کا کوئی شکوہ و شکایت نہ کرنا اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جو تمہاری منزلت میں کمی کی موجب ہو۔

اس کے بعد امام علیہ السلام دوبارہ میدان کارزار میں تشریف لائے اور خداداد شجاعت و شہامت کے جوہر دکھانے شروع کئے اور کشتوں کے پشتے لگانے لگے۔ شمر نے یہ دیکھ کر نئے سرے سے لشکر کو اس طرح سے مرتب کیا کہ پیادوں کے پیچھے سواروں کو کھڑا کر کے تیر اندازوں کو تیر چلانے کا حکم دیا۔ چنانچہ امام علیہ السلام پر اس قدر تیر برسائے گئے کہ اہل تاریخ کے بیان کے مطابق صار کالقنفذ کہ آپ کا جسم نازنین ساہی کے کانٹوں کی طرح ہو گیا۔[2] ہر طرف سے تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ امام جوابی حملے بھی کرتے جاتے تھے اور یہ بھی فرماتے جاتے تھے: ﴿یا امۃ السوء بئسما خلفتم محمداً فی عترتہ اما انکم لن تقتلوا بعدی عبداً من عباد اللّٰہ فتھابوا قتلہ بل یھون علیکم عند قتلکم ایای و ایم اللّٰہ انی لارجوان یکرمنی ربی بالشھادۃ بھوانکم ثم ینتقم لی منکم من حیث لا تشعرون﴾ اے رسولؐ کی بری امت! تم نے جناب رسول خداؐ کے بعد ان کی عترت طاہرہ کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا ہے۔ آگاہ ہو کہ تم میرے بعد کسی ایسے بندۂ خدا کو قتل نہیں کرو گے کہ جس سے کہ تمہیں خوف محسوس ہو بلکہ میرے عظیم قتل کے بعد تمہیں دوسروں کا قتل آسان معلوم ہوگا۔ خدا کی قسم! مجھے امید ہے کہ خدا مجھے شہادت کے درجۂ رفیعہ پر فائز کرے گا اور پھر تم سے میرے قتل کا اس طرح انتقام لے گا کہ تمہیں شعور بھی نہ ہوگا۔

حصین بن مالک سکونی نے بآواز بلند کہا۔ اے فرزند فاطمہ! خدا کس طرح ہم سے انتقام لے گا؟ امام نے فرمایا۔ ﴿یلقی باسکم بینکم و یسفک دمائکم ثم یصب علیکم العذاب الالیم﴾ تمہارے درمیان

---

[1] جلاء العیون، ص ۱۹۶۔ نفس المہموم، ص ۱۸۸۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۲۲ وغیرہ۔

[2] ارشاد مفیدؒ، ص ۲۶۳۔

اختلاف اور لڑائی واقع کر کے تمہارے خون بہائے گا اور پھر تم پر دردناک عذاب نازل کرے گا۔

اس اثناء میں ایک ملعون ابوالحتوف جعفی نے آپ کی پیشانی اقدس پر زبردست تیر مارا جس کی وجہ سے چہرۂ انور پر خون بہنے لگا۔ امام علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: ﴿اللّٰھم انک تری ما انا فیہ من عبادک ھؤلاء العصاۃ اللّٰھم احصھم عدداً و اقتلھم بدداً ولا تذر علی وجہ الارض منھم احدا ولا تغفر لھم ابدا﴾ یا اللہ! تو دیکھ رہا ہے کہ تیرے یہ سرکش بندے میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ تو انہیں قتل و غارت کر اور روئے زمین پر ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑ اور انہیں ہرگز معاف نہ کر۔[1]

بعض کتب میں وارد ہے کہ بایں ہمہ امام علیہ السلام بڑی دلیری اور جگر کاوی کے ساتھ قوم اشقیاء کا مقابلہ کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اب کے بعض حملوں میں مقام ذوالکفل تک پہنچ گئے جو اس مقام سے جہاں آپ نے علم نصب کیا ہوا تھا بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس اثناء میں ہاتف غیبی کی آواز آئی۔ ﴿یاایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود﴾

ع آواز آئی غیب سے وعدے وفا کرو

اس وقت امام علیہ السلام نے تلوار میان میں ڈال لی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ﴿لا حول ولا قوۃ الا باللہ رضاً بقضائہ و تسلیماً لامرہ﴾۔[2]

امام مظلومؑ کے زخموں کی تعداد

ظالموں نے یہ کیفیت دیکھ کر اور بھی شدید حملے کر کے امام کو بالکل گھائل کر دیا۔ آقائے مظلومؑ کا جسم مقدس زخموں سے چور چور ہو چکا تھا۔ بروایتے بہتر (۷۲) بروایتے تینتیس (۳۳) نیزوں کے اور ۳۴ تلوار کے، بروایتے کچھ اوپر تین سو، بروایتے تین سو ساٹھ اور ایک روایت کے مطابق ایک ہزار نو سو پچاس زخم تھے۔[3] کما قیل ؎

یک ہزار و نہ صد و پنجاہ زخمے بر بدن ہیچ زخمے کمتر از داغ علی اکبرؑ نبود

ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ یہ حد بندی صحیح نہیں ہے جبکہ ایک ایک زخم میں کئی کئی زخم موجود تھے۔ تو اس صورت میں کون صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ زخموں کی اصل تعداد کس قدر تھی؟

می خواہم از خدا بدعا صد ہزار جان تا صد ہزار بار بمیرم برائے او

1۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۴۴۔ نفس المہموم، ص ۱۸۹۔

2۔ مواعظ حسنہ (نقل بالمعنیٰ)، ص ۱۰۴، ۱۰۵، طبع سوم۔

3۔ نفس المہموم، ص ۱۸۹۔ وقائع ایام محرم، ص ۵۵۲۔

ارباب مقاتل کا بیان ہے کہ خون کے بکثرت بہہ جانے کی وجہ سے امام عالی مقام پر ضعف ونقاہت کا غلبہ تھا۔ بدن زخموں سے نڈھال ہوگیا تھا۔ قدرے ستا رہے تھے کہ اچانک ایک شقی نے پیشانی اقدس پر پتھر مارا جس کی وجہ سے خون نکلا۔ امام عالی مقامؑ نے کرتہ کا دامن اٹھایا تا کہ خون کو پونچھیں کہ اس اثناء میں ایک سہ شعبہ نوکدار تیر فراٹے لیتا ہوا آیا اور آنجنابؑ کے سینہ بے کینہ میں پیوست ہوگیا۔ تیر کا لگنا تھا کہ امامؑ نے پڑھا۔ ﴿بسم الله وبالله وعلىٰ ملة رسول الله صلى الله عليه و آله﴾۔ پھر آسمان کی طرف سر بلند کر کے کہا۔ ﴿الهى انك تعلم انهم يقتلون رجلاً ليس علىٰ وجه الارض ابن نبى غيره﴾۔ بارالہا! تو بہتر جانتا ہے کہ یہ لوگ ایسے شخص کو قتل کر رہے ہیں کہ اس وقت تمام روئے زمین پر اس کے سوا اور کوئی فرزند رسولؐ نہیں ہے۔ تیر سہ شعبہ تھا اور سینہ بے کینہ کے آر پار ہوگیا تھا۔ اس لئے امامؑ نے ہر چند کوشش کی مگر سامنے کی طرف سے تیر کو نہ کھینچ سکے اس لئے جھک کر پشت کی طرف سے کھینچا۔ ﴿فانبعث الدم كالميزاب﴾ پرنالے کی طرح جوش مار کر خون نکلا۔ امامؑ نے نیچے ہاتھ رکھ لیا۔ جب چلو لبریز ہوگیا تو آسمان کی طرف پھینک دیا۔ مگر ایک قطرہ بھی واپس نہ آیا۔ پھر دوبارہ نیچے ہاتھ رکھا جب بھر گیا تو اپنے سر و ریش مبارک پر مل کر فرمایا ﴿هكذا اكون حتى القى جدى رسول اللهؐ وانا مخضوب بدمى واقول يا رسول الله قتلنى فلان و فلان﴾ میں اسی طرح اپنے خون کا خضاب لگا کر اپنے جد نامدار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا اور جا کر عرض کروں گا۔ یا رسول اللہ! مجھے فلاں وفلاں نے شہید کیا ہے۔[1]

اسی اثنا میں صالح بن وہب مزنی نے آپ کی پشت مبارک پر اس زور سے نیزہ مارا کہ آپ زین پر سنبھل نہ سکے بلکہ ﴿بسم الله وبالله و علىٰ ملة رسول الله صلى الله عليه﴾ پڑھتے ہوئے زین فرس سے زمین کے فرش پر داہنے رخسار کے بل تشریف لائے۔[2]

بلند مرتبہ شاہے زصدر زین افتاد اگر غلط نکنم عرش برزمین افتاد

بعض آثار سے واضح وآشکار ہوتا ہے کہ امامؑ زمین پر گرنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ جہاں پہلے پہل گرے تھے وہ مقتل گاہ سے خاصے فاصلے پر تھی۔ پھر افتاں وخیزاں موجودہ مقام تک پہنچے۔ مؤرخین نے لکھا ہے ﴿تارة يبوء و تارة يكبو و يقوم مرة و يكب اخرىٰ﴾ چند قدم چلتے پھر منہ کے بل گر پڑتے۔ (نفس المہموم، ص۱۹۳۔ طبری، ج۶) بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ بار بار کا گرنا ضعف کی وجہ سے نہ تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ حضرت اٹھ کر

---

[1] نفس المہموم، ص۱۹۰۔ بحار، ج۱۰، ص۲۰۳۔ مقتل خوارزمی، ج۲، ص۳۴ وغیرہ۔

[2] نفس المہموم، ص۱۹۲ وغیرہ۔

چند قدم چلتے تو کوئی شقی نیزہ مارتا اور کوئی تلوار اور حضرت گر پڑتے۔[1]

اس اثناء میں حصین بن نمیر تمیمی ملعون نے دہن اقدس میں تیر مارا۔ ابو ایوب غنوی لعین نے حلق میں تیر مارا اور زرعہ بن شریک لعین نے آپ کے بائیں بازو پر تلوار کا وار کیا۔ ایک دوسرے ملعون نے دائیں شانے پر تلوار ماری اور سنان بن انس نخعی لعین نے آپؑ کی ہنسلی کی ہڈی میں نیزہ مارا جس سے آپؑ منہ کے بل گر پڑے۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے اور حلق سے تیر کھینچا۔[2] اس وقت دشمنوں نے آپؑ کو گھیرے میں لے لیا۔ امامؑ کو شہید کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پسر سعد پاس کھڑا تھا۔

زینبؑ عالیہ کی بے تابی

یہ دردناک اور ہوشربا منظر دیکھ کر عقیلۂ قریش جناب زینبؑ عالیہ خیمہ کے دروازہ (تلہ زینبیہ) پر آ گئیں اور صدائے نالہ وشیون بلند کی اور شدت درد وکرب سے بے چین ہو کر کہنا شروع کیا ﴿وا اخاہ! واسیداہ! وا اھل بیتاہ! لیت السماء اطبقت علی الارض! ولیت تدکدکت علی السھل﴾[3] ہائے بھائی! ہائے سردار! ہائے اہل بیتؑ! اے کاش آج آسمان زمین پر گر پڑتا۔ اور اے کاش! پہاڑ زمین پر گر کر پارہ پارہ ہو جاتے۔ پھر بیتابانہ انداز میں عمر بن سعد لعین کو خطاب کر کے فرمایا۔ ﴿ویلک یا عمر! ایقتل ابو عبداللہ و انت تنظر الیہ﴾ اے پسر سعد! تو دیکھ رہا ہے اور ابو عبداللہ کو شہید کیا جا رہا ہے! راوی کہتا ہے کہ عمر لعین نے کوئی جواب نہ دیا لیکن میں نے دیکھا کہ اس وقت آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں پر جاری تھیں۔[4] پھر بی بی نے تمام فوج مخالف کو خطاب کر کے فرمایا۔ ﴿ویحکم اما فیکم مسلم؟﴾ وائے ہو تم پر، کیا تم میں کوئی بھی مسلمان نہیں ہے؟ بی بی کی اس داد وفریاد پر کسی بھی شقی نے کوئی جواب نہ دیا۔[5]

ہائے افسوس! بی بیؑ کی یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں اور وہ اپنے بھائی کی جان نہ بچا سکیں۔ امامؑ نہایت مجروح وخستہ حالت میں خاک پر تشریف فرما تھے کہ مالک بن نسر کندی لعین نے آگے بڑھ کر امامؑ پر سب وشتم کیا اور پھر سر اقدس پر تلوار ماری جس سے عمامہ کے نیچے جو ٹوپی تھی وہ کٹ گئی اور سر مبارک بھی شگافتہ ہو گیا۔ ٹوپی خون سے بھر گئی۔ امامؑ نے وہ ٹوپی اتار دی۔ سر پر پٹی باندھی۔ ظالم سے فرمایا۔ ﴿لا اکلت بیمینک ولا شربت و

---

[1] سوانح حسنؑ، ص ۱۶۸، طبع سوم۔

[2] عاشر بحار، ص ۲۰۵۔ نفس المہموم، ص ۱۹۳۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۳۹ وغیرہ۔

[3] بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۵۔ وقائع، ص ۵۵۷۔

[4] کامل، ج ۳، ص ۲۹۵۔ نفس، ص ۱۹۳ وغیرہ۔

[5] ارشاد، ص ۲۶۳۔ نفس المہموم، ص ۱۹۳۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۹۳۔ بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۵ وغیرہ۔

حشرک اللّٰہ مع الظالمین ﴾ تجھے کبھی اس دائیں ہاتھ سے کھانا بلکہ پینا بھی نصیب نہ ہو اور خدا تیرا حشر ظالموں کے ساتھ کرے۔ امامؑ کی اس بددعا کا اثر یہ ہوا کہ اس ظالم کے دونوں ہاتھ سردیوں میں چوب خشک کی طرح ہو جاتے تھے اور گرمیوں میں ان سے خون اور پیپ بہتی تھی۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں فقر و فلاکت میں مبتلا رہ کر واصل جہنم ہو گیا۔ (قمقام زخار، ص ۳۸۴۔ بحار الانوار، ص ۲۰۱)

امامؑ کو زین اسپ سے فرش پر آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ دشمن چاہتا تو آپؑ کو بہت پہلے شہید کر ڈالتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ عظیم کوئی اپنے سر لینا نہ چاہتا تھا۔[1] آخر کار شمر لعین نے للکار کر کہا۔ کیا انتظار ہے؟ ان کا کام جلد تمام کرو۔ خولی بن یزید اصبحی لعین آگے بڑھا مگر وہ لرزہ براندام ہو کر واپس چلا گیا۔ شمر لعین نے غصہ سے کہا۔ خدا تیرے بازو کو شل کرے کانپتا کیوں ہے؟ اس کے بعد یہ ملعون خود آگے بڑھا اور ناقابل بیان گستاخانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ یہ ملعون مبروص تھا۔ جناب سید الشہداؑ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: ﴿اللّٰہ اکبر صدق اللّٰہ و رسولہ قال رسول اللّٰہ کانی انظر الی کلب ابقع یلغ فی دم اہلبیتی﴾ خدا اور رسولؐ نے سچ فرمایا ہے! جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایک سفید داغ والے کتے کو دیکھ رہا ہوں جو میرے اہل بیت کے خون میں منہ ڈال رہا ہے۔ بہر حال، اس شقی ازلی نے کند تلوار کی بارہ ضربات سے خامس آل عبا نواسہ رسولؐ خدا جناب سید الشہداؑ علیہ آلاف التحیۃ والثناء کا پس گردن سے سر اقدس تن اطہر سے جدا کر[2] دیا۔ ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ﴾

تاریخ عالم کا یہ عدیم النظیر واقعہ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ بروز جمعہ واقع ہوا۔

ع

گر خوانمش قیامت صغریٰ بعید نیست

آں رستخیز عام کہ نامش محرم است

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۲۹۵ وغیرہ۔

[2] مقتل عوالم، ص ۱۰۰۔ مقتل خوارزمی، ج ۲، ص ۳۷۔ مقتل مقرم، ص ۳۳۳۔ بحار الانوار، قمقام زخار، ارشاد شیخ مفید، امالی شیخ صدوق، مقتل ابن نما، تاریخ طبری، تاریخ کامل، ناسخ التواریخ، نفس المہموم وغیرہا۔

چوبیسواں باب

امامؑ کی شہادت عظمیٰ سے لے کر اسیری اہل بیتؑ تک کے واقعات

امر اول:۔ شہادت حسینی کے بعد قہر و غضب الٰہی کے آثار کا نمودار ہونا

اس باب میں چند اہم امور پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ حجت خدا کی اس بیدردانہ وسفاکانہ شہادت سے کائنات میں تلاطم پیدا ہو گیا اور انقلاب عالم و عذاب الٰہی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ سیاہ آندھیاں چلنے لگیں۔ زمین میں زلزلہ پیدا ہوا۔ آسمان سے خون کی بارش ہوئی۔ بجلیاں کڑکنے لگیں۔ دن کے وقت تارے نظر آنے لگے اور فضا میں تاریکی چھا گئی۔ قریباً ایک گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی۔[1]

مندرجہ ذیل علامات کا تذکرہ تو برادران اسلامی کی کتب میں بھی موجود ہے۔ تین دن تک دنیا تاریک ہو گئی۔[2] سخت اندھیرا چھا گیا۔[3] یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھا کہ قیامت آ گئی ہے۔[4] دن دہاڑے تارے نمودار ہو گئے۔[5] سورج کو گہن لگ گیا۔[6] آسمان سے خون برسا۔[7] اور اس کا اثر دیواروں اور کپڑوں پر مدت تک باقی رہا۔[8] دوسری صبح جب مٹکے اور گھڑے دیکھے گئے تو وہ خون سے پُر تھے[9] اور جب کوئی پتھر یا ڈھیلا زمین سے اٹھایا جاتا تھا تو اس کے نیچے سے ابلتا ہوا خون نکلتا تھا۔[10]

کئی آثار سے ظاہر ہوتا تھا کہ سید الشہداؑ کی شہادت سے پہلے آسمان پر سرخی نہ تھی۔ اس کا سلسلہ شہادت امامؑ کے بعد شروع ہوا۔[11] غنیۃ الطالبین، مترجم، ص ۵۸۶، طبع لاہور میں لکھا ہے: ﴿هبط على قبر الحسين بن

---

1. تاریخ، ج ۲، ص ۲۹۲، ۲۹۳۔ عاشر بحار، ص ۲۰۵۔ تقام، ص ۳۹۳۔ نفس، ص ۱۹۲۔
2. تاریخ ابن عساکر، ج ۴، ص ۳۳۹۔ خصائص کبریٰ سیوطی، ج ۲، ص ۱۲۲ وغیرہ۔
3. الاتحاف بحب الاشراف، ص ۲۳۔
4. صواعق محرقہ، ص ۱۱۶، اتحاف، ص ۲۳۔
5. تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۳۵۴۔ صواعق، ص ۱۱۶۔
6. تاریخ الخلفاء، ص ۱۳۸، صواعق، ص ۱۱۹۔
7. خصائص کبریٰ، ج ۲، ص [illegible]۔ تذکرۃ الخواص، ص ۱۵۵۔ صواعق محرقہ، ص ۱۱۶۔
8. تاریخ ابن عساکر، ج ۴، ص ۳۳۹۔
9. خصائص کبریٰ، ج ۲، ص ۱۲۶۔ الکواکب الدریہ، ج ۱، ص ۵۶۔
10. تاریخ ابن عساکر، ج ۴، ص ۳۳۹۔ صواعق بحوالہ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۴۷۔
11. صواعق، ص ۱۱۹، طبع قدیم۔

علیؑ لما اصیب سبعون الف ملک یکون علیه الی یوم القیامة﴾ جب امام حسینؑ کی شہادت واقع ہوئی تو خداوند عالم نے ستر ہزار فرشتے نازل کئے جو قیامت تک وہاں آپ پر گریہ وبکا کرتے رہیں گے۔ ان حقائق سے یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ امام مظلوم پر مظاہر غم و حزن کا اظہار کرنا سنت پروردگار ہے۔ جب حکم خدا سے معصوم فرشتے آں جناب کی مصیبت پر گریہ وبکا کرتے ہیں تو اگر ہم ایسا کریں تو اسے کیونکہ بدعت قرار دیا جا سکتا ہے؟

جناب ام سلمہ و ابن عباس کا روز عاشوراء حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم رؤیا میں اس حال میں دیکھنا کہ سر و ریش مبارک میں خاک تھی۔ اور دست مبارک میں ایک شیشی تھی جس میں سید الشہداء اور ان کے اعزاء و اصحاب کا خون مقدس تھا۔ موصوفین نے اس پریشانی کی وجہ دریافت کی تو آں حضرتؐ نے فرمایا کہ میں ابھی ابھی حسینؑ کی قتل گاہ سے آ رہا ہوں (مشکوٰۃ ص۵۶۲ تا ۵۶۳ طبع دہلی۔ ترمذی شریف ج ۲ ص ۲۱۸ طبع دہلی) اس سے معلوم ہوا کہ روز عاشوراء سر و ریش میں خاک ڈالنا اور دوسرے مظاہر غم کا اظہار کرنا سنت رسولؐ ہے۔

ناسخ (ج ۶ ص ۲۹۳) میں لکھا ہے کہ شہادت حسینیؑ کے بعد قوم اشقیاء نے تین بار نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اور ص ۲۹۴ پر لکھا ہے کہ ہاتف غیبی نے آواز دی۔ قتل واللّٰہ الامام ابن الامام و اخو الامام و ابو الائمة الحسین بن علی بن ابی طالب علیهم السلام ولنعم ما قیل شعراً

و یکبرون بان قتلت و انما — قتلوا بک التکبیر و التهلیلا

امر دوم:۔ امامؑ کی لاش مقدس کی عریانی

انسان نما درندوں نے صرف شہادت امام پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ جسد اطہر پر زخموں کے ساتھ تار تار شدہ جو لباس تھا وہ بھی اتار لیا۔ چنانچہ قمیص اسحاق بن الحیوۃ حضرمی نے اتاری، شلوار ابجر بن کعب تمیمی نے، عمامہ خنس بن مرثد حضرمی نے، نعلین اسود بن خالد نے اتاریں۔ اور انگوٹھی بجدل بن سلیم کلبی نے جس کے ساتھ ملعون نے آقائے نامدار کی انگشت مبارک بھی قلم کر لی۔ اور قطیفہ (چادر یمانی) قیس بن اشعث نے اور تبراء نامی زرہ عمر بن سعد نے حاصل کی۔ اس کے قتل کے بعد مختار نے وہ زرہ اس کے قاتل ابی عمرہ کو دے دی تھی تلوار کس نے لی؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں (۱) قبیلہ اود کے ایک شخص نے لی (۲) دارمی شخص نے لی (۳) بنی تمیم کے ایک آدمی نے لی (۴) اور یہ کہ بنی نہشل کے ایک مرد فلافس[۱] نے لی۔ واللہ العالم

مخفی نہ رہے کہ یہ تلوار ذوالفقار نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو ذخائر نبوت و امامت میں مذخور تھی بلکہ کوئی اور تلوار تھی۔[۲]

---

[۱] ارشاد، ص ۲۶۴۔ طبری، ج ۶ ص ۲۶۰۔

[۲] ملہوف، ص ۱۱۴، ۱۱۵۔ بحار، ج ۱۰ ص ۲۰۵۔

نیز پوشیدہ نہ رہے کہ بعض روایات میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے انگوٹھی والے واقعہ کی نفی وارد ہوئی ہے۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ انگوٹھی جس کا نقش لا الہ الا اللہ عدۃ للقاء اللہ تھا۔ وہ ودائع نبوت وامامت میں سے تھی جو آں جنابؑ نے اپنی شہادت سے پہلے امام زین العابدینؑ کے حوالہ کر دی تھی۔[1] لہٰذا اگر انگوٹھی والے واقعہ کو صحیح تسلیم کیا جائے (اور اسے صحیح تسلیم نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ اکثر کتب معتبرہ میں مذکور ہے) تو تلوار کی طرح اس کی بھی یہ تاویل ممکن ہے کہ یہ وہ انگوٹھی نہ تھی جو ذخائر نبوت میں سے تھی۔ یہی تاویل جناب محدث قمی نے کی ہے۔[2] بعض کتب میں انگوٹھی کی بجائے ایک قیمتی ازار بند کا واقعہ عجیب وغریب تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ جس میں امام کے سر اور دست مبارک کی انگشتان مبارک کے قطع کرنے کا واقعہ مسطور ہے۔[3] واللہ العالم

واضح رہے کہ جو ظالم جناب سید الشہداءؑ کی کوئی چیز لوٹ کر لے گئے۔ آثار واخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ قریباً سب کے سب کسی نہ کسی آہت وآفت اور لا علاج جسمانی بیماری کا شکار ہوئے۔ چنانچہ اسحاق نے قمیص پہنی تو برص کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ ابجر نے جب شلوار استعمال کی تو پاؤں شل ہو گئے اور زمین گیر ہو گیا۔ اخنس نے جب عمامہ باندھا تو دیوانہ ہو گیا اور مرض جذام میں مبتلا ہو گیا۔ بجدل کو مختار نے ہاتھ قطع کر کے ہلاک کیا۔[4] و لعذاب الاخرۃ اشد و ابقی۔

امر سوم:۔ جناب سید الشہداءؑ کی لاش مقدس کو پامال سم اسپاں کرنے کی تحقیق

حضرت سید الشہداءؑ کی پامالیٔ لاش مقدس کی بابت علماء میں قدرے اختلاف ہے جو بات مشہور و معروف بلکہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ لاش مطہر کو پامال سم اسپاں کیا گیا جیسا کہ ارشاد شیخ مفیدؒ، ص ۲۶۵۔ ملہوف سید بن طاؤسؒ، ص ۱۱۹۔ عاشر بحار الانوار، ص ۲۰۶۔ قمقام زخار فاضل فرہاد مرزا، ص ۳۹۹۔ ناسخ التواریخ۔ مرزا سپہر کاشانی، ج ۶، ص ۲۹۷۔ نفس المہموم شیخ عباس قمی، ص ۲۰۱۔ مقتل الحسین السید عبد الرزاق المقرم النجفی، ص ۳۶۱۔ لواعج الاشجان علامہ سید محسن امین عاملی، ص ۱۵۸، اور کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۹۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

اس واقعہ ہائلہ کی اجمالی کیفیت جو ان کتب میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ شہادت امام عالی مقام کے بعد عمر بن

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۹۷، ۱۹۸۔ قمقام، ص ۳۹۹۔

[2] نفس المہموم، ص ۱۹۷۔

[3] انوار نعمانیہ، ص ۳۳۲، طبع ایران۔

[4] ملہوف، ص ۱۱۳۔ نفس المہموم، ص ۱۹۳۔ قمقام، ص ۳۹۵۔ ناسخ، ج ۶، ص ۲۹۱۔

سعد نے اپنی سپاہ کو خطاب کر کے کہا: ﴿من ینتدب للحسین و یوطئه فرسه؟﴾ تم میں ہے کون حسینؑ کی لاش کو پامال سم اسپاں کرتا ہے؟ اس اعلان کے بعد دس شقی گھوڑ سوار آگے بڑھے جن کے نام یہ ہیں:

(۱) اسحاق بن حیوہ۔ (۲) اخنس بن مرثد۔ (۳) حکیم بن طفیل۔ (۴) عمر بن صبیح صیداوی۔ (۵) رجاء بن منقذ عبدی۔ (۶) سالم بن خیثمہ جعفی۔ (۷) واحظ بن ناعم۔ (۸) صالح بن وہب الجعفی۔ (۹) ہانی بن ثبیت حضرمی۔ (۱۰) اسید بن مالک لعنهم الله جمیعاً۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ﴿فداسوا الحسین علیه السلام بحوافر خیولهم حتی رضوا صدره و ظهره﴾ ان ملاعین نے جناب امام حسین علیہ السلام کی لاش مقدس کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے اس طرح پامال کیا کہ سینہ و پشت کی ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہی ملعون تھے جنہوں نے ابن زیاد بدنہاد کے دربار میں اپنے اسی سیاہ کارنامے کو فخریہ انداز میں اس طرح بیان کیا تھا۔

نحن رضضنا الصدر بعد الظهر ❁ بکل یعبوب شدید الاسر

اور پھر ابن زیاد نے ان کو معمولی سا جائزہ دیا تھا۔ ﴿خسر الدنیا والاخرة و ذلک هو الخسران المبین﴾ ابوعمر زاہد کا بیان ہے کہ ﴿فنظرنا الی هولا العشرة فوجدناهم جمیعاً اولاد زنا﴾ ہم نے جب ان دس آدمیوں کے نسبی حالات و کوائف کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ سب کے سب ولد الزنا تھے۔[1]

محبت شه مردان مجو ز بی پدری ❁ که دست غیر گرفت است پائے مادر او

ہاں بعض علماء کرام کا خیال یہ ہے (جناب علامہ مجلسیؒ کا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے) کہ لاش مقدس پامال نہیں ہوئی۔ ان کے اس نظریہ کی بنیاد اس روایت پر قائم ہے جو اصول کافی (ص ۲۵۴ طبع ایران) میں موجود ہے کہ جب ملاعین نے پامالی لاش سید الشہداء کا ارادہ کیا تو جناب فضہ نے عقیلہ بنی ہاشم جناب زینب عالیہ کے حکم سے جنگل کے شیر کو بلایا[2] جو چنگھاڑتا ہوا آیا اور اگلے پاؤں لاش مبارک پر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ابن سعد نے یہ منظر دیکھ کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ﴿فتنة لا تثیروها انصرفوا﴾ یہ کوئی آزمائش ہے اسے نہ چھیڑو اور واپس چلے جاؤ۔ چنانچہ سوار واپس چلے گئے۔ بنا بر تسلیم اس روایت کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس وقت (عصر عاشوراء کو) شیر کی وجہ سے لاش مطہر پامال نہ کی گئی ہو۔ لیکن ابن سعد چونکہ گیارہویں محرم کو زوال کے بعد کربلا سے اپنی

---

[1] ملہوف، ص ۱۲۰۔ نفس، ص ۲۰۲ وغیرہ۔

[2] مخفی نہ رہے کہ روایت میں لفظ ابوالحارث وارد ہے۔ ابوالحارث جو شیر کو کہا جاتا ہے۔ یہ اس کی متعدد کنیتوں میں سے ایک کنیت ہے۔ ملاحظہ ہو: حیوۃ الحیوان دمیری، ج ۱، ص ۳۔ لہٰذا بعض داستان گو اس شیر کے بارے میں جو قصے بیان کرتے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (منہ عفی عنہ)

فوج سمیت کوفہ روانہ ہوا تھا۔ اور یہ اس روایت میں مذکور نہیں ہے کہ اس کی روانگی تک شیر برابر پہرہ دیتا رہا تھا۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کچھ دیر کے بعد جب شیر چلا گیا ہو تو ان بدبختوں نے اپنے مشئوم ارادہ کی تکمیل کر لی ہو۔ اسی طرح اس روایت کی تکذیب بھی نہیں ہوتی۔ اور قول مشہور کی صحت پر بھی آنچ نہیں آتی۔

فاضل بیرونی نے اسی انسانیت سوز واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿لقد فعلوا بالحسین ما لم یفعل فی جمیع الامم باشرار الخلق من القتل بالسیف و الرمح والحجارة واجراء الخیول﴾ ان اشقیاء نے امام حسینؑ کے ساتھ وہ سلوک کیا جو تمام اقوام وامم میں اشرار خلق کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا یعنی ان کو نیزہ و تلوار اور پتھروں سے شہید کیا۔ اور پھر ان پر گھوڑے دوڑائے۔[1]

امر چہارم:۔ اسپ امامؑ کا عجیب کیفیت کے ساتھ خیام کی طرف آنا

اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام کے گھوڑے نے اپنے سر گردن کو خون امام سے رنگین کیا۔ اور پریشان حال دوڑتا اور ہنہناتا ہوا۔ خیام کی طرف آیا جب بنات رسولؐ نے گھوڑے کی آواز سنی تو در خیمہ پر آ گئیں دیکھا کہ رہوار بلا سوار ہے۔ یقین ہو گیا کہ امام شہید ہو گئے ہیں۔ بی بیوں نے سخت گریہ و بکا کیا اور جناب ام کلثومؑ نے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ بین کیا: ﴿وا محمداه هذا الحسین بالعراء قد سلب العمامة و الرداء﴾ ہائے جد نامدار! یہ حسینؑ ہیں جو لق و دق صحرا میں پڑے ہیں۔ سر سے عمامہ اور کاندھوں سے رداء چھین لی گئی ہے۔[2]

بعض کتب میں مرقوم ہے کہ امام کی شہادت کے بعد ظالموں نے امام کے گھوڑے کو پکڑنے کی کوشش کی مگر گھوڑے نے اپنی پیشانی خون امام سے رنگین کی اور دوڑتا اور ہنہناتا ہوا خیام حسینیؑ کی طرف گیا وہاں پہنچ کر زور زور سے زمین پر سر مارنا شروع کیا حتی کہ اس حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔[3]

ناسخ کی ایک روایت کے مطابق گھوڑے نے خیام میں اس طرح اطلاع دینے کے بعد اپنے آپ کو دریائے فرات میں ڈال دیا اور غم امامؑ میں جان دے دی۔[4] اس طرح راہوار نے اپنے عظیم سوار کے ساتھ وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

بعض کتب میں اس گھوڑے کی حمایت و نصرت امام کی بابت ایک عجیب واقعہ مذکور ہے کہ جب امام زین سے زمین پر تشریف لائے تو گھوڑے نے اپنے عظیم سوار کی اس طرح حفاظت کرنا شروع کی کہ فوج اشقیاء کے

---

[1] الآثار الباقیہ للبیرونی، ص ۳۲۹، طبع لیدن۔ (علی ما نقل عنه)۔
[2] امالی شیخ صدوق، ص ۹۸، طبع ایران۔
[3] عاشر بحار، ص ۲۰۶۔
[4] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۱۹۴۔

سواروں میں سے پہلے کسی سوار پر حملہ کر کے نیچے گرا دیتا اور پھر اپنی ٹاپوں سے اسے روند ڈالتا۔ اسی طرح پورے چالیس سواروں کا صفایا کیا۔[1]

شہادت امامؑ کے بعد مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ گھوڑے کا خیام کی طرف آنا جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ کی انشاء کردہ زیارت امامؑ میں وارد ہے: ﴿فلما رأين جوادک مخزيا وسرجک عليه ملويا برزن من الخدور ناشرات الشعور على الخدود لاطمات الوجوه. سافرات و بالعويل داعيات و بعد العز من مذللات﴾ جب مخدارت عصمت نے تیرے رہوار کو اس طرح پریشان حال دیکھا اور دیکھا کہ زین ایک طرف سرکی ہوئی ہے۔ تو بیبیاں کھلے بالوں، منہ پر طمانچے مارتی ہوئی خیام سے باہر نکل آئیں اور جگر خراش بین کرنے لگیں۔[2]

ناسخ[3] میں جناب سکینہ بنت الحسینؑ کے یہ بین مذکور ہیں:

﴿وا قتيلاه وا ابتاه. وا حسناه. وا حسيناه. وا غربتاه. وابعد سفراه. وا طول كربتاه. هذا الحسين بالعراء مسلوب العمامة و الرداء﴾۔

ایضاح در کشف ابہام از نام اسپ امامؑ

اس گھوڑے کا نام کیا تھا؟ عام طور پر مشہور ذوالجناح مگر قریباً تمام قابل وثوق کتب سیر و مقاتل کی ورق گردانی کے بعد بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا البتہ اس کی رد میں بعض اہل تحقیق کے ارشادات ملتے ہیں۔

(۱) چنانچہ صاحب ناسخ رقمطراز ہیں: ﴿مکشوف بباد که اسپ سید الشهداء که در کتب معتبره بنام نوشته اند افزون از دو بال سواری نیست. یکے اسپ رسول خدا صلی الله علیه و آله که "مرتجز" نام داشت و دیگر شترے که "مسنات" میناميد ند. و اسپے که ذوالجناح نام داشته باشد. در هیچ یك از کتاب احادیث واخبار و تواریخ معتبره من بنده ندیده ام "الخ۔﴾ یعنی جو کچھ کتب معتبرہ میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ جناب سید الشہداء کی دو سواریاں تھیں۔ ایک جناب رسول خداؐ والا گھوڑا جس کا نام ''مرتجز'' تھا۔ اور دوسرا شتر جس کا نام مسنات تھا۔ آیا آنجناب کا کوئی ذوالجناح نامی گھوڑا بھی تھا؟ میں نے کسی معتبر کتاب یا حدیث میں ایسی کوئی تصریح نہیں دیکھی۔''

---

[1] مناقب شہر ابن آشوب، ج ۳، ص ۲۷۔ عاشر بحار، ص ۲۰۵۔

[2] زیارت سید مرتضیٰؒ مندرجہ بحار، ج ۲۲، ص ۲۷۱ بخط معروف بزیارت ناحیہ۔

[3] ج ۲، ص ۳۹۵۔

(۲) ایسا ہی مقام میں مذکور ہے۔ فراجع

امر پنجم:۔ تاراجیٔ خیام اہل بیتؑ

ظالموں نے مذکورہ بالا مظالم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ شہادت حسینیؑ کے بعد ان انسان نما وحشی درندوں نے وحشت و بربریت کا وہ مظاہرہ کیا کہ انسانیت لرزہ براندام اور شرافت و آدمیت انگشت بدندان ہو کر رہ گئی۔ ان ملاعین کو اگر کوئی کد و کاوش یا پھر کوئی نزاع تھی تو وہ صرف جناب سید الشہداءؑ کی ذات قدسی صفات سے تھی جب وہ شہید ہو چکے تو اب ان لوگوں میں اسلام نہ سہی اگر انسانیت کا بھی کوئی رمق ہوتا تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اسلامؐ کی بہو بیٹیوں کو عزت و احترام کے ساتھ مدینہ پہنچا دیتے۔ مگر افسوس ان اسلام کے دعویداروں اور در حقیقت اسلام و انسانیت کے دشمنوں نے وہ اسلام بلکہ انسانیت سوز ظلم و ستم ڈھائے کہ ؎

هیچ کافر نه کند آنچه مسلماں کردند

بعد ازیں اس بات میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ ان دشمنان خدا اور رسول کو مسلمان کہنا اسلام کی توہین اور انسان کہنا انسانیت کی تحقیر و تہجین ہے؟

مخدرات عصمت و طہارت کو احترام سے مدینہ پہنچانا تو درکنار۔ وہاں تو کچھ اس قسم کی آوازیں گونجنے لگیں جن کا مطلب یہ تھا ؎

لوٹو تبرکات علیؑ و بتولؑ کو　　　قیدی بنا کے لے چلو آل رسولؐ کو

چنانچہ یہ وحشی جانور خیام حسینیؑ میں گھس آئے اور بلاتحاشا لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ خیام میں جو کچھ ملا، اسے لوٹ لیا بلکہ پردگیاں عصمت و طہارت کے سروں سے چادریں، کانوں سے گوشوارے اور پاؤں سے خلخال تک اتار لئے۔[۱]

جناب زینب عالیہؑ کی جگر خراش روایت

جناب زینب عالیہ سلام اللہ علیہا بیان کرتی ہیں کہ جب عمر بن سعد نے ہمارے خیام کے لوٹنے کا حکم دیا تو اس وقت میں در خیمہ پر کھڑی تھی کہ ایک ازرق چشم ظالم خیمہ میں گھس آیا۔ جو کچھ مال و اسباب ملا لوٹا۔ پھر امام زین العابدین علیہ السلام کی طرف بڑھا جو چمڑے کے ایک ٹکڑے پر رنجوری و بیماری کی حالت میں پڑے تھے۔ اس نے امام کو زمین پر گرا دیا اور وہ چمڑا بھی نیچے سے کھینچ لیا۔ اس کے بعد میری طرف بڑھا اور کانوں سے گوشوارے کھینچنے لگا وہ ظالم ظلم و ستم بھی کرتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ روتا بھی جاتا تھا۔ میں نے اس سے رونے کی وجہ دریافت کی؟ اس نے

---

[۱] ملہوف، ص ۱۱۶۔ ارشاد، ص ۲۶۴ بالاختصار۔

کہا: آپ اہل بیتؑ کی مظلومیت و بے کسی رلاتی ہے۔ جس میں آپ گرفتار ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا: ظالم اگر تجھے ہم سے اس قدر ہمدردی ہے تو پھر ہمیں لوٹتا کیوں ہے؟ کہا: اس اندیشہ سے کہ اگر میں نہ لوٹوں گا تو کوئی اور لوٹ لے گا! بی بی عالم نے غصہ میں آ کر فرمایا: ﴿قطع اللّٰہ یدیک و رجلیک و احرقک بنار الدنیا قبل نار الاٰخرۃ﴾ خدا تیرے ہاتھوں اور پاؤں کو قطع کرے اور آخرت کی آگ سے پہلے دنیا کی آگ میں جلائے۔ ثانی زہرا کی اس بددعا کا ظہور مختار کے ہاتھوں پر ہوا کہ اس نے اس ملعون کو اس کے ہاتھ پاؤں قلم کرنے کے بعد زندہ نذر آتش کر دیا گیا تھا[1]

جناب فاطمہؑ بنت الحسینؑ کی زبانی جانگداز واقعات

ایسے ہی ایک خسیس الطبع شقی کا واقعہ جناب فاطمہ بنت الحسین بیان کرتی ہیں کہ جب غارتگر ہمارے خیمہ میں گھس آئے تو ایک ظالم میرے پاؤں سے خلخال اتارنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ روتا بھی جاتا تھا۔ میں نے پوچھا: ﴿ما یبکیک یا عدو اللّٰہ؟﴾ اے دشمن خدا! تو روتا کیوں ہے؟ کہنے لگا: ﴿کیف لا ابکی وانا اسلب ابنۃ رسول اللّٰہ؟﴾ بھلا کیونکر نہ روؤں جب کہ رسول زادی کو لوٹ رہا ہوں؟ میں نے کہا: ﴿فلا تسلبنی؟﴾ اگر تجھے اس قدر احساس ہے تو پھر نہ لوٹ کہا: ﴿اخاف ان یجیئ غیری فیاخذہ﴾ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کوئی اور آ کر نہ لوٹ لے۔ بی بی کہتی ہیں پس جو کچھ خیام میں تھا وہ سب لوٹ کر لے گیا حتیٰ کہ ہمارے سروں سے چادریں بھی اتار لیں۔[2]

بحار وغیرہ کتب معتبرہ میں انہی جناب فاطمہ صغریٰ سے ان کی مظلومیت کی داستان قدرے تفصیل کے ساتھ اس طرح مرقوم ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں درخیمہ پر کھڑی اپنے بابا اور ان کے اصحاب واعزا کی لاشوں کو دیکھ رہی تھی جو قربان گاہ کربلا میں بے گور وکفن پڑی تھیں۔ اور اپنے انجام قید یا قتل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایک ظالم سوار خیمہ میں گھس آیا جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا جو نیزہ کی انی سے بی بیوں کو اذیت پہنچا کر ان کی چادریں اور زیور اتار رہا تھا۔ بی بیاں داد و فریاد کر رہی تھیں۔ اسی اثناء میں یکا یک وہ سفاک میری طرف بڑھا۔ میں یہ سمجھ کر دوڑی کہ شاید اس طرح میں اس کے چنگل سے بچ جاؤں گی مگر اس ظالم نے میرا تعاقب کیا اور اچانک میرے دونوں کاندھوں کے درمیان نیزہ مارا جس سے میں منہ کے بل گر گئی۔ پھر اس نے میرے سر سے چادر اور کانوں سے گوشوارے اتار لئے۔ میرے کانوں سے خون بہنے لگا اور میں شدت غم و دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد

---

[1] ناسخ التواریخ ج ۶ ص ۲۹۸۔ عاشر بحار ص ۲۰۶۔ مقتل الحسین ص ۳۵۷ وغیرہ۔

[2] امالی شیخ صدوق ص ۹۹۔

جب افاقہ ہوا تو دیکھا کہ پھوپھی اماں میرے پاس بیٹھ کر رو رہی رہیں اور فرما رہی ہیں۔ اٹھو جا کر دیکھیں کہ دوسری مستورات اور تمہارے بیمار بھائی پر کیا گذری ہے؟ میں نے کہا: ﴿یا عمتاہ هل من خرقة استر بها رأسی عن اعین النظار﴾ پھوپھی اماں! کیا کپڑے کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے جس سے میں اپنے سر کو ڈھانپ سکوں؟ پھوپھی نے فرمایا: ﴿یا بنتاہ عمتک مثلک﴾ بیٹی! تیری پھوپھی بھی تیری مانند ہے! میں نے جب نظر اوپر اٹھائی تو ﴿فرایت راسها مکشوفة متنها قد اسود من الضرب﴾ دیکھا کہ پھوپھی اماں کا سر ننگا ہے۔ اور مار کی وجہ سے پشت مبارک سیاہ ہوگئی ہے۔ واپس خیمہ میں پہنچیں تو دیکھا کہ سب مال اسباب لوٹا جا چکا ہے۔ اور امام بیمار منہ کے بل زمین پر پڑے ہیں جو کثرت بھوک و پیاس اور شدت بیماری کی وجہ سے حس و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ﴿فجعلنا نبکی علیه ویبکی علینا﴾ ہم ان کی حالت پر رونے لگیں۔ اور وہ ہماری حال زار پر رونے لگے۔[1]

خاندان نبوت کے انہیں مصائب و شدائد سے متاثر ہو کر بکر بن وائل کے خاندان کی ایک عورت جو اپنے شوہر کے ساتھ پسر سعد کے لشکر میں تھی۔ تلوار ہاتھ میں لے کر نعرہ بلند کرتی ہوئی خیام اہل بیت کے دروازہ پر آ کر کھڑی ہوگئی اور با آواز بلند کہا: ﴿یا ال بکر بن وائل اتسلب بنات رسول الله! لا حکم الا لله یالثارات رسول الله﴾ اے آل بکر بن وائل! تم موجود ہو اور بنات رسول کو لوٹا جا رہا ہے؟ خدا کے سوا کسی کا حکم قابل قبول نہیں۔ اے لوگو! آؤ خاندان رسول کا بدلہ لو۔ یہ کیفیت دیکھ کر اس کا شوہر آیا اور اسے اپنی قیام گاہ کی طرف لے گیا۔[2]

بیمار کربلا کے قتل کا ارادہ اور اس میں ناکامی کا سبب؟

یہ خونخوار درندے خیام حسینی میں لوٹ مار کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں امام بیمار بستر بیماری پر پڑے ہوئے تھے۔ اب باہم اختلاف کرنے لگے۔ بعض نے کہا کہ صنف ذکور میں سے کسی چھوٹے یا بڑے کو زندہ نہ چھوڑو۔ اور بعض نے کہا جلدی نہ کرو۔ امیر عمر ابن سعد سے مشورہ کر لو۔ اسی دوران شمر بن ذی الجوشن تلوار سونت کر پہنچ گیا۔ اور چاہا کہ امام بیمار کو شہید کر دے۔ حمید بن مسلم نے کہا: ﴿یا سبحان الله! اتقتل الصبیان انما هو صبی مریض﴾ سبحان اللہ! کیا لڑکے اور وہ بھی بیمار قتل کیے جاتے ہیں؟ اتنے میں عمر بن سعد بھی آ گیا اس نے شمر کو ایسا کرنے سے منع کیا۔[3] بعض روایات میں وارد ہے کہ جب شمر نے قتل امام پر اصرار کیا۔ تو جناب زینب عالیہ نے فرمایا: ﴿لا یقتل حتی اقتل﴾ پہلے مجھے قتل کرو پھر ان کو کرنا۔ یہ دیکھ کر ظالم رک گیا۔[4] یہ ان مقامات میں سے ایک

---

1. ماشر بحار، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۹۸، ۲۹۹ وغیرہ۔
2. بحار، ج ۱۰، ص ۲۰۶۔ مقتل الحسین، ص ۳۵۸۔ نفس الہموم، ص ۱۹۵ وغیرہ۔
3. طبری، ج ۶، ص ۲۶۰۔
4. اخبار الدول قرمانی، ص ۱۰۸، بحوالہ مقتل الحسین، ص ۳۵۹۔

مقام ہے۔ جہاں شریکۃ الحسین نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اپنے بیمار بھتیجے زین العابدینؑ کو بچانے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان ظالموں کے ترکش ظلم و جور میں کچھ تیر باقی تھے۔ چنانچہ سب کچھ لوٹنے کے بعد خیام کو آگ لگا دی ﴿فخرجن حواسرات مسلّبات. حافیات. باکیات یمشین فی اسر الذلة﴾ بی بیاں اس حال میں باہر نکلیں کہ سر ننگے، لوٹی ہوئی، پاؤں ننگے، روتی ہوئی اور ذلت و خواری کی قید میں گرفتار تھیں[1] اور اس طرح ان لوگوں نے اپنی اسلام بلکہ انسان دشمنی کے جذبہ کو عریاں کر دیا۔ لعنة الله علیهم اجمعین۔

امام حسینؑ کے پس ماندگان میں صرف ایک بیمار علی بن الحسینؑ، پردہ نشین خواتین اور کچھ چھوٹے بچے رہ گئے تھے۔ جو رات بھر خیموں کے جلنے کے بعد اسی کھلے ہوئے صحراء میں مقیم رہے۔[2]

ظالم جو کچھ مال و اسباب لوٹ کر لے گئے تھے اس میں کچھ زعفران، کچھ مہندی اور چند اونٹ بھی شامل تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس نے بھی زعفران استعمال کیا اس کا بدن جل گیا، مہندی راکھ کی مانند ہو گئی اور اونٹ جس نے بھی نحر کئے دیکھا ان کا گوشت حنظل سے بھی زیادہ کڑوا ہے۔[3]

امر ششم:۔ دفن شہداء کربلاء کی تحقیق

اس بات پر قریباً مورخین کا اتفاق ہے کہ عمر بن سعد نے عصر عاشوراء کو جناب سید الشہداء کا سر مبارک خولی بن یزید اصبحی اور حمید بن مسلم کی تحویل میں۔ اور دوسرے شہداء کربلا کے سر ہائے مبارک شمر بن ذی الجوشن، قیس بن اشعث اور عمرو بن الحجاج زبیدی کی سرکردگی میں ابن زیاد کی طرف کوفہ روانہ کر دیئے۔ اور خود پسر سعد گیارہ محرم کے زوال تک کربلا میں رہا۔ اس اثنا میں اپنے مقتولین کی نجس لاشوں کو اکٹھا کیا۔ ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ اور ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر جناب سید الشہداء اور ان کے اصحاب و اعزہ کی مقدس لاشوں کو بلا سر اور بلا کفن و دفن کربلا کے لق و دق صحراء میں چھوڑ کر زوال آفتاب کے بعد اپنے لاؤ لشکر اور اسارائے آل محمدؐ کے ساتھ کوفہ روانہ ہو گیا۔

اس کے روانہ ہو جانے کے بعد بنی اسد نے جو کربلا کے قریب ''غاضریہ'' نامی بستی میں فروکش تھے آئے

---

[1] ناسخ بحار، ص ۲۰۹۔ نفس المہموم، ص ۱۹۹۔ تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۶۰۔

[2] شہید انسانیت، ص ۵۴۴۔

[3] خصائص کبریٰ، ج ۲، ص ۱۲۶۔ تاریخ ابن عساکر، ج ۴، ص ۳۳۹۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۲، ص ۹۰ وغیرہ۔

اور شہداء پر نماز جنازہ پڑھی اور ان کو دفن کیا۔ اب رہیں اس واقعہ کی تفاصیل کہ آیا اسی گیارہ محرم کو دفن کیا یا بارہ کو۔ کس ترتیب سے دفن کیا؟ اور کس چیز کا کفن دیا؟ نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟ لاشوں کی شناخت کیونکر کی؟ ان تفاصیل کے بارے میں کتب معتبرہ خاموش ہیں۔

جناب محدث قمی لکھتے ہیں: ﴿ليس في الكتب المعتبرة كيفية دفن الحسين عليه السلام ومن قتل معه مفصلا﴾ کتب معتبرہ میں جناب امام حسین علیہ السلام اور دوسرے شہداء کربلا کے دفن کی تفصیلی کیفیت مذکور نہیں ہے۔ (نفس المہموم)

تاریخ دفن کے بارے میں اکثر کتب مقاتل میں ﴿بعد قتلهم بيوم﴾ [1] درج ہے۔ جس سے گیارہ محرم ظاہر ہوتی ہے۔ اور بعض کتب میں بارہ محرم کی تصریح [2] موجود ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ گیارہ سے پہلے نہیں اور بارہ کے بعد نہیں۔ البتہ مقتل الحسین للمقرم میں درج ہے۔ اور جہاں تک دفن کی ترتیب کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق اتنی بات پر تو تمام ارباب تاریخ و مقاتل متفق ہیں کہ جناب سید الشہداء کو وہاں دفن کیا گیا جہاں اب ان کا مزار مقدس ہے۔ ان کے پائیں پا شہزادہ علی اکبر کو دفنایا گیا نیز ان کی پائنتی کی طرف ایک بڑا سا گڑھا کھود کر دیگر اصحاب و اعزا کو دفن کیا گیا اور شہزادہ ابوالفضل کو وہیں دفن کیا گیا جہاں وہ کنار فرات غاضریہ کے راستہ میں شہید ہوئے تھے جہاں ان کی اب قبر مبارک ہے۔ [3]

جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کا قول ہے: ﴿لسنا نحصل لهم اجداثا على التحقيق و التفصيل الا انا لا نشك ان الحائر محيط بهم رضى الله عنهم﴾ (ارشاد ص ۲۷۲) ہم تعیین و تشخیص نہیں کر سکتے کہ کس شہید کا جسد کہاں ہے؟ ہاں اس قدر یقین ہے کہ حائر حسینی سب کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

مشہور یہ کہ جناب حر کو ان کے قبیلہ والے لوگ اٹھا کر دور لے گئے اور وہاں دفن کیا۔ جہاں ان کی اس وقت قبر [4] ہے۔ نیز بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا سر بھی قلم ہونے سے بچ گیا تھا۔ [5]

بنی اسد قبائل عرب پر فخر کرتے تھے کہ ہم وہ ہیں جنہوں نے امام حسین علیہ السلام پر نماز جنازہ پڑھی ہے اور آپ کو اور آپؑ کے اصحاب کو دفن کیا۔ [6]

---

[1] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۹۶۔

[2] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۰۴۔

[3] ارشاد، ص ۲۶۸۔ نفس المہموم، ص ۳۰۵۔ عاشر بحار الانوار، ص ۲۱۸۔

[4] نفس المہموم، ص ۳۰۵۔

[5] کبریت احمر، ص ۲۱۸۔

[6] ابصار العین، ص ۔۔۔؟۔ نفس المہموم، ص ۳۰۵ بحوالہ کامل بہائی۔

تبصرہ:۔

چونکہ مذہب شیعہ کے مسلمہ عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ امام کی نماز جنازہ امام ہی پڑھاتا ہے۔ اور اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین کا انتظام بھی وہی کرتا ہے۔ اس لئے اگرچہ حسب ظاہر یہ سب فرائض بنی اسد نے انجام دئے اور امام بظاہر گرفتار تھے مگر مذکورہ بالا مسلمہ عقیدہ کی رو سے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ امام باعجاز امامت تشریف لائے۔ اور اپنے والد ماجد کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی تجہیز و تدفین کا بندوبست کیا۔ جیسا کہ امام رضا علیہ السلام کی حدیث احتجاج علی الواقفہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ علی بن ابی حمزہ ابن البراج اور ابن الرکاری نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم تک آپ کے آباء واجداد طاہرین کی یہ حدیث پہنچی ہے کہا: امام کی تکفین کا انتظام امام ہی کرتا ہے (مطلب یہ کہ اگر آپ امام ہوتے تو بغداد میں جا کر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی تدفین و تکفین کا اہتمام فرماتے)۔ امام نے فرمایا: مجھے یہ بتاؤ کہ امام حسین علیہ السلام امام تھے یا نہ؟ سب نے کہا کہ ہاں وہ امام تھے! فرمایا: پھر ان کے کفن و دفن کا انتظام کس نے کیا تھا؟ کہا: ان کے فرزند امام زین العابدین علیہ السلام نے! فرمایا: وہ اس وقت تھے کہاں؟ کہا: ابن زیاد کی قید میں تھے مگر جناب اس طرح کربلا پہنچے کہ کسی کو خبر نہ ہو سکی اور جا کر امام کے دفن و کفن وغیرہ کا انتظام کر کے واپس چلے گئے امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ جس خدا نے امام زین العابدین علیہ السلام کو اس بات پر قادر کیا کہ وہ کربلا جا کر اپنے والد ماجد کے فرائض کفن و دفن کو انجام دیں وہی خدا اس امام کو بھی قدرت دے سکتا ہے کہ وہ مدینہ سے بغداد پہنچ کر اپنے والد ماجد کی تکفین و تدفین اور نماز جنازہ کا فریضہ انجام دیں حالانکہ یہ تو قید بھی نہ تھے۔[1]

اور اس کی تائید مزید مقتل الحسین للمقرم کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ بنی اسد دفن کے معاملہ میں حیران و سرگرداں تھے۔ کہ امام زین العابدینؑ باعجاز امامت تشریف لائے۔ امام نے ان کو لاشہائے شہداء کی معرفی کرائی اس وقت بہت گریہ و بکا ہوا۔ اس کے بعد امام اپنے بابائے بزرگوار کی لاش مطہر کے پاس گئے۔ گلے لگ کر بکثرت گریہ و بکا کیا۔ پھر قبر کے مقام سے تھوڑی سی مٹی ہٹائی۔ وہاں کھدی کھدائی قبر تیار تھی۔ امام نے نماز جنازہ پڑھنے کے بعد تنہا یہ پڑھتے ہوئے اپنے والد ماجد کو قبر میں اتارا ﴿بسم اللہ و فی سبیل اللہ و علی ملۃ رسول اللہ. صدق اللہ و رسولہ ماشاء اللہ لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم﴾ جب لحد میں لاش مقدس کو لٹا چکے تو گلوئے بریدہ کے پاس دہن اقدس لے جا کر کہا: ﴿طوبی لارض تضمنت جسدک الطاھر. فان الدنیا بعدک مظلمۃ. و الاخرۃ بنورک مشرقۃ. اما اللیل فمسھد و الحزن سرمد. او یختار اللہ لاھل بیتک

---

[1] رجال کشی ص ۹۔ نفس المہموم ص ۲۰۶ وغیرہ۔

دارک التی انت بها مقیم و علیک منی السلام یا بن رسول اللّٰہ ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ﴾

پھر قبر مبارک پر (انگشت سے) لکھا ﴿ھذا قبر الحسین ابن علی بن ابی طالب الذی قتلوه عطشاناً غریباً﴾ یہ اس حسین بن علیؑ کی قبر ہے جسے لوگوں نے پیاسا شہید کیا۔

اس کے بعد عم بزرگوار جناب ابوالفضل کی لاش مبارک کے پاس پہنچے۔ ان کے گلوئے بریدہ پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا ﴿علی الدنیا بعدک العفا یا قمر بنی ھاشم وعلیک منی السلام من شهید محتسب ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ﴾ اس کے بعد قبر کھودی اور خود تنہا ان کو اس میں اتارا۔ ہر دو دفعہ بنی اسد سے فرمایا: میرے ساتھ معاون موجود ہیں۔ پھر بنی اسد کو حکم دیا کہ دو گڑھے کھودیں۔ ایک میں بنی ہاشم کو اور دوسرے میں اصحاب کو دفن کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس کے مطابق عمل درآمد کیا۔[1] واللہ العالم

امر ہفتم:۔ سید الشہداء کے سر اقدس کے مدفن کی تحقیق

سید الشہداؑ کا سر مبارک کہاں دفن ہے؟ اس میں شدید اختلاف ہے۔ مذہب امامیہ میں قول مشہور و منصور یہی ہے کہ سر اطہر جسد اقدس کے ساتھ ہی دفن ہے[2] مگر اس سلسلہ میں اختلافات کو دیکھتے ہوئے شرح صدر اور پورے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

ذیل میں اس اختلاف کا ایک خلاصہ بیان کرکے اس پر کچھ مختصر سا تبصرہ کیا جاتا ہے۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے سر مبارک کے مدفن کے متعلق علمائے سیر و تواریخ میں بڑا اختلاف ہے۔ اور قطع و یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں دفن ہوا؟

۱۔ اصول کافی و تہذیب الاحکام کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کا فرق مقدس مدینہ طیبہ میں دفن ہے

۲۔ سید علی بن عبداللہ مدنی نے خلاصۃ الوفا میں لکھا ہے کہ امام حسن مجتبیٰؑ کے مزار مقدس کے پاس دفن ہے ابن شہر آشوب، ابن بکار اور ہمدانی کا یہی قول ہے۔

۳۔ فتاوائے قرطبی میں یہ لکھا ہے کہ یزید نے سر مبارک مدینہ کے گورنر عمرو بن سعید بن عاص کے پاس بھجوایا اور اس نے جنت البقیع میں دفن کرا دیا۔

۴۔ کامل الزیارۃ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ

---

[1] مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۸۹۔ اسرار الشہادت، ص ۳۵۸۔

[2] روضۃ الواعظین فتال نیشاپوری، ص ۲۳۰۔ مثیر الاحزان، ص ۵۸۔ لہوف، ص ۵۰۔ اعلام الوریٰ طبرسی، ص ۱۵۱۔ مقتل العوالم، ص ۱۵۴۔ عاشر بحار، ص ۲۲۸۔ مقتل الحسین، ص ۳۳۶۔ جلاء العیون، ص ۲۱۶، طبع النجف۔ تتمام، ص ۵۰۲ وغیرہ۔

کا سر اقدس نجف اشرف میں حضرت امیر علیہ السلام کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ علامہ مجلسی نے تحفۃ الزائر میں اور بہت سے علماء شیعہ نے اسی قول کی طرف میلان ظاہر کیا ہے۔

۵۔ عبداللہ بن عمرو وراق نے اپنے مقتل میں لکھا ہے کہ سر مبارک مسجد رقہ میں دفن ہے۔

۶۔ قطب راوندی کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب رسول خدا باعجاز نبوت اسے شام سے اپنے ہمراہ مدینہ لے گئے۔

۷۔ ایک قول یہ ہے کہ یزید نے دیار و امصار میں اس کی تشہیر کا حکم دیا جب لوگ پھراتے پھراتے عسقلان لے گئے تو وہاں کے حاکم نے وہیں دفن کرا دیا۔ چنانچہ خوان خلیلی کے قریب اب تک مشہد حسینی موجود ہے۔ اس مشہد کی ابتداء امیر الجیوش بدر الجمالی وزیر مستنصر باللہ نے کی اور تکمیل ان کے بیٹے ملک افضل نے کی۔

۸۔ تہذیب التہذیب اور صواعق محرقہ وغیرہ میں یہ لکھا ہے کہ جناب امام حسینؑ کا سر مبارک خزانۂ یزید میں ہی رہا جب سلیمان بن عبدالملک بن مروان تخت حکومت پر بیٹھا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ سر امام خزانہ میں موجود ہے تو اس نے تلاش کر کے منگایا۔ دیکھا کہ استخوان سر متور مجلا چاندی کی مانند چمک رہے ہیں کچھ دیر پاس رکھنے کے بعد کفن دے کر اکرام و احترام کے ساتھ مقابر مسلمین میں دفن کرا دیا۔

۹۔ بعض کا قول یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور حکومت میں وہاں سے نکلوا کر کربلا میں بھجوا دیا اور وہاں دفن کیا گیا۔

۱۰۔ یہ بھی تہذیب میں لکھا ہے کہ سر مبارک برابر خزانہ یزید میں رہا۔ جب بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی۔ اور انہوں نے خزانہ یزید کو لوٹا تو ایک سپاہی کو ایک تھیلی نظر پڑی۔ اس نے کوئی دنیوی گراں بہا چیز سمجھ کر اٹھا لیا۔ جب میدان میں لا کر کھولا تو سر مقدس ایک پارچہ حریر میں لپٹا ہوا دیکھا۔ اس حریر پر لکھا تھا: ﴿ھذا راس الحسین بن علی﴾ اس سپاہی نے وہیں نوک تلوار سے زمین کھود کر دفن کر دیا۔

۱۱۔ ابن جوزی اور بعض دوسرے مورخین نے یہ لکھا ہے کہ جب مصور بن جمہور نے خزانہ بنی امیہ پر قبضہ کیا تو اسے سر مقدس ایک مقفل صندوق میں ملا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ حضرت امام حسینؑ کا سر مطہر ہے تو اس نے دمشق کے تیسرے برج سے جانب شرقی باب الفرادیس کے قریب دفن کرایا۔

۱۲۔ عبوس منصوری نے زبدۃ الفکرہ میں یہ لکھا ہے کہ بنی عباس کے زمانہ میں سر مطہر کو دمشق سے عسقلان لے جایا گیا۔ اور عرصہ دراز تک وہیں دفن رہا۔ جب صلیبی جنگوں کے زمانے میں نصاریٰ کے غلبہ کا اندیشہ ہوا۔ تو مسلمانوں نے وہاں سے نکال کر دار السلطنت میں پہنچا دیا۔ مقریزی نے خطط میں لکھا ہے کہ ۸ جمادی الاولیٰ

۵۴۸ھ بروز یکشنبہ کو سر مطہر قاہرہ لایا گیا۔ اس وقت اس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ اور مشک جیسی خوشبو آرہی تھی۔ وہاں اب تک اسی نام۔ مسجد راس الحسین سے مسجد مشہور ہے جو نہایت مختلف ساماتوں سے آراستہ ہے اور لوگ بکثرت زیارت کو آتے ہیں۔

۱۳۔ بعض کتب میں سر مبارک کے دمشق سے عسقلان لے جانے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ دمشق دشمنان خاندان نبوت کا مرکز تھا۔ خطرہ تھا کہ یہ لوگ کبھی کوئی بے ادبی نہ کریں۔ اس لئے اسے عسقلان منتقل کرا دیا گیا۔ اور ۵۴۸ھ ۱۱۵۳ء جب مصر میں خاندان فاطمی کا آخری تاجدار فائزلدین اللہ مسند اقتدار پر متمکن تھا۔ ان کے وزیر اعظم ملک صالح طلائع بن رزیک نے ان کو اطلاع دی کہ عسقلان کی طرف سے صلیبی فوجیں بڑھ رہی ہیں۔ لہٰذا اس اندیشہ کے پیش نظر کہ وہ لوگ سر امام کے ساتھ کوئی بے ادبی کریں۔ مصر منتقل کرنے کا عزم کیا۔ چنانچہ ۸ جمادی الاولیٰ ۵۴۸ھ کو سر مبارک قاہرہ لایا گیا۔ اور بوستان کافوری میں جہاں وزیر اعظم موصوف نے نام سے عالی شان مسجد صالح تھی۔ اس میں ایک طرف سر مبارک دفن کیا گیا۔ اور اس پر عالی شان عمارت بنوا کر اس کی خوب زیبائش و آرائش کی گئی۔ ادھر ابھی سر مبارک کو عسقلان سے لائے ہوئے ہنوز پورے تین روز بھی نہ گزرے تھے کہ ۲۷ جمادی الثانیہ کو اس پر نصرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ یہ مسجد صالح باب زویلہ سے قدرے فاصلہ پر تھی اور زائروں کی آمد و رفت میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے عاضد لدین اللہ نے وہاں سے سر مطہر نکلوا کر اپنے خاص رہائشی محل قصر زمرد کے پاس دفن کرا دیا۔ اور اس پر پر شکوہ عمارت بنوا کر اسے خوب آراستہ و پیراستہ کیا۔ سیاح ابن جبیر نے اپنے سفر نامہ میں ۵۷۸ھ میں مصر کی سیاحت کے دوران قاہرہ میں مشہد حسین کی زیارت کرنے اور اس کی عجیب و غریب عمارت کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ سر مطہر ایک منقش تابوت میں مدفون ہے۔ اسی طرح مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی جب ۷۲۶ھ میں مصر کی سیاحت کی ہے تو اپنے سفر نامہ میں مشہد حسینی اور اس کی عظیم عمارت کا پر شکوہ الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ پھر برابر مختلف ادوار میں اس کی توسیع و تزئین میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ امیر حسن کتخدا المتوفی ۱۱۲۳ھ نے اس کی بڑے اہتمام سے توسیع اور زیبائش کرائی۔ اور ۱۱۷۵ھ میں امیر عبدالرحمٰن کتخدا کے حکم سے اس کی تجدید ہوئی۔ بعد ازاں ۱۲۰۶ھ میں مزید توسیع سید علی الوا الوار نے کرائی۔ پھر ۱۲۷۹ھ میں عباس پاشا نبیرہ محمد علی پاشا نے اس کی مزید توسیع کرانا شروع کی۔ مگر تکمیل سے پہلے وفات پا گیا۔ اس کے بعد خدیو اسماعیل پاشا نے اپنے خاص اہتمام سے اس کی تجدید و تکمیل کی۔ ۱۲۹۰ھ کو تکمیل ہوئی۔ اب یہ مشہور خان خلیلی اور جامع ازہر کے درمیان واقع ہے۔ عمارت بہت وسیع نہایت شاندار اور خوشنما ہے۔ ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ صد ہا مصری حفاظ اور قاری خوش الحانی سے تلاوت قرآن مجید اور دوسرے

لوگ نمازوں اوراد وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ خصوصاً جمعہ کے روز بہت ہجوم رہتا ہے۔ اس مشہد مطہر کی دیواروں پر دائروں کی شکل میں آیات قرآنی اور مختلف اشعار سنہری حروف میں لکھے ہوئے ہیں سنہ ۱۳۱۶ھ میں خدیو عباس حلمی کے زمانہ میں ان حروف پر پھر سنہرا رنگ چڑھایا گیا۔

۱۴۔ اکثر کتب مقاتل میں یہ لکھا ہے کہ امام زین العابدین نے رہائی کے بعد سر مبارک ہمراہ لا کر کربلا میں جسد اطہر کے ہمراہ دفن کیا۔

﴿الی غیر ذلک من الاقوال المختلفه والاراء المتشتة﴾ ان مختلف اخبار اور متضاد آثار کے درمیان جمع و توفیق یا بعض کو بعض پر تقدیم و ترجیح دینا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جیسا کہ صاحب فرسان الہیجاء نے (ج ۲، ص ۳۰۰ پر) اعتراف کیا ہے کہ:

﴿جمع بین این روایات و اقوال مختلفه در عقده محال است و قضاوت کردن باینکه کدام یك صحیح است در غایت اشکال ست و ترجیح قول باینکه در کربلا مدفون است سزاوار است﴾۔

ہم بوجہ خوف طوالت ہر قول کے دلائل اور پھر ان پر نقض و ابرام کو ترک کرتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک ہمارے ذاتی رجحان کا تعلق ہے ہمیں اقرب الی الصواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سر اقدس جسم اطہر کے ساتھ کربلا میں ایک جگہ دفن ہے اور یہی قول علماء امامیہ میں مشہور ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ روایات کثیرہ چوتھے قول پر دلالت کرتے ہیں کہ سر منور پہلوئے جناب امیر علیہ السلام میں مدفون ہے۔ اور عام مورخین میں مصر والے قول کو شہرت حاصل ہے۔ واللہ العالم

باقی رہے دوسرے شہداء کربلا ان کے سرہائے مقدسہ کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی خاموشی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اگرچہ حبیب السیر اور روضۃ الشہداء سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سید الساجدین علیہ السلام نے رہائی کے بعد بروز اربعین تمام شہداء کربلا کے سر واپس لا کر کربلا معلی میں دفن کئے تھے مگر یہ بیان چونکہ بے دلیل و برہان ہے اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔[1] ﴿واللہ العالم بحقیقة الحال﴾

---

[1] مجاہد اعظم، ج ۱، از صفحہ ۲۹۷ تا ص ۳۰۳۔ ناسخ، ج ۶، از ص ۲۵۸ تا ص ۳۶۱۔ نفس المہموم از ص ۵۰۱ تا ص ۵۰۸۔ فرسان الہیجاء، ج ۲، از ص ۲۹۶ تا ص ۳۰۳۔ الدمعۃ الساکبہ، از ص ۲۸۷ تا ۲۸۹ وغیرہ۔

افادہ جدیدہ

فاضل ساروی نے یہ تحقیق انیق فرمائی ہے کہ واقعہ کربلا میں سرکار سید الشہداء کے تمام اعزہ و انصار کے سر مبارک قلم کر کے دیار و امصار میں پھرائے گئے تھے۔ سوائے دو (۲) سروں کے۔ ایک شہزادہ علی اصغر کا سر مبارک کیونکہ آنجناب نے ننھی سی قبر کھود کر شہزادہ کو دفن کر دیا تھا۔ دوسرے جناب حرؓ۔ کیونکہ بنی تمیم نے ان کا سر قلم نہیں ہونے دیا تھا۔ بعض دیگر آثار سے بھی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ واللہ العالم

امر ہشتم:۔ سید الشہداء کے قاتل کی تعیین

امام الشہداء کا قاتل کون ہے؟ اگرچہ علماء امامیہ میں قول مشہور و منصور یہی ہے کہ شمر ذی الجوشن ہی جناب سید الشہداء کا قاتل ہے۔ مگر اختلاف کرنے والوں نے دیگر حقائق کی طرح اس حقیقت میں بھی اختلاف کیا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد قول ملتے ہیں: (۱) بعض نے کہا ہے کہ قاتل حصین بن نمیر ہے۔ (۲) بعض نے مہاجر بن اوس تمیمی۔ (۳) بعض نے عبداللہ شعبی کو۔ (۴) بعض نے خولی بن یزید اصبحی۔ (۵) بعض نے زرعہ بن شریک۔ (۶) بعض نے شبل بن یزید (برادر خولی)۔ (۷) بعض نے سنان بن انس نخعی کو آنجناب کا قاتل قرار دیا ہے۔[1] پہلے چھ قول تو بالکل ناقابل التفات ہیں۔ ہاں البتہ ساتواں قول یعنی یہ کہ قاتل سنان بن انس نخعی ہے۔ اسے اکثر مؤرخین اہل سنت اور ہمارے بھی بعض اکابر جیسے شیخ صدوق (در امالی، ص ۹۸)۔ سید ابن طاؤس (در لہوف، ص ۱۱۱) اور شہزادہ فرہاد مرزا (در قمقام، ص ۳۹۲) وغیرہم نے اختیار کیا ہے مگر مشہور و مسلم قول یہی ہے کہ اصل قاتل شمر بن ذی الجوشن ہی ہے۔ اور اس قول کی صحت کے بہت سے تاریخی قرائن و شواہد ہیں۔ جن کے یہاں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں چونکہ سنان ملعون کے نیزہ کی ضرب بہت کاری تھی۔ جس سے سرکار شہادت زمین پر گرے تھے۔ اس لئے بعض حضرات نے شہادت امام کو اسی کی طرف منسوب کر دیا۔ اسی طرح زرعہ بن شریک نے بھی تلوار سے کاری ضرب لگائی تھی۔ انہی حقائق کی بناپر شہید انسانیت میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "بالآخر زرعہ بن شریک کی تلوار سنان بن انس کا نیزہ اور پھر شمر بن ذی الجوشن کا خنجر وہ تھا جس نے اس مجسمہ حق کی شمع حیات گل کر دی، سچائی کی گردن قلم ہوئی۔ اور شہید حق شہید انسانیت شہید راہ خدا کا سر نیزہ پر بلند کر دیا گیا۔[2]

امر نہم:۔ جناب مخدرہ شہربانو کے طوس جانے کی تحقیق

فاضل مازندرانی نے لکھا ہے ﴿الا شهر بانویه فانها اتلفت نفسها فی الفرات﴾ تمام اہل حرم کو قید

---

[1] نفس المہموم، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔

[2] شہید انسانیت، ص ۵۲۲۔

کر کے لائے سوائے جناب بی بی شہر بانو کے۔ کیونکہ ان معظمہ نے نہر فرات میں اپنی جان تلف کر دی تھی۔[1]

"آقائے دربندی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے: "واعلم ما عن ابن شهر آشوب في قضية شهر بانويه مالم اظفر به في كلام احد" جناب شہر بانو کے بارے میں ابن شہر آشوب نے جو کچھ لکھا ہے۔ میں نے کسی بھی اہل علم کے کلام میں اسے نہیں پایا۔" پھر لکھا ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہ معظمہ بادشاہ عجم یزد جرد کی دختر اور امام زین العابدین کی والدہ کے علاوہ کوئی اور ہوں گی کیونکہ ان خاتون کا تو امام کی ولادت باسعادت کے چند لمحے بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔[2] بعد ازاں یہ افادہ جدیدہ فرمایا ہے کہ وہ بی بی شہر بانو جو میدان کربلا میں تھیں وہ فاطمہ زوجہ قاسم کی والدہ تھیں جو وصیت امام کے مطابق اپنی بیٹی فاطمہ کو ہمراہ لے کر امام کے گھوڑے پر سوار ہو کر مقررہ مقام کی طرف چلی گئیں۔ جب گھوڑا رائے کے قریب پہنچا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو حکم دیا تم یہیں اتر جاؤ کیونکہ یہاں تمہارے ننھیال موجود ہیں تمہاری کفالت کریں گے۔ چنانچہ ان کو وہاں اتار کر خود وہاں چلی گئیں۔ جہاں ان کو حکم تھا۔ یعنی جبل طوس جو رائے کے قریب ہے۔[3] یہ قصہ بالکل غلط موضوع اور بے بنیاد ہے۔ اس میں حسب ذیل امور تنقیح طلب ہیں۔

(الف) کیا جناب شہر بانو اس وقت تک زندہ اور واقعہ کربلا میں موجود تھیں؟

(ب) کیا یہ ممکن تھا کہ جناب شہر بانو تمام اہل بیت اور اپنے آقا امام کو ایسی بے کسی میں گرفتار تنہا چھوڑ کر اپنے تحفظ کے لئے علیحدگی اختیار کر لیں؟

(ج) کیا ان کے کوئی بھائی رائے کے قریب آباد تھے؟ جن کا نام شہریار بیان کیا جاتا ہے؟

(د) کیا جناب امام حسین نے ان کو رے کی طرف جانے کا حکم دیا تھا؟

(ہ) اگر یہ شہر بانو سید الساجدین کی والدہ نہ تھیں تو کیا کوئی دوسری عجمی شہزادی تھیں؟ اگر تھیں تو آں جناب نے ان سے کب اور کس طرح عقد کیا تھا؟

(و) کیا فاطمہ بنت الحسین کے علاوہ جو جناب ام اسحاق کے بطن سے تھیں۔ امام کی کوئی اور صاحبزادی اس نام کی تھیں؟

(ز) وہ کون سا گھوڑا تھا جس پر سوار ہو کر آپ گئی تھیں؟

امر اول کے متعلق عموماً محدثین و مورخین کا اتفاق ہے کہ جناب شہر بانو واقعہ کربلا کے وقت زندہ ہی نہ تھیں۔ بلکہ اس سے ایک عرصہ دراز پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ بنابر اختصار صرف چند اقوال پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[1] مناقب، ج ۴، ص ۹۹۔ [2] اسرار الشہادت، ص ۴۳۹۔ [3] اسرار، ص ۴۳۹

۱۔ رئیس المحدثین حضرت شیخ صدوق نے کتاب عیون اخبار الرضا میں بسند معتبر امام رضا کی یہ روایت نقل کی ہے کہ امام زین العابدینؑ کی ولادت کے بعد اس مخدرہ کا انتقال ہو گیا۔

۲۔ علامہ مجلسی جلاء العیون میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿از روایات معتبرہ ظاہر می شود کہ شہر بانو در آں صحرا نبود﴾۔

۳۔ مرزا محمد بن سلیمان تنکابنی اکلیل المصائب میں رقم فرماتے ہیں: ﴿قول دیگر در شہر بانو کہ در کربلا ہمراہ بود و اسیر شد این نیز ضعیف است و محل اعتنا نیست واضح این کہ شہر بانو بہ و خواہرش کہ زوجہ امام حسن بود حاملہ شدند و ہر دو متولد شدند و در ایام نفاس وفات یا فتند﴾۔

۴۔ مرزا محمد حسن خیرات حسان میں لکھتے ہیں: ﴿باری حضرت شہر بانو چنانچہ در اخبار معتبرہ رسیدہ است بحال نفاس درگذشت﴾۔

۵۔ فرہاد مرزا، قمقام ذخار میں تحریر کرتے ہیں: ﴿آنچہ از کتب معبترہ روایات محدثین شیعہ بہ نظر رسیدہ شہر بانو در نفاس وفات یافت۔ و کفالت و حضانت امام سجاد را یکے از امہات اولاد حضرت سید الشہداء می نمود﴾۔

۶۔ مرزا سپہر کاشانی ناسخ التواریخ میں لکھتے ہیں: ﴿چہ شہر بانو در ہنگام ولادت علی بن الحسینؑ وداع جہاں گفت و در سفر کربلا ملازمت سید الشہداء نداشت﴾۔

۷۔ جناب علامہ محمد حسن قزوینی ریاض الشہادہ میں لکھتے ہیں: ﴿از احادیث ظاہر می شود کہ شہربانو مادر امام زین العابدینؑ در صحرائے کربلا حاضر نبود بلکہ آنچہ مستفاد می شود از اخبار اینست کہ در وقت وضع حمل از دنیا رفت و آں مصائب و وقائع را ندید﴾۔

۸۔ جناب سید اولاد حیدر صاحب بلگرامی کا ارشاد ہے: ﴿جن روایتوں سے جناب شہر بانو کا واقعہ کربلا میں تشریف رکھنا معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ اعتماد کے لائق نہیں ہیں۔ اور مجہول الاسانید ہیں اور ان معظمہ کا حضرت امام زین العابدینؑ کی ولادت کے ساتھ وفات پانا اقوی اور اظہر ہے۔

۹۔ مولانا سید ناصر حسین صاحب ایک استفتا کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں ''کتاب اخبار عیون الرضا'' سے واضح ہوتا ہے کہ شہر بانو والدہ ماجدہ امام زین العابدین نے قریب ولادت سید سجاد انتقال فرمایا۔

۱۰۔ خود فاضل دربندی نے اسرار الشہادت میں اس بات کا اقرار کیا ہے جنہوں نے جناب شہر بانو کے رائے کی طرف جانے کا طومار باندھا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

امر دوم:۔ اگر بالفرض اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے۔ تو اس سے جناب شہر بانو کی نسبت کئی شبہات وارد ہوتے ہیں۔

ا۔ انہوں نے ایسی قیامت خیز مصیبت کے وقت رسول اللہ کی نواسیوں اور خاتون جنت کی بیٹیوں اور بہوں کا ساتھ چھوڑ کر ایک بڑی اخلاقی کمزوری کا اظہار کیا (معاذ اللہ)

ب۔ انہوں نے اپنی عزت کو دختران سید النساء کی عزت پر مقدم سمجھا

ج۔ انہوں نے اپنی اولاد (امام سجادؑ) کو ایسی دردناک مصیبت میں چھوڑ کر مادری محبت و شفقت کو خیر باد کہہ دیا۔ بھلا آپ کی ذات سے ایسے خلاف مروت و وفاداری امور کی امید کی جا سکتی ہے؟

امر سوم:۔ ہمارے پاس کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں ہے کہ یزدجرد پدر جناب شہر بانو کا کوئی بیٹا بنام شہریار موجود تھا۔ متقدمین اور متاخرین کی تہ معتبر و مستند کتابیں دیکھنے سے کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی اس کا ذکر نہیں پایا جاتا کہ زوال سلطنت کے بعد یزدجرد کے کسی بیٹے یا کسی عزیز کو کسی ملک یا کسی حصے کی سلطنت حاصل ہوئی ہو! مولانا سید ناصر حسین صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: شہریار کا قصہ قطعاً کتب معتبرہ میں نہیں اور اس کا قصہ جس طرح روضہ خواں پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعات مسلمہ مورخین فریقین ہے۔

امر چہارم:۔ کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ علماء و مورخین کی تمام مستند و معتبر کتابیں اس سے خالی ہیں کہ حضرت سید الشہداء نے جناب شہر بانو سے ایسا فرمایا ہو کہ تم گھوڑے پر سوار ہو کر چلی جانا۔ گھوڑا تم کو وہاں پہنچا دے گا جہاں حکم خدا ہوگا! تعجب ہے کہ آقائے دربندی نے یہ بے سروپا مہمل واقعہ درج کرتے وقت ''فی کتب التواریخ المعتبرہ'' تو لکھ دیا۔ مگر کسی کتاب یا سند کا حوالہ تحریر کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ بظاہر انہوں نے یہ واقعہ کتاب بحر الانساب سے لیا ہے۔ اور یہ کتاب مہملات ولغویات سے جیسی بھری ہوئی ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔

علاوہ بریں یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جناب سید الشہداء نے ایسا حکم اپنی دوسری ازواج کو کیوں نہ دیا۔ بالخصوص جناب رباب جن سے آپ زیادہ مانوس تھے۔ نیز اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو کیوں نہ دیا جو دین و دنیا کی شہزادیاں تھیں۔

امر پنجم:۔ آقائے دربندی نے جواہر الایقان میں ایک قیاسی تجویز کی ہے۔ زبیدہ زوجہ قاسم کی والدہ اور سید سجادؑ کی مادر گرامی دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ حضرت سید الشہداء نے بعد وفات والدہ سید سجادؑ ان کی خواہر سے عقد

کر لیا تھا اور یہی معظمہ آنجناب کی شہادت کے بعد گھوڑے پر سوار ہو گئی تھیں۔

یہ فاضل موصوف کا ذاتی اجتہاد اور قیاسی فیصلہ ہے جو انہوں نے بحر الانساب پر اعتماد کرتے ہوئے کیا ہے حالانکہ متقدمین و متاخرین کی کتابیں اس سے خالی ہیں۔ اگرچہ بعض روایات میں یزدجرد کی دو (۲) اور بعض میں تین بیٹیوں کا وارد مدینہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ایک سے زیادہ کا داخل زوجیت سید الشہداء ہونا کسی روایت میں نہیں پایا جاتا۔ یہ خیال جناب موصوف نے اسرار الشہادت میں زوجہ قاسم کا نام فاطمہ اور جواہر الانفال میں زبیدہ لکھا ہے۔ یہ تناقض بجائے خود اس قصہ کے بطلان کا قوی برہان ہے۔

امر ششم:۔ ہم سید الشہداء علیہ السلام کی اولاد اور دامادی قاسم کے قصہ کے بیان میں ارباب سیر و تواریخ کی قطعی شہادتوں سے ثابت کر آئے ہیں کہ جناب سید الشہداء کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک فاطمہ جو جناب ام اسحاق کے بطن سے تھیں اور دوسری سکینہ جو جناب رباب کے بطن سے تھیں۔ ان کے علاوہ کسی اور فاطمہ کا کسی مستند کتاب میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

امر ہفتم:۔ ہم اسی باب میں امر چہارم کی تحقیق میں تاریخی شواہد کی روشنی میں ثابت کر آئے ہیں کہ جناب سید الشہداء کی سواری کا ایک ہی گھوڑا کربلا میں تھا۔ جس نے آنجناب کی شہادت کے بعد زمین پر سر مار مار کر اور بقولے دریائے فرات میں ڈوب کر جان قربان کر دی تھی۔ ان ناقابل رد حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل اظہر من الشمس ہو کر رہ جاتی ہے کہ یہ قصہ بالکل من گھڑت اور بے بنیاد ہے۔ انہی حقائق سے جناب ابن شہر آشوب کے بیان کا ناقابل اعتماد ہونا بھی واضح و عیاں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ علاوہ فریقین کی روایات کے منافی ہونے کے جیسا کہ صاحب قمقام نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿منافی با جمیع روایات فریقین است﴾۔

یہ خودکشی ہے جو بالاتفاق حرام ہے۔ در قرآنی حکم ﴿وَلَا تَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ﴾ اور ﴿لَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کے منافی ہے۔ بھلا وہ گھر جو مہبط قرآن، سرچشمہ علم و عرفان اور منبع رشد و ہدایت تھا۔ ایسے گھر کی ایک ممتاز خاتون جو امام کی بہن، امام کی بھاوج، امام کی بی بی اور امام کی ماں تھی۔ اس حکم سے بے خبر یا پھر اس کی مخالفت کر سکتی تھیں؟ تعجب ہے کہ فاضل مازندرانی نے ایسی بے سروپا روایت کو اپنی کتاب میں کس طرح جگہ دی؟ سچ ہے: ﴿الجواد قد یکبوا و اللہ العاصم﴾ (ملخص از: مجاہد اعظم ج ا، مع اضافات)

امر دہم:۔ شام غریباں کے دلخراش واقعات پر مختصر تبصرہ

مشہور یہ ہے کہ دنیا کی سخت ترین شب شب عاشوراء ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شب اپنی خصوصیات کی وجہ سے منفرد ہے۔ کائنات کا سردار اپنے مٹھی بھر اعزہ و انصار سمیت پوری طرح نرغہ اعداء میں گھر چکا

تھا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ کربلا والوں کو صبح اپنی موت کا یقین تھا۔ ہر ماں کو علم تھا کہ کل اس کا ماہ لقا بیٹا قربان گاہ کربلا میں فدیہ راہ خدا ہو جائے گا۔ ہر بہن کو یقین تھا کہ کل اس کا قوت بازو دائمی طور پر رخصت ہو جائے گا۔ اور ہر زوجہ کو سامنے نظر آ رہا تھا کہ کل اس کا سہاگ لٹ جائے گا۔ علاوہ بریں بھوک تھی۔ پیاس تھی دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت تھی۔ مظلومیت تھی۔ بے کسی تھی۔ غرضکہ شب عاشورہ سخت ابتلاء و آزمائش کی رات تھی مگر بایں ہمہ اس میں ایک گونہ چہل پہل تھی۔ ہنوز سب خورد و کلاں زندہ اور موجود تھے۔ رسول زادیوں کا ظاہری سہارا موجود تھا۔ پنجتن پاک کی آخری فرد فرید دنیا میں موجود تھی۔ ذکر تسبیح و تہلیل سے خیام حسینی گونج رہے تھے۔ لیکن شام غریباں (شب یازدہم محرم) کو کچھ اور سماں تھا۔ شام غریباں کی کیفیت کچھ اور ہے۔ آسمان نیلگوں، غروب ہونے والے آفتاب، طلوع ہونے والے ماہتاب اور چمکتے ہوئے ستاروں نے نہ معلوم کتنے انقلاب روزگار دیکھے ہوں گے اور خدا معلوم سطح زمین پر کس قدر دردناک سانحے گذرے ہوں گے۔ اور نہ معلوم سینہ تاریخ میں کس قدر حیرت افزاء واقعات محفوظ ہوں گے مگر بلا خوف رد کہا جا سکتا ہے کہ اس ربع مسکون پر آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر شام غریباں سے زیادہ دلخراش، جگر سوز اور دردناک سانحۂ کبریٰ نہیں گذرا ہوگا۔ وارثوں کا سایہ اٹھ چکا۔ ظاہری سہارے ٹوٹ چکے۔ سامان لٹ چکا۔ خیام جل چکے۔ خاتم المرسلین کی نواسیوں کے گوشوارے اتر چکے۔ علی و بتول کی پوتیوں کے خلخال اتر چکے۔ جناب رباب کی گود خالی ہو چکی۔ سہرہ والے دولہے کٹ چکے۔ ہر دل میں کوئی نہ کوئی غم والم کا ناسور ہے مگر شریکۃ الحسین کے قلب حزیں پر تو ایک سو چھیالیس داغ ہیں۔ پنجتن پاک کی آخری یادگار زمین سے اٹھ چکی ہے۔ بچے بزرگوں کی یادوں میں نڈھال ہو رہے ہیں۔ شدت گرسنگی و تشنگی سے بلک رہے ہیں مگر کوئی دلاسا دینے والا نہیں۔ بی بیوں کے سامنے عزیزوں کی خون میں نہائی ہوئی اور سر بریدہ لاشیں بے گور و کفن پڑی ہیں۔ عجیب بے کسی و بے بسی کا عالم ہے۔ کہتے ہیں کہ پسر سعد نے زوجہ حر کے ہاتھ اس رات کچھ خورد و نوش کا سامان بھجوایا تھا مگر کسی قابل اعتماد کتاب میں ایسی کوئی تصریح نظر قاصر سے نہیں گذری۔ خدا معلوم ان ستم زدہ سیدانیوں اور یتیم بچوں اور بیواؤں نے کس طرح فاقہ شکنی کی؟

آہ۔ نام نہاد مسلمانوں نے اسیران اہل بیت کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ترک و دیلم کے اسیروں کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔

آہ از دمے کہ لشکر اعداء نہ کردہ شرم	کردند رو بخیمہ سلطان کربلا
گزرے ہیں کربلا میں وہ پر ہول سانحے	مر جائے آدمی جو تصور کبھی کرے

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

پچیسواں باب

ابتداءِ اسیریٔ اہل بیتؑ سے روانگی شام تک کے حالات

جیسا کہ سابقہ باب میں بیان کیا جاچکا ہے عمر بن سعد نے حضرت سید الشہداء علیہ السلام اور دوسرے شہدا کربلا کے سرہائے مبارکہ عصر عاشوراء کوفہ روانہ کرکے خود گیارہ محرم کو زوال آفتاب کے بعد خاندان نبوت کو اسیر کرکے اور بے مقنعہ و چادر ترک و دیلم کی باندیوں کی طرح[1] بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کرکے کوفہ روانہ ہوا۔ بعض آثار کی بنا پر اس وقت اسیران اہل بیتؑ میں بیس خواتین اور بارہ لڑکے[2] تھے۔ جن میں امام حسن مجتبیٰؑ کے تین صاحبزادے حسن مثنیٰ جو معرکہ کربلا میں امام برحق کی نصرت کا حق ادا کرتے ہوئے سترہ ناریوں کو واصل جہنم کرنے کے بعد خود اٹھارہ زخم کھانے سے نڈھال ہوکر گر گئے تھے۔ اور دایاں بازو بھی قلم ہوگیا تھا۔ اسماء بن خارجہ فزاری (جو حسن مثنیٰ کی والدہ کے خاندان سے تھا کی سفارش پر قتل ہونے سے بچ گئے[3] تھے) (۲) زید بن الحسنؑ۔ (۳) عمرو بن الحسنؑ اور امام محمد باقر علیہ السلام بھی انہی میں شامل تھے جن کی عمر اس وقت قریباً چار سال تھی۔[4]

عقبہ بن سمعان جو جناب رباب کے غلام تھے (جنہیں سپاہی پکڑ کر پسر سعد کے پاس لے گئے لیکن ان کے یہ بتلانے سے کہ وہ غلام ہیں ان کی جان بخشی ہوگئی تھی[5] بھی ہمراہ[6] تھے۔ یہ وہی عقبہ ہیں جن کا ایک مختصر سا مقتل بھی ہے۔ جو چشم دید واقعات پر مشتمل ہے۔

بہرحال وہ ساعت کسی طرح قیامت سے کم نہ تھی۔ جب پیغمبر آخر الزمانؐ کے نام نہاد کلمہ گو مسلمان ان کی بہوؤں اور بیٹیوں کو پابند رسن کرکے اسی کوفہ کے دربار میں پیش کرنے کے لئے لے جارہے تھے۔ جو کبھی جناب امیرؑ کے ظاہری دور خلافت میں ان کا دارالخلافہ تھا۔ اور یہ چادر تطہیر کی وارث بی بیاں اس میں شہزادیوں کے طور پر قیام پذیر رہ چکی تھیں۔ آہ ؎

یصلی علی المبعوث من آل ہاشم　　　و یغزی بنوہ ان ذا لعجیب

---

[1] لہوف ص ۱۴۲ ـ عاشر بحار ص ۲۱۸ ـ قمقام ص ۳۳۳ ـ نفس المہموم ص ۲۰۲ وغیرہ۔

[2] نفس المہموم ص ۲۰۳ ـ مقتل الحسین ص ۳۶۵ وغیرہ۔

[3] نفس المہموم ص ۲۰۳۔

[4] مقتل الحسین ص ۳۶۵ ـ لہوف ص ۱۴۸ وغیرہ۔

[5] نفس المہموم ص ۱۵۸ ـ مقتل الحسین ص ۳۶۹۔

[6] مقتل الحسین للمقرم ص ۳۶۵۔

بیبیاں شہدا کے لاشوں پر

شامیان بستند بازو زینب و کلثوم را ‌ ‌ ‌ ‌ اے فلک آں ابتدا ایں انتہائے اہل بیتؑ

جب اشقیاء کوفہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو پردگیان عصمت وطہارت نے فرمایا: ﴿باللہ علیکم الا مامررتم بنا علی القتلی﴾ خدا کے واسطے ہمیں وہاں سے لے چلو جہاں شہداء کی لاشیں پڑی ہیں۔ اور بعض آثار کے مطابق خود اشقیا اسی راستہ سے اسیروں کو لے کر گزرے (اسرار الشہادت)

جب بی بیوں نے شہداء کربلا اور بالخصوص جناب سید الشہداء کی لاشوں کو اس حال میں دیکھا کہ بند سے بند جدا ہے اور پامال سم اسپاں بے گور وکفن خاک پر پڑی ہیں تو یہ دل خراش منظر دیکھ کر تاب ضبط نہ رہی آواز بلند گریہ وبکاء کیا۔ اور رخساروں پر طمانچے مارے[1] راوی (مرہ بن قیس تمیمی[2]) کہتا ہے: ﴿فما نسیت من الاشیاء لا انسی قول زینب ابنۃ فاطمۃ حین مرت باخیہا الحسینؑ صریعاً فنادت بصوت حزین و قلب کئیب یا محمداہ یا محمداہ صلی علیک ملائکۃ السماء ھذا حسین بالعراء مرمل بالدما مقطع الاعضاء مسلوب العمامۃ والرداء یا محمداہ و بناتک سبایا و ذریتک مقتلۃ تسفی علیہا الصباء فابکت و اللہ کل عدو و صدیق﴾ میں اور سب کچھ بھول جاؤں تو بھول جاؤں مگر میں جناب زینبؑ بنت فاطمہؑ کے اس کلام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب وہ اپنے بھائی کی لاش مقدس کے پاس سے گزریں تو پرسوز دل اور غمناک لب ولہجہ کے ساتھ اپنے نانا رسول کو خطاب کر کے کہہ رہی تھیں۔ اے جد نامدار آپ پر تو آسمان کے فرشتے درود وسلام پڑھتے ہیں۔ مگر یہ آپؐ کے حسینؑ لق ودق صحرا میں خاک وخون میں غلطاں پڑے ہیں۔ جن کے اعضاء پارہ پارہ ہیں اور سر عمامہ اور کاندھوں سے عبا اتار لی گئی ہے آپ کی بیٹیاں اسیر اور ذریت قتل ہوئی پڑی ہے۔ جن پر باد صبا مٹی ڈال رہی[3] ہے۔'' اگر کوئی رستم وسہراب بھی ہوتا تو یہ جانکاہ اور جگر خراش منظر دیکھ کر حواس کھو بیٹھتا۔ مگر یہ شیر خدا کی شیر دل بچی کا دل وگردہ تھا کہ پورے صبر وثبات اور اطمینان واستقلال کے ساتھ آسمان کی طرف دست دعا بلند کئے اور کہا: ﴿اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا ھٰذَا الْقُرْبَانَ﴾ خداوند ہماری یہ قربانی قبول فرما[4] اس سے جناب بی بی عالم کے صبر وثبات اور خلوص وللّٰہیت اور بلندی مقام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اخبار وآثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اثنا میں جناب سکینہ کسی طرح اپنے بابا بزرگوار کے جسد اطہر کے ساتھ جا کر لپٹ گئیں۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے بابا کے گلوئے بریدہ سے یہ آواز سنی ؎

---

[1] نفس المہموم ص ۲۰۴۔ مقتل ابن نما ص ۶۱۔ مقتل الحسین ص ۳۶۷ وغیرہ۔ [2] نفس المہموم ص ۲۰۴۔

[3] لواعج الاشجان ص ۱۵۷۔ نفس المہموم ص ۲۰۴۔ [4] کبریت احمر۔

شیعتی ما ء شربتم عذب ماء فاذکرونی

او سمعتم بغریب او شہید فاندبونی[1]

بی بی سکینہ اس طرح بابا کی لاش مطہر سے لپٹی ہوئی تھی کہ کسی طرح جدا نہیں ہوتی حتیٰ کہ کسی شقی نے زبردستی کھینچ[2] کر علیحدہ کیا اور بروایتے زجر بن قیس نے تازیانہ کی ضرب سے جدا کر کے شتر پر سوار کیا۔[3]

امام سجادؑ کی بے قراری اور شریکۃ الحسینؑ کی دلجوئی

روایات میں وارد ہے کہ جب امام زین العابدینؑ نے شہداء کربلا اور بالخصوص لخت جگر زہراؑ کو ایسی حالت میں دیکھا۔ جس سے قریب تھا کہ آسمان پھٹ جائے زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ تو یہ جانگداز منظر دیکھ کر اچانک حجت خدا کی حالت غیر ہونے لگی۔ جب ثانی زہراؑ نے اپنے بھتیجے کی یہ حالت دیکھی تو بیمار کربلا کو تسلی و تشفی دیتے ہوفرمایا: ﴿ما لی اراک تجود بنفسک یا بقیة جدی و ابی و اخوتی﴾ اے میرے جد و اب اور بھائیوں کی یادگار! کیا بات ہے کہ میں تجھے دم توڑتے دیکھ رہی ہوں۔؟ امام نے فرمایا: ﴿کیف لا اجزع و اهلع وقد اری سیدی و اخوتی و عمومتی و ولد عمی و اهلی مصرعین بدمائهم مرملین بالعراء مسلبین لا یکفنون ولا یوارون لا یعرج علیهم احد ولا یقربهم بشر کانهم اهل بیت من الدیلم و الخزر﴾ بھلا میں کیونکر جزع و فزع نہ کروں۔ جبکہ میں اپنے سید و سردار (والد بزرگوار) بھائیوں اور چچازاد بھائیوں کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں کہ لق و دق صحراء میں خاک و خون میں غلطاں لباس سے عریاں بلا کفن و دفن پڑے ہیں۔ کوئی آدمی ان کے قریب نہیں جاتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ دیلم و خزر کے خاندان سے ہیں! عقیلۂ قریش نے فرمایا: ﴿لا یجزعنک ما تری فو اللّٰه ان هذا لعهد من اللّٰه الی جدک و ابیک، ولقد اخذ اللّٰه میثاق اناس لا تعرفهم فراعنة هذه الارض وهم معروفون فی اهل السموت انهم یجمعون هذه الاعضاء المقطعة والجسوم المضرجة فیوارونها وینصبون بهذا الطف علما بقبر ابیک سید الشهداء لایدرس اثره ولا یمحی رسمه علی مرور اللیالی والایام ولیجهدن ائمة الکفر و اشیاع الضلال فی محوه و تطمیسه فلا یزداد اثره الا ظهوراً و امره الا علواً﴾[4] بیٹا جو منظر آپ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو گھبراہٹ میں نہ ڈالے۔ خدا کی قسم یہ تو خدا کا ایک عہد تھا جو اس نے آپ کے جد نامدار

---

[1] انیس الہموم، ص ۲۰۰۔ مقتل الحسین، ص ۳۶۸ بحوالہ مصباح کفعمی، ص ۳۷۶۔

[2] مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۶۹۔ ولواعج الاشجان، ص ۱۵۸۔

[3] مقتل الحسین، ص ۳۷۰۔

[4] کامل الزیارۃ، ص ۲۶۱ وغیرہ۔

اور بابائے بزرگوار سے لیا تھا۔ نیز کچھ لوگوں سے خدا نے یہ عہد و پیمان لیا ہے جنہیں اس زمین کے فراعنہ وقت نہیں پہچانتے مگر وہ اہل آسمان کے نزدیک مشہور و معروف ہیں کہ وہ ان قطع شدہ اعضا اور خون سے آغشتہ اجسام کو دفن کریں گے اور تیرے بابا سید الشہداءؑ کی قبر مقدس پر علم نصب کریں گے باوجودیکہ لیل ونہار کی گردشوں کے تیرے بابا کی قبر کا نام ونشان ہرگز نہیں مٹے گا۔ اور اگرچہ کئی ائمہ کفر اور پیروان ضلالت اس کے مٹانے کی پوری کوشش کریں گے مگر ان کی ہر نا کام کوشش سے الٹا اس کے نشان روشن وعیاں ہونگے۔ اور ان کی شان زیادہ بلند و بالا ہوگی۔''

اس مکالمہ اور امام کو دلاسہ دینے سے عقیلہ بنی ہاشم کی عظمت وجلالت اور رفعت منزلت کا جس قدر اظہار ہوتا ہے وہ کسی تبصرہ اور بیان کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ اللہ بی بی عالم کا مقام صبر وتحمل کس قدر بلند ہے۔ کہ امام وقت کو صبر وضبط اور تحمل واستقلال کی تلقین فرما رہی ہیں۔ نیز بی بی عالم کا یہ کلام بالکل وحی ترجمان معلوم ہوتا ہے جو کچھ اس مخدومہ کونین نے اس روز فرمایا تھا بعد میں آنے والے حالات وواقعات نے اس کی حرف بحرف تصدیق وتائید کردی ہے۔ جیسا کہ تاریخ دان حضرات جانتے ہیں ؎

يريد الجاحدون ليطفئوه و يابى الله الا ان يتمه!

سچ ہے۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اسارائے اہل بیتؑ کی کوفہ میں آمد

بہر حال عمر بن سعد اس لئے ہوئے قافلہ کو لے کر اپنے لاؤ لشکر سمیت سرہائے مبارکہ کے کوفہ پہنچنے کے ایک روز بعد (۱۲ محرم کو) کوفہ پہنچا۔[1] ابن زیاد کو جب اس لئے ہوئے قافلہ کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی۔ تو اس نے سرہائے شہداء نوک ہائے نیزہ پر چڑھا کر بھجوا دیئے تاکہ ایک ساتھ وارد دربار ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آگے آگے شہداء کے سرہائے مقدس تھے اس کے پیچھے اسیران آل محمد کا مختصر قافلہ تھا۔[2] نیز ابن زیاد نے متوقع خوف ہنگامہ آرائی کے پیش نظر یہ احتیاطی تدبیر کر رکھی تھی کہ گو آج دربار و بازار میں لوگوں کو جمع ہو کر اسراء اہل بیتؑ کا نظارہ کرنے کا اذن عام تھا۔ مگر یہ اعلان بھی کرا دیا گیا تھا کہ کوئی زن یا مرد اسلحہ جنگ لے کر گھر سے باہر نہ نکلے اور اس پر عمل درآمد کرانے کے لئے جابجا پولیس کے دستے بھی متعین کر دیے گئے تھے۔[3]

---

[1] ارشاد، ص ۲۹۶۔

[2] ناسخ، ج ۶، ص ۳۰۵۔ قمقام، ص ۳۲۳۔ نفس المہموم، ص ۲۱۲۔

[3] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۰۵۔

مسلم جصاص کی روایت

مسلم جصاص بیان کرتا ہے کہ ابن زیاد نے مجھے دارالامارہ کی اصلاح کے لیے بلایا ہوا تھا اور میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ اچانک کوفہ کے اطراف و جوانب سے شور و شغب کی آوازیں آنے لگیں۔ اس اثناء میں ایک خادم آیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا: کیا وجہ ہے کہ آج کوفہ میں بہت شور و غل ہو رہا ہے؟ اس نے کہا: ابھی ابھی ایک خارجی (بحاک و بن قائل) کا سر لایا جا رہا ہے۔ جس نے یزید پر خروج کیا تھا۔ میں نے پوچھا: اس کا نام کیا تھا؟ کہا: حسین بن علی۔ میں یہ سنتے ہی دم بخود ہو کر رہ گیا۔ جب خادم باہر چلا گیا تو میں نے زور سے دو تھپڑ اپنے منہ پر مارا۔ قریب تھا کہ میری آنکھیں ضائع ہو جائیں۔ اس کے بعد میں ہاتھ دھو کر دارالامارہ کی پچھلی طرف سے کناسہ کے مقام پر پہنچا جہاں لوگ سروں اور قیدیوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد ایک قافلہ پہنچا جو چالیس اونٹوں پر مشتمل تھا۔ جن پر اولاد حضرت فاطمہ زہراء سوار تھی۔ جن میں کچھ بچے اور کچھ مستورات تھیں۔ امام زین العابدین بے پالان اونٹ پر سوار تھے۔ رگہائے بدن سے خون جاری تھا۔ اور گریہ کناں آواز کے ساتھ یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

يا امة السوء لا سقيا لربعكم　　　يا امة لم تراعي جدنا فينا

لو اننا و رسول الله يجمعنا　　　يوم القيامة ما كنتم تقولونا

تسيرونا على الاقتاب عارية [illegible]　　　كانالم تشهد فيكم دينا

بنی امية! ما هذاالوقوف على　　　تلک المصائب لا تلبون داعينا

تصفقون علينا كفكم فرحاً　　　وانتم في فجاج الارض تسبونا

اليس جدی رسول الله ويلكم　　　اهدى البرية من سبل المضلينا

ياوقعة الطف قد اورثتنی حزنا　　　و الله تهتک استار المسينا

اسیران آل محمدؐ کی خستہ تنی اور زبوں حالی دیکھ کر اہل کوفہ صدقہ کی کھجوریں اور روٹیوں کے ٹکڑے بچوں کی طرف پھینکتے تھے۔ اور جناب ام کلثوم یہ فرما کر کہ ﴿یا اهل الكوفة ان الصدقة علينا حرام﴾ اے اہل کوفہ! صدقہ ہم پر حرام ہے۔ کھجوریں وغیرہ بچوں کے ہاتھ سے لے کر نیچے پھینک دیتی تھیں۔ لوگ خاندان نبوت کی یہ حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ جناب ام کلثوم نے فرمایا: ﴿صه يا اهل الكوفة تقتلنا رجالكم و تبكينا نساء كم فالحاكم بيننا و بينكم الله يوم فصل القضاء﴾ اے اہل کوفہ خاموش ہو جاؤ! تمہارے مرد ہمیں قتل کرتے ہیں۔ اور تمہاری عورتیں ہم پر روتی ہیں؟ خداوند عالم روز قیامت ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا مسلم کہتا ہے بی بی یہی گفتگو کر رہی تھیں کہ اچانک صدائے شور و شغب بلند ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ (دوسری طرف

سے) شہداء کربلا کے سر نیزوں پر سوار ہیں۔ ان سب کے آگے آگے جناب امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک تھا۔ ﴿وھو راس زھری قمری اشبہ الخلق برسول اللّٰہ و لحیتہ کسواد السبج قد انتصل منہا الخضاب و وجہہ دارۃ قمر طالع و الرمح تلعب بہا یمیناً و شمالاً﴾ اور وہ سر بدر کامل کی طرح تابندہ اور درخشندہ تھا۔ اور تمام لوگوں سے زیادہ رسول خداؐ کے ساتھ مشابہ تھا۔ ریش مبارک خضاب کی وجہ سے بالکل سیاہ تھی۔ چہرہ انور ماہتاب کی مانند مدورا (روشن تھا اور ہوا ریش مبارک کو دائیں بائیں حرکت دے رہی تھی۔ جب جناب زینب عالیہ کی بھائی کے سر مبارک پر اس حال میں نظر پڑی تو اس منظر سے بے تاب ہو کر فرط غم والم سے چوب پالان پر اس زور سے سر مارا کہ خون جاری ہو گیا۔ اور اس وقت یہ رقت خیز اشعار پڑھے

یا ھلالاً لما استتم کمالاً	غالہ خسفہ فابدا غروباً
ما توھمت یا شقیق فؤادی	کان ھذا مقدراً مکتوباً
یا اخی! فاطم الصغیرۃ کلمھا	فقد کاد قلبھا ان یذوبا
یا اخی! قلبک الشفیق علینا	ما لہ قد قسی و صار صلیبا
یا اخی لو تری علیاً لدی الاسر	مع الیتم لا یطیق وجوبا
کلما اوجعوہ بالضرب ناداء	کی بذل یفیض دمعاً سکوبا
یا اخی ضمہ الیک و قربہ	و سکن فؤادہ المرعوبا
ما اذال الیتیم حین ینادی	بابیہ و لا یراہ مجیبا[1]

بہرحال ارباب سیر ومقاتل کا بیان ہے کہ جب اس حال میں یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ کے در و دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ ہاں ہاں وہی کوفہ جس میں جناب امیر علیہ السلام کے ظاہری دور خلافت میں جناب زینب و ام کلثوم شہزادیوں کی حیثیت سے رہ چکی تھیں۔ اور آج قیدیوں کی حیثیت سے داخل ہو رہی تھیں۔ آہ۔ ع

---

[1] بحار، ج ۱۰، ص ۲۲۵۔ تاریخ، ج ۶، ص ۳۱۱، ۳۱۲۔ نفس المہموم، ص ۲۱۳ وغیرہ۔
مخفی نہ رہے کہ صاحب طراز المذہب نے بڑے شد و مد کے ساتھ زینبؑ عالیہ کے سر پھوڑنے والے واقعہ کی نفی کی ہے اور اس امر کو بی بی عالم کے صبر و استقلال کے منافی قرار دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے خیالی استبعاد کی بنا پر ان واقعات کا جو کتب معتبرہ میں موجود ہیں انکار نہیں کیا جا سکتا نیز اس فعل کو منافی صبر و استقلال قرار دینا درست نہیں ہے۔ ﴿بفحوی ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد﴾۔ جہاں حسب ضرورت زینبؑ عالیہ نے اس قدر صبر وضبط سے کام لیا ہے کہ خود امام زین العابدینؑ کو تسلیاں اور دلاسے دیئے ہیں۔ وہاں یہ بھی ثابت ہے کہ گریبان چاک کر کے منہ پر طمانچے بھی مارے ہیں۔ لہٰذا حسینؑ ایسے عظیم بھائی کا اچانک نوک سنان پر سر دیکھ کر فرط غم والم کی وجہ سے چوب پالان پر سر دے مارنا کون سی تعجب خیز بات ہے؟ واللہ العالم۔ (منہ عفی عنہ)

اے فلک آں ابتدا ایں انتہائے اہل بیتؑ

کوفہ کے زن و مرد جو ہزاروں کی تعداد میں وہاں یہ نظارہ دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ آل رسول کو اس تباہ حال میں دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ امام زین العابدینؑ نے نحیف و نزار آواز کے ساتھ فرمایا: ﴿تنوحون و تبکون من اجلنا فمن ذا الذی قتلنا؟﴾ کوفہ والو! اب تم ہم پر نوحہ اور گریہ کر رہے ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ ہمیں قتل کس نے کیا ہے؟[۱] اس اثنا میں ایک کوفی عورت نے بالائے بام جھانک کر دیکھا اور دریافت کیا: ﴿من ای الاساری انتم؟﴾ تم کس قوم و قبیلہ کے قیدی ہو؟ بی بیوں نے فرمایا: ﴿نحن اساریٰ ال محمدؐ﴾ ہم خاندان نبوت کے اسیر ہیں' یہ سن کر وہ نیک بخت عورت نیچے اتری اور کچھ برقعے اور کچھ چادریں اکٹھی کر کے ان کی خدمت میں پیش کیں جن سے پردگیانِ عصمت نے اپنے سروں کو ڈھانپ لیا۔[۲]

زینبؑ عالیہ کا خطبہ

اس وقت عقیلہ بنی ہاشم نے درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا: لوگوں کے گریہ و بکاء اور شور و شغب کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن راویان اخبار کا بیان ہے کہ جونہی شیر خدا کی بیٹی نے لوگوں کو ارشاد کیا کہ ﴿انصتوا﴾ خاموش ہو جاؤ! تو کیفیت یہ تھی کہ ﴿ارتدت الانفاس و سکنت الاجراس﴾ آتے ہوئے سانس رک گئے اور جرس کارواں کی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد خطیب منبر سلونی کی دختر نے جب خطبہ شروع کیا تو لوگوں کو حضرت علیؑ کا لب و لہجہ اور ان کا عہد معدلت انگیز یاد آ گیا۔ راوی (حذام[۳] اسدی یا بشیر بن خریم[۴] اسدی) کہتا ہے: ﴿لم ار و اللّٰه خفرة قط انطق منها کانها تنطق و تفرغ علی لسان امیر المؤمنین علی علیه السّلام﴾ خدا کی قسم میں نے کبھی کسی خاتون کو دختر علیؑ سے زیادہ پرزور تقریر کرتے نہیں دیکھا (بی بی کے لب و لہجہ اور خطابت سے معلوم ہوتا تھا) کہ گویا جناب امیر المومنینؑ کی زبان سے بول رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں

---

۱ لہوف، ص ۱۲۹۔ نفس المہموم، ص ۲۰۸۔

۲ نفس المہموم، ص ۲۰۸۔ لہوف، ص ۱۲۸۔

۳ نفس المہموم، ص ۲۰۸۔

۴ لہوف، ص ۱۲۹۔

* مخفی نہ رہے کہ کلمات علماء ابرار اور اخبار و آثار میں قدرے اختلاف ہے کہ کوفہ اور دربار ابن زیاد میں وارد ہونے کے وقت مخدرات عصمت بے مقنعہ و چادر تھیں۔ یا باپردہ؟ مشہور یہی ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے کہ چادر تطہیر کی وارث بی بیاں امت کے سلوک کے نتیجہ میں بے مقنعہ و چادر تھیں۔ ہاں البتہ بعض آثار سے یہ ضرور آشکار ہوتا ہے کہ بی بیاں متکشفات الوجوہ نہ تھیں چنانچہ فاضل دربندی نے اسی قول پر بہت زور دیا ہے ہم نے اوپر جو روایت درج کی ہے اس سے دونوں اقوال کے درمیان جمع و توفیق ہو جاتی ہے کہ اس کوفی عورت کے برقعوں اور چادروں کے انتظام سے پہلے سر ننگے تھیں بعد ازاں جب سر ڈھانکنے کا انتظام ہو گیا تو بنات رسولؐ نے پردہ کر لیا۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ظالموں نے وہ چادریں بھی چھین لیں (سیرت صدیقہ صغریٰ) مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔ (و اللّٰه العالم بحقائق الامور)۔ (منہ عفی عنہ)

محسوس ہوتا کہ حضرت امیر علیہ السلام آپ کی زبان سے بول رہے ہیں ؎

دربار میں خطبے، کبھی قرآں کی تلاوت　　　انداز تکلم میں علیؑ کی تھی فصاحت

جب ہر طرف مکمل خاموشی چھاگئی تو ام المصائب نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

﴿الحمد لله و الصلوة على ابي محمد و اله الطيبين الاخيار. اما بعد يا اهل الكوفة يا اهل الختل و الغدر اتبكون فلا رقات الدمعة ولا هدأت الزفرة انما مثلكم كمثل التى نقضت غزلها من بعد قوة انكاثا تتخذون ايمانكم دخلاً بينكم الا وهل فيكم الا الصلف و النطف و الصدر الشنف (الصلف و العجب و الشنف و الكذب) و ملق الاماء و غمز الاعداء او كمرعى على دمنة او كفضة على ملحودة الا ساء ما قدمت لكم انفسكم ان سخط الله عليكم و فى العذاب انتم خالدون. اتبكون و تنتحبون اى والله فابكوا كثيراً و اضحكوا قليلاً فلقد ذهبتم بعارها و شنارها و ان ترحضوها بغسل بعدها و انى ترحضون قتل سليل خاتم النبوة ومعدن الرسالة و سيد شباب اهل الجنة و ملاذ حيرتكم و مفزع نازلتكم و منار حجتكم و مدرة سنتكم (مدرة حججكم و منار محجتكم ن و) الا ساء ما تزرون و بعدا لكم و سحقا فلقد خاب السعى و تبت الايدى و خسرت الصفقة و بوتم بغضب من الله وضربت عليكم الذلة و المسكنة ويلكم يا اهل الكوفة اتدرون اى كبد لرسول الله فريتم و اى كريمة له ابرزتم و اى دم له سفكتم و اى حرمة له انتهكتم (لقد جئتم شيئاً اذا تكاد السموات يتفطرن منه و تنشق الارض و تخر الجبال هدًا) و لقد جئتم بها صلعاء عنقاء سوداء فقماء خرقاء شوهاء كطلاع الارض او ملاءِ السماء افعجبتم ان مطرت السماء دما و العذاب الاخرة اخزى و انتم لا تنصرون فلا يستخفنكم المهل فانه لا يحفزه البدار ولا يخاف فوت الثار وان ربكم لبالمرصاد﴾[1]

(بعض روایات کے مطابق پھر یہ اشعار پڑھے) ؎

ماذا تقولون اذ قال النبى لكم　　　ماذا صنعتم وانتم اخر الامم

باهلبيتى واولادى وتكرمتى　　　منهم اسارىٰ و منهم ضرجوا بدم

ما كان ذاك جزائى اذ نصحت لكم　　　ان تخلفونى بسوء فى ذوى رحم

انى لاخشى عليكم ان يحل بكم　　　مثل العذاب الذى اودى على ارم[2]

[1] لہوف، ص ۱۳۱، لواعج الاشجان، ص ۱۹۰۔

[2] تاریخ، ج ۲، ص ۳۰۲۔ نفس المہموم، ص ۲۰۹۔

سب تعریفیں خدا کے لئے ہیں۔ اور درود و سلام میرے باپ (نانا) محمدؐ اور ان کی طیب و طاہر اور نیک اولاد پر۔ اما بعد۔ اے اہل کوفہ! اے اہل دھوکہ و مکر! کیا اب تم روتے ہو؟ (خدا کرے) تمہارے آنسو کبھی خشک نہ ہوں اور تمہاری آہ و فغاں کبھی بند نہ ہو! تمہاری مثال اس عورت جیسی ہے۔ جس نے بڑی محنت و جانفشانی سے محکم ڈوری بانٹی اور پھر خود ہی اسے کھول دیا۔ اور اپنی محنت پر پانی پھیر دیا تم (منافقانہ طور پر) ایسی جھوٹی قسمیں کھاتے ہو۔ جن میں کوئی صداقت نہیں تم جتنے بھی ہو سب کے سب بے ہودہ گو ڈینگ مارنے والے پیکر فسق و فجور اور فسادی کینہ پرور اور لونڈیوں کی طرح جھوٹے چاپلوس اور دشمنوں کی غمازی ہو تمہاری کیفیت یہ ہے جیسے کثافت کی جگہ سبزی یا چاندی جیسی ہے جو دفن شدہ عورت (کی قبر) پر رکھی جائے۔

آگہ باشید! تم نے بہت ہی برے اعمال کا ارتکاب کیا ہے۔ جن کی وجہ سے خداوند عالم تم پر غضب ناک ہے۔ اس لئے تم اس کے ابدی عذاب و عقاب میں گرفتار ہو گئے۔ کیا اب گریہ و بکاء کرتے ہو۔ ہاں بخدا۔ البتہ تم اس کے سزاوار ہو کہ روؤ زیادہ اور ہنسو کم۔ تم امام علیہ السلام کے قتل کی عار و شنار میں گرفتار ہو چکے ہو۔ اور تم اس دھبے کو کبھی دھو نہیں سکتے! اور بھلا تم خاتم نبوت و معدن رسالت کے سلیل (فرزند) اور جوانان جنت کے سردار جنگ میں اپنے پشت پناہ۔ مصیبت میں جائے پناہ، منارہ حجت اور عالم سنت کے قتل کے الزام سے کیونکر بری ہو سکتے ہو؟ تمہارے لئے لعنت و ہلاکت ہو۔ تم نے بہت ہی برے کام کا ارتکاب کیا ہے اور آخرت کے لئے برا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ تمہاری کوشش رائیگاں ہو گئی تم برباد ہو گئے۔ تمہاری تجارت خسارہ میں رہی اور خدا کے قہر و غضب کے شکار ہو گئے۔ اور ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوئے۔ افسوس ہے تم پر اے اہل کوفہ! کچھ جانتے بھی ہو کہ تم نے رسولؐ کے کس جگر کو پارہ پارہ کیا؟ اور ان کا کونسا خون بہایا؟ اور ان کی کونسی ہتک حرمت کی؟ اور ان کی کن مستورات کو بے پردہ کیا؟ تم نے ایسے افعال شنیعہ کا ارتکاب کیا ہے کہ آسمان گر پڑیں۔ زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ تم نے قتل امام کا جرم شنیع کیا ہے جو پہنائی و وسعت میں آسمان و زمین کے برابر ہے۔ اگر اس واہیہ و بیاء و بلیہ عمیا پر آسمان سے خون برسا ہے تو تم تعجب کیوں کرتے ہو؟ یقیناً آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت اور رسوا کن ہوگا اور اس وقت تمہاری کوئی امداد نہ کی جائے گی! تمہیں جو مہلت ملی ہے اس سے خوش نہ ہو کیونکہ خداوند عالم بدلہ لینے میں جلدی نہیں کرتا کیونکہ اسے انتقام کے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں یقیناً تمہارا پروردگار اپنے نافرمان بندوں کی گھات میں ہے۔

صاحب طراز المذہب ص ۲۷۳ نے اس خطبہ کی انوکھی تعبیرات و تشبیہات اور استعارات و کنایات کے متعلق لکھا ہے: ﴿فصحاء و بلغاء روزگار را متحیر و مبہوت می دارد﴾۔

پھر بی بی عالم نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ راوی کہتا ہے میں نے دیکھا کہ لوگ حیران و سرگرداں ہیں۔

اور تعجب سے انگلیاں منہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو دیکھا جو میرے پہلو میں کھڑا رو رہا تھا۔ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی۔ ہاتھ آسمان کی طرف بلند تھا اور وہ اس حال میں کہہ رہا تھا: ﴿بابی انتم و امی کھولکم خیر الکھول وشبابکم خیر الشباب ونساء کم خیر النساء ونسلکم خیر نسل وفضلکم فضل عظیم﴾ میرے ماں باپ تم پر قربان! تمہارے بزرگ سب بزرگوں سے بہتر۔ تمہارے جوان سب جوانوں سے افضل تمہاری عورتیں سب عورتوں سے اشرف! تمہاری نسل سب نسلوں سے اعلیٰ۔ اور تمہارا فضل عظیم ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

کھو لھم خیر الکھول ونسلھم ۔۔۔ اذا عد نسل لا یبور ولا یخزی

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اسکتی یا عمة ففی الباقی من الماضی اعتبار و انت بحمد اللّٰہ عالمة غیر معلّمة فھمة غیر مفھمة ان البکاء و الحنین لا یرد ان من قد اباده الدھر فسکنت﴾ پھوپھی اماں! چپ کرو! جو کچھ گذر ااس میں باقی ماندہ کے لئے درس عبرت ہے۔ آپ بحمد اللہ بغیر پڑھائے ہوئے عالمہ اور بغیر سمجھائے ہوئے سمجھدار ہیں۔ گریہ و بکا اسے واپس نہیں لاسکتا جسے حوادث روزگار کا شکار ہو چکا ہے۔ چنانچہ مخدومہ عالم خاموش ہو گئیں۔[1]

جناب فاطمہ صغریٰ کا خطبہ

مخدومہ کونین کے بعد جناب فاطمہ بنت الحسینؑ نے غم والم میں ڈوبا ہوا یہ خطبہ دیا جسے زید بن موسیٰ نے اپنے آباواجداد کے سلسلہ سند سے روایت کیا ہے: ﴿الحمد للّٰہ عدد الرمل. والحصیٰ وزنة العرش الی الثریٰ احمده و اؤمن به واتوکل علیه واشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لا شریک له وان محمداً عبده ورسوله صلّی اللّٰه علیه و اله و ان اولاده ذبحوا بشطّ الفرات بغیر ذحل ولا ترات اللّٰهمّ الی اعوذ بک ان افتری علیک الکذب و ان اقول علیک خلاف ما انزلت علیه من اخذ العهود لوصیه علی بن ابی طالب المسلوب حقه المقتول من غیر ذنب کما قتل ولده بالامس فی بیت من بیوت اللّٰه و بها معشر مسلمة بالسنتهم تعساً لرؤسهم ما رفعت عنه ضیماً فی حیاته ولا عند مماته حتی قبضته، الیک محمود النقیبة طیب الضریبة معروف المناقب مشهود المذاهب لا تاخذه فیک اللّٰهمّ لومة لائم ولا عذل عاذل هدیته اللّٰهمّ للاسلام صغیراً و حمدت مناقبه کبیراً ولم یزل ناصحاً لک ولرسولک صلی اللّٰه علیه و اله حتی قبضته الیک زاهداً فی الدنیا غیر حریص

---

[1] احتجاج طبرسی ص ۱۶۶ طبع النجف۔ الملہوف ص ۲۰۹۔ ناسخ ج ۶ ص ۳۰۷۔

علیهـا راغباً فی الاخرة مجاهدا لک فی سبیلک فاخترته و هدیته الی صراط مستقیم. اما بعد یا اهـل الـکوفة یا اهل المکر و الغدر و الخیلاء فانا اهل بیت ابتلانا اللّٰه بکم و ابتلاکم بنا فجعل بلائنا حسـنا و جـعـل عـلـمـه عـنـدنا و فهمه لدینا فنحن عیبة علمه و وعاء فهمه و حکمته و حجته علی الارض فی بـلاده لـعبـاده اکرمنا اللّٰه بکرامة و فضلنا بنبیه محمّد علی کثیر من خلقه تفضیلا بیّناً فـکـذبـتـمـونـا و کفرتمونا و رأیتم قتالنا حلالاً و اموالنا نهبا کأننا اولاد الترک او کابل کما قتلتم جـدنـا بـالامس و سیوفکم تقطر من دمائنا اهل البیت لحقد متقدم قرت لذلک عیونکم وفرحت قـلـوبکم افتراء علی اللّٰه ومکراً مکرتم واللّٰه خیر الماکرین فلا تدعونکم انفسکم الی الجذل بما اصبتم من دمائنا ونالت ایدیکم من اموالنا فان ما اصابنا من المصائب الجلیلة و الرزایا العظیمة فی کتـاب مـن قبل ان نبرأها ان ذلک علی اللّٰه یسیر لکیلا تأسوا علی ما فاتکم و لا تفرحوا بما اتکم واللّٰه لا یحب کل مختال فخور. تبّاً لکم فانتظروا اللعنة والعذاب فکان قد حلّ بکم وتواترت من السّمـاء نقمات فیسحتکم بعذاب (فتسحتکم بما کسبتم) ویذیق بعضکم بأس بعض ثم تخلدون فی العذاب الالیم یوم القیامة بما ظلمتمونا الا لعنة اللّٰه علی الظالمین ویلکم أتدرون اية ید طاعننا منـکـم و اية نـفـس نزعت الی قتالنا ام بای رجل مشیتم الینا تبغون محاربتنا واللّٰه قست قلوبکم و غلظت اکبادکم و طبع فی افئدتکم وختم علی سمعکم وبصرکم وسوّل لکم الشیطان واملی لکم وجـعـل عـلـی بـصـرکم غشاوة فانتم لا تهتدون فتباً لکم یا اهل الکوفة ایّ ترات لرسول اللّٰه صلی اللّٰـه عـلـیـه وآله قبلکم و ذحول له لدیکم ثم غدرتم باخیه علی بن ابی طالب جدی و بنیه و عترته الطّیبین الاخیار فافتخر بذلک مفتخر و قال ـه

نحن قتلنا علیًا و بنی علیّ	بسیوف هندیة ورماح
و سبینا نساء هم سبی ترک	و نطحنا هم ایّ نطاح

بفیک ایها القـائـل الـکـثکث و لک الاثلب افتخرت بقتل قوم زکاهم اللّٰه وطهرم اللّٰه واذهب عنهـم الـرجـس فـاکظم واقع کـمـا اقعیٰ ابوک و انما لکل امرء ما کسب وما قدمت یداه احسدتمونا ویلاً لکم علی ما فضلنا اللّٰه.

فما ذنبنا ان جاش دهراً بحورنا	و بحرک ساج لا یواری الدعامصا

ذلک فـضـل اللّٰه یؤتیه من یشاء و اللّٰه ذوالفضل العظیم و من لم یجعل اللّٰه له نوراً فما له

من لوذ۔

(حمد پروردگار و ثنائے پیغمبر و آئمہ اطہار پر مشتمل تمہیدی خطبہ کے بعد فرمایا:)

اے اہل کوفہ، اے اہل غدر و مکر اور تکبر۔ خداوند عالم نے ہمارا تمہارے ذریعہ اور تمہارا ہمارے ذریعہ سے امتحان و اختبار لیا ہے پھر ہماری آزمائش کو اچھا بنایا ہے۔ اور ہمیں اپنے علم و فہم اور حکمت کا گنجینہ قرار دیا ہے۔ اور ہمیں زمین میں اپنے بندوں پر اپنی حجت قرار دیا ہے۔ خداوند عالم نے ہمیں اپنی مخصوص عزت و کرامت سے نوازا ہے۔ اور ہمیں اپنے پیغمبر حضرت محمدؐ کی وجہ سے اپنی تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے مگر تم نے ہماری تکذیب کی۔ اور ہمارے (احسانات کا) انکار کیا اور ہمارے ساتھ قتل و قتال کرنے اور ہمارے مال و منال کے لوٹنے کو جائز سمجھا گویا کہ ہم (معاذ اللہ) ترک و کابل کے (غیر مسلمان) لوگ ہیں۔ تم نے کل (ماضی قریب میں) سابقہ کینوں کی بنا پر جد امجد کو شہید کیا۔ تمہاری تلواروں سے اب بھی ہمارا خون بہ رہا ہے۔ مگر (ایسے سنگین جرائم کے باوجود) تمہارے دل شادکام اور آنکھیں روشن ہیں۔ یہ سب کچھ تم نے خدا پر افترا پردازی اور مکر و فریب کا مظاہر کرتے ہوئے کیا ہے۔ خدا تمہیں تمہارے مکر و فریب کی ضرور سزا دے گا تم نے جو ہمارے خون بہائے ہیں اور مال و اسباب لوٹے ہیں۔ اس سے تم خوش و خرم نہ ہو کیونکہ ہم پر جو سخت مصائب و آلام نازل ہوئے ہیں۔ وہ خلقت سے پہلے کتاب میں لکھے ہوئے تھے اور یہ بات خدا پر آسان ہے تاکہ دنیوی مال کے ضیاع سے ملول نہ ہو اور اس کی فراوانی پر مسرور و شادکام نہ ہو۔ خدا تکبر اور فخر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اے اہل کوفہ تمہارے لئے ہلاکت ہو۔ اب لعنت و عذاب کا انتظار کرو۔ گویا کہ تم پر نازل ہو گیا ہے۔ اور تم پر آسمان سے مسلسل لعنتیں نازل ہو رہی ہیں جو تمہیں نیست نابود کر کے رکھ دیں گی اور خدا ایک دوسرے کے ہاتھوں تم سے انتقام لے گا۔ تم نے ہم پر جو ظلم و ستم کیا ہے اس کی پاداش میں ہمیشہ عذاب جہنم میں مبتلا رہو گے۔ ظالموں پر خدا کی لعنت ہو! وائے ہو تم پر اے اہل کوفہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے کس ہاتھ سے ہم پر ظلم و زیادتی کی ہے؟ اور کس نفس کے ساتھ ہم سے جدال و قتال کیا ہے؟ اور کن پاؤں سے چل کر ہم سے لڑنے کے لئے آئے ہو؟ خدا کی قسم تمہارے دل سخت اور جگر درشت ہو گئے ہیں۔ اور تمہارے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہریں لگ چکی ہیں۔ شیطان نے تمہیں فریب دیا ہے۔ اور تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اس لئے تم ہدایت حاصل نہیں کر سکتے! اے اہل کوفہ! ہلاکت ہو تمہارے لئے تم نے جناب رسول خداؐ سے کونسا بدلہ اور انتقام لینا تھا کہ ان کے بھائی اور میرے جد علی بن ابی طالبؑ اور ان کی عترت طاہرہ کے ساتھ تم نے غدر و مکر کیا۔ چنانچہ تمہارے بعض فخر کرنے والوں نے کہا: ہم نے علی اور اولاد علی کو ہندی تلواروں اور نیزوں کے ساتھ قتل کیا ہے اور ان کی مستورات کو ترک و دیلم کی باندیوں کی طرح قید کیا ہے۔ اور ان کو خوب لتاڑا ہے۔ اے قائل تیرے منہ میں خاک و پتھر تو اس گروہ کے قتل پر فخر و

مباہات کر رہا ہے۔ جن کو خداوند عالم نے طہارت و پاکیزگی عطا فرمائی ہے۔ اور ان سے ہر قسم کے رجس و ناپاکی کو دور رکھا ہے۔ اپنے غصہ کو پی اور اپنے باپ کو مانند کتے کی طرح بیٹھ۔ ہر آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہوگا تم ہمارے ساتھ اس لئے حسد کرتے ہو کہ خدا نے ہم کو فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ کہ ہمارے (کمالات کا) سمندر تمام زمانہ کو محیط ہے۔ اور تمہارا سمندر ساکن و پایاب ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے کیونکہ وہ صاحب فضل عظیم ہے۔ اور جسے خدا اپنے نور کا حصہ نہ دے اس کے لئے تاریکی سے نکلنے کے لئے کوئی نور نہیں ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ جب دختر حسینؑ کا کلام بلاغت نظام یہاں تک پہنچا تو روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ گریہ و بکا کرتے ہوئے عرض کیا: ﴿حسبک یا ابنة الطیبین فقد احرقت قلوبنا و انضجت نحورنا واضرمت اجوافنا﴾ اے طیب وطاہر آباء کی بیٹی! اتنا کلام کافی ہے آپ نے تو ہمارے دلوں کو شدت غم سے جلا دیا۔ سینوں کو پکا دیا اور ہمارے اندر حزن وملال کی آگ سلگا دی چنانچہ بی بی خاموش ہوگئیں۔[1]

جناب ام کلثوم کا خطبہ

اس کے بعد جناب ام کلثوم نے با آواز بلند آہ و بکا کرتے ہوئے یہ خطبہ انشا فرمایا:

یا اهل الكوفة سوءة لكم ما لكم خذلتم حسيناً و قتلتموه و انتهبتم امواله و ورثتموه و سبيتم نساءه و نكبتموه فتبًا لكم و سحقاً و يلكم اتدرون اى دواه دهتكم و اى وزر على ظهوركم حملتم و اى دماء سفكتموها و اى كريمة اصبتموها و اى صبية سلبتموها و اى اموال انتهبتموها قتلتم خير رجالات بعد النبیؐ و نزعت الرحمة من قلوبكم الا ان حزب الله هم الفائزون (المفلحون) و حزب الشيطان هم الخاسرون ثم قالت.

قتلتم اخی صبراً فویل لأمکم ستجزون ناراً حرها یتوقد

سفکتم دماءً حرّم الله سفکها و حرمها القران ثم محمّد

الا فابشروا بالنّار انکم غداً لفی سقر حقا یقیناً تخلّدوا

و انی لأبکی فی حیاتی علی اخی علی خیر من بعد النبی سیولد

---

[1] لہوف، ص ۱۲۷۔ عاشر بحار، ص ۲۱۹۔ نفس المہموم، ص ۲۱۲۔ تاریخ، ج ۶، ص ۲۰۸۔ قمقام، ص ۳۳۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۶۳۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۷۹۔ مقتل الحسین للخوارزمی، ج ۲، ص ۔۔۔؟۔ تظلم الزہراؑ، ص ۲۲۷۔ الدمعة الساکبہ، ص ۳۶۲ وغیرہ۔

نوٹ: علاوہ دوسرے شواہد کے خود یہ تاریخی خطبہ بھی جناب فاطمہ صغریٰ کے سید الشہداؑ کے ہمراہ ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ (منہ عفی عنہ)

بدمع غزیر مستهلٍ مکفکف　　　علی الخد منی دائماً لیس یجمد

اے اہل کوفہ! برائی ہو تمہارے لئے تم نے کیوں حسینؑ کی نصرت نہ کی۔ اور ان کو شہید کیا اور ان کے مال و اسباب کو لوٹا اور اپنا ورثہ بنایا۔ اور ان کے اہل عیال کو قید کیا۔ تمہارے لئے ہلاکت اور رحمت ایزدی سے دوری ہو۔ وائے بہ حال شما۔ کیا کچھ معلوم بھی ہے کہ تم کن مصائب میں مبتلا ہوئے اور کیا بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھایا؟ اور کیسے خون تم نے بہائے۔ اور کن اہل حرم کو تکلیفیں پہنچائیں۔ اور کن لڑکیوں کو لوٹا اور کن اموال پر ناجائز قبضہ کیا۔ تم نے ایسے شخص (امام حسینؑ) کو شہید کیا جو پیغمبر اکرمؐ کے بعد تمام لوگوں سے افضل تھا۔ رحم تمہارے دلوں سے اٹھا لیا گیا یقیناً خدا کا گروہ ہی کامران ہوتا ہے۔ اور شیطانی گروہ خائب و خاسر ہوتا ہے۔ پھر حزن و ملال میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار پڑھے۔

وائے ہو تم پر تم نے بلاقصور میرے بھائی کو شہید کیا۔ اس کی سزا تمہیں جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دی جائے گی۔ تم نے ایسے خون بہائے جن کے بہانے کو خدا، قرآن اور رسولؐ نے حرام قرار دیا تھا۔ تمہیں آتش کی بشارت ہو جس میں ابد آلاباد تک معذب رہو گے! میں اپنے بھائی پر جو بعد از رسول سب لوگوں سے افضل تھا۔ زندگی بھر روتی رہوں گی اور کبھی نہ خشک ہونے والا سیل اشک بہاتی رہوں گی۔"

راوی کہتا ہے کہ جناب ام کلثومؑ کے خطبہ کا اتنا اثر ہوا کہ روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ عورتیں اپنے بال بکھیر کر ان میں مٹی ڈالنے لگیں۔ اور مونہوں پر طمانچے مارنے شروع کئے۔ اسی طرح مرد شدت غم سے نڈھال ہو کر اپنی ڈاڑھیاں نوچنے لگے۔ اس روز سے زیادہ رونے والے مرد اور عورتیں کبھی نہیں دیکھی گئیں۔[1]

حضرت امام زین العابدینؑ کا خطبہ

لوگ ہنوز گریہ و بکاء کر رہے تھے کہ امام زین العابدینؑ نے انہیں خاموش ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب سب لوگ خاموش ہو گئے تو امامؑ نے خدا کی حمد و ثنا اور پیغمبر اسلامؐ پر درود و سلام بھیجنے کے بعد فرمایا: ﴿ایها الناس من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا اعرفه بنفسی انا علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب علیهم السّلام انا بن من انتهکت حرمة و سلبت نعمته و انتهب ما له و سبی عیاله انا بن المذبوح بشط الفرات من غیر ذحل ولا ترات انا بن من قتل صبراً و کفی بذلک فخرا. ایها الناس ناشدتکم بالله (انشدکم الله) هل تعلمون انکم کتبتم الی ابی و خدعتموه و اعطیتموه من انفسکم العهد و المیثاق و البیعة و قاتلتموه و خذلتموه فتباً لکم ما قدمتم لانفسکم و سوئةً

[1] لہوف، ص ۱۳۹۔ علاوہ بریں یہ خطبہ شریفہ تمام مذکورہ بالا کتب میں موجود ہے۔ فراجع۔

لرايكم بآية عين تنظرون الى رسول اللّٰہ اذ يقول لكم قتلتم عترتي وانتهكتم حرمتي فلستم من امتي﴾۔

فرمایا: ایہا الناس! جو شخص مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے اور جو نہیں پہچانتا میں اسے اپنی معرفی کرائے دیتا ہوں۔ میں علی بن الحسینؑ ہوں۔ وہ حسینؑ جو بلا جرم و قصور نہر فرات کے کنارے ذبح کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی ہتک حرمت کی گئی جس کے مال و منال کو لوٹا گیا اور جس کے اہل و عیال کو قید کیا گیا۔ میں اس کا پسر ہوں جسے ظلم و جور سے واماندہ کر کے شہید کیا گیا۔ اور یہ بات ہمارے فخر کے لئے کافی ہے۔ اے لوگو! میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا تم نے میرے پدر عالی قدر کو (دعوتی) خطوط لکھ کر نہیں بلایا تھا؟ اور ان کی نصرت و امداد کے عہد پیمان نہیں کیے تھے؟ اور جب وہ تمہاری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تشریف لائے تو تم نے مکر و فریب کا مظاہرہ کیا۔ اور ان کی نصرت و یاری سے دست برداری اختیار کر لی۔ بلکہ ان کے ساتھ قتال کر کے ان کو قتل کر دیا۔ ہلاکت ہو تمہارے لئے کہ تم نے بہت برا ذخیرہ اعمال جمع کیا ہے اور برائی ہو تمہاری رائے و تدبیر کے لئے! بھلا تم کن آنکھوں سے اس وقت جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ کی طرف دیکھو گے جب وہ تم سے فرمائیں گے کہ تم نے میری عترت اہل بیت کو قتل کیا اور میری ہتک حرمت کی اس لئے تم میری امت سے نہیں ہو۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ جب امام کا کلام غم التیام یہاں تک پہنچا تو ہر طرف سے لوگوں کے رونے اور چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اور ایک دوسرے کو کہنا شروع کیا: ﴿هلكتم وما تعلمون﴾ تم بے علمی میں ہلاک و برباد ہو گئے ہو۔ امام نے پھر سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے فرمایا: ﴿رحم الله امرأ قبل نصيحتي و حفظ وصيتي في الله و في رسوله و اهلبيته فان لنا في رسول الله اسوة حسنة﴾ خدا اس بندے پر رحم کرے جو میری نصیحت کو قبول کرے اور میری وصیت کو خدا اور رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ کے بارے میں یاد رکھے کیونکہ ہمارے لئے رسول خداؐ کی ذات میں اعلیٰ نمونہ موجود ہے۔ سب حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا: یابن رسول اللہ ہم سب آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ آپ جو حکم دیں ضرور اس کی تعمیل کی جائے گی۔ ہم آپ کے دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ امام نے ان کا یہ کلام فریب التیام سن کر فرمایا: ﴿هيهات هيهات ايها الغدرة المكرة حيل بينكم و بين شهوات انفسكم تريدون ان تأتوا اليّ كما اتيتم الى ابائي من قبل كلاّ و ربّ الراقصات فان الجرح لما يندمل من قتل ابي صلوات الله عليه بالامس و اهلبيته معه و لم ينسي ثكل رسول اللّٰہ و ثكل ابي و بني ابي و جدي بين لهاتي و مرارته بين حنا جري و حلقي و غصصه تجري في فراش صدري و مسئلتي ان تكونوا لا لنا ولا علينا﴾۔

امام نے فرمایا: ہیہات اے گروہ مکاراں وعیاراں! اب تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ اب تم چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو اس سے پہلے میرے اب وجد کے ساتھ کر چکے ہو؟ حاشا وکلا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بخدا! ابھی تک تو سابقہ زخم بھی مندمل نہیں ہوئے۔ کل تو میرے پدر عالی قدر کو ان کے اہل بیتؑ سمیت قتل کیا گیا ابھی تک تو مجھے اب وجدؑ اور بھائیوں کی شہادت کا صدمہ فراموش نہیں ہوا بلکہ ان مصائب کے غم والم (کی تلخی) میرے حلق میں موجود ہے اور غم وغصہ کے گھونٹ میرے سینہ کی ہڈیوں میں گردش کر رہے ہیں۔

ہاں تم سے صرف اس قدر خواہش ہے کہ نہ ہمیں فائدہ پہنچاؤ اور نہ نقصان۔

پھر یہ اشعار پڑھے:

لا غرو ان قتل الحسینؑ فشیخه　　قد کان خیراً من حسین واکرما

فلا تفرحوا یا اهل کوفة بالذی　　اصیب حسین کان ذلک اعظما

قتیل بشط النهر روحی فداءه　　جزاء الذی ارداه نار جهنما [1]

ابن زیاد کی سید الشہداءؑ کے سر اقدس کے ساتھ بے ادبی

ان خطبوں کے بعد اسیران اہل بیتؑ کا یہ لٹا ہوا قافلہ دربار ابن زیاد کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر ابن زیاد نے دربار میں تمام لوگوں کو حاضری کا اذن عام دے رکھا تھا۔[2] اس لئے آج دربار درباریوں اور تماش بینوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے شہداء کے سر دربار میں پہنچائے گئے۔ جناب سید الشہداءؑ کا سر اقدس ایک طشت[3] طلائی میں رکھ کر ابن مرجانہ کے سامنے پیش کیا گیا وہ بدنہاد سر مقدس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا اور چھڑی سے دندان مبارک کے ساتھ بے ادبی کی پھر امامؑ کے لب ودندان کے حسن وجمال کے بارے میں کچھ کلام کیا۔ بروایتے یہ بھی کہا: ﴿لقد اسرع الشیب الیک یا ابا عبد اللّٰه﴾ اے ابو عبداللہ! تم بہت جلد بوڑھے ہو گئے۔ اس وقت زید بن ارقمؓ (صحابی رسولؐ) موجود تھا۔ اس نے ابن زیاد کی گستاخی کا یہ افسوس ناک منظر دیکھ کر کہا: ﴿ارفع قضیبک عن هاتین الشفتین فو اللّٰه الذی لا اله غیره لقد رایت شفتی رسول اللّٰه علی هاتین الشفتین ما لا احصیه کثرةً یقبلها﴾ اے ابن زیاد ان مقدس ہونٹوں سے اپنی چھڑی اٹھا لے۔ کیونکہ میں نے بے شمار بار رسولؐ کو ان ہونٹوں کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔'' اس کے بعد ابن ارقم نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ ابن زیاد نے

---

[1] لہوف، ص ۱۳۲۔ نیز خطبہ مبارکہ تمام مذکورہ بالا کتب میں موجود ہے۔

[2] تاریخ، ج ۶، ص ۳۱۲۔ ارشاد، ص ۲۶۲۔ لہوف، ص ۱۴۲ وغیرہ۔

[3] تاریخ، ج ۶، ص ۲۶۲۔ امالی صدوق، ص ۹۹۔

آگ بگولا ہو کر کہا خدا تیری آنکھوں کو رلائے کیا تو فتح خداوندی پر روتا ہے؟ اگر بڑھاپے کی وجہ سے تیری عقل زائل نہ ہوگئی ہوتی تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ اس کے بعد زیدؓ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ بعض روایات کے مطابق وہ جاتے وقت لوگوں سے یہ کہہ رہے تھے: ﴿ایها الناس! انتم العبید بعد الیوم قتلتم ابن فاطمةؑ و امرتم ابن مرجانه واللّٰه یقتلن خیارکم و یستعبدن شرارکم فبعداً لمن رضی بالذل و العار﴾ ایہا الناس! تم آج کے بعد غلام ہو۔ تم نے فرزند فاطمہ کو شہید کیا۔ اور ابن مرجانہ کو امیر بنایا جو بخدا تمہارے اچھے لوگوں کو قتل کرتا ہے اور برے لوگوں کو غلام بناتا ہے۔ ہلاکت ہو اس کے لئے جو ذلت و رسوائی اور ننگ و عار پر رضامند ہوتا ہے۔[1]

اسیران آل محمدؐ کا دربار ابن زیاد میں ورود

کیسی ہوش ربا اور قیامت خیز گھڑی تھی جس وقت سید الانبیاء اور سید الاوصیاء کی بہو بیٹیاں اور نواسیاں بحالت قید و بند اور پابند رسن کر کے ایک فاسق فاجر، شراب خوار سردار کے دربار میں لائی جا رہی تھیں وہ دربار شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے اظہار کے لئے ہر قسم کی زیبائش و آرائش سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کوفہ کے تمام اراذل و اوباش لوگ تماشہ بینی کے لئے اس میں موجود تھے۔ اور سپاہیوں اور پہرہ داروں کو اسلحہ جنگ اور لباس فاخرہ سے نوازا گیا تھا۔

تمام ارباب تواریخ و مقاتل کا اتفاق ہے کہ ﴿دخلت زینب ابنة فاطمة متنكرة و علیها ارذل ثیابها﴾ فاطمۃ الزہراؑ کی دختر اور حسینؑ کی بہن زینب کبریٰؑ اس حال میں ابن زیاد کے دربار میں پیش ہوئیں کہ بہت ہی پست اور کم قیمت قسم کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ پھر دار الامارہ کے ایک کونہ میں کنیزوں کے جھرمٹ میں بیٹھ گئیں۔ بھلا خاندان نبوت و امامت کی جلالت کے آثار کیونکر چھپ سکتے تھے؟ ابن زیاد بدنہاد نے فوراً دریافت کیا: ﴿من هذه﴾ یہ گوشہ دربار میں اس طرح بیٹھنے والی کون ہے؟ بی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ملعون نے دوبارہ سہ بارہ یہی سوال کیا۔ بالآخر بنت زہراؑ کی ایک کنیز نے جواب میں کہا: ﴿هذه زینب بنت فاطمه بنت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و اله﴾ یہ رسولؐ خدا کی صاحبزادی فاطمہ زہراؑ کی بیٹی زینب عالیہ ہیں۔

دربار میں بنت حیدر کرار کی ابن زیاد سے گفتگو

بے شرم نشۂ فتح میں بدمست حاکم بجائے اس کے کہ خجل و شرمسار ہوتا کہ آج رسول اکرمؐ کی نواسی اس حالت میں اسکے دربار میں پیش ہے۔ الٹا اس نے اپنی نفس و خست طبع بلکہ اپنے کفر و الحاد کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ بی

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۲۰۔ طبری، ج ۶، ص ۲۶۲۔ تاریخ ابن کثیر، ج ۸، ص ۱۹۰۔ نفس المہموم، ص ۲۱۵۔ لواعج الاشجان، ص ۱۶۶۔

نوٹ: اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ زید بن ارقم اس وقت نابینا تھے۔ تب بھی اس واقعہ کی صداقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا کیونکہ عین ممکن ہے کہ لوگوں سے سن کر انہوں نے اس اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا ہو۔ (منہ عفی عنہ)

بی کا مزید دل جلانے کی خاطر کہا (نقل کفر کفر نہ باشد) ﴿الحمد لله الذی فضحکم و قتلکم و اکذب احدو ثتکم﴾ اس خدا کی حمد ہے جس نے تمہیں رسوا کیا، تمہیں قتل کیا۔ اور تمہارے ڈھونگ کو ظاہر کیا۔ عقیلہ قریش علیؑ زادی نے جرأت ہاشمیہ کے ساتھ فوراً حاکم کو جواب دیا: ﴿الحمد لله الذی اکرمنا بنبیه و الحمد لله وطهرنا من الرجس تطهیراً. انما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر و هو غیرنا و الحمد لله﴾ سب تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے ہمیں اپنے رسول محمدؐ کے ذریعہ سے عزت و کرامت بخشی اور ہمیں ہر قسم کے گناہوں سے پاک و پاکیزہ قرار دیا۔ ہاں البتہ ذلیل و رسوا فاسق ہوتا ہے اور جھوٹ فاجر بولتا ہے۔ اور وہ الحمد للہ ہم نہیں بلکہ ہمارا غیر ہے۔

پھر ابن زیاد نے طنزاً کہا: ﴿کیف رایت فعل الله باهلبیتک﴾ تم نے اپنے خاندان کے ساتھ خدا کا سلوک کیسے دیکھا ہے؟ نواسی رسولؐ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا: ﴿ما رایت الا جمیلاً هؤلاء قوم کتب الله علیهم القتل فبرزوا الی مضاجعهم و سیجمع الله تعالی بینک و بینهم فتحاجون و تختصمون عندهٔ فانظر لمن یکون الفلج یومئذٍ هبلتک امک یابن مرجانة!﴾ میں نے خدا کے حسن سلوک کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔ یہ شہید ہونے والا وہ گروہ تھا جس کے لئے خدا نے درجہ شہادت قلم قدرت سے لکھ دیا تھا اس لئے وہ اپنی مقتل گاہ کی طرف گیا۔ عنقریب خدا تعالیٰ تمہیں اور انہیں (بروز قیامت ایک جگہ جمع کرے گا۔ اس وقت اس عادل حقیقی کی بارگاہ میں تمہارا مقدمہ پیش ہوگا۔ اچھی طرح غور کر لے کہ اس وقت کون کامیاب ہوگا؟ اور ابن مرجانہ! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے!

راوی کہتا ہے کہ بی بی کا یہ کلام حقیقت ترجمان سن کر ابن زیاد غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔ اور بی بی کو کچھ گزند پہنچانے کا مشئوم ارادہ کیا۔ مگر عمرو بن حریث نے یہ کہہ کر اس کے غصہ کو فرو کر دیا کہ ﴿ایها الامیر! انها امرأة والمرأة لا تؤاخذ بشئ من منطقها ولا تذم علی خطابها﴾ اے امیر! یہ عورت ہے اور عورت کی کسی گفتگو کا مؤاخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کے کسی خطاب پر اس کی مذمت کی جا سکتی ہے! پھر ابن زیاد نے اس طرح اپنے کفر والحاد کا اظہار کیا: ﴿قد شفی الله نفسی من طاغیتک والعصاة من اهل بیتک﴾ خدا نے میرے نفس کو تیرے سرکش بھائی اور تیرے خاندان کے دوسرے نافرمان لوگوں سے شفا دی ہے، بی بی عالم کو ملعون کا یہ کلام نافرجام سن کر جو کھلم کھلا گالی تھا۔ سخت صدمہ ہوا اس لئے آبدیدہ ہو گئیں۔ اور رو رو کر فرمایا: ﴿لعمری لقد قتلت کهلی و ابرت اهلی قطعت فرعی و اجتثثت اصلی فان یشفک هذا فقد اشتفیت!﴾ مجھے اپنی زندگی کی قسم! تو نے میرے بڑوں کو قتل کیا۔ میرے اہل و عیال کو تباہ کیا، فرع کو قطع کیا اور اصل کو جڑ سے اکھیڑا! اگر اسی بات میں تیری شفا ہے تو یقیناً تو نے شفا حاصل کر لی ہے۔“

علیؑ کی لاڈلی کا یہ جواب باصواب سن کر ابن زیاد نے کہا: ﴿ھذه سجاعة ولعمری لقد کان ابوھا سجاعا شاعرا﴾ یہ تو بڑی قافیہ باز عورت ہے۔ اور مجھے اپنی زندگی کی قسم اور اس کا والد بھی بڑا قافیہ باز اور شاعر تھا۔

بی بی نے اس کی اس خرافات کا یہ جواب دیا کہ ﴿ما للمراة و للسجاعة ان لی عن السجاعة لشغلا و لکن صدری نفث بما قلت﴾ ''ایک عورت کو سجع بندی سے کیا واسطہ ہے۔ اور مجھے قافیہ بازی کا کہاں ہوش ہے لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے۔''

امام سجادؑ کا ابن زیاد کے ساتھ مکالمہ

اس کے بعد ابن زیاد امام زین العابدینؑ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ﴿من انت؟﴾ تم کون ہو؟ امام نے فرمایا: انا علی بن الحسین ''میں علی بن الحسینؑ ہوں!'' ابن زیاد نے کہا: ﴿او لیس قتل الله علی بن الحسینؑ؟﴾ کیا خدا نے علی بن الحسینؑ کو (میدان کربلا میں) قتل نہیں کر دیا؟ امام نے فرمایا: ﴿قد کان لی اخ (اصغر منی) یسمّٰی علیًا قتله الناس﴾ میرا ایک بھائی تھا (جو مجھ سے چھوٹا تھا) جسے لوگوں نے شہید کیا ہے![1]

ابن زیاد نے کہا: ﴿بل الله قتله﴾ نہیں بلکہ اسے خدا نے ہی قتل کیا ہے امامؑ نے فرمایا: ﴿الله یتوفی الانفس حین موتها وما کان لنفس ان تموت الا باذن الله﴾ خداوند عالم روحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے۔ اور کوئی نفس خدا کے حکم کے بغیر نہیں مرتا۔

امام علیہ السلام کا یہ کلام وحی ترجمان ابن زیاد پر شاق گذرا کہا: ﴿الک جراة علی جوابی﴾ کیا تمہیں میرا جواب دینے کی ابھی تک جرأت ہے؟ پھر جلاد کو حکم دیا کہ ان کی گردن اڑا دے۔ یہ حکم سنتے ہی جناب زینب عالیہؑ اپنے بھتیجے بیمار کربلا کے گلے سے لپٹ گئیں۔ اور ابن زیاد کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿حسبک یا بن زیادا من دمائنا ما سفکت و هل ابقیت احدا. غیر هذا لا والله لا افارقه فان اردت قتله فاقتلنی معه﴾ اے ابن زیاد جس قدر تو ہمارا خون بہا چکا ہے۔ وہی تیرے لئے کافی ہے۔ سوائے اس بیمار کے کسی اور (مرد) کو زندہ چھوڑا ہے؟ بخدا میں ان سے جدا نہ ہوں گی۔ اگر ان کے بھی قتل کا ارادہ ہے تو مجھے بھی ان کے ہمراہ قتل کر دو۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اسکتی یا عمتی حتی اکلمه﴾ پھوپھی اماں آپ چپ کریں تا کہ میں اس سے کچھ باتیں کر لوں۔ پھر ابن زیاد کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ﴿ابا لقتل تهددنی یا بن زیادا اما علمت ان القتل لنا عادة و کرامتنا الشهادة﴾ اے پسر زیاد! کیا تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ قتل ہونا ہماری عادت اور راہ خدا میں شہید ہونا ہماری فضیلت و کرامت ہے!

---

[1] عمدۃ الطالب۔

ابن زیاد کچھ دیر تک پھوپھی اور بھتیجے کی باہمی محبت واخلاص کا یہ عجیب وغریب منظر دیکھتا رہا پھر کہا: ﴿عجبا للرحم و اللّٰہ انی لاظنها ودّت انی قتلتها معه﴾ تعجب ہے۔ قرابت داری پر خدا کی قسم میرا خیال ہے بی بی چاہتی تھی کہ اسے بھی ان کے ساتھ قتل کر دیا جائے پھر حکم دیا: ﴿دعوه فانی اراه لما به مشغول﴾ "اسے چھوڑ دو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ موجودہ بیماری ہی اس کے لئے کافی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جس خوش اسلوبی کے ساتھ جناب زینب عالیہ نے دربار ابن زیاد میں جس منزل کو طے کیا وہ اس مرحلہ سے بھی زیادہ مشکل تھی جس کو اعوان وانصار حسین نے کربلا میں طے کیا تھا۔ ایسے ہوش ربا حالات میں ابن زیاد کے سامنے اگر کوئی فارغ البال اور مطمئن الحال مرد کئی شب و روز کی سوچ بچار کے بعد بھی ایسی یادگا تقریر کرتا جیسے دختر علی نے ہزاروں کے نامحرم مجمع میں خطبوں اور مکالموں کی شکل میں کی ہے تو یہ اس کا عظیم کارنامہ شمار ہوتا حالانکہ رسول کی نواسی تو مصائب و آلام میں اس طرح گھری ہوئی تھی جیسے بتیس دانتوں میں زبان۔ اس کے بعد ابن زیاد نے دربار برخاست کرتے ہوئے اسیران آل محمدؐ کے متعلق حکم دیا کہ انہیں مسجد کوفہ کے پہلو میں جو قید خانہ ہے۔ اس میں لے جا کر بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس وقت جناب زینب عالیہ نے فرمایا: ﴿لا یدخلن علینا عربیة الا ام ولد او مملوکة فانهن سبین کما سبینا﴾ ہمارے پاس کوئی (آزاد) عربی عورت نہیں آئی۔ سوائے امّ ولد یا کنیز کے کیونکہ وہ بھی اسی طرح قید ہو چکی ہیں جس طرح ہم قید ہوئے ہیں۔[1]

ابن زیاد کا جامع مسجد کوفہ میں شر انگیز خطبہ اور عبداللہ بن عفیف ازدیؒ کی شہادت

سابقہ کاروائی کرنے کے بعد ابن زیاد بدنہاد نے منادی کرائی الصلوٰۃ جامعۃ چنانچہ جب سب لوگ مسجد جامع میں حاضر ہو گئے اور مسجد پر ہوگئی تو ابن زیاد نے منبر پر جا کر یہ خطبہ دیا جسے نقل کفر کفر نہ باشد کے طور پر مجبوراً نقل کیا جاتا ہے: ﴿الحمد للّٰہ الذی اظهر الحق واهله و نصر امیر المؤمنین یزید و حزبه وقتل الکذاب الحسینؑ بن علی و شیعته﴾ حمد ہے خدا کی جس نے حق اور اہل حق کو غلبہ دیا اور امیر یزید اور اس کی جماعت کو فتح و نصرت عطا کی اور...... حسینؑ اور علی اور ان کے شیعوں کو قتل کیا۔

ابھی اس بدنہاد کا سلسلہ کلام یہیں تک پہنچا تھا کہ عبداللہ بن عفیف ازدی یہ ناہنجار کلام سن کر اٹھ کھڑا ہوا جو

---

[1] مقاتل الطالبین، ص ۸۸، طبع النجف۔ منتخب طریحی، ص ۳۳۸۔ نسب قریش زبیری، ص ۵۸۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۹۳۔ ارشاد، ص ۲۶۷۔ لہوف، ص ۱۴۳۔ نفس المہموم، ص ۲۱۷۔ لواعج الاشجان، ص ۱۲۸۔ مقتل الحسین للخوارزمی، ج ۲، ص ۴۳۔ تظلم الزہراء، ص ۲۵۳۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۱۵۔ قمقام، ص ۴۳۶۔ ذخیرۃ الدارین... ص ۴۲۔ تظلم الزہراء، ص ۲۵۳۔ عاشر بحار، ص ۲۲۱۔ تحفہ وقائع ایام محرم، ص ۲۶۳۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۹۷ وغیرہ۔

کہ بہت عمر رسیدہ و نابینا اور حضرت امیر علیہ السلام کے خواص اصحاب میں سے تھا ان کی ہمراہی میں بائیں آنکھ جنگ جمل میں اور دوسری جنگ صفین میں بے کار ہوگئی تھی۔ زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ سارا دن مسجد میں نماز پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ بہرحال ابن عفیف نے گرج کر کہا: ﴿یابن مرجانہ (یا عدو اللہ) الکذاب ابن الکذاب انت و ابوک والذی ولاک و ابوہ! یابن مرجانۃ اتقتلون ابناء النبیین و تکلمون بکلام الصدیقین (اتقتل اولاد النبیین و تقوم علی منبر الصدیقین)﴾ اے دشمن خدا ابن مرجانہ۔ کذاب تو اور تیرا باپ ہے اور وہ جس نے تجھے حاکم بنایا ہے (یزید) اور اس کا باپ تم اولاد انبیاء کو قتل کرتے ہو اور پھر صدیقوں والا کلام کرتے ہو۔ بروایت دیگر اور پھر صدیقین کے منبر پر چڑھتے ہو۔ ابن زیاد نے کہا: اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ چنانچہ پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا۔ مگر جب عبداللہ نے بنی ازد کے مخصوص شعار "یا مبرور" کی صدا بلند کی تو کئی ازدی نوجوان اٹھے اور اسے ان ظالموں کے چنگل سے چھڑا کر لے گئے لیکن ابن زیاد نے رات کے وقت کسی آدمی کو بھیج کر ان کو قتل کرا دیا۔ اور ان کی لاش مقام سبخہ (طبری) یا مسجد میں (کامل) سولی پر لٹکوا دی۔[1] طبری و کامل اور ارشاد میں تو یہ واقعہ اسی قدر لکھا ہے۔ مگر دوسری بعض کتب معتبرہ میں یہ واقعہ ہائلہ قدرے تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

ابن عفیف کا مذکورہ بالا جرات مندانہ اور مومنانہ جواب سن کر ابن زیاد بھڑک اٹھا کہا: ﴿من المتکلم﴾ یہ کلام کرنے والا کون ہے؟ جناب عبداللہ نے کہا: ﴿انا یا عدو اللہ اتقتل الذریۃ الطاھرۃ التی قد اذھب اللہ عنھا الرجس و تزعم انک علی دین الاسلام وا غوثاہ این اولاد المھاجرین والانصار لا ینتقمون من طاغیتک اللعین بن اللعین علی لسان محمد رسول رب العالمین﴾۔

اے اللہ کے دشمن! میں کلام کر رہا ہوں۔ تو اس ذریت طاہرہ کو شہید کرتا ہے۔ جس سے خدا نے ہر قسم کے رجس کو دور رکھا ہے۔ اور پھر یہ گمان کرتا ہے کہ تو مسلمان ہے۔ ہائے فریاد! اولاد مہاجرین وانصار کہاں ہے؟ جو اس (ابن زیاد) کے سرکش (یزید) سے جو رسول خدا کی زبان سے لعین بن لعین ہے انتقام لے؟ یہ کلام سن کر ابن زیاد شدت غیظ و غضب کی وجہ سے آگ بگولہ ہو کر بولا: اسے میرے پاس لاؤ چنانچہ پولیس والے اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔ مگر عبداللہ کے شعار بنی "ازد" یا "مبرور" پکارنے سے اس کی قوم کے کچھ لوگ اٹھے جن کی تعداد شیخ مفید نے سات سو لکھی ہے۔[2] اور اسے پولیس سے چھڑا کر گھر لے گئے۔

ابن زیاد نے پولیس کو حکم دیا کہ اس اندھے کے گھر جاؤ اور اسے پکڑ کر لاؤ۔ چنانچہ جب یہ لوگ اس کے گھر پہنچے تو بنی ازد نے مزاحمت کی اور کچھ یمنی بھی ان کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ ادھر سے انکار ادھر سے اصرار جب

[1] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۶۳۔ تاریخ کامل، ج ۳، ص ۲۹۷۔ ارشاد، ص ۲۶۷۔
[2] ارشاد، ص ۲۶۷۔ نفس المہموم، ص ۲۲۷۔

ابن زیاد کو حقیقت حال کا علم ہوا تو اس نے محمد بن اشعث کی کمان میں کئی قبائل عبداللہ کو پکڑنے اور بصورت دیگر جنگ کرنے کے لئے بھیج دیئے۔ چنانچہ فریقین میں سخت جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک جماعت ماری گئی۔ اور بالآخر ابن زیاد کے آدمی عبداللہ کے گھر کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ عبداللہ کی لڑکی نے کہا: بابا دشمن آ گیا ہے۔ عبداللہ نے فرمایا: بیٹی کوئی حرج نہیں۔ مجھے تلوار پکڑا دو۔ چنانچہ عبداللہ نے تلوار ہاتھ میں لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے اپنا دفاع شروع کیا ؎

انا ابن ذی الفضل عفیف الطاہر　　　عفیف شیخی و ابن ام عامر

کم دارع من جمعکم و حاسر　　　و بطل جدلتہ مغادر

عبداللہ کی صاحبزادی نے کہا اے کاش میں مرد ہوتی اور آج تیرے ہمراہ ذریت طاہرہ کے ان قاتلوں کے ساتھ جنگ کرتی۔ لوگ حملہ پر حملہ کر رہے تھے اور لڑکی برابر بتائے جاتی تھی کہ بابا اب دشمن فلاں طرف سے حملہ کر رہا ہے۔ بالآخر دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اسے پکڑ لیا اور اٹھا کر ابن زیاد کے پاس لے گئے ملعون نے دیکھتے ہی کہا: ﴿الحمد للہ الذی اخزاک﴾ شکر ہے کہ خدا نے تجھے ذلیل کیا ہے! عبداللہ نے کہا: ﴿یا عدو اللہ! و بما ذا اخزانی اللہ!﴾ او خدا کے دشمن! بھلا خدا نے مجھے کیونکر ذلیل کیا ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

لو فرج لی عن بصری　　　ضاق علیک موردی و مصدری

ابن زیاد نے کہا: او دشمن تو عثمان بن عفان کی بابت کیا کہتا ہے؟ عبداللہ نے کہا: یا ابن مرجانہ تجھے عثمان سے کیا تعلق ہے؟ وہ اچھا ہے یا برا۔ خدا کے پاس اس کا حساب ہے۔ البتہ تو مجھ سے اپنے اور اپنے باپ، یزید اور اس کے باپ کی بابت سوال کر! ابن زیاد نے کہا: اب کوئی سوال نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ تم موت کے گھاٹ اتارے جاؤ۔ یہ سن کر عبداللہ نے کہا: ﴿الحمد للہ رب العالمین اما انی قد کنت اسئل اللہ ربی ان یرزقنی الشہادۃ من قبل ان تلدک امک و سئلت اللہ ان یجعل ذلک علی یدی العن خلقہ و ابغضہم الیہ فلما کف بصری یئست عن الشہادۃ و الآن فالحمد للہ الذی رزقنیہا بعد الیاس منہا و عرفنی الاجابۃ منہ فی قدیم دعائی﴾ سب تعریف ہے اس خدا کے لئے جو تمام عالمین کا پروردگار ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہاری ولادت سے بھی پہلے اپنے پروردگار سے دعا کیا کرتا تھا کہ وہ مجھے اپنی بدترین مخلوق کے ہاتھوں شہادت نصیب فرمائے۔ لیکن جب میری آنکھیں جاتی رہیں تو میں شہادت سے ناامید ہو گیا۔ اب (شہادت کو سامنے دیکھ کر) میں اس کی حمد کرتا ہوں کہ اس نے میری قدیمانہ دعا کو قبول فرماتے ہوئے مجھے شرف شہادت عطا فرمایا ہے۔

ابن زیاد نے حکم دیا کہ ان کی گردن اڑا دو۔ چنانچہ ان کو شہید کر دیا گیا اور مقام سبخہ پر لاش کو سولی پر لٹکوا دیا

گیا۔[۱] اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سر مقدس کا کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جانا

اس کے بعد حکم دیا کہ سید الشہداء کا سر مقدس نوک سنان پر سوار کر کے کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔[۲] اس کے بعد دار الامارہ کے دروازہ پر نصب کر دیا گیا۔[۳] کوفہ میں جناب مسلم کے سر کے بعد یہ دوسرا سر مقدس تھا جسے نصب کیا گیا تھا۔[۴] بروایتے تمام شہداء کے سرہائے مقدسہ کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا (لواعج الاشجان ص ۱۷۰) بعض اہل تاریخ کا خیال ہے کہ ھو اول راس حمل فی الاسلام. آں جناب کا سر مقدس پہلا سر ہے جسے نوک سنان پر بلند کر کے پھرایا گیا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ سب سے پہلے جناب عمرو بن الحمق خزاعی کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔[۵] (جو کہ جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کے مخلص صحابی تھے اور معاویہ نے انہیں شہید کرایا تھا)۔

سر اقدس کا بازار کوفہ میں تلاوت قرآن کرنا

زید بن ارقمؓ بیان کرتے ہیں کہ جب امام حسینؑ کے سر مقدس کو کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جا رہا تھا اس وقت میں اپنے بالائی غرفہ میں بیٹھا تھا۔ جب سر مبارک میرے بالمقابل پہنچا تو میں نے اسے یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ بخدا یہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں نے پکار کر کہا: ﴿راسک یا بن رسول اللہ! اعجب و اعجب!﴾ اے فرزند رسول! تیرے سر کا معاملہ ان سے زیادہ عجیب ہے۔[۶]

۱۔ نفس المہموم ص ۲۲۰۔ لہوف ص ۱۵۰۔ مقتل الحسین للمقرم ص ۳۹۸۔ دمعۂ ساکبہ ص ۲۲۱۔ لواعج الاشجان ص ۱۷۰ وغیرہ۔

۲۔ تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۲۹۸۔ نفس المہموم ص ۲۱۳۔ ارشاد ص ۲۶۷۔ لہوف ص ۱۳۵۔ تظلم الزہراء ص ۲۵۳، اور دمعۂ ساکبہ ص ۲۲۲ وغیرہ۔

۳۔ نفس المہموم ص ۲۱۶۔ لواعج الاشجان ص ۱۷۰۔

۴۔ نفس المہموم ص ۲۱۶۔

۵۔ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۳۹۸۔

۶۔ دمعۂ ساکبہ ص ۲۲۲۔ ارشاد ص ۲۶۸۔ تظلم الزہراء ص ۲۵۳۔ خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۲۵۔

تبصرہ:۔ مقتل الحسین للمقرم ص ۲۰۲، ۲۰۳ تا متعدد مقامات پر مختلف عناوین کے تحت سید الشہداءؑ کے سر اقدس کے کلام کرنے کے واقعات ذکر کئے ہیں اور اس میں کسی قسم کے تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ جو خدائے قدیر کوہ طور پر ایک درخت میں کلام پیدا کر سکتا ہے جو بروز قیامت انسانی اعضاء و جوارح کو قوت گویائی عطا فرما سکتا ہے کیا وہ قادر مطلق امام حسینؑ کے سر کو باعجاز امامت گویا نہیں کر سکتا؟ تاکہ حیات انسانی شہداء کا عملی مظاہرہ ہو جائے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متواتر حدیث ثقلین ﴿اِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلَ بَيْتِیْ﴾ کی صداقت و حقانیت کی تصدیق ہو جائے۔ نیز تاکہ مقصد حسینؑ یعنی لوگوں کو خواب غفلت سے جگانے اور اسلام کو زندہ جاوید بنانے کی تکمیل بھی ہو جائے؟ یقیناً یہ امر قدرت خدا سے کچھ بعید نہیں حالانکہ شجر و طور یا انسانی اعضاء کو سید الشہداءؑ کے سر اقدس کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ (منہ عفی عنہ)

بعض کتب میں مذکور ہے کہ جب اسیران آل محمدؑ ابن زیاد کے قید خانہ میں تھے۔ تو ایک روز کسی نے قید خانہ میں ایک پتھر پھینکا جس کے ساتھ ایک تحریر بندھی ہوئی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ تمہارے متعلق قاصد فلاں روز یزید کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ فلاں دن تک وہاں پہنچے گا اور فلاں روز تک واپس آئے گا۔ پس اگر اس دن تکبیر کی آواز سنو تو اپنے قتل کا یقین کر لینا اور اگر تکبیر کی آواز نہ آئے تو اسے امان کی علامت سمجھنا۔ چنانچہ مقررہ تاریخ کو تکبیر کی آواز بلند نہ ہوئی۔[1]

شہادت سید الشہداءؑ کی مدینہ میں اطلاع

ان امور سے فارغ ہو کر بنا بر مشہور ابن زیاد نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک سبک رفتار قاصد کو شہادت حسینؑ کی بشارت پر مشتمل خط دے کر شام یزید کی طرف روانہ کیا اور اسیران آل محمدؐ کے متعلق اس کی رائے دریافت کی مگر ابی مخنف کے مقتل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن زیاد نے یزید کے پاس کوئی قاصد نہیں بھیجا بلکہ خود بخود اسیران اہل بیت کو شام بھیج دیا، اور دوسرا قاصد (عبد الملک بن الحارث السلمی کو) حاکم مدینہ عمرو بن سعید الاشدق اموی کے پاس بھیجا اور اسے تاکید کی کہ اس قدر جلدی مدینہ پہنچے کہ اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے اس سے پہلے یہ خبر مدینہ نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ عبد الملک تیز رفتار شتر پر سوار ہو کر جلد منازل سفر طے کرتا ہوا مدینہ پہنچا۔ حاکم کے پاس پہنچنے سے پہلے اسے قریش کا ایک آدمی ملا۔ اس نے اسے اس قدر شتابی کرتے ہوئے دیکھ کر دریافت کیا کہ کہاں سے آرہے ہو۔ اور کیا نئی خبر لا رہے ہو؟ عبد الملک نے کہا: خبر حاکم مدینہ کے پاس آکر معلوم کرو۔ چنانچہ قاصد نے جا کر ابن سعید کو شہادت حسینؑ کی خبر سنائی۔ عمرو یہ خبر سن کر بہت خوش و خرم ہوا۔ پھر منادی کو حکم دیا کہ مدینہ کے گلی کوچوں میں شہادت حسینؑ کا اعلان کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس خبر دہشت اثر کے سننے سے خواتین بنی ہاشم کے ہاں گریہ و بکاء کا کہرام بپا ہوا بلکہ مدینہ کے تمام مردوں اور عورتوں نے اس قدر شور و شین کی صدا بلند کی کہ اس سے پہلے ایسا نالہ و شیون نہ کسی کان نے سنا تھا اور نہ کسی آنکھ نے دیکھا تھا۔ جب عمرو کے کانوں میں بنی ہاشم کی خواتین کی صدائے گریہ پڑی تو ہنستے ہوئے عمرو بن معدیکرب کا یہ شعر پڑھا ؎

عجت نساء بنی زیاد عجۃً كعجيج نسوتنا غداۃ الارنب

بنی زیاد نے اسی طرح آواز گریہ بلند کی جس طرح ہماری عورتوں نے واقعہ ارنب کی صبح بلند کی تھی۔ (جو بنی زیاد کے ہاتھوں درپیش آیا تھا) پھر کہا: ﴿ھذہ واعیۃ بواعیۃ عثمان﴾ یہ گریہ و بکاء عثمان پر ہونے والے گریہ و بکاء کا عوض ہے۔[2]

---

[1] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۶۶۔ تاریخ کامل، ج ۳، ص ۲۹۸۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۹۵۔ [2] طبری، ج ۶، ص ۲۶۸۔

بعدازاں قبر رسولؐ کی طرف متوجہ ہو کر یہ کفریہ کلمہ کہا: ﴿یوم بیوم بدر یا رسول اللّٰہ!﴾ یارسول اللہ! یہ دن بدر والے دن کا بدلہ ہے! جن بعض انصار نے اس سے یہ کافرانہ جملہ سنا انہوں نے اسے ناپسند کیا۔[1] پھر لوگوں کے اجتماع میں گیا اور یہ خطبہ دیا جو کہ کذب وافترا کا پلندہ ہے۔ ﴿ایها الناس لدمة بلدمة و صدمة بصدمة کم خطبة بعد خطبة و موعظة بعد موعظة حکمة بالغة فما تغنی النذر (واللّٰه لوددت ان رأسه فی بدنه و روحه فی جسده احیانا) کان یسبنا و نمدحه و یقطعنا و نصله کعادتنا و عادته ولم یکن من امره ما کان ولکن کیف نصنع بمن سلّ سیفه یرید قتلنا الا ان ندفعه من انفسنا﴾ ایها الناس! یہ ضرب کے عوض ضرب اور صدمہ کے بدلے صدمہ ہے! کس قدر خطبے اور موعظے گوش گذار ہوتے ہیں اور کس قدر خدا کی حکمت بالغہ ہے مگر یہ چیزیں فائدہ نہیں دیتیں۔ بخدا میں تو اس بات کو پسند کرتا تھا کہ ان (امام حسینؑ) کا سران کے بدن کے ساتھ رہتا اور روح جسم میں رہتی۔ جب وہ ہمیں گالیاں دیتے اور ہم ان کی مدح کرتے تھے، وہ قطع رحمی کرتے اور ہم صلہ رحمی کرتے تھے جس طرح کہ ان کی اور ہماری عادت تھی مگر کیا کرتے جب انہوں نے تلوار کھینچ کر ہم کو قتل کرنا چاہا تو اب بجز اپنے دفاع کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔[2]

عبداللہ بن السائب یہ خطبہ سن کر اٹھا اور عمرو سے کہا: ﴿لو کانت فاطمة حیة فرأت رأس الحسینؑ لبکت عینها و حرت کبدها﴾ اگر اس وقت فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) زندہ ہوتیں اور اپنے فرزند حسینؑ کا سر اس حال میں دیکھتیں تو وہ یقیناً روتیں۔ عمرو نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا: ہم تجھ سے زیادہ فاطمہؑ کے قریب ہیں۔ ان کا والد ہمارا چچا ان کا شوہر ہمارا بھائی۔ ان کا بیٹا ہمارا بیٹا ہے اگر وہ زندہ ہوتیں تو روتیں ضرور مگر جس نے حسینؑ کو اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کیا ہے اس کی ملامت نہ کرتیں۔[3] مخفی نہ رہے کہ بعض کتب میں مذکور ہے کہ سب سے پہلے مدینہ میں یزید عنید نے اطلاع بھجوائی تھی۔ اور پھر عمرو بن سعید نے یہ کاروائی کی تھی مگر مشہور یہی ہے کہ اسے ابن زیاد بدنہاد نے اطلاع دی تھی۔

جناب اسماء بنت عقیل کچھ دوسری خواتین بنی ہاشم کے ہمراہ قبر رسولؐ پر گئیں اور قبر مقدس کے ساتھ لپٹ کر اور دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ پھر مہاجرین و انصار کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا

ماذا تقولون ان قال النبی لکم	یوم الحساب وصدق القول مسموع
خذلتموا عترتی او کنتم غیباً	والحق عند ولی الامر مجموع
اسلمتموهم بایدی الظالمین فما	منکم له الیوم عند اللّٰه مشفوع

[1] نفس المہموم، ص ۳۲۲۔ [2] تاریخ، ج ۶، ص ۲۲۰ وغیرہ۔ [3] تاریخ، مقتل العوالم، ص ۱۳۱۔

ما کان عند غداة الطف اذ حضروا — تلک المنا یا و لا عنهن مدفوع

ان اشعار غم شعار نے تمام حاضرین کو رلا دیا اور ایک کہرام بپا ہوگیا۔[1] جب جناب ام سلمہؓ کو اطلاع ملی تو وہ اس قدر روئیں کہ ان پر غشی طاری ہوگئی افاقہ آنے کے بعد کہا: ﴿فعلوها ملأ الله قبورهم ناراً﴾ کیا یہ لوگ یہ اقدام کر گذرے ہیں؟ خدا ان کی قبروں کو آتش جہنم سے پر کرے۔[2]

جناب ام البنین نے تو حسین علیہ السلام کے لئے باقاعدہ تعزیت کا اہتمام کیا تھا۔ بنی ہاشم کی مستورات وہاں جمع ہو کر امامؑ پر گریہ و بکا کرتی تھیں۔[3]

کچھ لوگ عبداللہ بن جعفر طیار کے پاس تعزیت پیش کرنے کے لئے گئے۔ ان کے ملازم ابوالسلاس نے کہا ہمیں یہ جو کچھ صدمہ پہنچا (عبداللہ کے دو بیٹے مارے گئے) یہ سب حسینؑ کی وجہ سے ہوا۔ یہ سنتے ہی عبداللہ نے اسے جوتا مار کر خاموش کیا۔ اور کہا: ﴿یا بن اللخناء! اللحسین تقول هذا؟﴾ اے فاحشہ کے بیٹے! کیا تم حسینؑ کے متعلق ایسی بات کرتے ہو؟ پھر کہا: ﴿والله لو شهدته لأحببت ان لا افارقه حتی اقتل معه والله انه لمما یسخی بنفسی عنهما و یهوّن علیّ المصائب بهما انهما اصیبا مع اخی و ابن عمی مواسیین له صابرین معه﴾ بخدا اگر میں ان کے پاس موجود ہوتا تو یقیناً اس بات کو پسند کرتا کہ ان سے علیحدہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ شہید ہو جاؤں۔ بخدا جو چیز میرے بیٹوں کی مصیبت کو مجھ پر آسان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ میرے بھائی اور ابن عم (امام حسینؑ) کی نصرت و ہمدردی میں شہید ہوئے ہیں۔

پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ﴿الحمد لله عز علی بمصرع الحسین ان لا یکن آست حسیناً یدی فقد اساه ولدی﴾ مجھ پر حسینؑ کی شہادت کا صدمہ بہت شاق ہے اگر میں بذات خود ان پر اپنی جان نثار نہیں کر سکا تو میرے بیٹوں نے تو اپنی جانیں قربان کی ہیں۔[4] جس روز عمرو بن سعید نے خطبہ دیا اور یہ سب کاروائی ہوئی اسی رات اہل مدینہ کسی منادی کو یہ ندا دیتے ہوئے سنتے تھے مگر کوئی منادی دکھائی نہیں دیتا تھا

ایها القاتلون جهلاً حسیناً — ابشروا بالعذاب و التنکیل

کل اهل السماء یدعو علیکم — من نبی و ملک و قبیل

قد لعنتم علی لسان داؤد — و موسی و حامل الانجیل[5]

---

1. امالی ابن الشیخ الطوسی، ص ۵۵۔
2. نفس المہموم، ص ۳۳۳ بحوالہ طبقات ابن سعد۔
3. مقتل الحسین، ص ۳۰۰۔
4. طبری، ج ۶، ص ۲۶۸۔ مقتل الحسین، ص ۳۰۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۷۲۔
5. طبری، ج ۶، ص ۲۶۹۔ لواعج الاشجان، ص ۱۷۳۔

چھبیسواں باب

اسیرانِ آلِ محمد علیہم السلام کی روانگی بجانب شام
اور
منازل سفر کے حالات وواقعات

پہلا امر:۔ اصل مقصد میں وارد ہونے سے قبل یہاں چند امور کی تنقیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

آلِ محمدؑ کا قافلہ کب کوفہ سے روانہ ہوا اور کب شام پہنچا؟

سابقہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بنا بریں مشہور ابن زیاد نے شہادت حسینؑ کی اطلاع یزید کو بھجوائی اور اسیران اہل بیتؑ کی بابت اس کی رائے معلوم کی تھی اور یزید نے اسے حکم دیا تھا کہ شہداء کے سروں اور اسیران اہل بیتؑ کو شام بھیج دو۔ چنانچہ ابن زیاد نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن تنقیح طلب بات یہ ہے کہ اسیران اہل بیتؑ کس تاریخ کو دارالسلطنت شام پہنچے؟ تقریباً تمام کتب تواریخ ومقاتل ان تاریخوں کے تعین کے سلسلہ میں خاموش ہیں اور کوئی ایسی قابل اطمینان روایت نہیں ملتی جس کی بناء پر کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ تاریخ طبری، کامل، ارشاد، ملہوف، حاشر بحار، دمعہ ساکبہ، لمقام اور ناسخ وغیرہ سب موجود ہیں مگر سب خاموش۔

ہاں لمقام (ص ۳۳۹ پر) تذکرۃ الخواص سے یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اسیران اہل بیتؑ کا قافلہ ۱۵ محرم ۶۱ھ کو کوفہ سے روانہ ہوا اور صاحب تحفہ وقائع ایام محرم نے بھی (ص ۲۸۱ پر) اسی خیال کا اظہار کیا ہے! اور شام پہنچنے کے متعلق صاحب نفس المہموم نے (ص ۲۲۹ پر) اور صاحب مقتل الحسینؑ نے (ص ۳۳۵ پر) یہ لکھا ہے[1] کہ ”یکم صفر (سنہ ۶۱ ہجری) کو یہ قافلہ وارد شام ہوا۔“

ایک ایراد اور اس کا جواب

اس تاریخ روانگی پر جو کھلا ہوا اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب اس زمانہ کے رسل ورسائل اور ذرائع آمد ورفت کو دیکھا جاتا ہے تو یہ بات کسی طرح بھی باور نہیں کی جا سکتی کہ اسیران آل محمدؑ ۱۲ یا ۱۳ محرم کو دربار ابن زیاد میں پیش ہوں اور اسی اثنا میں وہ شام قاصد بھیجے اور ۱۵ دن تک حکم اسیری آ جائے اور پھر روانگی بھی عمل میں آ جائے؟

---

[1] صاحب مقتل الحسینؑ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کامل بہائی، الآثار الباقیہ للبیرونی، مصباح کفعمی ص ۲۶۹ اور تقویم المحسنین ملا محسن فیض ص ۱۵ پر بھی دمشق پہنچنے کی یہی تاریخ لکھی ہے (ص ۳۶۵) (منہ عفی عنہ)

اگر ان تاریخوں کو درست تسلیم کیا جائے تو کئی طرح اس ایراد کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اولاً: ممکن ہے کہ ابن زیاد نے کوئی قاصد بھیج کر یزید سے اس بارے میں استصواب کیا ہی نہ ہو جیسا کہ ابی مخنف کا بیان ہے، بلکہ اس نے یہ تمام کارروائی اپنی صوابدید سے کی ہو۔

ثانیاً: چونکہ گیارہ محرم کی شام تک ابن زیاد کو شہادت امام کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے ممکن ہے کہ اس نے اسی شب کو کسی ہشیار قاصد کو سبک رفتار گھوڑا دے کر شام روانہ کر دیا ہو جس نے ہفتوں کی مسافت دنوں اور دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کر لی ہو اور پندرہ محرم تک واپس آ گیا ہو۔

ثالثاً: عین ممکن ہے کہ نامہ دے کر جو قاصد بھیجا گیا تھا وہ کوئی آدمی نہ ہو بلکہ کوئی سدھایا ہوا پرندہ ہو جیسا کہ صاحب مقتل الحسینؑ نے ص ۲۱۵ پر اس احتمال کا اظہار کیا ہے اور صاحب تتمہ وقائع ایام محرم نے بھی ص ۲۷۲ پر اسی نظریہ کو اختیار کیا ہے اور پھر (ص ۲۷۳ سے لے کر ص ۲۸۱ سطر اول تک) تاریخی شواہد و قرائن سے یہ بات ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ قدیم زمانہ میں موصل، مصر، شام، قسطنطنیہ، کوفہ، بغداد اور مدینہ وغیرہ جیسے بڑے بڑے ملکوں اور شہروں میں اسی طریق کار کا رواج تھا۔ بنابریں ان تاریخی شواہد کے پیش نظر یہ جواب بعید از عقل نہیں ہے۔ و اللہ العالم بحقائق الامور۔

امر دوم:۔ کوفہ سے شام تک منازل سفر کی تعیین و تحقیق

یہ امر بھی تنقیح طلب ہے کہ اسرائے اہل بیتؑ کا قافلہ کس راستہ سے کون کون سے اور کس قدر منازل طے کر کے دمشق پہنچا اور ان منازل کی ترتیب کیا تھی؟ اس سلسلہ میں بھی تاریخ اور مقاتل کی کتب معتبرہ بالکل خاموش نظر آتی ہیں، چنانچہ وہ کتب جن کے نام اوپر امر اول کے ضمن میں ذکر کئے گئے ہیں وہ تمام اس معاملہ میں بھی کوئی رہنمائی نہیں کرتیں بلکہ علماء سیر و مقاتل نے اقرار و اعتراف کیا ہے کہ انہیں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں ہے، چنانچہ محدث قمی نفس المہموم (ص ۲۲۷ پر) لکھتے ہیں: ﴿اعلم ان ترتیب المنازل التی نزلوها فی کل مرحلة باتوا بها ام عبروا منها غیر معلوم ولا مذکور فی شیء من الکتب المعتبرة بل لیس فی اکثرها کیفیة مسافرة اهل البیت الی شام نعم وقع بعض القضایا فی بعضها نحن نشیر الیها فی هذا الکتاب انشاء اللہ تعالیٰ﴾۔

جاننا چاہئے کہ ان منازل کی ترتیب و تفصیل کہ جن میں اسیران اہل بیتؑ نے رات گزاری تھی یا صرف عبور کیا تھا، معلوم نہیں ہے اور نہ کتب معتبرہ میں سے کسی کتاب میں اس بات کا کوئی تذکرہ ہے بلکہ اکثر کتب میں تو اہل بیتؑ کے سفر شام کی کیفیت میں ہی مذکور نہیں ہے کہ کس طرح سفر کیا، ہاں البتہ بعض منازل میں بعض واقعات در پیش

آ ئے ، ہم اس کتاب میں ان کا تذکرہ کریں گے ۔ انشاء اللہ ۔

ایسا ہی قمقام ، زخار وصمصام بتار ، ص ۳۶۱ پر افادہ فرمایا گیا ہے کہ :

ھر چند ھیچ یك از مؤرخین و محدثین فریقین شرح منازل عرض راہ را ۔ کوفہ تا ب سام شدادہ اند ولیکن چون حسن بن علی الطبرسی در کتاب کامل بھائی کہ بنام بھاء الدین محمد بن شمس الدین جوینی صاحب دیوان تالیف کردہ ذکر بعضے از آنھا را نمودہ ودرمقتل ابی مخنف ھر یك را مرتباً نوشتہ است شرح آن در این کتاب بیاوریم ۔ اگرچہ این روایت خالی از اشکال وترتیب منازل بیرون از تشویش نیست ﴾ (ترجمہ) اگرچہ شیعہ وسنی مورخین ومحدثین میں سے کسی نے بھی کوفہ سے شام تک درمیانی منازل کی تشریح نہیں کی لیکن چونکہ حسن بن علی الطبرسی نے اپنی کتاب کامل میں جسے انہوں نے بہاء الدین محمد بن شمس الدین جوینی کے نام پر تالیف کیا ہے بعض منازل کا تذکرہ کیا ہے اور مقتل ابی مخنف میں ان منازل کا بالترتیب تذکرہ موجود ہے اس لئے ہم انہی دو کتابوں سے یہاں ان منازل کا تذکرہ کرتے ہیں ، اگرچہ یہ روایت منازل خالی از اشکال اور ترتیب خالی از تشویش واضطراب نہیں ہے ۔

اسی طرح صاحب تتمہ وقائع ایام محرم ص ۲۸۳ پر لکھتے ہیں ﴿ چون ترتیب منازل معلوم و مضبوط نیست فقیر احوال آن مراحل مذکور میدارم کہ در آنھا تفصیلے واقع شدہ بدون مراعات ترتیب ﴾ چونکہ ان منازل ومراحل کی ترتیب معلوم ومضبوط نہیں ہے اس لئے میں ترتیب کی رعایت کے بغیر صرف ان بعض منازل کا ذکر کروں گا جن میں کوئی تفصیلی واقعہ رونما ہوا ہے اس کے بعد کے چندرہ منزل کا تذکرہ کیا ہے ۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل ام نشرح ہو جاتی ہے کہ کتب معتبرہ ان منازل کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور ان سے ان منازل کے متعلق کچھ معلومات فراہم نہیں ہو سکتے ۔ جن بعض کتب میں بعض منازل مذکور ہیں ان کا اعتماد بھی مقتل ابی مخنف پر ہے اور بدقسمتی سے مقتل ابی مخنف کا وہ نسخہ جو مطبوع وموجود ہے بنا بر تصریح علماء محققین محرف ومبدل اور بالکل ناقابل اعتماد ہے ، بالخصوص ان امور میں جن کے ذکر کرنے میں وہ متفرد ہو ۔

تفصیلی حالات معلوم کرنے کے شائقین محدث نوری مرحوم کی کتاب ''لؤ لؤ و مرجان'' کی طرف رجوع کریں جو عام مومنین کے لئے بالعموم اور اہل منبر حضرات کے لئے بالخصوص حرز جان بنانے کے قابل ہے ۔ اس وقت مقتل ابی مخنف کا مطبوعہ نجف اشرف نسخہ ہمارے پیش نظر ہے ۔ اس کے ص ۱۱۴ تا ص ۱۲۰ پر بایں ترتیب تیس منازل سفر کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام ہم یہاں محض تبرۃً درج کرتے ہیں ۔ و ھی ھذہ ۔

۱ ۔ منزل اول ۔ تکریت ۔ ۲ ۔ منزل دوم ۔ اعمیٰ ۔ ۳ ۔ منزل سوم ۔ دیر عروہ

۴۔منزل چہارم۔صلیثا　۵۔منزل پنجم۔وادی النخلہ　۶۔منزل ششم۔ارینباہ

۷۔منزل ہفتم۔ لینا　۸۔ منزل ہشتم۔کحیل　۹۔منزل نہم۔جہینیہ

۱۰۔منزل دہم۔تل باعفر　۱۱۔ منزل یازدہم۔جبل سنجار　۱۲۔منزل دوازدہم۔نصیبین

۱۳۔منزل سیزدہم۔عین الورد　۱۴۔منزل چہاردہم۔قنسرین　۱۵۔منزل پانزدہم۔معرۃ النعمان

۱۶۔منزل شانزدہم۔شیرد　۱۷۔ منزل ہفدہم۔کفرطاب　۱۸۔منزل ہیجدہم۔سیبور

۱۹۔منزل نوزدہم۔حما　۲۰۔منزل بستم۔حمص　۲۱۔منزل بیست ویکم۔کنیسہ قسمین

۲۲۔منزل بیست ودوم۔بعلبک　۲۳۔منزل بیست وسوم۔صومعہ راہب۔

<u>وہ پندرہ منازل جن کا تذکرہ بلالحاظ ترتیب صاحب تمتہ وقائع ایام محرم نے (ص۲۸۴ الغایت ص۳۰۸) کیا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ان کے نام یہ ہیں:۔</u>

۱۔منزل اول۔تکریت　۲۔منزل دوم۔موصل　۳۔منزل سوم۔حران

۴۔منزل چہارم۔دعوات　۵۔منزل پنجم۔قنسرین　۶۔منزل ششم۔سیبور

۷۔منزل ہفتم۔حمص　۸۔منزل ہشتم۔بعلبک　۹۔منزل نہم۔قصر بنی مقاتل

۱۰۔منزل دہم۔حماۃ　۱۱۔منزل یازدہم۔حلب　۱۲۔منزل دوازدہم۔نصیبین

۱۳۔منزل سیزدہم۔عسقلان　۱۴۔منزل چہاردہم۔دیر قسمین　۱۵۔منزل پانزدہم۔دیر راہب

نوٹ۔ مخفی نہ رہے کہ جن حضرات نے ان منازل کا تذکرہ کیا ہے ان کے بیان سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس قافلہ نے ضرور ان مقامات پر رات گزاری ہے یا کچھ دیر قیام کیا ہے بلکہ جہاں سے اس لٹے ہوئے قافلے نے عبور و مرور بھی کیا ہے اس مقام کو بھی منازل سفر شمار کر دیا گیا ہے، جیسا کہ ان کتب کے ناظرین پر روشن ہے۔فتدبر۔

امر سوم:۔کیا صرف مخدرات عصمت کو شام لے جایا گیا یا دوسری مستورات بھی ہمراہ تھیں؟

کوفہ سے جو اسیروں کا قافلہ شام کی طرف روانہ کیا گیا ان میں صرف بنی ہاشم کی مخدرات عصمت وطہارت تھیں یا دوسری وہ بعض خواتین بھی شامل تھیں جو کربلا سے قید ہو کر اسیران اہل بیتؑ کے ساتھ کوفہ لائی گئی تھیں؟ عام کتب تواریخ ومقاتل میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں ملتی۔البتہ بعض کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار حسینؑ کی مستورات کو ان کے خاندان والوں نے سفارشیں کر کے کوفہ میں رہا کرا لیا تھا۔اب شام جو قافلہ بھیجا گیا اس میں بنی

ہاشم کی مخدرات (یا ان کی بعض کنیزیں) ہی تھیں۔ چنانچہ فاضل سماوی کی ابصار العین کے خاتمہ میں لکھا ہے: ﴿بقیت عیالات غیر الطالبین من انصار الحسین علیہ السلام بالکوفۃ و ذالک لانھن حین الوصول الی الکوفۃ شفع فیھن ذو قرباھن من القبائل عند ابن زیاد فاخذ ھن من السبی و سبیت الطالبیات الی الشام﴾ یعنی بنی ہاشم کے علاوہ دوسرے انصار حسینؑ کے اہل وعیال کوفہ میں رہ گئے کیونکہ کوفہ پہنچنے کے بعد ان کے رشتہ دار قبائل نے ابن زیاد کے پاس سفارش کر کے ان کو قید و بند سے آزاد کرالیا تھا۔ اس لئے صرف بنی ہاشم کی مستورات ہی قید ہو کر شام گئیں۔ (ص ۱۵۹)

آہ! آج دوسری تمام عورتوں کے سفارشی تو پیدا ہو گئے مگر وہ پردگیان عصمت و طہارت جن کے اب وجد پورے عالمین کے شفیع و سفارشی ہیں ان کی سفارش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کو اس طرح بیدردی کے ساتھ قید کر کے دیار و امصار میں پھروایا گیا جس طرح ترک و دیلم کے قیدیوں کی دیار و امصار میں تشہیر کی جاتی ہے۔

کس منہ سے یہ لوگ شفیع العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے؟ عمر بن عبدالعزیز کہا کرتا تھا۔ اگر میں قاتلان حسینؑ میں شامل ہوتا اور پھر بفرض محال خدا مجھے بھی بخش دیتا تو تب بھی جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرم وحیا کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوتا۔[1]

ویل لمن شفعائہ خصمائہ والصور فی یوم القیامۃ ینفخ

صاحب تمہ وقائع ایام محرم نے بھی (ص ۲۸۱ پر) ایسا ہی افادہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں: ﴿مخفی مباد کہ از اسراء غیر طالبیات و نساء غیر ہاشمیات کسے را با اھل بیتؑ دیلم و خزرا سیر کردہ بجانب شام بردہ اند﴾۔ ﴿فعلی الحسین و اھل بیتہ فلیبک الباکون و علیہ فلیندب النادبون و لیصرخ الصارخون﴾۔

سرہائے شہداء اور اسیران خانوادہ مصطفیٰ کی شام کی طرف روانگی

جب ابن زیاد کے پاس حاکم شام کا حکم نامہ پہنچ گیا کہ سرہائے شہداء اور اسیران اہل بیتؑ کو اس کے پاس شام بھیج دے تو ابن زیاد نے زجر بن قیس کی نگرانی میں شہداء کے سرہائے مقدس شام روانہ کر دیے اور اس کے ہمراہ ابو بردہ بن عوف ازدی، طارق بن ظبیان وغیرہ پچاس آدمی کر دیئے۔[2]

---

[1] تمقام، ص ۴۵۷، بحوالہ تاریخ ابن خلکان۔

[2] تمہ ایام محرم، ص ۲۸۳۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۲۶۔ مگر منتخب طریحی میں ان کی تعداد ایک ہزار اور مقتل ابی مخنف میں ڈیڑھ ہزار لکھی ہے جو بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ (منہ عفی عنہ)

اور ان کی روانگی کے بعد اسی روز اسیران آل محمدؐ کو مخضر بن ثعلبہ عائذی اور شمر بن ذی الجوشن کی نگرانی میں ایک جماعت کثیرہ کے ہمراہ روانہ کر دیا[1] جو بعض منازل پر جا کر پہلی جماعت کے ساتھ شامل ہو گئے۔[2]

اسیری کی کیفیت

اسیروں کی کیفیت یہ تھی کہ امام بیمارؑ کے گلے میں طوق تھا۔[3] اور بعض روایات کے مطابق ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھی تھیں۔[4] بروایتے ہاتھ پشت گردن باندھے ہوئے تھے۔[5] اور پاؤں شکم شتر کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔[6] اور مخدرات اس طرح بے کجاوہ اونٹوں پر بے مقنع و چادر سوار تھیں کہ تمام لوگ ان کا نظارہ کر سکتے تھے۔[7]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام بیان کرتے تھے کہ مجھے ایک ایسے بے پالان اونٹ پر سوار کیا گیا تھا جو لنگڑا تا تھا۔ آگے بابا کا سر مبارک نیزہ پر [illegible] تھا، پیچھے پیچھے مخدرات تھیں۔ اگر ہم میں سے کسی کی آنکھ سے آنسو نکل آتا تھا تو نیزوں کی انیوں سے اس کی سرکوبی کی جاتی تھی۔ جب شام کے قریب پہنچے تو کسی نے آواز بلند کی۔ ھولاء سبایا اھل البیت الملعون۔[8]

سفر شام میں امام کی خاموشی

انہی حالات وواقعات سے متاثر ہو کر امام بیمارؑ نے بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ کوفہ سے شام تک امام بیمارؑ نے کسی اشقیا سے کوئی بات نہیں کی۔ ﴿فلم یکلمھم علی بن الحسینؑ فی الطریق حتیٰ بلغوا الشام﴾[9]

شریکۃ الحسینؑ کی شان عبادت

ایسے ہوش ربا مصائب وشدائد اور نامساعد حالات میں بھی ثانی زہراؑ کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ واجبی نماز تو بجائے خود، کبھی نماز تہجد بھی قضا نہیں ہوئی۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ ﴿ان عمتی زینب مع تلک المصائب والمحن النازلۃ بھا فی طریقنا الی الشام ما ترکت نوافلھا اللیلیۃ﴾ میری پھوپھی اماں زینب نے باوجود ان مصائب وشدائد کے جو ہمیں شام کے راستہ میں درپیش آئے کبھی اپنے نوافل

---

1. طبری، ج ۶، ص ۲۶۴۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۸۔
2. نفس المہموم، ص ۲۲۵۔ ارشاد، ص ۲۹۸۔ ناسخ، ج ۳، ص ۳۲۶ پر لکھا ہے کہ پہلی منزل پر ملحق ہو گئے۔
3. تاریخ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۹۸۔ تاریخ قرمانی، ص ۱۰۸۔ مقتل الحسینؑ، ص ۳۱۰۔ ارشاد ۲۹۸ وغیرہ۔
4. تاریخ کامل، ج ۳، ص ۲۹۸۔
5. تاریخ قرمانی، ص ۱۰۸، تقام، ص ۳۵۸۔
6. تتمہ وقائع ایام محرم، ص
7. تتمہ وقائع ایام محرم، ص ۲۸۲۔ تقام، ص ۲۵۸۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۲۶۔
8. تظلم الزہراء، ص ۲۶۰۔ عاشر بحار، ص ۲۳۱۔
9. کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۹۰۔ نفس المہموم، ص ۲۲۵۔

شب ترک نہیں کیے۔[1]

ثانی زہراؑ کی یہی عبادت واطاعت ہی تو تھی جس کی بناء پر جناب سیدالشہداءؑ نے ان کو وصیت کی تھی: ﴿یَا اُخْتَاهُ لَا تَنْسِیْنِیْ فِیْ نَافِلَةِ اللَّیْلِ﴾ بہن زینب! مجھے نمازِ شب میں دعائے خیر سے فراموش نہ کرنا۔[2] خداوند عالم تمام خواتین اسلام کو اس مخدرہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبی و آلہ الطاہرین۔

سفر شام کے بعض واقعات اور ظہور کرامات

بعض کتب مقاتل سے مستفاد ہوتا ہے کہ اس سفر میں کئی کرامات کا ظہور ہوا اور کئی سانحات درپیش آئے۔ ہم بطور تبرک یہاں ان میں سے بعض کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ

ابن یسعد بیان کرتے ہیں کہ میں طواف بیت اللہ کر رہا تھا کہ اس اثنا میں ایک شخص کو استار کعبہ سے لپٹ کر یہ فریاد کرتے ہوئے سنا: ﴿اللّٰھم اغفرلی وما اراک فاعلاً﴾ یا اللہ! مجھے بخش دے لیکن میرا خیال ہے کہ تو ایسا کرے گا نہیں۔ میں نے اس سے کہا: ﴿یا عبد اللّٰہ! اتق اللّٰہ ولا تقل مثل ذالک فان ذنوبک لو کانت مثل قطر الامطار وورق الاشجار فاستغفرت اللّٰہ غفرھا لک وانہ غفور رحیم﴾ او اللہ کے بندے! ایسا نہ کہہ، کیونکہ خداوند غفور رحیم ہے کہ اگر تیرے گناہ قطرات باران، و برگہائے درختاں کے برابر بھی ہوں اور تو اس سے بخشش طلب کرے تو وہ ضرور بخش دے گا۔ میرا کلام سن کر اس شخص نے کہا۔ میرے پاس آ تا کہ میں تجھے اپنا قصہ سناؤں۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا۔ اس نے کہا۔ میں ان پچاس آدمیوں میں سے ایک تھا جو سفر شام میں امام حسینؑ کے سر کے ساتھ گئے تھے۔ ہمارا یہ معمول تھا کہ جب رات ہو جاتی تھی تو ہم فرق مقدس کو ایک صندوق میں بند کر دیتے تھے اور اس کے اردگرد بیٹھ کر شراب کا دور چلاتے تھے۔ چنانچہ ایک رات میرے ساتھیوں نے حسب معمول شراب پی اور نشہ میں مخمور ہو گئے، لیکن میں نے نہ پی۔ جب رات کی تاریکی خوب چھا گئی تو میں نے اچانک رعد و برق کے گرجنے چمکنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی دربائے آسمان کھل گئے اور جناب آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ اور ہمارے پیغمبر اکرمؐ نیچے اترے اور ان کے ساتھ جبرائیلؑ اور بہت سے ملائکہ تھے۔ جبرائیلؑ نے صندوق کے قریب جا کر سر امام کو باہر نکالا، سینہ سے لگایا اور بوسہ دیا۔ پھر تمام حاضر انبیاءؑ نے یکے بعد دیگرے ایسا ہی کیا اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نواسہ کا سر مبارک دیکھ کر روئے۔ انبیاءؑ نے تعزیت پیش کی۔ پھر جبرائیلؑ نے خدمت

---

[1] رسالہ زینب کبریٰ، شیخ النجف، ص ۸۳۔

[2] حوالہ مذکورہ بالا۔

رسولؐ میں عرض کیا: ﴿یا محمدا! ان اللہ تبارک و تعالٰی امرنی ان اطیعک فی امتک فان امرتنی زلزلت بھم الارض و جعلت عالیھاسافلھا کما فعلت بقوم لوطا﴾ یا محمدؐ! خداوند عالم نے مجھے آپ کی امت کی بابت آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں اس وقت زمین کو اسی طرح تہہ و بالا کر کے ان کو تہس نہس کر دوں جس طرح میں نے قوم لوط کے ساتھ کیا تھا۔ اس وقت جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ﴿لا جبرائیل! فان لھم معی موقفاً بین یدی اللہ تعالٰی یوم القیامۃ﴾ نہیں جبرائیل! ایسا نہیں کرنا کیونکہ میرا اوران کا حساب کتاب بروز قیامت بارگاہ خداوندی میں ہوگا۔ پھر فرشتے قتل کرنے کے لئے ہماری طرف بڑھے۔ میں نے کہا: ﴿الامان الامان یا رسول اللہؐ﴾ آنحضرتؐ نے فرمایا: ﴿اذھب فلا غفر اللہ لک﴾ چلے جاؤ، خدا تمہیں معاف نہ کرے۔ اس شخص نے اپنا یہ تمام قصہ بیان کر کے مجھ سے کہا، اب بتاؤ ان حالات میں میری بخشش کی کوئی امید ہے؟[1]

وھذہ القصۃ کما تری فتامل ولا تکن من الغافلین

دوسرا واقعہ

کتب فریقین میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ سر امامؑ کو شام کی طرف لے جانے والے ملعون کسی منزل پر حسب معمول جب رات کے وقت شراب پینے اور کثرت و شادمانی کا اظہار کرنے میں معروف تھے کہ یکایک سامنے والی دیوار سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں لوہے کا قلم تھا پھر اس نے اس دیوار پر خون سے یہ شعر لکھا۔

اترجوا امۃ قتلت حسیناً   شفاعۃ جدہ یوم الحساب

بھلا وہ امت بھی جس نے حسین علیہ السلام کو شہید کیا قیامت کے روز ان کے جد نامدار کی شفاعت کی امید رکھ سکتی ہے؟؟

ملاعین یہ ہولناک منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور اس منزل سے آگے چلے گئے۔[2]

بعض کتب میں یہ واقعہ اس طرح مرقوم ہے کہ سفر کرتے ہوئے جب ملاعین ایک راہب کے دیر کے پاس پہنچے تو اس کی بعض دیواروں پر بھی مذکورہ بالا شعر لکھا ہوا دیکھا۔ انہوں نے راہب سے اس شعر کے لکھے جانے کی کیفیت دریافت کی۔ راہب نے بتایا کہ تمہارے نبیؐ کے مبعوث ہونے سے پانچ سو سال پہلے کا یہ شعر لکھا ہوا موجود

---

1. نفس المہموم ص ۲۱۷۔ تمام ص ۳۶۱۔ تظلم الزہرا ص ۱۵۷، ۲۵۸۔ مقتل الحسین للمقرم۔ لہوف ص ۱۵۳۔ تاریخ، ج ۶، ص ۳۲۶ وغیرہ۔
2. خصائص کبریٰ سیوطی، ج ۲، ص ۱۲۷۔ تاریخ ابن عساکر، ج ۴، ص ۳۴۲۔ صواعق محرقہ، ص ۱۱۶۔ نفس المہموم، ص ۲۲۵۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۶۱۔

سبط ابن جوزی نے لکھا ہے کہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعث سے پانچ سو سال پہلے ایک پتھر پر سریانی زبان میں یہ شعر کندہ تھا۔ جب اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تو وہ یوں تھا۔[1]

اترجو امة قتلت حسيناً　　　شفاعة جده يوم الحساب[2]

تیسرا واقعہ

ان ملاعین نے منازل سفر طے کرتے ہوئے ایک راہب کے دیر کے پاس قیام کیا اور وہ نیزہ جس پر سید الشہداءؑ کا سر مقدس سوار تھا دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا اور سوائے چند پہرہ داروں کے باقی تمام لوگ سو گئے تو راہب نے دیکھا کہ سر مقدس سے نور کی شعاعیں پھوٹ کر آسمان کو چھو رہی ہیں اور سر مقدس سے تسبیح وتہلیل کی آواز آ رہی ہے اور کوئی کہنے والا یہ کہہ رہا ہے: ﴿السلام عليك يا ابا عبد الله!﴾ راہب یہ عجیب نظارہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ لب بام سے جھانک کر پہرہ داروں سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم ابن زیاد کے آدمی ہیں۔ پھر دریافت کیا: یہ سر کس کا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: حسینؑ بن فاطمہؑ بنت محمدؐ کا۔ راہب نے کہا: وہی محمدؐ جو تمہارا رسولؐ ہے؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ یہ سن کر راہب نے کہا: ﴿بئس القوم انتم لو كان للمسيح ولد لا سكناه احداقنا﴾ تم بہت ہی برے لوگ ہو اگر ہمارے عیسیٰؑ کا کوئی بیٹا ہوتا تو ہم اسے آنکھوں پر بٹھاتے۔ پھر کہا۔ یہ سر صبح تک میرے حوالے کر دو۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا میرے پاس دس ہزار دینار ہیں، یہ لے لو اور صبح تک یہ سر مقدس میرے حوالے کر دو۔ اس پیشکش کو انہوں نے منظور کر لیا۔ دیناروں کی تھیلیاں لے لیں اور سر مقدس اس کے حوالے کر دیا۔ (سر مبارک چونکہ گرد آلود تھا) راہب نے اسے صاف کیا، خوشبو لگائی اور پھر گود میں لے کر ساری رات گریہ وبکاء کرتا رہا۔ جب سپیدۂ صبح نمودار ہونے لگا تو اس نے سر مقدس کو خطاب کرتے ہوئے کہا: ﴿يا راس لا املك الا نفسي وانا اشهد ان لا اله الا الله و ان جدك محمداً رسول الله صلى الله عليه وآله واشهد انى مولاك و عبدك﴾ اے سر مقدس! میں سوائے اپنی ذات کے کسی اور شے کا مالک نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور آپ کے جد نامدار محمدؐ اس کے رسول ہیں اور میں آپ کا غلام ہوں۔ صبح سر ان کے حوالے کیا اور خود شام تک اسارائے اہل بیتؑ کی خدمت کرتا رہا۔[3] اور بروایتے دیر چھوڑ کر پہاڑیوں میں چلا گیا اور وہاں عبادت خدا کرتے کرتے جان جان آفرین کے حوالہ کر

---

[1] مقتل، ص ۳۵۹۔　　[2] تذکرہ، ص ۲۷۳۔

[3] تذکرہ خواص الامہ، ص ۲۶۳۔

دی۔[1] یہ بھی منقول ہے کہ جب یہ ملاعین شام کے قریب پہنچے تو ایک دوسرے سے کہا آؤ دینار تقسیم کرلیں مبادا یہ واقعہ یزید کو معلوم ہوجائے اور وہ ہم سے لے لے۔ چنانچہ جب تھیلیاں کھولیں تو دیکھا کہ دینار ٹھیکریاں بن چکے تھے، جن کی ایک طرف لکھا تھا: ﴿ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون﴾ اور دوسری طرف لکھا تھا: ﴿وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون﴾[2]

چوتھا واقعہ

بعض کتب مقاتل میں لکھا ہے کہ شام جاتے ہوئے جب یہ لوگ موصل کے قریب پہنچے تو حاکم موصل کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کے اور ان کی سواریوں کے لئے نان و چارہ اور قیام کا انتظام کرے (جیسا کہ بالعموم راستہ میں بڑے شہروں سے گزرتے وقت یہ ایسا کرتے تھے) حاکم نے منظور کرلیا مگر اہل بلد نے استدعا کی کہ یہ لوگ شہر میں داخل نہ ہوں بلکہ شہر سے باہر قیام کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک فرسخ کے فاصلے پر قیام کیا۔ اس اثنا میں سر مقدس کو ایک پتھر پر رکھا۔ سر مطہر سے خون کا ایک قطرہ پتھر پر گرا۔ وہ لوگ تو چلے گئے مگر اس خون کا اثر یہ ہوا کہ ہر سال روز عاشورہ اس سے جوش مار کر خون نکلتا تھا اور اطراف و اکناف سے لوگ جمع ہو کر گریہ و بکاء اور مراسم عزا قائم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ عبدالملک بن مروان کے وقت تک قائم رہا۔ پھر اس نے یہ پتھر کہیں منتقل کرادیا جس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا مگر لوگوں نے وہاں ایک قبہ بنادیا جو "مشہد النقطہ" کے نام سے مشہور ہے۔[3]

پانچواں واقعہ

بعض کتب مقاتل لکھا ہے کہ حلب کے مغربی جانب "جوشن" ایک پہاڑ ہے جس میں کئی مشاہیر شیعہ کی قبریں ہیں، منجملہ ان کے ایک عالم ربانی محمد بن علی بن شہر آشوب مازندرانی اور شیخ احمد بن منیر عاملی کا مقبرہ بھی ہے۔ اسی پہاڑ پر ایک "مشہد السقط" ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شام جاتے وقت جب اسیران آل محمد کو یہاں سے گزارا گیا تو امام حسینؑ کی ایک زوجہ محترمہ کا جو کہ حاملہ تھیں بوجہ شدائد و مصائب سفر حمل ساقط ہوگیا جسے اس مقام پر دفن کیا گیا جسے "مشہد السقط اور مشہد الدکۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[4]

صاحب مقتل الحسین نے (۳۱۳ کے حاشیہ پر) کتاب نہر الذہب فی تاریخ حلب ج ۲ ص ۲۷۸ کے حوالہ

---

1. نفس المہموم، ص۲۳۶۔ 2. تذکرۃ الخواص، ص۲۶۳۔
3. نفس المہموم، ص۲۲۸۔ مقتل الحسینؑ، ص۳۱۲۔ اس کتاب میں نہر الذہب فی تاریخ حلب، ج ۳، ص ۲۳ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حلب کے جبل عربی میں درپیش آیا اور یہ مشہد النقطہ وہاں ہے۔ واللہ العالم۔
4. معجم البلدان، ج ۳، ص ۱۷۳، بذیل مادہ جوشن و خریدۃ العجائب، ص ۱۲۸۔ نفس المہموم، ص ۲۲۹۔

سے لکھا ہے کہ یہ "مشہد" ۳۵۱ھ میں ظاہر ہوا اور اس کے ظاہر ہونے کا قصہ یوں ہے کہا: ایک مرتبہ سیف الدولہ ہمدانی نے اپنے مکان سے جو کہ حلب کے باہر تھا، دیکھا کہ جہاں مشہد ہے وہاں آسمان سے نور نازل ہو رہا ہے، اس نے کئی بار یہ ماجرا دیکھا، پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا اور اپنے ہاتھ سے وہ جگہ کھودی۔ چنانچہ وہاں ایک پتھر نکلا جس پر کندہ تھا: ﴿هذا قبر المحسنؑ بن الحسينؑ بن عليؑ بن ابي طالبؑ﴾۔

فانظر الى هذا الاسم كيف لقى　　　من الاواخر مالاقىٰ من الاول

سیف الدولہ نے علویین کو جمع کر کے ان سے اس امر کی حقیقت دریافت کی۔ چنانچہ بعض سادات نے اسے بتایا کہ جب اسیران اہل بیتؑ شام کی طرف لے جائے جا رہے تھے اس وقت جناب امام حسینؑ کی ایک حاملہ زوجہ کا حمل یہاں سقط ہو گیا تھا، یہ اسی سقط کی قبر ہے۔ اس کے بعد سیف الدولہ نے وہاں مقبرہ تعمیر کرایا۔ حموی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس پہاڑ پر پہلے سرخ تانبے کی ایک کان تھی لیکن جب اسیران اہل بیتؑ کا وہاں سے گزر ہوا اور امام حسینؑ کی ایک زوجہ محترمہ کا حمل ساقط ہوا تو انہوں نے ان لوگوں سے جو وہاں کام کر رہے تھے کچھ پانی وغیرہ طلب کیا مگر انہوں نے نہ صرف دینے سے انکار کیا بلکہ کچھ ناسزا کلمات بھی کہے۔ بی بی نے ان کو بددعا دی جس کی وجہ سے وہ کان برباد ہو گئی۔[1]

اسیران آل رسولؐ کا شام میں داخلہ

سفر کے جانگداز شدائد و آلام جھیلنے کے بعد بالآخر یہ تباہ حال قافلہ شام کے قریب پہنچا تو جناب ام کلثوم نے شمر سے جا کر فرمایا: ﴿لي اليك حاجة﴾ مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ شمر نے کہا: ﴿ما حاجتك؟﴾ کیا کام ہے؟ بی بی نے فرمایا: ﴿اذا دخلت بنا البلد فاحملنا في درب قليل النظارة و تقدم اليهم ان يخرجوا هذه الرؤس من بين المحامل وينحونا عنها فقد خزينا من كثرة النظر الينا و نحن في هذه الحال﴾ جب شہر میں داخلہ ہو تو ہمیں ایسے راستے سے لے جاؤ جس میں دیکھنے والوں کی بھیڑ کم ہو اور ان لوگوں سے کہو جن کے ہاتھوں میں سرہائے شہداء ہیں کہ وہ ان کو آگے لے جائیں اور ہم کو ان سے علیحدہ رہنے دیں کیونکہ ہم اس حالت میں دیکھنے والوں کی کثرت سے رسوا ہو رہی ہیں۔ اس شقی نے اس فرمائش کے برعکس حکم دیا کہ سروں کو جو کہ نیزوں پر سوار تھے ان اونٹوں کے درمیان لائے جائیں جن پر مخدرات سوار تھیں اور پھر اس بازار (باب الساعات)[2] سے داخلہ کا حکم دیا جس میں سب سے زیادہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔[3]

۱۔ معجم البلدان، ج ۳، ص ۱۷۳۔
۲۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۱۵۔
۳۔ لہوف، ص ۱۵۵۔

بعض تابعین کی روپوشی

وارد ہے کہ اہل فضل تابعین میں سے ایک بزرگوار نے جب حسین مظلوم اور ان کے خانوادہ کو اس تباہ حال میں شام میں داخل ہوتے دیکھا تو تو اس نے شدت غم سے روپوشی اختیار کر لی۔ پورا ایک ماہ غائب رہا۔ جب ایک ماہ کے بعد اس کے احباب نے اسے ڈھونڈ نکالا تو اس سے اس روپوشی اختیار کرنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ ہم پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے؟ پھر یہ اشعار پڑھے ؎

جاؤا براسک یا بن بنت محمدؐ　　مترملا بدمائہ ترمیلا

وکانما بک یا بن بنت محمدؐ　　قتلوا جھاراً عامدین رسولا

قتلوک عطشاناً و لم یترقبوا　　فی قتلک التاویل والتنزیلا

و یکبرون بان قتلت و انما　　قتلوا بک التکبیر والتھلیلا[1]

یزید کے کافرانہ اشعار اور مسرت کا اظہار

بعض کتب تواریخ میں لکھا ہے کہ جب یہ لٹا ہوا قافلہ سرہائے شہداء کے ساتھ شام میں داخل ہو رہا تھا اس وقت یزید (لع) اپنے اس مکان کی بالائی منزل پر بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا جو (شام سے باہر) جیرون میں تھا۔ جب اس نے دور سے سروں کو نوک ہائے سنان پر سوار دیکھا۔ اس وقت ایک کوے نے کائیں کائیں کی (جسے نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے) یزید (لع) خوش ہو کر یہ اشعار گنگنانے لگا ؎

لما بدت تلک الحمول واشرقت　　تلک الروس علیٰ ربی جیرون

جب سواریاں ظاہر ہوئیں اور سر جیرون کے ٹیلوں پر نمودار ہوئے۔

نعب الغراب فقلت صح اولا تصح　　فلقد قضیت من الرسول دیونی

تو کوے نے کائیں کائیں کی، میں نے اس سے کہا، تو آواز بلند کر یا نہ کر، میں نے رسول سے اپنے قرضے چکا لئے ہیں۔[2]

ان اشعار سے بھی یزید کے دین کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹ جاتا ہے اور صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی یہ تمام کارروائی اپنے آباء و اجداد کے عہد جاہلی والے انتقام لینے پر مبنی تھی۔ انہی حقائق کی بناء پر ابن جوزی، قاضی ابویعلی، تفتازانی اور جلال الدین سیوطی وغیرہ علماء نے اس کے کافر و ملعون ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔[3]

---

[1] لہوف، ص ۱۵۶۔ انتمام، ص ۳۶۷ وغیرہ۔　　[2] تذکرۃ الخواص، ص ۲۶۲ طبع النجف۔ تفسیر روح المعانی للآلوسی، ج ۲۶، ص ۷۔

[3] حوالہ مذکورہ بالا۔

سہل ابن سعد ساعدیؓ کی روایت

اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ جب شہدائے کربلا کے سر اور اسیران آل محمدؐ کا لٹا ہوا قافلہ شام پہنچا اور سابقہ تحقیق کے مطابق اس روز یکم صفر ۶۱ھ تھی۔ تو شہادت حسینؑ اور یزید کی ظاہری فتح کی تقریب کی مناسبت سے دارالسلطنت شام کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا اور اسے انواع واقسام کی زیبائش و آرائش سے مزین و مرصع کیا گیا تھا۔ عورتیں مرد لباس فاخرہ زیب تن کئے ہوئے ہاتھوں میں مہندی، آنکھوں میں سرمہ لگائے خوشی سے طبلے اور شادیانے بجا رہے تھے۔ شہر کے باہر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ عرصہ محشر معلوم ہوتا تھا اور دارالامارہ کی سجاوٹ تو حیطہ بیان سے باہر ہے۔ یزید (لع) کے لئے انواع و اقسام کی زینت سے مرصع سریر بچھائی گئی تھی اور اردگرد سنہری، روپہلی کرسیاں بچھائی گئی تھیں جن پر عمائدین وقت بیٹھے تھے۔[1] یہ سب انتظام سید المرسلین اور امیر دین کی ستم رسیدہ بیٹیوں کے استقبال کے لئے کیا جا رہا تھا۔ آہ! ؎

یصلی علی المبعوث من آل هاشم و یغزیٰ بنوہ ان ذا لعجیب

چنانچہ سہل بن سعد ساعدیؓ صحابی رسولؐ بیان کرتے ہیں کہ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر آ رہا تھا۔ واپسی پر بیت المقدس کی زیارت کی۔ جب واپس شام پہنچا تو اس کی عجیب ہیئت دیکھی۔ نہریں جاری ہیں، درخت لہلہا رہے ہیں، لوگوں نے مخمل و دیبا کے زرنگار پردے لٹکائے ہوئے ہیں، لوگ بہت خوش و خرم ہیں اور کچھ عورتیں فرط مسرت و شادمانی سے دفیں بجا رہی ہیں۔ میں نے دل میں کہا شاید اس تاریخ کو شامیوں کی کوئی عید ہو گی جس کا مجھے علم نہیں۔ بہر حال میں حیران تھا کہ یہ جشن مسرت کیسا ہے؟ اس اثناء میں بعض لوگوں کو کچھ کھسر پھسر کرتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے قریب گیا اور ان سے دریافت کیا۔ آج تمہاری کوئی عید ہے جس کا مجھے علم نہیں؟ انہوں نے کہا۔ اے شیخ! تم کوئی اجنبی اور بادیہ نشین معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا، میں سہل بن سعد ہوں، جناب پیغمبر اسلام کی صحبت کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ اس وقت انہوں نے کہا۔ اے سہلؓ! تعجب ہے کہ آسمان سے خون کی بارش کیوں نہیں برستی اور زمین اپنے اہل سمیت پانی میں کیوں دھنس نہیں جاتی؟ میں نے کہا۔ کیوں، کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا اس لئے کہ یہ نواسہ رسولؐ امام حسینؑ کا سر عراق سے دربار یزید میں لایا جا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ہیں؟ حسینؑ کا سر لایا جا رہا ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں؟ پھر میں نے دریافت کیا۔ کس دروازہ سے داخلہ ہے؟ انہوں نے باب الساعات کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکے بعد دیگرے کئی علم آ رہے ہیں اور ایک سوار کے ہاتھ میں نیزہ ہے جس پر ایک ایسا سر سوار ہے جو سب لوگوں سے زیادہ رسولؐ خدا کے ساتھ مشابہ ہے۔

---

[1] کامل بہائی، ص ۲۳۰، طبع قم۔ نفس المہموم، ص ۲۳۲۔ مقتل الحسین، ص ۲۱۵، مختصراً۔

کامل بہائی میں جناب سہل کی زبانی اس واقعہ کی جو منظر کشی کی گئی ہے وہ یوں ہے۔ ”میں نے کئی سروں کو نیزوں کی نوکوں پر دیکھا۔ آگے آگے عباسؑ بن علیؑ کا سر تھا۔ ان کے پیچھے امام کا سر مقدس تھا۔ ان کے پیچھے اسیران اہل بیت تھے۔ سر مقدس کی حالت یہ تھی کہ اس سے ہیبت و دبدبہ ٹپک رہا تھا۔ ریش مبارک مدور تھی جس میں بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے۔ خضاب لگا ہوا تھا، آنکھیں سیاہ تھیں، ابرو قوس کی طرح نوکدار، پیشانی کشادہ، ناک بلند، آنکھیں افق کی طرف، چہرہ آسمان کی طرف تبسم کناں معلوم ہوتا تھا اور ہوا ریش مبارک کو دائیں بائیں اڑاتی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا گویا ہو بہو امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔ ان کے پیچھے چند عورتیں تھیں جو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار تھیں۔ پہلے اونٹ پر ایک لڑکی سوار تھی۔ میں اس کے قریب گیا اور جا کر دریافت کیا۔ تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: ﴿انا سکینہ بنت الحسینؑ﴾ میں نے عرض کیا۔ میں سہل بن سعد ہوں، آپ کے جد امجد کا صحابی ہوں اور ان کی حدیثیں سن چکا ہوں۔ اگر میرے لائق کوئی کار خدمت ہو تو بتائیں۔ بی بی نے کہا۔ اے سہل! اس آدمی سے کہو جس کے ہاتھ میں سر ہے کہ وہ اسے آگے لے جائے تاکہ لوگ ان سروں کو دیکھنے میں مشغول ہوں اور حرم رسولؐ کی طرف نہ دیکھیں۔ سہل کہتے ہیں۔ میں نے اس شخص کے پاس گیا اور جا کر کہا۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ میری ایک مطلب براری کر دو اور میرے پاس جو چار سو دینار ہیں وہ لے لو۔ اس نے دریافت کیا۔ تمہارا کیا مقصد ہے؟ میں نے مقصد بیان کیا تو اس نے آمادگی ظاہر کی اور سر مقدس کو آگے لے گیا۔ اس لئے میں نے مقررہ رقم اس کے حوالے کر دی۔[1]
(الی آخر القصہ)

کافی دیر تک اس قافلہ کو دروازہ دمشق پر ٹھہرایا گیا۔[2] شاید مقصد یہ تھا کہ اگر بازار یا دربار کی سجاوٹ میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو وہ پوری کر دی جائے۔ بعض کتب میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ پورے تین دن ان کو وہاں روکے رکھا گیا جو کہ ناقابل اعتبار ہے۔

داخلہ شام کے وقت اسیران آل رسولؐ کی کیفیت

بعض کتب مقاتل میں لکھا ہے کہ ملاعین نے دروازہ شام میں داخل ہونے سے قبل یہ نیا ظلم ڈھایا کہ تمام زن و مرد، خورد و کلاں، غرضیکہ تمام اسیران آل محمدؐ کو گلۂ گوسفنداں کی طرح رسیوں میں جکڑ دیا گیا اور اسی حال میں کہ مخدرات عصمت و طہارت مکشفات[3] الوجوہ تھیں، ان کو بازار سے گزار کر دربار یزید میں لایا گیا۔ جبکہ وہ شریر سرپر

---

[1] قمقام، ص ۳۶۸، ۳۶۹۔ نفس المہموم، ص ۲۳۱۔ ناسخ بحار، ص ۲۲۳۔

[2] مقتل الحسینؑ للمقرم، ص ۳۱۵۔

[3] امالی صدوقؒ، ص ۱۰۰ وغیرہ۔

حکومت پر نشۂ اقتدار میں چور متمکن تھا۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ما ظنک برسول اللّٰہ، لو یرانا علی ھذا الحال﴾ اے یزید! تیرا کیا خیال ہے، اگر جناب رسولؐ خدا ہمیں اس حال میں دیکھیں تو ان کا کیا حال ہوگا؟ امامؑ کے اس کلام کا یہ اثر ہوا کہ حاضرین رونے لگے اور یزید (لع) نے رسیاں کاٹنے کا حکم دے دیا۔[1]

بعض روایات میں اس اندوہ ناک واقعہ کی منظر کشی حضرت امام زین العابدینؑ سے یوں مروی ہے: ﴿لما وفدنا علی یزید بن معاویہ اتو بحبال و ربقونا مثل الاغنام و کان الحبل بعنقی و عنق ام کلثوم و بکتف زینب و سکینہ و البنات تساق کلما قصرنا عن المشی (ضربنا) ضربونا حتی اوقفونا بین یدی یزید فتقدمت وھو علی سریر مملکتہ وقلت لہ ما ظنک برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ لو یرانا علی ھذہ الصفة..... الخ﴾ جب ہم یزید (لع) کے قریب پہنچے تو اس کے آدمی تا رسیاں لائے جن سے ہمیں بکریوں کے گلہ کی طرح باندھ دیا گیا۔ چنانچہ میری اور ام کلثوم کی گردن میں اور جناب زینب اور سکینہ کے کاندھوں سے رسی بندھی ہوئی تھی اور لڑکیوں کو ہانکا جاتا تھا۔ اگر ہم چلنے میں تھوڑی سی بھی سستی کرتے تھے تو ہمیں مارا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں ہمیں یزید کے دربار میں ٹھہرایا گیا۔ اس وقت وہ اپنی سریر مملکت پر متمکن تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ او یزید! تیرا کیا خیال ہے، اگر جناب رسولؐ خدا ہمیں اس حال میں مشاہدہ کریں تو ان کی کیا حالت ہوگی؟[2]

بہر حال یہ لٹا ہوا قافلہ اسی خستہ حالی میں بازار سے گزارا جا رہا تھا، مگر ودائع نبوت، عقائل امامتؑ کی شکل و ہیئت سے جمال و کمال کے آثار نمایاں تھے۔ چنانچہ شام کے بعض لئام نے کہا: ﴿ما راینا سبایا احسن من ھولاء فمن انتم؟﴾ ہم نے اتنے خوبصورت قیدی نہیں دیکھے تم کس خاندان کے قیدی ہو؟ جناب سکینہؑ نے جواب دیا: ﴿نحن سبایا آل محمد﴾ ہم اسیران آل محمدؐ ہیں۔[3]

بعض اخبار میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ابراہیم بن طلحہ بن عبید اللہ نے (طنزاً) امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا: ﴿من غلب؟﴾ بتاؤ غلبہ کسے حاصل ہوا؟ اور فتح کس کی ہوئی؟ امامؑ نے جواب میں فرمایا: ﴿اذا اردت ان تعلم من غلب و دخل وقت الصلوة فاذن و اقم!﴾ اگر یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ غلبہ کسے حاصل ہوا تو جب نماز کا وقت آئے اس وقت اذان و اقامت کہنا۔ معلوم ہو جائے گا کہ فاتح کون

---

[1] ملہوف، ۱۵۹۔ مقتل الحسینؑ، ص ۴۴۷۔ قمقام، ص ۵۷۱۔ تذکرۃ الخواص، ص ۲۶۲۔

[2] انوار نعمانیہ، ص ۳۴۰۔ منتخب طریحی، ص ۴۴۳ طبع بمبئی۔

[3] امالی شیخ صدوق، ص ۱۰۰۔

ہے اور مفتوح کون؟[1]

جب یہ قافلہ بازار سے گزر رہا تھا تو جا بجا لوگوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نیز استقبال کرنے والوں میں سے بعض لوگ کچھ پھول (پتھر) بھی ہمراہ لائے تھے۔ وہ بھی اسیران آل محمدؑ اور شہداء کے سروں پر نثار کر رہے تھے۔ چنانچہ سہل بن ساعد ساعدیؓ کی مذکورہ بالا روایت میں وارد ہے کہ جب یہ تباہ حال قافلہ بازار شام سے گزر رہا تھا تو میں نے ایک مکان کے ذریعہ پر پانچ عورتوں کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک بوڑھی اور کبڑی عورت بھی تھی۔ جب سید الشہداءؑ کا سر مقدس ان کے قریب پہنچا تو اس بوڑھی عورت نے پتھر اٹھا کر امامؑ کے دندان مبارک پر دے مارا۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو میں نے یہ بددعا کی: ﴿اللّٰھم اھلکھا و اھلکھن معھا بحق محمدؐ و آلہ اجمعین﴾ سہل بیان کرتے ہیں کہ ابھی میری یہ دعا ختم نہیں ہوئی تھی وہ ذریعہ ٹوٹ گیا اور وہ بڑھیا گر کر ہلاک ہوگئی اور اس کے ساتھ دوسری عورتیں بھی ہلاک ہوگئیں۔[2]

منہال بن عمرو بیان کرتا ہے کہ میں نے شام میں دیکھا کہ امام حسینؑ کا سر مبارک نوک سنان پر سوار تھا۔ آگے آگے ایک شخص سورہ کہف کی تلاوت کرتا جاتا تھا۔ جب وہ اس آیت پر پہنچا: ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ تو یکایک سر مقدس بزبان فصیح گویا ہوا اور کہا: ﴿اعجب من اصحاب الکھف قتلی و حملی﴾ اصحاب کہف کے قصہ سے میرا شہید ہونا اور نوک سنان پر سوار ہونا زیادہ تعجب خیز ہے۔[3]

یہی وجوہ تھے جن کی بناء پر اسیران اہل بیتؑ کا قافلہ دربار میں بہت دیر سے پہنچا۔ بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قافلہ اگلے پہر بازار میں داخل ہوا اور زوال کے بعد دربار یزید میں پہنچا۔[4]

جب اسیران آل محمدؑ یزید کے محل کے نزدیک پہنچے (جو کہ جامع مسجد کے قریب ہی تھا) تو محضر بن ثعلبہ نے بآواز بلند یہ کفریہ کلمات کہے: ﴿ھذا محضر بن ثعلبہ جاء امیر المؤمنین باللئام الفجرۃ﴾ اس ملعون کا یہ کلام نافرجام سن کر امام زین العابدین علیہ السلام جنہوں نے کوفہ سے شام تک ان لئام سے کوئی کلام نہیں کیا تھا فرمایا: ﴿ما ولدت ام محضرۃ اشر و الئام﴾[5] ام محضر کا بیٹا سب سے بڑا شریر و لئیم ہے۔

بالآخر وہ قیامت خیز ساعت آگئی کہ اس لٹے ہوئے قافلہ کو جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ٹھہرا دیا گیا

---

1. اسرار الشہادت، ص ۵۱۰
2. نفس المہموم، ص ۲۳۳۔
3. مقتل الحسین للمقرم، ص ۴۰۳۔ خصائص الکبریٰ سیوطی، ج ۲، ص ۱۲۷۔ نفس المہموم، ص ۲۳۷ وغیرہ۔
4. نفس المہموم، ص ۲۳۲، بحوالہ کامل بہائی۔
5. ارشاد، ص ۲۶۹۔ تمام، ص ۲۷۰۔

جہاں عام قیدی ٹھہرائے جاتے تھے [۱] اور سید الشہداءؑ کا سر مقدس یزید (لع) کے سامنے طشت طلائی میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ [۲]

راویانِ اخبار کا بیان ہے کہ اس وقت یزید شراب نوشی میں مشغول تھا۔ [۳]

امام رضا علیہ السلام سے اس سلسلہ میں جو حدیث مروی ہے اس میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس وقت یزید عنید کی حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ فضل بن شاذان بیان کرتے ہیں کہ ﴿سمعت الرضاؑ یقول لما حمل راس الحسینؑ الی الشام امر یزید لعنه اللّٰه فوضع و نصب علیه مائدة فاقبل هو و اصحابه یاکلون و یشربون الفقاع فلما فرغوا امر بالرأس فوضع فی طشت تحت سریرة و بسط علیه رقعة الشطرنج و جلس یزید لعنهٔ اللّٰه یلعب بالشطرنج ویذکر الحسین بن علی علیهما السلام وآبائه وجده علیهم السلام ویستهزء بذکرهم فمتی قمر صاحبه تناول الفقاع فشربه ثلث مرات ثم صب فضلته علی ما یلی الطشت من الارض فمن کان من شیعتنا فلیتورع من شرب الفقاع واللعب بالشطرنج ومن نظر الی الفقاع او الی الشطرنج فلیذکر الحسینؑ ولیلعن یزید و آل زیاد یمحوا اللّٰه عز و جل بذالک ذنوبه کلها ولو کانت بعدد النجوم﴾۔

جب امام حسینؑ کا سر مقدس شام میں یزید کے پاس لایا گیا تو یزید نے حکم دیا کہ اس کے اوپر دسترخوان بچھایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور یزید نے اپنے یار دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کی۔ بعد ازاں سر انور طشت طلائی میں رکھ کر سریر کے نیچے رکھ دیا اور اوپر بساط شطرنج بچھا کر شطرنج کھیلنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی امام حسینؑ اور ان کے اب وجد کا برائی کے ساتھ ذکر کرتا جاتا تھا۔ جب کھیل میں اپنے ساتھیوں پر غلبہ حاصل کرتا تو شراب کے تین جام چڑھا جاتا اور تلچھٹ سر مقدس کے پاس زمین پر انڈیل دیتا۔ امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں جو ہمارا شیعہ ہے اسے لازم ہے کہ شراب نوشی اور شطرنج بازی سے اجتناب کرے اور جو شخص بھی شراب یا شطرنج کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ امام حسینؑ کو یاد کرے (ان پر درود وسلام بھیجے) اور یزید اور آل یزید (آل زیاد) پر لعنت کرے۔ ایسا کرنے سے خدا اس کے گناہ معاف کر دے گا اگرچہ تعداد میں ستارہ ہائے آسمان کے برابر بھی ہوں۔ [۴]

آہ ؎   ہجوم عام کجا آل بوتراب کجا   سر حسینؑ کجا مجلس شراب کجا؟

---

۱ امالی صدوقؒ، ص ۱۰۰۔ لہوف، ص ۱۵۶ وغیرہ۔

۲ نفس المہموم، ص ۲۷۰۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۴۴۲۔ مرآۃ الجنان یافعی، ج ۱، ص ۱۳۵۔

۳ لہوف، ص ۱۷۰۔

۴ من لا یحضرہ الفقیہ، ص ۔۔۔؟۔ عیون اخبار الرضا، ج ۲، ص ۲۲۷۔ نفس المہموم، ص ۲۷۹۔

بہرحال جب جناب سید الشہداءؑ کا سر مقدس یزید عنید (لع) کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ بہت مسرور و شادکام ہوا[1] اور کہا: ﴿یوم بیوم بدر﴾ ۔آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے۔[2] اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ چھڑی سے جناب سید الشہداءؑ کے لب و دندان مبارک کی بے ادبی کی اور اس کے ساتھ ساتھ نشۂ فتح و سرور سے چور ہو کر حصین بن حمام مری کے یہ شعر پڑھے ۔

ابی قومنا ان ینصفونا فانصفت　　قواضب فی ایماننا تقطر الدماء

نفلق هاماً من رجال اعزة　　علینا و هم کانوا اعقا و اظلما[3]

اس وقت ابوبرزہ صحابیٔ رسولؐ وہاں موجود تھے۔ وہ یہ کیفیت دیکھ کر تاب ضبط نہ لا سکے اور پکار کر کہا:

﴿ویحک یا یزید! اتنکت بقضیبک ثغر الحسینؑ بن فاطمۃؑ! اشهد لقد رأیت النبی صلی اللّٰه علیه و آله وسلم یرشف ثنایاه و ثنایا اخیه الحسن علیهما السلام ویقول انتما سیدا شباب اهل الجنة فقتل اللّٰه قاتلکما و لعنه و اعد له جهنم وساءت مصیرا!﴾ ''وائے ہو تم پر اے یزید! تم چھڑی سے حسینؑ بن فاطمہؑ کے لب و دندان کی بے ادبی کرتے ہو؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے جناب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان کے اور ان کے بھائی حسنؑ کے لب و دندان پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم دونوں جوانان جنت کے سردار ہو! خدا تمہارے قاتل کو قتل کرے، لعنت کرے اور اس کے لئے عذاب جہنم مہیا کرے اور وہ بہت ہی بری بازگشت ہے''۔

راوی کا بیان ہے کہ ابوبرزہؓ کا یہ کلام حق ترجمان سن کر یزید غضبناک ہو گیا اور اسے دربار سے نکال دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ درباریوں نے کھینچ کر اسے دربار سے باہر نکال دیا۔[4]

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۸۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۰۰۔ [2] مقتل الحسین، ص ۳۴۳۔ مناقب شہرآشوب، ج ۴، ص ۱۰۰۔

[3] تاریخ طبری، ج ۶، ص ۲۶۷۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۸۔ صواعق محرقہ، ص ۱۱۹۔ تذکرۃ الخواص، ص ۲۶۲۔ بدایہ و نہایہ ابن کثیر، ج ۸، ص ۱۹۲ وغیرہ۔

[4] لہوف، ص ۱۶۰۔ طبری، ج ۶، ص ۲۶۷۔ مقتل الحسین، ص ۳۴۵۔ فصول مہمہ، ص ۲۰۵۔

فائدہ: ابن جوزی نے اپنی کتاب ''الرد علی المتعصب العنید'' میں یزید کی اس حرکت شنیعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: (علی ما نقله فی نفس المهموم، ص ۳۴۳) ﴿لیس العجب من فعل عمر بن سعد و عبید اللّٰه بن زیاد و انما العجب من خذلان یزید و ضربه بالقضیب علی ثنیة الحسین علیه السلام و اغارته علی المدینة افیجوز ان یفعل هذا، بالخوارج او لیس فی الشرع انهم یدفنون اما قوله لی ان اسبیهم فامر لا یقنع لفاعله و معتقده باللعنة و لو انه احترم الرأس حین وصوله و صلی علیه و لم یترکه فی الطست ولم یضربه بقضیب ما الذی کان یضرّه وقد حصل مقصوده من القتل و لکن احقاد جاهلية و دليلها ما تقدم من انشاده لیت اشیاخی ببدر شهدوا... الخ﴾۔

[بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۴ پر]

ایک بوڑھے شامی کی گستاخی اور پھر توبہ

ادھر دربار میں یہ کارروائی ہو رہی تھی اور ادھر جہاں امام سیڑھیوں کے پاس تشریف فرما تھے ایک عجیب واقعہ در پیش آیا۔ ایک عمر رسیدہ شامی جو حقیقت حال سے بالکل ناواقف تھا اور بنی امیہ کے غلط پراپیگنڈے کا شکار تھا مخدرات عصمت و طہارت کے قریب آ کر کہنے لگا: ﴿الحمد لله الذی قتلکم و اهلککم و اراح البلاد عن رجالکم و امکن امیر المؤمنین منکم﴾ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا اور لوگوں کو تمہارے مردوں کے شر سے راحت پہنچائی اور امیر (یزید) کو تم پر فتح و نصرت عطا کی۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے علم امامت سے دیکھا کہ جوہر قابل ہے مگر صرف غلط فہمی کا شکار ہے۔ لہٰذا چاہا کہ اس کے سامنے چراغ ہدایت روشن کر دیں۔ فرمایا: ﴿یا شیخ! هل قرات القرآن؟﴾ اے شیخ! کیا تو نے قرآن پڑھا ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: ﴿فهل عرفت هذه الایة قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربی﴾ کیا آیت مودت کو پہچانتے ہو؟ شیخ نے کہا۔ ہاں پہچانتا ہوں۔ فرمایا: ﴿نحن القربی﴾ وہ قرابتداران رسولؐ ہم ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿یا شیخ! فهل قرات فی بنی اسرائیل و آت ذا القربی حقه﴾ اے شیخ! کیا تو نے سورہ بنی اسرائیل میں یہ آیت پڑھی ہے کہ اے رسولؐ قرابتداروں کو ان کا حق دے دو۔ شیخ نے کہا۔ ہاں ضرور پڑھی ہے۔ فرمایا۔ وہ قرابتدار ہم ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿یا شیخ هل قرات هذه الایة واعلموا انما غنمتم من شیء فان لله خمسه و للرسول و لذی القربی﴾ اے شیخ! کیا یہ آیت پڑھی ہے جس میں خدا فرماتا ہے کہ جب تمہیں کسی قسم کی غنیمت حاصل ہو تو اس کا پانچواں حصہ خدا، رسولؐ اور ذوی القربیٰ کے لئے ہے۔ کہا، ہاں پڑھی ہے۔ امام نے فرمایا: ﴿فنحن القربی﴾ وہ اقرباء رسولؐ ہم ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿یا شیخ! فهل قرات هذه الایة انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت و یطهر کم تطهیرا﴾ اے شیخ! کیا آیت تطہیر انما یرید اللہ پڑھی

[بقیہ حاشیہ از صفحہ نمبر ۵۴۲]

ہمیں عمر بن سعد اور عبید اللہ بن زیاد کے افعال (ناشائستہ) سے تعجب نہیں بلکہ ہمیں تو یزید کے حرکات سے تعجب ہے کہ اس نے امام حسین علیہ السلام کے لب و دندان پر چھڑی سے بے ادبی کی اور مدینۃ النبی کو لوٹا۔ کیا خارجیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرنا روا ہے؟ کیا شرع انور میں یہ حکم نہیں کہ ان کو دفن کیا جائے؟ باقی رہا یزید کا یہ کہنا کہ مجھے حق حاصل ہے کہ میں ان پسماندگان حسین کو قید کروں ایسا ایسا جرم ہے کہ اس کے مرتکب پر صرف لعنت کرنے پر اکتفا نہیں کی جا سکتی۔ جب سر امام یزید کے پاس پہنچا تھا اگر وہ اس کا احترام کرتا اور اس پر نماز جنازہ پڑھتا اور اسے طشت میں رکھ کر چھڑی سے اس کی بے ادبی نہ کرتا تو اس کا کیا نقصان ہوتا تھا حالانکہ قتل امام سے اس کا مقصد تو حاصل ہو چکا تھا لیکن عہد جاہلیت والے حقد و کینہ نے اسے ایسا کرنے پر آمادہ کیا جس کی دلیل اس کے یہ اشعار ہیں ۔

لیت اشیاخی ببدر شهدوا۔ الخ۔

(منہ عفی عنہ)

ہے؟ شیخ نے عرض کیا۔ ہاں یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ امامؑ نے فرمایا: ﴿فنحن اهل البیت الذین خصصنا الله بآیة التطهیر یا شیخ!﴾ اے شیخ! ہم ہی وہ اہل بیتؑ ہیں جن کو خدا نے آیت تطہیر کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔

شامی امامؑ کا یہ کلام حقیقت ترجمان سن کر اپنے گستاخانہ کلام کی وجہ سے بالکل ساکت وصامت ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بولا: ﴿بالله انکم هم؟﴾ خدا کے لئے سچ بتاؤ کیا آپ حقیقتاً وہی لوگ ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿فالله انا لنحن هم من غیر شک و حق جدنا رسول الله انا لنحن هم﴾ خدا کی قسم! بلاشک ولاریب ہم ہی وہ لوگ ہیں۔ اپنے جد نامدار کے حق کی قسم! یقیناً ہم ہی وہی لوگ ہیں"۔ یہ سنتے ہی شیخ شامی نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور عمامہ سر سے اتار کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر آسمان کی طرف سر بلند کر کے کہا: ﴿اللّٰهم انا نبرء الیک من عدو آل محمد من الجن و الانس﴾ یا اللہ! ہم دشمنان آل محمدؐ سے بیزار ہیں خواہ وہ جن ہوں یا انسان! بعد ازاں امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: ﴿هل لی من توبة﴾ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ﴿نعم! ان تبت تاب الله علیک و انت معنا﴾ ۔ ہاں! اگر تم صدق دل سے توبہ کرلو تو ضرور خدا تمہاری توبہ قبول فرمائے گا اور تمہارا حشر و نشر ہمارے ساتھ ہوگا۔ یہ مژدہ سن کر شیخ نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ میں تائب ہوں۔ جب اس واقعہ کی اطلاع یزید کو ملی تو اس نے شیخ کو شہید کرا دیا۔[1] رضوان الله علیه۔

اس کے بعد اسیران آل محمدؐ کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ روایت میں وارد ہے کہ جب ام المصائب جناب زینبؑ کی اس حال میں بھائی کے سر اقدس پر نظر پڑی تو بی بی نے شدت غم سے اپنا گریبان چاک کر دیا اور غمگین لب و لہجہ میں فرمایا: ﴿یا حسیناه! یا حبیب رسول الله! یابن فاطمة الزهرا سیدة النساء یابن بنت المصطفیٰ﴾ ۔ بی بی کے غم میں ڈوبے ہوئے یہ کلمات سن کر حاضرین دربار رو پڑے۔ مگر یزید پلید ملعون خاموش بیٹھا رہا۔[2] اور جناب فاطمہؑ بنت الحسینؑ نے فرمایا: ﴿یا یزید! بنات رسول الله سبایا؟﴾ اے یزید! کیا یہ جائز ہے کہ رسولؐ زادیاں قید ہوں؟[3]

زحر بن قیس کی دربار یزید میں غلط رپورٹ

زحر بن قیس ملعون نے واقعات کربلا کی مسخ شدہ رپورٹ پیش کی جس میں حسینی فوج کے عدیم النظیر کارناموں پر پردہ ڈالنے اور یزیدی فوج کی من گھڑت جرأت و دلیری کے افسانے بیان کرنے کی مذموم کوشش کی گئی

---

[1] لہوف، ص ۱۵۸۔ مقتل مقرم، ص ۳۶۸۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۱۱۲۔ روح المعانی للآلوسی، ج ۲۵، ص ۳۱۔ مقتل الحسین للخوارزمی، ج ۲، ص ۶۲۔

[2] لہوف، ص ۱۵۹۔

[3] تاریخ، ج ۶، ص ۲۶۸۔

تھی، جس کا خلاصہ یہ تھا۔ اے امیر! حسینؑ اپنے خاندان کے اٹھارہ اور اشیاع واصحاب میں سے ساٹھ آدمیوں کو لے کر کربلا پہنچے۔ ہم نے ان سے کہا، کہ دو باتوں میں سے ایک اختیار کر لیں۔ یا تو غیر مشروط طریقہ پر اپنے تئیں عبیداللہ بن زیاد کے حوالے کر دیں یا پھر جنگ وجدال کے لئے تیار ہو جائیں۔ انہوں نے جنگ کو اختیار کیا۔ پھر کیا تھا ہم نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر اس طرح حملہ کر دیا جس طرح شقرا کبوتروں پر کرتا ہے۔ وہ ادھر ادھر بھاگتے پھرتے تھے، مگر کوئی جائے پناہ نہ ملتی تھی۔ بس اتنی دیر گزری ہوگی جتنی ذبح کرنے میں لگتی ہے یا جتنی دیر کوئی شخص دوپہر کا قیلولہ کرتا ہے کہ ہم نے سب کو تہ تیغ کر دیا، اب ان کے جسم بلالباس کربلا میں خاک وخون میں غلطاں پڑے ہیں۔[1]

اس وقت یزید جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اپنے ندیموں کے ساتھ شطرنج کھیلنے اور شراب پینے میں مشغول تھا۔ ظاہری فتح وکامرانی کی دوآتشہ شراب کے نشے سے چور چور ہو کر ترنگ میں آ گیا اور یہ کفریہ اشعار پڑھنے لگا۔

لیت اشیاخی ببدر شهدوا　　جزع الخزرج من وقع الاسل

اے کاش! میرے بدر والے وہ بزرگ آج موجود ہوتے جنہوں نے اس جنگ میں نیزوں کے لگنے سے خزرج کی جزع فزع دیکھی تھی۔

لاهلوا واستهلوا فرحاً　　ثم قالوا یا یزید لا تشل

وہ تو یقیناً خوش ہوتے اور خوش ہو کر بآواز بلند پکار کر کہتے، اے یزید! تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔

قد قتلنا القوم من ساداتهم　　و عدلنا ببدر فاعتدل

ہم نے بنی ہاشم کے سرداروں میں سے بڑے سردار کو قتل کر دیا ہے۔ اس طرح جب ہم نے اس واقعہ کا بدر سے موازنہ کیا ہے تو مقابلہ برابر ہو گیا ہے۔

---

[1] طبری، ج ۶، ص ۲۶۴۔ کامل، ج ۳، ص ۲۹۸۔ ارشاد، ص ۲۵۸۔

تبصرہ:۔ تاریخ کامل ابن اثیر کا فاضل محشی زحر بن قیس کی اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ﴿هذا هو الفخر المزيف والكذب الصريح فان كان كل المورخين يذكرون لمن كان مع الحسينؑ وله ثباتاً لا يضارعه ثبات واباء وشمائل ان يرى لكثرة قبل ناصره وكثرة تره﴾۔ یہ بے غلط فخر اور کھلم کھلا جھوٹ، کیونکہ تمام مورخین متفق ہیں کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب نے جس جرأت وہمت کا عملی مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور جس عزت نفس کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر ایسے لوگوں میں کم نظر آئے گی جو کثرت اعداء میں گھرے ہوئے ہوں، جن کے مددگار کم اور دشمن زیادہ ہوں۔ (منہ عفی عنہ)

لعبت بنو هاشم بالملک فلا   خبر جاء ولا وحی نزل [1]

بنی ہاشم نے ملک حاصل کرنے کے لئے ایک ڈھونگ رچایا تھا ورنہ نہ کوئی خبر آئی اور نہ کوئی وحی آسمان سے نازل ہوئی تھی۔

دربار یزید میں زینب کبریٰؑ کا تاریخی خطبہ

یزید کے یہ کفریہ اشعار سنتے ہی رسولؐ اسلام کی نواسی اور شیر خدا کی شیر دل بیٹی زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جس نے یزیدی ایوان حکومت کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا:

﴿الحمد للّٰہ رب العلمین و صلی اللّٰہ علی رسولہ و آلہ اجمعین صدق اللّٰہ سبحانہ کذالک یقول ثم کان عاقبۃ الذین اساؤا السوء ان کذبوا بآیات اللّٰہ و کانوا بھا یستھزء ون. اظننت یا یزید حیث اخذت علینا اقطار الارض و آفاق السماء فاصبحنا نساق. کما تساق الاساری ان بنا ھواناً علی اللّٰہ و بک علیہ کرامۃً و ان ذالک لعظم خطرک عندہ فشمخت بانفک و نظرت فی عطفک جذلان مسروراً حیث رایت الدنیا لک مستوثقۃ و الامور متسقۃ و حین صفالک ملکنا و سلطاننا فمھلاً مھلاً انسیت قول اللّٰہ تعالیٰ ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیر لانفسھم انما نملی لھم لیزدادوا اثماً ولھم عذاب مھین۔ امن العدل یابن الطلقاء تخدیرک حرائرک و امائک و سوقک بنات رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم سبایا قد ھتکت ستورھن و ابدیت وجوھھن تحدوا بھن الاعداء من بلد الی بلد و یستشرفھن اھل المناھل و المناقل و یتصفح وجوھھن القریب و البعید و الدنی و الشریف لیس معھن من رجالھن ولی ولا من حماتھن حمیم و کیف یرتجی مراقبۃ من لفظ فوہ اکباد الازکیاء و نبت لحمہ من دماء الشھداء و کیف لا یستبطاء فی بغضنا اھل البیت من نظر الینا بالشنف و الشنان والاحن و الاضغان ثم تقول غیر متاثم ولا مستعظم، لاھلوا و استھلوا فرحاً، ثم قالوا یا یزید لا تشل، منتحیاً علی ثنایا ابی عبد اللّٰہ سید شباب اھل الجنۃ تنکتھا بمخصرتک و کیف لا تقول ذالک و قد نکات القرحۃ و استاصلت الشافۃ باراقتک دماء ذریۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ و نجوم الارض من آل عبد المطلب و تھتف باشیاخک زعمت انک تنادیھم و لتردن وشیکا موردھم و لتودن انک شللت و بکمت ولم تکن قلت ما قلت و فعلت ما فعلت اللّٰھم خذ بحقنا و انتقم ممن ظلمنا

---

[1] لہوف، ص ۶۱۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۲، ص ۵۸۔ تفسیر روح المعانی آلوسی، ج ۲۹، ص ۷۲۔ تذکرۃ الخواص الامہ، ص ۲۶۱۔ تقام، ص ۳۷۲، وغیرہ

و احلل غضبک بمن سفک دمائنا و قتل حماتنا فواللّٰہ ما فریت الا جلدک ولا حززت الا لحمک و لتردن علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ بما تحملّت من سفک دماء ذریتہ و انتھکت من حرمتہ فی عترتہ و لحمتہ حیث یجمع اللّٰہ شملھم و یلم شعثھم و یاخذ بحقھم ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون و حسبک باللّٰہ حاکماً و بمحمّدٌ خصیما و بجبرئیل ظھیراً و سیعلم من سوّل لک و مکنک من رقاب المسلمین بئس للظالمین بدلاً و ایکم شر مکاناً و اضعف جندا و لئن جرت علی الدواھی مخاطبتک انی لاستصغر قدرتک و استعظم تقریعک و استکثر توبیخک لکن العیون عبریٰ و الصدور حری الا فالعجب کل العجب لقتل حزب اللّٰہ النجباء بحزب الشیطان الطلقاء فھذہ الایدی تنطف من دمائنا و الافواہ تتحلب من لحومنا و تلک الجثث الطواھر الزواکی تنتابھا العواسل و تعفرھا امھات الفراعل و لئن اتخذتنا مغنماً لتجدنا و شیکا مغرماً حین لا تجد الا ما قدمت یداک وما ربک بظلام للعبید فالی اللّٰہ المشتکی و علیہ المعول فکد کیدک واسع سعیک و ناصب جھدک فواللّٰہ لا تمحو ذکرنا ولا تمیت وحینا ولا تدرک امرنا ولا ترحض عنک عارھا و ھل رایک الا فندا و ایامک الا عدد و جمعک الا بدد یوم ینادی المنادی الا لعنۃ اللّٰہ علی الظالمین و الحمد للّٰہ رب العالمین الذی ختم لاولنا بالسعادۃ و المغفرۃ ولآخرنا بالشھادۃ و الرحمۃ و نسئل اللّٰہ ان یکمل لھم الثواب و یوجب المزید و یحسن علینا الخلافۃ انہ رحیم ودود و حسبنا و نعم الوکیل﴾۔[1]

سب تعریف اس خدا کے لئے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے اور درود وسلام ہو اس کے رسولؐ اور انکی اہل بیتؑ پر! خدا کا ارشاد برحق ہے کہ ان لوگوں کا انجام جو برابر برے کام کرتے رہے یہ ہوا کہ خدا کی آیات کو جھٹلایا اور ان کے ساتھ تمسخر کیا۔ اے یزید! اس بات سے کہ تو نے ہم پر زمین کے گوشے اور آسمان کے کنارے تنگ کر دیے اور ہمیں قیدیوں کی طرح ہنکایا جا رہا ہے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم خدا کی نظر میں ذلیل اور تو عزیز اور جلیل ہے؟ تو نے دیکھا کہ آج دنیا تجھے حاصل ہے اور تمام اسباب مجتمع ہیں اور ہماری سلطنت تیرے قبضہ اقتدار میں ہے۔ اس لئے کہ تو ناک چڑھا کر اترا رہا ہے اور مسرور و شاد کام ہو رہا ہے۔ ٹھہر جلدی نہ کر! کیا تو خدا کا یہ فرمان بھول گیا ہے کہ" کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے ان کو جو ڈھیل دے رکھی ہے یہ ان کے لئے بہتر ہے! ہم تو محض اس لئے ان کو مہلت دیتے

---

[1] لہوف، ص ۱۶۱، ۱۶۶۔ قمقام، ص ۳۷۲۔ نفس المہموم، ص ۲۴۰ وغیرہ۔

ہیں کہ وہ (دل کھول کر) گناہ زیادہ کرلیں۔ ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب موجود ہے۔ اے آزاد کردہ غلاموں کے بیٹے! کیا عدل وانصاف ہے کہ تو اپنی آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو گھر میں پردہ کے اندر بٹھائے لیکن دختران رسول کو بے مقنعہ و چادر مکشفات الوجوہ اس حال میں شہر بشہر پھرائے کہ چشمہائے آبی پر خیمہ زن اور خانہ بدوش نیز قریب و بعید، رذیل و شریف، حاضر و غائب غرضیکہ تمام اقسام کے لوگ ان کا نظارہ کررہے ہیں اور ان کے ساتھ ان مردوں اور مددگاروں میں سے کوئی نہیں ہے۔ بھلا اس شخص سے کسی خیر و خوبی کی کیا امید ہوسکتی ہے جس کی (دادی نے) پاکبازوں کے جگر چبائے ہوں اور ان کا گوشت شہیدوں کے خون سے اگا ہو اور رسولؐ خدا کے خلاف جتھے اکٹھے کر کے جنگیں کی ہوں اور ایسا شخص ہم اہل بیتؑ کے بغض وعداوت میں کیونکر تامل اور سستی کرسکتا ہے جو ہماری طرف سے دشمنی وعداوت اور حسد وکینہ کی نظر سے نگاہ کرتا ہے۔ پھر تو گناہ (اور امر عظیم) نہ سمجھتے ہوئے (بلکہ خوش ہوکر) کہتا ہے کہ اگر آج تیرے بدر والے مقتول موجود ہوتے تو خوش ہوکر تجھے دعا دیتے کہ اے یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔ اے یزید! تو جوانان جنت کے سردار ابو عبداللہ (الحسینؑ) کے لب و دندان پر اپنی چھڑی سے بے ادبی کرتا ہے؟ تو کیوں ایسا نہ کرے، جبکہ تو نے ہمارے زخم کو گہرا کردیا اور ذریت رسولؐ اور عبدالمطلب کی اولاد میں سے ستارہ ہائے زمین کے خون مقدس بہا کر ان کی جڑ کو اصل سے اکھیڑ دیا پھر خوش ہوکر اپنے بزرگوں کو پکارتا اور صدا دیتا ہے۔ عنقریب تو ان کے انجام سے دوچار ہوگا اور انہی کے مورد (میں وارد ہوگا۔ اس وقت تو (اپنے اس رویہ ورفتار کی وجہ سے) اس بات کو پسند کرے گا کہ کاش تیرے ہاتھ شل ہوتے اور تو گونگا ہوتا اور جو کچھ کہا اور کیا ہے نہ کہتا اور نہ کرتا۔ یااللہ! ہمارا حق حاصل کر اور ہمارے ظالموں سے انتقام لے اور جن لوگوں نے ہمارا خون بہایا ہے اور ہمارے مددگاروں کو قتل کیا ہے ان پر اپنا قہر وغضب نازل کر۔ اے یزید! خدا کی قسم تو نے اپنا چمڑا کاٹا ہے اور اپنے ہی گوشت کے ٹکڑے کئے ہیں۔ تو ذریت رسول کا خون بہانے اور انکی ہتک حرمت کرنے کا بوجھ اٹھا کر عنقریب رسولؐ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا جبکہ (بروز قیامت) خدا ان سب کو ایک جگہ جمع کرلے گا۔ ان کی پراگندگی کو دور کرے گا اور ان کے دشمنوں سے ان کا انتقام لے گا۔ جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوگئے ان کو مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں۔ تیرے لئے خدا کا حاکم ہونا، پیغمبرؐ کا دشمن ہونا اور جبرائیلؑ کا (تمہارے برخلاف) ہمارا مددگار ہونا کافی ہے۔ جن لوگوں نے تیرے لئے زمین ہموار کی اور تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کیا ان کو معلوم ہوجائے گا کہ ظالموں کا کس قدر برا انجام ہے اور یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ کس کا انجام برا اور لشکر کمزور ہے۔

اے یزید! یہ بھی انقلاب روزگار اور حوادث دہر ناہنجار کا شاہکار ہے کہ میں تجھ سے خطاب کروں؟ میں تیرے مقام کو اس سے کہیں پست تر اور تیری زجر و توبیخ کرنے کو سخت عظیم سمجھتی ہوں مگر کیا کروں۔ آنکھ گریاں اور سینہ

سوزاں و بریاں ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ شیطانی گروہ اور اولاد طلقاء نے خدا کے نجیب گروہ کو قتل کر دیا ہے۔ یہ دیکھئے ان ہاتھوں سے ہمارا خون بہہ رہا ہے اور ان مونہوں سے ہمارا گوشت گر رہا ہے۔ افسوس ہے کہ کربلا میں ابدان طاہر بے گور و کفن پڑے ہوئے ہیں۔

اے یزید! اگر آج تو ہماری (ظاہری کمزوری) کو اپنے لئے غنیمت سمجھ رہا ہے تو کل فردائے قیامت تو اس بات کو تاوان سمجھے گا جب تو سوائے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے اور کچھ نہ پائے گا اور خدا اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔ ہم بارگاہ خدا میں ہی شکوہ و شکایت کرتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جس قدر جی چاہے مکر و فریب کر لے اور جس قدر چاہے تگ و تاز کر لے اور جی بھر کر جد و جہد کر لے۔ خدا کی قسم! تو ہرگز ہمارے ذکر جمیل مٹا نہیں سکتا۔ نہ ہماری وحی (شریعت) کو ختم کر سکتا ہے اور نہ ہی ہمارے مقام کی بلندی کو چھو سکتا ہے اور نہ اپنے کرتوت کی عار و شناعہ کو دور کر سکتا ہے۔ تیری رائے و تدبیر کمزور! اور (بادشاہی) گنتی کے چند یوم اور تیری جماعت پراگندہ ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب ایک منادی ندا کرے گا، آگاہ باشید! لعنت ہو ظلم و ستم کرنے والی قوم پر!

اس خدا کی حمد و ثناء ہے جس نے ہمارے پہلے کا خاتمہ سعادت و مغفرت کے ساتھ اور آخری کا شہادت و رحمت کے ساتھ فرمایا۔ ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ان کے اجر و ثواب کو مکمل فرمائے اور مزید اجر جزیل عطا فرمائے اور ہمیں ان کی صحیح جانشینی کرنے کی توفیق دے۔ وہ بڑا مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔

تبصرہ

رازق الخیری نے اپنی کتاب ''سیدہ کی بیٹی'' میں جلالۂ کربلا کے اس عظیم خطبۂ عالیہ کے متعلق جن پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے ہم بلا تبصرہ یہاں پیش کرتے ہیں:

''یزید کا دربار شامیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ہر شخص بے حس و حرکت اس طرح بیٹھا یا کھڑا تھا جس طرح پتھر کی مورتیں۔ ان کی زبانیں اور ان کے ہونٹ چپکے ہوئے تھے۔ ان کے دل دریائے حیرت میں غوطے کھا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں، جب شیر خدا کی بیٹی لاکھوں کے مجمع میں شیر کی طرح دھاڑ رہی تھی اور رعیت کے سامنے ان کے بادشاہ کو للکار رہی تھی۔ خود یزید دانت پیس پیس لیتا، ہونٹ چباتا اور تاؤ پیچ کھا رہا تھا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ سیدہ کی بیٹی کی تقریر روانی کا ایک چشمہ تھا کہ ابلا چلا آ رہا تھا اور فصاحت و بلاغت کا ایک دریا تھا جو بہے چلا جا رہا تھا اور کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس تقریر سے بی بی زینبؑ نے صداقت اور حق گوئی کا حق ادا کر کے اسلام کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔ اس تقریر سے شامیوں کو معلوم ہو گیا خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو کر اسلام کو کیسا زبردست دھچکا لگا ہے۔''

جناب فاطمہؑ بنت الحسینؑ اور ایک ناواقف حال شامی کی گستاخی

جناب بی بی کا یہ خطبہ سن کر یزید نے صرف اس قدر کہا۔

یا صیحة تحمد من صوائح　　　ما اھون الموت عن النوائح[1]

آل رسولؐ کے لئے کس قدر ہوش ربا اور صبر آزما تھی وہ ساعت جب ایک شامی نے جناب فاطمہ بنت الحسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حاکم وقت یزید سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ﴿یا امیر المومنین! ھب لی ھذہ الجاریة﴾ اے امیر! یہ کنیز مجھے دے دیں۔ یہ منحوس آواز سنتے ہی جناب فاطمہؑ اپنی پھوپھی زینب عالیہؑ کے دامن سے لپٹ گئیں اور کہا: ﴿یاعماہ! او تمت و استخدمت؟﴾ پھوپھی اماں! کیا یتیمی کے بعد اب مجھے کنیز بھی بنایا جا رہا ہے؟ جناب بی بی عالم نے بھتیجی کو تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لا ولا کرامة له﴾ نہیں بیٹی! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ پھر بی بی نے شامی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿کذبت و لومت ما ذالک لک لاله﴾ او شامی! تو نے غلط کہا اور اپنی کمینگی کا مظاہرہ کیا۔ ایسا کرنے کا نہ کوئی تجھے حق ہے اور نہ اس (یزید) کو۔ یزید نے کہا: ﴿لو اردت لفعلت!﴾ اگر میں چاہوں تو ایسا کرسکتا ہوں۔ ابوترابؑ کی صاحبزادی نے پوری جرأت واستقلال کے ساتھ فرمایا: ﴿کلا و اللہ! ما جعل اللہ لک ذالک؟ الا ان تخرج عن ملتنا و تدین بغیر دیننا﴾ ہرگز نہیں! خدا کی قسم ہرگز خدا نے تجھے یہ حق نہیں دیا مگر یہ کہ ہمارے دین سے کھلم کھلا نکل کر کوئی اور دین اختیار کرلے۔ اس پر یزید نے جلا کر کہا: ﴿انما خرج من الدین ابوک و اخوک!﴾ دین سے تیرا باپ اور بھائی نکلے ہیں (خاک بدہن قائل)۔ بی بی نے فرمایا: ﴿بدین اللہ و دین جدی و ابی و اخی اھتدیت انت و ابوک ان کنت مسلماً﴾ اگر تو مسلمان ہے تو تو نے اور تیرے باپ نے ہمارے جد (نانا) واب (بابا) اور بھائی کے ذریعے سے ہدایت حاصل کی ہے۔ یزید نے برافروختہ ہو کر کہا: ﴿کذبت یا عدوة اللہ﴾ اے خدا کی دشمن تو نے غلط کہا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ یزید کا یہ ہتک آمیز جواب سن کر شہزادی آبدیدہ ہوگئی اور فرمایا: ﴿انت امیر مسلط تشتم ظالماً و تقھر بسلطانک﴾ تو حاکم ہے اس لئے گالیاں دیتا ہے اور ظلم وجور کرتا ہے۔ اس اثناء میں اس شامی نے پھر یہی مطالبہ دہرایا۔ یزید نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: ﴿اعزب ذھب اللہ لک حتفاً قاضیاً﴾ دور ہوجا خدا تجھے موت دے۔[2] بعض کتب میں یہ بھی مذکور ہے کہ عقیلۂ بنی ہاشم اور یزید کی باہمی گفتگو کے بعد شامی نے

---

[1] ملہوف، ص ۱۹۶۔

[2] مخفی نہ رہے کہ ان کتب میں اس واقعہ کی نسبت فاطمہ بنت علی کی طرف دی گئی ہے لیکن ہماری کتب کی روایت کے مطابق یہ واقعہ جناب فاطمہ بنت الحسینؑ کے ساتھ پیش آیا۔ (منہ عفی عنہ)

دوبارہ اپنی خواہش کا اظہار کرنے کی بجائے یزید سے دریافت کیا: یہ لڑکی کون ہے؟ یزید نے کہا: یہ فاطمہ بنت الحسینؑ اور وہ زینب بنت علیؑ ہیں۔ شامی نے تعجب انگیز لہجہ میں پوچھا: حسین بن فاطمہ علیہا السلام وعلی ابن ابی طالبؑ! یہ اسی حسینؑ کی بیٹی ہیں جو فاطمہ زہرا اور علی ابن ابی طالبؑ کے فرزند ہیں؟ یزید نے کہا: ہاں اسی حسینؑ کی بیٹی ہیں! یہ سننا تھا کہ شامی کے تن من میں آگ لگ گئی اور پکار کر کہا: ﴿لعنک اللہ یا یزید! القتل عترۃ نبیک وتسبی ذریتہ واللہ ما توھمت الا انھم سبی الروم﴾ او یزید! خدا تجھ پر لعنت کرے، تو عترت رسول کو قتل کرتا ہے اور پھر ذریت رسول کو قید کرتا ہے۔ خدا کی قسم میرا تو یہ خیال تھا کہ یہ روم کے قیدی ہیں۔ یزید نے غصہ سے آگ بگولہ ہو کر کہا۔ ابھی میں تمہیں بھی انہیں کے ساتھ ملحق کرتا ہوں۔ پھر حکم دیا اور اس شامی کی گردن اڑا دی گئی۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ ایسے نازک حالات میں ثانی زہراؑ نے ذریت رسول کی عظمت ظاہر کرتے ہوئے یزید ایسے بدمغز بادشاہ کو ایسے بیباکانہ اور دندان شکن جوابات دے کر اس کی حکومت کے ارکان کو ہلا کر کھوکھلا کر دیا۔

امام زین العابدینؑ کے ساتھ یزید کا مکالمہ

دربار یزید میں یزید پلید نے امام زین العابدینؑ کو زبانی ایذا رسانی کی خاطر کئی بار چھیڑا مگر ہر بار امام عالی وقار نے اسے وہ دندان شکن جوابات دیئے کہ یزید کھسیانہ ہو کر رہ گیا۔

ایک مرتبہ امام کو خطاب کر کے کہا: ﴿کیف صنع اللہ بک یا علی بن الحسینؑ﴾ اے علی ابن الحسینؑ تم نے اپنے ساتھ خدا کا سلوک کیسا دیکھا؟ امام نے فرمایا: ﴿رایت ما قضاہ عزوجل قبل ان یخلق السموات والارض﴾ میں نے وہی دیکھا ہے جس کا خدا نے زمین وآسمان کی خلقت سے بھی پہلے فیصلہ کر دیا تھا۔[2]

یزید نے کہا: ﴿یابن حسینؑ! ابوک قطع رحمی وجھل حقی و نازعنی سلطانی فصنع اللہ بہ ما قد رایت!﴾ اے فرزند حسینؑ! تیرے باپ نے مجھ سے قطع رحمی کی۔ میرے حق کو نہ پہچانا اور میری سلطنت میں مجھ سے جھگڑا کیا۔ لہٰذا آپ نے دیکھ لیا کہ خدا نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ امام علیہ السلام نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا﴾[3] زمین میں تمہیں جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہاری خلقت سے پہلے کتاب (لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہوتی ہے اور یہ بات خدا پر بالکل آسان ہے۔

---

[1] لہوف، ص ۱۶۷۔ تمام، ص ۲۷۸۔ نفس المہموم، ص ۲۴۴ وغیرہ۔
[2] مقتل الحسین، ص ۳۶۹، بحوالہ اثبات الوصیہ، ۱۴۳۔
[3] الارشاد، ص ۲۶۹۔

یزید نے یہ آیت پڑھی: ﴿مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ تمہیں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ امام نے فرمایا: ﴿ما هذه وفينا نزلت انما نزلت فينا ما اصابكم من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان نبراها ان ذالك على الله يسير لكيلا تاسو على ما فاتكم ولا تفرحوا بما اتاكم﴾[1]

یہ آیت ہمارے حق میں نہیں نازل ہوئی، ہمارے بارے میں تو یہ آیت اتری ہے کہ تم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ تمہاری خلقت سے بھی پہلے کتاب میں لکھ دی گئی ہے اور یہ بات خدا پر آسان ہے تاکہ جو کچھ فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو کچھ مل جائے اس سے خوش نہ ہو۔

﴿فنحن لا فاتني على ما فاتنا ولا نفرح بما اتانا﴾ پس ہم وہ لوگ ہیں جو چیز ہم سے فوت ہو جائے اس پر افسوس نہیں کرتے اور جو مل جائے اس پر خوش و خرم نہیں ہوتے۔[2]

بعض آثار میں وارد ہے کہ یزید نے امام بیمار سے کہا: ﴿اراد جدک و ابوک ان يكونا اميرين والحمد لله الذي قتلهما وسفک دمائهما﴾ آپ کے جد (علیؑ) اور باپ (حسینؑ) نے چاہا کہ وہ امیر و بادشاہ بنیں لیکن خدا کا شکر ہے جس نے ان کو قتل کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لم تزل النبوة و الامرة لاٰبائي و اجدادي قبل ان تولد﴾ اے یزید! ابھی تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے آباؤ اجداد کے خانوادہ میں نبوت اور امارت موجود تھی۔''[3]

یزید کا ایک دین فروش خطیب کو مذمت اہل بیتؑ کا حکم دینا اور پھر امامؑ کا خطبہ پڑھنا

جب اس طرح سوال و جواب سے یزید ذلیل و رسوا ہوا تو اپنی خفت اور سبکی کو کم کرنے کے لئے ایک دین فروش خطیب کو حکم دیا کہ منبر پر جا کر بزعم خود بنی امیہ کے فضائل اور بنی ہاشم کے رذائل و مثالب بیان کرے۔ چنانچہ خطیب نے منبر پا جا کر مقدور بھر معاویہ و یزید کی مدح اور جناب امیرؑ اور سید الشہداءؑ کی قدح کی۔ یہ کیفیت دیکھ کر امام زین العابدینؑ نے بآواز بلند فرمایا: ﴿ويلک ايها الخاطب! اشتريت مرضات المخلوق بسخط الخالق فتبو مقعدک من النار﴾ اے خطیب! افسوس ہے تجھ پر۔ تو نے خالق کو ناراض کر کے مخلوق کی رضامندی خریدی ہے اس لئے تو جہنم میں اپنی جگہ مہیا سمجھ۔[4] جب وہ دین فروش ملا منبر سے نیچے اترا تو امامؑ نے یزید سے فرمایا مجھے اجازت ہے کہ ﴿ان ارقى هذه الاعواد و اتكلم بكلام فيه لله تعالى رضیً و لهولاء اجر و ثواب﴾۔

1۔ عقد فرید، ج ۲، ص ۳۱۳۔ طبری، ج ۶، ص ۲۶۷۔
2۔ تفسیر قمی، ص ۶۰۳۔
3۔ مقتل مقرم، ص ۴۸۷۔
4۔ لہوف، ص ۱۶۷۔

منبر پر چڑھ کر وہ کچھ بیان کروں جس میں خدا کی خوشنودی ہے اور ان لوگوں کے لئے باعث اجر و ثواب ہے۔ یزید نے کچھ پس و پیش کیا، لیکن حاضرین کے اصرار سے مجبور ہو کر اجازت دے دی۔ جب امام عالی مقام اپنے اصلی منصب و مقام پر پہنچے تو خدا کی حمد و ثناء اور پیغمبر اسلام پر درود و سلام بھیجنے کے بعد فرمایا: ﴿ایها الناس من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا اعرفه بنفسی انا علی بن الحسینؑ انا ابن البشیر النذیر انا ابن الداعی الی اللّٰه باذنه انا ابن السراج المنیر﴾ ''ایہا الناس! جو شخص مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے اور جو نہیں پہچانتا میں اسے اپنی معرفی کرائے دیتا ہوں۔ میں علی بن الحسینؑ ہوں، میں بشیر و نذیر کا بیٹا ہوں، میں داعی الی اللہ کا بیٹا ہوں، میں سراج منیر (یعنی رسولؐ خدا) کا فرزند ہوں۔''[1]

احتجاج طبرسی ص۱۲۹ میں ﴿فانا اعرفه بنفسی﴾ کے بعد یوں وارد ہے: ﴿انا ابن مكة و منٰی و انا ابن المروة و الصفا و انا ابن محمد المصطفیٰؐ انا ابن من لا یخفٰی انا ابن من علی فاستعلی فجاء سدرة المنتهٰی فكان من ربه قاب قوسین او ادنٰی﴾۔

بعض کتب میں آپ کا وہ خطبہ شریفہ ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ فرمایا: ﴿الحمد للّٰه الذی لا بدایة له الدائم الذی لا نفاد له الاول الذی لا اول لاولیته والآخر لا آخر یته الباقی بعد فناء الخلق قدر اللیالی والایام وقسم فیما بینهم الاقسام فتبارک اللّٰه العلام﴾ پھر فرمایا: ﴿معاشر الناس من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا اعرفه بنفسی انا ابن مكة و منٰی انا ابن المروة والصفاء انا ابن محمد المصطفیٰؐ انا ابن من لا یخفٰی انا ابن من علی فاستعلی فجاز سدرة المنتهٰی و كان من ربه كقاب قوسین او ادنٰی انا بن من صلی بملائكة السماء مثنٰی مثنٰی انا ابن من اسری به من المسجد الحرام الی المسجد الاقصٰی انا ابن علی المرتضٰیؑ انا ابن فاطمة الزهراءؑ انا ابن خدیجة الكبریٰ انا ابن المقتول ظلماً انا ابن مجزوز الراس من القفاء انا ابن العطشان حتٰی قضٰی انا ابن طریح كربلا انا ابن مسلوب العمامة والرداء انا ابن من بكت علیه ملائكة السماء انا ابن من ناحت علیه الجن فی الارض و الطیر فی الهواء انا ابن من راسه علی السنان یهدیٰ انا بن من حرمه من العراق الی الشام تسبٰی. ایها الناس! ان اللّٰه تعالٰی وله الحمد ابتلانا اهل البیت ببلاء حسن حیث جعل رایة الهدیٰ والعدل والتقی فینا وجعل رایة الضلالة و الردیٰ فی غیرنا فضلنا اهل البیت خصال فضلنا بالعلم والحلم والشجاعة والسماحة والمحبة والمحلة فی قلوب المؤمنین و اٰتانا مالم یؤت احداً

[1] مقاتل الطالبیین، ص ۸۹۔

من العالمین فینا مختلف الملائکۃ و تنزیل الکتاب... الخ﴾

میں صاحب مکہ ومنیٰ ہوں، میں صاحب مروہ وصفا ہوں، میں فرزند مصطفیٰؐ ہوں، میں اس باپ کا بیٹا ہوں جس کی شان مخفی نہیں ہے، میں اس بیٹا ہوں جو اس قدر بلند ہوا کہ سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے بڑھ گیا اور مقام قاب قوسین اوادنیٰ تک پہنچا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس نے فرشتوں کو نماز پڑھائی۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جایا گیا۔ میں علی مرتضیٰ کا فرزند ہوں، میں فاطمہ زہراؑ کا فرزند ہوں، میں خدیجۃ الکبریٰ کا فرزند ہوں، میں اس کا فرزند ہوں جسے ظلم وستم سے شہید کیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جسے پس گردن سے قتل کیا گیا، میں اس کا فرزند ہوں جو پیاسا راہیٔ ملک بقاء ہوا، میں شہید کربلا کا فرزند ہوں، میں اس کا فرزند ہوں جس کی دوش سے چادر اور سر سے عمامہ اتارلیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس پر فرشتوں نے آسمان میں، جنوں نے زمین میں اور پرندوں نے ہوا میں گریہ وبکاء کیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کا سرنوک سناں پر تحفتاً درباروں میں پیش کیا جارہا ہے۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کی مستورات کو عراق سے شام قید کر کے لایا جارہا ہے۔

ایہا الناس! خداوند عالم نے ہم اہل بیت رسولؐ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ کہ علم ہدایت وعدل اور تقویٰ ہم میں مقرر فرمایا؛ اور علم ضلالت وہلاکت ہمارے غیروں میں مقرر کیا۔ خداوند عالم نے ہمیں چھ چیزوں کے ساتھ فضیلت بخشی ہے۔ وہ ہیں علم۔ حلم۔ شجاعت۔ سخاوت محبت اور اہل ایمان کے دلوں میں منزلت۔ اور ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو عالمین میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کیا۔ ہمارے گھروں میں ملائکہ کی آمد ورفت کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور ہمارے ہی گھر میں کتاب خدا اتری ہے۔[1]

راویان اخبار کا بیان ہے کہ ابھی امام کا خطبہ جاری وساری تھا کہ حاضرین دربار نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ جب یزید نے یہ نازک صورت حال دیکھی اور انقلاب کا خطرہ محسوس کیا تو موذن کو حکم دیا کہ اذان دے چنانچہ موذن نے اذان دینا شروع کی۔ امامؑ نے خطبہ بند کر دیا۔ موذن نے کہا: ﴿اللّٰہ اکبر﴾ امامؑ نے فرمایا: ﴿اللّٰہ اکبر و اجل و اعلیٰ و اکرم مما اخاف و احذر﴾ موذن نے کہا: ﴿اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ﴾ امامؑ نے فرمایا: ﴿نعم اشھد مع کل شاھدان لا الہ غیرہ ولا رب سواہ﴾ جب موذن نے کہا: ﴿اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ﴾ امام نے موذن سے فرمایا: ﴿اسئلک بحق محمدٍ ان تسکت حتی اکلم ھذا﴾ تجھے ابھی محمدؐ کا واسطہ ذرا خاموش ہو جا تا کہ میں اس (یزید) سے کچھ کلام کرلوں۔ پھر یزید کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ھذا الرسول العزیز الکریمؐ جدی ام جدک؟ فان قلت جدک علم الحاضرون والناس کلھم

---

[1] مقتل مقرم، ص ۳۸۲۔

انک کاذب و ان قلت انہ جدی فلم قتلت ابی ظلماً و عدواناً و انتھبت ما لہ و سبیت نسائہ فویل لک یوم القیامۃ اذا کان جدی خصمک﴾ یہ رسولِ اکرمؐ تیرے جد ہیں یا میرے؟ اگر تو یہ کہے کہ تیرے جد ہیں تو حاضرین اور تمام لوگ گواہی دیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور اگر تو یہ مانتا ہے کہ یہ میرے جد ہیں تو پھر میرے باپ (حسینؑ) کو ظلم وجور سے کیوں شہید کیا ہے؟ پھر ان کے مال واسباب کو کیوں لوٹا ہے؟ اور ان کی مخدرات کو کیوں قید کیا ہے؟ او یزید بروز قیامت ویل ہے تیرے لئے جبکہ میرے جدّ نامدار تیرے دشمن ہوں گے۔ اس کے بعد یزید نے اسی موذن کو اقامت نماز کا حکم دیا لیکن لوگوں میں ایک ہمہمہ اور غلغلہ تھا چنانچہ بعض نے نماز پڑھی اور بعض ویسے ہی متفرق ہو گئے۔[1]

یزید کا حاضرین دربار سے آلِ رسولؐ کے بارے میں مشورہ کرنا

پھر یزید نے اہلِ دربار سے اسیران آلِ رسولؐ کے بارے میں مشورہ کیا (یعنی ان کو قتل کیا جائے، قید میں رکھا جائے یا رہا کر دیا جائے؟)

بعض ملاعین نے بڑے گستاخانہ الفاظ میں (جن کو نقل نہیں کیا جا سکتا) سب کو شہید کر دینے کا مشورہ دیا۔[2]

اس وقت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ﴿یا یزید! لقد اشار علیک ھؤلاء بخلاف ما اشار بہ جلساء فرعون علیہ حین شاورھم فی موسیٰؑ وھارونؑ فانھم قالوا ارجہ واخاہ ولا یقتل الا الادعیاء اولاد الانبیاء وابنائھم﴾ اے یزید! تیرے درباریوں نے تجھے وہ مشورہ دیا ہے جو فرعون کے درباریوں نے بھی نہیں دیا تھا جب کہ اس نے جناب موسیٰؑ وہارونؑ کے بارے میں ان سے مشورہ کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کو ڈھیل دو (قید میں ڈال دو) یاد رکھو کہ انبیاء کی اولاد کو سوائے ولد الزنا کے اور کوئی قتل نہیں کرتا۔[3] ہاں البتہ نعمان بن بشیر نے یہ مشورہ دیا ﴿ما کان الرسولؐ یصنع بھم فاصنعہ بھم﴾ جو رسولِ اکرمؐ ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے تو بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کر۔[4]

اسیران آلِ محمدؐ زندانِ شام میں

بالآخر یزید نے قتل کا ارادہ ترک کر کے ان کو زندان میں بھیجنے کا فیصلہ کیا چنانچہ اس کے اقامتی محل کے قریب جو زندان تھا اس میں اسیران آلِ محمدؐ کو بھیج دیا۔ اس زندان کو اجمالی کیفیت ارباب مقاتل نے یہ لکھی ہے کہ ﴿لا یکنھم من حرّ ولا برد فاقاموا بہ حتی تقشرت وجوھھم و کانوا فی مدۃ اقامتھم ینوحون علی

---

[1] نفس المہموم، ص ۲۴۳۔ مقتل الحسین، ص ۳۲۲۔
[2] لہوف، ص ۱۶۲۔ قمقام، ص ۵۷۹ وغیرہ۔
[3] اثبات الوصیہ للمسعودی، ص ۱۴۳، طبع النجف۔
[4] لہوف، ص ۱۶۶۔

الحسين﴾ جو گرمی اور سردی سے حفاظت نہیں کرتا تھا (یعنی اس پر چھت نہ تھی) [۱] اتنا عرصہ ان کو اس زندان میں رکھا گیا کہ ان کے چہروں کے رنگ جھلس گئے۔ اور پوری مدت قیام کے دوران وہ برابر حسینؑ پر نوح و ماتم کرتے رہتے تھے۔ [۲]

اس کے بعد یزید کے حکم سے جناب سید الشہداؑ کا سر اقدس قصر الامارہ کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا جو تین دن تک لٹکا رہا۔ [۳] اور بروایتے جامع مسجد کے منارہ پر چالیس دن تک لٹکا رہا۔ [۴] اور دوسرے شہداء کے سرہائے مقدسہ میں سے بعض کو شہر شام کے مختلف دروازوں پر اور بعض کو جامع مسجد کے دروازں پر لٹکایا گیا۔ [۵]

زندان شام اور دربار یزید کے بعض واقعات

بعض آثار و اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ یزید عنید نے یہ معمول بنالیا تھا کہ سید الشہداؑ کے سر اقدس کو دربار میں طلب کرتا پھر مجلس شراب جماتا۔ ایک بار وہ اسی قسم کے لہو ولعب کے مظاہرہ میں مشغول تھا اور اس وقت دربار میں بادشاہ روم کا ایک نصرانی سفیر بھی موجود تھا۔ اس نے یزید سے دریافت کیا: ﴿هذا الراس من﴾ یہ کس کا سر ہے؟ یزید نے کہا: ﴿مالک و لهذا الراس؟﴾ تجھے اس سے کیا سروکار ہے؟ سفیر نے کہا میں جب لوٹ کر اپنے ملک جاتا ہوں تو بادشاہ مجھ سے سب واقعات دریافت کرتا ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ حقیقت حال معلوم کروں تاکہ تمہاری اس مسرت وشادمانی میں ہمارا بادشاہ بھی تمہارے ساتھ شریک ہو سکے یزید نے کہا: ﴿هذا راس حسين بن علي بن ابي طالب﴾ یہ حسینؑ بن علیؑ کا سر ہے۔ سفیر نے پوچھا: ﴿و من امه؟﴾ ان کی ماں کا کیا نام ہے؟ یزید نے کہا: فاطمه بنت رسول الله یہ سنتے ہی نصرانی نے کہا: ﴿اف لک ولدينک لي دين احسن من دينكم﴾ اف ہے تم پر اور تمہارے دین پر! تمہارے دین سے تو میرا دین بہتر ہے۔ میرا باپ حضرت داؤد کے نواسوں میں سے ہے۔ حالانکہ میرے اور جناب داؤد کے درمیان کئی (بروایتے ستر (۷۰)) پشتوں [۶] کا فاصلہ ہے لیکن اس کے باجود نصرانی لوگ محض یہ سمجھ کر کہ میں حضرت داؤد کا نواسہ ہوں میری اس قدر تعظیم وتکریم کرتے ہیں کہ میرے قدموں کی مٹی بطور

---

۱ انوار نعمانیہ، ص ۳۴۰۔ لقمام، ص ۱۶۹۔

۲ ملہوف، ص ۱۶۸۔ امالی شیخ صدوق، ص ۱۰۱۔ عاشر بحار، ص ۲۲۷۔ نفس المہموم، ص ۲۳۵۔

۳ مقتل الحسین، ص ۲۲۵۔ خطط مقریزیہ، ج ۲، ص ۲۸۹۔ الاتحاف بحب الاشراف، ص ۲۳۔ مقتل خوارزمی، ج ۲، ص ۷۵۔ البدایہ والنہایہ ابن اثیر، ج ۸، ص ۲۰۴۔ امالی صدوق، ص ۱۰۰۔

۴ نفس المہموم، ص ۲۲۷۔

۵ نفس المہموم، ص ۲۲۷۔ مقتل الحسین، ص ۲۲۶۔

۶ ملہوف، ص ۱۶۹۔

تبرک حاصل کرتے ہیں۔ ﴿و انتم تقتلون ابن بنت نبیکم وما بینکم و بین نبیکم الا ام واحدة فای دین دینکم؟﴾ مگر تم اپنے نبی کی دختر کے فرزند کو قتل کرتے ہو۔ حالانکہ تمہارے اور تمہارے رسولؐ کے درمیان صرف ایک ماں کا فاصلہ ہے تمہارا کیسا دین ہے؟ پھر سفیر روم نے یزید سے کہا تجھے ''کنیسہ حافر'' والے واقعہ کا علم ہے؟ یزید نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ سفیر نے کہا عمان اور چین کے درمیان ایک بڑا عظیم الشان شہر ہے۔ جس میں نصرانی لوگ آباد ہیں۔ اس میں کئی کنیسے (گرجے) ہیں۔ ان میں سب سے بڑا کنیسہ حافر ہے اس کے محراب میں سونے کا ایک ظرف لٹکا ہوا ہے جسے ریشم و دیبا سے آراستہ کیا گیا ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اس میں حضرت عیسیٰؑ کے سواری والے گدھے کی سم موجود ہے! ہر سال نصرانی لوگ اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اس کے اردگرد طواف کرتے ہیں۔ اسے چومتے ہیں اور اس کے پاس کھڑے ہو کر خدا سے حاجتیں طلب کرتے ہیں؟ نصرانی تو اس قسم کا۔ اس قدر اکرام واحترام کریں۔ جسے وہ اپنے نبی کی سواری کے گدھے کا خیال کرتے ہیں۔ مگر تم ﴿انتم تقتلون ابن بنت نبیکم فلا بارک اللّٰہ فیکم ولا فی دینکم﴾ اپنے نبی کی دختر کے فرزند کو قتل کرتے ہو۔ خدا تم میں اور تمہارے دین میں برکت نہ دے۔

سفیر کا یہ کلام سن کر یزید نے حکم دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے کہ یہ واپس جا کر اپنے ملک میں مجھے ذلیل وخوار نہ کرے۔ جب نصرانی نے اپنے قتل کیے جانے کا حکم سنا تو اس نے یزید سے پوچھا: ﴿اتریدان تقتلنی؟﴾ کیا تو واقعا مجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟ یزید نے کہا: نعم۔ ہاں۔ سفیر نے کہا: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ﴿رایت البارحة نبیکم فی المنام یقول یا نصرانی انت من اهل الجنة؟﴾ میں نے گذشتہ رات عالم خواب میں تمہارے پیغمبرؐ کو دیکھا جو مجھ سے فرما رہے تھے۔ اے نصرانی! تو جنتی ہے؟ مجھے اس سے بڑا تعجب ہوا (مگر اب راز کھل گیا ہے اس لئے) اشهدان لا اله الا اللّٰه وان محمد ارسول اللّٰه۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمدؐ اس کے رسولؐ ہیں۔ اس کے بعد نصرانی سید الشہداءؑ کے سر مبارک کی طرف بڑھا اور اسے سینہ سے لگا لیا اور رو رو کر اسے بوسے دینے لگا۔ اسی اثنا میں یزید کے حکم سے اسے شہید کر دیا گیا۔[1] رضوان اللّٰہ علیہ

امام سجادؑ کی تسبیح

یزید امام زین العابدینؑ کے قتل کے بہانے تلاش کیا کرتا تھا۔ ایک بار امام کو دربار میں بلایا اور مختلف موضوعات پر سلسلہ گفتگو شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح امام کوئی ایسی بات کہہ دیں جس سے اس کے لئے ان کے قتل کا جواز پیدا ہو جائے۔ امامؑ اس کی باتوں کا جواب بھی دیتے جاتے تھے اور دست مبارک میں جو چھوٹی سی تسبیح

---

[1] لہوف، ص ۱۷۲، نفس المہموم، ص ۲۳۸۔ عاشر بحار، ص ۲۲۸ وغیرہ۔

تھی۔ اسے بھی برابر پھیرتے جاتے تھے۔ یزید نے جھلا کر کہا یہ کیا بات ہے؟ میں تم سے باتیں کر رہا ہوں مگر آپ مجھے جواب بھی دیتے ہیں۔ اور ہاتھ میں تسبیح لئے اسے بھی پھیرتے جاتے ہیں! امام نے فرمایا مجھ سے میرے والد ماجد نے میرے جد بزرگوار کا یہ معمول نقل کیا ہے کہ جب وہ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تھے تو کلام کرنے سے پہلے ہاتھ میں تسبیح لے کر اس کے دانوں کو پھیرتے جاتے تھے اور یہ دعا بھی پڑھتے جاتے تھے: ﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَصْبَحْتُ اُسَبِّحُکَ وَ اَحْمِدُکَ وَ اُھَلِّلُکَ وَ اُکَبِّرُکَ وَ اُمَجِّدُکَ بِعَدَدِ مَا اُدِیْرُ بِهٖ سُبْحَتِیْ﴾ اس کے بعد اپنے ضروریات کے متعلق بات چیت کرتے۔ اس طرح وہ بات بھی ان کی تسبیح شمار ہوتی تھی۔ اور یہ تسبیح صبح ان کے لئے رات کے سونے تک (بلیات و آفات) حرز ہوتی تھی اور جب رخت خواب پر تشریف لے جاتے۔ تو پھر حسب سابق عمل کرتے بعد ازاں تسبیح کو زیر بالین رکھ دیتے۔ اس طرح نماز صبح تک یہ تسبیح ان کے اعمال صالحہ میں شمار ہوتی۔ میں بھی اپنے جد امجد کی اقتداء کرتے ہوئے ایسا ہی کیا کرتا ہوں۔ یزید نے امام سجاد کا یہ جواب باصواب سن کر کہا میں جب بھی تمہارے خاندان کے کسی آدمی سے کوئی بات کرتا ہوں تو وہ ایسا جواب دیتا ہے جس میں فوز و فلاح پوشیدہ ہوتی ہے۔[1]

امام بیمار سے منہالؒ کی ملاقات

منہال بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک بار امام زین العابدین علیہ السلام کو دیکھا جب کہ وہ شام کے بازار سے گذر رہے تھے۔ اس وقت آپ کی حالت یہ تھی کہ عصا پر ٹیک لگا کر چل رہے تھے سر کنڈے کی طرح ٹانگیں کمزور تھیں۔ پنڈلیوں سے خون جاری تھا۔ رنگت میں صفرت (زردی) کا غلبہ تھا۔ یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور عرض کیا: ﴿کیف اصبحت یا بن رسول اللّٰه!﴾ فرزند رسولؐ! آپ نے کس حال میں صبح کی ہے؟ میرا سوال سن کر امام بیمار رو پڑے پھر فرمایا: ﴿کیف حال من اصبح اسیراً لیزید بن معاویه و نسائی الی الآن ما شبعن بطونهن ولا کسین رؤسهن نائحات اللیل و النهار. نحن یا منهال کمثل بنی اسرائیل فی ال فرعون یذبحون ابنائهم و یستحیون نسائهم امست العرب تفتخر علی العجم بان محمداً عربی و امست قریش تفتخر علی العرب بان محمداً منهم، امسینا معشر اهل البیت مغصوبین مقتلین مشرّدین ما یدعونا یزید الیه مرة الا نظن القتل اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اس آدمی کی کیا حالت پوچھتے ہو جو یزید بن معاویہ کا قیدی ہو جس کی مستورات نے پیٹ بھر غذا نہ کھائی ہو اور نہ ان کے پاس سر ڈھانپنے کے لئے کپڑا موجود ہو۔ اور دن رات گریہ و بکا سے سروکار ہو۔ پھر فرمایا: اے منہال! اس امت میں ہماری

---

[1] نفس المہموم، ص ۳۴۳۔ تمقام، ص ۳۸۵۔

حالت وہی ہے جو آل فرعون میں بنی اسرائیل کی تھی جوان کے لڑکوں کو قتل کرتے تھے۔ اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اہل عرب اہل عجم کے بالمقابل فخر کرتے ہیں کہ جناب محمد مصطفٰے عربی ہیں۔ پھر قریش تمام عربوں کے سامنے فخر کرتے ہیں کہ جناب رسول خدا ان کے خاندان سے ہیں مگر ہم اہل بیت رسول کی حالت یہ ہے کہ ہمارے حقوق غصب کر لئے گئے۔ پھر قتل کیا گیا۔ اور وطن سے بے وطن کر دیا گیا جب بھی یزید ہمیں بلاتا ہے تو ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ اب وہ ہمیں قتل کردے گا۔[1] اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

یعظون له اعواد منیره　　　وتحت ارجلهم اولاده وضعوا

بای حکم بنوه یتبعونکم　　　وفخرکم انکم صحب له تبع

جناب سکینہ بنت الحسینؑ کا زندان شام میں ایک عجیب خواب دیکھنا

جناب سکینہ بنت الحسینؑ بیان کرتی ہیں کہ ہمیں زندان شام میں قیام کئے ابھی چوتھا دن تھا کہ میں روتی رہی اور بڑی دیر سے سوئی سوتے ہی میں نے ایک خواب دیکھا (پھر ایک طویل خواب بیان کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے) کہ پانچ نوری ناقاؤں سے پانچ بزرگوار سوار اترے (۱) حضرت آدم صفی اللہ (۲) حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت عیسٰی روح اللہ اور حضرت محمد حبیب اللہ اور پانچ عماریاں اتریں جن میں سے ایک میں جناب حوام البشر، دوسری میں جناب آسیہ بنت مزاحم تیسری میں جناب مریم بنت عمران، چوتھی میں جناب خدیجہ بنت خویلد اور پانچویں میں حضرت فاطمہ زہراؑ سوار تھیں۔ پہلے جناب سکینہ نے اپنے جد نامدار کی خدمت میں اپنے مصائب وآلام کا تذکرہ کیا۔ اور اس کے بعد اپنی جدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تفصیل کے لئے عاشر بحار، ص ۲۲۷، قمقام، ص ۴۸۶، نفس المہموم، ص ۲۴۵، اور انوار نعمانیہ ۳۴۱ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس خواب کے آخر میں یہ مذکور ہے کہ میں نے ایک مستور کو ہودج میں دیکھا جس نے شدت غم سے اپنا ہاتھ سر پر رکھا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا یہ معظمہ کون ہیں؟ تو مجھے بتایا گیا کہ تمہاری جدہ ماجدہ فاطمہ زہراؑ ہیں پس میں جلدی جلدی ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جا کر سامنے کھڑی ہوگئی۔ اور روتے ہوئے عرض کیا: ﴿یا اماہ جحدوا واللّٰه حقنا یا امّاه بدد واللّٰه شملنا یا اماه استبا حوا واللّٰه حریمنا یا امّاه قتلوا واللّٰه الحسین ابانا﴾ ''اے اماں! بخدا لوگوں نے ہمارے حق کا انکار کیا۔ اے اماں بخدا لوگوں نے ہماری جمعیت کو پراگندہ کر دیا، ہماری حرمت کا خیال نہ کیا۔ اے اماں! بخدا لوگوں نے ہمارے بابا حسینؑ کو شہید کر دیا۔''

میری یہ داد وفریاد سن کر خاتون قیامت نے مجھ سے فرمایا: ﴿کفی یا سکینة! فقد قطعت نياط قلبی

[1] انوار نعمانیہ، ص ۳۴۰۔ لہوف، ص ۱۷۳۔ نفس المہموم، ص ۲۳۹۔

ھذا قمیص ابیک الحسینؑ لا یفارقنی حتی القی اللّٰہ بہ﴾ اے سکینہ! خاموش ہو تو نے تو میرے قلب حزین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ یہ دیکھو! تمہارے بابا حسینؑ کی قمیص ہے جب تک میں اسے لے کر بارگاہ ایزدی میں پیش نہ ہوں۔ اس وقت تک یہ مجھ سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔[1]

ہند زوجہ یزید کا خواب دیکھنا

بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سکینہ کے خواب سے ملتا جلتا ایک خواب ہند زوجہ یزید نے بھی بقول صاحب ناسخ التواریخ (ج ۶ ص ۳۵۱) اسی رات (اہل بیت کے وارد دمشق ہونے کی چوتھی رات) دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور فرشتے صف اندر صف زیارت حسینؑ کے لئے اتر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ السلام علیک یا بن رسول اللّٰہ! اسی اثنا میں آسمان سے ایک بادل زمین پر اترا جس سے چند بزرگ برآمد ہوئے ان میں سے ایک بزرگ نے جو سفید رنگ اور قمر نما چہرہ والے تھے۔ اپنے آپ کو حسینؑ کے سر مبارک پر گرا دیا اور ان کے لب و دندان کے بوسے لیتے ہوئے فرمایا: ﴿یا ولدی قتلوک! اتراھم ما عرفوک من شرب الماء منعوک یا ولدی انا جدک رسول اللّٰہ! و ھذا ابوک علی المرتضی و ھذا اخوک الحسن وھذا عمک جعفر و ھذا عقیل و ھذان حمزہ و العباس﴾ اے فرزند! ان لوگوں نے تجھے شہید کر دیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ انہوں نے تمہیں نہیں پہچانا؟ اور تجھے پانی پینے سے بھی روک دیا۔ اے فرزند میں تیرا نانا رسولؐ ہوں! یہ تیرے بابا علی مرتضیٰؑ اور یہ تیرے بھائی حسنؑ اور یہ تیرے چچا جعفر عقیل اور یہ حمزہ و عباس ہیں۔ اسی طرح اپنے خاندان کے اور بھی بعض بزرگوں کے نام لئے۔ ہند کہتی ہیں کہ یہ ماجرا دیکھ کر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ سر حسینؑ کو دیکھا کہ اس پر نور برس رہا ہے۔ میں اٹھ کر یزید کو ڈھونڈنے لگی۔ اچانک دیکھا کہ ایک تاریک کمرے میں دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے کہہ رہا ہے۔ مالی وللحسین؟ مجھے حسینؑ سے کیا سروکار تھا؟ ہند نے اپنا خواب بیان کیا مگر یزید سر جھکائے سنتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔[2] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہند کا یہ خواب بھی اسیران آل رسول کی جلد رہائی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

ہند زوجہ یزید کا ننگے سر دربار میں نکل آنا

اسیران آل رسولؐ کے قیام دمشق کے زمانہ میں ہند زوجہ یزید کے بارے میں دو روایتیں عام طور پر مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ ایک روز وہ قید خانہ میں گئیں اور اسیران اہل بیت کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مگر چونکہ یہ روایت کسی قابل اعتبار کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب سید الشہداء کا سر

---

[1] ملہوف، ص ۶۔
[2] ناسخ، ج ۶، ص ۳۵۱۔ عاشر بحار، ص ۲۳۳۔ منتخب طریحی، ص ۴۳۹ وغیرہ۔

مبارک یزید کے محل کے دروازہ پر آویزاں کیا گیا۔ (وهو الظاهر من الفاظ الرواية) اور اس بات کا ہندہ کو علم ہوا تو ننگے سر (اور بروایتے ننگے پاؤں بھی[1]) دربار میں نکل آئی۔ اور یزید سے کہا جب کہ وہ مجلس عام جمائے بیٹھا تھا: ﴿يا يزيد. اراس ابن فاطمة بنت رسول الله! مصلوب على فناء بابى؟﴾ اے یزید! کیا دختر رسول فاطمہ زہرا کے فرزند کا سر میرے گھر کے دروازہ پر لٹکایا جائے؟ یزید نے فوراً اٹھ کر اس کے سر پر چادر ڈالی۔ اور مصلحت وقت کے پیش نظر کہا: ﴿نعم فاعولى عليه يا هند وابكى على ابن بنت رسول الله و صريخة قريش عجّل عليه ابن زياد فقتله قتله الله﴾ ہاں اے ہندہ! یہ سر حسینؑ ہی کا ہے۔ اے ہندہ! تم فرزند دختر رسول اور خلاصہ دودمان قریش پر خوب گریہ وبکا کرو۔ ابن زیاد نے جلد بازی سے کام لیا اور ان کو قتل کر دیا۔ خدا اسے قتل کرے۔[2]

یہ واقعہ قریباً مقتل کی تمام کتب معتبرہ وغیرہ معتبرہ میں موجود ہے۔ لہٰذا مجاہد اعظم کے فاضل مصنف کے صرف اسی عقلی استبعاد کی بنا پر اسے غلط نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ''عقل سلیم اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی کہ ایک شہنشاہ کی بی بی اس طرح بے حجابانہ مجمع عام میں نکل آئے۔ یزید اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تاجدار اور سب سے وسیع سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اسی طرح ہندہ بھی دنیا کی ان شاہی بیگمات سے جن کو ملکہ آفاق کہلائے جانے کا شرف حاصل تھا سب سے بڑی شہنشاہ بیگم تھی۔ یزید کے محلات بھی غالباً شاہی قاعدے سے بنے ہوں گے۔ متعدد ڈھوڑیاں اور ہر ڈھوڑی پر خواجہ سراؤں اور محافظوں کا انتظام تھا۔ پھر کیوں کر قیاس میں آ سکتا ہے کہ ہندہ باوجود شاہی انتظامات اور پہرہ چوکی کے اس طرح بے تحاشا اور بے پردہ بھرے دربار میں نکل آئی۔ الخ (مجاہد اعظم، ص ۲۹۳/۲۹۴) کسی کے قیاس میں آئے یا نہ آئے جب ایک واقعہ کتب معتبرہ میں موجود ہے تو اسے اپنی قیاس آرائیوں کی بناء پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ بریں ایسے غیر معمولی واقعات کے وقت ہندہ سے بھی بڑی عظیم الشان بیگمات کے بے مقنعہ و چادر درباروں میں چلے آنے کے متعدد واقعات کتب سیر وتواریخ میں مل جاتے ہیں۔ چونکہ اس خاتون کو ایک گونہ خاندان نبوت سے لگاؤ تھا۔ اس لئے یہ ہولناک منظر دیکھ کر از خود رفتہ ہوگئی۔ اور عالم بے تابی میں یوں بے حجابانہ باہر نکل آئی جیسا کہ ناسخ میں لکھا ہے: ﴿از خرد بیگانه شد و بی هوشانه از سرائے خویش بیرون دوید و بی پرده بمجلس یزید..... الخ﴾ دریں حالات اس بات میں کون سا استبعاد ہو سکتا ہے؟ ہاں البتہ اس سلسلہ میں جو کچھ منتخب طریحی (ص ۲۴۲ طبع بمبئی) میں مرقوم ہے کہ وہ دربار میں آئی تو یزید کو بہت لعن طعن کی اور کہا نہ تو میرا شوہر

---

[1] نفس المہموم، ص ۲۴۹۔

[2] عاشر بحار، ص ۲۲۸۔ جلاء العیون، ص ۲۱۴۔ نفس المہموم، ص ۲۴۶۔ مقتل الحسین خوارزمی، ج ۲، ص ۷۳۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۴۷۔ طبری، ص ۱۴۷، ج ۶۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۹۸۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۸۰۔ ریاض القدس، ج ۲، ص ۳۳۰۔

ہے نہ میں تیری بیوی ہوں اور پھر ناراض ہو کر کہیں چلی گئی۔ یہ واقعہ بالکل بے اصل ہے اور کتب معتبرہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اہل علم جانتے ہیں طریحی کے متفردات قابل اعتماد نہیں ہوتے۔

"تذنیب"

یہ ہند زوجہ یزید کون تھی؟

بحمد اللہ جس قدر کتب مقاتل کی سیر کی گئی ہے۔ ان میں صرف اس قدر ملا ہے کہ یہ ہند عبداللہ بن عامر بن کریز کی دختر تھی۔ یزید کی زوجیت میں آنے سے پہلے جناب سید الشہداء کے حرم سرا میں داخل تھی [1] سرکار ناصر الملۃ لکھنوی نے اس سوال کو "ہندہ زوجہ یزید کون تھی؟ اسے اہل بیت رسالت سے کیا تعلق تھا؟ اس کا زندان شام میں آنا صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے بطن سے کوئی اولاد تھی یا نہیں؟ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "بحار الانوار میں منقول ہے کہ ہند زوجہ یزید لعنہ اللہ عبداللہ بن عامر بن کریز کی دختر تھی۔ اور قبل یزید کے وہ زوجہ امام حسین علیہ السلام کی تھی اور اس کا مجلس یزید میں نکل آنا تو روایات معتبرہ میں وارد ہے۔ لیکن زندان شام میں اس کا آنا کسی روایت معتبرہ میں مذکور نہیں ہے۔ اور بنا بر تصریح مورخین مخالفین مثل طبری و ابن الاثیر۔ یزید ملعون کا ایک لڑکا بطن ہند بنت عبداللہ بن عامر سے تھا (ہدایات ناصریہ ص ۶) ان سب تاریخی حقائق کے خلاف فاضل مقرم نجفی نے مقتل الحسینؑ کے ص ۱۵ پر یہ لکھا ہے کہ یہ ہند عمرو بن سہیل کی صاحبزادی تھی۔ اور پہلے عبداللہ بن عامر بن کریز کی زوجیت اور کتاب محبر ص ۴۵۰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عبداللہ سے پہلے عبدالرحمن بن عتاب بن اسید بن العیص کے عقد نکاح میں تھی۔ جب عبداللہ بن عامر کی زوجیت میں تھی تو یزید کو اس کے ساتھ شادی کرنے کی رغبت پیدا ہوئی۔ اس لئے معاویہ نے اپنے چہیتے بیٹے کی آرزو کی تکمیل کے لئے عبداللہ کو جو اس کی طرف سے بصرہ کا گورنر تھا۔ طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔ (ایسا ہی مقتل الحسین خوارزمی ج ۱ ص ۱۵۰ طبری ج ۶ ل ۱۹۷ میں مذکور ہے (مگر اس میں ہند کے باپ کا نام سہیل بن عمرو لکھا ہے) باقی رہی یہ بات کہ اس نے کس طرح سرکار سید الشہداء سے ناطہ توڑا اور کس طرح یزید سے رشتہ جوڑا؟ اس کی تفصیل کتب معتبرہ میں مذکور نہیں ہے۔ واللہ العالم

یزید کا عمرو بن الحسن کو اپنے بیٹے خالد کے ساتھ کشتی لڑنے کی دعوت دینا

ایک بار جب امام زین العابدینؑ کو دربار یزید میں بلایا گیا تو ان کے ساتھ عمرو بن الحسن بھی تھے (بعض کتب میں غلط طور پر عمرو بن الحسینؑ درج ہے) جن کی عمر قریبا گیارہ برس تھی۔ یزید نے اپنے بیٹے خالد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہزادہ سے کہا: اتصارع ہذا۔ کیا تم اس سے کشتی لڑو گے؟ شہزادہ نے جواب میں کہا: ﴿لا ولکن

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۲۸۔ نفس المہموم، ص ۲۲۹۔ دمعہ ساکبہ، ص ۳۸۰۔ تاریخ، ج ۶، ص ۳۴۷۔ مقتل خوارزمی، ج ۲، ص ۷۲ وغیرہ۔

اعطنی سکیناً واعطه سکیناً ثمه اقاتله﴾ ویسے نہیں ہاں اگر مقابلہ کرانے کا خیال ہے تو ایک چھری مجھے دے دو اور ایک اسے دے دو۔ پھر میں اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ شہزادہ کا یہ جواب سن کر یزید نے یہ ضرب المثل دہرائی: ﴿شنشنة اعرفها من اخزم هل تلد الحية الا الحية﴾۔[1]

یزید کا قتل امامؑ کی سازش کرنا اور اس میں ناکام ہونا

مدائنی کا بیان ہے کہ جب امام زین العابدینؑ نے دربار یزید میں وہ خطبہ پڑھا جس میں اپنے حسب ونسب کا تذکرہ تھا تو یزید نے آتش حسد سے پیچ و تاب کھا کر اپنے ایک پولیس ملازم کو حکم دیا کہ ان کو فلاں باغ میں لے جا کر قتل کر دو اور پھر وہیں دفن کر دو۔ چنانچہ وہ شخص امام کو اس باغ میں لے گیا۔ اور قبر کھودنے لگا۔ سید الساجدینؑ نے لمحات فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ جب وہ قبر کھود چکا اور قتل امام کا ارادہ کیا تو یکایک ہوا سے ایک دست غیبی نمودار ہوا۔ اور اسے ایک ایسا تھپڑ رسید کیا کہ وہ مدہوش ہو کر منہ کے بل گر پڑا۔ صرف ایک چیخ ماری اور پھر واصل جہنم ہو گیا۔ اتفاق سے خالد بن یزید یہ وحشت ناک منظر دیکھ رہا تھا اس نے واپس جا کر یزید سے یہ تمام ماجرا بیان کیا۔ یزید نے حکم دیا کہ اس قبر میں اس شخص کو دفن کر دو اور امام کو چھوڑ دو۔[2]

جناب سکینہ بنت الحسینؑ کے زندان شام میں وفات پانے کی رد

من جملہ ان قصص و حکایات کے جو بالکل بے بنیاد و بے سرو پا ہیں اور ان کی اصلاً کوئی اصلیت وحقیقت نہیں ہے۔ ایک قصہ بھی ہے کہ جناب سکینہ بنت الحسینؑ نے شدائد و مصائب زندان کی تاب نہ لاتے ہوئے قید خانہ میں (اور وہ بھی قید تنہائی میں) وفات پائی۔ اس سراسر غلط اور کذب محض روایت کو بڑے درد انگیز اور رقت خیز پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ اس میں کوئی اصلیت نہیں بلکہ بالکل کذب عظیم اور افترائے جسیم ہے۔ فریقین کے تمام مورخین اور علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ آپ واقعہ کربلا کے بعد مدت مدید تک زندہ رہیں۔ اور ۱۱۷ھ میں رحلت فرمائی۔ جو غلط واقعات آپ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ تاریخی شواہد و دلائل اور عقلی براہین سے ان کو غلط ثابت کرنا چاہیے۔ یہ منفی طریقہ کار کسی طرح بھی مستحسن نہیں کہ تمام مسلمہ تاریخی حقائق کا انکار کر کے ان کی وفات کا نظریہ اختیار کیا جائے تمام کتب سیر و تواریخ اور مقاتل موجود ہیں۔ کسی ایک قابل اعتماد کتاب میں بھی جناب سکینہ کے زندان شام میں وفات پانے کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ بعض کتب[3] میں سید الشہداء کی ایک تین سالہ بچی

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۲۸۔ نفس المہموم، ص ۲۵۰۔ قمقام وغیرہ۔

[2] تظلم الزہرا، ص ۲۷۶۔ عاشر بحار، ص ۲۲۷۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۸۰۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۳۶۔

[3] اسرار شہادت، ص ۵۳۳، بحوالہ منتخب طریحی۔

کی وفات کا تذکرہ موجود ہے۔ مگر اس روایت میں بھی چونکہ اس صاحبزادی کے نام کی قطعاً کوئی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس لئے بعض ارباب مقاتل کا خیال ہے کہ اس بچی کا نام رقیہ تھا۔ اور بعض نے زینب لکھا ہے اور بعض نے فاطمہ[1] اگرچہ ہمارے نزدیک یہ روایت بھی چنداں قابل اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ ہم سابقہ اوراق میں کتب فریقین سے ثابت کر آئے ہیں۔ کہ جناب سید الشہداء کی کل دو صاحبزادیاں تھیں ایک جناب فاطمہ دوسری جناب سکینہ۔ لہٰذا جب کسی اور دختر کا وجود ہی ثابت نہیں تو پھر اس کی وفات کیونکر باور کی جا سکتی ہے؟ اور بنا بر تسلیم وہ صاحبزادی کوئی اور ہیں پر زیادہ بحث وتمحیص کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ ہمارے شعراء اور ذاکرین نے اس کو بڑی اہمیت دے رکھی ہے۔ اس لئے یہاں ایک محقق عالم جلیل مولانا سید ناصر حسین صاحب لکھنوی کی تحقیق کا درج کر دینا مناسب اور کافی ہے۔ یہ بزرگوار ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جناب سکینہ کا زندان شام میں انتقال کرنا بالکل غلط اور طریق معتبر سے ثابت ہے کہ آپ بعد جناب سید الشہداء علیہ السلام ایک مدت تک زندہ رہیں۔ البتہ کتاب منتخب فخر الدین طریحی میں ایک روایت ایسی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے جن کا سن تین سال تھا۔ زندان شام میں انتقال فرمایا۔ اور چونکہ اس روایت میں صاحبزادی کا کوئی نام درج نہیں ہے۔ لہٰذا بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا نام کیا تھا لیکن ممکن ہے کہ نام ان کا زینب ہو۔ اس لئے بنا بر ایک قول کے جناب سید الشہداء کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ ایک فاطمہ دوسری سکینہ تیسری زینب اور چونکہ فاطمہ وسکینہ کا بعد جناب سید الشہداء مدت تک موجود رہنا ثابت ہے۔ اور ان کے بعض حالات موثق طریق پر وارد ہیں۔ اور زینب بنت الحسینؑ کا کوئی حال ثابت نہیں۔ لہٰذا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال کیا۔ وہ زینب بنت الحسین ہیں۔[2]

اسی طرح مجاہد اعظم کے فاضل مصنف نے بھی (از ص ۲۹۱ تا ص ۲۹۳) بڑے شد ومد اور تاریخی شواہد و دلائل سے اس واقعہ کا بے سروپا اور کذب محض ہونا ثابت کیا ہے۔ (فراجع)

اسیران اہل بیتؑ کتنا عرصہ زندان شام میں رہے؟

اسیران اہل بیتؑ کب تک دار السلطنت شام میں رہے؟ کب رہا ہو کر مدینہ روانہ ہوئے؟ یہ تلخ حقیقت بہت ہی افسوس ناک ہے کہ تمام کتب سیر وتواریخ اور مقاتل اس سلسلہ میں خاموش نظر آتی ہیں اور کوئی ایسی قابل اطمینان روایت نہیں ملتی۔ جس کی بنا پر پورے انشراح صدر اور قلبی اطمینان کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ کتب

1۔ ریاض القدس، ج ۲، ص ۳۲۳۔

2۔ ہدایات ناصریہ، ص ۵۔

تذکرہ میں جو بعض جلی یا خفی اشارات ملتے ہیں وہ اس قدر مختصر اور نامکمل ہیں کہ ﴿لا یسمن ولا یغنی من جوع﴾ کے مصداق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں اہل علم کے آراء و نظریات میں شدید اختلاف نظر آتا ہے۔

ہر قوم راہ است راہی۔ دینی و قبلہ گاہی

اس سلسلہ میں اختلاف آراء کا نمونہ

ذیل میں ہم اس اختلاف و افتراق کا ایک جامع خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ یہ موضوع کس طرح اختلاف آراء کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اور ان حالات میں اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنا کس قدر مشکل ہے؟

۱۔ صاحب روضۃ الشہداء اور صاحب تہیج الاحزان کا خیال تو یہ ہے کہ جب اسیران آل رسول دربار یزید میں پیش ہوئے تو وہ ان کی خستہ حالی دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت رہائی کا حکم دے دیا اور عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا۔

۲۔ خوارزمی نے مقتل الحسین (ج ۲ ص ۷۴) میں یہ لکھا ہے کہ اسارائے آل محمد کا صرف تین دن دمشق میں قیام رہا۔ اس اثنا میں امام حسین پر گریہ و بکاء کا سلسلہ جاری رہا۔ سید عبدالرزاق المقرم النجفی صاحب مقتل الحسین (ص ۴۳۳) کا میلان بھی اسی قول کی طرف ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ ارشاد شیخ مفیدؒ (۲۷۰) میں صرف اس قدر لکھا ہے: ﴿فاقاموا ایاما﴾ شام میں چند یوم قیام رہا۔

۴۔ کتاب شہید اعظم جناب ریاض بنارسی (ج ۲ ص ۳۱۹ پر) لکھا ہے اہل بیتؑ چھ دن دمشق میں رہے۔

۵۔ منتخب طریحی (ص ۴۳۹) تمقام (۲۸۸) تظلم الزہراء (ص ۲۸۷) عاشر بحار الانوار (ص ۲۳۳) ناسخ ج ۶ ص ۳۵۱ میں لکھا ہے کہ سات دن میں قیام رہا۔ اور اس اثنا میں برابر امام حسین پر نوحہ و ماتم ہوتا رہا۔ اور آٹھویں روز رہائی عمل میں آئی۔

۶۔ امالی شیخ صدوق (ص ۱۰۱) ملہوف (۱۶۸) تظلم الزہراء (ص ۲۷۸) دمعہ ساکبہ (۳۸۰) لواعج الاشجان ص ۱۸۴ نفس المہموم (ص ۲۵۲) روضۃ الواعظین (ص ۲۳۰) میں یہ لکھا ہے کہ اسیران آل رسول کو ایک ایسے قید خانہ میں (جو سردی و گرمی سے بچا نہ سکتا تھا اتنے دنوں تک قید رکھا گیا کہ مخدرات کے چہرے جھلس گئے۔

۷۔ آقائے دربندی نے اسرار الشہادت (ص ۵۲۶) پر مذکورہ بالا واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ﴿فان فرضنا ها اقل من مدة شهر فلا يجوز ان نفرضها اقل من من عشرين او خمسة عشر يوما﴾ اگر ہم مدت قید کو ایک ماہ سے کم بھی فرض کریں۔ تو بیس یا پندرہ دن سے کم تو کسی طرح فرض نہیں کر سکتے

دلیل ان کی یہ ہے کہ اتنے دنوں سے پہلے ﴿تقشر وجوہ﴾ (چہروں کا جھلسنا) ممکن نہیں۔

۸۔ سید اجل ابن طاؤس نے کتاب اقبال میں یہ لکھا ہے (علی نقل عنہ فی تظلم الزہراء ص ۲۸۷) کہ ایک ماہ تک سلسلہ قید و بند نے طول کھینچا۔

۹۔ سید طباطبائیؒ نے حاشیہ ریاض المصائب پر مدت قید چالیس روز بتائی ہے اور سید سہارنپوری نے جلاء العینین فی سیرۃ علی بن الحسینؑ میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۱۰۔ کتاب سیرت زینب سلام اللہ علیہا مطبوعہ حیدرآباد دکن (ص ۲۵۳ پر) مدت قید چھ ماہ درج ہے۔

۱۱۔ اردو کی بعض کتب متداولہ میں مدت قید ایک سال بھی ملتی ہے۔

یہ ہیں وہ تمام مختلف اقوال جو اس موضوع پر ہمیں کتب مقاتل میں دستیاب ہو سکے ہیں۔ اب اگرچہ ان میں سے اصل حقیقت کا کھوج لگانا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ تاہم ذیل میں بتائید ایزدی اصل حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ و بیدہ ازمۃ التحقیق

مخفی نہ رہے کہ سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں کتب حدیث کی ورق گردانی کی جائے کہ آیا اس موضوع کی بابت آئمہ اہل بیت کی کوئی تصریح ملتی ہے یا نہیں؟ اور اگر آئمہ معصومینؑ کی کوئی تصریح مل جائے تو اسے تمام اقوال و آراء پر مقدم سمجھا جائے گا۔ جہاں تک ہم نے کتب آثار و اخبار اہل بیت اطہار کی سیر کی ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں صرف دو روایتیں ملی ہیں۔ ایک میں قید خانہ کی اجمالی کیفیت تو مذکور ہے۔ مگر اس میں مدت قید کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ یہ روایت بصائر الدرجات ص ۳۲۸ طبع ایران میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ اور دوسری روایت میں مدت قید کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ روایت بھی بسند صحیح بصائر الدرجات (ص ۳۳۹ پر) مروی ہے۔ اور اس کے حوالہ سے بحار۔ ناسخ۔ قمقام اور اسرار وغیرہ میں مذکور ہے۔ اور یہ روایت امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے۔ روایت قدرے طویل ہے اس کے آخر میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں ﴿فمکثنا یومین ثم دعانا و اطلق عنا﴾ ہم مکمل دو دن زندان شام میں رہے۔ پھر تیسرے دن یزید نے ہمیں بلا کر رہا کر دیا۔

بنابریں ہماری تحقیق کے مطابق مذکورہ بالا اقوال میں سے پانچواں قول اقویٰ ہے۔ یعنی اسیران آل رسول کا سات روز شام میں قیام رہا اور آٹھویں روز رہائی ہوئی اور وہ واپس مدینہ تشریف لے گئے۔

عندالتحقیق تیسرا و چوتھا اور چھٹا قول بھی اس پر منطبق ہو سکتا ہے۔ اور یہ آٹھ روز اس طرح بنتے ہیں۔ سابقاً بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ اسارائے اہل بیت کا قافلہ یکم صفر کو شہر شام اور پھر دربار میں وارد ہوا۔ تین دن قید میں رہے تیسرے دن یزید نے رہائی کا حکم صادر کیا۔ اور مخدرات عصمت و طہارت کی خواہش پر تین روز تک خود یزید کے گھر

میں سید الشہداء پر گریہ وبکاء اور مراسم عزا کا اظہار کیا گیا۔ جس میں شام کی خواتین قریش نے بھی برابر حصہ لیا[1] اس طرح سات روز پورے ہوگئے اور آٹھویں روز بسوئے مدینہ روانگی عمل میں آئی اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ تیسرا چوتھا اور چھٹا قول بھی اس پر منطبق ہوتا ہے! اس کی وجہ یہ ہے کہ تیسرے قول میں صرف چند یوم کی قید کا تذکرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس میں داخلہ شام اور رہائی کے بعد والے دو دن شامل نہیں کیے گئے ورنہ وہی آٹھ یوم بن جاتے باقی چھٹا قول کہ اتنا عرصہ اسیران اہل بیت زندان میں رہے کہ مخدرات کے چہرے جھلس گئے یہ بھی اس پر منطبق ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گرمیوں کے موسم میں چہروں کے جھلسنے کے لئے بقول صاحب اسرار الشہادت پندرہ بیس دن کی مدت ضروری نہیں ہے۔ یہ کیفیت دو تین روز بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں پیدا ہوسکتی ہے۔ بالخصوص جب کہ یہ بھی ملحوظ رکھا جائے۔ کہ یہ ان ستم رسیدہ پردگیان عصمت وطہارت اور ناز پروردگیان گود زہراؑ کی روئیداد ہے۔ جنہوں نے کبھی دن کے وقت روضہ رسولؐ کی زیارت بھی نہیں کی تھی۔ اگر صرف ایک دن کی دھوپ سے بھی ان کی یہ کیفیت ہو جائے۔ تو کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔ لہٰذا صرف اس واقعہ سے مدت قید کو کم از کم پندرہ بیس دن یا اس سے کم وبیش تسلیم کرنا۔ جیسا کہ صاحب اسرار الشہادت (ص ۵۲۶ اور صاحب ریاض القدس ج ۲ ص ۳۲۱) کا خیال ہے کوئی وزنی استدلال نہیں ہے۔ اسی استدلال کو رد کرتے ہوئے فاضل میبدی نے اپنے کشکول (ص ۱۵ طبع ایران) پر لکھا ہے ﴿ان ذلک یمکن ان یحصل فی ایام قلیلة﴾ اس کیفیت کا بالکل تھوڑے دنوں میں بھی حاصل ہونا ممکن ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ

مذکورہ بالا حدیث امام میں وارد شدہ فقرہ ﴿و اطلق عنا﴾ کی صاحب ریاض القدس نے (ج ۲ ص ۳۱۸) پر ریاض الاحزان کے حوالہ سے یہ تاویل بیان کی ہے ﴿ای یفک الاغلال و الحبال﴾ ﴿یعنی غلهارا از گردن مرداں که دوازده نفر بودند برداشتند﴾۔ یعنی دو دن کے بعد یزید نے بارہ اطفال بنی ہاشم کی رسیاں کاٹ دیں اور گلے سے طوق اتار دیے۔ یہ تاویل اس لئے علیل ہے کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ دربار میں پیشی کے وقت ہی غل وجامعہ اتار دیے گئے تھے اور رسیاں کاٹ دی گئی تھیں۔ بعد ازاں کسی روایت میں یہ وارد نہیں ہے کہ قید خانہ میں دوبارہ یہ طوق گلے میں ڈالے گئے تھے۔ لہٰذا جب طوقوں کا دوبارہ پہنانا ہی ثابت نہیں تو اتارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح صاحب اسرار الشہادت نے (ص ۵۲۶ پر) اس کی جو تاویل کی ہے کہ شاید اس سے مراد یہ ہو کہ روی داروغوں کی گفتگو کے بعد دو دن مزید قید میں رہے اور پھر رہائی کا حکم ملا یہ تاویل بھی دور از قیاس اور سیاق وسباق کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔ کما لا یخفی۔

---

[1] عاشر بحار ص ۲۲۸۔ مقتل الحسین للخوارزمی ج ۲ ص ۷۳۔ تظلم الزہراء ص ۲۷۵۔ مقتل الحسین للمقرم ص ۳۳۳ وغیرہ۔

پانچویں قول کی صحت پر شواہد

اس قول کی صحت وقوت کی چند وجوہ ہیں۔

وجہ اول: ۔اسے اخبار آئمہ اور اکثر ناقلین آثار کی تائید حاصل ہے اور دوسرے اقوال اس سے محروم ہیں۔

وجہ دوم: ۔اس سے زیادہ عرصہ تک مدت قید کا تسلیم کرنا۔ علاوہ اس کے کہ اس پر کوئی روایت دلالت نہیں کرتی خلاف روایت بھی ہے کیونکہ مزید مدت تک ان کو قید وبند میں رکھنا مفاد ملکی کے خلاف تھا ہم عنقریب رہائی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے تفصیل سے بیان کریں گے کہ یزید کا یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی تھا کہ شہادت حسینؑ کے بعد مخدرات کی اس طرح تشہیر کر کے وہ اپنے تسلط واقتدار کا لوہا اہل عالم سے منوالے گا۔ اس پر اپنے اس زعم باطل کا بطلان پہلے دن ہی دربار میں پیشی کے بعد واضح وعیاں ہو گیا تھا۔ تاریخی بیانات سے ظاہر ہے کہ جوں جوں لوگ حقیقت حال سے آگاہ ہوتے جاتے تھے۔ توں توں یزید سے ان کی نفرت بڑھتی جاتی تھی اور انقلاب کے آثار واضح و آشکار ہونے لگے تھے۔ اس لئے یزید نے اپنی اور اپنی حکومت کی سلامتی اسی میں دیکھی کہ ان کے ساتھ مدارات سے پیش آئے۔ اور جلدی رہائی کے احکام صادر کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ شہادت حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیاد کے سر تھوپتے ہوئے جلد رہائی کے احکام جاری کئے اور حسن سلوک کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا۔

وجہ سوم: ۔دوسرے اقوال کا بے دلیل ہونا بھی اس قول کی تقویت کا باعث ہے۔ جہاں تک پہلے قول کا تعلق ہے۔ وہ جمہور ارباب تاریخ کے بیانات کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔ اور سراسر تفریط پر مبنی ہے۔

دوسرا قول: ۔﴿حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء﴾ کا مصداق ہے۔ یہ درست ہے کہ روایت امام میں تین دن قید کا تذکرہ ہے۔ مگر اس میں یہ مذکور نہیں ہے کہ تیسرے دن شام سے روانگی بھی عمل میں آگئی۔ لہٰذا جب دوسرے آثار سے آشکار ہے کہ کم از کم تین یوم دار السلطنت میں ماتم اور گریہ وبکاء کے لئے قیام کیا گیا تو اسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ جن آثار میں سات یوم نوحہ وبکا کرنا وارد ہے اس سے مراد پوری مدت قیام شام ہے۔ بشمول ایام زندان کیونکہ یہ سلسلہ زندان میں بھی جاری رہا تھا۔ (کما تقدم)

تیسرا، چوتھا اور چھٹا قول تو اس قول کے ساتھ موافق ہے۔ ان میں درحقیقت کوئی تضاد وتصادم نہیں ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں واضح کیا جا چکا ہے۔

ساتواں قول: ۔پندرہ بیس دن والا ہے۔ اس پر بھی سطور بالا میں تبصرہ کر دیا گیا ہے کہ ان حضرات کا ذاتی خیال ہے جس کی بنیاد پر کسی مضبوط اساس پر قائم نہیں ہے۔

آٹھواں قول: ۔ایک ماہ قید والا ہے۔ اس کی تائید بھی کسی روایت سے نہیں ہوتی۔ صاحب تظلم الزہراء نے

ص ۲۸۷ پر اس قول پر نقد تبصرہ کرتے ہو لکھا ہے: ﴿لم نظفر علی روایة دلت علی مقامهم فیها مدة شهر﴾ ہمیں کوئی ایسی روایت نہیں ملی۔ جو اس بات پر دلالت کرے کہ اسیران اہل بیتؑ کا قیام شام میں ایک ماہ تک رہا۔

نواں قول:۔ جس میں چالیس دن مدت قید بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی آٹھویں قول کی طرح بے ماخذ و بے دلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔

جہاں تک دسویں اور گیارہویں قول کا تعلق ہے۔ ان کی رکاکت و کمزوری محتاج بیان نہیں ہے۔ علاوہ اس کے کہ کتب سیر و تواریخ و مقاتل میں ان کا کہیں نام و نشان تک موجود نہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسے بے سروپا اقوال کے تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) یہ قول روایت کے بھی سراسر خلاف ہیں۔ اگر یزید اتنی طویل مدت تک خاندان نبوت کو قید و بند میں رکھتا تو ملک میں انقلاب آ جاتا۔ ان اقوال کے لکھنے والے حضرات نے جہاں کسی روایت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہاں از روئے قانون درایت سیاسیات ملکیہ کے قوانین و آئین کو بھی پیش نظر رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ پس جب اس پانچویں قول کے علاوہ جس قدر اقوال ہیں وہ یا تو اس کے موافق ہیں اور یا پھر روایت و درایت کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں۔ تو اس سے باوجود اس قول کی صحت و صداقت بالکل بے غبار اور واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔ وہو المطلوب

وجہ چہارم:۔ اگر قول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر وقت واپسی پہلی اربعین پر اسیران آل رسول کا کربلا پہنچنا اور جناب جابر بن عبداللہ کے ساتھ وہاں ملاقات کرنا (جیسا کہ مشہور ہے) ممکن الوقوع ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے کہ اگر زیادہ مدت والے اقوال کو درست مانا جائے تو پھر مذکورہ بالا واقعہ سے انکار کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ کیونکہ جو حضرات اس واقعہ کی صحت کے منکر ہیں۔ وہ یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس قدر طویل مدت تک قید و بند میں رہنے کے بعد کیونکر پہلی اربعین کو کربلا واپس پہنچ سکتے ہیں؟ اور جو بوجہ قلت وقت آمد و رفت اور قید و بند کی وجہ سے اس کے منکر ہیں۔ ہماری سابقہ تحقیقات سے ان کے استبعادات کے جوابات واضح ہو جاتے ہیں۔

رہائی اہل بیتؑ اور اس کے علل و اسباب

یزید عنید کا شہادت حسینؑ کا حکم دینا اور پھر اس پر رضامند اور مسرور و شادکام ہونا، مخدرات عصمت و طہارت کو دیار و امصار میں تشہیر کرانا، سر مقدس اور خانوادہ عصمت کے ساتھ پہلے سخت توہین آمیز سلوک کرنا جوش مسرت اور ظاہری فتح و نصرت اور نشہ اقتدار سے چور چور ہو کر کفریہ اشعار پڑھنا تاریخ اسلام کے وہ مسلم الثبوت واقعات ہیں۔ جن کا نہ تو کسی سے انکار ممکن ہے اور نہ ہی کسی یزید نواز فرد یا گروہ کے پردہ ڈالنے سے ان پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ برادران اسلامی کے فاضل گرامی علامہ سعد الدین تفتازانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ﴿الحق ان رضا یزید

بقتل الحسین رضی اللہ عنہ واستبشارہ بذلک واھانۃ اھل بیت النبی علیہ السلام مما تواتر معناہ وان کان تفاصیلھا احاداً فنحن لا نتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ لعنۃ اللّٰہ علیہ وعلی انصارہ واعوانہ ﴾ حق یہ ہے کہ یزید کا قتل حسینؑ پر راضی اور خوش وخرم ہونا۔ اور اس کا اہلبیت رسولؐ کی اہانت کرنا اس پر تواتر معنوی موجود ہے۔ اگرچہ ان واقعات کی تفاصیل بطریق احاد مروی ہیں۔ بنابریں ہم اس کے بے ایمان ہونے میں ذرہ بھر توقف نہیں کرتے۔ خدا اس پر اور اس کے اعوان انصار پر لعنت کرے۔[1]

شہادت حسینؑ کے بعد خاندان رسولؐ کی اس طرح تذلیل وتوہین سے یزید کا بظاہر جو مقصد تھا کہ وہ اس طرح اس خانوادہ کے اثر ورسوخ کو ختم کر کے اہل عالم پر اپنی دھاک بٹھا سکے گا۔ اور اس کا اقتدار مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے گا۔ حالات نے بہت جلد یزید پر اس کے خیال کے غلط ہونے کو واضح وآشکار کر دیا۔ کربلا کی شیر دل خاتون نے اپنے غیر فانی خطبوں کے ذریعہ سے یزید کے ظلم وستم کو طشت ازبام کر کے اس کے ایوان اقتدار کے ستونوں کو صرف ہلایا ہی نہیں بلکہ بالکل کھوکھلا کر دیا۔ چنانچہ ہر چہار طرف حتیٰ کہ خود اپنے افراد خانہ کی طرف سے بھی اس کی لعنت ملامت ہونے لگی۔ ملک میں انقلاب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ خانہ جنگی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ یزید کو ان بدلتے ہوئے حالات کی سنگینی کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے ان حالات میں اس نے اپنی اور اپنی سلطنت کی حفاظت وبقا اس امر میں دیکھی کہ شہادت حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیادہ پر ڈال کر اس سے اپنی برات وبیزاری کا اظہار کرے اور اسیران آل رسولؐ کی جلد رہائی کے احکام جاری کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

مذکورہ بالا تاریخی مسلم الثبوت حقائق کی تائید علامہ جلال الدین سیوطی اور مؤرخ شہیر ابن اثیر جزری کے حقیقت افروز بیانات سے بھی ہوتی ہے جو اکثر وبیشتر خود یزید کے بیانات سے ماخوذ ہیں۔ اول الذکر لکھتے ہیں ﴿ولما قتل الحسین و بنو ابیہ بعث ابن زیاد برؤسھم الی یزید فسر بقتلھم اولاً ثم ندم لما مقتہ المسلمون علی ذلک وابغضہ الناس وحق لھم ان یبغضوہ[2]﴾ جب امام حسینؑ اور ان کے بھائی (اور دیگر اعزا وانصار) شہید ہو گئے۔ اور ابن زیاد نے ان کے سر یزید کے پاس بھیج دیے تو وہ پہلے تو ان کے قتل سے بہت خوش ہوا۔ پھر جب لوگوں نے اس کے فعل شنیع کی وجہ سے اسے برا سمجھنا شروع کیا اور ان کو اس کا حق بھی تھا کہ اسے برا سمجھیں تب اس نے ندامت کا اظہار کیا۔

اور ثانی الذکر قمطراز ہیں: ﴿لما وصل راس الحسین الی یزید حسنت حال ابن زیاد عندہ وزادہ و وصلہ و سرۃ ما فعل ثم لم یلبث الایسیراً حتی بلغہ بغض الناس و لعنھم وسبھم فندم علی

[1] شرح عقائد نسفی، ص ۱۸۱، طبع اسلامبول۔
[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۸، طبع جدید۔

قتل الحسین فکان یقول وما علی لواحتملت الاذی وانزلت الحسین معی فی داری وحکمة فیما یریدوان کان علی فی ذلک وھن فی سلطانی حفظا الرسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم و رعایة لحقہ و قرابتہ لعن اللّٰہ ابن مرجانة فانہ اضطرہ وقد سئلہ ان یضع یدہ فی یدی اویلحق بثغر حتی یتوفاہ اللّٰہ فلم یجبہ الی ذلک فقتلہ فبغضنی بقتلہ الی المسلمین وزرع فی قلوبھم العداوة فابغضنی الی البر والفاجر لما استعظموہ من قتل الحسین مالی ولا بن مرجانة لعنة اللّٰہ و قتلہ﴾[1]

یعنی جب امام حسینؑ کا سر مبارک یزید کے پاس پہنچا تو اس کی نظر میں ابن زیاد کی وقعت اور بڑھ گئی۔ اور جو کچھ اس نے کیا تھا اس نے یزید کو مسرور و شادکام کیا۔ چنانچہ اس نے اس کو انعام و اکرام سے بھی نوازا[2] لیکن ابھی بہت ہی تھوڑا وقت گذرا تھا کہ یزید کو یہ اطلاعیں ملنے لگیں کہ لوگ اس کو برا سمجھنے لگے ہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے اس کو لعن وطعن اور سب وشتم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لئے اب اس نے شہادت حسینؑ پر اپنی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: میرا کیا نقصان ہوتا اگر میں اذیت برداشت کر لیتا اور حسینؑ کو یہاں اپنے پاس اپنے گھر میں رکھ لیتا۔ اور وہ جو کچھ چاہتے ان کو کرنے دیتا۔ اگرچہ اس سے میرے اقتدار میں کمزوری پیدا ہو جاتی۔ لیکن حق رسول اور ان کی قرابتداری کی حفاظت و رعایت تو ہو جاتی۔ خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر جس نے ان کو مجبور کر کے قتل کر دیا حالانکہ حسینؑ نے اس سے کہا تھا کہ مجھے امیر سے صلح کی گفتگو کر لینے دیں۔ یا کسی سرحد کی طرف نکل جائیں۔ مگر اس نے ان کی بات نہ مانی (اس آخری پیراگراف پر ہم سابقہ بعض ابواب میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ ناقل) اس طرح ان کو قتل کر کے مجھے مسلمانوں کی نگاہوں میں مبغوض بنا دیا۔ اور میرے خلاف دلوں میں دشمنی کا بیج بو کر مجھے ہر نیک و بد کی نظر میں برا بنا دیا۔ مجھ سے ابن مرجانہ کو کیا کد تھی؟ خدا اس پر لعنت کرے اور اسے قتل کرے۔

بعض آثار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یزید نے عامۃ المسلمین کی آنکھوں میں دھول ڈالنے اور آل رسول کی اشک شوئی کرنے کے لئے کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی۔ مگر ان میں سے بعض نے اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر کے اسے دربار عام میں ذلیل و رسوا کر دیا۔

چنانچہ بعض کتب میں وارد ہے کہ یزید نے بعض قائدین لشکر مثل شبث بن ربعی، شمر بن ذی الجوشن، سنان

---

[1] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۰۰ طبع جدید۔

[2] منجملہ ان قطعی دلائل کے جو شہادت حسینؑ پر یزید کی رضامندی پر دلالت کرتے ہیں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر وہ اس بات پر راضی نہ تھا اور نہ قتل حسینؑ کو جائز سمجھتا تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک یہ ابن زیاد کے طغیان و سرکشی کا نتیجہ تھا تو پھر لازم تھا کہ اس سے قصاص و انتقام لینے کا کوئی انتظام کرتا مگر اس کے متعلق تاریخ خاموش ہے بلکہ اس کے برعکس اس کو انعام و اکرام سے نوازنا ثابت ہے۔ بعد ازیں کون دشمن عقل و خرد یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ یزید کے حکم اور اس کی رضامندی کے بغیر ہوا!! (منہ عفی عنہ)

بن انس نخعی، مصائب بن وہبہ اور خولی بن یزید آصحی وغیرہ کو دربار میں بلایا۔ پہلے شبث کو خطاب کر کے کہا کیا تو نے حسینؑ کو قتل کیا ہے؟ اور کیا میں نے تمہیں ان کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا؟ شبث نے کہا: میں نے ان کو قتل نہیں کیا۔ خدا ان کے قاتل پر لعنت کرے! یزید نے کہا پھر کس نے ان کو قتل کیا ہے؟ شبث نے کہا: مصائب بن وہبہ نے یزید نے روئے سخن مصائب کی طرف کرتے ہوئے اس سے یہی سوال کیا مصائب نے بھی شبث کی طرح جواب دے کر تیسرے آدمی پر ٹال دیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے یزید ان لوگوں سے دریافت کرتا رہا اور وہ جواب میں اپنی برات ظاہر کر کے دوسرے پر ٹالتے رہے۔ بالآخر نوبت قیس بن ربیع تک جا پہنچی۔ سب نے بالاتفاق اسے قاتل قرار دیا۔ یزید نے اس سے وہی سوال کیا۔ قیس نے نفی میں جواب دیا۔ یزید نے قدرے برہم ہو کر کہا وائے ہو تم پر! آخر کس نے انہیں قتل کیا؟ قیس نے کہا اگر مجھے امان دی جائے تو میں بتاتا ہوں کہ حسینؑ کا اصل قاتل کون ہے؟ یزید نے امان دی قیس نے کہا: حسین کو قتل نہیں کیا مگر اس شخص نے جس نے علم جنگ بلند کیا اور لشکر پر لشکر روانہ کیا! یزید نے کہا وہ شخص کون ہے؟ قیس نے برجستہ جواب دیا وہ تو ہے اے یزید! تو نے حسینؑ کو قتل کیا ہے۔ یزید یہ تلخ مگر مبنی برحقیقت جواب سن کر یہ کہتے ہوئے کہ مالی و لقتل الحسین محل سرا میں چلا گیا۔[1]

رہائی کی کیفیت

پھر یزید نے اسیران اہل بیت کی رہائی کے احکام صادر کئے اور امام زین العابدین کو بلا بھیجا۔ جب امام تشریف لائے تو تخلیہ کرا کے ان سے اپنی سابقہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ﴿لعن اللہ ابن مرجانۃ اما واللہ لو انی صاحبہ ما سئلنی خصلۃ ابداً الا اعطیتہ ایاھا ولدفعت الحتف عنہ بکل ما استطعت ولو بھلاک بعض ولدی﴾ خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے۔ خدا کی قسم۔ اگر مجھ سے ان (حسینؑ) کا سامنا ہوتا تو جو کچھ چاہتے میں اسے پورا کرتا۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا۔ ان کو قتل ہونے سے بچاتا اگرچہ مجھے اپنی بعض اولاد بھی موت کے منہ میں جھونکنی پڑتی۔[2]

بعض کتب مقاتل میں مرقوم ہے کہ قیام دمشق کے دوران جب امام کو دربار میں بلایا جاتا تھا تو کسی وقت یزید نے کسی بات سے خوش ہو کر امامؑ کی تین حاجتیں برلانے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ رہائی کے وقت یزید نے امام علیہ السلام سے کہا اپنی حاجات ذکر کریں۔ امامؑ نے فرمایا:

﴿الاولی ان ترینی وجہ سیدی و مولائی و ابی الحسین علیہ السلام فانزود منہ. والثانیۃ ان ترد علینا ما اخذ منا. و الثالثۃ ان کنت عزمت علی قتلی ان توجہ مع ھولاء النسوۃ من یردھن

---

[1] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۵۲۔

[2] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۰۰۔ ارشاد، ص ۲۷۰۔

الی حرم جدھن ﴾ پہلی حاجت تو یہ ہے کہ مجھے اپنے آقا و بابا حسین علیہ السلام کا سر مقدس دکھاؤ تا کہ میں اس سے زاد (زیارت) حاصل کرلوں۔ دوسری یہ ہے کہ (کربلا کی) لوٹ مار میں ہمارا جو مال و اسباب لوٹا گیا ہے وہ واپس کر دیجئے تیسری یہ ہے کہ اگر تو نے میرے قتل کا ارادہ کرلیا ہے تو کوئی (امین) آدمی مقرر کرنا جو ان مستورات کو ان کے جدنامدار کے حرم میں پہنچا آئے۔ یزید نے کہا: ﴿اما وجه ابیک فلا تراه ابداً و اما قتلک فقد عفوت عنک و اما النساء فما یردهن غیرک و اما ما اخذه منکم فانا اعوضکم عنه اضعاف قیمته ﴾ جہاں تک آپ کے والد کے سر کا تعلق ہے آپ اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ اور جہاں تک تمہیں قتل کرنے کا تعلق ہے میں نے اس سے درگذر کیا ہے۔ لہٰذا مستورات کو آپ خود ہی واپس ساتھ لے جائیں گے۔ اور جہاں تک تمہارے مال و اسباب کا تعلق ہے میں اس کے عوض تمہیں کئی گناہ زیادہ قیمت ادا کرتا ہوں! امام نے جواب دیا: ﴿اما مالک فلا نریده وهو موفر علیک وانما طلبت ما اخذ منا لان فیه مغزل فاطمة بنت محمد صلی الله علیه واله ومقنعتها وقلادتها وقمیصها ﴾ ہمیں تمہارے مال کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرا مطالبہ تو یہ ہے کہ جو مال ہم سے چھینا گیا ہے وہی ہمیں واپس دے دیا جائے کیونکہ اس میں حضرت فاطمہ بنت رسول کا چرخہ، ان کا مقنعہ، گلو بند اور ان کی قمیص ہے۔ چنانچہ یزید کے حکم سے یہ سب مال و اسباب واپس کر دیا گیا۔ مزید برآں یزید نے اپنی طرف سے دوسو دینار بھی پیش کئے جو امامؑ نے اسی وقت فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیئے[1] اگرچہ سید اجل بن طاؤس علیہ الرحمہ کی اس روایت کو بلا کسی جرح کے اکثر ارباب مقاتل نے اپنی کتب میں درج کر دیا ہے۔ مگر اس روایت کی بابت دو چیزیں بری طرح طبیعت میں کھٹکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جن تبرکات فاطمہؑ کا اس میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ کربلا میں ہمراہ کیوں لائے گئے تھے؟ دوسری جو کہ پہلی سے بھی اہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ کربلا میں خاندان نبوت کا جو مال و اسباب لوٹا گیا تھا وہ تو لوٹنے والے سپاہی اپنے اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہ شام میں کیسے پہنچ گیا تھا جو یزید نے رہائی کے وقت واپس کر دیا؟؟ اگرچہ بنا بر صحت روایت اس کی تاویل بعید ممکن ہے مگر اس کی صحت محل کلام ہے۔ و الله العالم

یہ بھی بعض آثار میں وارد ہے کہ اسیران آل محمدؐ کی رہائی کے وقت یزید نے اونٹوں پر شاندار محمل رکھائے۔ اور چمڑے کے قطعے اور ریشم کے کپڑے بچھا کر ان پر درہم و دینار کے ڈھیر لگا دیے۔ پھر بوقت رخصت مخدرات کو بلا کر کہا: ﴿یا ام کلثوم! خذوا هذه الاموال عوض ما اصابکم ﴾ ام کلثوم! ان مصائب و شدائد کے عوض جو تم پر وارد ہوئے ہیں یہ مال و منال لے لو۔ جناب ام کلثوم نے فرمایا: ﴿یا یزید! ما اقل حیائک واصلب وجهک. تقتل اخی واهلبیتی و تعطینی عوضهم مالاً والله لا کان ذلک ابداً ﴾ اے یزید!

---

[1] لہوف، ص ۱۷۵۔ تظلم الزہراء، ص ۳۸۱۔ عاشر بحار، ص ۲۲۸۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۸۰، ۳۸۷۔ نفس المہموم، ص ۲۵۱، ۲۵۲۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۵۱۔

تو کتنا بے شرم و بے حیا ہے۔ میرے بھائی اور جملہ اہل بیت کو قتل کرتا ہے اور پھر اس کے عوض مجھے مال دیتا ہے۔ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔[۱]

اس کے بعد نعمان بن بشیر انصاری کو آدمیوں کی ایک جماعت دے کر (جن کی تعداد مورخ طبری اور صاحب اخبار الدول کے بیان کے مطابق تیس تھی مگر ابی مخنف اور اس کے حوالہ سے صاحب ناسخ نے پانچ سو لکھی ہے جو کسی طرح بھی قرین عقل و نقل نہیں ہے) حکم دیا کہ پس ماندگان امام کو احترام کے ساتھ مدینہ پہنچائیں۔[۲]

چنانچہ نعمان بن بشیر ہماری سابقہ تحقیق کے مطابق ۸ صفر المظفر کو خاندان نبوت کے پس ماندگان کو لے کر دار السلطنت شام سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور یزید کی ہدایت کے مطابق ...... پورے عز و احترام کے ساتھ اہل بیت رسالت کو مدینہ پہنچایا۔[۳]

اسیران آل محمدؐ کا رہائی کے بعد کربلا میں ورود

راویان اخبار کا بیان ہے کہ واپسی پر جب یہ قافلہ اہل بیت سرزمین عراق کی سرحد پر پہنچا جہاں دو راہہ تھا۔ ایک راستہ سیدھا مدینہ کو جاتا تھا۔ اور دوسرا عراق کی طرف سے تو انہوں نے راہبر سے فرمایا کہ ہمیں کربلا (عراق) کے راستہ سے لے چلو چنانچہ حسب الحکم عراقی راستہ اختیار کیا گیا۔ جب کربلا میں ورود ہوا اور مقتل گاہ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اسی وقت جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور کچھ ہاشمی ؟؟ قبر حسینؑ کی زیارت کے لئے مدینہ سے کربلا پہنچے ہیں۔ جناب ابن طاؤسؒ نے لکھا ہے: ﴿فوافوا فی وقت واحد و تلاقوا بالبکاء و الحزن و اللطم و اقاموا الماتم المقرحۃ للاکباد و اجتمع الیھم نساء ذلک السواد فاقاموا علی ذلک ایاما﴾ یعنی دونوں قافلے ایک ہی وقت میں بروز اربعین یعنی (بیستم (۲۰) صفر کو)[۴] وارد کربلا ہوئے۔ انتہائی حزن و ملال اور گریہ و بکا کے ساتھ باہمی ملاقات ہوئی، جگر خراش انداز میں مراسم عزاداری بجالائے۔ اور اس علاقہ کی عورتیں بھی آ کر شریک ماتم و غم ہو گئیں۔ کئی روز (بروایت ریاض الاحزان، ص ۱۵۷: تین یوم) تک یہ سلسلہ قائم رہا۔[۵] جناب جابرؓ کی کیفیت

۱۔ تظلم الزہراء، ص ۲۸۸۔ نفس المہموم، ص ۲۵۲۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۸۶ وغیرہ۔

۲۔ طبری، ج ۶، ص ۲۶۵۔ کامل، ج ۳، ص ۳۰۰۔ ارشاد، ص ۲۷۰۔ عاشر بحار، ص ۲۲۹۔ نفس المہموم، ص ۲۵۵۔

۳۔ ارشاد، ص ۲۷۰۔ نفس المہموم، ص ۲۵۱۔

۴۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۸۹۔ المنتخب للطریحی، ص ۲۵۰۔

۵۔ ملہوف، ص ۱۷۶۔ عاشر بحار، ص ۲۲۹۔ نفس المہموم، ص ۲۵۳۔ قمقام، ص ۵۹۰۔ ناسخ، ج ۲، ص ۳۵۲۔ لواعج الاشجان، ص ۱۸۹۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۴۳۵۔

زیارت مفصل طور پر بشارۃ المصطفیٰ (ص ۸۹ پر) طبع النجف وغیرہ کتب میں بروایت عطیہ عوفی مرقوم ہے۔

تبصرہ:۔

مخفی نہ رہے کہ رہائی کے بعد واپسی پر اس قافلہ کا کربلا پہنچنا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور اختلاف کی آماجگاہ ہے۔ بعض حضرات نے تو محض اس استبعاد کی وجہ سے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شہادت امام کے بعد ابن زیاد کا قاصد شام جائے۔ پھر وہاں سے حکم یزید لائے۔ بعد ازاں اسیران اہل بیت کو شام بھیجا جائے اور وہاں کچھ عرصہ ان کو زندان میں رکھا جائے۔ اور پھر رہائی کے بعد وہی قافلہ بروز اربعین بیستم صفر کو کربلا میں بھی پہنچ جائے۔ یعنی صرف چالیس روز کی قلیل مدت میں یہ سب کچھ ہو جائے۔ سرے سے اس واقعہ کا انکار کر دیا ہے[1] اور بعض نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کوفہ سے شام جاتے وقت کربلا میں ورود ہوا تھا[2] اور بعض نے یہ بے پر کی اڑائی کہ کربلا میں یہ ورود اور جناب جابر سے ملاقات ایک سال کے بعد دوسری اربعین ۲۲ ہجری کو ہوئی[3] الغرض ؎

ہر کس بقدر فہمش فہمید مدعا را

ہم اسی کتاب کے اسی باب کی ابتداء میں جو تحقیق پیش کر آئے ہیں کہ بنا بر تسلیم ارسال قاصد پندرہ محرم تک سدھائے ہوئے کبوتر یا تیز گام قاصد کے ذریعہ سے یزید کا پیغام ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسی روز اس نے اس لٹے ہوئے قافلہ کو شام کی طرف روانہ کر دیا تھا اور یکم صفر کو قریباً پندرہ یوم میں یہ قافلہ شام پہنچا۔ پھر زندان وغیرہ میں سات روز قیام کرنے کے بعد آٹھویں دن یعنی آٹھویں صفر کو واپس روانہ ہوا۔ اس طرح قریباً بارہ یوم میں یہ قافلہ بآسانی کربلا پہنچ سکتا ہے۔ اور ان حقائق کی روشنی میں مذکورہ بالا استبعادات کا کوئی محل اور وزن باقی نہیں رہ جاتا اور نہ ہی ان کی بنا پر ایک مشہور واقعہ کی صحت کا انکار کیا جا سکتا ہے صاحب تظلم الزہراء نے ۲۸۷ پر ایسے ہی استبعادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بعد تسلیمہ محض استبعاد ولا ینبغی بمحضہ انکار الروایات" بعد ازاں ثابت کیا ہے کہ کوفہ شام تک تیز رو قاصد تین یوم میں پہنچ سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ کسی غیر معمولی واقعہ کی اطلاع دینا ہو۔ جیسے شہادت امام مظلوم کی خبر مشئوم فراجع۔

باقی رہا یہ خیال کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو اکابر علماء مثل شیخ صدوق و شیخ مفید و امثالہم رضوان اللہ علیہم اس واقعہ

---

[1] محدث نوری (در لؤلؤ و مرجان) و محدث قمی (در منتہی الامال)۔ فاضل امروہوی (در مجاہد اعظم)۔

[2] مرزا سپہر کاشانی (در ناسخ ج ۶ ص ۳۵۳)۔

[3] مظلوم کربلا ص ۳۶۲۔ اس کتاب میں یہ زیادتی بھی کی گئی ہے کہ ۲۰ صفر ۶۲ھ لکھ کر نیچے لہوف منتخب طریحی اور ناسخ کا نام درج کر دیا ہے حالانکہ ان کتب میں ۶۲ھ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ (منہ عفی عنہ)

کا ذکر کرتے۔ اس کا جواب واضح ہے کہ ان بزرگواروں کا بوجہ اختصار اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا اس واقعہ کے عدم وقوع کی دلیل نہیں بن سکتا جب کہ یہ واقعہ دوسری کتب معتبرہ میں موجود ہے۔ بوجہ اختصار جب انہوں نے دیگر منازل وحالات سفر کو قلم بند نہیں کیا تو اگر اس واقعہ کو نظر انداز کر دیا ہے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے آخر یہ اس سفر کی ایک منزل ہی تو ہے۔

زیارتِ اربعین کی فضیلت

غالباً اسی وجہ سے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے اربعین کے دن جناب سید الشہداء علیہ السلام کی زیارت کی تھی۔ اور اس روز سے زیارت حسینؑ کو علامات مؤمن میں داخل کر دیا گیا۔ جیسا کہ امام حسن عسکریؑ سے مروی ہے فرمایا: ﴿علامات المؤمن خمس صلواة احدی و خمسین و زیارة الاربعین والجهر بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم والتختم فی الیمین وتعفیر الجبین﴾ مؤمن کی پانچ علامتیں ہیں: (۱) (شب وروز میں) اکیاون رکعت نماز پڑھنا۔ (۲) زیارتِ اربعین کرنا۔ (۳) (نماز میں) بسم اللہ کو بآواز بلند پڑھنا۔ (۴) داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہننا۔ (۵) (سجدہ) میں خاک پر جبہ سائی کرنا۔[1]

اس حدیث میں وارد شدہ لفظ ''زیارۃ الاربعین'' سے علماء اعلام نے یہی سمجھا ہے کہ اس سے مراد بروز بستم صفر سید الشہداء کی زیارت کرنا ہے تفصیل مقتل الحسین للمقرم میں موجود ہے۔

قافلۂ آلِ محمدؐ کا مدینہ میں ورود

بہر کیف یہاں سے چل کر جب یہ قافلہ منازل سفر طے کرتے ہوئے بالآخر مدینہ رسولؐ کے قریب پہنچا تو سالار قافلہ امام نے وہاں محل اقامت ڈال دیا خیمہ نصب کر کے مخدرات کو اس میں بٹھایا گیا۔ پھر امام نے بشیر بن جذلم کو (جو پہرہ داروں میں شامل تھا) بلا کر فرمایا: ﴿رحم اللّٰه اباک لقد کان شاعراً فهل تقدر علی شئی منه؟﴾ خدا تیرے باپ پر رحم کرے وہ تو شاعر تھا کیا تم بھی کچھ شعر کہہ لیتے ہو؟ بشیر نے عرض کیا ﴿بلی یا بن رسول اللّٰه انی لشاعر﴾ ہاں فرزند رسول! میں بھی شاعر ہوں! امام نے فرمایا: ﴿ادخل المدینة وانع ابا عبداللّٰه﴾ مدینہ میں جاؤ اور اہل مدینہ کو ابو عبداللہ الحسینؑ کی خبر شہادت سناؤ بشیر کا بیان ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا مدینہ میں داخل ہوا۔ جب مسجد نبویؐ کے قریب پہنچا تو بلند آواز سے گریہ و بکا کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھنے شروع کیے ؎

یا اهل یثرب لا مقام لکم بها — قتل الحسین فادمعی مدرار

---

[1] تہذیب الاحکام شیخ طوسیؒ، ج ۲، ص ۱۷۔ احتجاج طبرسی طبع نجف۔

الجسم منه بکر بلاء مخرج　　　والرأس منه علی القناة یدار

پھر میں نے کہا: ﴿یا اھل المدینة ھذا علی بن الحسین مع عماته و اخواته قد حلّوا بساحتکم و نزلوا بفنائکم وانا رسوله الیکم اعرّفکم مکانه﴾ اے مدینہ والو! یہ علی بن الحسینؑ اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کے ساتھ تمہارے قریب تشریف لا چکے ہیں۔ میں تمہیں ان کی آمد کی اطلاع اور شہادت حسینؑ کی خبر دینے کے لئے آیا ہوں۔ بشیر بیان کرتا ہے کہ میرا یہ اعلان کرنا تھا کہ مدینہ کے اندر جس قدر مستورات تھیں۔ وہ بے حجاب ہو کر کھلے سروں رخساروں پر طمانچے مارتی ہوئی اور ویل وثبور پکارتی ہوئی اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑیں۔ اور مدینہ کے تمام مرد بھی گریہ وبکا کرتے ہوئے نکل پڑے۔ میں نے اس سے زیادہ کبھی گریہ وبکا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ ہی وفات رسولؐ کے بعد مسلمانوں پر کوئی ایسا سخت دن نظر سے گذرا تھا۔ اسی اثنا میں میں نے ایک لڑکی کو سید الشہداء علیہ السلام پر یوں نوحہ کرتے ہوئے سنا:

نعیٰ سیدی ناع نعاہ فاوجعا　　　و امرضنی ناع نعاہ فافجعا

فعینی جودا بالدموع و اسکبا　　　وجودا بدمع بعد دمعکما معاً

علی من دھی عرش الجلیل فزعزعا　　　فاصبح ھذا المجد والدین اجدعا

علی بن نبی اللہ و ابن وصیہ　　　وان کان عنا شاحط الدار اشسعا

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ﴿الناعی جددت حزننا بابی عبد اللہ و خرشت منا قروحاً لما تندمل فمن انت رحمک اللہ؟﴾ اے خبر شہادت سنانے والے تو کون ہے؟ تو نے تو حضرت ابو عبد اللہ کی وجہ سے ہمارے ان زخموں کو تازہ کر دیا ہے جو ہنوز مندمل بھی نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کہا: ﴿انا بشیر بن جذلم جھنی مولائی علی بن الحسین و ھو نازل الموضع کذا و کذا مع عیال ابی عبد اللہ الحسین و نسائه﴾ میں بشیر بن جذلم ہوں! مجھے میرے آقا علی بن الحسینؑ نے بھیجا ہے جو فلاں جگہ پر حضرت ابو عبد اللہ الحسینؑ کے اہل وعیال سمیت موجود ہیں۔ میرا یہ جواب سن کر لوگوں نے مجھے وہیں چھوڑا اور خود خدمت امامؑ میں حاضر ہونے کے لئے دوڑ پڑے۔ میں بھی گھوڑے کو ایڑ لگا کر واپس پہنچا دیکھا کہ لوگوں کی اس قدر کثرت ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ تمام راستے بند ہیں۔ چنانچہ میں گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور لوگوں کے اژدہام سے بمشکل گذرتا ہوا خیمہ امامؑ کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت تک امامؑ خیمہ سے باہر تشریف نہیں لائے تھے۔ پس اچانک امامؑ اس حالت میں خیمہ سے باہر برآمد ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہاتھ میں ایک رومال تھا جس سے آنسو پونچھتے جاتے تھے مگر آنسو تھے کہ برابر بہہ رہے تھے۔ پیچھے پیچھے خادم کرسی اٹھا کر لا رہا تھا۔ خادم نے کرسی رکھی۔ امام بیمارؑ اس پر بیٹھ گئے جب

لوگوں کی نظر اس حال میں سوگوار امام پر پڑی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور رو رو کر چاروں طرف سے تعزیت مسنونہ پیش کرنے لگے۔ اس وقت اس قدر گریہ و بکا اور نالہ وشیون کا شور بلند ہوا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد امامؑ نے لوگوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ خاموش ہو جاؤ۔ چنانچہ ان کی اواز گریہ خاموشی کے ساتھ تبدیلی ہوگئی۔ اس وقت امام سجاد علیہ السلام نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

امام سجاد علیہ السلام کا خطبہ

الحمد للّٰه ربّ العلمین الرّحمن الرّحیم ملک یوم الدین باری الخلائق اجمعین الذی بعد فارتفع فی السموات العلی و قرب فشهد النجوی نحمده علی عظائم الامور و فجائع الدهور و الم الفجائع و مضاضة اللواذع و جلیل الرزء و عظیم المصائب الفاظعة الکاظة الفادحة الجائحة ایها الناس انّ اللّٰه وله الحمد ابتلانا بمصائب الجلیلة و ثلمه فی الاسلام عظیمة قتل ابو عبد اللّٰه و عترته و سبی نسائه و صبیتهٔ وداروا برأسه فی البلد ان من فوق عامل السنان و هذه الرزیة التی لا مثلها رزیة ایها الناس فای رجالات منکم یسرون بعد قتله ام ای فواد لا یحزن من اجله ام اية عین منکم تحبس دمعها وتضن عن انهما لها فقد بکت السبع الشدا دلقتله و بکت البحار بامواجها و السموات بارکانها و الارض بارجانها و الاشجار باغصانها و الحیتان فی لجج البحار و الملائکة المقربون و اهل السموات اجمعون. یا ایها النّاس ای قلب لا ینصدع لقتله ام ای فواد لا یحنّ الیه ام ایّ مسمع یسمع هذه الثلمة التی ثلمت فی الاسلام ولا یصم ایها الناس اصبحنا مطرودین مشردین مذودین شاسعین عن الامصار کأنا اولاد ترک و کابل من غیر جرم اجترمناه ولا مکروه ارتکبناه ولا ثلمة فی الاسلام ثلمناها ما سمعنا بهذا فی ابائنا الاولین ان هذا الا اختلاق. واللّٰه لوانّ النبی صلی اللّٰه علیه و اله تقدم الیهم لم فی قتا لنا کما تقدم الیهم فی الوصایة بنا لما زادوا علی ما فعلوا بنا فانا للّٰه و انا الیه راجعون من مصیبة ما اعظمها و اوجعها و افجعها و اکظها و افظها و امرها و افدحها فعند اللّٰه تحتسب فیما اصابنا وما بلغ بنا انه عزیز ذوانتقام۔[1]

سب تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جو یوم جزاء کا مالک اور تمام مخلوق کا خالق ہے۔ جو (ذات کے اعتبار سے) انتہائی بلند و دور ہے اور (علم و دیگر صفات کے لحاظ سے) انتہائی نزدیک ہے۔ ہم شدائد روزگار نوائب، جگر،

---

[1] لواعج الاشجان، ص ۱۹۳۔ نفس المہموم، ص ۲۵۵۔ تاریخ، ج ۲، ص ۳۵۶ وغیرہ۔

فگار، تکالیف صبر سوز سخت مصیبت، و شدید مصائب اندوہ آگین پر اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ ایہا الناس! خدا کا شکر ہے کہ اس نے عظیم مصائب و شدائد کے ساتھ ہماری آزمائش کی۔ اسلام کی دیوار میں سخت رخنہ شگاف پڑ گیا۔ جناب ابو عبداللہ (الحسینؑ) اور ان کی عترت شہید کر دی گئی۔ اور ان مستورات اور بچوں کو قید کیا گیا۔ اور ان کے سر مقدس کو نوک نیزہ پر بلند کر کے مختلف دیار و امصار میں پھرایا گیا۔ اور یہ وہ عظیم مصیبت ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ ایہا الناس تم میں سے وہ کون ہیں جو آں جناب کی شہادت کے بعد خوش و خرم ہوں گے؟ اور وہ کونسی آنکھ ہے جو اس واقعہ ہائلہ پر آنسو بہانے میں بخل کرے گی؟ ان کی شہادت پر تو ساتوں آسمان (اپنی بلندیوں سمیت سمندر اپنی موجوں کے ساتھ آسمان اپنے ارکان کے ساتھ، زمین اپنے اطراف کے ساتھ، درخت اپنی ٹہنیوں کے ساتھ مچھلیاں سمندروں کی موجوں میں تمام ملائکہ مقربین اور تمام اہل آسمان (و زمین) روئے ہیں۔ ایہا الناس! وہ کونسا دل ہے جو آپ کی شہادت کی وجہ سے پھٹ نہ جائے گا۔ وہ کونسا دل ہے جو ان کی طرف نہیں کھنچے گا، اور وہ کونسا کان ہے جو اس اسلامی رخنہ کی خبر (غم اثر) سنے گا۔ اور بہرہ نہ ہو جائے گا؟ ایہا الناس! ہمیں (اپنے وطن مالوف سے) دور کر دیا گیا۔ ہماری جمعیت کو پراگندہ کر دیا گیا اور ہمیں دیار و امصار سے دور پھینک دیا گیا۔ گویا کہ ہم ترک و دیلم کی اولاد ہیں؟ حالانکہ ہم نے نہ کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا، نہ کسی ناپسندیدہ حرکت کا اور نہ اسلام میں کوئی رخنہ واقعہ کیا تھا نیز ہم نے اپنے بزرگوں کے متعلق بھی ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ خدا کی قسم جس طرح پیغمبر اسلام نے ان لوگوں کو ہمارے اعزاز جلال کی وصیت فرمائی تھی اگر (اس کے برعکس) ان کو ہمارے ساتھ قتل و قتال کا حکم دیتے تو یہ اس سے زیادہ برا سلوک نہ کر سکتے تھے جو اب ہمارے ساتھ کیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (آہ) یہ مصیبت کس قدر عظیم تر، دردناک تر تکلیف دہ تر، شنیع تر، تلخ تر اور گزندہ تر ہے ہمیں جو کچھ مصائب و شدائد پہنچے ہیں ہم ان کے عوض خداوند عالم سے اجر و ثواب کے امیدوار ہیں۔ کیونکہ وہ غالب اور (ظالموں سے) انتقام لینے والا ہے۔

جناب صوحان بن صعصعہ بن صوحان نے جو بوجہ مرض زمین گیر ہو چکے تھے۔ نصرت امام کا فریضہ ادا نہ کر سکنے پر معذرت پیش کی۔ اور امامؑ نے ان کی معذرت کو شرف قبول بخشتے ہوئے ان کے والد کے حق میں دعائے خیر فرمائی بعد ازاں یہ تباہ حال قافلہ مدینہ رسول کی طرف روانہ ہوا۔ دیکھا کہ مدینہ اجڑا ہوا نظر آ رہا ہے اور یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے در و دیوار اپنے مکینوں کی شہادت پر نوحہ و ماتم اور گریہ و بکا کر رہے ہیں۔ کما قال ابن قتیبة فی مرثیة الحسینؑ ؎

مررت علی ابیات آل محمدؐ	فلم ارھا امثالھا یوم حلّت
فلا یبعد اللّٰہ الدیار و اھلھا	و ان اصبحت منھم بزعمی تخلّت

الا ان قتلی الطف من آل هاشم — اذلت رقاب المسلمین فذلّت

و کانوا غیاثاً ثم اضحوا رزیة — لقد عظمت تلک الرزایا و جلّت

الم تر ان الشمس اضحت مریضةً — لفقد حسینٍ و البلاد اقشعرّت[1]

بعض کتب مقاتل میں منقول ہے کہ جب اس حال میں جناب ام کلثوم کی نظر مدینہ رسولؐ کے در و دیوار پر پڑی تو گریہ کناں آواز میں یہ اشعار حزن شعار پڑھنا شروع کیے۔

مدینة جدنا لا تقبلینا — فبالحسرات والاحزان جئنا

الا اخبر رسول اللّٰہ فینا — بانا قد فجعنا فی ابینا

و ان رجالنا بالطف صرعیٰ — بلا روؤس و قد ذبحوا البنینا

و اخبر جدنا انا اسرنا — و بعد الاسر یا جدا سبینا

و رھطک یا رسول اللّٰہ اضحوا — عرایا بالطفوف مسلبینا

وقد ذبحوا الحسینؑ و لم یراعوا — جنابک یا رسول اللّٰہؐ فینا

فلو نظرت عیونک للاساریٰ — علی اقتاب الجمال محملینا

رسولؐ اللّٰہ بعد الصون صارت — عیون الناس ناظرة الینا

و کنت تحوطنا حتیٰ تولت — عیونک ثارت الاعداء علینا

افاطم لو نظرت الی السبایا — بناتک فی البلاد مشتتینا

افاطم لو نظرت الی الحیاری — و لو ابصرت زین العابدینا

افاطم لو رأیت بنا سھاری — و من سھر اللیالی قد عمینا

افاطم ما لقیت من عداک — و لا قیراط مما قد لقینا

فلو دامت حیاتک لم تزالی — الی یوم القیامة تند بینا

و عرّج بالبقیع وقف و نادی — ابن حبیب رب العالمینا

و قل یا عم یا الحسن المزکی — عیال اخیک اضحو اضا یعینا

---

[1] ملہوف، ص ۱۸۸۔

ایا عماه ان اخاک اضحی — بعیدا عنک بالرمضا رهینا

بلا راس تنوح علیه جهرا — طیور والوحوش الموحشینا

ولو عاینت یا مولائی ساقوا — حریماً لا یجدن لهم معینا

علی متن النیاق بالاوطاءِ — و شاهدت العیال مکشفینا

مدینة جدنا لا تقبلینا — فبالحسرات والاحزان جئنا

خرجنا منک بالاهلینا جمعا — رجعنا لا رجال ولا بنینا

وکنا فی الخروج بجمع شملی — رجعنا خاسرین مسلّبینا

و کنا فی امان اللّٰه جهراً — رجعنا بالقطیعة خائفینا

و مولٰینا الحسینؑ لنا انیس — رجعنا والحسینؑ به رهینا

فنحن الضائعات بلا کفیل — و نحن النائحات علٰی اخینا

و نحن السائرات علی المطایا — نشال علی جمال المبغضینا

و نحن بنات یٰس و طٰه — و نحن الباکیات علی ابینا

و نحن الطاهرات بلا خفاء — و نحن المخلصون المصطفونا

و نحن الصابرات علی البلایا — و نحن الصادقون الناصحونا

الا یا جدنا قتلوا حسینا — و لم یرعوا جناب اللّٰه فینا

الا یا جدنا بلغت عدانا — مناها و اشتفی الاعداء فینا

لقد هتکوا النساء و حملوها — علی الاقتاب قهرا اجمعینا

و زینب اخرجوها من خباها — و فاطم و اله تبدی الانینا

سکینة تشتکی من حر وجد — تنادی الغوث رب العالمینا

و زین العابدین بقید ذل — و راموا قتله اهل الخئونا

فبعد هم علی الدنیا تراب — فکاس الموت فیها قد سقینا

و هذی قصتی مع شرح حالی — الا یا سامعون ابکوا علینا

قافلۂ اہل بیتؑ روضۂ رسولؐ پر

راویان اخبار کا بیان ہے کہ جب یہ قافلہ مدینہ میں داخل ہوا تو پہلے پہل سیدھا مسجد نبویؐ اور روضہ رسولؐ کے پاس پہنچا۔ فلک کج رفتار اور دیدہ دہر غدار نے لاکھوں جگر سوز اور جانگداز سانحے دیکھے ہوں گے مگر اس نے علیؑ و بتولؑ کی لاڈلیوں اور رسولؐ اسلام کی نواسیوں اور حسینؑ مظلوم کی بیٹیوں کی واقعہ کربلا کے بعد قید و بند کی صعوبتیں اور طویل سفروں کی دل ہلا دینے والی مشکلیں جھیلنے کے بعد روضہ رسولؐ پر پہنچنے جیسا دردناک منظر کبھی نہ دیکھا ہوگا، جبکہ ام المصائب زینب کبریٰؑ نے مسجد نبویؐ کے دروازہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بلند آواز سے روتے ہوئے کہا ﴿یا جداہ! انی ناعیۃ الیک اخی الحسین﴾ اے جد نامدار! میں آپ کے پاس اپنے بھائی حسینؑ کی خبر شہادت لائی ہوں۔ اس وقت بی بی عالم کی یہ حالت تھی کہ نہ تو آنکھوں سے آنسو تھمتے تھے اور نہ گریہ و بکاء اور نوحہ و بین کرنے میں افاقہ ہوتا تھا۔ اس حال میں جب بھی شریکۃ الحسینؑ کی نظر امام زین العابدینؑ پر پڑتی تھی تو ان کے حزن و ملال میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔[1] بعض کتب میں وارد ہے کہ اس کے بعد جناب ام کلثوم باچشم گریاں و دل بریاں قبر رسولؐ کی طرف بڑھیں اور عرض کیا۔ ﴿السلام علیک یا جداہ! انی ناعیۃ الیک ولدک الحسین﴾ اے نانا! آپ پر درود و سلام ہو، میں آپ کے فرزند حسینؑ کی خبر شہادت سنانے آئی ہوں۔[2]

بعض کتب میں لکھا ہے کہ اس وقت جناب سکینہ بنت الحسینؑ نے بآواز بلند کہا: ﴿یا جداہ! الیک المشتکی مما جری علینا فو اللہ ما رأیت اقسی من یزید ولا رأیت کافراً ولا مشرکاً شرا منہ ولا اجفا و اغلظ فلقد کان یقرع ثغر ابی بمخصرتہ و ھو یقول کیف رأیت الضرب یا حسین﴾ اے جد بزرگوار! جو کچھ ہم پر مصائب و آلام گزرے ہیں تیری بارگاہ میں ان کی شکایت کرتی ہوں۔ خدا کی قسم! میں نے یزید سے بڑھ کر کوئی قسی القلب اور کوئی کافر و مشرک اور شریر نہ دیکھا اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی درشت خو اور جفاکار دیکھا ہے۔ وہ اپنی چھڑی میرے بابا کے دندان پر مارتا بھی تھا اور ساتھ یہ بھی کہتا تھا۔ اے حسینؑ! بتاؤ، اس ضرب کو کیسا پاتے ہو؟[3]

لا اضحک اللہ سن الدھر ان ضحکت   یوماً و آل رسولؐ اللہ قد قھروا

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

---

[1] عاشر بحار، ص ۲۲۳۔ نفس المہموم، ص ۲۵۱۔ مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۵۴۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۹۰۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۵۷۔ لقمام، ص ۲۹۳ وغیرہ۔

[2] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۵۷۔

[3] مقتل الحسین للمقرم، ص ۳۵۳ بحوالہ ریاض الاحزان، ص ۱۶۳۔

بعض کتب مقاتل میں لکھا ہے کہ امام زین العابدینؑ نے اپنا چہرہ مبارک قبر رسولؐ پر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

انا جیک یا جداہ یا خیر مرسل — حبیبک مقتول و نسلک ضائع

اناجیک محزوناً علیلاً موجلاً — اسیراً و نالی حامی و مدافع

سبینا کما تسبی الاماء و مسنا — من الضر ما لا تحمله الا ضالع

ایا جد یا جداہ بعدک اظہرت — امیۃ فینا مکرھا و الشنائع[1]

اس وقت لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ابر بہاری کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور ہر طرف سے وامحمداہ! واعلیاہ! واحسناہ! واحسیناہ! کی آوازیں بلند تھیں۔ بقول صاحب ناسخ التواریخ پندرہ روز تک اسی طرح گریہ و بکاہ اور نوحہ و عزا کا سلسلہ جاری رہا۔[2] اور مخدرات عصمت و زنان بنی ہاشم کی یہ کیفیت تھی کہ لباس غم پہن کر دن رات سید الشہداء پر گریہ و بکاہ کرتی رہتی تھیں اور امام زین العابدینؑ ان کے لئے طعام پکوا کر بھیجتے تھے۔[3]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ﴿ما اختضبت ھاشمیۃ ولا ادھنت ولا اجیل مرود فی عین ھاشمیۃ خمس حجج حتیٰ بعث المختار براس عبید اللّٰہ ابن زیاد﴾ جب تک مختار نے عبید اللہ ابن زیاد کا سر نہیں بھیجا اس وقت تک پورے پانچ سال زنان بنی ہاشم میں سے کسی عورت نے نہ خضاب لگایا اور نہ تیل اور نہ کسی نے آنکھ میں سرمہ لگایا تھا۔[4] امام زین العابدینؑ کے گریہ و بکاہ اور حزن و ملال کی کیفیت کیا تھی؟ امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی سن لیجئے۔ فرمایا۔ ﴿ان زین العابدینؑ بکی علی ابیہ اربعین سنۃ صائماً نھارہ و قائماً لیلۃ فاذا احضر الافطار و جاء غلامہ بطعامہ و شرابہ فیضعہ بین یدیہ فیقول قتل ابن رسول اللّٰہ جائعاً قتل ابن رسول اللّٰہ عطشاناً فلا یزال یکرر ذالک و یبکی حتی یبتل طعامہ من دموعہ و یمزج شرابہ بدموعہ فلم یزل کذالک حتی لحق باللّٰہ عزوجل﴾ زین العابدین علیہ السلام اپنے بابا (کے مصائب) پر چالیس برس روئے۔ کیفیت یہ تھی کہ دن کو روزہ رکھتے، رات بھر عبادت خدا کرتے۔ جب افطاری کا وقت ہوتا اور غلام روٹی پانی لا کر سامنے حاضر کرتا اور عرض کرتا، میرے آقا! کھانا تناول فرمایئے! تو آپ فرماتے، فرزند رسول کو بھوکا شہید کیا گیا۔ ان کلمات کا بار بار تکرار فرماتے اور ساتھ ہی اس قدر روتے کہ آنسوؤں سے کھانا تر

---

[1] ناسخ، ج ۶، ص ۳۵۷۔

[2] ایضاً۔

[3] محاسن برقی، ج ۲، ص ۴۲۰۔

[4] مقتل الحسین للمقرم، ص ۴۵۳۔

ہو جاتا اور آنسو پانی میں مل جاتے۔ آپ کی یہی حالت رہی یہاں تک کہ بارگاہ الٰہی میں تشریف لے گئے۔[1]

جناب امام زین العابدینؑ کا غلام روایت کرتا ہے کہ ایک بار آپ صحرا کی طرف نکل گئے۔ میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دیکھا کہ آپ ایک درشت پتھر کے اوپر سجدہ ریز ہیں اور بلند آواز سے گریہ و بکاء فرما رہے ہیں اور یہ تسبیح بھی پڑھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اس کا ایک ہزار بار تکرار کرتے ہوئے سنا: ﴿لا الہ الا اللّٰہ حقاً حقاً لا الہ الا اللہ تعبداً و رقاً لا الہ الا اللہ ایماناً و تصدیقاً و صدقاً﴾ اس کے بعد آپ نے سر بلند کیا، میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ انور اور ریش مبارک آنسوؤں سے تر بتر تھے۔ میں نے عرض کیا ﴿یا سیدی اما ان لحزنک ان ینقضی و لبکائک ان یقل؟﴾ میرے آقا! کیا کبھی آپ کا حزن و ملال ختم نہ ہوگا؟ اور گریہ و بکاء کم نہ ہوگا؟ میرا یہ سوال سن کر امامؑ نے فرمایا۔ ﴿ویحک ان یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراھیمؑ کان نبیاً ابن نبی لہ اثنی عشر ابنا فغیب اللہ واحداً منھم فشاب راسہ من الحزن واحد و دب ظھرہ من الغم و ذھب بصرہ من البکاء و ابنہ حی فی دار الدنیا و انا رأیت ابی و اخی و سبعۃ عشر من اھل بیتی صرعیٰ مقتولین فکیف ینقضی حزنی و یقل بکائی﴾ افسوس ہے تجھ پر، یعقوبؑ بن اسحاق بن ابراہیم نبی اور نبی زادہ تھے۔ خدا نے ان کو بارہ فرزند عطا فرمائے تھے اور صرف ایک کو (کچھ عرصہ کے لئے ان کی آنکھوں سے) پوشیدہ کر دیا تھا، اس کے نتیجہ میں بوجہ حزن سر سفید بسبب غم کمر خمیدہ اور بوجہ گریہ بصارت ختم ہوگئی تھی حالانکہ ان کا فرزند دنیا میں زندہ موجود تھا مگر میں نے تو اپنی آنکھوں سے اپنے باپ، بھائی اور اپنے خانوادہ کے دوسرے سترہ شہیدوں کو مقتول حالت میں زمین پر پڑا ہوا دیکھا ہے، اس لئے میرا حزن و ملال کیونکر ختم ہو سکتا ہے؟ اور میرا گریہ و بکاء کس طرح کم ہو سکتا ہے؟[2]

﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ﴾

---

[1] لہوف ص ۱۸۹۔
مخفی نہ رہے کہ بنابر مشہور امام سجادؑ کی ولادت ۱۵ جمادی الثانی ۳۸ھ اور ستاون سال کی عمر میں ۲۵ محرم ۹۵ھ میں شہادت واقع ہوئی۔ واقعہ کربلا کے وقت آپ کی عمر تیئس برس تھی اور واقعہ کربلا کے بعد ۳۵ برس زندہ رہے۔ مگر اس روایت میں چالیس برس تک ہونا مذکور ہے۔ تعجب ہے کہ مذکورہ بالا تحقیق کے مطابق بینر کربلا کی ستاون سال کی عمر کے قائل حضرات بھی بلا تبصرہ مذکورہ بالا روایت درج کر دیتے ہیں اور اس اشکال کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے کہ چونتیس اور چالیس سال کیونکر جمع ہو سکتے ہیں، ممکن ہے کہ اصل روایت میں ﴿اربعۃ و ثلاثون﴾ کا لفظ وارد ہو اور بعد میں کتابت کی غلطی سے اربعین بن گیا ہو۔ و اللہ العالم۔ (منہ عفی عنہ)

[2] لہوف ص ۱۹۰۔ نفس المہموم ص ۲۵۶۔ تاریخ ج ۶ ص ۲۵۸۔ مقتل ص ۵۵۹۔ لواعج الاشجان ص ۱۹۵ وغیرہ۔

﴿ ستائیسواں باب ﴾

ان شہداء کی شہادتوں کا بیان جن کا واقعہ کربلا کے ساتھ بالواسطہ گہرا ربط ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان بعض شہدائے کرام کی شہادتوں کا تذکرہ کردیا جائے جن کا بلاواسطہ یا بالواسطہ کربلا کے ساتھ گہرا ربط وتعلق ہے۔ بلکہ یہ شہادتیں سانحہ کربلا ہی کا ایک شعبہ (حصہ) ہیں۔

اس سلسلہ میں سرفہرست جناب (۱) مسلم بن عقیل (۲) ہانی بن عروہ اور (۳) قیس بن مسہر صیداوی (۴) عبداللہ بن یقطر (۵) عبداللہ بن عفیف کی شہادتیں ہیں جن کا تذکرہ اسی کتاب میں اپنے اپنے مناسب مقام پر کیا جاچکا ہے لہٰذا یہاں ان کے اعادہ وتکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

صاحب فرسان الہیجاء، صاحب ذخیرۃ الدارین نے جناب مسلمؑ کی حمایت میں کوفہ کے اندر بعض اور بزرگواروں کی شہادتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ذیل میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان شہبازان کوفہ کی شہادتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (۶) عبدالاعلیٰ بن یزید الکلبی العلیمی جو شیعیان کوفہ میں سے قاری قرآن اور بڑے اچھے شہسوار تھے۔ جناب مسلم کی بیعت کی تھی اور خروج کے دن ان کے ہمراہ تھے۔ کثیر بن شہاب نے ان کو گرفتار کرکے ابن زیاد کے سامنے پیش کیا اور اس نے مختصر سوال وجواب کے بعد حکم دیا کہ جبانہ سبیع میں لے جاکر ان کو شہید کردیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[۱]

(۷) عبداللہ (یا عبداللہ) بن الحارث جو کہ صحابی رسولؐ تھے اور جنگ صفین میں حضرت امیرالمومنینؑ کے ہمرکاب ظفر انتساب تھے۔ کوفہ میں جناب مسلمؑ کے لئے لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ کثیر بن شہاب نے ان کو گرفتار کرکے ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ جناب مسلمؑ کی شہادت کے بعد ان کو بھی شہید کردیا گیا۔[۲]

(۸) عبیداللہ بن عمرو الکندی، حضرت امیر علیہ السلام کے شیعیان کوفہ میں سے بڑے دلیر اور شہسوار تھے۔ جنگ جمل وصفین اور نہروان میں حضرت امیر علیہ السلام کے ہمراہ رہ کر داد شجاعت دے چکے تھے۔ کوفہ میں جناب مسلمؑ کے ہمراہ سرکار سیدالشہداءؑ کے لئے لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ جنگ کوفہ کے وقت جناب مسلمؑ نے بنی کندہ

---

[۱] فرسان، ج۱، ص ۲۳۰۔ [۲] فرسان الہیجاء، ج۱، ص ۲۲۷۔

کے قبیلہ کا علمبردار انہیں کو بنایا تھا۔ بالآخر حصین بن نمیر نے ان کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے سامنے پیش کیا اور اس بدنہاد کے حکم سے ان کو جام شہادت پلایا گیا۔[1]

(۹) عمارہ بن صلخب الازدی کوفہ کے شیعیان حیدر کرار میں سے تھے۔ جناب مسلمؑ کے ہاتھ پر جناب سید الشہداءؑ کے لئے بیعت کر چکے تھے۔ جناب مسلمؑ کی گرفتاری کے بعد محمد بن اشعث محلہ بنی عمارہ میں گشت کر رہا تھا کہ اس اثناء میں عمارہ بن صلخب اس حالت میں گھر سے نکلے کہ اسلحہ جنگ سے مسلح تھے۔ محمد بن اشعث نے انہیں گرفتار کر کے ابن زیاد لعین کے دربار میں پیش کیا۔ اس نے انہیں قید کر دیا اور جناب مسلمؑ کی شہادت کے بعد اسی بدنہاد کے حکم سے ان کو اپنے قبیلہ کے سامنے لے جا کر شہید کر دیا گیا۔[2]

(۱۰) ابوذر بن سلیمان غلام یا آزاد کردہ جناب سید الشہداءؑ نے مکہ سے مکتوب دے کر بصرہ بھیجا تھا جسے گرفتار کر کے ابن زیاد کے حکم سے شہید کر دیا گیا۔[3]

(۱۱-۱۲) شہادت فرزندان مسلم بن عقیلؑ

بعض تحقیق طلب امور پر تبصرہ

قبل اس کے کہ ان مظلوم شہزادوں کی شہادت کا تذکرہ کیا جائے یہاں بعض امور کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتی ہے۔

پہلا امر:۔ اس بات کی تنقیح ضروری ہے کہ ان شہزادوں کا نسب کیا ہے؟ مشہور اور منصور قول یہی ہے کہ یہ دونوں صاحبزادے جناب مسلم بن عقیلؓ کے چشم و چراغ تھے مگر بعض کتب میں ان کو جناب جعفر طیار کے صاحبزادے قرار دیا گیا ہے۔[4] اور بعض میں ان کو عبداللہ بن جعفرؓ کے صاحبزادے ظاہر کیا گیا ہے۔[5] اور طبری نے صرف دولڑکے لکھے ہیں۔[6] بہرحال صحیح قول پہلا ہی ہے۔ دوسرے تمام اقوال جادہ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ (و لیس ھھنا للتفصیل مجال)۔

دوسرا امر:۔ ان شہزادوں کے نام کیا تھے؟ مشہور یہی ہے کہ ایک کا نام ابراہیم اور دوسرے کا محمد[7] تھا لیکن اس پر صاحب فرسان الہیجاء نے (ج ۲ ص ۶۰ پر) یہ اعتراض کیا ہے کہ جناب مسلم کے ایک صاحبزادے مسمی بہ محمد تو کربلا میں جام شہادت پی چکے تھے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کے دونوں صاحب زادوں کے نام محمد

---

[1] فرسان، ج ۱، ص ۳۶۱۔
[2] فرسان، ج ۲، ص ۳۰۳۔
[3] منتخب التواریخ، ص ۲۹۴۔
[4] مقتل، ص ۳۰۶۔
[5] ایضاً۔
[6] بحوالہ حاشیہ فرسان الہیجاء، ج ۱، ص ۱۷۔
[7] فرسان، ج ۱، ص ۱۷۱۔

ہوں ﴿تواریخ بمانشان نمی دهد که مسلم دو پسر بنام محمد داشته باشد﴾ پھر خود ہی اس کتاب میں (ج ۲ص ۲۱ پر) یہ جواب دیا ہے کہ ممکن ہے کہ شہید کوفہ کا اصل نام کوئی اور ہو اور محمد کے نام سے مشہور ہو گئے ہوں ﴿ممکن است آن پسر که درکوفه شهیدشده است بابرادرش ابراهیم نام دیگر داشته وبمحمد شهرت پیدا کرده و الله العالم﴾۔

تیسرا امر :۔ آیا یہ شہزادے جناب مسلم کے ہمراہ کوفہ میں آئے تھے یا شہادت امامؑ کے بعد گرفتار ہوئے تھے؟ مشہور بین العلماء یہی ہے کہ یہ شہزادے امام علیہ السلام کے ہمراہ کربلا میں موجود تھے، آپ کی شہادت کے بعد گرفتار ہو کر قید ہوئے مگر تاریخ اعثم کوفی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مسلم کے ہمراہ کوفہ آئے تھے اور جناب نے ان کو بوقت شہادت شریح قاضی کے سپرد کیا تھا۔ صاحب ناسخ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا[1] ہے مگر صحیح قول پہلا ہی ہے۔ دوسرا قول اصول روایت کے خلاف ہے۔

چوتھا امر :۔ شہزادوں کی شہادت کیونکر واقع ہوئی؟ اس میں قدرے اختلاف ہے۔ مشہور و معروف وہی کیفیت ہے جسے رئیس المحدثین جناب شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے امالی میں درج فرمایا ہے اور پھر متاخرین نے بلا نقد و تبصرہ اپنی اپنی کتب مقاتل میں درج کیا ہے۔ اگرچہ اس کیفیت میں بھی قیل و قال اور اشکال کی گنجائش موجود ہے مگر شیخ کی جلالت اور اس روایت کے راویوں کی وثاقت کے پیش نظر اس پر اعتماد کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ محدث قمی نے بھی (نفس المہموم ص ۸۶ کے حاشیہ پر) اسی طرح شہزادوں کی شہادت درج کرنے کے بعد ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے: ﴿اقول عندی قتل هذين الغلامين بهذا التفصيل مستبعد لكن نقلته اعتمادا على شيخنا الصدوقؒ و رجال سنده. و الله العالم﴾ چنانچہ ہم بھی اسی بنا پر یہاں شیخ صدوقؒ کی روایت کے مطابق ان شہزادوں کی شہادت درج کرتے ہیں۔[2]

چنانچہ جناب شیخ صدوق علیہ الرحمہ اپنے والد ماجد شیخ علی سے اور وہ جناب علی بن ابراہیم قمی سے اور وہ اپنے باپ ابراہیم سے اور وہ ابراہیم بن رجاء سے اور وہ علی بن جابر سے اور وہ عثمان بن داؤد ہاشمی سے اور وہ محمد بن مسلم سے اور وہ حمران بن اعین سے اور وہ اہل کوفہ کے ایک بزرگ ابو محمد سے روایت کرتے ہیں کہ جب امام حسین علیہ السلام کی شہادت ہو چکی تو ان کے پسماندگان میں سے دو شہزادے گرفتار کر کے عبیداللہ بن زیاد کے پاس لائے گئے۔ اس نے

---

[1] ناسخ، ج ۶، ص ۱۹۸ تا ص ۲۰۱۔

[2] لمقام، ص ۲۰۶ پر بالاختصار اور ناسخ، ج ۶، ص ۱۹۸ تا ص ۲۰۱ پر بالتفصیل اور کیفیت کے ساتھ ان کی شہادت مذکور ہے، تفصیلات کے شائقین ان کتب کی طرف رجوع کریں۔ (منہ عفی عنہ)

داروغہ زندان کو بلا کر حکم دیا کہ ان کو قید میں ڈال دے اور ساتھ ہی یہ تاکید کر دی کہ ﴿فمن طیب الطعام فلا تطعمهما و من البارد فلا تسقهما و ضیق علیهما سجنهما﴾ نہ ان کو اچھی غذا کھلانا، نہ ٹھنڈا پانی پلانا اور جہاں تک ہو سکے ان پر قافیہ قید تنگ کرنا۔ زندان میں شہزادوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ دن کو روزہ رکھتے۔ جب افطار کا وقت ہوتا تو داروغہ دو روٹیاں اور ایک کوزہ آب پیش کرتا۔ ایک روز ایک بھائی نے دوسرے بھائی سے کہا۔ برادر جان! ہماری مدت قید بہت دراز ہو گئی ہے، اندیشہ ہے کہ اس حال زار میں کہیں ہمارے قویٰ مضمحل اور زندگیاں ختم نہ ہو جائیں، لہٰذا جب شیخ (داروغہ) آئے تو کم از کم اسے اپنا نام و نسب اور پیغمبرؐ اسلام کے ساتھ اپنی قرابت قریبہ کا تذکرہ تو کریں شاید اس وجہ سے وہ ہمیں خورد و نوش اور رہائش میں کچھ سہولت بہم پہنچائے۔ چنانچہ حسب معمول جب رات کے وقت داروغہ دو قرص نان اور پانی کا ایک کوزہ لے کر آ گیا تو اس وقت چھوٹے شہزادے اور داروغہ کے درمیان اس طرح سلسلہ کلام کا آغاز ہوا۔

شہزادہ:۔ ﴿یا شیخ اتعرف محمداً صلّی اللّٰہ علیه و اٰله﴾ اے شیخ! کیا تم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانتے ہو؟

شیخ:۔ ﴿کیف لا اعرف محمّداً و هو نبییّ﴾ بھلا یہ ممکن ہے کہ میں محمدؐ کو نہ پہچانوں؟ حالانکہ وہ میرے پیغمبر ہیں؟

شہزادہ:۔ ﴿اتعرف جعفر ابن ابی طالبؑ؟﴾ کیا تم جعفر بن ابی طالبؑ کو بھی پہچانتے ہو؟

شیخ:۔ ﴿کیف لا اعرف جعفراً و قد اٰتیٰ اللّٰہ له جناحین یطیر بهما مع الملائکة کیف یشاء!﴾ بھلا میں جناب جعفرؑ کو کس طرح نہ پہچانوں؟ حالانکہ خدائے قدوس نے ان کو دو پر عطا فرمائے ہیں۔ جن کے ساتھ وہ ملائکہ جنت کے ساتھ جس طرح چاہتے ہیں پرواز کرتے ہیں۔

شہزادہ:۔ ﴿اتعرف علی بن ابی طالبؑ﴾ کیا تم علی بن ابی طالبؑ کو بھی پہچانتے ہو؟

شیخ:۔ ﴿کیف لا اعرف علیًا و هو ابن عمّ نبییّ و اخو نبییّ؟﴾ بھلا میں علیؑ کو کیونکر نہ پہچانوں۔ حالانکہ وہ میرے نبیؐ کے ابن عم و برادر ہیں؟

شہزادہ:۔ ﴿یا شیخ فنحن عترة نبیک محمد و نحن من ولد مسلم بن عقیل بن ابی طالب علیهم السلام و بیدک اساریٰ من طیب الطعام فلا تطعمنا و من بارد الشراب فلا تسقینا و قد ضیقت علینا سجننا؟﴾ اے شیخ ہم تیرے نبیؐ کی عترت ہیں۔ یعنی ہم جناب مسلم بن عقیل بن ابی طالبؑ کے فرزند ہیں۔ تو نہ تو ہمیں عمدہ کھانا کھلاتا ہے، نہ ٹھنڈا پانی پلاتا ہے (الٹا) ہماری قید کو سخت کرتا ہے؟

شیخ:۔ کا یہ سننا تھا کہ یہ کہتا ہوا شہزادوں کے قدموں پر گر پڑا: ﴿نفسی لنفسکما الفداء و وجھی لوجھکما الوفاء یا عترة نبی اللّٰہ المصطفی. ھذا باب السّجن بین یدیکما مفتوح فخذ ایّ طریق شئتما! ﴾ میری جان تم نثار! اے عترت مصطفیؐ! یہ قید خانہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جہاں چاہو تشریف لے جاؤ۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ اور راستہ دکھاتے ہوئے عرض کیا کہ رات کو چلنا اور دن کو کہیں چھپے رہنا۔ یہاں تک کہ خدا تمہاری کشائش کے اسباب مہیا فرمائے۔

چنانچہ شہزادوں نے قید خانہ سے نکل کر چلنا شروع کیا۔ جب (غالباً دوسری) رات کی تاریکی چھانے لگی۔ تو شہزادے ایک دروازہ پر کھڑی ہوئی ایک بوڑھی عورت کی طرف بڑھے۔ اور فرمایا: ﴿یا عجوز انا غلامان صغیران غریبان حدثان غیر خبیرین بالطریق و ھذا اللیل قد جنّنا اضفینا سواد لیلتنا ھذہ فلمّا اصبحنا الزمنا الطریق! ﴾ اے ضعیفہ! ہم دو صغیر السن مسافر بچے ہیں۔ اور راستہ سے ناواقف۔ رات کی تاریکی چھا گئی ہے۔ ہمیں آج رات اپنے ہاں مہمان ٹھہرا لے۔ صبح ہوتے ہی ہم اپنا راستہ پکڑیں گے۔ بڑھیا نے کہا: ﴿فمن انتما یا حبیبی! فقد شممت الروائح فما شممت رائحة ھی اطیب من رائحتکما! ﴾ میرے عزیزو! تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ میں نے تمام خوشبوئیں سونگھی ہیں۔ لیکن تمہاری خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہیں سونگھی۔ شہزادوں نے کہا: ﴿یا عجوز! نحن من عترة نبیک محمدؐ (صلی اللّٰہ علیہ و آلہ) ھربنا من سجن عبید اللّٰہ ابن زیاد من القتل ﴾ ہم تیرے پیغمبر کی ذریت ہیں۔ بوجہ خوفِ قتل ابن زیاد کے قید خانہ سے بھاگ آئے ہیں! ضعیفہ نے کہا: میرا ایک فاسق و فاجر داماد ہے جو واقعۂ کربلا میں لشکر ابن زیاد میں شامل تھا۔ مجھے اس سے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں تمہیں یہاں دیکھ کر کوئی گزند نہ پہنچائے۔ شہزادوں نے کہا: اب رات تاریک ہے۔ جب صبح ہوگی۔ ہم اپنی راہ لیں گے۔ چنانچہ ضعیفہ شہزادوں کو گھر لے گئی۔ پھر آب و طعام لائی۔ شہزادوں نے نوش جان کیا۔ جب سونے لگے تو چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا: برادر جان! امید ہے کہ آج کی رات امن و امان سے گزرے گی۔ آیئے میں اپنی باہیں آپ کے گلے میں ڈال دوں۔ اور تم اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دو۔ اور میں آپؑ کی خوشبو کو سونگھوں۔ تم میری خوشبو کو سونگھو۔ قبل اس کے کہ موت ہمارے تمہارے درمیان جدائی ڈال دے۔

چنانچہ شہزادے اسی حالت میں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سو گئے۔ ابھی رات کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا کہ اس ضعیفہ کے داماد نے دق الباب کیا۔ ضعیفہ نے دریافت کیا: کون ہے؟ ملعون نے کہا: میں فلاں ہوں! بڑھیا نے کہا: اس وقت آنے کا کیا مقصد ہے؟ فاسق نے کہا: جلدی دروازہ کھولو کہ شدت خستگی کی وجہ سے میری جان نکل رہی ہے۔ اور دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ ضعیفہ نے پوچھا: یہ خستگی کیسی ہے؟ ملعون نے کہا: عبید اللہ بن زیاد کے لشکر

(قید خانہ) سے دو صغیر السن بچے بھاگ گئے ہیں۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ جو شخص ان میں سے ایک کا سر لائے گا۔ اسے ایک ہزار اور جو دونوں کا سر لائے گا۔ اسے دو ہزار درہم انعام دیا جائے گا۔ اس لیے میں نے اس لالچ میں دن بھر بڑی تگ و دو کی۔ مگر کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ ضعیفہ نے کہا: اس بات سے ڈرو کہ بروز قیامت محمد مصطفیٰ ' تیرے دشمن ہوں۔ فاسق نے کہا: میں یہ سب کچھ حرص دنیا کے لیے کر رہا ہوں۔ ضعیفہ نے کہا: اس دنیا کو حاصل کر کے کیا کرو گے؟ جبکہ آخرت ہاتھ سے چلی جائے گی۔ اس نے اس رحم دل بڑھیا کا یہ جواب سن کر کہا: تیرے اس ہمدردانہ جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ تو ان بچوں کی حمایت کر رہی ہے۔ گویا تمہیں ان کا کچھ اتہ پتہ ہے۔ پھر کہا: اٹھو، تمہیں حاکم کوفہ نے یاد کیا ہے۔ بڑھیا نے کہا: مجھ سے حاکم کو کیا سروکار ہے۔ میں ایک بوڑھی عورت ہوں۔ جو اس صحرا میں رہتی ہوں۔ اس خبیث نے جھلا کر کہا: دروازہ کھول۔ تاکہ میں کچھ آرام و استراحت کر لوں۔ صبح سوچوں گا کہ کہاں انہیں تلاش کروں۔ بہرحال ضعیفہ نے دروازہ کھولا۔ ملعون اندر آیا۔ بڑھیا نے طعام پیش کیا جسے کھا کر سو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ملعون کے کانوں میں شہزادوں کے سانس لینے کی بھنک پڑ گئی۔ چنانچہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ اور اونٹ کی طرح بلبلاتا اور بیل کی طرح آواز نکالتا ہوا کمرے کی دیواروں کو ٹٹولنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کا نجس ہاتھ چھوٹے شہزادوں کے پہلو پر جا لگا۔ شہزادہ نے گھبرا کر کہا: کون ہے؟ ملعون نے جواب دیا: میں تو صاحب منزل ہوں۔ البتہ تم بتاؤ تم کون ہو؟ اس وقت چھوٹے شہزادے نے بڑے شہزادے کو جگاتے ہوئے کہا: ﴿قم یا حبیبی فقد واللہ وقعنا فیما کنا نحاذرہ﴾ حبیب سن! اٹھو بخدا ہم جس مصیبت سے ڈرتے تھے۔ اسی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ملعون نے پھر یہی سوال دہرایا کہ تم کون ہو؟ شہزادوں نے کہا: ﴿یا شیخ ان نحن صدقناک فلنا الامان؟﴾ اے شیخ! اگر ہم تجھے صحیح صحیح صورت حال بتا دیں۔ تو کیا ہمارے لیے امان ہے؟ ملعون نے کہا: ﴿نعم امان اللہ و امان رسولہ و ذمۃ اللہ و ذمۃ الرسول اللہ﴾ ہاں خدا اور رسول کی امان ہے۔ اور خدا اور رسولؐ کے عہد و پیمان اور ذمہ داری پر؟ شہزادوں نے اس امان دہی کو مزید پختہ کرنے کے لیے فرمایا: ﴿و محمد بن عبد اللہ علی ذلک من الشاھدین﴾ (جناب رسولؐ خدا اس بات پر گواہ ہیں؟) ملعون نے کہا: ہاں۔ پھر شہزادوں نے کہا: ﴿یا شیخ فنحن من عترۃ نبیک محمد صلی اللہ علیہ و الہ ھربنا من سجن عبید اللہ بن زیاد من القتل﴾ اے شیخ! ہم تیرے نبی محمدؐ کی عترت میں سے ہیں۔ خوفِ قتل کی وجہ سے ابن زیاد کی قید سے بھاگ آئے ہیں۔ ملعون نے کہا: ﴿من الموت ھربتما و الی الموت وقعتما الحمد للہ الذی اظفرنی بکما﴾ تم موت کے ڈر سے بھاگے ہو اور موت کے چنگل میں پھنس گئے ہو۔ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کیا۔ پھر اٹھا۔ اور شہزادوں کے ہاتھ پس پشت باندھ دیئے۔ اسی حالت میں انہوں نے صبح کی۔ جب صبح صادق ہوئی تو اس نے اپنے سیاہ فام فلیح نامی غلام کو حکم

دیا کہ ان شہزادوں کو دریائے فرات کے کنارے لے جا کر قتل کر دو۔ اور ان کے سر میرے پاس لاؤ۔ تاکہ میں ابن زیاد کے پاس لے جا کر دو ہزار درہم کا انعام حاصل کروں۔ چنانچہ وہ غلام شہزادوں کو ہمراہ لے کر فرات کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی تھوڑا سا راستہ طے کیا تھا کہ شہزادوں نے کہا: اے سیاہ فام! تیری سیاہی بلال مؤذن رسولؐ کے ساتھ کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ غلام نے کہا: میرے آقا نے تمہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ شہزادوں نے کہا: ﴿یا اسود! نحن من عترة نبیک محمدؐ﴾ اے سیاہ فام! ہم تیرے نبی کی عترت ہیں۔ ہم ابن زیاد کی قید سے بھاگ کر تمہاری اس ضعیفہ کے ہاں مہمان ہوئے۔ اب تمہارا آقا ہمیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ جب غلام کو شہزادوں کا حسب و نسب معلوم ہوا۔ تو شہزادوں کے قدموں پر گر پڑا۔ اور قدموں پر بوسہ دیتے ہوئے کہا: ﴿نفسی لنفسکما الفداء. و وجھی لوجھکما الوقاء یا عترة نبی اللہ المصطفیٰؐ و اللہ لا یکون محمدؐ خصمی فی القیمة﴾ میری جان تم پر قربان۔ بخدا ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ بروز قیامت جناب رسول خداؐ میرے دشمن ہوں۔ اس کے بعد تلوار ہاتھ سے پھینک دی۔ اور اپنے آپ کو نہر فرات میں ڈال دیا اور تیر کر دوسری جانب چلا گیا۔ ملعون نے یہ منظر دیکھ کر اسے کہا: اے غلام تو نے میری نافرمانی کی۔ غلام نے جواب دیا: جب تک تو نے خدا کی نافرمانی نہیں کی۔ اس وقت تک میں نے تیری فرمان برداری کی ہے۔ اب جبکہ تو خدا کی معصیت کر رہا ہے۔ تو میں دنیا و آخرت میں اب تجھ سے بیزار ہوں۔ پھر اس ملعون نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا: دیکھ بیٹا میں دنیا کا سب حلال و حرام تیرے ہی لیے جمع کر رہا ہوں۔ جاؤ! نہر فرات کے کنارے ان بچوں کو قتل کر کے ان کے سر میرے پاس لاؤ۔ تاکہ میں ابن زیاد سے جا کر مقررہ انعام حاصل کروں۔ چنانچہ اس نوجوان نے تلوار ہاتھ میں لی اور شہزادوں کو لے کر چلا۔ ابھی تھوڑا سا ہی راستہ طے کیا تھا کہ ایک شہزادہ نے کہا: ﴿یا شباب ما اخوفنی علی شبابک من نار جھنم﴾ ''اے جوان مجھے تیری اس بھرپور جوانی کا بڑا اندیشہ ہے کہ کس طرح آتش جہنم میں جلے گی۔'' شہزادوں کا یہ کلام سن کر نوجوان نے دریافت کیا: تم کون ہو؟ شہزادوں نے جواب دیا: ہم تیرے نبی کی عترت ہیں۔ تمہارا والد ہمیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ وہ نوجوان شہزادوں کے قدموں پر گر گیا۔ اور قدم چومتے ہوئے وہی کلمات دہرائے جو قبل ازیں سیاہ فام غلام نے کہے تھے۔ پھر تلوار پھینک کر دریا کے اس پار چلا گیا۔ ملعون نے چلا کر کہا: بیٹا! تو نے بھی میری نافرمانی کی۔ جوان نے کہا: اگر خدا کی فرمانبرداری کروں۔ اور تمہاری نافرمانی تو یہ اس سے بہتر ہے۔ کہ تمہاری فرمانبرداری کروں اور خدا کی نافرمانی! اس وقت ملعون نے غصہ سے آگ بگولہ ہو کر کہا: میرے سوا تمہیں اور کوئی قتل نہیں کرے گا۔ پھر شمشیر بکف ہو کر نکلا۔ چنانچہ جب نہر فرات کے کنارے پہنچا تو تلوار کو میان سے کھینچا۔ جب شہزادوں نے کھنچی ہوئی تلوار کو دیکھا تو آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

شہزادے:۔ ﴿یا شیخ انطلق بنا الی السوق و استمتع باثماننا. ولا ترد ان یکون محمدؐ خصمک فی القیمۃ﴾ اے شیخ ہمیں بازار میں زندہ لے جا کر فروخت کر دے اور ہماری قیمت سے فائدہ حاصل کر۔ ہمیں قتل کر کے محمد مصطفیٰؐ کو بروزِ قیامت اپنا دشمن نہ بنا۔

ملعون:۔ نہیں میں تو ضرور تمہیں قتل ہی کروں گا۔ اور تمہارے سر ابن زیاد کے پاس پہنچا کر دو ہزار درہم انعام حاصل کروں گا۔

شہزادے:۔ ﴿یا شیخ! اما تحفظ قرابتنا من رسول اللّٰہ﴾ اے شیخ! کیا تم ہماری قرابت رسول کا بھی کوئی خیال نہیں کرتے؟

ملعون:۔ تمہیں رسولؐ سے کوئی قرابت نہیں ہے۔

شہزادے:۔ ﴿یا شیخ فات بنا الی عبید اللّٰہ بن زیاد حتی یحکم فینا بامرہ﴾ اے شیخ! ہمیں زندہ ابن زیاد کے پاس لے جاؤ تا کہ وہ ہمارے متعلق مناسب فیصلہ کرے۔

ملعون:۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تو تمہارا خون بہا کر ہی ابن زیاد کا تقرب حاصل کروں گا۔

شہزادے:۔ ﴿یا شیخ! اما ترحم صغر سننا﴾ اے شیخ! کیا تم ہماری صغر سنی پر بھی رحم نہیں کرتے۔

ملعون:۔ تمہارے بارے میں خدا نے میرے دل میں رحم پیدا ہی نہیں کیا۔

شہزادے:۔ ﴿یا شیخ ان کان ولا بد فدعنا نصلی رکعات﴾ اے شیخ! اگر ہمیں ضرور قتل ہی کرنا ہے۔ تو ہمیں چند رکعت نماز پڑھنے کی تو مہلت دے دو۔

ملعون:۔ ﴿فصلیا ما شئتما ان نفعتکما الصلوٰۃ﴾ اگر نماز تمہیں کوئی فائدہ دیتی ہے تو جس قدر چاہو پڑھو۔

چنانچہ شہزادوں نے چار چار رکعت پڑھی۔ پھر آسمان کی طرف نگاہیں بلند کر کے بارگاہ اللہ العالمین میں عرض کیا: ﴿یا حیّ یا حلیم، یا احکم الحاکمین اُحکم بیننا و بینہٗ بالحق﴾ (اے حی و حلیم۔ اے احکم الحاکمین تو ہمارے اور اس کے درمیان برحق فیصلہ فرما)۔ جب شہزادے دعا و پکار سے فارغ ہوئے۔ تو ملعون بڑے شہزادے کی طرف بڑھا۔ اور ان کی گردن اڑا دی اور سر توبرے میں رکھ دیا۔ چھوٹا شہزادہ بڑے بھائی کے خون میں لوٹنے لگا۔ اور کہا: میں رسولؐ خدا کی خدمت میں اپنے بھائی کے خون میں اس طرح لتھڑا ہوا جاؤں گا۔ ملعون نے کہا: میں ابھی تمہیں بھی اپنے بھائی سے ملحق کرتا ہوں۔ اس کے بعد تلوار کا ایک وار کر کے ان کا سر بھی تن سے جدا کر دیا۔ اور سر توبرے میں رکھ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ پھر دونوں شہزادوں کی لاش ہائے مقدسہ کو دریا میں پھینک دیا۔ جبکہ ان سے خون ٹپک رہا تھا۔ اور سروں کو لے کر سیدھا ابن زیاد کے دربار میں پہنچا۔ اس وقت ابن زیاد کرسی پر بیٹھا تھا اور

ہاتھ میں چھڑی تھی۔ جب ملعون نے اس کے سامنے سر پیش کئے۔ تو ابن زیاد سروں کو دیکھتے ہی تین بار اٹھا اور بیٹھا۔

پھر اس ملعون کو مخاطب کر کے دریافت کیا:

ابن زیاد: افسوس ہے تجھ پر۔ تو نے ان کو کہاں پایا؟

ملعون: ہماری ایک بڑھیا نے ان کو مہمان ٹھہرایا ہوا تھا۔

ابن زیاد: پھر تو نے حق مہمانی کا خیال بھی نہ کیا؟

ملعون: نے نفی میں جواب دیا۔

ابن زیاد: شہزادوں نے تمہیں کچھ کہا بھی تھا؟

ملعون: ہاں کہا تھا کہ ہمیں بازار میں جا کر فروخت کر دو۔ اور ہماری قیمت سے فائدہ اٹھاؤ۔

ابن زیاد: پھر تم نے انہیں کیا کہا تھا؟

ملعون: میں نے کہا تھا: ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تو تمہیں قتل کر کے تمہارے سر ابن زیاد کے پاس لے جاؤں گا۔ تا کہ دو ہزار کا انعام حاصل کروں۔

ابن زیاد: اور کیا کہا تھا؟

ملعون: کہا تھا کہ ہمیں زندہ ابن زیاد کے پاس لے جا۔ تا کہ وہ جو چاہے ہمارے متعلق فیصلہ کرے۔

ابن زیاد: تو نے انہیں کیا جواب دیا؟

ملعون: میں نے کہا تھا: میں تمہارے قتل کے ذریعے سے اس کا تقرب حاصل کروں گا۔

ابن زیاد: اگر تو ان کو زندہ میرے پاس لاتا۔ تو میں یہ انعام دوگنا کر کے تجھے چار ہزار درہم دیتا۔ اچھا یہ بتاؤ: پھر انہوں نے کچھ اور بھی کہا تھا؟

ملعون: کہا تھا: ہماری قرابت داری رسول کا لحاظ کر۔

ابن زیاد: تو نے کیا کہا تھا؟

ملعون: میں نے کہا تھا: تمہیں رسولؐ سے کوئی قرابت داری نہیں ہے!

ابن زیاد: اور بھی کچھ کہا تھا؟

ملعون: ہاں کہا تھا کہ ہماری صغر سنی پر رحم کرو۔

ابن زیاد: پھر تو نے ان پر رحم نہ کیا؟

ملعون: میں نے کہا تھا: تمہارے متعلق خدا نے میرے دل میں رحم پیدا ہی نہیں کیا۔

ابن زیاد: کیا کچھ اور بھی کہا تھا؟

ملعون: ہاں یہ کہا تھا کہ ہمیں چند رکعت نماز پڑھنے دو۔ میں نے کہا تھا کہ اگر نماز تمہیں کچھ فائدہ دیتی ہے تو پڑھ لو۔ چنانچہ شہزادوں نے چار رکعت نماز پڑھی تھی۔

ابن زیاد: نماز کے بعد بھی کچھ کہا تھا؟

ملعون: ہاں آسمان کی طرف نگاہیں بلند کر کے یہ دعا پڑھی تھی: ﴿يا حيّ يا حليم. يا احكم الحاكمين اُحكم بيننا و بينهٔ بالحق﴾

ابن زیاد: احکم الحاکمین نے تمہارا فیصلہ کر دیا ہے۔ پھر بآواز بلند کہا: ﴿من للفاسق؟﴾ کوئی ہے جو اس فاسق کا کام تمام کرے۔ یہ سن کر ایک شامی مرد اٹھا۔ اور کہا: میں حاضر ہوں۔ ابن زیاد نے اسے کہا: اسے اسی جگہ لے جاؤ جہاں اس نے شہزادوں کو قتل کیا تھا۔ وہاں اسے قتل کر دو۔ مگر خیال رکھنا اس کا خون ان کے خون کے ساتھ نہ ملنے پائے اور جلدی اس کا سر قلم کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ شامی نے تعمیل حکم کی۔ اور اس کا سر قلم کر کے لایا پھر اسے نوکِ سناں پر بلند کیا گیا۔ کوفہ کے اطفال خورد سال اسے پتھر مارتے اور کہتے تھے: ﴿هذا قاتل ذرية رسول الله صلى الله عليه و اله﴾ یہ ذریت رسول کا قاتل ہے۔[1]

---

[1] امالی شیخ صدوق علیہ الرحمہ، ص ۵۱۔ عاشر بحار الانوار، ص ۲۷۶۔ نفس المہموم، ص ۸۶۔ تظلم الزہراء، ص ۱۳۹ وغیرہ۔

اسیران آل رسولؐ کا مختصر تعارف

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسیرانِ اہل بیتؑ کی بعض اہم شخصیات کے مختصر مگر جامع حالات کا تذکرہ کر دیا جائے۔ تاکہ قارئین کرام ان کے حالاتِ زندگی سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ جیسا کہ قبل ازیں شہدائے کربلا کے مختصر حالاتِ زندگی سے ان کو روشناس کرایا جا چکا ہے۔

(۱) امام علی بن الحسینؑ المعروف بامام زین العابدینؑ

ولادت باسعادت

آنجنابؑ کی ولادت مدینہ منورہ میں ۲۵ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ میں واقع ہوئی۔ آپؑ کی والدہ ماجدہ شاہ زنان (شہر بانو) بنت یزدجرد ہیں۔ آپ کی ولادت حضرت امیرؑ کی ظاہری خلافت کے دور میں ہوئی۔ ابھی ولادت کو پورے تین سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ جناب امیرؑ کی شہادت واقع ہوئی۔ اور قریباً زندگی کی بارہ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ عم بزرگوار حضرت امام حسن مجتبیٰؑ کی شہادت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ شہادت امام حسینؑ کے وقت آپ کی عمر شریف ۲۳ برس تھی۔ ہجرت مدینہ سے لے کر آ کر دم تک آپ سید الشہداءؑ کے ہمرکاب رہے۔ اس اثنا میں آنجنابؑ بیمار ہو گئے۔ بیماری کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔ لیکن اس قدر معلوم ہے کہ روز عاشوراء آپؑ اتنے بیمار تھے کہ جہاد میں شرکت نہیں کر سکے۔ اور نصرت امامؑ میں دوسرے شہداء کی طرح شمولیت نہیں فرما سکے۔ عالم اسباب میں خداوند عالم کو نسل رسولؐ کا باقی رکھنا اور امام زین العابدینؑ کا اور طریقہ سے امتحان لینا مقصود تھا۔ اس لئے ان کو ان ایام میں مبتلائے مرض کر دیا۔

شہادت امامؑ کے بعد جب مخدراتِ عصمت و طہارت کو اسیر کیا گیا تو امام زین العابدینؑ اس مصیبت میں شریک تھے۔ قبل ازیں ان کی اسیری کے واقعات بیان کئے جا چکے ہیں۔

زہد و تقویٰ

مؤرخین متفق القول ہیں کہ آپؑ اپنے زمانہ میں بے مثال زاہد و متقی تھے۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے: ﴿انہ کان یصلی فی الیوم واللیلۃ الف رکعت الی ان مات﴾ آپؑ دن اور رات میں ایک ہزار رکعت

نماز پڑھتے تھے۔ اسی حالت میں آپ نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔[۱] احیاء العلوم غزالی میں ہے: ﴿کان اذا توضأ للصلوٰة یصفر لونه فقیل له ما هذا الحال الذی یعتریک قال الدرون بین یدی من ارید ان اقف﴾۔ امام زین العابدینؑ جس وقت وضو کرتے تھے۔ آپ کا رنگ پیلا ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہونے والا ہوں۔[۲] نور الابصار، (ص ۱۳۹) میں جناب ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ ﴿لم ار هاشمیا افضل من علی بن الحسینؑ﴾ میں نے علی بن الحسینؑ سے افضل کوئی ہاشمی نہیں دیکھا۔ فصول مہمہ (ص ۱۸۵ پر) سعید بن مسیب تابعی کا قول ہے: ﴿لم ار اورع منه﴾ میں نے امام زین العابدینؑ سے زیادہ کوئی پرہیزگار نہیں دیکھا۔[۳]

آپ کا علم وفضل

یحییٰ عامری نے ریاض المستطابہ میں لکھا ہے ﴿کان رضی الله عنه نهایة فی العلم و غایة فی العبادة و کان له فی الیوم و اللیلة اوراداً الا تطیق القیام بها جماعة من الناس﴾ آپ کی ذات ستودہ صفات علم کی انتہائی بلندیوں اور عبادت کی آخری چوٹیوں پر پہنچی ہوئی تھی۔ آپ شب وروز میں اس قدر اوراد و وظائف پڑھا کرتے تھے کہ لوگوں کی مشترکہ جماعت بھی اس قدر نہیں پڑھ سکتی۔[۴]

آپ کے اخلاق کریمانہ

آپ کے اخلاق کریمانہ میں سے صرف ایک واقعہ کا نقل کر دینا ہی کافی ہوگا۔ نور الابصار، (ص ۱۴۱، طبع مصر) میں مروی ہے: ﴿ان علیا زین العابدین خرج من المسجد یوما فلقیه رجل فسبه و بالغ فی سبه دعا و الیه العبید و الموالی فکفهم عنه و اقبل الیه و قال له ما ستر عنک من امرنا اکثر الک حاجة نعینک فیها فاستحی الرجل فالقی الیه قمیصه و القی الیه خمسة آلاف درهم فقال اشهد انک من اولاد المصطفیٰ﴾۔ ایک مرتبہ آپ مسجد سے برآمد ہوئے تو ایک شخص سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ جس نے آپ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ آپ کے غلام اس کی طرف بڑھے۔ مگر آپ نے ان کو روک دیا اور کہا۔ اے شخص! ہمارے حالات کا بہت سے حصہ تو تجھ سے مخفی ہے۔ اگر تجھ کو کوئی حاجت ہو تو بیان کرو تا کہ ہم تمہاری معاونت کریں۔ پھر آپ نے اپنا جبہ اور پانچ ہزار درہم اس کی طرف پھینک دیئے، اس کو حیاء آئی اور اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ واقعی آپ اولاد رسولؐ ہیں۔

۱۔ فصول مہمہ، ص ۱۸۳۔ تاریخ احمدی، ص ۳۲۹۔
۲۔ تاریخ احمدی، ص ۳۲۹۔
۳۔ نور الابصار، ص ۱۳۹۔
۴۔ تاریخ احمدی، ص ۳۳۰۔

آپؑ کی شہادت

آپؑ کی شہادت ۲۵ محرم الحرام ۹۵ھ میں ہوئی۔ جبکہ آپؑ کی عمر ۵۷ سال تھی۔ ابن صباغ مالکی نے لکھا ہے: ﴿انه مات مسموماً و ان الذی سمه ولید بن عبد الملک و دفن بالبقیع عند عمه الحسن﴾[1]۔ علماء کا قول ہے۔ کہ آپؑ زہر سے شہید کیے گئے۔ اور آپ کو ولید بن عبد الملک نے زہر دی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

(۲) امام محمد بن علی الباقرؑ

ولادت باسعادت

آپؑ کی ولادت باسعادت یکم رجب المرجب ۵۷ھ کو مدینہ منورہ میں واقع ہوئی۔ واقعہ کربلا میں آپ اپنے اب وجد کے ہمراہ موجود تھے۔ اس وقت آپؑ کی عمر قریباً چار برس تھی۔

القاب شریفہ

آپؑ کے بہت سے القاب مبارکہ ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور لقب ''باقر'' ہے۔ جس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے: ﴿بذلک من بقر الارض ای شقها و اثار مخبأتها و مکامنها فلذلک هو اظهر من مخبات کنوز المعارف و حقائق الاحکام...... و من ثم قیل فیه هو باقر العلم و جامعه و شاهر علمه و رافعه﴾[2] بقر کے لغوی معنی شگافتہ کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ﴿بقر الارض ای شقها و اثار مخبأتها﴾ اس نے زمین کو شگافتہ کیا۔ یعنی اس کو چیرا اور اس کے پوشیدہ اسرار کو واضح کیا۔ آپؑ کو اسی مناسبت سے باقر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ نے خزائن علوم و معارف کے اسرار و رموز اور احکام کے حقائق کو واضح کر دیا۔ اس وجہ سے کہا جاتا ہے۔ آپؑ ہی علم کے شگافتہ کرنے والے، اس کو جمع کرنے والے اور اس کے علمبردار ہیں۔ آپ کا یہ لقب گرامی خود رسول اللہؐ نے تجویز فرمایا تھا۔ چنانچہ الفصول المہمہ، ص ۱۹۳، اور صواعق، ص ۱۹۹ میں جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: ﴿یا جابر یوشک ان تلتحق بولدی من ولدی الحسینؑ اسمهٔ کاسمی یبقر العلم بقراً ای یفجرهٔ تفجیراً فاذا رائیتهٔ فاقرأه منی السلام﴾۔ اے جابر! عنقریب تم امام حسینؑ کی اولاد میں سے میرے ایک فرزند سے ملاقات کرو گے۔ جو میرا ہم نام ہوگا۔ جو کہ علم کو شگافتہ کرے گا۔ یعنی علم کے چشمے جاری کرے گا۔ جب تم ان کو دیکھو تو ان کو میرا سلام کہہ دینا۔

---

[1] الفصول المہمہ، ص ۱۹۰۔ صواعق محرقہ، ص ۱۳۰۔

[2] صواعق محرقہ، ص ۱۹۹۔

آپ کا علم و فضل

صاحب نور الابصار (ص ۱۴۳ میں) اور ابن صباغ مالکی فصول مہمہ (ص ۱۹۲ میں) بحوالہ الارشاد لکھتے ہیں:

﴿کان اشهرهم ذکراً و اکملهم فضلاً و اعظمهم نبلاً لم یظهر من احد من ولد الحسنؑ و الحسینؑ من علم الدین و السنن و علم القران و فنون الادب ما ظهر من ابی جعفر الباقر علیه السلام﴾ آپ "تمام ائمہ علیہم السلام سے زیادہ مشہور اور زیادہ صاحب فضل وجلالت تھے۔ اولاد امام حسنؑ و حسینؑ میں سے کسی سے اس قدر علم دین و سنن اور علم قرآن اور فنون ادب ظاہر نہیں ہوئے جس قدر امام محمد باقرؑ سے ظاہر ہوئے ہیں۔ آپؑ سے جلیل القدر تابعین اور جید علماء نے علوم دینیہ حاصل کئے اور آپؑ کے متعلق محدث شہیر مالک بن اعین جہنی کہتا ہے:

﴿اذا طلب الناس علم القرآن کان القریش علیه عیالاً﴾۔ اگر لوگ علم قرآن حاصل کریں۔ تو قریش اس علم میں امام باقرؑ کے عیال (ممنون احسان) ہیں۔

آپؑ کا زہد و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ

ابن حجر مکی صواعق محرقہ، ص ۱۹۹ میں فرماتے ہیں: آپ علم و عبادت اور زہد و تقویٰ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے قائم مقام تھے۔ ابن صباغ مالکی الفصول المہمہ، ص ۱۹۲ میں فرماتے ہیں: ﴿هو باقر العلم و جامعه و شاهره و رافعه و متفوق دره و راصعه صفی قلبه و زکی عمله و طهرت نفسه و شرفت اخلاقه و عمرت اوقاته بطاعة الله و رسخ فی مقام التقوی قدمه و میثاقه﴾ آپ ہی علم کے سینہ کو چیرنے والے، اس کے جامع اور اس کے علم بردار ہیں۔ اور اس کے آبدار موتیوں کو ٹانکنے والے ہیں۔ آپ پاکیزہ دل، نیک سیرت، طاہر النفس اور شریف الاخلاق تھے۔ جن کے اوقات اللہ کی اطاعت سے آباد رہتے تھے۔ اور مقام تقویٰ و طہارت میں راسخ القدم تھے۔ ابن صباغ لکھتے ہیں کہ: امام محمد باقرؑ اپنے علم و فضل، ریاست علمیہ اور امامت کبریٰ کے حامل ہونے کے باوجود مشہور ترین سخی تھے۔ اسود بن کثیر نے آپ کی خدمت میں تنگ دستی کی شکایت کی۔ آپؑ نے اس کو سات سو درہم عطا فرمائے۔ اور فرمایا: فی الحال ان کو صرف کرو۔ جب یہ ختم ہو جائیں تو مجھ کو آگاہ کر دینا۔[1]

آپؑ کی شہادت

آپؑ کی شہادت زہر کی وجہ سے ہوئی۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ صواعق محرقہ، ص ۱۹۹ میں ہے:

﴿توفی سنة سبع عشرة و مأة عن ثمان و خمسین سنة مسموماً کابیه﴾۔ آپؑ اٹھاون برس کی عمر میں اپنے والد ماجدؑ کی طرح زہر سے شہید ہوئے۔ اور سن شہادت ۱۱۷ھ ہے۔ (صحیح ۱۱۴ھ ہے۔ ۷ ذی الحجہ) (ہر دو

---

[1] الفصول المہمہ، ص ۱۹۷۔

اماموں کے حالات کا یہ اجمالی مگر جامع خاکہ اپنی کتاب "اثبات الامامت" از ص ۲۷۲ تا ص ۲۷۵ لیا گیا ہے)۔

(۳) حضرت زینبؑ بنت علی علیہا السلام

ولادت باسعادت

آپؑ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت ۵ جمادی الاولیٰ، سنہ ۵ ھ میں ہوئی۔[1] آپؑ جناب صدیقہ کبریٰ کی بڑی صاحبزادی اور امام حسینؑ سے قریباً دو سال چھوٹی تھیں۔

بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولادت کے بعد جناب مخدومہ کونین سلام اللہ علیہا ان کو حضرت امیرؑ کی خدمت میں لائیں۔ اور عرض کیا۔ ان کا نام تجویز فرمائیے۔ آنجنابؑ نے فرمایا میں حضرت رسولؐ خدا پر کس طرح سبقت کرسکتا ہوں۔ اس وقت آنحضرتؐ کہیں سفر پر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے اور ان کی خدمت میں نام تجویز کرنے کی درخواست پیش کی گئی تو آپؐ نے فرمایا میں خداوند عالم پر کس طرح سبقت کرسکتا ہوں۔ اس وقت جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور پروردگار عالم کی طرف سے تحفہ درود وسلام کے بعد کہا کہ خداوند ارشاد فرماتا ہے کہ اس مولودہ کا نام زینبؑ رکھ دیجئے کہ خدا نے ان کے لیے یہی نام تجویز کیا ہے۔ پھر جبرئیلؑ نے ان مصائب وآلام کی خبر دی جو اس مخدرہ پر وارد ہونے والے تھے۔ یہ سن کر آنحضرتؐ روئے اور فرمایا: ﴿من بکی علی مصائب هذه البنت کان کمن بکی علی اخویها الحسنؑ و الحسینؑ﴾۔ جو میری اس بیٹی کی مصیبت پر روئے گا وہ اجر وثواب میں اس کے بھائی حسنؑ وحسینؑ کے مصائب پر رونے والے کی مانند ہوگا۔[2]

القاب مبارکہ

جناب زینب عالیہ علیہا السلام کے بہت سے القاب ہیں جن میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں: (۱) صدیقہ صغریٰ، (۲) عقیلہ بنی ہاشم، (۳) عالمہ غیر معلّمہ، (۴) عابدہ آل علی، (۵) شریکۃ الحسینؑ اور مشہور کنیت اُم کلثوم ہے۔

تعلیم وتربیت

اس بی بی کی تعلیم وتربیت اور خاندانی عظمت وجلالت کا اندازہ کیوں کر لگایا جاسکتا ہے۔ جس کے نانا جناب رسولؐ خدا اور بابا علی مرتضیٰؑ، والدہ ماجدہ فاطمۃ الزہراؑ، ایک بھائی حسن مجتبیٰؑ اور دوسرے حسینؑ سید الشہداء ہوں اور انہی بزرگواروں کی آغوش تربیت میں نشو ونما پائی ہو اور جسے امام زین العابدینؑ عالمہ غیر معلّمہ اور فہمہ غیر مفہمہ کا جلیل القدر لقب عطا فرمائیں۔ امام کے اس کلام حقیقت ترجمان سے تو یہی واضح وعیاں ہوتا ہے کہ صدیقہ صغریٰ علم لدنی کی مالک تھیں۔

---

[1] زینب الکبریٰ، ص ۲۲ و ۲۳۔ خصائص زینبیہؑ وسیرت جناب زینبؑ، ص ۷ وغیرہ۔ [2] زینب الکبریٰ، ص ۲۱۔

راشد الخیری نے لکھا[1] ہے: ''ایثار و قربانی اور دانشمندی، استقامت و استقلال، صداقت اور جرات تواضع اور مہمان نوازی۔ زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت۔ خلق و کرم۔ سادگی و پاکیزگی ان تمام صفات کا بی بی زینبؑ میں جمع ہو جانا نہ صرف اثر تھا ان کے بزرگوں کے خون کا جو ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا بلکہ فیض تھا۔ اس ماحول اور صحبت کا جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور بچپن اور کنوار پنہ گذارا۔ پھر سونے پر سہاگہ اس محترمہ اور مقدسہ ماں کی تربیت تھی جس نے غیروں تک کو جانور سے انسان۔ پیتل سے سونا اور پتھر سے ہیرا بنا دیا۔ اور جناب زینبؑ کے ارشادات اور خطبات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مختلف علوم یعنی قرآن و تفسیر۔ ادب و علم کلام و بیان پر یہ پوری طرح حاوی تھیں۔ جو نتیجہ تھا جناب امیرؑ کی تعلیم کا اور آپ کے حصول تعلیم کی صلاحیت کا۔[2]

زینبؑ عالیہ کے بچپن کا ایک عجیب واقعہ

سچ ہے: ﴿نہالے کہ نکو است از بہارش پیدا﴾۔ وہ زینبؑ عالیہ جس نے بڑے ہو کر شریکۃ الحسینؑ بننا تھا۔ بعد واقعہ ہائلہ کربلا میں مثالی کارہائے نمایاں انجام دینے تھے۔ ان کا بچپن ہی ان کے مستقبل کے درخشاں و تاباں ہونے کی غمازی کر رہا تھا۔ بعض آثار و اخبار میں موجود ہے کہ بی بی کا بچپن تھا۔ جناب امیرؑ ان کو گود میں لے کر پیار کر رہے تھے اور دل بہلانے کے لئے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ فرمایا: ﴿یا بنیۃ قولی واحد﴾۔ بیٹی کہو: ''ایک''۔ بی بی نے کہا: ﴿واحد﴾۔ پھر فرمایا: بیٹی کہو: ﴿اثنین﴾ ''دو'' بی بی خاموش ہو گئیں، فرمایا: ﴿تکلمی یا قرۃ عینی﴾ ''میری آنکھ کی ٹھنڈک بیٹی بولو۔ بی بی نے عرض کیا: ﴿یا ابتاہ ما اطیق ان اقول اثنین بلسان اجریۃ بالواحد﴾۔ بابا جان! مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ جس زبان سے ایک بار ایک کہہ دیا۔ اسی زبان سے اب دو کہوں۔ بی بی کا یہ شگفتہ اور موحدانہ جواب سن کر جناب امیرؑ خاموش ہو گئے اور بی بی کو سینہ سے لگا لیا اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔[3]

شکل و شمائل

اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قد بلند و بالا۔ چہرہ نورانی تھا اور وقار و سکینہ میں مثل اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰؑ کے تھیں۔ عصمت و حیا میں مثل فاطمۃ الزہراؑ۔ فصاحت و بلاغت اور طرز تکلم میں مثل علی المرتضیٰؑ کے۔ علم و بردباری میں مثل حسن مجتبیٰ کے۔ شجاعت و اطمینان قلب میں مثل حسینؑ سید الشہداء کے تھیں۔ صاحب خصائص زینبیہؑ

1۔ سیدہ کی بیٹی۔

2۔ سیرت جناب زینبؑ، ص ۲۰۔

3۔ کتاب زینب الکبریٰ للشیخ جعفر النقدی النجفی، ص ۳۶، ۳۷۔

لکھتے ہیں کہ آپ کشیدہ قامت تھیں۔ چہرہ انور سے رعب حیدری اور جلالت نبوی آشکار تھے۔ اعضاء متناسبہ آپ کی بزرگی و مہابت پر دال تھے۔ آپ فضائل صوریہ و معنویہ کی مجموعہ تھیں۔[۱]

جناب زینبؑ عالیہ کی تزویج

اگرچہ صحیح تاریخ اور ماہ و سال کا تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا۔ مگر اس قدر اجمالاً معلوم ہے کہ جب بی بی عالم سن بلوغ کو پہنچیں تو حضرت امیرؑ نے ان کا عقد نکاح آپ کے چچازاد بھائی جناب عبداللہ بن جعفر طیارؓ سے کر دیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کی طرح آپ کی رسم نکاح بھی بڑی سادگی کے ساتھ ادا کی گئی۔ مسجد میں خود جناب امیرؑ نے نکاح پڑھایا اور خاندان کی عورتوں نے دلہن کو حضرت عبداللہ کے گھر پہنچایا۔ اور دوسرے روز حضرت عبداللہ نے دعوت ولیمہ کی۔[۲] جناب بی بی عالم کو جہیز کیا دیا گیا؟ اس کی تفصیل بھی کتب سیر و تواریخ سے دستیاب نہیں ہو سکی۔ ظن غالب یہی ہے کہ اس سلسلہ میں بھی جناب امیرؑ نے حضرت رسولؐ خدا کی تاسی کی ہوگی۔ واللعلم عند اللہ۔

جناب زینبؑ عالیہ کی طرز بود و ماند اور امور خانہ داری

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ بی بی عالم امور خانہ داری میں مہارت تامہ رکھتی تھی۔ جہاں رہیں گھر کو نمونہ جنت بنا دیا۔ شادی سے قبل والد کے گھر میں تھیں تو تمام گھر کا نظم و نسق آپ کے ہی متعلق تھا۔ اور شوہر کے گھر گئیں تو اُسے حسن انتظام سے رشک جنت بنا دیا۔ راشد الخیری نے لکھا ہے ان کی سلیقہ شعاری میں یہ عادت بھی شامل تھی کہ وہ فضول اور بے کار کوئی چیز گھر میں نہ رکھتی تھیں، کھانا ضرورت کے مطابق تیار کرتیں اور وقت پر تیار کرتیں۔ جب تمام مرد اور بچے یا مہمان کھانے سے فارغ ہو جاتے تب کھاتیں اور جو بچ جاتا اٹھا کر نہ رکھتیں۔ بلکہ کسی بھوکے کو کھلا دیتیں۔ کفایت و نظم ان کے تمام کاموں میں جلوہ گر ہوتا۔ ضرورت سے زیادہ کوئی چیز خرچ نہ کرتیں۔ ان کی خانہ داری میں غریبوں، بے کسوں اور یتیموں کی مدد بھی شامل تھی جن کی امداد میں ہمیشہ بلند حوصلگی سے کام لیتیں۔ اپنی محترم ماں کی طرح انہیں بھی اچھے کھانوں کا شوق نہ تھا۔ جو کچھ میسر آتا اس پر صبر و شکر کرتیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفر کے یہ الفاظ زینبؑ بہترین گھر والی ہے۔ بتا رہے ہیں کہ سیدہ کی بیٹی خانہ داری میں کس قدر ماہر تھیں۔[۳]

بی بی عالم کے شرم و حیا کا ایک واقعہ

یحییٰ مازنی کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ میں جناب امیرؑ کے اس گھر کے جوار میں ایک مدت مدید تک رہا ہوں جس میں جناب زینبؑ عالیہ رہتی تھیں۔ خدا کی قسم اس پوری مدت میں (ما رایت لها شخصا و لا سمعت لها

۱۔ سیرت جناب زینبؑ، مطبوعہ دکن، ص ۱۸۔
۲۔ سیرت مذکورہ، ص ۲۶۔
۳۔ سیدہ کی بیٹی۔

صوتا ہے۔ نہ میں نے کبھی ان کا قد وقامت دیکھا اور نہ ہی کبھی ان کی آواز سنی۔[1]

بی بی کی جلالت قدر کی انتہا

بی بی عالم کی عظمت وجلالت کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جو بعض اخبار سے واضح وآشکار ہوتا ہے کہ جب بی بی عالم اپنے بھائی امام حسینؑ کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتیں تو امام عالی مقام ان کا اٹھ کر استقبال فرماتے اور اپنی جگہ پر ان کو بٹھاتے تھے۔[2]

جناب زینبؑ کا زہد وتقویٰ

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جاچکا ہے آپ کے کثیر التعداد اور جلیل القدر القاب میں سے ایک لقب۔ زاہدہ بھی ہے آپ نے زہد وتقویٰ اپنے والدین شریفین سے وراثت میں پایا تھا۔ آپ کے زاہد وتقویٰ کے متعلق راشد الخیری لکھتے ہیں کہ زینب کبریٰ کا زہد واتقا اس درجہ کا بلند تھا کہ بہت کم عورتوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ دنیا کی زینتوں، دنیا کی لذتوں، دنیا کے ساز وسامان سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ دنیاوی خوشحالی۔ دنیاوی عشرت اور دنیاوی راحت پر وہ ہمیشہ ابدی راحت کو ترجیح دیتی تھیں۔ ان کا قول تھا کہ دنیا کی زندگی بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مسافر چند لمحوں کیلئے تکان دور کرنے کے واسطے آسائش کی جگہ ٹھہر جائے۔ بی بی زینبؑ کا تقویٰ اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ کسی مشتبہ چیز کو احتیاط کی بنا پر استعمال نہیں کیا۔ خدا کی رضامندی کے حصول میں کوشاں رہیں۔ اور خدا کے بندوں کی دل آزاری کی کبھی روادار نہ ہوئیں۔[3]

جناب صدیقہ صغریٰؑ کی عبادت واطاعت

جناب صدیقہ صغریٰ کی عبادت واطاعت کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کو عابدہ آل علی کے جلیل القدر لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بی بی عالم کا مقام عبادت اس قدر بلند ہے کہ امام حسینؑ نے وصیت فرمائی تھی کہ ﴿یا اختاہ زینب. لا تنسینی فی نافلة اللیل[4]﴾۔ بہن زینب! مجھے نماز تہجد میں فراموش نہ کرنا اللہ اللہ جس مخدرہ سے امامؑ نماز شب میں دعائے خیر کرنے کی درخواست کریں۔ اس مخدرہ کی عبادت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ بی بی عالم کو عبادت خدا بجا لانے کا کس قدر شوق وذوق تھا اس کا کچھ اندازہ امام زین العابدینؑ کے اس بیان حقیقت ترجمان سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو انہوں نے جناب بی بی عالم کی عبادت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے، فرماتے ہیں: ﴿ان عمتی زینبؑ مع تلک المصائب و المحن النازلة بها فی طریقنا الی الشام ما ترکت نوافلها اللیلة[5]﴾

---

1. کتاب زینب الکبریٰ، ص ۲۸، طبع النجف۔
2. کتاب مذکور، ص ۲۹۔
3. سیدہ کی بیٹی۔
4. کتاب زینب الکبریٰ للشیخ جعفر النقدی، ص ۸۲۔
5. حوالہ مذکورہ بالا۔

باوجود ان مصائب وشدائد کے جو شام کے سفر میں ہمیں درپیش آئے۔ میری پھوپھی جناب زینبؑ نے پھر بھی نماز تہجد ترک کبھی نہیں کی۔

جناب زینب عالیہؑ کا ایمان باللہ وتوکل علی اللہ

ویسے تو بی بی عالم کی تمام زندگی اور اس کا ایک ایک لمحہ ان کے ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے مگر اس کا سب سے عمدہ عملی مظاہرہ اس وقت ہوا۔ جب شہادت حسینؑ کے بعد مخدرات عصمت وطہارت کو اسیر کر کے وہاں سے گذارا گیا۔ جہاں سید الشہدا کی نعش مطہر مع اعزا وانصار کی لاشہائے مقدسہ کے بے گور وکفن تپتی ہوئی ریت پر خاک وخون میں غلطاں پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت اگر کوئی رستم زماں بھی ہوتا۔ تو یہ جانگداز منظر دیکھ کر اُس کا زہرہ آب ہو جاتا۔ مگر امام الصابرینؑ کی بہنؑ نے پورے صبر وثبات اور یقین واعتماد کے ساتھ بارگاہ قدرت میں دست دعا بلند کر کے یوں عرض کیا: ﴿الٰهی تقبل منا هذا القربان﴾ بارالہا! اپنے دین کے تحفظ کے سلسلہ میں ہماری یہ قربانی قبول فرما۔[1] بی بی عالم کا یہ قول وفعل آپؑ کے معرفت الٰہی اور توکل علی اللہ کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کی بین دلیل ہے۔ ایسی جانگسل مصیبت کے وقت تسلیم ورضا کے یہ کلمے جلیلہ کبریٰ ہی فرما سکتی تھیں۔

جناب زینبؑ کی امام حسینؑ سے محبت واُلفت

جناب زینبؑ عالیہ کو بچپن سے ہی اپنے بھائی حسینؑ سے جو بے پناہ محبت تھی۔ اور آخر دم تک رہی۔ اس کی مثال اس عالم رنگ وبو اور دُنیائے نفسا نفسی میں بہت کم ملے گی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آپؑ کی امام حسینؑ سے محبت والفت کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جب آپؑ نماز کا قصد فرماتیں۔ تو پہلے حضرت سید الشہدا کے روئے اقدس کو دیکھ لیا کرتی تھیں۔ یہی دلی محبت تھی جس نے آپؑ کو مجبور کیا۔ کہ گھر بار، آل اولاد، امن و راحت کو خیر باد کہیں اور اپنے عزیز بھائی کے ساتھ سفر پر خطر اختیار کریں۔ روز عاشوراء اور بعد شہادت حسین قید و دربدری، صحرا نوردی کے وہ شدید مصائب برداشت کریں۔ جو اگر پہاڑوں پر پڑتے تو ریزہ ریزہ ہو جاتے اور پھر ان بلاؤں ومصیبتوں کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کریں۔ بقول صاحب طراز المذہب کسی نبی یا ولی کی ذریت سے کسی بھی بی بی پر ایسے مظالم ومصائب نہیں وارد ہوئے جو جناب زینب پر گذرے۔ اور نہ کسی بی بی نے ایسے شدید مصائب واقع ہوتے پر اس طرح صبر وشکر اور حلم کا مظاہرہ کیا جو آپ نے کیا۔[2]

---

[1] مقتل الحسین، ص ۳۶۷۔

[2] سیرت جناب زینبؑ، ص ۲۲۔

واقعہ کربلا میں شریکۃ الحسینؑ کا حصہ

شہادت امامؑ کے بعد بعض ایسے جگر خراش اور دلدوز واقعات در پیش آئے کہ امام زین العابدینؑ ایسے بزرگوار کے ہاتھوں سے زمام صبر و شکیبائی چھوٹنے لگی۔ مگر اس مجسمہ صبر و ثبات بی بی نے امامؑ کو تسلی اور دلاسا دیا۔ اُن تمام واقعات کی تفصیل سابقاً گذر چکی ہے۔ بہر حال یہ بات اہل انصاف کے نزدیک مسلم الثبوت ہے کہ واقعہ کربلا کی تصویر میں رنگ عقیلہ بنی ہاشمؑ جناب زینب عالیہؑ نے بھرا ہے۔ اور اس پیکر میں روح حیات جاودانی بنت علیؑ کے بازار و دربار کوفہ و شام میں عدیم النظیر خطبات نے ڈالی ہے۔ اور خواب غفلت میں سوئی ہوئی دنیا کو اس خواب گراں سے بی بی عالم کی اسیری نے بیدار کیا ہے۔ اور مظلوم کربلا کی مظلومیت وحقانیت کا یگانوں اور بیگانوں سے اقرار بنت زہراؑ نے کرایا ہے اور امام کی شہادت کو چار چاند اسی نواسی رسولؐ نے لگائے ہیں۔ حد ہوگئی کہ یزید ایسے ظالم کے دار الحکومت دمشق میں مظلوم بھائی کی پہلی مجلس عزا اور ماتم برپا کرنا بھی آپ کا ہی زریں کارنامہ ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں بلاخوف رد کہا جاسکتا ہے۔ کہ آپؑ صحیح معنوں میں شریکۃ الحسینؑ ہیں۔

وفات حسرت آیات اور مدفن شریف

جناب زینب عالیہؑ کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ہاں اس قدر مسلم ہے کہ رہائی کے بعد جناب بہت تھوڑا عرصہ زندہ رہیں۔ اور بھائی اور دیگر اعزہ کے غم میں گھل گھل کر بہت جلد دار فانی سے دار جاودانی کی طرف انتقال کر گئیں۔ صاحب زینب کبریٰ[1] نے معتبر حوالہ جات سے آپؑ کی تاریخ وفات پندرہ رجب المرجب ۶۲ھ ثابت کی ہے۔ ہمیں بھی ان کی تحقیق سے اتفاق ہے۔

اسی طرح ان کے مدفن اور کیفیت وفات میں بھی شدید اختلاف ہے۔ مشہور شام ہی ہے مگر کئی ایک محققین کے نزدیک ان کا مدفن مدینہ میں ہے۔ اور متعدد ارباب سیر و تواریخ کا رجحان مصر کی طرف ہے۔ یہاں اس اختلاف کی تنقیح واحقاق ما ھو الحق کی گنجائش نہیں ہے البتہ یہاں صرف اس قدر اشارہ کیا جاتا ہے کہ تاریخی شواہد وقرائن کی بنا پر ہمارا میلان و رجحان سب سے زیادہ مصر اور اس کے بعد مدینہ والے قول کی طرف ہے۔ اگر خداوند عالم توفیق عطا فرمائے تو ہر سہ مقامات مقدسہ پر اس محسنہ اسلام کی زیارت کا شرف حاصل کرنا چاہیے۔ واللہ الموفق

---

[1] زینب کبریٰ ص ۱۶۵ طبع النجف الاشرف۔

(۴) جناب اُم کلثوم بنت امیر المومنینؑ

یہ معظمہ پیغمبرؐ اسلام کی چھوٹی نواسی اور علیؑ و بتولؑ کی منجھلی صاحبزادی ہیں۔ ان کا نام نامی واسم گرامی بھی زینب ہے اور کنیت ام کلثوم[۱] مگر کنیت نام سے زیادہ مشہور ہے آپ کی تزویج پہلے اپنے عم زاد جناب عون بن جعفر طیارؓ کے ساتھ ہوئی اور ان کی وفات کے بعد جناب محمد بن جعفر طیارؓ کے ساتھ ہوئی۔[۲] صحیح تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں۔ اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ حیات رسولؐ کے آخری ایام میں آپ کی ولادت ہوئی اور شہادت امام کے تھوڑا عرصہ بعد وفات پائی۔

مسلمانوں کے خلیفہ ثانی کے ساتھ ان کے ازدواج کا افسانہ بالکل بے اصل و بے حقیقت ہے۔ جو قوانین روایت و روایت اور آئین عقل و نقل کے سراسر خلاف ہے۔ ہم نے اپنی کتاب ''تنزیہ الامامیہ وتجلیات صداقت'' میں اس موضوع پر مفصل بحث کر کے اس قصہ کو بے اصل ثابت کیا ہے قارئین کرام کتاب مذکور نیز اس موضوع پر مستقل تالیف شدہ کتب و رسائل مثل السر المختوم، کنز مکتوم در حل عقد ام کلثوم اور شرح کنز مکتوم وغیرہ کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہاں اس موضوع پر گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے ہاں یہاں صرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کہ جس ام کلثوم کی تزویج کا افسانہ خلیفہ ثانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی وفات بالا تفاق بعہد معاویہ بیان کی جاتی ہے۔ مگر ام کلثوم بنت علیؑ و بتولؑ کے واقعہ کربلا میں اور اس کے بعد اسیران اہل بیتؑ کے ہمراہ موجود ہونے پر تمام ارباب سیر و تواریخ اور اصحاب مقاتل کا اجماع و اتفاق ہے۔

جناب اُم کلثوم نے اپنی بڑی بہن جناب زینبؑ عالیہ کے دوش بدوش بازار کوفہ وغیرہ میں جو پرجوش اور ولولہ انگیز خطبے پڑھے وہ سابقہ ابواب میں درج کئے جاچکے ہیں۔ یہی زینبؑ و اُم کلثوم کے عدیم النظیر خطبات تھے جنہوں نے یزید کی حکومت کے ارکان کو متزلزل کر دیا تھا۔''

(۵) جناب رقیہ کبریٰ بنت امیر المومنینؑ

یہ مخدرہ جناب امیرؑ کی زوجہ محترمہ اُم حبیب دختر ربیعہ کے بطن سے تھیں۔ یہ اپنے بھائی عمر بن علی کے ساتھ توام متولد ہوئیں۔[۳] ان کا ازدواج اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیل کے ساتھ ہوا۔ سفر کربلا میں اپنے بھائی امام حسینؑ کے ہمراہ تھیں۔ اور روز عاشوراء اپنا ایک لخت جگر عبداللہ بن مسلم بن عقیل قربان گاہ

۱۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۱۸۶، مگر صاحب منتخب التواریخ، (ص ۹۳) نے ان کا نام گرامی رقیہ کبریٰ لکھا ہے۔

۲۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۱۸۶۔

۳۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۱۸۷ وغیرہ۔

کربلا میں اپنے بھائی پر قربان کیا۔[1] اور بعد از شہادت امام مصیبت اسیری و در بدر گردی و صحرا نوردی میں اپنی دونوں بڑی بہنوں اور بھتیجوں کے ہمراہ شریک رہیں۔[2] اور رہائی کے بعد واپس مدینہ منورہ تشریف لائیں۔ تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔

(۶) جناب فاطمہ بنت الحسینؑ

یہ معظمہ جناب سید الشہداءؑ کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ اُم اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ التیمیہ ہیں۔ اس مخدرہ کو تقویٰ و کمال و فضائل و جمال کی وجہ سے حور العین کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی۔[3] امام حسینؑ نے اپنے برادر زادہ جناب شہزادہ حسن مثنیٰ فرزند امام حسنؑ کے ساتھ ان کی تزویج کی وارد ہے کہ جب شہزادہ نے امامؑ سے رشتہ کی خواستگاری کی تو امامؑ نے فرمایا میری دو صاحبزادیوں میں سے جس سے چاہو تمہارا عقد کر دیا جائے۔ جناب حسن نے بوجہ شرم و حیا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ پھر امامؑ نے خود ہی فرمایا: میں تمہارے لئے اپنی بڑی صاحبزادی فاطمہ کو منتخب کرتا ہوں کیونکہ یہ میری والدہ ماجدہ فاطمہ زہراؑ سے زیادہ شباہت رکھتی ہیں۔[4]

جناب حسن مثنیٰ سے آپ کی تین اولادیں ہوئیں۔ (۱) عبداللہ المحض۔ (۲) ابراہیم الغمر و۔ (۳) حسن مثلث۔[5] اس معظمہ کو بیوگی کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ چنانچہ ۳۵ سال کی عمر میں جناب حسن مثنیٰ کا انتقال ہو گیا۔ پورا ایک سال اپنے شوہر گرامی کی قبر پر خیمہ نصب کر کے سوگ میں بیٹھی رہیں۔ اور کیفیت یہ تھی کہ دن کو روزہ رکھتیں۔ اور رات بھر عبادت خدا میں بیدار رہتیں۔ سال کے بعد گھر تشریف لائیں۔ جب خیمہ اُٹھا کر گھر آنے لگیں۔ تو ایک ہاتف غیبی کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا: ﴿هل وجدوا ما فقدوا﴾۔ دوسرے نے جواب میں کہا: ﴿بل يئسوا فانقلبوا[6]﴾۔

اس محترمہ کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ امام حسینؑ نے آخری وقت ظاہری وصیت نامہ انہی

---

[1] منتخب التواریخ، ص ۱۲۳۔

[2] منتخب طریحی، ص ۲۲۲۔ منتخب التواریخ، ص ۲۹۶۔

[3] ناسخ التواریخ، ج ۶، ص ۳۹۹۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۲۶۳۔

[4] ارشاد، ص ۲۰۹ وغیرہ۔

[5] منتخب التواریخ، ص ۳۶۔

[6] ارشاد، ص ۲۰۶۔ منتخب، ص ۲۳۹۔

کے سپرد کیا تھا۔ جو انہوں نے امام زین العابدینؑ کی صحت کے بعد ان کے حوالہ کیا تھا۔[1] جناب سید الشہداء کی روانگی از مدینہ کے مقام پر تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ کہ یہ معظمہ سفر کربلا میں امامؑ کے ہمراہ تھیں۔ اور بعد از شہادت اسیری کے صدمے بھی سہے۔ رہائی کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہیں۔ بالآخر ۶۱ھ کو مدینہ میں دار فانی سے دار جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔[2]

(۷) جناب سکینہ بنت الحسینؑ

یہ معظمہ حضرت سید الشہداء کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ ان کی اور شہزادہ علی اصغرؑ کی والدہ گرامی کا نام نامی جناب رباب بنت امرء القیس ہے۔ آپ کا اصل نام آمنہ یا امیمہ تھا۔ مگر جناب رباب نے سکینہ لقب تجویز کیا۔ جو نام پر بھی غالب آ گیا۔[3] آپ بالاتفاق واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔ شہادت امام کے بعد اسیری کے مصائب و شدائد بھی برداشت کیے رہائی کے بعد مدینہ گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعہ کربلا کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہیں۔ اور بنا بر مشہور عند المورخین ۵ ربیع الاول ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔[4] مگر ان کی واقعہ کربلا کے بعد والی زندگی کے واقعات و حالات مستند طریقہ سے مروی نہیں ہیں۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان بے سر و پا واقعات کے ایجاد و اختراع میں سیاست اموی کارفرما نظر آتی ہے۔ حقیقت حال سے آنکھیں بند کر کے ہمارے بھی بعض اہل علم نے ان واقعات کو اپنی کتب میں درج کر دیا جو کہ اصول روایت و درایت کے پیش نظر بالکل ناقابل اعتبار ہیں۔ یہاں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اہل تحقیق کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعہ کی تحقیق کرتے وقت اس کے مثبت پہلو کو سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں نہ کہ منفی پہلو کو یہاں بھی اسی طریق کو اپنانا چاہیے کہ جناب سکینہ کو زندہ موجود تسلیم کرنے کے باوجود ان واقعات پر جرح و تنقید کر کے ان کو بے اصل ثابت کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ سرے سے ان کے زندہ ہونے کا ہی انکار کر دیا جائے۔ اگرچہ اس انکار کی گراں قیمت تمام ارباب سیر و تواریخ کے بیان کی تکذیب کی صورت میں ہی کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ ہم قبل ازیں تفصیلاً بتا چکے ہیں کہ زندان شام میں ان کی وفات کا واقعہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اس موضوع پر رسالہ "حضرت سکینہ"، مصنفہ: مولانا سید علی حیدر صاحب کھجویؒ قابل

---

[1] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۶۳۔ منتخب التواریخ، ص ۳۳۰۔ ناسخ، ج ۶، ص ۳۴۹ وغیرہ۔

[2] اصول کافی۔

[3] منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۶۳۔

[4] منتخب التواریخ، ص ۳۳۱۔ منتہی الآمال، ج ۱، ص ۳۶۳۔ ناسخ التواریخ، ص ۵۰۳۔ تمام؟؟، ص ۵۲۵ وغیرہا۔

دید ہے۔ ہم اپنے قارئین کرام سے اُس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

(۸) جنابِ رُباب بنت امرء القیس الکلبیہ سلام اللہ علیہا

یہ مخدرہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے شہزادہ علی اصغرؑ اور جناب سکینہؑ کی والدہ ماجدہ ہیں۔ جناب ربابؑ کے والد جناب امرء القیس کلبی عرب کے اشراف و اکابر خانوادہ سے تھے [۱] اور خود جناب رباب بہترین زنانِ عرب سے تھیں جیسا کہ صاحب تنقام نے ہشام کلبی (نسابہ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ﴿کانت الرباب من خیار النساء﴾ [۲] ان کی انہی خصوصیات کی وجہ سے سرکار سید الشہداؑ ان کو بہت چاہتے تھے۔ اور ان سے خاص تعلق خاطر تھا سبط ابن جوزی وغیرہ نے ان اشعار کی نسبت آنجناب کی طرف دی ہے۔ جس سے مذکورہ بالا بیان کی تائید مزید ہوتی ہے ؎

لعمرک اننی لاحب داراً	تکون بھا سکینة و الرباب
احبّھما ابذل جلّ مالی	و لیس لعاتب عندی عتاب
و لست لھم و ان عابوا مطیعاً	حیٰوتی او یغیّبنی التراب [۳]

آپ میدان کربلا میں موجود تھیں۔ پھر اسیری کے مصائب و آلام جھیلنے کے بعد واپس مدینہ تشریف لائیں اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ رہائی کے بعد بڑے بڑے اکابرین قریش نے آپ کی خواستگاری کی مگر آپ نے یہ فرما کر سب کی خواستگاری مسترد کر دی کہ ﴿ما کنت لا تخذ بعد رسول اللّٰہ حموا ً﴾۔ میں جناب رسولؐ خدا کے بعد اب کسی اور کو اپنا خسر بنانا گوارا نہیں کر سکتی۔ [۴] اسی وفادار معظمہ کے متعلق مشہور ہے کہ جب جناب سید الشہداؑ کی نعش اقدس کو بے گور و کفن خاک و خون میں غلطاں دھوپ میں پڑا ہوا دیکھا تو عہد کیا تھا۔ کہ زندگی بھر سایہ میں نہیں بیٹھیں گی۔ چنانچہ اس عہد کو پورا کیا۔ جب تک زندہ رہیں سایہ میں نہ بیٹھیں حتیٰ کہ اسی حزن و غم اور رنج و ملال میں گھل گھل کر ایک سال کے بعد دنیا سے رحلت کر گئیں۔ [۵] یہ بھی منقول ہے کہ "رہائی کے بعد آپ نے مدینہ جانے سے انکار کر دیا۔ اور ایک سال تک قبر حسینؑ پر خیمہ لگا کر مجاور

---

[۱] منتخب التواریخ، ص ۲۷۔

[۲] تنقام، ص ۵۶۰۔

[۳] تذکرۃ الخواص، ص ۲۶۵ وغیرہ۔

[۴] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۰۰ وغیرہ۔

[۵] منتخب التواریخ، ص ۲۳۸۔ کامل، ج ۳، ص ۳۰۰۔ تذکرہ، ص ۲۶۵۔

کی حیثیت سے مقیم رہیں جس میں شب و روز گریہ و بکا اور نوحہ و ماتم میں مصروف رہیں۔[1]

تبصرہ

قبل ازیں واقعات بعد شہادت کے ضمن میں بالتفصیل ثابت کیا جا چکا ہے کہ جناب بی بی شہر بانو سلام اللہ علیہا واقعہ کربلا میں قطعاً موجود نہ تھیں بلکہ ولادت امام زین العابدینؑ کے چند روز بعد ایام زچگی میں ہی دُنیا سے رحلت فرما گئی تھیں۔ اسی طرح شہادت جناب شہزادہ علی اکبرؑ کے بیان میں یہ امر بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ آپ کی والدہ جناب اُم لیلیٰ بھی واقعہ کربلا میں موجود نہ تھیں۔ مزید برآں یہاں فاضل بیر جندی کی تصریح بھی پیش کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

﴿و بودن ام لیلی مادر علی اکبر در کربلا در هیچ کتاب معتبرے ذکر نه شده و اعتبارے نیست بکلام مهیّج که مادر و خواهران بر نعش او آمدند..... و الا چرا در هیچ مقامے از وقائع کربلا و شام و کوفه ازان مخدورۃ ذکرے نیست﴾۔[2]

فتدبر و تشکر، ولا تغفل ولا تکن من الجاحدین۔

---

[1] شہید انسانیت، ص ۵۶۳ بحوالہ اصابہ مصر، ج ا، ص ۱۱۳۔

[2] کبریت احمر، ص ۱۸۷۔

انتیسواں باب

واقعہ کربلا کے اخلاقی وافادی نتائج وآثار

بعض سابقہ بیانات میں سے یہ حقیقت بیان کی جا چکی ہے۔ کہ کسی بھی واقعہ کی حقیقی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس کے اغراض ومقاصد اور اس کے نتائج وآثار کی بلندی یا پستی سے لگایا جاسکتا ہے بنابریں دیکھنا چاہیے کہ کربلا کے واقعہ ہائلہ سے عالم انسانیت کو کیا کیا اخلاقی وروحانی درس ہائے رشد وہدایت حاصل ہوئے۔ اور اس سانحہ عظمیٰ سے کیا فوائد وعوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اور اس سانحہ کبریٰ پر کیا کیا نتائج وآثار مترتب ہوئے ہیں۔ دنیا کا ہر واقع نتیجہ خیز اور ہر سانحہ سبق آموز ہوتا ہے۔ تو کیا کربلا کا خونچکاں، دل فگار اور عظیم الشان واقعہ ہائلہ ہمارے سامنے کوئی درس عمل پیش نہیں کرتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ عظیم الشان واقعہ عبرت ونصیحت اور رشد وہدایت کے ہزار ہا خونین اوراق پیش کرتا ہے بلکہ روحانی واخلاقی اقدار کا بحر بے کنار نظر آتا ہے۔ یہ مطلب اس وقت اور بھی زیادہ واضح وآشکار ہوجاتا ہے۔ جب یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ہائلہ جس ذات جامع الصفات سے وابستہ ہے وہ الہ العالمین کے آخری رسولؐ جو رحمۃ للعالمین کے جلیل القدر لقب سے ملقب ہیں) کے عظیم نواسے سید الکونین حضرت امام حسینؑ ہیں جس کے بعد یہ حقیقت بالکل اُجاگر ہوجاتی ہے کہ جس طرح خداوند عالم کی خدائی کسی خاص قوم وملت کے ساتھ مختص نہیں۔ اور نہ اس کے آخری عظیم المرتبت رسول کی رسالت ونبوت کسی خاص قوم وقبیلہ اور مذہب وملت کے حدود کے ساتھ محدود ہے اسی طرح آنحضرتؐ کی مسند کے صحیح وارث تیسرے لعل ولایت کی اس شہادت عظمیٰ کے فیوض و برکات کو بھی کسی خاص قوم وملت تک محدود کرنا سوائے کوتاہ اندیشی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے فیوض وبرکات پورے عوالم امکانیہ کے حدود کو چھو رہے ہیں۔ اور نہیں تو کم از کم تمام عالم انسانیت تو یقیناً ان سے بہرہ مند ہو رہا ہے۔ اب رہی ان روحانی واخلاقی فوائد وعوائد اور عمومی فیوض وبرکات کی تفصیل! تو اگرچہ اس کتاب کے اوراق اس کے متحمل نہیں ہیں۔ کیونکہ ؎ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

تاہم بموجب ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ بعض تفصیلات ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں۔ نیز مخفی نہ رہے کہ ہر اس موضوع پر کتاب مستطاب شہید انسانیت اور ''مجاہد اعظم'' جلد اول میں اس قدر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا جاچکا ہے کہ اس سے زیادہ اس پر خامہ فرسائی کی بہت ہی کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ہم اس سلسلہ میں جو کچھ پیش کر رہے ہیں اس میں وہ زیادہ تر اسی گلشن کی شاداب روشوں سے گل چینی کی گئی ہے۔ اب ہم ذیل میں ان

اخلاقی نتائج وآثار اور روحانی درس واقدار کی چند جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

(۱) روحانیت و مادیت کا تصادم اور روحانیت کا غلبہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں مذہبی نقوش روز بروز دھندلے ہوتے جارہے ہیں۔ اور دنیا بڑی سرعت کے ساتھ خدا پرستی کو چھوڑ زر، زن، زمین اور خود پرستی کی طرف مائل ہورہی ہے۔ مذہب جو روحانیت کا علمبردار ہے وہ دین و دنیا میں حسین امتزاج اور حد اعتدال قائم کرنے کا داعی ہے۔ مگر مادی قوتیں اس کے مقرر کردہ حدود کو توڑنے پر تلی ہوئی ہیں۔ درحقیقت مادیت و روحانیت کی یہ کش مکش کوئی تازہ حادثہ نہیں۔ بلکہ ابتدائے آفرینش سے برابر جاری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

مگر یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اس باہمی آویزش میں ممکن ہے بظاہر حالات چند دنوں کے لیے مادیت نے حق پر غلبہ حاصل کرلیا ہو۔ مگر حقیقت بین نگاہوں سے یہ حقیقت ہرگز پوشیدہ نہیں کہ نتائج و آثار اور مقصد جنگ کے اعتبار سے ہمیشہ روحانیت غالب رہی ہے۔ اور مذہب نے ہمیشہ اپنی طاقت کا لوہا منوایا ہے۔ معرکہ کربلا بھی اسی مادی و روحانی دائمی کش مکش کی ہی ایک اہم کڑی تھی۔ ایک طرف وہ تمام مادی اسباب و وسائل جمع تھے۔ جو ایک انسان کو مرغوب و مغلوب کرنے کے لیے کافی و وافی تھے اور دوسری طرف ان حقیقتوں یعنی مذہبی و روحانی اقدار کا حامل امام حسینؑ تھے۔ جو مادی مظاہر سے تہی دامن تھے۔ مادی طاقتیں اس پیکر حریت، غیبی طاقتوں پر ایمان رکھنے والے عظیم الشان انسان کی گردن کو یزید کے سامنے جھکانے پر تلی ہوئی تھیں مگر دنیا نے یہ ایمان افزا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کہ روحانیت کے اس علمبردار نے آخر وقت تک انکار بیعت پر قائم رہ کر اپنی گردن کٹوا دی۔ اور نتیجہ کے اعتبار سے روحانیت کی فتح و نصرت کا عالم پر سکہ بیٹھا دیا۔ مگر مادی طاقتیں اس گردن کو باطل کے سامنے جھکا نہ سکیں۔

سر داد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

امامؑ کے اس کارنامہ میں اقوام و افراد کے لیے یہ پیغام مضمر ہے۔ کہ انسان اگر حق و حقیقت پر ہو تو اسے ہرگز باطل کی مادی اور طاغوتی طاقتوں کے سامنے سپر انداز نہیں ہونا چاہیئے بلکہ حق و راستی پر قائم رہنے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

(۲) شہادت حسینؑ صداقت اسلام کی ناقابل انکار دلیل ہے

یہ حقیقت کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں ہے کہ یزید کی تخت نشینی جسد اسلام کے لیے زہر ہلاہل سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ وہ گو بظاہر اسلام کا کلمہ پڑھتا تھا۔ مگر اس کے افعال و اقوال اس بات کے گواہ تھے۔ کہ اس نے

اسلام کا جوا گردن سے اتارا ہوا ہے۔ اس کے تمام حرکات وسکنات شرع اسلامی کے خلاف تھے۔ اور یہ مار آستین اسلام اور مسلمانوں کے لیے کافروں سے بھی زیادہ ضرر رساں اور خطرناک تھا۔ الغرض اسلام کا یہ رنگیلا خلیفہ ان تمام خصائل ورزائل کا مجموعہ تھا۔ جو انسانیت کو حیوانیت سے بھی بدتر بنا دیتی ہیں۔ اس موضوع پر قبل ازیں ایک مستقل باب میں تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ بایں ہمہ فسق وفجور اور کفر وشرک حسینؑ سے اپنی بیعت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اگر حسینؑ اس کی بیعت کر لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ گویا آپؑ اس کو خلیفہ برحق تسلیم کر کے اس کے رندانہ اور کافرانہ افعال واعمال پر مہر جواز ثبت فرما رہے ہیں پھر اس کا نتیجہ یہ کہ فرزند رسولؐ کے مصدقہ خلیفہ کے وہ افعال واحکام جو سراسر خلاف اسلام تھے بلکہ ہادم شریعت تھے سب مستحسن اور واجب العمل ہو جاتے۔ اور نتیجہ یہ نکلتا کہ دین اسلام مٹ جاتا اور پھر کفر والحاد عود کر آتا۔ حسینؑ سے زیادہ اس بیعت کے تباہ کن نتائج وعواقب کو سمجھنے والا کون تھا وہ کس طرح اپنے اب وجد بلکہ تمام انبیاء ومرسلین کی کوششوں اور محنتوں کو ضائع وبرباد ہوتا گوارا فرما سکتے تھے؟

حالانکہ اگر مادی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو حکومت وقت کا ساتھ دینے میں امامؑ کو ہر قسم کی دولت وصولت اور جاہ ومنصب کے ملنے کا یقین تھا۔ اور مخالفت کرنے میں نہ صرف اپنی جان بلکہ اپنے خانوادہ کی تباہی کا یقین تھا یہی وہ موقع تھا کہ امامؑ نے اپنی جان ومال اور تمام انصار واعزا کو داؤ پر لگا دیا۔ مگر اسلام کی صداقت وحقیقت پر آنچ آنا گوارا نہ کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی بھی مذہب ودین کی صداقت کے منجملہ اور دلائل وبراہین کے ایک بہت بڑا نشان اس کے بانیوں کا اس کی بقا وتحفظ کی خاطر خندہ پیشانی اور پوری جرأت ایمانی کے ساتھ مصائب وشدائد کو برداشت کرنا بھی ہے۔ کسی مذہب کے نام لیواؤں کا مذہب کی خاطر کوئی قربانی پیش کرنا اس کی صداقت کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ اکثر حقیقت حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ باطل کو حق سمجھ کر اس کی حمایت میں جان قربان کر دیں۔ لیکن خود بانی مذہب یا اس کے مخصوص واقف کار اور ان افراد خانوادہ کا جو اس کے اسرار ورموز حیات سے کماحقہ واقف ہیں۔ اور اس کی زندگی کے تمام خفی وجلی گوشوں سے آگاہ ہیں۔ اور مذہب کے حقائق سے من حیث المذہب مطلع ہیں۔ ان کا اس مذہب کے تحفظ کی خاطر بوقت ضرورت جان تک قربان کر دینا یقیناً اس مذہب اور اس کے بانی کی حقانیت وصداقت کی ناقابل انکار دلیل ہے یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ کا غزوات میں یہ طریقہ کار تھا۔ کہ میدان کارزار میں اپنے عزیزوں کو سب سے آگے رکھتے تھے۔ میدان مباہلہ میں بھی قریبی رشتہ داروں کو ہمراہ لے گئے تھے۔ جہاں ابدی ہلاکت کا سوال تھا۔ یہی تو وجہ تھی کہ جب اسقف نجران نے دیکھا کہ ایسے کٹھن مرحلہ پر بجائے غیروں کے اپنوں کو ہمراہ لائے ہیں۔ تو ان کو اپنی حقانیت پر مکمل یقین ہے۔ اس لئے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ مگر مباہلہ کرنے کی جسارت نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل بتلاتا ہے۔ کہ خدا کا دین ان

کو کس قدر عزیز تھا۔ اور اس کی خاطر آپ کیسی عظیم الشان قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اسی طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ آپ کے چچازاد بھائی عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب جنگ بدر میں شہید ہوئے۔ اور جناب کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب جنگ احد میں کام آئے اور دوسرے چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالب موتہ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ آخر میں امام حسین علیہ السلام نے نانا کے مقصد اقصیٰ کے تحفظ کی خاطر وہ عظیم الشان قربانی پیش کی کہ چشم فلک نے اس کی نظیر نہ دیکھی ہوگی۔ حسینؑ نے جس دشوار اور مشکل مہم کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس راستہ میں مصائب و آلام کے وہ پہاڑ موجود تھے۔ جن کا برداشت کرنا تمام انسانی طاقت سے بالا تر تھا۔ اس کے لیے مافوق العادت صبر و استقلال درکار تھا۔ راکب دوش نبوتؐ نے حق و حقیقت اور مذہب کی صداقت کو چار چاند لگانے کی خاطر خندہ پیشانی سے یہ سب کچھ برداشت کر کے اسلام کی صداقت و حقانیت کا دائمی نقش صفحۂ عالم پر ثبت کر دیا۔

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

حسین علیہ السلام کی پیری تھی لیکن ہمت و جرأت کا شباب تھا کثرت مصائب ء سے جس قدر حسینؑ کی کمر جھکتی تھی۔ اسی قدر ہمت و جرأت بلند ہوتی تھی۔ جب تک بدن پر سر اور تن میں روح رہی۔ حسینؑ کے صبر و ثبات اور عزم استقلال میں سرمو فرق نہ آیا۔ پیرانہ سالی، شدت بھوک و پیاس، عورتوں کی نالہ و زاری، بچوں کی فریاد العطش، عزیزوں اور دوستوں کے داغ مفارقت، ان کے جسموں کو اپنی آنکھوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ لیکن پھر بھی اپنی آن، اپنی بات اور اپنی خودداری پر پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہنا صرف نواسۂ رسول حسینؑ ہی کا کام تھا۔ جس نے اپنے اس مثالی کارنامہ سے اسلام کو ایک زندہ جاوید حقیقت بنا دیا۔

بھر حق درخاک و خون غلیطدہ است ❁ پس بنائے لا الہ گردیدہ است

امام علیہ السلام کے اس عظیم الشان کارنامے میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ مذہب و ملت کے تحفظ کی خاطر انسان کو بڑی سے بڑی قربانی بھی پیش کرنے میں ہرگز کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اور ایک مسلمان کا یہ قول و کردار ہونا چاہیے کہ ﴿اِنَّ حَیَاتِیْ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ لہٰذا اسے اگر راہِ خدا میں جان دینا پڑے تو یہ کہہ کر جان آفریں کے حوالے کر دے۔

جان دے دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(۳) حریت فکر کی آبیاری

حریت فکر کا بالعموم بموجب "کلمۂ حق یراد بہا الباطل" یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ انسان بالکل مطلق العنان اور

خلیع العذار ہے نہ وہ کسی مذہب و دین کا تابع ہے اور نہ اسے کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کی ضرورت ہے۔ ارباب عقل و خرد جانتے ہیں۔ کہ اگر حریت فکر کا یہی مطلب لیا جائے تو پھر تو انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جائے گا اس طرح پدر و مادر آزاد ہونے کی کوئی بھی انسانی معاشرہ انسان کو اجازت نہیں دے سکتا۔ بلکہ حریت فکر کا صاف و سادہ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر (جس کا خمیر شریعت کے پانی سے ہوا ہو) کے فیصلوں پر بلا کسی قسم کی روک ٹوک کے عمل کرے۔ اور اس کے فیصلہ پر عمل کرنے میں اپنے لذائذ نفسانیہ یا محرکات شیطانیہ اور بیرونی طاغوتی طاقتیں اس کے لیے سد راہ نہ بن سکیں۔ امامؑ نے مشکلات و مصائب راہ کی ذرہ بھی پروا نہ کرتے ہوئے پورے عزم و ثبات کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر یہ جرأت مندانہ اعلان واجب الاذعان فرما دیا۔ کہ مثلی لا یبایع مثلہ کہ مجھ ایسا پاک باز انسان۔ یزید ایسے ننگ انسانیت آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس انکار کی جو بھی گراں سے گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ خندہ پیشانی کے ساتھ ادا فرمائی۔ اور اس سلسلہ میں بڑی سے بڑی مصیبت بھی جادہ حق و صواب سے آپؑ کے پائے ثبات میں لغزش واقع نہ کر سکی۔ امام ؑ نے حریت نفس و فکر کا یہ لافانی شاہکار پیش کر کے دنیا والوں پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ۔

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست   پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

اس میں یہ درس عمل مخفی ہے کہ صحیح معنوں میں انسان کامل وہ ہے جسے اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل درآمد کرنے سے دنیا کی کوئی مادی طاقت باز نہ رکھ سکے۔

(۴) ثبات و استقلال کی تلقین

جب انسان کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہو۔ اور اس کے آگے دشوار گزار منزلیں سدِ راہ ہوں اور مشکلات راہ مزاحم ہوں۔ مگر وہ انسان کے بڑھتے ہوئے قدم میں لغزش واقع نہ کر سکیں۔ اور وہ برابر اپنے مقصد کے حصول کے لیے رواں دواں رہے۔ یہ چیز ثبات و استقلال کہلاتی ہے۔ تمام عقلائے روزگار کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ کسی مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کلید۔ ثبات و استقلال کے ساتھ جد و جہد کرنا ہے۔ ﴿من طلب شیئاً وجد وجد﴾ جہاں تک گفتار کا تعلق ہے ہر شخص اپنے استقلال مزاج کا دعویٰ کرتا ہے مگر کردار سے ثابت کرنا دشوار ہوتا ہے ظاہر ہے کہ حسینؑ نے اپنے استقلال اور طرز عمل سے اہل عالم کو یہ سبق دیا کہ ایک عظیم مقصد کے حامل راست باز انسان کو اپنے ضمیر کی شہادت پر کس طرح ثابت اور قائم رہنا چاہیے۔ رضا بالقضاء کا عملی نمونہ کیا ہے قوم و مذہب کی خاطر قربانیاں کس رنگ سے دی جاتی ہیں صداقت پرست انسان کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اور ان کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے؟ بعض اوقات بڑی تحریکات کا خیر مقدم نہ کرنے سے کن کن آفات و بلیات میں گرفتار

ہوسکتا ہے؟ اور ان کی مدافعت کے طور وطریقے کیا ہیں؟ حمایت مذہب کا عملی نمونہ کیا ہے امام حسینؑ نے اپنے کردار سے اقوام عالم کو ایسا سبق دیا۔ جس کی نظیر اولین اور آخرین میں نہیں مل سکتی۔ حضرت امام حسینؑ نے جب فرمایا تھا کہ بیعت نہیں کروں گا۔ تو اس وقت اس کا صحیح مفہوم دنیا کو معلوم نہ تھا۔ کیونکہ انسان تخیل کے حدود ان امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں تک واقعات کی رفتار بعد کو پہنچ گئی۔ دنیا نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کہ اس نہیں میں کتنے مشکلات کے مقابلہ کا عزم مضمر ہے۔ لیکن حسینؑ جس وقت ''نہیں'' کی آواز بلند کر رہے تھے تو دل کی گہرائیوں میں اپنی قوت ارادی کا جائزہ لینے اور موقع کی نزاکت پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ شدائد اپنے امکان کی آخری حد کو پہنچ جائیں گے۔ لیکن میرے عزم کو نہ بدل سکیں گے۔ چنانچہ نتیجہ نے ظاہر کر دیا کہ اس ''نہیں'' میں کتنا وزن تھا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب تھے۔ جو آتے تھے اور اس کوہ عزم واستقلال سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے تھے۔ گویا ان تمام مصائب کے ہجوم میں حسینؑ کی زبان پر یہ شعر جاری تھا۔

ؔ ان کان دین محمدؐ لم یستقم الا بقتلی یا سیوف خذینی

اگر میرے نانا کا دین اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا۔ جب تک میری رگ حیات قطع نہ ہو جائے۔ تو اے خون آشام تلوارو! آؤ یہ جسم حاضر ہے''۔ امام کے اس مثالی کارنامہ میں یہ سبق مضمر ہے۔ کہ مقاصد جلیلہ کے حامل انسانوں کو ''صخرۃ الوادی'' کی طرح ثبات واستقلال کی وہ چٹان ہونا چاہیے کہ حوادث روزگار کے جس قدر تند و تیز سیلاب آئیں۔ ٹکرائیں اور واپس لوٹ جائیں۔ مگر ان کے پائے استقلال میں ہرگز جنبش پیدا نہ کر سکیں۔ تب تو کامیابی یقینی ہے لیکن جو لوگ اس قدر بلند حوصلہ نہیں رکھتے ان کو اس پُر خار وادی میں قدم رکھنے کی زحمت ہی نہیں کرنا چاہیے۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(۵) شجاعت وشہامت کے عدیم النظیر نمونے

طاقت وقوت کے حد اعتدال پر ہونے کا نام شجاعت ہے۔ اگر اس میں افراط پیدا ہو جائے تو اس سے تہور (اجڈپن) پیدا ہو جاتا ہے۔ اور معمولی سی تفریط سے ''جبن'' (بزدلی) جنم لیتا ہے یہ دونوں صفات رذیلہ اسی طرح مذموم ہیں۔ جس طرح شجاعت کی صفت جلیلہ ممدوح ہے''۔ یہ دنیا والوں کی نا سمجھی ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو بے محل جنگ پر آمادہ ہو جائے۔ بہادر وشجاع کہہ دیتے ہیں۔ لیکن شجاعت حقیقتہً یہ ہے کہ انسان کے لیے جس وقت قدم اٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو۔ اُس وقت پر جگری کے ساتھ آگے بڑھے۔ اور وہ سب کچھ کرے۔ جو اس کا فرض معلوم ہوتا ہو۔ چاہے اس سلسلہ میں اسے جان بھی دینا پڑے۔ اور جس موقع پر اقدام مناسب نہ ہو۔ بلکہ سکوت اور

چشم پوشی کی ضرورت ہو۔ چاہے اس سلسلہ میں اسے جان بھی دینا پڑے۔ اور جس موقع پر اقدام مناسب نہ ہو۔ بلکہ سکوت اور چشم پوشی کی ضرورت ہو۔ اس وقت تحمل سے کام لے۔ چاہے اس میں کتنے ہی مشکلات درپیش ہوں۔ اور ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اس صورت میں خاموشی اسی طرح شجاعت کا ثبوت ہوگی جس طرح پہلی صورت میں نبرد آزمائی۔۔۔ حسینؑ بن علیؑ کی شجاعت کا وہ صرف ایک رخ ہے جسے کربلا پیش کرتی ہے۔ اور اس کا دوسرا پہلو وہ ہے۔ جسے حضرت نے دس برس تک اپنے بھائی امام حسنؑ کی صلح کا پابند رہ کر پہلے دکھایا۔ اس دوران میں بہت سے تکلیف دہ واقعات پیش آئے۔ مگر حسینؑ نے انہیں برداشت کیا۔ اور کسی طرح مکدر فضا میں اپنی طرف سے اضطراب پیدا نہ کیا۔ بے شک جس وقت آپ کو یہ فرض معلوم ہوا کہ آپ کھڑے ہوں اور باطل سے ٹکرا جائیں تو پھر پہاڑوں کا استحکام آپ کے استقلال تک نہیں پہنچتا تھا۔ آپ کی شجاعت کا وہ رخ بھی بے نظیر تھا اور یہ رخ بھی ایسا تھا۔ جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ (شہید انسانیت) حسینؑ کا اٹل انکار بیعت ان کے فولادی عزم و استقلال اور بے نظیر شجاعت کا شاہکار ہے۔ مصیبتیں اس وقت تک مصیبتیں ہیں۔ جب تک انسان ان سے ڈرتا ہے کس چہرہ کا یہ حوصلہ تھا کہ ششماہہ بچہ کو دم توڑتا دیکھ کر شکر کی مسرت سے سرخ ہو جائے۔ کس زبان کا یہ جگر تھا۔ کہ خراب خنجر میں امت کی نجات کے لیے دعا مانگے۔ تلوار کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کہ کسی مظلوم کے گلے پر پھرائی جائے۔ تیروں کے لیے یہ پہلا موقع نہ تھا کہ کسی بے گناہ کے بدن میں پیوست ہوں۔ تیر آپ سے پہلے بھی انسانی خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ لیکن دنیا کے کسی ہتھیار نے اپنے مقتول کو اس قدر مستقل مزاج (اور جری و دلیر) نہ پایا ہوگا۔ وقت تھا کہ رستم و اسفندیار اپنی خاکی آرام گاہ سے سر نکالتے۔ ارجن و بھیم کی راکھ کے پریشان ذروں میں روح پھونکی جاتی جعفر طیارؓ اور حیدر کرارؑ قبروں سے نکل پڑتے۔ سنہال و جولیس عالم ارواح کے موکل سے رخصت لے کر دنیا میں آتے۔ اور یہ سب مل کر تین دن کے بھوکے پیاسے کی مدافعانہ جنگ کا تماشہ دیکھتے۔ زخمی ہاتھوں نے کس روز اس زور کی لڑائی لڑی تھی۔ بہتر کا داغ اٹھائے دل نے کس دن یہ جرأت دکھائی تھی شجاعت و استقلال کو علیؑ نے پالا تھا۔ اور آج حسینؑ کے ہاتھوں ان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ حسینؑ کی پیری تھی۔ مگر ان کی ہمت و جرأت کا شباب تھا کثرت مصائب سے جس قدر حسینؑ کی کمر جھکتی تھی اس قدر ہمت و جرأت بلند ہوتی جاتی تھی۔ بایں ہمہ جس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔ اور دشمن اس طرح بدحواس ہو کر گرتے پڑتے بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح بھیڑیں شیر کے حملہ کے وقت بدحواس ہو کر بھاگتی ہیں۔ ادھر اُدھر حسینؑ کی تنہا ذات مقدس پر جن مصائب کا نرغہ ہوا۔ اور جن ہوش ربا اور روح فرسا صدمات و حالات کا حسین علیہ السلام نے تنہا مقابلہ کیا۔ وہ عام انسانی طاقت برداشت سے بالاتر ہیں۔ رفیقوں اور عزیزوں کی شہادت کے بعد بھی خود تن تنہا بھوک و پیاس کے باوجود حسینؑ کا

حیرت انگیز بہادری سے ہزاروں دشمنوں کے ساتھ جدال وقتال کرنا اور صدہا زخم کھانے پر بھی تلوار کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا جنگی کارناموں میں تحیر افزا کارنامہ ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی انسان کو اس قدر مصیبتوں اور تکلیفوں نے گھیرا ہو۔ اور وہ اپنے عزم واستقلال پر اس طرح ثابت قدم رہا ہو کہ دنیا کے کسی بہادر نے اتنے صدمے برداشت کرنے کے بعد ایسے دل شکن ہجوم وآلام میں شجاعت وبہادری کے ایسے مافوق الفطرت جوہر دکھائے ہم بلاخوف تردید دعوے سے کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تم تمام بہادران عالم کے فرداً فرداً شجاعانہ کارناموں پر غور کرو اور بایں ہمہ مصائب و شدائد حسینؑ کی شجاعت ہمت، استقامت سے ان کا موازنہ کرو۔ تو تمہارا ضمیر خود پکار اُٹھے گا۔ کہ بے شک شجاعت استقلال کا حسینؑ پر خاتمہ ہو گیا۔ شجاعت واستقلال کا دوسرا نام حسینؑ ہے (مجاہد اعظم) صرف آنجناب ہی نہیں۔ آپ کے تمام رفقاء اس صفت جلیلہ میں بے نظیر نظر آتے ہیں۔ ان کے مثالی کارناموں کے تفصیلی تذکرے سابقہ ابواب میں گذر چکے ہیں۔ بہرحال حسینؑ واصحاب حسینؑ کے کارناموں میں یہ درس مضمر ہے کہ انسان کو حق وحقیقت کے لیے جان تک کی بازی لگا دینی چاہیے۔ اور موت کا خوف دل سے بالکل نکال دینا چاہیے۔ اور اس بات کی پروا نہیں کرنا چاہیے کہ موت پر گر رہا ہے یا موت اس پر گر رہی ہے اور اسی چیز کا دوسرا نام شجاعت ہے۔

(۶) عزت نفس کی بلند تعلیم

یہ حقیقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس عالم رنگ وبو میں انسان کی سب سے زیادہ گرانمایہ متاع اس کی اپنی زندگی ہے۔ انسان کی تمام تگ ودو، جدوجہد اور تمام محنت ومشقت اسی زندگی کے تحفظ وبقایا اس کی سہولت وآسائش کی خاطر ہوتی ہے۔ اسی کی بقا کے لیے وہ تمام مشکلات ومصائب برداشت کرتا ہے۔ اور اسی کی حفاظت و صیانت کے لیے تمام ممکن وسائل وذرائع کو بروئے کار لاتا ہے۔ ﴿یود احدهم لو یعمر الف سنة﴾ مشاہدہ شاہد ہے کہ انسان اپنی زندگی کے بچاؤ کی خاطر اپنا سب مال ومتاع قربان کر دیتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے۔ کہ انسانی زندگی میں گردش لیل ونہار سے کچھ ایسے نشیب وفراز بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے سخت ترین لمحات بھی درپیش آجاتے ہیں۔ کہ جب جذبات میں تلاطم اور طبعی وعقلی رجحانات میں تصادم ہو جاتا ہے اور ایک غیور وجسور انسان اپنی اس عزیز ترین متاع (زندگی) سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ اور اپنے سرمایہ حیات وہستی کو قربانی کی بھینٹ چڑھانے میں روحانی لذت اور شادمانی محسوس کرتا ہے۔ انہی نازک مواقع میں سے ایک موقع وہ ہے جب ذلت کی زندگی، اور عزت کی موت کا سوال درپیش ہو۔ اس قسم کے نازک مواقع پر بلند ہمت، عزت نفس کے پیکر، اور انسان کامل وقتی فنا کو قبول کرتے ہوئے موت کے منہ میں جا پڑتے ہیں۔ اور اس طرح حیات جاودانی اور ابدی وسرمدی کامرانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن کبھی عزت نفس قربان کر کے ذلت کے ساتھ زندہ رہنا گوارا

نہیں کرتے کیونکہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

شہید کربلا (روحی لہ الفداہ) کو اپنی زندگی میں ایسا ہی نازک لمحہ پیش آیا تھا۔ ایک طرف ذلت کی زندگی تھی اور وہ بیعت یزید میں پوشیدہ۔ اور دوسری طرف عزت کی موت تھی۔ اور وہ انکار بیعت میں مضمر تھی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ امام عالی مقام نے اس موقع پر ﴿الموت فی عز خیر من حیاۃ فی ذل﴾ یعنی عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ اور ﴿الموت خیر من رکوب العار﴾ ننگ و عار برداشت کرنے سے موت کا اختیار کرنا بہتر ہے۔ فرما کر موت کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اور بقائے دائمی و حیات ابدی کا گوہر یگانہ حاصل کر لیا۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری ۔۔۔ بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

اگر حسین علیہ السلام چاہتے تو صرف اتنی بات پر اپنی اور اپنے اہل خانوادہ کو ان مصائب و شدائد سے بچا سکتے تھے۔ کہ یزید کے سامنے گردن جھکا دیں۔ اس صورت میں ممکن ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ یزید کے دربار میں ظاہری عزت و حرمت بھی مل جاتی۔ اور جاہ و منصب بھی۔ مگر اس طرح عزت نفس اور دین اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس لئے فرزند رسول کی غیرت نفس نے آخر دم تک اس ذلت کو گوارا نہ کیا۔ کہ دنیوی زندگی کے بچاؤ کی خاطر عزت نفس اور دین رسول کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیں۔ حالانکہ آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ کشت و خون کا ہنگامہ محشر برپا ہونے والا تھا۔ جس میں آپ کے سب عزیز و رفیق تیروں و تلواروں سے کٹ کٹ کر زمین پر گریں گے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ منحوس سماں بھی تھا۔ کہ آپ کی شہادت کے بعد مخدرات عصمت و طہارت پر مصیبتوں اور بلاؤں کا آسمان ٹوٹنے والا تھا۔ اور وہ حوصلہ شکن منظر بھی پیش نظر تھا۔ جب عورتوں کی جگر خراش صدائے فریاد اور بچوں کی بھوک و پیاس کی شدت سے بے قراری اور آواز العطش، العطش بلند ہوگی۔ اپنی جماعت کی قلت، دشمنوں کی کثرت، تمازت آفتاب، لو کے جھونکے، پانی کی بندش مگر ان میں سے کوئی چیز بھی آپ کو مرکز تعلق سے ہٹا کر عزت نفس کے قربان کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ حالانکہ ان میں سے کوئی ایک مصیبت بھی ایک انسان کو خواہ وہ بات کا کیسا ہی دھنی ہو۔ خلاف ضمیر اور مخالف دین راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرنے کے لیے کافی تھی۔ مگر امام حسین علیہ السلام یہ تمام سختیاں بلائیں اور زہر گداز مصیبتیں اٹھا کر بھی وجدانی صداقت، روحانی سچائی، ایمانی قوت، اسلامی جوش اور عزت نفس پر قائم اور ثابت قدم رہے۔ کیا عالم کی تاریخ میں کسی اور بہادر کی بھی ایسی کوئی شاندار مثال موجود ہے لا واللہ۔

حسینؑ نے فوق التصور شدائد و مصائب برداشت کرنے کے باوجود جان دی۔ مگر بات نہ دی، سر قلم ہو جانا گوارا کیا مگر اپنی عزت نفس پر حرف نہ آنے دیا۔ اس میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام عوالم امکانیہ میں بسنے والے

انسانوں کے لیے یہ بے نظیر درس موجود ہے۔ کہ جب بھی زندگی میں کوئی ایسا موڑ آ جائے کہ عزت نفس کی موت اور ذلت کی زندگی میں معاملہ دائر ہو جائے تو چند روزہ حیات مستعار کو قربان کر دینا مگر عزت نفس پر حرف نہ آنے دینا اسی میں بقاء دوام کا راز مضمر ہے۔ روحی لک الفداء یا حسینؑ ۔

از ہیچ پیمبر نباید ایں کار — واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

(۷) تنظیم، محکم یقین اور عمل پیہم کی تلقین

مفکرین عالم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر چیز کا خواہ وہ عالم روحانیات سے تعلق رکھتی ہو یا عالم مادیات سے ایک وضعی وطبعی اثر ہوتا ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا۔ بنابریں اصول، نظم وضبط، یقین کامل اور عمل پیہم اور ان کی اضداد اختلاف وافتراق، شک وبے یقینی کی کیفیت اور بے عملی یا عملی کمزوری کے بھی کچھ مخصوص وضعی وطبعی آثار و خواص ہیں جو کبھی ان سے منفک وجدا نہیں ہوتے۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ ان امور اور ان کے اضداد کے وہ خواص ولوازم ہیں کیا؟ اگر آپ چند لمحات کے لیے تاریخ عالم کی روشنی میں قوموں کے بننے اور بگڑنے، ان کے ابھرنے اور کچھ عرصہ تک تمام ربع مسکون یا اس کے کسی خطہ پر حکومت کرنے کے بعد صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جانے اور پردۂ عدم میں روپوش ہو جانے کے فلسفہ پر غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جائے گی۔ کہ قوموں کے بننے وابھرنے اور عالم پر چھا جانے کا فلسفہ ان کی اجتماعی تنظیم، سعی وکوشش اور پھر اس کے نتیجہ میں اپنی کامیابی وکامرانی پر یقین محکم میں مضمر ہے۔ اس کے خلاف ان کی ذلت ورسوائی، نکبت وپسپائی اور بالآخر لوح کائنات سے مٹنے کا راز ان کے اجتماعی شیرازہ کے بکھرنے، عملی قوی کے شل ہو جانے اور شک وتذبذب کا شکار ہو جانے میں پوشیدہ ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

انہی حقائق کی بنا پر خدائے حکیم نے یہ حکیمانہ حکم دیا ہے کہ ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ آپس میں اختلاف نہ کرنا ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے۔ (سورۂ انفال، آیت ۴۶) اور جب کمزور ہو جاؤ گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (عزت وآبرو خاک میں مل جائے گی)۔ یہ کسی ہادی ورہبر اور لیڈر کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اسے کچھ ایسے افراد مل جائیں جو وحدت خیال، وحدت مقصد اور وحدت عمل کے سلک میں منسلک ہوں کیونکہ کسی انسان کی انتہائی عظمت وجلالت کے بعد بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ایسے منظم ساتھی بھی مل جائیں اوروں کا تو ذکر ہی کیا۔ انبیاء ومرسلین کے حالات وکوائف سامنے موجود ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر (بلکہ تمام) کو ایسے ساتھی نصیب نہیں ہوئے جیسے شک ہے وہ قرآن وحدیث اور کتب تاریخ میں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہما السلام بلکہ خود

پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اصحاب کے حالات و واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لے۔ اسے اس حقیقت کا علم الیقین ہو جائے گا کہ شخصی عظمت و بلندی اور ہے اور منظم، مخلص اور مستقل مزاج پیرووں کا دستیاب ہو جانا چیزے دیگر۔ اس سلسلہ میں حضرت امام حسینؑ ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں۔ امامؑ نے اپنے ساتھیوں میں تنظیم و اتحاد اور عمل کی وہ روح پھونک دی کہ ان کے ہمراہیوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کے قول و فعل میں تضاد کا شائبہ بھی نظر آئے یا جس کے رویہ و رفتار سے عدم تنظیم، عدم یقین اور عدم عمل کی بو بھی آئے۔ حالیؔ نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں حسینؑ کے ساتھیوں کی انہی وفا کیشیوں کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا ہے:

''چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ امنگ ہے کہ سب سے پہلے اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی، بھتیجے، بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دوں۔ بھائی، بھائیوں، بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار، اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے میں ہوں۔ بہن کا یہ ارادہ ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کر دے۔ بھائی اس غم میں گھلا جاتا ہے کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے۔ تو بہن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔۔ (یہ تو حسینؑ کے اہل خاندان کے صنف مذکر کا تذکرہ تھا۔ اب ذرا خواتین کربلا کا کردار بھی دیکھئے) ''بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو قتل اور زخمی ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی۔ اور منہ سے سانس نہیں لیتی۔ صرف اس خیال سے کہ جس مربی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں۔ اس کے دل پر میل نہ آئے اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اس کی اور اس کی اولاد کی خیر مناتے ہیں اور کوئی اپنے بچھڑے ہوؤں کو یاد نہیں کرتی۔'' ۔۔۔۔۔ (اب ذرا انصار حسینؑ کے کردار کی بھی ایک جھلک دیکھ لیں) ''چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبیؐ کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دل کے مقابلہ میں اس قدر قلیل ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں اس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی۔ بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آ رہی ہے نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے جو اس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو مگر وفاداری کا طوق ان کی گردن میں اور دوستی و اخلاص کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع ان کے اس تعلق کو قطع نہیں کر سکتی۔ ہر وقت یہی آرزو ہے کہ کب اذن جنگ ملے اور کب خاندان نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں اور کب اس فرض سے سبکدوش ہوں۔۔۔ غور کیجئے ان خاصانِ خدا کے جذبات وفاداری کی کیا کیفیت تھی؟ اور وہ سب ایک اصول کے لیے قربان ہونے آئے تھے۔ اور حق و صداقت کی حمایت کا حق ادا کر گئے۔'' بنابریں

جناب امام حسینؑ یہ فخر و مباہات کرتے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ”جیسے وفادار اور جاں نثار ساتھی مجھے نصیب ہوئے ایسے کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔“

بہر حال یوں تو اسلام اپنے ہر فرزند سے حق و صداقت کی نظیر پیش کر سکتا ہے۔ حمایت صداقت کی ایسی شان دار مثال قائم کرنا صرف حسینؑ کا ہی کام تھا۔ حسینؑ کا اسی جذبہ سے متاثر ہو کر ناقابل برداشت مصائب کو جھیلنا گوارا فرمایا اور تعلیم اسلام کو اپنے خون سے عملی رنگ میں دنیا کے روبرو پیش کیا۔ حسینؑ اگر باطل سے دب جاتے تو یہ اسلام کی شکست تھی اس لیے وہ خود ہدف مصائب بنے۔ اور اپنے قتل سے نہ صرف اسلام کی آبرو رکھ لی۔ بلکہ اسلام کی فتح کا اعلان کر دیا۔ جب تک دنیا قائم ہے اسلام فرزند بانیٔ اسلام کا مرہون احسان اور یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے درس عبرت و موعظت بنا رہے گا۔ اور ان کو یاد دلاتا رہے گا۔ کہ مسلمانوں کو حق و صداقت کی حمایت اس طرح کرنی چاہیے۔ (مقدمہ دیوان حالیؔ)

خداوند عالم تمام اہل عالم کو حسینؑ اور انصاران حسینؑ کے ان زرین کارناموں سے عملی سبق حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

(۸) صبر و رضا کی بے مثال عملی تعلیم

صبر کا مطلب یہ ہے کہ کسی بلا و مصیبت کے وقت انسان سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد نہ ہو جس سے خداوند عالم کی قضا و قدر پر ناراضی کا اظہار ہوتا ہو۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قید حیات ”بند غم“ کا دوسرا نام ہے۔ یہاں قدم قدم پر مصائب و آلام اور ناملائم و ناساعد حالات کا سامنا کرنا ناگزیر ہے۔ اگر کوئی انسان یہ چاہے کہ دار دنیا میں تمام امور اس کے حسب دلخواہ ہوں۔ اور اسے کبھی ناموافق حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تو اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا ایسے آدمی کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو آگ میں پانی یا پانی میں آگ تلاش کرے۔

طبعت علی کدر و انت تریدها — صفواً من الاقذاء و الاکدار
و مکلف الایام ضد طباعها — متطلب فی الماء جذوة نار

اسی بنا پر ارباب دانش و بینش نے تمام مشکلات و مصائب کا واحد حل ”صبر جمیل“ تجویز کیا ہے کہ انسان کو مشکلات و مصائب کے وقت کسی قسم کی گھبراہٹ و اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے بلکہ پوری طمانیت قلبی اور دلی لگن کے ساتھ مگن رہنا چاہیے اور ایسا کرنے سے مشکلات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور مقصد کا ابر آلود مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود — مرد باید کہ ہراساں نہ شود

تجربہ شاہد ہے کہ جب انسان اپنے اندر رنج و الم سہنے کا جذبہ پیدا کر لے اور مشکلات برداشت کرنے کا خوگر

ہو جائے تو اس وقت رنج رنج نہیں رہتا اور مصیبت مصیبت نہیں رہتی۔

ع رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں مجھ پر اتنی پڑیں کہ آساں ہو گئیں

انہی حقائق کی وجہ سے قرآن وحدیث میں صبر کی بے حساب مدح وثنا وارد ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں ستر سے زائد مقامات پر صبر وصابرین کا ذکر خیر کیا گیا ہے۔ اور حدیث میں صبر کو ایمان کے ساتھ وہی نسبت دی گئی ہے جو سر کو بدن کے ساتھ ہوتی ہے۔ (المقامات العلیہ)

یہ صفت جلیلہ امام حسینؑ میں اس قدر نمایاں طور پر موجود تھی کہ آپؑ کا لقب ہی ''سید الصابرین'' ہو گیا۔ حادثۂ کربلا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ مرورِ ایام کا کوئی ادنیٰ معاملہ نہ تھا۔ روزگارِ عالم کی آئے دن کی بات نہ تھی بلکہ گردشِ افلاک کا اہم ترین دور تھا۔ تاریخ اسلام کا شاندار واقعہ تھا۔ حق و باطل کی جنگ کا معرکۃ الآراء دور تھا۔ بے دینی و ایمان وصداقت و بطلان کا فیصلہ کن ہنگامہ تھا۔

حسینی شہادت کا دوسرے شہداء سے سرسری مقابلہ

حسینؑ کے مصائب کا موازنہ دنیا کی کسی مصیبت سے نہیں ہو سکتا اگرچہ ہر قسم کے مصلحین ومجددین کو ان کے مخالفین نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ لیکن ان سب میں انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا پیمانہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ تاہم تمام دنیا کے انبیاء ورسل کے واقعات شدائد کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کسی نبیؑ یا رسولؑ نے حسینؑ سے بڑھ کر رضائے الٰہی کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کیا۔ کیونکہ انبیائے ماسلف نے اپنے مخالفوں کے ہاتھوں جو آلام وصدمات برداشت کیے۔ وہ صرف ان کی ذات تک محدود تھے۔ یہاں تو نہ صرف اپنی ذات بلکہ سارے خاندان کی تباہی وبربادی، قتل واسیری کو گوارا فرمایا گیا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صبر ورضا کا جو امتحان لیا گیا وہ ان بلاؤں کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کو سوائے صبر کے چارہ نہ تھا۔ اس کے خلاف حسینؑ پر جن مصائب کا ہجوم بیک وقت ہوا۔ ان کے مقابلہ میں کوئی مصیبت پیش نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہ ان کا دفاع آپؑ کے اختیار میں تھا۔ اگر آپؑ یزید کی بیعت کر لیتے (۔۔۔۔۔) تو ساری مصیبتوں کا خاتمہ تھا۔ یا اگر چاہتے تو مقابلہ کے لیے لشکر فراہم کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انبیاء کی مصیبتیں تنہا تھیں۔ یہاں مصائب وصدمات کی یورش۔ ہر مصیبت کے بعد دوسری مصیبت پہلی مصیبت سے بھی زیادہ شدید اور روح فرسا ہر لحظہ شدائد کی سختی بڑھتی جاتی تھی۔ مصیبتوں کے بادل مہیب اور بھیانک صورت کے ساتھ پے در پے اُمڈے چلے آتے تھے لیکن حسینؑ جادۂ صبر ورضا پر پہاڑ کی طرح قائم ہیں۔ اور ان کے پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوتی۔ شہید دنیا

میں ہزاروں ہوئے اور ہزاروں ہوں گے۔ مگر اس شان کا شہید نہ اب تک ہوا۔ نہ آئندہ ہوگا۔ کسی نے سچ کہا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ۔

از ہیچ پیمبر نیاید ایں کار   واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

امامؑ کے سر پر مصیبت کا یہ کوہ گراں کیوں رکھا گیا؟

یہ بات بھی سوچنے کے لائق ہے کہ کارساز حقیقی نے مصائب و آلام کا یہ کوہ گراں اپنے برگزیدہ ترین کے سر پر کیوں رکھا؟ بارگاہ خداوندی کے مقرب ملائکہ نے تخلیق آدمؑ کے وقت عرض کیا تھا تو زمین پر ایسا خلیفہ (انسان) پیدا کرے گا جو فساد برپا کرے۔ اور خون بہاتا رہے؟ اور ہم تیری حمد و ثنا کی تسبیح کرتے ہیں اور تجلیل و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں۔ حکیم مطلق ان فرشتوں کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اطمینان و سکون سے تمہارا حمد و ثنا کرنا۔ ان انسانوں کی تسبیح کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ جو ہماری خاطر اور ہماری راہ میں اپنی گردنیں قلم کراتے ہیں اور امانت توحید کی پاسبانی کے لیے خطرات عظیمہ کا تسلیم و رضا سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ معبود مطلق کے دربار میں وہی عبادت اعلیٰ قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے جو مصائب و آلام اور ابتلاء و آزمائش سے ہم آغوش ہو (مجاہد اعظم) چنانچہ بعض زیارات میں وارد ہے: ﴿و لقد عجبت من صبرک ملائکۃ السماء﴾ اے حسینؑ! تیرے صبر و رضا سے آسمان کے فرشتے بھی تعجب کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اللہ تعالیٰ کی مشیت عہد حاضر کے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو بھی درس عمل دینا چاہتی تھی۔ کہ توحید پرستی و حق نوازی وہ گرانقدر اور عظیم الشان عمل ہے۔ جس کی حفاظت و پاسبانی میں تمہاری دنیا و آخرت کے سردار کا عزیز ترین لخت جگر مع بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں، بھانجوں کے اپنا خون پانی طرح بہا چکا ہے۔"

خداوند عالم تمام انسانوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اور شیعوں کو بالاخص امام الشہداءؑ کے اس اسوۂ حسنہ سے سبق لینے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۹) مواسات و ایثار کے شاندار عملی نمونے

کسی کو گرفتار مصیبت دیکھ کر اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کا نام "مواسات" اور اپنی ضرورت و احتیاج کے باوجود دوسرے صاحب ضرورت کو اپنی ذات پر ترجیح دینے کا نام "ایثار" ہے۔ علم الاخلاق میں ان دونوں صفتوں کا شمار اعلیٰ درجہ کی انسانی صفات جلیلہ میں ہوتا ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھی مجاہدین نے موسات و ایثار کے بے مثال عملی نمونے پیش کیے ہیں۔ امامؑ کی مواسات کا یہ عالم ہے کہ انصار و اصحاب پر جو مصیبت بھی پڑتی ہے ان میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اصحاب حسینؑ کی امامؑ کے ساتھ مساوات و ہمدردی کی مثال بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ جہاں تک ایثار کا تعلق ہے امامؑ نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ جو ہر انسانیت

یہ ہے کہ احتیاج کے وقت دوست تو کجا دشمن کو بھی اپنے نفس پر مقدم سمجھنا چاہیے۔ ذرا اس وقت کو تصور میں لائیے جب راستہ میں حر ایک ہزار کا لشکر لے کر امامؑ کے سدِّ راہ ہونے کے لیے آیا ہے۔ مگر مع اپنی فوج کے شدت پیاس سے نڈھال ہے۔ امامؑ اپنے اور اپنے متعلقین کے مستقبل کا خیال نہ فرماتے ہوئے سب پانی انہیں پلا دیتے ہیں۔

اسی طرح میدان کربلا میں اقارب واصحاب امامؑ میں سے ہر شخص نے ایثار کا لافانی مرقع پیش کیا ہے ہر فرد نے امام کی جان کی حفاظت کو اپنے جسم و جان سے مقدم سمجھا ہے۔ ذرا روز عاشوراء ہنگام ظہر ابو ثمامہ صائدی اور سعید بن عبداللہ حنفی کا بوقت نماز امامؑ کے سامنے سپر بن کر کھڑا ہونے اور تیروں کو سینے پر روکنے کا ہوشربا اور روح فرسا منظر آنکھوں کے سامنے لائیں اور پھر انصاف سے فرمائیں۔ کہ آیا تاریخ عالم اس کی کوئی نظیر پیش کرسکتی ہے؟ قربان گاہ کربلا میں ہر شخص دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اپنی جان دے کر دوسروں کے تحفظ کا ذریعہ بن سکے۔

انہیں اپنا غم نہ تھا۔ اپنی فکر نہ تھی۔ ہاں اگر انہیں غم تھا تو حسین کا فکر تھی تو ان کی تنہائی کی چنانچہ یاد کیجئے سیف بن حارث و مالک بن عبد دونوں بھائیوں کا وہ امامؑ کے پاس آ کر رونے لگنا اور امام کا فرمان کیوں روتے ہو؟ اور ان کہنا ہم اپنے لئے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں آپ کی بے کسی پر رونا آتا ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور یہ کہ اب ہم سے آپ کی حفاظت قرار واقعی طور پر نہ ہو سکے گی۔ یا یاد کیجئے وہ مسلم بن عوسجہ کے آخری وقت حبیب بن مظاہر کے ان کے پاس جانے اور ان سے یہ کہنے کہ "اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں ابھی عنقریب تمہارے پیچھے آ رہا ہوں تو ضرور کہتا کہ کچھ وصیت کرو اور میں اس وصیت کو پورا کرتا" اور اس وقت جناب مسلم کا امام حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہنا کہ جو کچھ وصیت ہے وہ اسی بزرگوار کے بارے میں ہے۔ یعنی ان پر اپنی جان قربان کرنا اور حبیب کا بڑی پر جگری کے ساتھ کہنا۔ بخدا ضرور ایسا ہی ہوگا۔ (شہید انسانیت) اور انہوں نے یقیناً ایسا ہی کیا بلکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو کربلا کا پورا المیہ ہی ایثار کا عملی نمونہ ہے۔ امامؑ اور ان کی پوری جماعت نے دین و مذہب کے تحفظ اور نوع انسانی کو ابدی ہلاکت سے بچانے کی خاطر اپنا تن، من، دھن راہ خدا میں قربان کر دیا۔ کربلا والوں کے اس اسوہ حسنہ سے یہ درس ملتا ہے کہ صحیح معنوں میں انسان وہی ہے جو مواسات وایثار کے زیور سے آراستہ ہے۔ اور جس آدمی میں یہ صفت نہیں ہے وہ درحقیقت جوہر انسانیت سے عاری وخالی ہے۔ و

لنعم ما قیل

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں

(۱۰) عظیم مقصد کے حصول کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کا درس

صاحبان خرد سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ مقاصد واغراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے کچھ مقصد بغیر کسی قسم کی قربانی دیئے صرف معمولی عملی جدوجہد کرنے سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور بعض کے حصول کے لیے کچھ مالی قربانی بھی پیش کرنا پڑتی ہے۔ اور بعض عظیم مقصد اپنے حصول میں مختلف النوع جانی قربانیوں کے متقاضی ہوتے ہیں۔

اذا عظیم المطلوب قل المساعد

صحیح معنوں میں مدبر اور معقول انسان وہی ہوتا ہے جو ہر ہر مقصد کی نوعیت واہمیت کو سمجھے۔ اور پھر اس کے حصول کے لیے وہی طریقہ کار اختیار کرے جو اس کے لیے مناسب ہے اس لیے ہمیشہ مردان راہ کو مقاصد عظیمہ کی خاطر دشوار گذار اور پُر خار وادیوں میں قدم رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوعِ وَ نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۵،۱۵۶)

ترجمہ:۔ ''اور ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک اور مال و جان اور ثمرات (کے نقصانات) سے ضرور آزمائیں گے اور ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیجیے۔ جو مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے درود ہیں اور رحمت بھی۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے جو عظیم مقصد تھا وہ ہر قسم کی مالی اور جانی قربانی کا طلب گار تھا۔ کیونکہ اس وقت اسلام بلکہ انسانیت کی کشتی فسق وفجور بلکہ کفر والحاد کے بحر ناپیدا کنار کے بھنور میں پھنس گئی تھی۔ طوفان استبداد کے زبردست تھپیڑے چاروں طرف سے اس پر پڑ رہے تھے۔ ظلم وجور اور کفر وزندقہ کے تیز وتند جھونکے اس سفینہ نجات کو ڈبونا چاہتے تھے۔ قریب تھا کہ یہ کشتی پاش پاش ہو کر تباہ ہو جائے۔ مگر اس اولوالعزم امامؑ نے مخالف ہواؤں کی کچھ پروانہ کی اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَ مُرْسٰهَا﴾ پڑھتے ہوئے اس کشتی کو گرداب بلا سے نکالنے کا عزم بالجزم کرلیا۔ اور اس کے بچانے کے لیے ایسی راہ اختیار کی۔ جس کو پہلے کسی نے اختیار نہ کیا تھا۔ جو ابتلاء پُر خطر ہونے کے لحاظ سے ایسی سخت اور کٹھن تھی۔ کہ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ کوئی سہل مہم نہ تھی کوئی چرب لقمہ نہ تھا اس سفینہ نجات کی حفاظت بڑی بھاری قربانیاں چاہتی تھی۔ بڑے بڑے فدیوں کی ضرورت تھی۔ کوہ شکن مصائب کا تحمل درکار تھا۔ مگر حسینؑ ایسے نہ تھے۔ کہ ان مصائب وشدائد کے سامنے جھجکتے۔ انہوں

نے بڑی خوشی سے لبیک کہا اور تمام آنے والی مصیبتوں کا تہ دل سے خیر مقدم کیا۔ وہ تو عہد طفولیتؑ سے ہی ان تمام مصائب کے لیے تیار تھے اور باوجود ایسے جانکاہ شدائد کے جواپنی نوعیت میں عدیم المثال ہیں۔ آخر دم تک اپنی بات پر ثابت اور قائم رہے آپؑ کی قربانی بڑی عظیم تھی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ مذکورہ بالا عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان گاہ کربلا میں پیش کریں۔ اور جب اپنی ذات کے علاوہ اور کچھ باقی نہ رہے تو سب کے آخر میں اسے بھی میدان قربانی میں پیش کر دیں۔ چنانچہ روز عاشور آپؑ نے سب سے پہلے اپنے محبوب ترین اعوان و انصار کو قربان کیا۔ یہاں تک کہ جب عزیزوں کی باری آئی۔ تو ایک ایک کر کے ان سب کو میدان قربانی میں بھیجا۔ حتی کہ اپنے دل کی قوت، آنکھوں کی روشنی، پیری کے سہارے علی اکبرؑ ایسے فرزند۔ قاسمؑ و عبداللہ ایسے بھتیجے۔ ابوالفضلؑ ایسے وفادار بھائی۔ سب کو فدیہ راہ حق ہونے دیا۔ اور سب کے آخر میں باغ امید کی آخری کونپل اور غنچہ ناشگفتہ علی اصغرؑ کو خود اپنے ہاتھوں پر نشانہ بتر ستم ہوتے دیکھ لیا۔ اب اعضائے جسم تک نوبت پہنچی۔ سطح جسم کا چپہ چپہ اور خون کا ہر ہر قطرہ قربان کیا۔ اب کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک رشتہ حیات تھا۔ جو قائم تھا۔ اور سر و گردن کا ارتباط تھا۔ جس میں ابھی جدائی نہیں ہوئی تھی۔ عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں کامیاب ہو گئے۔ ایک طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور جسم و روح کا اتصال قطع ہوا۔ اور دوسری طرف سر و گردن کے باہمی ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔ آسمان لاکھوں بار گردش کرلے زمانہ کے ورق ہزاروں بار الٹ جائیں۔ لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔" (شہید انسانیت)

امام کی اس عظیم قربانی میں یہ درس پوشیدہ ہے کہ اگر وقت آنے پر قوم و مذہب کے لیے مال تو مال اگر عزیز و اقارب کٹوانے پڑیں اور جان بھی نثار کرنا پڑے تو اس میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ کہتے ہوئے کہ

> جان دے دی دی ہوئی اُسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی جان، جانِ آفریں کے حوالہ کر دینا چاہیے۔

(۱۱) انسانی ہمدردی اور حسن معاشرت کے تابناک مظاہرے

قبل ازیں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کہ انسانیت کی معراج اور انسانیت کا جوہر اعلیٰ انسانی ہمدردی۔ ان کیساتھ حسن سلوک اور ان کی خیر خواہی اور نفع رسانی کے اندر مضمر ہے۔ حدیث نبویؐ ہے: ﴿خیر الناس من انفع الناس﴾ بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔ یہ بھی روایات معصومینؑ میں وارد ہے کہ ﴿لا تنظروا الیٰ کثرۃ صلوٰۃ الرجل و صومہ بلی انظروا الی معاملاتہ﴾ کسی آدمی کی کثرت صوم و صلوٰۃ پر نگاہ نہ کرو۔ بلکہ اُس کے معاملات پر نظر کرو۔ کیونکہ ﴿لا یعرف المرء بکثرۃ الصوم و الصلوٰۃ بل یعرف

بالمعاملات﴾ انسان کا جوہر اس کی نماز و روزہ سے نہیں ظاہر ہوتا۔ بلکہ حسن معاملات سے نکھرتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ یہ تو عام فطری بات ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ نگاہ اس قدر بلند ہو۔ کہ اس کی نظر میں دوست و دشمن کا فرق بھی بیچ ہو جائے۔ اور اپنے خون کے پیاسوں سے بھی حسن سلوک کرے۔ یہ سبق حسینؑ نے دیا۔ ذرا ایک نظر حسینؑ کے ان خطبوں پر نگاہ ڈالیے جو آپؑ نے روز عاشوراء گم گشتگان وادی ضلالت کو راہ راست پر لانے کے لیے ارشاد فرمائے ہیں۔ یا وہ منظر آنکھوں کے سامنے لایئے جب روز عاشوراء آپؑ کو روتے ہوئے دیکھ کر کسی بد طینت نے یہ طعنہ دیا ہے کہ حسینؑ! اگر رونا تھا تو کربلا کا رخ کیوں تھا؟ امامؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: تیرا کیا خیال ہے میں اپنے مصائب پر رو رہا ہوں؟ پھر کس پر رو رہے ہیں؟ فرمایا: مجھے یہ چیز رلا رہی ہے کہ میری وجہ سے تیس ہزار آدمی جہنم میں جائیں گے۔ اس سے مذکورہ بالا حقائق کی کس قدر تائید ہوتی ہے۔ امامؑ نے آخر وقت تک کوشش کی۔ کہ ان کے نانا کے کلمہ گو راہ راست پر آجائیں۔ اور اہل بیت رسالت کا خون ناحق اپنی گردنوں پر نہ لیں۔ اور جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔ مگر افسوس ان اشقیاء پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سچ ہے: ﴿وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾

اسی طرح امامؑ کے کردار میں اس طرح کے بھی کئی نمونے موجود ہیں۔ کہ انسان کو دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اپنوں کے ساتھ کس طرح مساویانہ سلوک برتنا چاہیے۔ نیز ایک سردار، ایک رئیس اور ایک افسر کو اپنے ساتھیوں، ماتحتوں اور سپاہیوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔ اور ان کے ساتھ کس طرح یگانگی اور مساوات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اگر طوالت کا خوف دامنگیر نہ ہوتا تو اس کی مثالیں پیش کی جاتیں۔ اگر صرف واقعہ کربلا میں امام کے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سلوک کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو مثالوں کی کوئی کمی نہیں رہتی۔ سابقہ ابواب میں یہ واقعات درج کئے جا چکے ہیں۔

کربلا کا سانحہ ہمارے لیے اپنے دامن میں موعظہ و ارشاد کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ امامؑ کے اس عظیم کارنامے میں ہمارے لیے یہ درس موجود ہے کہ ہم اپنے آپ کو کسی بھی انسان کا اپنا دشمن تصور نہ کریں۔ بلکہ اپنے قول و فعل سے ثابت کریں۔ کہ ہم اس کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ اور اس بات کے خواہشمند ہیں۔ کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آجائے۔ کس قدر شرم کا مقام ہے۔ کہ ہمارے سامنے ایسے اعلیٰ اخلاق کے نمونے موجود ہوں۔ اور پھر بھی ہماری جگہ دنیا کی اعلیٰ اقوام کی آخری صف میں ہو۔ اگر ہمارے دلوں میں قوت، بازوؤں میں سکت، آوازوں میں زور اور اخلاق میں بلندی نہیں ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سید الشہداؑ کی شہادت عظمیٰ کے بلند مقاصد و اغراض سے کوئی درس عمل حاصل نہیں کیا۔

(۱۴) ادائیگی فرض اور عبادت الٰہی کی بجا آواری کا عدیم المثال نمونہ

ارباب بصیرت پر یہ حقیقت روز روشن سے بھی زیادہ روشن ہے کہ کائنات کی ہر شئی کی خلقت انسان کے لیے ہوئی ہے۔ (خلق لکم ما فی الارض جمیعا) اور حضرت انسان کی خلقت کی غرض وغایت عبادت الٰہی کی بجا آوری ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ اب انسان کامل وہی ہوگا۔ جو اپنی اس غرض خلقت کی تکمیل کرے گا۔ اور جو اس سلسلہ میں کوتاہی کرے گا۔ وہ ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ کا مصداق قرار پائے گا۔ عبادت پروردگار کے کئی شعبے ہیں۔ منجملہ ان کے اقامت صلوٰۃ و جہاد بھی اس کے دو اہم شعبے ہیں۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔ کہ حضرت امام حسینؑ کو عبادت الٰہی کے ساتھ ایک والہانہ شغف تھا جس کا اظہار خود آپؑ نے بھی تاسوعا (نویں محرم) کی عصر کو اس وقت فرمایا تھا۔ جب فوج مخالف اچانک خیام کے سامنے آدھمکی تھی۔ اور آنے کا مقصد دریافت کرنے پر انہوں نے کہا تھا کہ وہ غروب آفتاب سے پہلے بیعت کا یا جنگ کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ آنجنابؑ نے حضرت ابوالفضل العباسؑ کو یہ فرما کر کہ ﴿ و اللّٰہ یعلم انی احب الصلوٰۃ و الدعا و الاستغفار ﴾ (خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنے اور دعا و استغفار کرنے کے ساتھ بڑی محبت ہے) پسر سعدؒ سے ایک شب کی مہلت طلب کی تھی جو بڑی مشکل کے ساتھ ملی۔ تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے اور جناب نے وہ تمام شب اپنے اعزا و انصار کے ساتھ اس طرح عبادت الٰہی میں بسر کی کہ مورخین نے لکھا ہے: ﴿لهم دوی کدوی النحل﴾۔ حسینؑ اور ان کے اعزا و اعوان کے خیام سے اس طرح تسبیح و تقدیس الٰہی کی آوازیں بلند تھیں جس طرح شہد کے چھتہ سے بھنبھناہٹ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اسی طرح پیدل چل کر پورے پچیس حج بیت اللہ کرنا۔ (عاشر بحار) اور نماز ہائے پنجگانہ اور ان کے نوافل راتبہ اور نماز تہجد کے علاوہ شب و روز میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھنا (العقد الفرید) عبادت خدا کے ساتھ اسی غیر معمولی محبت کے مختلف مظاہرے ہیں۔ بالخصوص آنجنابؑ نے روز عاشورا عین حالت جہاد میں اول وقت پر نماز ظہر اور وہ بھی جماعت کے ساتھ ادا کر کے نماز کی اہمیت وعظمت کا وہ عملی نمونہ پیش فرمایا ہے جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ ذرا اس وقت کا تصور کیجئے۔ جب روز عاشورا لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ حسینؑ کی جماعت کے بہت سے افراد درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں۔ مختصر حسینی سپاہ میں نمایاں کمزوری محسوس ہو رہی ہے اور تیروں کی بارش جاری ہے، لو چل رہی ہے زمین و آسمان کرہ نار بنے ہوئے ہیں۔ گرد و غبار سے ایک اور آسمان۔ آسمان نیچے پیدا ہو گیا ہے۔ حدت آفتاب سے اسلحہ جنگ آتش سوزاں بنا ہوا ہے۔ بیابان کربلا کا ریگستانی علاقہ تپش میں خاکستر تنور کی کیفیت پیش کر رہا ہے۔ میدان کارزار گرم ہے۔ دشمن کی ٹڈی دل سپاہ گھنگھور گھٹا کی طرح چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ شدت پیاس سے سب کے جگر کباب ہو رہے ہیں۔ اور خیام

سے بچوں کی صدائے العطش شورِ محشر کا نمونہ پیش کر رہی ہے، عورتوں کا نالہ جانکاہ جگر کے ٹکڑے کر رہا ہے۔ لاش پر لاش گر رہی ہے۔ مختصر حسینی جماعت کے نصف سے زیادہ آدمی جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ شدت تشنگی سے زبانیں خشک ہو کر کانٹا ہوگئی ہیں۔ بایں ہمہ تائید و نصرت حق میں دشمن کی کثیر التعداد فوج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بے مثال شجاعت کے جوہر دکھا رہے ہیں۔

اتنے میں دو پہر ڈھل جاتی ہے اور نماز ظہر کا وقت آجاتا ہے ابوثمامہ صیداویؓ آگے بڑھ کر عرض کرتے ہیں۔ یابن رسول اللہ! میری جان آپ پر نثار! جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ میری تمنا ہے۔ بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونے سے پہلے آخری نماز باجماعت آپ کے ساتھ پڑھ لوں۔ جب امام نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ تو نماز ظہر کا اول وقت دکھائی دیتا ہے۔ آپ ابوثمامہؓ کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ کہ ﴿ذکرت الصلوٰۃ جعلک اللہ من المصلین﴾ تو نے ایسے وقت میں نماز کو یاد کیا ہے۔ خدا تجھے نماز گذاروں سے بنائے۔ اس کے بعد امام علیہ السلام نماز خدا ادا کرنے کی مہلت طلب کرتے ہیں۔ فوج یزید مہلت دینے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ امامؑ اس صبر آزما موقع پر بطور نماز خوف اس طرح نماز ظہر باجماعت ادا کرتے ہیں۔ کہ امام علیہ السلام رو بقبلہ مجاہدین کی صفیں پیچھے اور دو جان نثار بہادر مجاہد امامؑ کے آگے سینہ سپر بنے کھڑے ہیں۔ جدھر سے جو تیر آتا ہے۔ آگے بڑھ کر سینے سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اس

؎ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

کا مکمل نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ حسینؑ نے ایسے جانگداز حالات، میں تلواروں کی چھاؤں اور تیروں کی بوچھاڑ میں نماز ظہر کو اپنی تھوڑی سی جماعت کے ساتھ ادا کر کے تمام دنیا کو یہ بات دکھا دی کہ احکام الٰہی کی کامل پیروی اس کو کہتے ہیں۔ اور یہ حقیقت اہل عالم پر واضح کر دی کہ فریضہ نماز کی ادائیگی کسی حالت میں معاف نہیں ہو سکتی۔ کیا عالم کی کوئی قوم اپنے عبادت گذاروں کی فہرست میں اس عبادت کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے۔ حاشا و کلا! جس طرح خندق میں باپ (حیدر کرارؑ) کی ایک ضرب ثقلین کی عبادتوں سے افضل تھی۔ اسی طرح آج بیٹے (حسینؑ) کی نماز ثقلین کی اطاعتوں سے برتر نظر آتی ہے ؎

یاد رکھا اُسے درد میں آزاروں میں
اور سجدہ کیا چلتی ہوئی تلواروں میں

لمحہ فکریہ یا طلت گریہ کن سے دو باتیں

خداوند عالم حسین مظلوم علیہ السلام کے تمام نام لیواؤں کو یہ توفیق مرحمت فرمائے کہ وہ اپنی سیرت کو حسینی سیرت

وکردار کے آئینے میں تشکیل دینے کی کوشش کریں۔ امام حسین علیہ السلام یقیناً نہ صرف عالم اسلام بلکہ پورے عالم انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔ لیکن اس معنی میں کہ انہوں نے نجاح وفلاح دارین کا راستہ واضح وآشکار کر دیا ہے۔ اور کربلا کے جہاد کا بے نظیر عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے دین وشریعت کو بقائے دوام بخش کر ہمیں نجات کے قابل بنا دیا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے ان کو نجات دہندہ قرار دینا بالکل غلط ہے۔ کہ امت کے گناہوں کا کفارہ بن کر خود شہید ہو گئے ہیں اور اپنے نام لیواؤں کو واجبات کی ادائگی یا محرمات سے اجتناب کی قید سے بالکل آزاد کر دیا ہے۔ انجناب نے شہید ہو کر (معاذ اللہ) ہمارے عملی قویٰ کو معطل نہیں کیا۔ بلکہ اپنے تابناک اور عدیم النظیر عملی کارناموں سے ہمیں عمل کرنے کا درس دیا ہے۔

''کیا حسین علیہ السلام کی شہادت سے یہ غرض تھی کہ کچھ رونے والے پیدا ہو جائیں۔ کیا حسینؑ نے انسانی طاقت برداشت سے بالاتر مصیبتیں صرف اس لیے اٹھائی تھیں کہ ان کے نام پر سبیلیں لگائی جائیں۔ شیرینی تقسیم ہو علم اور تابوت اُٹھیں۔ تعزیئے بنائے جائیں۔ تاشے نقارے بجیں یا سینہ کوبی ہوا کرے۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔ حسینؑ نے اسلام کی حمایت میں جان دی۔ احیائے ملت کے واسطے اپنے دوستوں، عزیزوں اور بیٹوں کی قربانی منظور فرمائی۔ اصول کے تحفظ کو اپنے خون سے خریدا اور ہم کو تعلیم دی کہ اصولوں کی تائید وپیروی آخر دم تک کرنی چاہیے۔ خواہ کچھ ہی افتاد پڑے۔ یہ جو کچھ ہوا ہمارے مذہبی، روحانی اور اخلاقی معاشرتی تمدنی اصلاح کو حاجت اور ہماری تعلیم وہدایت کے لیے نہ صرف عورتوں کی طرح رونے پیٹنے اور چھاتی کوٹنے کے لیے۔

مگر کس قدر افسوس ہے کہ ہماری دُنیا ایک مرکز اخلاق اور پیشوائے ملت کی بنائی نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں اس قدر جہالت اور اس قدر نخوت، اس قدر خود غرضی، اس قدر ایذا رسانی، اس قدر غصب حقوق، اس قدر ظلم، اس قدر کذب وافترا، اس قدر برائیاں، بداخلاقیاں اور احکام شریعت سے اس قدر لا پروائی موجود ہے۔ حسینؑ کے اس قدر ایثار اور قربانی کا ماحصل صرف یہ ہونا چاہیے۔ کہ ہم ایک جگہ جمع ہو کر حقہ پئیں۔ کچھ شیرینی بانٹ دیں۔ اشعار رزم و بزم کا لطف اُٹھائیں۔ کچھ ذاکرین کے مخصوص انداز دیکھ لیں۔ ذاکر فاتحانہ انداز سے دائیں بائیں دیکھیں۔ اور لوگ اپنے ایثار پر ناز کریں۔ کہ ہم نے کچھ وقت اس مشغلہ میں صرف کر دیا۔ ایسا خیال حسین علیہ السلام پر اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہے۔ جو کربلا میں واقع ہوا۔ حسینؑ کی شہادت احقاق حق اور ابطال باطل کے واسطے ہے۔ حسین علیہ السلام نے ملت اسلام کے جہاز کی اس وقت ناخدائی کی جب وہ فسق وارتداد کے طوفانی جھونکوں سے ڈگمگا رہا تھا۔ حسینؑ نے اسلام کا عملی مثالیہ بن کر ہم کو ایثار اور علوئے نفس، استقلال، تسلیم ورضا، صبر، حمایت حق، صیانت شریعت، خلق وکرم، ہمدردی، رحم اور ادائے فرض کی تعلیم دی، مگر یہ تو بتایئے۔ کہ ہم میں کتنے ایسے ہیں۔ جو مذکورہ بالا صفات واحکام پر عمل کرتے ہوں۔

صرف فرائض ہی کو لیجیے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جمعہ جماعت تلاوت قرآن ہم میں کس قدر ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ حافظ قرآن ہونا تو درکنار قاری قرآن بھی بہت کم ملیں گے۔ نماز باجماعت اور نماز جمعہ سے تو غرض ہی کیا۔ عتبات عالیہ کی زیارات کو اگر سو جائیں گے تو حج کو پانچ بھی نہیں۔ امام باڑوں کی عمارتیں عالی شان ہیں۔ ہزاروں روپیہ کا شیشہ، آلات وغیرہ موجود ہیں مگر مساجد ویران پڑی ہیں۔ اول تو مسجد میں نماز کی پابندی ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو کسی وقت ایک نماز پڑھ گیا۔ کسی وقت دو آ گئے۔ کسی وقت چار مجالس کی ترتیب، روشنی اور تکلفات کی افراط، ذاکرین کی خدمت اور شیرینی کی تقسیم پر دل و جان سے روپیہ صرف کرنے کو تیار ہیں مگر زکوٰۃ و صدقات سے سروکار ہی نہیں۔ ایسی حالت میں ان کا ادعائے پیروی حسینؑ اس شخص سے بلند درجہ پر نہیں جو مسلمان ہی نہ ہو۔

کوئی شخص صرف آنسوؤں کے چند قطروں یا منہ بسور دینے سے وہ بڑا انعام نہیں حاصل کر سکتا۔ جسے جنت کہتے ہیں۔ نہ بہشت اور دائمی نجات کے پٹے ایسے ارزاں پڑے بکتے ہیں جو اس طرح رائیگاں اور مفت ہاتھ آ جائیں۔ ہمارا مسئلہ شفاعت مسیحیوں کی طرح عجیب و غریب نہیں ہے۔ کہ گناہوں کی گٹھڑی خدا کے بیٹے کے حوالے کر دینا کافی ہے۔ اور پھر خلیع العذار ہو کر جو چاہیں کریں۔ کوئی باز پرس کرنے والا ہی نہیں۔ قرآن مجید صاف لفظوں میں فرماتا ہے: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾۔

ہم پر طاعات اسی طرح فرض ہیں جس طرح خدا اور اس کے رسول کا حکم اگر ہم ان سے جاہل و غافل اور لاپروا ہیں۔ تو ہمارا دعویٰ محبت حسینؑ محض دروغ اور سراسر کذب ہے۔ حسینؑ کے مصائب تو انہیں طاعات کے قائم کرنے کے لیے تھے۔ اگر طاعات و فرائض کی بجا آوری میں تساہل و لاپرواہی خدا اور اس کے رسولؐ سے عدول حکمی اور سرکشی کی جائے تو یہ رونا کیا فائدہ رساں ہو سکتا ہے اور جب حسینؑ اور ان کے نانا کا تتبع نہیں کرتے اور حسینؑ اور ان کے اوامر کی ہمارے دلوں میں کچھ وقعت نہیں تو ہم مسلمان، مومن اور محب حسینؑ کہلائے جانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں۔ صرف حالات و مصائب سن کر رو دینا کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ وہ کسی انسان کی مصیبت سن کر متاثر ہو جائے اس لیے ایک غیر مسلم بھی ہماری طرح رو دیتا ہے۔ حسینؑ پر ہی کیا موقوف ہے کسی کے مصائب کیوں نہ ہوں۔ یا ایک گھڑا ہوا قصہ ہی کیوں نہ ہو۔ محض رو دینا کافی نہیں ہے۔ جب تک حسینؑ کی شرافت اعمال اور غرض شہادت کے سمجھنے کے قابل نہ ہوں۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے آنسوؤں کے پیچھے آپ کا درجہ ہمدردی و اثر کیا ہے۔ آپ کتنے عامل فرائض مستقل مزاج، کریم النفس، رحیم، ہمدرد، سخی، شجاع اور پابند صوم و صلوات ہیں۔ مصیبتوں کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں؟ اور آپ میں غیرت کتنی ہے۔" (مجاہد اعظم)

تیسواں باب

امام حسین علیہ السلام کا مقام اور کام

مفکرین عالم کی نظر میں

قبل ازیں کئی بار اس حقیقت کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ کسی کام کی اہمیت وعظمت کا اندازہ اس کی غرض وغایت کی بلندی اور اس کی افادیت کی وسعتوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس کام کی علت غائی جس قدر بلند و پاکیزہ ہوگی اور اس کی افادیت میں جس قدر وسعت وپہنائی ہوگی۔ اسی قدر وہ کارنامہ عظیم متصور ہوگا۔ بنابریں اُصول یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ واقعہ ہائلہ کربلا اپنی غرض وغایت کی بلندی اور افادیت کی ہمہ گیر وسعتوں کے اعتبار سے اس کارخانہ ''ہست و بود'' میں عدیم النظیر نظر آتا ہے اور اُس نے ہمیشہ ہر دور میں مفکرین عالم کو اپنی اہمیت وعظمت کا اقرار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اور دنیا کے اکابرین ومفکرین نے بلاتفریق مذہب وملت اس شہید عالم انسانیت کی خدمت میں عقیدت وارادت کے قیمتی پھول نچھاور کیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سانحۂ عظمیٰ کو کسی قسم کے جغرافیائی اور نسلی حدود میں مقید نہیں کیا جاسکتا اور نہ امام کی ذات کو صرف اُمت مسلمہ کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنا تکبر اور کوتاہ اندیشی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ حسینؑ کو شہید ہوئے قریباً ساڑھے تیرہ سو برس ہونے کو ہیں مگر ان کا نام وکام آج تک برابر زندہ و تابندہ ہے۔ ہر قوم وملت کے لوگ آپؑ کا ذکر سنتے، اشک غم بہاتے اور ان کی عظمت کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ان کے تذکرے نہ ہوں۔ کوئی قابل ذکر زبان نہیں جس میں ان کے مرثیے اور ان کے عظیم کارناموں پر تبصرے نہ ہوئے ہوں۔ اور دنیا کا کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں ہر سال ان کی یادگار نہ منائی جاتی ہو۔ اور ان کے غم میں عملی مظاہرے نہ ہوتے ہوں۔ جب ان لوگوں کی طویل فہرست پر نگاہ ڈالی جاتی ہے جنہوں نے سرکار سید الشہداؑ کی بارگاہِ معلّیٰ میں اپنی عقیدت کے موتی نثار کیے ہیں تو ان میں کچھ نام ایسے لوگوں کے بھی نظر آتے ہیں جو خدا کو خدا نہیں مانتے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسولؐ نہیں جانتے۔ اور روز حشر ونشر پر ایمان نہیں رکھتے۔ جس سے شاعر کے اس بیان کی حرف بحرف تائید مزید ہو جاتی ہے کہ ؎

تو اپنے خون پاک کے چھینٹوں سے اے حسینؑ	انسان کی شرافت خفتہ جگا گیا
اسلام کی کشش کا نہ جن پر اثر ہوا	تو درد بن کے ان کے دلوں میں سما گیا

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسینؑ زندہ ہیں۔ ان کی دعوت جاری ہے۔ اور روز بروز ان کا نام روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ

ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

اس کے برخلاف ان کا حریف یزید مر گیا۔ اس کا نام مٹ گیا۔ کوئی شخص حتی کہ کافر بھی اس کا نام پسند نہیں کرتا اور جو لیتا ہے برائی سے یاد کرتا ہے اس کے نام کے ساتھ ہر زبان پر لفظ پلید، یا لعنت اللہ شامل ہے اور نام حسینؑ کے ساتھ ہر زبان پر صلوات اللہ علیہ، ''منضم'' (مجاہد) اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ

نام یزید داخل دشنام ہو گیا

اسی بات سے اس امر کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طرفین میں سے اپنے مقصد میں کون کامیاب ہوا؟ رسالۂ شریفہ ''حسینی دنیا'' میں قریباً قریباً عقیدت و ارادت کے ان تمام ابدار موتیوں کو یک جا جمع کرنے کی سعی جمیل کی گئی ہے۔ جو پہلی صدی ہجری سے لیکر چودہویں صدی کے نصف تک شہید حریت اور قتیل ظلم و جور کی بارگاہ میں پیش کیے گئے اور جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ ہم اسی رسالہ کی وساطت سے بطور نمونہ مشتے از خروارے و دانہ از انبار چند مشاہیر کے گرانقدر آرا کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ جس سے قارئین کرام کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہر عہد اور ہر ملک میں سید الشہداء امامؑ کی اولو العزمی اور ان کے عظیم کارناموں پر غور و فکر کیا گیا ہے۔ اور اس عدیم النظیر واقعہ نے ہمیشہ مفکرین عالم کو متاثر کیا ہے اور ہر شخص نے اس ناپیدا کنار سمندر سے اپنی اپنی عقل و فکر کی بساط کے مطابق اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ اور ہر شخص نے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے امام کی سیرت و شہادت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ جس سے یہ حقیقت بالکل الم نشرح ہو جاتی ہے کہ کربلا کا محیر العقول واقعہ کسی خاص قوم و ملت کی میراث نہیں۔ بلکہ بقول کارلائل: ''تمام عالم انسانیت کی میراث ہے۔''

وضاحت

مخفی نہ رہے کہ اختصار کے پیش نظر ہم نے اس سلسلہ جلیلہ میں مختلف اسلامی مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے اکابرین و مفکرین کے قیمتی آراء کو درج نہیں کیا بلکہ صرف غیر مسلم مفکرین اور وہ بھی سینکڑوں میں سے صرف اقل قلیل کے گلہائے عقیدت اور تحسین و آفرین کے کلمات کے چند اقتباس پیش کیے ہیں۔ ؏

و الفضل ما شهدت به الاعداء

(۱) مہاتما گاندھی سابق صدر انڈیا (بھارت)

''میں اہل ہند کے سامنے کوئی نئی بات پیش نہیں کرتا بلکہ میں نے کربلا کے ہیرو کی زندگی کا بخوبی مطالعہ کیا

ہے اور اس سے مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی اگر نجات ہو سکتی ہے تو ہم کو حسینی اصول پر عمل کرنا چاہیے۔"

(۲) پنڈت جواہر لعل نہرو۔ سابق وزیر اعظم انڈیا

"کربلا کے عدیم المثال ہیرو اور اس کی قربانی کی جو اس ہیرو نے مفاد انسانی کی خاطر پیش کی۔ جذبہ تفاخر کو بلند کرتی ہے (مون لائٹ محرم نمبر ۶۰ء) کا واقعہ امام حسینؑ جرأت و استقلال کی ایک زبردست یادگار ہے جو اب سے تیرہ سو سال قبل رونما ہوا تھا۔ ہر فرقہ ہر قوم اور فرد کو استقلال اور اپنی جرات و ہمت میں اضافہ کی کوشش کرنا چاہیے۔ اور اپنے جذبہ ایثار و قربانی کو عروج و ترقی کی انتہائی منزل پر پہنچانا چاہیے میں بھی اپنی جانب سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔" (سرفراز ۲۰ فروری ۱۹۳۲ء)

(۳) سوامی شنکر آچاریہ جی

اگر حسینؑ نہ ہوتے تو دنیا سے اسلام کا وجود مٹ جاتا۔ اور دنیا ہمیشہ کے لیے خدا پرستی اور نیکیوں سے خالی ہو جاتی۔ میں نے حسینؑ سے بڑھ کر کوئی شہید نہیں دیکھا۔ اور حسینؑ کی شہادت سے زیادہ کسی شہید کی قربانی کا اثر نہیں ہوا۔ (سرفراز لکھنو، ۲۱ فروری، ۱۹۳۹ء)

(۴) سر رادھا کرشن وائس چانسلر ہندو یونیورسٹی بنارس

امام حسینؑ نے اپنی قربانی اور ایثار سے دنیا پر ثابت کر دیا کہ دنیا میں حق و صداقت کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے لیے ہتھیاروں اور فوجوں کی بجائے جانوں کی قربانی پیش کر کے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ انہوں نے دنیا کے سامنے ایک مثال پیش کر دی ہے۔ آج ہم اس بہادر جان فدا کرنے والے اور انسانیت کو زندہ کرنے والے عظیم الشان انسان کی یادگار مناتے وقت اپنے دلوں میں فخر و مباہات کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ امام حسینؑ نے ہمیں بتایا کہ حق و صداقت کے لیے سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ (سرفراز، فروری، ۱۹۳۲ء)

(۵) ہز ہائنس دھیراج مہند بہادر سکھ مہاراجہ آف پٹیالہ

حضرت امام حسین علیہ السلام نے انسان کی خدمت بہادری سے اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے خدمت کا طریقہ بتا دیا ہے۔ اسی لیے لاکھوں روپے خرچ کر کے ہر قوم کے لوگ آپ کی یادگار ہر سال مناتے ہیں۔

(اچھوت اخبار حسینی پنتھ علی گڑھ)

(۶) دستور کیخسرو دھیار کتور پیشوائے اعظم فرقہ پارسی بمبئی

اگر شہداء اعظم کی قربانیاں نہ ہوتیں، دنیائے اخلاق و مذہب و صداقت سے ناآشنا رہتی۔ دنیا ان شہیدوں کی ممنون ہے۔ جنہوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی۔ امام حسینؑ ان شہداء میں سے ہیں جنہوں نے انسانیت کی خدمت

کے لیے جان دی۔ ہم کو ان کی یاد اپنے عمل سے منانا چاہیے۔ اور ان کی قربانیوں سے سبق لینا چاہیے۔

(ہندو قوم و عزاداری)

(۷) مورخ مسٹر واشنگٹن ایرونگ

حضرت حسینؑ اس وقت مدینہ میں تھے جہاں دس گیارہ برس سے اپنے بھائی کے ساتھ کوفہ سے چلے گئے تھے۔ وہ سمجھے کہ میں نے یزید کی باقاعدہ بیعت کر لی تو یقیناً سارا عالم میرے ساتھ بیعت کرلے گا۔ اور تمام ناجائز افعال سنت ہو کر رواج پائیں گے۔ نہایت ایمانداری اور بڑی جوانمردی سے تمام مصیبتوں کے مقابلے میں صاف انکار کر دیا۔ وہ خود انہی کا یہ مقدس خیال تھا کہ جان دو اور یزید اموی کے ہاتھ سے بندگان خدا کا ایمان بچاؤ۔ جب الہام یا خود اپنی حق پسند طبیعت نے فیصلہ کر دیا تو اب زمانے کی کوئی قوت اور دنیا کی کوئی مصیبت ان کو اس ارادہ سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔۔۔ یہاں تک کہ ہزاروں آدمیوں کے مقابلے میں فقط بہتر آدمی ہو گئے۔ جن کی تعداد پوری کرنے کو ایک چھ مہینے کا بچہ بھی تھا۔ یہی لوگ درحقیقت ایک سچے مذہب کا نمونہ تھے محرم کی دسویں ۶۱ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء اس لاجواب لڑائی کی تاریخ ہے۔

نہایت آسانی سے ممکن تھا کہ حضرت امام حسینؑ یزید اموی سے اس کی تمنا کے موافق بیعت کر کے اپنی جان و دل بچا لیتے۔ مگر اس ذمہ داری کے خیال نے جو کہ ہر بہادر کی طبیعت میں ہوتا ہے اس بات کا اثر نہ ہونے دیا۔ اور نہایت سخت مصیبت اور تکلیف پر ایک بے مثل صبر و استقلال کے ساتھ قائم رہنا۔ اولاد کا سامنے قتل ہونا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا مارا جانا۔ زخموں کی تکلیف۔ عرب کی دھوپ۔ پھر اس دھوپ میں زخمی کی پیاس۔ یہ ایسی تکلیفیں نہ تھیں جو سلطنت کے شوق کے سامنے آدمی کو صبر کے ساتھ اپنے ارادے پر قائم رہنے دیتیں۔ (حسینی دنیا ص ۱۸۶)

(۸) مسٹر کارلائل مصنف ہیرو ورشپ

"بہادرانہ کارنامے محض ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں رہتے بلکہ تمام انسانی برادری کی میراث اور ملکیت ہو جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آنے والی نسلوں میں سلسلہ شجاعت اور استقامت باقی رہتا ہے۔ اس لحاظ سے واقعہ شہادت (حسینؑ) پر جس درجہ غور و فکر کیا جائے گا۔ اسی قدر اس کے اعلیٰ اور عمیق مطالب روشن ہو جائیں گے۔ اچھا آؤ، ہم دیکھیں کہ واقعہ کربلا سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے۔ سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ فاتحان کربلا کو خدا کا کامل یقین تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے اس دنیا سے اچھی دنیا دیکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ قومی غیرت و حمیت کا بہترین سبق ملتا ہے۔ جو کسی اور تاریخ سے نہیں ملتا۔ اور ایک نتیجہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ جب دنیا میں مصیبت اور غضب وغیرہ بہت ہو جاتا ہے تو خدا کا قانون قربانی نکلتا ہے۔ اس کے بعد تمام راہیں صاف ہو جاتی ہیں۔" (ہیرو ورشپ)

(۹) ایڈورڈ گبن مورخ و مصنف ڈکلائن اینڈ فال رومن امپائر

''خاندان بنی ہاشم کی سرداری اور رسولؐ اللہ کا متبرک چال چلن ان (حسینؑ) کی شخصیت میں مجتمع تھے۔ یزید کے خلاف ان کو اپنا مقصد پورا کرنے کی آزادی تھی۔ جو کہ دمشق کا ظالم حاکم تھا۔ اور جس کی برائیوں کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور جس کا خطاب (خلافت) انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔۔۔۔۔ یوم قتل کی صبح کو امام حسین علیہ السلام ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر پشت مرکب پر سوار ہوئے۔۔۔۔۔ قریب بمرگ ہیرو ان پر حملہ آور ہوا تو اس (یزید) بہادر سپاہی بھی ہر طرف بھاگ نکلے۔۔۔۔۔ امام حسینؑ کا پُر درد واقعہ ایک دور دراز ملک میں واقع ہوا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو بے رحم و سنگ دل کو بھی ہلا دیتا ہے۔ اگرچہ کوئی کتنا ہی بے رحم ہو مگر حسینؑ کا نام سنتے ہی اس کے دل میں ایک جوش ہمدردی پیدا ہو جائے گا۔ (گبن فی رومن امپائر)

(۱۰) مسٹر جیمس کارکرن مصنف تاریخ چین

دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے۔ لیکن کئی شخص ایسے گذرے ہیں جن کے سامنے رستم کا نام قابل لینے کے نہیں۔ چنانچہ اول درجہ میں حسینؑ بن علی کا مرتبہ بہادری میں ہے کیونکہ میدان کربلا میں ریت پر تشنگی اور گرسنگی میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو۔ اس کے سامنے رستم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ ایک کی دوا دو مثل مشہور ہے اور مبالغہ کی حد بھی ہے جب ہی ایسے حال میں یہ کہا جاتا ہے کہ دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لیکن حسینؑ اور بہتر تن کو آٹھ قسم کے دشمنوں نے تنگ کیا تھا۔ اور اس پر بھی قدم نہ ہٹا۔ چنانچہ چاروں طرف دس ہزار فوج یزید کی تھی جن کے تیروں اور نیزوں کی بوچھاڑ مثل آندھی کے آتی تھی۔ پانچویں دشمن عرب کے دھوپ کے مانند عرب کے دھوپ ہے۔ اور چھٹا دشمن وہ ریگ کا میدان تھا جو آفتاب کی تمازت میں شعلہ زن اور تنور کی خاکستر سے زیادہ پر سوز تھا بلکہ اس کو دریائے قہر کہنا چاہیے۔ جس کے بلبلے بنی فاطمہ کے پاؤں کے آبلے تھے۔ اور دشمن سب سے ظالم بھوک اور پیاس مثل دغا باز ہمراہی کے تھے۔۔۔۔ پس جنہوں نے ایسے معرکہ میں ہزار ہا کافروں کا مقابلہ کیا ہو۔ پس ان پر خاتمہ بہادری کا ہو چکا۔ (تاریخ چین اُردو، ج ۲، باب ۱۶، ۱۸۲۸ء)

(۱۱) ڈاکٹر میسور ماربین جرمنی مورخ سیاست اسلامیہ

ہمارے نزدیک قانون محمدؐ کی حفاظت اور مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کی اشاعت یہ سب کچھ حسینؑ کے قتل ہو جانے سے اور ان واقعات کے پیدا ہو جانے سے ہے۔ ملکی احساس اور ہیجان مذہبی جو تعزیہ داری سے پیدا ہوا۔ کسی قوم میں نظر نہیں آتا۔ تمام اعلیٰ صفات اور پولیٹیکل رزولیوشن کا احساس۔۔۔۔۔ حسینؑ کی عزاداری سے ہو گیا ہے۔ اور جب تک اس عمل کو اپنا ملکہ قرار دیتے رہیں گے۔ پستی اور زبردستی قبول نہ کریں گے۔۔۔۔ حسینؑ اپنے زمانے میں

سیاست میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ارباب دیانات میں سے کسی شخص نے ایسی موثر سیاست اختیار نہیں کی کہ جو آں جنابؑ نے اختیار فرمائی۔ ان کا قصد سلطنت اور ریاست حاصل کرنے کا نہ تھا۔ صاف صاف اپنے ہمراہیوں سے فرماتے جاتے تھے کہ جو جاہ و جلال کی حرص و طمع میں میرے ساتھ جانا چاہتا ہے وہ ہم سے الگ ہو جائے۔ آپ نے بے کسی اور مظلومیت کو اختیار فرمایا۔ حسینؑ کے واقعہ نے تمام وقائع پر برتری حاصل کرلی۔ حسینؑ کا واقعہ عالمانہ اور حکیمانہ اور سیاسی حیثیت کا تھا۔ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ (رسالہ مذکورہ، مترجمہ اُردو)

(۱۲) پروفیسر براؤن مصنف تاریخ ادبیات ایران

''ایسا کوئی متنفس ہے کہ جو درد بھرا دل رکھتا ہو۔ اور پھر حالات کربلا کو پڑھ کر اس کا دل نہ پسیجے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ محرم کی عزاداری کے سلسلہ میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ خواہ شبیہیں دیکھنے سے ہوں یا نوحہ خوانی سے وہ نہایت کھرے اور سچے ہوتے ہیں۔ اور غیر ملکوں اور غیر مسلموں کو بھی ان کے مخلصانہ اور موثر ہونے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ (لٹریری ہسٹری آف پرشیا)

(۱۳) مسٹر والٹیر مشہور فرنچ اہل قلم

کربلا والے حسینؑ کے علاوہ دور تاریخ میں ایسی کوئی ہستی دیکھنے میں نہیں آئی۔ جس نے بنی نوع انسان پر ایسے مافوق الفطرت اثرات چھوڑے ہوں۔ (والٹیر)

(۱۴) جرجی زیدان معروف مسیحی مؤرخ

واقعہ کربلا ایک سانحہ عظیمہ ہے جس کی تاریخ عالم میں نظیر نہیں ملتی (عادہ کربلا) اسی چودہ کے مبارک و مسعود عدد پر اس سلسلہ مبارکہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ ورنہ ؎

سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لیے

بنابریں حقائق امام حسینؑ کے فقید المثال کارنامہ کے متعلق بڑے فخر و انبساط کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ؎

انسانیت کے نام پہ کیا کر گئے حسینؑ
ہر دور کے بلند خیالوں سے پوچھ لو
(قیصرؔ)

حسینیت پائندہ باد

خاتمۃ الکتاب

انقلاب عالم اسلام

یا

نافرجام قاتلانِ حسینؑ کا عبرت ناک انجام

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ شہادت امام کے ساتھ ہی عالم اسلامی میں انقلاب کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ کیونکہ کسی بھی انقلاب کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک قوت احساس اور دوسرا اجرات اظہار۔ اور یہ دونوں چیزیں شہادت حسینؑ کے ساتھ ہی مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور اگر اس کی تصویر ہنوز دھندلی تھی تو کوفہ وشام کے بازاروں اور درباروں میں جناب زینب اُم کلثوم اور فرزند امام مظلومؑ کے فقید المثال خطبوں نے اس میں رنگ بھر دیا تھا۔ ان خطبوں کو سن کر لوگوں کا بے اختیار ہو کر گریہ وبکاء اور داد وفریاد کرنا رائے عامہ کے بیدار ہونے اور انقلاب کے نمودار ہونے کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ جوں جوں عالم اسلامی میں حسینؑ کی خبر شہادت اور ان کے پس ماندگان کی دیار وامصار میں تشہیر کی اطلاع پھیلتی گئی۔ توں توں یزید اور اس کی حکومت کے خلاف غم وغصہ اور نفرت وبیزاری کے جذبات ابھرتے گئے۔ حتی کہ تھوڑے دنوں کے بعد خود یزید کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ باوجود یکہ پہلے شہادت حسینؑ پر اپنی انتہائی شادمانی کا اظہار کر چکا تھا۔ مگر اب پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے اس خونچکاں واقعہ کی ذمہ داری تمام تر ابن زیاد پر ڈالتے ہوئے کہتا تھا۔ خدا لعنت کرے ابن زیاد پر جس نے حسین بن علیؑ کو قتل کر کے مجھے مسلمانوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا کر دیا ہے۔ اور ان کے دلوں میں میری طرف سے نفرت وعداوت کے بیج بوئے ہیں۔ اور سب لوگ مجھ سے بیزار ہونے لگے ہیں۔[1]

جماعت توابین کا تذکرہ

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے انفرادی طور پر تو ہر جگہ حکومت وقت سے اس کے عظیم جرم شنیع کی وجہ سے نفرت وبیزاری کے جذبات پیدا ہو ہی رہے تھے مگر اجتماعی طور پر دو جماعتیں امامؑ کے خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے منظم طریقہ پر اُبھر کر سامنے آئیں۔ اور اس سلسلہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان میں سے ایک ''جماعت توابین''

---

[1] طبری، ج ۷، ص ۲۹۔

کے نام سے مشہور ہے۔ اور دوسری "جماعت مختار" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ہم یہاں بڑے اختصار کے ساتھ ہر دو جماعتوں کے تشکیل پانے اور انتقام خون شہیداں لینے کے سلسلہ میں مساعی جمیلہ بروئے کار لانے کا مستند ماخذ و مصادر سے اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔ تاکہ اس موضوع پر بھی فی الجملہ تبصرہ ہو جانے سے ہماری یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل و مختتم ہو جائے۔ انشاللہ۔

ارباب تاریخ نے لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ کی شہادت انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں ہو چکی تو ان شیعیان کوفہ کے اندر جنہوں نے امام کو نصرت کی یقین دہانی پر مشتمل خطوط لکھے تھے۔ اور پھر نصرت کا حق ادا نہ کر سکے۔ بیداری کی لہر دوڑ گئی اور احساس ندامت اُبھر آیا۔ اور ایک دوسرے کو ملامت کرنا شروع کی۔ اور اس بات کا اعتراف کرنے لگے کہ ہم سے بڑی زبردست خطا سرزد ہوئی ہے۔ اور ہم ننگ و عار کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور پھر یہ تجویز پاس کی کہ اس گناہ عظیم کا کفارہ اور اس ننگ و عار کا ازالہ اس طرح ممکن ہے کہ ہم قاتلان حسینؑ سے امام کے خون ناحق کا بدلہ لیں یا پھر اسی کوشش میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔

سلیمان بن صردؓ کے مکان پر شیعیان علیؑ کا اجتماع

چنانچہ اس سلسلہ میں عام شیعوں نے کوفہ کے سربرآوردہ پانچ شیعیان علیؑ سے رابطہ قائم کیا:

(۱) سلیمان بن صرد خزاعی جو اپنی اپنی قوم میں معزز اور بہت ہی سن رسیدہ بزرگ تھے صحبت رسول کا شرف بھی حاصل تھا۔ وفات رسولؐ کے بعد کوفہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اور امیر المومنین کے ہمرکاب ہو کر جمل و صفین میں داد شجاعت دے چکے تھے۔ مرگ معاویہ کے بعد سب سے پہلے شیعیان کوفہ کا انہی کے مکان پر اجتماع ہوا تھا۔ جس میں جناب امام حسینؑ کو کوفہ تشریف لانے کی دعوت دینے کی تجویز پاس ہوئی تھی۔ اور پھر ان کو مسلسل خطوط لکھے گئے تھے۔ مگر جب امام تشریف لائے تو سوئے اتفاق سے یہ نصرت امام کا فریضہ انجام نہ دے سکے۔

(۲) مسیب بن نجبہ فزاری۔ یہ بزرگ حضرت امیرؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔

(۳) عبداللہ بن وال تیمی۔

(۴) عبداللہ بن سعد بن نفیل ازدی

(۵) رفاعہ بن شداد بجلی۔ یہ ہر سہ حضرات بھی اصحاب حضرت امیرؑ میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔ چنانچہ یہ تمام حضرات مع اور چند منتخب افراد کے سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے۔

اس اجتماع میں مسیب بن نجبہ کی تقریر

سب سے پہلے مسیب بن نجبہ نے ایک پرجوش تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ حمد و ثنا کے بعد کہا۔ ہم بوجہ

طول عمر مختلف آزمائشوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ ہوں جن کے بارے میں خدا فرماتا ہے: کیا میں نے تم کو اس قدر عمر عطا نہیں کی تھی کہ اگر اس میں نصیحت حاصل کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔ اب ہماری عمریں ساٹھ ساٹھ سال سے تجاوز ہو چکی ہیں۔ ہمیں اپنے نفوس کی پاکیزگی پر بہت کچھ گھمنڈ تھا۔ مگر دختر رسولؐ کے فرزند کی نصرت کے ساتھ جب ہماری آزمائش کی گئی تو ہم جھوٹے ثابت ہوئے۔ حالانکہ ہم نے تحریری طور پر ان کی نصرت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر جب وہ قریب تشریف لائے اور ہمارے قریب بڑی مظلومیت کے ساتھ شہید کردئے گئے تو ہم نے مالی اور جانی طور پر ان کی بالکل کوئی نصرت وامداد نہ کی۔ بتاؤ جب ہم خدا اور رسول کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو کیا عذر پیش کریں گے؟ جب ہمارے پاس رسول کا پورا کنبہ شہید کر دیا گیا نہ بخدا ہمارے پاس کوئی عذر نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کے قاتلوں سے انتقام لیں۔ یا اسی سلسلہ میں خود بھی جام مرگ نوش کریں۔ اور کسی ایک کو اپنا امیر مقرر کرلو۔ کیونکہ اس سلسلہ میں ایک امیر کا ہونا ضروری ہے۔

قیادت کے لیے سلیمان کا انتخاب

ان کے بعد رفاعہ بن شداد نے کھڑے ہو کر پرزور الفاظ میں مسیب بن نجبہ کی تقریر کی تائید کی اور آخر میں کہا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ ابن الجزری کے لیے مسیّب ہی نہایت موزوں شخص ہیں۔ اور اگر آپ کا خیال ہو تو سلیمان بن صرد خزاعی کو بھی سردار لشکر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ جو علاوہ شیخ الشیعہ، بہادر اور دیندار ہونے کے صحابی رسولؐ بھی ہیں۔ مسیب نے بھی سلیمان کی قیادت کی تائید کردی۔[1]

سلیمانؓ بن صرد کی تقریر

اس کے بعد سلیمان نے کھڑے ہو کر ایک پرزور تقریر کی جس کا ایک حصہ یہ ہے ہم گردنیں دراز کر کے آل رسولؐ کی تشریف آوری کا انتظار کرتے تھے۔ اور ان کو خطوط لکھ لکھ کر اپنی نصرت وامداد کا یقین دلاتے تھے۔ مگر جب وہ تشریف لائے تو ہم نے سستی و کمزوری کا مظاہرہ کیا یہاں تک کہ ہمارے پاس ہی فرزند رسولؐ بڑی بیدردی کے ساتھ شہید کردئے گئے۔ آواز استغاثہ بلند کی۔ مگر کسی نے لبیک نہ کہی انصاف طلب کیا مگر ان کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا بلکہ فاسقوں کی جماعت نے ان کو اپنے تیروں کا ہدف اور نیزوں کا نشانہ بنا دیا۔ اب اُٹھو کھڑے ہو کر خدا تم پر ناراض ہو چکا ہے۔ اور اس وقت تک اپنے بیوی بچوں کے پاس نہ جائے جب تک خدا کو راضی نہ کرلو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ خدا اس وقت تک راضی نہیں ہوگا جب تک قاتلین امام کو قتل نہ کردو۔ خبردار موت سے نہ ڈرنا۔ کیونکہ جو شخص موت سے

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۳۔ کامل، ج ۴، ص ۳۳۳۔ قمقام، ص ۵۸۳۔

ڈرتا ہے وہ ذلیل وخوار ہوتا ہے تم بنی اسرائیل کی طرح ہوجاؤ۔ جب انہوں نے گوسالہ پرستی کرکے اپنے نفوس پر ظلم و زیادتی کی تو ان کے نبی (حضرت موسیٰ) نے کہا اب تمہاری توبہ اس طرح قبول ہوسکتی ہے کہ اپنے نفوس کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے پر آمادہ ہوجاؤ۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اب تم تلواروں کو تیز کرلو۔ اور نیزوں کو درست کرلو۔ اور جس قدر ہوسکتا ہے جنگ کے لیے سازوسامان جمع کرلو۔ نیز لوگوں کو اس کار خیر میں شمولیت کی دعوت دو تاکہ ہم مناسب وقت پر نکل کھڑے ہوں۔[1]

اس پرزور تقریر کا اثر تھا کہ حاضرین کے خوابیدہ جذبات میں تلاطم پیدا ہوگیا خالد بن سعد بن نفیل نے کھڑے ہوکر کہا۔ خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوجاتا کہ پروردگار میرے گناہ سے صرف اس صورت میں درگذر فرمائے گا اور راضی ہوگا کہ میں اپنے آپ کو قتل کردوں تو یقیناً میں ایسا کرگذرتا (پھر کہا) میں تمام حاضرین کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ مال واسباب ہے۔ سوائے اسلحہ جنگ کے وہ سب میں نے فاسقوں کے ساتھ جہاد کرنے والے مسلمانوں پر وقف کردیا ہے۔ کئی اور افراد نے بھی ایسے ہی پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا۔ سلیمان بن صردؓ نے عبداللہ بن دال کو خزانچی مقرر کرتے ہوئے کہا کہ جو صاحب اس خیر میں حصہ لینا چاہتے ہیں وہ ان کے پاس جمع کرا دیں۔[2]

سلیمان بن صردؓ کی شیعیان علیؑ سے خط وکتابت

اس کے بعد سلیمانؓ نے دوسرے علاقوں کی فضا کو ہموار کرنے کے لیے مختلف اطراف وجوانب میں اسی مطالب پر مشتمل قاصدوں کے ذریعہ خطوط بھیجے چنانچہ مدائن میں سعد بن حذیفہ بن الیمانؓ اور دوسرے شیعیان مدائن کے نام عبداللہ بن مالک طائی کے ہاتھ ایک خط روانہ کیا۔ جس میں شیعیان کوفہ کے ان عزائم کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ان کو بھی دعوت دی کہ وہ اس کار خیر میں ان کی مساعدت کریں۔ جب سعد کو یہ خط پہنچا تو اس نے شیعیان مدائن کو پڑھ کر سنایا چنانچہ سب نے لبیک کہتے ہوئے مدد کرنے پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ سعد نے جواب میں سلیمان بن صردؓ کو وعدۂ نصرت پر مشتمل جواب بھیج دیا۔

اسی طرح سلیمان نے دوسرا خط مثنیٰ بن مخرمہ عبدی کو ظبیان بن عمارۃ تمیمی کے ہاتھ بصرہ روانہ کیا۔ مثنیٰ نے جواب میں سلیمانؓ کو لکھا۔ میں نے آپ کا مکتوب پڑھا اور آپ کے دوسرے دینی بھائیوں کو بھی پڑھایا۔ سب نے

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۵۔ تقام، ص ۵۸۳۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔

[2] اصدق الاخبار، ص ۵۔ تقام، ص ۵۸۳۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔

آپ کی تجویز کی تائید کرتے ہوئے نصرت پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ ہم مقررہ وقت پر حاضر ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔[1]

مرگ یزید سے شیعیان کوفہ میں ہلچل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ شیعیان علیؑ میں خون ناحق کے انتقام لینے کی تحریک تو اسی ۶۱ھ سے شروع ہو چکی تھی۔ جس میں امام حسینؑ شہید ہوئے تھے لیکن اسلحہ جنگ جمع کرنے اور پوشیدہ طور پر رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کافی دن گذر گئے۔ یہاں تک کہ ۶۴ھ ۱۴ ربیع الاول میں یزید ہلاک ہو گیا۔ شہادت امام اور مرگ یزید میں تین سال دو ماہ اور چار دن کا فاصلہ ہے۔[2] جب یزید مر گیا تو ایک بار پھر شیعیان کوفہ سلیمان بن صردؓ کے مکان پر جمع ہوئے اور کہا کہ طلب انتقام اور حق خلافت بحق دار پہنچانے کے لیے یہ بہت مناسب و موزوں وقت ہے۔ یہ طاغی مر گیا ہے۔ اور بنی اُمیہ کی خلافت رو بانحطاط ہے۔ لیکن سلیمان نے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔ تمہارا مقابلہ اکابر کوفہ سے ہے جن کے پاس تمام ظاہری وسائل کی فراوانی ہے۔ مگر تمہاری تعداد مختصر ہے۔ اگر خروج میں جلدی کی گئی تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم مارے جاؤ گے اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی نہیں ہو گے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ لوگوں میں اپنے داعی و مبلغ پھیلا دو۔ ان کو زیادہ سے زیادہ اپنا ہم خیال بناؤ۔ تا کہ تمہاری جمعیت زیادہ ہو جائے چنانچہ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور اسی طریقہ پر عمل درآمد کیا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد اس تحریک سے اتفاق کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔[3]

مرگ یزید کے بعد ابن زیاد کا کردار

ادھر یہ سب کارروائی خفیہ طور پر ہو رہی تھی اور دوسری طرف یہ کیفیت تھی کہ مرگ یزید کے وقت عبداللہ بن زیادہ بصرہ کا گورنر تھا۔ اور کوفہ میں اس کی نیابت میں عمرو بن حریث حاکم تھا۔ جب ابن زیاد کو مرگ یزید اور شام میں اختلاف کی اطلاع ملی تو اس نے اہل بصرہ کو جمع کر کے ان کو اس امر کی اطلاع دی۔ اور ساتھ ہی یزید کی مذمت کرتے ہوئے اپنی بیعت لینے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس وقت تو لوگوں نے بیعت کر لی۔ مگر باہر جا کر دیواروں پر ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ کیا ابن مرجانہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہم ہمیشہ اس کے مطیع و منقاد رہیں گے؟ نیز ابن زیاد نے دو قاصد بیعت لینے کے لیے کوفہ بھی بھیجے۔ جن کو اہل کوفہ نے پتھر مار کر واپس کر دیا۔[4] قاصدوں نے واپس جا کر حقیقت حال سے ابن زیاد کو آگاہ کیا۔ جب اہل بصرہ کو اہل کوفہ کے رویہ کا پتہ چلا تو وہ بھی انکار پر ڈٹ گئے۔ چنانچہ جب ابن زیاد کو

---

1. اصدق الاخبار، ص ۲۔ قمقام، ص ۵۸۴۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔
2. اصدق الاخبار، ص ۲۔ شرح اخذ الثار، مطبوعہ تتمہ عاشر بحار، ص ۴۸۲۔
3. کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔ اصدق، ص ۷۔ قمقام، ص ۵۸۴۔
4. اصدق الاخبار، ص ۷۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۲۰۔

خلافت تو کجا اپنی گورنری کے زوال بلکہ اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق ہو گیا تو پہلے تو بعض روسا بصرہ مسعود بن عمرو کے ہاں پناہ لی اور پھر شام کی طرف بھاگ گیا۔ (کامل، ج ۳، ص ۳۲۳) اہل کوفہ نے عمرو بن حریث کو نکال دیا۔ اور بعض لوگوں نے وقتی طور پر عمر بن سعد کو امیر کوفہ بنانے کا ارادہ کیا مگر قبیلہ ہمدان کی باہمت خواتین آڑے آئیں اور جامع مسجد میں جمع ہو کر داد و فریاد کی کہ قاتل حسینؑ کو امیر کوفہ بنایا جا رہا ہے چنانچہ لوگ رو پڑے اور اس ارادہ سے باز آئے۔[1]

تمام اہل کوفہ کا بیعت ابن زبیر کرنا اور اس کا عبداللہ بن یزید کو گورنر کوفہ مقرر کرنا

اس کے بعد عام اہل کوفہ نے عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لی۔ جس کی وجہ سے ابن زبیر نے عبداللہ بن یزید انصاری کو کوفہ کا گورنر اور ابراہیم بن محمد بن طلحہ کو امیر خراج بنا کر کوفہ بھیجا۔ جو ۲۲ ماہ رمضان ۶۴ھ کو کوفہ پہنچے۔ جب کہ سلیمان بن صرد اور ان کے ساتھی لوگوں کو قاتلان حسینؑ سے انتقام لینے کی دعوت دینے میں مشغول تھے۔[2]

ویسے تو یزید کے عین حیات ابن زبیر بھی قتل حسینؑ کا بدلہ لینے کا ڈھونگ رچا کر لوگوں سے بیعت لیا کرتا تھا اور اہل مدینہ نے بھی یزید کے انہی زہرہ گداز مظالم کی وجہ سے اس کی بیعت توڑ دی تھی۔ جس کے نتیجہ میں انسانیت سوز واقعہ حرہ پیش آیا (جس کی تفصیلات سابقاً حالات یزید میں بیان ہو چکی ہیں) اس لشکر جرار کا قائد مسلم بن عقبہ مری تو مدینہ کی تباہی کے بعد مکہ جاتے ہوئے راستہ میں ہی واصل جہنم ہو گیا تھا۔ اور اس کے قائم مقام حصین بن نمیر نے مکہ جا کر ابن زبیر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ مگر جب اس اثناء میں اس کو مرگ یزید کی اطلاع ملی تو حصار اٹھا کر مدینہ کے راستہ سے مروان بن الحکم وغیرہ بنی امیہ کو ہمراہ لیتا ہوا واپس شام چلا گیا۔ اب بلا مزاحمت اہل حجاز و عراق نے ابن زبیر کی بیعت کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ جب ابن زبیر نے اپنی قیادت کی دکان چمکتی ہوئی دیکھی تو اب انتقام خون شہیدان کربلا کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔[3] صرف یہی نہیں بلکہ اس کا بھائی مصعب بن زبیر (حاکم بصرہ) ان قاتلان سید الشہداء کی آخری جائے پناہ تھا جو کوفہ سے بھاگ کر بصرہ جاتے تھے۔ چنانچہ جب اس نے کوفہ پر چڑھائی کی تو اس کی فوج میں ایسے لوگوں کی کثرت تھی۔ (تاریخ کامل، ج ۳، ص ۳۸۴)

معاویہ بن یزید کی بیعت

اہل شام نے مرگ یزید کے بعد اس کے بیٹے معاویہ کی بیعت کر لی۔ مگر اس نے خلع بیعت کر لیا۔ اور تین ماہ اور بقولے چالیس دن کے بعد وفات پائی۔ مشہور یہ ہے کہ بنی امیہ نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔[4] واللہ العالم۔

---

۱ اصدق الاخبار، ص ۸۔

۲ کامل، ج ۳، ص ۳۳۵۔ قمقام، ص ۵۸۴۔

۳ شرح الثار، ص ۲۸۴۔ اصدق الاخبار، ص ۹۔

۴ اصدق الاخبار، ص ۹۔ کامل، ج ۳، ص ۳۱۹۔

بوقت وفات اس کی عمر اکیس برس اور اٹھارہ دن تھی۔[1]

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مروان بن الحکم بھی چاہتا تھا کہ ابن زبیر کی بیعت کرے مگر ابن زیاد جب شام پہنچ گیا تو اس نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھا بلکہ خود اس کو ادعائے خلافت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ اسی سال ۶۴ھ شام میں مروان کی بیعت کر لی گئی۔[2]

جماعت توابین کی روانگی

اس طرف سلیمان بن صرد ۶۵ھ تک برابر پروگرام کی تیاری میں مشغول رہا اور بالآخر یکم ربیع الثانی ۶۵ھ کی شب کو کوفہ سے نکل کر مقام نخیلہ میں قیام کیا اور اس مقررہ مقام و تاریخ پر سب ہم خیال جمع ہوئے۔ مگر اس وقت یہ حوصلہ شکن صورت حال سامنے آئی کہ جن لوگوں نے نصرت کے وعدے کئے تھے ان کی تعداد تو سولہ اور بقولے اٹھارہ ہزار تھی لیکن جو لوگ وہاں پہنچے وہ بمشکل چار ہزار تھے۔ وہاں قیام کر کے سلیمان نے کوفہ میں اکا دکا اپنے آدمی بھیجے۔ جنہوں نے کوفہ کی جامع مسجد وغیرہ میں یا لثارات الحسینؑ کے نعرہ ہائے حق بلند کئے۔ اس طرح تین دن کی تگ و دو اور انتظار کے بعد صرف ایک ہزار آدمی اور جمع ہوئے۔ اس طرح ان جانبازوں کی کل تعداد پانچ ہزار ہوگئی۔ مسیب بن نجبہ نے کہا جو لوگ خروج کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا مزید انتظار کرنا بے سود ہے۔ اور نہ ہی ایسے لوگوں کی حاضری سودمند ہو سکتی ہے۔ سلیمانؓ نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ اور کوچ سے پہلے اپنی کمان پر ٹیک لگا کر تقریر کی۔ جس میں اس امر کی وضاحت کی کہ ہم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے خروج نہیں کر رہے۔ بلکہ ہمارا مقصد تو صرف خدا کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنا ہے۔ پس جس شخص کا یہی مقصد ہے۔ خدا اس پر زندگی اور موت ہر حال میں رحمت نازل کرے وہ ہمارے ساتھ آئے۔ اور جس کا مقصد مال دنیا حاصل کرنا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی سونا و چاندی نہیں ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ تلواریں کاندھوں پر۔ اور نیزے ہاتھ میں ہیں۔ سلیمان کی یہ تقریر سن کر ہر طرف سے یہی آواز آئی کہ ہم طلب دنیا کے لیے نہیں نکلے بلکہ توبہ کرنے اور فرزند رسولؐ کا بدلہ لینے کیلئے نکلے ہیں۔[3]

---

1. کامل، ج ۳، ص ۳۱۹۔
2. اصدق، ص ۹۔ کامل، ج ۳، ص ۳۲۶۔
3. اصدق الاخبار، ص ۱۱۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۱۔

(**نوٹ**):۔ اسی سال مروان نے اپنے بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کی ولی عہدی کا اعلان کیا اور اسی سال نو ماہ حکومت کرنے کے بعد یکم ماہ رمضان کو اکیاسی برس کی عمر میں مر گیا اور اس کے بعد عبدالملک مسند نشین ہوا۔

(الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۰۶۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۷۔ شرح الثار لابن نما، ص ۲۸۵، مع عاشر بحار)

جب سلیمان بن صرد نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو عبداللہ بن سعد بن نفیل نے کہا کہ جب ہمارا مقصد حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا بدلہ لینا ہے اور عبیداللہ بن زیاد کے سوا باقی سب قاتل کوفہ میں موجود ہیں تو ہمیں یہیں سے ابتداء کرنا چاہیے۔ مگر سلیمان نے یہ کہا کہ جس شخص نے لشکر بھیج بھیج کر ان کو شہید کرایا وہ یہی فاسق ابن مرجانہ ہے۔ ہمیں پہلے اسی سے مقابلہ و مقاتلہ کرنا چاہیے۔ اگر خدا نے اس پر ہمیں غلبہ عطا فرما دیا تو پھر اہل کوفہ کا مقابلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ بلاجنگ اہل کوفہ تمہاری اطاعت کر لیں۔ پھر چن چن کر قاتلین کو قتل کر دینا۔ بالآخر اسی رائے پر اتفاق ہو گیا۔[1]

جماعت توابین سے گورنر کوفہ کی ملاقات

وہاں سے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ عبداللہ بن یزید گورنر کوفہ اور ابراہیم بن محمد امیر خراج نے ان کی طرف قاصد بھیج کر استدعا کی کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہمارا انتظار کرو۔ سلیمان نے رفاعہ بن شداد کو حکم دیا کہ تم اپنے لشکر کو مرتب کرو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سلیمان اپنے اکابر اصحاب کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں عبداللہ بن یزید اور ابراہیم بن محمد بھی چند اشراف کوفہ کی معیت میں پہنچ گئے۔ موصوفین نے سلیمان کو مشورہ دیا کہ ابن زیاد کے ساتھ جنگ کرنے میں جلدی نہ کریں بلکہ یہیں قیام کریں۔ ہاں جب ان کو ابن زیاد کے ان کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملے تو پھر پیشقدمی کریں۔ مزید برآں انہوں نے یہ کہا کہ ان کی اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ مسترد کر دیا کہ ہم مال و دولت جمع کرنے کی خاطر خروج نہیں کر رہے۔

دوسرے یہ کہ اگر آپ قیام کریں تو عندالضرورت آپ کو لشکر بھی دیا جائے گا۔ مگر سلیمان نے ان کی یہ پیش کش بھی قبول نہ کی اور مزید توقف کو درست نہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھنے میں مصلحت دیکھی۔[2] مگر انہوں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ شیعیان بصرہ و مدائن مقررہ وقت پر نہیں پہنچے۔ چنانچہ بعض حضرات نے ان کی ملامت کرنا شروع کی۔ مگر سلیمان نے یہ کہہ کر ان کو روک دیا کہ ان کی ملامت نہ کرو۔ اگر وہ اس وقت نہیں پہنچ سکے تو زاد راہ کی کمی یا کوئی اور وجہ ہوگی۔ البتہ ان کو جب آپ کی روانگی کی اطلاع ملے گی تو وہ ضرور آ کر آپ کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے۔ اس وقت پھر سلیمان نے ایک تقریر کی جو دنیا میں بے رغبتی پیدا کرنے، آخرت میں رغبت بڑھانے اور جہاد کی فضیلت پر مشتمل تھی۔ بالآخر پانچ ربیع الثانی ۶۵ھ شب جمعہ کو وہاں سے روانہ ہو کر "دیر الاعور" کے مقام پر پہنچ کر رات گذاری۔ کچھ آدمی وہاں رک گئے۔ مگر سلیمان اپنے مخلص اصحاب کے ساتھ ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے برابر آگے بڑھتے گئے اور نہر فرات کے کنارے اقساس بنی مالک کے پاس رات بسر کی۔

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۱۱۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۱۔

[2] اصدق الاخبار، ص ۱۲۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۱۔

جماعت توابین کا کربلا میں ورود

پھر صبح سویرے وہاں سے اٹھ کر کربلا معلیٰ پہنچ گئے۔ ایک شب و روز تک وہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں قبر حسینؑ کی زیارت کی۔ اور اس کے پاس برابر دعا استغفار اور گریہ وبکاء میں مشغول رہے۔ راویان اخبار کا بیان ہے کہ وہاں اس قدر گریہ وبکاء کا کہرام برپا ہوا۔ کہ اس سے زیادہ کبھی رقت خیز منظر نہیں دیکھا گیا تھا۔ ایک شب و روز تک وہاں قیام رہا پھر تمام حضرات قبر حسینؑ سے رخصت ہوئے۔ لوگ اس طرح قبر مبارک پر ٹوٹ رہے تھے جیسے حاجی حجر اسود پر ٹوٹتے ہیں۔ اس وقت ان کے نالہ وشیون کا عجب سماں تھا۔ جذبات بے قابو تھے۔ سب سید الشہداءؑ کی مظلومیت اور اپنی حرمان نصیبی پر اشک بہا رہے تھے۔ سب کے آخر میں سلیمانؓ یہ دعا کرتے ہوئے رخصت ہوئے کہ بار الہا! اگر ہم امامؑ کے ہمرکاب ہو کر شرف شہادت حاصل نہیں کر سکے تو اب ہمیں اس سعادت سے محروم نہ رکھ۔[1]

بالآخر وہاں سے روانہ ہو کر مقام انبار میں پہنچے۔ وہاں پھر عبداللہ بن یزید حاکم کوفہ کا قاصد خط لیکر پہنچا جس میں ان حضرات سے واپس لوٹنے کی استدعا کی گئی تھی۔ سلیمان نے کہا: جب ہم نے مقام نخیلہ میں ان کے مشورہ کو قبول نہیں کیا۔ تو اب دشمن کی سرحد کے قریب پہنچ کر واپس لوٹنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ سلیمان نے جواب میں اس کے اس مشورہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ میرے ہمراہیوں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی جانوں کا سودا کر دیا ہے۔ اس لئے وہ کسی قیمت پر واپس لوٹنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ جب عبداللہ کے پاس یہ مکتوب پہنچا تو اس نے کہا یہ لوگ خود موت کو طلب کر رہے ہیں۔ بخدا یہ لوگ عزت کی موت مارے جائیں گے۔[2]

زفر کلابی سے ملاقات

بعد ازاں سفر کرتے ہوئے مقام ''ہیت'' میں پہنچے۔ پھر وہاں سے چل کر مقام ''قرقیسیا'' میں وارد ہوئے۔ وہاں زفر بن حارث کلابی سے ملاقات ہوئی۔ جس نے پہلے انہیں دشمن تصور کر کے۔ شہر کے دروازے بند کر لیے تھے۔ اور خود قلعہ بند ہو گیا تھا۔ مگر انکشاف حقیقت کے بعد باہم گھل مل گئے۔ اس نے انہیں کافی آزوقہ اور ضروریات خورد و نوش مہیا کر دیں۔ رات وہاں گذاری۔ دوسرے دن صبح وہاں سے آگے بڑھے۔ زفر بغرض مشایعت ان کے ساتھ نکلا۔ اور اس نے سلیمان بن صرد کو بتایا۔ کہ عبیداللہ بن زیاد وغیرہ پانچ سرداران لشکر مقام ''رقہ'' سے افواج کثیرہ لیکر روانہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ یہیں شہر میں داخل ہو کر قیام کریں تاکہ اگر وہ حملہ آور ہوں۔ تو ہم تم اتفاق سے ان کا مقابلہ کریں۔ سلیمانؓ نے کہا خود ہمارے شہر (کوفہ) والوں نے بھی ہم سے یہی مطالبہ کیا تھا جسے ہم نے مسترد کر دیا تھا۔ (مطلب یہ کہ تمہاری یہ پیش کش بھی قبول نہیں ہے)۔

---

[1] اصدق الاخبار ص ۱۲۔ کامل، ج ۳، ص ۳۴۱۔ [2] اصدق الاخبار ص ۱۳۔ کامل، ج ۳، ص ۳۴۲۔

زفر کا مشورہ

جب زفر مایوس ہو گیا تو اس نے دوسرا مشورہ یہ دیا کہ پھر جلد کرو۔ ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے تم مقام ''عین الوردۃ'' جسے ''راس عین'' بھی کہا جاتا ہے پر پہنچ جاؤ اور شہر کو پشت کی جانب قرار دے کر دوسری طرف قیام کرو۔ اس طرح شہر، پانی اور دیگر ضروریات زندگی تمہارے قبضہ میں ہو جائیں گے۔ اور جہاں تک ہمارے تمہارے معاملات کا تعلق ہے میری طرف سے مطمئن رہو۔ میں ہرگز تمہارے خلاف کوئی کاروائی نہیں کروں گا۔ بخدا میں نے تم سے بڑھ کر کوئی شریف جماعت نہیں دیکھی۔ دیکھو جلدی کرو۔ مجھے امید ہے کہ تم ان سے پہلے پہنچ جاؤ گے۔ خیال رکھنا کھلی فضا میں ان کے ساتھ جنگ نہ کرنا۔ ورنہ وہ تمہیں چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر دیں گے۔ کیوں کہ ان کی تعداد تم سے بہت زیادہ ہے۔

جماعت کا مقام عین الوردہ پر قیام

چنانچہ یہ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ دو دو مرحلوں کو ایک ایک مرحلہ میں قطع کرتے ہوئے مقام ''عین الوردۃ'' میں پہنچ گئے۔ اور اس کی غربی جانب رحل اقامت ڈال دیا۔ اور پانچ دن تک استراحت کر کے تھکان سفر دور کی۔ پانچویں دن معلوم ہوا کہ ابن زیاد اہل شام کے علاوہ کثیر والے کو لے رہا ہے اور صرف درمیان میں ایک شب و روز کی مسافت باقی ہے۔

سلیمان کی تقریر اور جنگی ہدایات

اس وقت سلیمان بن صرد نے تقریر کی جس میں دنیا کی بے ثباتی بیان کر کے اور دار آخرت میں رغبت دلانے کے بعد کہا۔ تمہارا وہ دشمن آ پہنچا ہے جس کی طرف تم شب و روز ایک کر کے بڑھ رہے تھے جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو۔ تو اس سے فیصلہ کن جنگ کرو اور شدائد جنگ پر صبر کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کسی زخمی کا کام تمام نہ کرنا۔ اور نہ کسی اسیر کو قتل کرنا ہی جناب امیرؑ کی سیرت تھی۔[1]

اور یہ بھی کہا کہ اگر میں جاں بحق ہو جاؤں تو پھر امیر لشکر مسیب بن نجبہ ہوں گے۔ اگر وہ بھی راہ خدا میں کام آ جائیں تو پھر رئیس لشکر عبداللہ بن سعد بن نفیل ہوں گے۔ اگر وہ بھی جان سپار ہو جائیں۔ تو پھر سردار عبداللہ بن دال ہوں گے۔ اور اگر وہ بھی راہی ملک بقاء ہو جائیں تو پھر قائد رفاعہ بن شداد ہوں گے۔ خدا اس بندہ پر رحم کرے جو اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرے۔[2]

---

1. اصدق الاخبار، ص ۱۶۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۲۔ مقتل ابی مخنف، ص ۵۹۱۔
2. اصدق الاخبار، ص ۱۶۔ مقتل ابی مخنف، ص ۵۹۱۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۲۔

مسیب کی پیشقدمی اور کامیابی

پھر مسیب کو چار سو سوار دے کر آگے بھیج دیا۔ اور اسے حکم دیا کہ اگر مخالف لشکر کے پہلے حصہ سے ملاقات ہو تو اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اگر فتح و نصرت حاصل ہو تو فبہا ورنہ واپس پلٹ آئیں۔ مسیب کو راستہ میں ایک اعرابی ملا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریباً ایک میل کے فاصلہ پر شراحیل بن ذی الکلاع چار ہزار کے دستہ فوج کے ساتھ اور اس کے پیچھے حصین بن نمیر چار ہزار کے ساتھ اس کے پیچھے صلت بن نجبہ غلابی چار ہزار کے ساتھ اور ان سب کے بعد عبیداللہ بن زیاد ایک لشکر جرار لیکر آرہا ہے۔ جس نے مقام رقہ سے ان دستوں کو "مقدمۃ الجیش" کے طور پر آگے بھیج دیا ہے۔ باوجود اس مدہش خبر سننے کے مسیب کے قدم بجائے پیچھے ہٹنے کے اور تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے۔ حتی کہ شامیوں کے پہلے دستہ فوج پر نگاہ پڑی جو بڑے اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مسیبؓ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ ان پر یکبارگی حملہ کردو۔ اس مختصر مگر مستعد اور دلیر دستہ کا حملہ اس قدر سخت تھا کہ شامیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسیب اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں بہت سے شامی مارے گئے۔ اور بہت سے زخمی ہوئے اور ان سے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔ پھر واپس اپنے مرکز کی طرف لوٹ آئے۔[1]

جنگ عین الوردہ کا بیان

جب ابن زیاد کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے حصین بن نمیر کو روانہ کیا۔ اس طرح اہل شام کی کم از کم تعداد بارہ ہزار اور اہل عراق کی پورے پانچ ہزار بھی نہ تھی۔ چنانچہ دونوں لشکر بروز چہار شنبہ ۱۶ اور بقولے ۲۲ جمادی الاولی ۶۵ھ کو ایک دوسرے کے مقابل ڈٹ گئے۔ اہل عراق نے اپنا لشکر اس طرح ترتیب دیا میمنہ پر مسیب بن نجبہ، میسرہ پر عبداللہ بن سعد۔ جناح پر رفاعہ بن شداد افسر اعلی مقرر ہوئے اور امیر لشکر سلیمان بن صرد خزاعی قلب میں کھڑے ہو گئے۔ اور اہل شام نے لشکر اس طرح ترتیب دیا۔ میمنہ پر عبداللہ بن ضحاک فہری کو میسرہ پر ربیعہ بن مخارق غنوی کو۔ جناح پر شراحیل بن ذی الکلاع کو افسر اعلی مقرر کیا۔ اور خود حصین بن نمیر قلب میں کھڑا ہو گیا۔ جب دونوں لشکر باہم قریب آگئے۔ تو اہل شام نے عراقیوں کو عبدالملک بن مروان کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ اور اہل عراق نے شامیوں کو یہ دعوت دی کہ عبدالملک اور آل زبیر کی اطاعت چھوڑ دو۔ بلکہ امر خلافت اس کے صحیح حق داروں یعنی اہل بیت رسولؐ تک پہنچانے میں ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ مگر کسی فریق نے بھی دوسرے کی بات نہ سنی۔ اور اب جنگ ناگزیر ہو گئی۔[2] سلیمان نے اپنے اصحاب کو جنگ و جدال کی بہت کچھ ترغیب و تحریص دلائی۔

۱؎ اصدق الاخبار ص ۱۷۔ تقام ص ۵۹۳۔ کامل ج ۳ ص ۳۳۳۔ ۲؎ اصدق الاخبار ص ۱۹۔ تقام ص ۵۵۳۔ کامل ج ۳ ص ۳۳۳۔

المختصر جنگ شروع ہوگئی۔ سلیمان بن صردؓ کے میمنہ نے حصین بن نمیر کے میسرہ پر اور میسرہ نے میمنہ پر اور خود سلیمان نے قلب پر اس زور کا حملہ کیا کہ اہل شام میدان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر شام تک اکادکا زد و خورد کا سلسلہ جاری رہا مگر میدان بہرحال سلیمان کے ہاتھ رہا۔ دوسرے دن حصین کو آٹھ ہزار تازہ دم فوج کی مزید کمک پہنچ گئی۔

اب ان کی تعداد بارہ ہزار سے بڑھ کر بیس ہزار ہوگئی۔[1] چنانچہ دوسرے روز پھر جنگ شروع ہوئی اور سوائے نماز کے وقت کے سارا دن شام تک جاری رہی۔ اصحاب سلیمان نے باوجود قلیل التعداد ہونے کے بڑی پامردی سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ جب شام کو جنگ بند ہوئی تو معلوم ہوا کہ فریقین کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا ہے اور زخمی بھی کافی ہوئے ہیں۔

جب تیسرے روز اور یہ یوم جمعہ تھا صبح ہوئی۔ تو اہل شام کے پاس ادہم بن محرز باہلی کی ماتحتی میں مزید دس ہزار لشکر پہنچ گیا اسے بھی ابن زیاد نے کمک کے طور پر بھیجا تھا۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی تو چاشت تک تو فریقین میں گھمسان کا رن پڑا۔ مگر اب اہل شام کے ٹڈی دل لشکر نے اس مختصر جماعت توابین کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر سلیمان گھوڑے سے اتر پڑے اور اپنے آدمیوں کو للکار کر کہا: اے اللہ کے بندو! جو شخص توبہ کر کے جلدی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں جانا چاہتا ہے۔ وہ میری طرف آئے یہ کہہ کر تلوار کا میان توڑ دیا۔ اسی طرح ان کے بہت سے ہمراہیوں نے بھی ان کی متابعت کی۔ اور بڑی جگر کاوی اور پامردی کے ساتھ لڑنا شروع کیا یہاں تک کہ اہل شام کے بہت سے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت سلیمان یہ رجز پڑھ رہے تھے

الیک ربی تبت من ذنوبی   وقد علانی فی الوریٰ مشیبتی[2]

و اغفر ذنوبی سیدی و ربی

جب حصین بن نمیر نے شدائد جنگ پر ان کے صبر و ثبات اور شدید حملوں کو دیکھا تو بزدل نے تیر اندازوں کو حکم دیا کہ ان پر تیر برسائے جائیں۔ حکم کا ملنا تھا کہ آگ کے شراروں اور موسلا دھار بارش کے قطروں کی طرح ہر طرف سے تیر آنے لگے۔ چنانچہ اسی اثنا میں جناب سلیمان بن صرد خزاعیؓ یزید بن حصین بن نمیر کے تیر لگنے سے دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف سدھار گئے۔[3] ان کی عمر ترانوے برس تھی۔[4] اس کے بعد علم لشکر مسیب بن نجبہ نے ہاتھ میں لیا۔ اور رجز پڑھتے ہوئے کئی بار بڑے زوردار حملے کئے۔ اور ہر مرتبہ بہت سے شامیوں کو واصل جہنم کیا۔

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۱۸۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔
[2] قمقام، ص ۵۹۲۔
[3] کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔ قمقام، ص ۵۹۳ وغیرہ۔
[4] اصدق الاخبار، ص ۱۹۔

حتیٰ کہ دشمن نے ہر طرف سے حملہ کر کے ان کو گھیر لیا۔ اس طرح وہ بھی بہادرانہ جنگ لڑتے ہوئے عروس موت سے ہمکنار ہو گئے۔ اس کے بعد علم لشکر عبداللہ بن سعد بن نفیل نے سنبھالا۔ اور بڑی جرأت و ہمت سے داد شجاعت دینا شروع کی۔ اسی اثنا میں ان کے پاس تین سوار پہنچے۔ عبداللہ بن فضل الطائی، کثیر بن عمرو المزنی اور سعر بن ابی سعر الحنفی جنہیں سعد بن حذیفہ بن الیمان نے یہ اطلاع دے کر بھیجا تھا کہ وہ ایک سو ستر آدمیوں کا جتھہ لے کر مدائن سے روانہ ہو چکا ہے۔ اور اسی طرح مثنیٰ بن مخرمہ عبدی بھی بصرہ سے تین سو آدمیوں کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے۔ یہ خوش خبری سن کر عبداللہ بن سعد کے ساتھی خوش ہوئے۔ مگر عبداللہ نے کہا یہ خوشی اس وقت تھی کہ یہ لوگ ہماری زندگی میں پہنچتے (جس کی اب امید نہ تھی) جب ان قاصدوں نے صورت حال کی نزاکت کو دیکھا۔ تو وہ بھی اپنے ایمانی بھائیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک ہو گئے۔ اور داد شجاعت دیتے ہوئے راہی ملک بقاء ہوئے۔[1] بقولے کثیر بن عمرو المزنی اس وقت زخمی ہو کر گرا تھا جو بعد میں تندرست ہو گیا[2] بالآخر عبداللہ بن سعد نے بھی فیصلہ کن جنگ لڑتے ہوئے عالم آخرت کی راہ لی۔ اب جناب سلیمان کی ہدایت کے مطابق علم لشکر عبداللہ بن دال نے سنبھالنا تھا مگر وہ دوسری طرف شدید جنگ لڑ رہے تھے۔ اس لیے کچھ دیر کے لیے علم زمین پر گر گیا جب عبداللہ کو صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے علم سنبھال لیا۔ اور بڑی پرجگری کے ساتھ تابڑ توڑ حملے شروع کیے اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں سے بھی کہتے جاتے تھے جو شخص دائمی زند [illegible] چاہتا ہے وہ دل کھول کر ان لوگوں سے جنگ کرے۔ اب عصر کا وقت ہو چکا تھا اور فوج مخالف کی کمان ادھم بن محرز باہلی نے سنبھال لی تھی۔ جو بڑے زوردار حملے کر رہا تھا۔ اس وقت عبداللہ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ انہی حملوں میں اسی ملعون کے ہاتھوں سے عبداللہ بن دال نے بھی سفر آخرت اختیار کیا۔[3] اب حسب وصیت علم لشکر رفاعہ بن شداد کے حوالہ کیا گیا۔ انہوں نے بھی خوب داد شجاعت دی۔ آج شامی چاہتے تھے کہ شام سے قبل ہی اہل عراق کا خاتمہ کر دیا جائے مگر رات کے حائل ہو جانے کی وجہ سے مجبوراً جنگ موقوف کرنا پڑی۔ اب رفاعہ نے یہ سوچا کہ ان کے ہمراہ بالکل تھوڑے سے آدمی رہ گئے ہیں جن کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے اور اور وہ بھی سب صحیح سلامت نہیں بلکہ بہت سے زخمی ہونے کے باعث جنگ کرنے کے قابل نہیں ہیں لہٰذا اب جنگ جاری رکھنے میں کامیابی کی بالکل کوئی اُمید نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے رات کی تاریکی میں اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کو لے کر

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۴۰۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔

[2] اصدق، ص ۴۰۔

[3] قمقام، ص ۵۹۴۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔

مراجعت کی۔ بعض آثار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب کرب بن یزید حمیری کو رفاعہ کے واپسی کے ارادہ کی اطلاع ملی تو اس نے موافقت نہ کی بلکہ اپنی قوم بنی حمیر اور قبیلہ ہمدان کے ایک سو آدمیوں کے ساتھ واپس جانے پر موت کو ترجیح دی۔ چنانچہ راتوں رات اپنے ساتھیوں سمیت فوج مخالف پر ٹوٹ پڑا۔ ابن الکلاع نے ان کو امان کی پیش کش کی مگر انہوں نے جواب میں کہا۔ امن میں تو پہلے ہی زندگی گذار رہے تھے۔ اب تو صرف ہم آخرت کی امان کے طلبگار ہیں چنانچہ زبردست جنگ کرنے کے بعد سب عالم بقا کی طرف سدھار گئے۔ اسی طرح صخر بن حذیفہ ہلال مزنی نے بھی اپنے قبیلہ بنی مزن کے تیس آدمیوں کی معیت میں حیات پر موت کو ترجیح دی اور آخر دم تک لڑتے ہوئے دنیا کے رنج والم سے رہائی پا کر عالم آخرت کے روح، ریحان کی طرف منتقل ہو گئے۔[1] بہرحال جب صبح ہوئی تو حصین بن نمیر نے میدان کو خالی پایا۔ رفاعہ اپنے چند ساتھیوں سمیت واپس جا چکے تھے۔ مگر اس نے تعاقب کرنا ضروری نہ سمجھا۔ واپسی پر ''قرقیسیا'' پہنچ کر زفر کے پاس تین دن تک قیام کیا۔ اس اثنا میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ بعد ازاں وہاں سے بجانب کوفہ روانہ ہوئے سعد بن حذیفہ جب مقام حیف پر پہنچا اور اس کو صورت حال کی اطلاع ملی تو وہ وہیں سے واپس ہو گیا۔ واپسی پر بمقام صندودار پر مثنیٰ بن مخرمہ عبدی سے ملاقات ہوئی۔ اسے بھی تازہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور دونوں حضرات اپنے ہمراہیوں سمیت وہیں رفاعہ کے انتظار میں رک گئے۔ جب رفاعہ بن شداد پہنچے۔ تو انہوں نے ان تباہ حالوں کا گریہ وبکاء سے استقبال کیا۔ دونوں گروہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ایک شب و روز تک وہیں قیام رہا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔[2] ابن زیاد کی فوج نے جناب سلیمان بن صرد کا سر قلم کر کے عبدالملک بن مروان کے پاس شام میں بھیج دیا۔[3] ''اور اس طرح قاتلان حسینؑ سے بدلہ لینے کی یہ پہلی کوشش منزل آخر تک پہنچی''۔[4]

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۲۲۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔

[2] اصدق الاخبار، ص ۲۲۔ الدمعۃ الساکبہ، ص ۳۰۷۔ نفس المہموم، ص ۵۹۶۔ کامل، ج ۳، ص ۳۳۳۔

[3] اصدق الاخبار، ص ۲۳۔

[4] شہید انسانیت، ص ۶۲۵۔

مختارِ آلِ محمدؐ کے قاتلانِ امامؑ سے انتقام لینے کا بیان

سطور بالا میں مجملاً بیان کیا جا چکا ہے کہ سلیمان بن صرو خزاعیؓ کی قیادت میں توابین کی جو جماعت قاتلان امام سے انتقام لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھی وہ کس طرح اور کن وجوہ سے اپنے مقصد میں ناکامی کا شکار ہوئی۔ جس کی سب سے نمایاں وجہ باوجود اپنی تعداد کے قلیل ہونے کے براہ راست بنی امیہ کی حکومت سے ٹکر لینا تھا۔ حالانکہ انفرادی طور پر عام قاتلان حسینؑ کوفہ میں ہی تھے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتبان قضاء قدر نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کو منتخب کیا تھا۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست ⁂ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مختار کے حسب ونسب کا مختصر تعارف

اصل مقصد میں وارد ہونے سے پہلے مختار کے حسب ونسب اور نام وکام کا مختصر سا تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مختار بن ابی عبیدہ قبیلۂ ثقیف کے ایک ممتاز فرد ہیں۔ جو عرب کے شریف قبائل میں سے تھا۔ اور اصل میں طائف کے باشندہ تھے۔ بعد ازاں کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ ان کا شمار کوفہ کے روسا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد ابو عبیدہ کا شمار جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کبار میں ہوتا تھا وہ کئی اسلامی غزوات میں داد شجاعت دے چکے تھے۔ بدور خلیفۂ ثانی ۱۳ھ کو اواخر ماہ شعبان میں عجمیوں سے جنگ کرتے ہوئے کام آئے۔[1]

مختار کی ولادت ۱ھ میں بمقام طائف ہوئی۔ ان کی کنیت ابو اسحاق اور لقب کیسان ہے۔ والد کی شہادت کے وقت ان کی عمر تیرہ برس تھی۔ اور زندگی کی ۶۷ بہاریں دیکھنے کے بعد جاں بحق تسلیم ہوئے۔[2]

مختار کی مدح اور قدح میں روایات کا اختلاف

اگرچہ مختار آل محمد علیہم السلام کے ہمدرد وخیر خواہ ہونے میں مشہور تھے اور ہیں۔ مگر ان کے بارے میں جو اخبار وآثار ہم تک پہنچے ہیں۔ ان میں مختار کی مدح وقدح کے متعلق اس قدر شدید اختلاف ہے کہ غواص بحار اخبار آئمہ اطہار حضرت علامہ مجلسیؒ ایسے عالم خبیر بھی سپر انداز ہو گئے ہیں۔ اور دونوں قسم کی روایات درج کرنے کے بعد

---

[1] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۱۹۹، ۱۹۸۔

[2] فرسان، ج ۲، ص ۱۹۸۔

کوئی حتمی فیصلہ کیے بغیر صاف صاف لکھ دیا ہے: ﴿و انا فی شانہ من المتوقفین و ان کان الاشهر بین اصحابنا انه من المشکورین﴾۔ میں ان کے بارے میں توقف کرنے والوں میں سے ہوں۔ اگرچہ ہمارے علماء میں مشہور یہی ہے کہ وہ مشکورین میں سے ہیں۔[1] جہاں تک ہمارے ذاتی رجحان کا تعلق ہے ہمارا میلان ان کی مدح کی طرف ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جب انتہائی مذمت والی روایات سے بھی بالآخران کا مخلص ہونا ہی ظاہر ہوتا ہے۔[2] تو بعد ازیں سرے سے یہ بحث ہی قلیل الجدوی معلوم ہوتی ہے۔ اتنا تو تاریخی شواہد سے معلوم ہے کہ انہوں نے قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لے کر خاندانِ رسولؐ کو مسرور و شادکام کیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: ﴿ما اکتحلت هاشمیة ولا اختضبت ولا رؤی فی دارها شمی دخان خمس سنین حتی قتل عبید اللہ بن زیاد﴾ جب تک عبید اللہ بن زیاد قتل نہیں ہوا۔ اس وقت تک خاندان بنی ہاشم کی کسی عورت نے نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور نہ خضاب لگایا۔ اور نہ ہی کسی ہاشمی کے گھرانے سے پانچ سال تک دھواں اٹھتا دیکھا گیا۔[3] ایسا ہی جناب فاطمہ بنت علی سے منقول ہے، فرمایا: ﴿ما تحنات امراة منا ولا اجالت فی عینها مرودا ولا امتشطت حتی بعث المختار برأس عبید اللہ بن زیاد﴾ جب تک مختار نے عبید اللہ بن زیاد کا سر نہیں بھیجا۔ اس وقت تک ہماری کسی عورت نے نہ مہندی لگائی۔ نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ اور نہ بالوں میں کنگھی کی۔[4] اسی طرح بعض موارد پر آئمہ اطہار علیہم السلام کا ان کے حق میں دعائے خیر کرنا بھی وارد ہے۔[5] اور یہی امر مختار کی فلاح کے لیے کافی ہے اور بعید نہیں کہ جو غلط باتیں ان کی طرف منسوب ہیں ان میں حکومت بنی اُمیہ اور حکومت ابن زبیر کے پروپیگنڈے کا دخل ہو۔ کیونکہ مختار بیک وقت دونوں حکومتوں کے عتاب کا شکار تھے۔ واللہ العالم

خروج مسلمؑ کے وقت مختار کوفہ سے باہر تھے

جن لوگوں نے کوفہ سے حضرت امام حسینؑ کو بلاوے کے خطوط لکھے تھے اگرچہ ان میں مختار کا کہیں نام نہیں ملتا لیکن کوفہ پہنچ کر امامؑ کے سفیر خاص جناب مسلم بن عقیل نے پہلے مختار کے گھر ہی قیام کیا تھا۔ جیسا کہ اپنے مقام پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے بھی مختار کے ہمدرد اہل بیت ہونے پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ ہاں بعد ازاں ابن زیاد کی آمد سے جب حالات دگرگوں ہوئے اور اس وقت مختار کوفہ سے باہر اپنی ملکیتی بستی میں گئے ہوئے تھے (جس کا نام لقفا تھا)[6] جہاں ان کی جائداد اور باغات تھے۔[7] تب جناب مسلمؑ ہانیؓ کے گھر منتقل ہو گئے۔ اور چونکہ جناب مسلم کا

[1] عاشر بحار، ص ۲۸۰۔
[2] عاشر بحار، ص ۲۸۰۔
[3] اصدق الاخبار، ص ۷۱۔ بحار، ج ۱۰، ص ۲۸۱۔
[4] اصدق الاخبار، ص ۷۱۔
[5] اصدق، ص ۷۱، فرسان، ج ۲، ص ۲۳۰۔
[6] فرسان الہیجاء، ج ۲، ص ۲۰۴۔
[7] اصدق، ص ۲۵۔

خروج جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ جناب ہانی کی گرفتاری کے واقعہ کی وجہ سے اچانک اور قبل از وقت تھا۔ اس لیے مختار ان کے ساتھ شامل نہ ہو سکے۔ ہاں جب ان کو ان کے خروج کی اطلاع ملی تو اپنی قوم وقبیلہ اور اپنے غلاموں کی ایک جمعیت کے ساتھ رات کے وقت کوفہ پہنچے۔ مگر اس وقت جناب مسلم روپوش ہو چکے تھے۔ اور ابن زیاد کے حکم سے عمرو بن حریث نے امان کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا۔ کہ جو اس کے نیچے آ جائے اسے امان مل جائے گی۔ چنانچہ بعض لوگوں کے مشورہ سے مختار اسی جھنڈے کے نیچے چلے گئے۔ اور صبح تک وہیں رہے۔[1]

مختار۔ زندان ابن زیاد میں

مگر چونکہ حاکم وقت کو مختار کی طرف سے کافی شکوک وشبہات تھے۔ لہذا انہیں امان نہ مل سکی۔ اس لیے انہیں صبح زندان میں بھیج دیا گیا۔ بلکہ ابن زیاد نے چھڑی کے ساتھ ان کے منہ پر کچھ ضربیں بھی لگائیں جس سے ان کی ایک آنکھ کو کچھ نقصان بھی پہنچا۔[2] اسی قید میں جناب میثم تمار بھی قید تھے۔ انہوں نے مختار کو بشارت دی کہ ہم عنقریب قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ اور یہ مردود ابن زیاد تمہارے ہاتھوں اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا۔ مختار نے دریافت کیا تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی ہے۔ میثم نے کہا۔ میں نے حضرت امیرؑ سے سنی ہے۔[3] پھر مختار شہادت حسینؑ تک مسلسل ابن زیاد کے زندان میں رہے۔

بعد ازاں مختار نے تمام صورت حال لکھ کر عبداللہ بن عمر کو بھیجی۔ اور ان سے اپنی رہائی کے لیے یزید کے پاس سفارش کی استدعا کی۔ چونکہ مختار کی بہن صفیہ عبداللہ کے گھر تھی۔ جب اسے اپنے بھائی کی قید وبند کی اطلاع ملی تو اس نے باصرار عبداللہ کو سفارش کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے یزید کے نام سفارشی خط لکھا۔ ادھر یزید بھی ایسے سربرآوردہ لوگوں کی (بالخصوص شہادت امامؑ کے بعد) دل شکنی کرنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا اور اب تو چونکہ عبداللہ نے اس کی بیعت بھی کر لی تھی۔ اس لیے بھی اسے اس کی خاطرداری ملحوظ تھی۔ چنانچہ یزید نے ابن زیاد کو تاکیدی حکم نامہ بھیجا کہ یہ میرا مکتوب دیکھتے ہی مختار کو آزاد کر دو۔ چنانچہ ابن زیاد نے مختار کو بلا کر آزاد کر دیا۔ مگر یہ شرط کر لی کہ تین دن کے اندر اندر کوفہ سے نکل جاؤ ورنہ حکومت تمہارے خون کی ذمہ دار نہ ہوگی۔[4] کہا جاتا ہے کہ یہ تمام رسل ورسائل کے لیے جانے اور لے آنے کا کام کوفہ کے ایک معلم عمیر بن عامر نامی شخص نے انجام دیا۔[5] ان تفصیلات کو بوجہ ان

---

[1] اصدق، ص ۲۵، فرسان، ج ۲، ص ۲۰۴۔

[2] اصدق، ص ۲۶، فرسان، ج ۲، ص ۲۰۵۔ کامل، ج ۳، ص ۲۲۷۔

[3] فرسان، ج ۲، ص ۲۰۵۔ اصدق، ص ۲۹۔

[4] اصدق، ص ۲۷، طبری، ج ۷، ص ۵۹۔ تقام، ص ۲۰۲۔ کامل، ج ۳، ص ۲۲۷۔

[5] اخذ الثار ابی مخنف۔

کے ناقابل اعتماد ہونے کے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مختار رہائی کے بعد حجاز میں

چنانچہ رہائی کے تیسرے روز بعد مختار حجاز روانہ ہو گئے۔ وہاں عبداللہ بن زبیر نے امام حسینؑ کے خون ناحق کے انتقام کا بہانہ کر کے لوگوں سے اپنی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ مختار نے چند ایسے شرائط کے ساتھ اس کی بیعت کرنے پر اپنی آمادگی ظاہر کی جن کی بنا پر وہ ابن زبیر کی کامیابی کے بعد قاتلان امامؑ سے انتقام لے سکتے۔[۱] مگر ابن زبیر نے وہ شرائط قبول نہ کیں اس لیے مختار اس کے ہاں سے چلے گئے اور سال بھر طائف میں رہے۔[۲] ایک سال کے بعد ابن زبیر نے لوگوں سے دریافت کیا کہ مختار کہاں ہیں؟ اسے بتایا گیا کہ طائف میں ہیں۔[۳] مختار دوبارہ مکہ پہنچے (بعید نہیں کہ ابن زبیر کے بلانے سے آئے ہوں) اور انہی شرائط پر جو پہلے ابن زبیر نے مسترد کر دی تھیں بیعت کر لی اور برابر پانچ ماہ اور کچھ دن ابن زبیر کے ہمراہ مکہ میں قیام کیا۔[۴] اسی دوران میں اہل مدینہ کے بیعت یزید توڑنے اور یزید کے ان کی سرکوبی کے لیے مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں لشکر جرار بھیجنے اور اس کے مدینہ رسول میں تباہی مچانے کا المیہ پیش آیا۔ جو واقعہ حرہ کے نام سے مشہور ہے اہل مدینہ کی سرکوبی کے بعد مسلم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ کے ساتھ ابن زبیر کے ساتھ نمٹنے کے لیے مکے روانہ ہوا۔ مگر چونکہ اس ملعون کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اس لیے راستہ میں ہی واصل جہنم ہو گیا اب اس کی نیابت میں حصین ابن نمیر نے قیادت سنبھالی اور مکہ مکرمہ میں پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ ابن زبیر خانہ کعبہ میں پناہ گزین تھا اس لیے خانہ خدا پر آگ برسائی گئی۔ اس جنگ میں مختار ابن زبیر کی طرف سے شریک تھے۔ اور تن تنہا کچھ اس طرح داد شجاعت دی کہ شامیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اور بالآخر ان کو پسپا ہونا پڑا۔[۵] اسی اثناء میں حصین کو مرگ یزید کی اطلاع ملی۔ اور وہ محاصرہ اٹھا کر مدینہ سے ہوتا ہوا اور بنی اُمیہ مثل مروان وغیرہ کو ہمراہ لیتا ہوا واپس شام چلا گیا۔[۶] مرگ یزید کے بعد کچھ وقت کے لیے ابن زبیر کے حق میں فضا ساز گار ہو گئی۔ چنانچہ حجاز اور عراق وغیرہ کے اکثر لوگوں نے اس کی بیعت کر لی۔ جوں جوں ابن زبیر کی ظاہری طاقت بڑھتی گئی اس نے انتقام امام کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور اپنی تمام توجہ اپنی سلطنت کے مضبوط کرنے پر صرف کرنے لگا۔ مختار اس سے دل برداشتہ ہو گئے۔[۷] اسی اثناء میں کوفہ کا ایک باشندہ ہانی بن ابی حیۃ الوداعی بغرض عمرہ ماہ

۱۔ تفصیل کے لیے فرسان، ج ۲، ص ۲۱۱ ملاحظہ ہو۔
۲۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۱۱۔
۳۔ اصدق، ص ۴۷۔
۴۔ اصدق، ص ۱۷۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۱۲۔
۵۔ طبری، ج ۷، ص ۲۳۔
۶۔ اصدق، ص ۷۔
۷۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۱۲۔

رمضان میں وارد مکہ ہوا۔ مختار نے اس سے اہل کوفہ کی موجود حالت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ اگرچہ اکثر لوگوں نے ابن زبیر کی بیعت کر لی ہے مگر اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے تا حال کسی کی بیعت نہیں کی۔ اگر ان کو کوئی صحیح قائد مل جائے تو وہ ان کے ذریعہ عراق و حجاز وغیرہ پر حکومت کر سکتا ہے۔ یہ سن کر مختار نے کہا وہ شخص میں ہی ہوں گا۔ جو ان سب کو ایک جھنڈے تلے جمع کرے گا اور ان کے ذریعہ حق کا بولا کر کے باطل کا سرنگوں کرے گا۔[1]

اس کے بعد مختار نے ابن زبیر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتے ہوئے کوفہ کی راہ لی اور بڑی سرعت کے ساتھ منازل سفر طے کرتے ہوئے بروز جمعہ کوفہ کے قریب نہر حیرہ پہنچے۔ وہاں گھوڑے سے اترے۔ غسل کیا۔ تیل لگایا۔ سر پر عمامہ باندھا۔ اور لباس فاخرہ زیب تن کیا۔ ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور گھوڑے پر سوار بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کوفہ میں داخل ہوئے۔ ﴿هو الذی انزل القران و شرع الادیان لا قتلنّ من ازد و عمان و نهد و خولان غضباً لابن بنت نبی الرحمن﴾[2] جس جماعت اور گروہ کے پاس سے گذرتے سلام کرنے کے بعد برابر یہی کہتے جاتے: ﴿ابشروا ما النصر والفلج اتاکم ما تحبون﴾ تمہیں فتح و ظفر کی بشارت ہو۔ تم جو کچھ چاہتے تھے وہ تمہارے پاس پہنچ گیا۔[3] اس وقت کوفہ کی داخلی حالت یہ تھی کہ اہل کوفہ نے عمرو بن حریث کو جو ابن زیاد کا نائب تھا نکال دیا تھا اور اس کی جگہ ابن زبیر نے عبداللہ بن یزید الخطمی الانصاری کو کوفہ کا گورنر بنا دیا تھا جو برابر ابن زبیر کے لیے لوگوں سے بیعت لے رہا تھا اور سلیمان بن صرد خزاعی ایک جماعت کے ساتھ امام کے خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے حکومت شام سے ٹکر لینے کی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔

مختار دوبارہ زندان کوفہ میں

ان حالات میں جب مختار کوفہ میں پہنچے اور اہل کوفہ کو ان کے عزائم کا علم ہوا۔ تو قاتلان امام کو اپنا اندیشہ لاحق ہوا۔ چنانچہ عمر بن سعد۔ شبث بن ربعی۔ یزید بن حارث وغیرہ نے حاکم کوفہ کے کان بھرنے شروع کیے کہ سلیمان بن صرد تو تمہارے دشمن سے ٹکر لینا چاہتے ہیں۔ لیکن مختار کا مقابلہ براہ راست تمہاری حکومت سے ہے۔ اس لیے ان کا معاملہ بہت خطرناک ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے۔ حاکم ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا اور اس نے اچانک مختار کو پکڑ کر زندان میں بھیج دیا۔[4] راویان اخبار کا بیان ہے کہ مختار جن دنوں قید خانہ میں تھے وہاں بھی برابر یہ کہا کرتے تھے:

﴿اما و رب البحار و النخیل و الاشجار و المهامة و القفار و الملائکة الابرار و

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۲۱۲، اصدق، ص ۲۷۔
[2] فرسان، ج ۲، ص ۲۱۲، کامل، ج ۳، ص ۳۲۸۔
[3] فرسان، ج ۲، ص ۲۱۳۔ کامل، ج ۳، ص ۳۲۸۔ اصدق، ص ۲۸۔
[4] اصدق، ص ۲۸۔ طبری، ج ۷، ص ۶۵۔

المصطفين الاخيار ولاقتلن كل جبار بكل لدن خطار و مهند بتار بجموع الانصار ليسوا بميل اغمار ولا بعزل اشرار حتى اقمت عمود الدين و زايلت شعب صدع المسلمين و شفيت غليل صدور المؤمنين و ادركت ثار النبيين لم يكبر عليّ زوال الدنيا ولم احفل بالموت اذا اتى﴾

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ مجھے سمندروں، درختوں، صحراؤں، فرشتوں اور برگزیدگان اخیار کے پروردگار کی قسم میں ان انصار واعون کی جماعتوں کے ساتھ جو نہ ڈرپوک ہیں اور نہ ہی شریر۔ بذریعہ شمشیر وسنان ہر جبار وسرکش کو ضرور قتل کروں گا۔ اور جب میں نے دین کا ستون کھڑا کر دیا۔ مسلمانوں کے رخنہ کو دور کر دیا۔ مومنین کے دلوں کو شفا دے دی۔ اور (خاندان) انبیاء کا انتقام لے لیا تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں کہ میری سلطنت زائل ہو جائے اور مجھے موت آجائے۔[1]

اسی اثناء میں سلیمان بن صرد خزاعی کی جماعت توابین کے چند بچے کھچے آدمی رفاعہ بن شداد کی ہمراہی میں کوفہ واپس پہنچ گئے۔ مختار نے زندان سے ہی ان کے نام ہمدردی کا ایک مکتوب بھیجا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مختار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں اپنے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم زبردستی آکر آپ کو زندان سے نکال دیں۔ مختار ان کے اس ہمت افزا جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور جواب میں کہلا بھیجا اس بات کی ضرورت نہیں "تم مطمئن رہو۔ میں عنقریب رہا ہو جاؤں گا۔"[2]

مختار کی قید سے رہائی

اس کے بعد مختار نے اپنے غلام کو ایک خط دے کر مدینہ میں اپنے بہنوئی عبداللہ بن عمر کے پاس بھیجا اور اس سے استدعا کی کہ چونکہ مجھے بلاوجہ دوبارہ قید کر دیا گیا ہے اس لیے آپ عبداللہ بن یزید انصاری حاکم کوفہ کے نام سفارشی خط لکھیں۔ اُمید ہے کہ اس طرح میں رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ چنانچہ عبداللہ نے فوراً حاکم کوفہ کو مختار کے ساتھ اپنی رشتہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے پرزور الفاظ میں سفارش کی کہ جلد از جلد انہیں رہا کر دیا جائے۔ حاکم کوفہ کے پاس یہ سفارش نامہ پہنچا تو اس نے مختار سے خروج نہ کرنے کے متعلق بہت کچھ عہد و پیمان۔ بلکہ اشراف کوفہ سے دس کفیل لینے کے بعد رہائی کے احکام صادر کیے۔[3] مختار جب کہ ابھی زندان میں تھے ان کی بیعت کا سلسلہ تو اسی وقت شروع ہو گیا مگر رہائی کے بعد تو اس سلسلہ نے مزید شدت اختیار کر لی اور اکابر واشراف کوفہ برابر

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۲۸۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۱۲۔ کامل، ج ۳، ص ۳۲۹۔

[2] فرسان، ج ۲، ص ۲۱۵۔ اصدق، ص ۲۸۔ کامل، ج ۳، ص ۳۵۶۔

[3] فرسان، ج ۲، ص ۲۱۵۔ اصدق، ص ۲۹۔

مختار کے گھر آنے جانے اور ان کی بیعت میں داخل ہونے لگے۔ اور روز بروز ان کی طاقت بڑھنے لگی۔

عبداللہ بن یزید کی بجائے عبداللہ بن مطیع کا تقرر

عبداللہ بن زبیر نے عبداللہ بن یزید گورنر کوفہ وابراہیم بن محمد امیر خراج کی اس نرم روی یا کمزوری سے متاثر ہو کر ان کو معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ بن مطیع کو نیا گورنر مقرر کیا[1] جو کہ پچیس ماہ رمضان کو کوفہ پہنچا[2]

ابراہیم بن مالک اشتر کی شمولیت

یہ درست ہے کہ مختار کے اعوان وانصار کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور بڑے بڑے ممتاز افراد اس تحریک میں شامل ہو رہے تھے۔ مگر مختار چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ابراہیم بن مالک اشتر کو اپنے جماعت میں شامل کرے جو اپنے عظیم باپ کی طرح بہت بہادر و دلیر اور ایک دلآویز و ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ چنانچہ بڑے لطائف الحیل کے ساتھ مختار انہیں اپنی اس تحریک میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے[3] اور اب برابر طرفین سے باہمی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا اور ان کی شمولیت کی وجہ سے اس تحریک میں بہت وزن پیدا ہو گیا۔ جو عجمی لوگ کوفہ میں مقیم تھے۔ بوجہ محبت اہل بیتؑ وہ بھی بہت جلد اس مقدس تحریک میں شامل ہو گئے۔ جن کی تعداد بیس ہزار سے بھی متجاوز تھی[4]

جب عبداللہ بن مطیع کو مختار کی خفیہ سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے ایک جمعیت کو بھیجا کہ مختار کو دربار میں لائیں۔ چنانچہ مختار جانے پر تیار ہو گئے مگر جب ابن مطیع کے ہی بعض آدمیوں کے اشارہ سے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا تو مرض کا بہانہ کر کے حاضر ہونے سے معذرت طلب کی[5] اس طرح اس متوقع آفت سے بال بال بچ گئے۔ جماعت توابین کے برعکس مختار کا خیال یہ تھا کہ انفرادی طور پر چونکہ قاتلان حسینؑ کا مرکز کوفہ ہے اس لیے ان سے یہیں نپٹنا چاہیے۔

عملی اقدام کا ہنگام

بہر حال مختار نے جب فضا سازگار کر لی تو شب پنج شنبہ پندرہ و سولہ ربیع الاول ۶۶ھ کی درمیانی شب عملی اقدام کرنے کے لیے تجویز کی۔ جس مکان میں مختار کی رہائش تھی۔ اس کے اردگرد والے مکانوں میں اپنے بکثرت آدمی جمع کر رکھے تھے لیکن پروگرام سے ایک رات پہلے ایک خاص سبب سے اقدام کرنا پڑ گیا۔ ہوا یوں کہ عبداللہ بن

---

[1] طبری، ج ۷، ص ۹۵۔ اصدق، ص ۳۰۔

[2] کامل، ج ۳، ص ۳۵۷۔

[3] اصدق، ص ۳۲۔ کامل، ج ۲، ص ۳۵۸، ۳۵۹۔

[4] قرسان، ج ۲، ص ۲۱۶۔

[5] قرسان، ج ۲، ص ۲۱۶۔ کامل، ج ۳، ص ۳۵۷۔

مطیع (حاکم کوفہ) کو اس کی خفیہ پولیس کے سربراہ ایاس بن مضارب نے اطلاع دی کہ انہی دوراتوں میں مختار خروج کرنے والے ہیں۔ لہٰذا ان مطیع کے حکم سے کوفہ کے تمام بڑے بڑے شارع عاموں کی ناکہ بندی کردی گئی۔ اور ہر ہر چوک میں فوج کے دستے متعین کردیے گئے۔ شب چہارشنبہ ۱۲ ربیع الاول کو ابراہیم بن الاشتر حسب معمول نماز مغرب کے بعد مختار کے پاس آنا چاہتے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ ابن مطیع نے ناکہ بندی کردی ہے اور شہر کے سب بڑے بڑے شارع عاموں پر فوج کی بھاری جمعیت مقرر کردی ہے۔ چنانچہ ابراہیم نے اپنے جنگ آزمودہ سو آدمی ہمراہ لیے اور ان کو اسلحۂ جنگ سے مسلح کرکے اوپر سے عادی کپڑے پہنا دیے۔ جب وہ اس حال میں روانہ ہوئے تو باب الفیل سے آگے بڑھے ہی تھے کہ راستہ میں ایاس بن مضارب سے مڈبھیڑ ہوگئی جو اپنی پولیس کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔

مختصر سوال و جواب کے بعد ایاس نے ابراہیم کو گرفتار کرکے حاکم وقت کے پاس لے جانا چاہا اور ابراہیم نے اسے راستہ چھوڑنے کے لیے کہا مگر جب اس نے راستہ چھوڑنے سے انکار کیا تو ابراہیم نے اچانک بڑے زور سے نیزہ اس کے حلقوم میں پیوست کردیا جس سے وہ زمین پر گر گیا۔ ابراہیم نے اپنے ایک ہمراہی کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کرلو۔ چنانچہ اس نے بڑھ کر اس کا سر قلم کرلیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر ایاس کے آدمی بھاگ نکلے۔ اور ابراہیم ظفریاب ہو کر مختار کے پاس پہنچ گئے۔ [1] اور صورت حال کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ عملی اقدام کے لیے آنے والی رات تجویز ہوئی تھی مگر تازہ صورت حال کے پیش نظر اسی رات اقدام کر دینا چاہیے۔ مختار ابراہیم کی اس کامیابی کو نیک فال سمجھتے ہوئے خوش ہوئے۔ اور سعید بن منقذ کو حکم دیا کہ سرکلوں (کانوں) کو آگ لگا کر بند کرو۔ اور قدامہ بن مالک و سفیان بن یعلی کو حکم دیا کہ تم اپنا علامتی نعرہ "یا لثارات الحسینؑ" بلند کرو اور عبداللہ بن شداد کو دوسرا علامتی نعرہ "یا منصور امت" کی منادی کرانے کا حکم دیا۔ پھر خود اسلحۂ جنگ سے مسلح ہو کر آمادۂ جنگ ہوگئے۔ [2] اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے پاس قریباً چار ہزار آدمی جمع ہو چکے تھے۔ [3] رات بھر کچھ نہ کچھ زد و خورد کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر ابراہیم جو اس رات مختار سے اجازت لے کر نواحِ کوفہ سے اپنے ہم خیال لوگوں کو ہمراہ لینے کے لیے گئے تھے۔ وہ بھی راستہ میں مار دھاڑ کرتے ہوئے اور جاتے آتے راستہ کی رکاوٹیں دور کرتے ہوئے سالماً غانماً واپس مختار کے پاس پہنچ گئے۔ نماز صبح سے قبل ہی مختار کوفہ سے باہر لشکر کی ترتیب سے فارغ ہو چکے تھے۔ ادھر عبداللہ بن مطیع نے بھی حجار بن ابجر اور شبث بن ربعی وغیرہ کی سرکردگی میں لشکر کثیر مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ مختار و ابراہیم اور ان

---

[1] اصدق، ص ۳۶۔ [2] اصدق، ص ۳۶۔

[3] اصدق، ص ۳۸۔

کے ہمراہیوں نے محیر العقول طور پر داد شجاعت دی اور مخالف کو شکست فاش دی۔ بالآخر عبداللہ بن مطیع قصر الامارہ میں جا کر پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ ادھر مختار نے جا کر دار الامارہ کا محاصرہ کر لیا۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر ابن مطیع نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے راتوں رات وہاں سے نکل کر ابو موسیٰ کے گھر جا کر پناہ لی اور اس کے ساتھیوں نے دروازہ کھول دیا۔ ان لوگوں نے ابراہیم سے امان کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی چنانچہ ان لوگوں نے باہر نکل کر مختار کی بیعت کی۔ مختار دار الامارہ میں داخل ہوئے۔ رات دار الامارہ میں ہی گزاری۔ نماز صبح جامع مسجد میں پڑھائی۔ خطبہ کے بعد عام بیعت کا سلسلہ شروع ہوا جو کتاب خدا، سنت رسولؐ، انتقام خون اہل بیتؑ، حمایت مظلوم اور ردِ ظالم پر لی گئی۔[1] اس کے بعد بیت المال کا دروازہ کھولا گیا۔ اس میں کل نو ہزار درہم ملے جو مختار نے سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے اور جب مختار کو معلوم ہوا کہ ابن مطیع ابو موسیٰ کے گھر میں پنہاں ہے تو بوجہ قدیمی تعلقات اس کی طرف ایک ہزار درہم بھیج دیئے تاکہ اسے گھر جانے میں سہولت ہو۔ چنانچہ وہ یہ رقم لے کر چلا گیا۔

بعد ازاں مختار اپنی حکومت کے استحکام اور اس کے نظم و نسق کو بحال کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ ارمینیا، آذربائیجان، موصل، مدائن، حلوان، رائے، ہمدان اور اصفہان میں اپنے عمال و حکام مقرر کیے۔ اس طرح شام و حجاز اور مصر و بصرہ کے علاوہ دیگر تمام اسلامی علاقہ مختار کے زیر نگیں آ گیا۔[2] مختار نے پولیس کا سربراہ عبداللہ بن کامل شاکری اور محافظ فوج کا سربراہ کیسان ابو عمرہ کو مقرر کیا۔[3]

جیسا کہ جماعت توابین کے تذکرہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مروان نے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد ابن زیاد کو لشکر جرار دے کر جزیرہ میں بعض لوگوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ وہاں سے فارغ ہو کر اہل کوفہ کو ان کی مخالفت کا ذائقہ چکھائے مگر اسے کوفہ پہنچنے کی نوبت نہ مل سکی۔ سب سے پہلے اسے سلیمان بن صرد خزاعی کی جماعت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔ اس اثنا میں مروان مر گیا۔ عبدالملک مسند اقتدار پر بیٹھا۔ اس نے بھی ابن زیاد کو اس کے عہدہ پر بحال رکھا۔ جب ابن زیاد جماعت توابین کے مقابلہ سے فارغ ہوا تو پھر اہل جزیرہ یعنی زفر بن الحارث کلابی اور اس کے ساتھ جو قبیلہ قیس غیلان تھا جو کہ ابن زبیر کی اطاعت میں تھے ان سے ٹھن گئی۔ قریباً سال تک ان سے جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا۔

---

[1] اصدق، ص ۲۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۳۔

[2] اصدق الاخبار، ص ۲۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۳ وغیرہ۔

[3] اصدق، ص ۲۳۔ کامل، ج ۳، ص ۲۶۳۔

موصل میں مختار کے لشکر کا ابن زیاد کے لشکر سے مقابلہ اور کامیابی

بہر حال جب ابن زیاد ایک سال تک لڑنے کے باوجود اہل جزیرہ پر فتح حاصل نہ کر سکا تو اب اس نے تنگ آ کر ان کا مقابلہ ترک کر کے موصل کا رخ کیا جو کہ مختار کے قبضہ میں تھا۔ جب موصل کے حاکم عبدالرحمٰن بن سعید کو ابن زیاد کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ اپنے اندر مقابلہ کی تاب و توانائی نہ پاتے ہوئے تکریت منتقل ہو گیا اور مختار کو صورت حال کی اطلاع دی۔ مختار نے اس کی کمک کے لیے یزید بن انس اسدی کو تین ہزار منتخب شاہسوار دے کر روانہ کیا۔ کوفہ سے باہر نکل کر ان کی مشایعت کی۔ ضروری ہدایات دے کر ان کو روانہ کیا اور بشرط ضرورت مزید کمک دینے کا وعدہ بھی کیا۔[1] یزید منازل سفر طے کرتا ہوا موصل کی سرزمین میں داخل ہوا۔ جب ابن زیاد کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اس کے مقابلہ کے لیے بایں ترتیب چھ ہزار کا لشکر بھیجا کہ تین ہزار ربیعہ غنوی کی سرکردگی میں اور تین ہزار عبداللہ بن جملہ خثعمی کی ماتحتی میں۔ ربیعہ ایک دن پہلے روانہ ہوا۔ اور پہلے پہنچا۔ جب یزید بن انس کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو چونکہ وہ بیمار تھا اسے سپاہی گدھے پر سوار کر کے اور پکڑ کر میدان جنگ میں لائے۔ میدان میں پہنچ کر اپنے فوجیوں کو جنگ کی ترغیب و تحریص دلائی اور پھر وہیں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور کہا اب تمہاری مرضی ہے کہ اپنے امیر کے حکم سے لڑو اور اس کی حفاظت کرو۔ یا اسی حالت میں اسے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ جب مقابلہ شروع ہوا تو عراقی بڑے بے جگری سے لڑے۔ یہ نو ذی الحجہ بروز عرفہ ۶۶ھ کی صبح کا واقعہ ہے۔ چاشت تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اہل شام کو شکست فاش ہوئی۔ وہ میدان سے بھاگ نکلے اور سردار لشکر ربیعہ مارا گیا۔ جب شامی بھاگ کر واپس جا رہے تھے تو راستہ میں عبداللہ خثعمی سے ملاقات ہوئی۔ جو تین ہزار کا تازہ دم لشکر لے کر آ رہا تھا وہ ان بھگوڑوں کو ہمراہ لے کر واپس پہنچا۔ شب عید گزارنے کے بعد بروز عید الاضحیٰ نماز صبح کے بعد پھر بڑا سخت رن پڑا جو نماز ظہر تک جاری رہا۔ فریقین نے نماز ظہر پڑھی اور پھر میدان کارزار گرم ہو گیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اہل شام نے میدان سے فرار اختیار کیا۔ لشکر شام کا سردار عبداللہ مارا گیا۔ تین سو شامی قید کیے گئے جو بعد میں یزید بن انس کے حکم سے قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد خود یزید بن انس کا بھی طبعی موت سے انتقال ہو گیا۔ ورقہ بن عازب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر ان کو اعزاز و احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔[2]

یزید بن انس نے اپنی موت سے پہلے ورقاء بن عازب کو اپنا نائب نامزد کر دیا تھا۔ ورقاء کو اطلاع ملی کہ ابن زیاد اسی ہزار کا لشکر جرار لے کر اس طرف کا رخ کر رہا ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ہم اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ واپس چلیں۔ دشمن یہی سمجھے گا کہ ہم اپنے سردار کی موت کی وجہ سے واپس جا

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۳۶۴۔ اصدق، ص ۱۳۵۔

[2] اصدق الاخبار، ص ۳۹۔ کامل، ج ۳، ص ۳۶۵۔

رہے ہیں۔ نہ اس سے ڈر کر۔ ہمراہیوں نے بھی اس کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے۔ جب مختار کو تازہ صورت حال کی اطلاع ملی تو انہوں نے ابراہیم بن مالک اشتر کو ایک لشکر جرار دے کر ابن زیاد کے مقابلے کے لیے روانہ کیا اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ جب راستہ میں کہیں یزید بن انس والا لشکر مل جائے تو تم اس کے بھی سردار ہو کر ان کو بھی اپنی فوج میں شامل کر لینا۔[1]

کوفہ کے بعض شر پسند عناصر کی شورش

قاتلان امامؑ میں سے جو سر برآوردہ لوگ کوفہ میں تھے وہ مختار سے خائف و ترساں تو تھے ہی۔ چنانچہ شبث بن ربعی، محمد بن اشعث اور شمر وغیرہ نے جب دیکھا کہ اس وقت مختار کے پاس بالکل تھوڑا سا لشکر ہے تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ لشکر مختار نے دفع الوقتی کے طور پر معمولی مقابلہ جاری رکھا اور کسی معتمد آدمی کے ذریعہ ابراہیم کو صورت حال کی اطلاع دیتے ہوئے پیغام بھیجا کہ فوراً اپنے لشکر سمیت کوفہ پہنچو۔ اس وقت ابراہیم مقام حمام اعین سے روانہ ہو کر مقام ساباط میں پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ جب ابراہیم کو اس نازک صورت حال کی اطلاع ملی تو وہ لشکر لے کر اچانک صاعقہ شرر بار کی طرح اہل کوفہ پر آ گرا اور جو لوگ مختار سے برسر پیکار تھے ان کو شکست فاش دے کر پانچ سو آدمی قید کر کے مختار کے پاس لایا۔ مختار نے حکم دیا کہ مجھے بتاتے جاؤ کہ ان میں سے کون کون سے لوگ قتل امامؑ میں شریک تھے؟ ان کے علاوہ باقی کو چھوڑ دو۔ چنانچہ ان میں سے دو سو اڑتالیس آدمی تہ تیغ کر دیے گئے اور دوسروں کو کسی قسم کی شورش اور ہنگامہ آرائی نہ کرنے کا عہد و پیمان لے کر چھوڑ دیا۔

تکمیل مقصد کا ہنگام آ گیا

اب قدرت قاتلان امامؑ کو مزید ڈھیل نہیں دینا چاہتی تھی۔ ان کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانے کا وقت آ گیا تھا۔ مختار نے اعلان کرایا کہ جو شخص بھی اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا اسے امان ہے سوائے ان لوگوں کے جو قتل امامؑ میں شریک ہو چکے ہیں۔[2]

قاتلان حسینؑ کے گھروں کا ڈھایا جانا

بعد ازاں مختار نے پولیس کے افسر اعلیٰ ابو عمرہ کو حکم دیا کہ ایک ہزار بیلچہ دار مزدور ہمراہ لے کر کوفہ میں گشت کرو اور جن جن لوگوں نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ میں شرکت کی ہے ان کے مکانات مسمار کر دو۔ چنانچہ ابو عمرہ نے ایسا ہی کیا اور بہت سے لوگوں کے مکانات منہدم کروا دیے اور ان کے اموال اپنے اہل عجم لشکریوں میں تقسیم کرا

---

[1] اصدق الاخبار، ص ۴۷۔ کامل، ج ۳، ص ۳۶۵۔

[2] اصدق، ص ۴۹۔ کامل، ج ۳، ص ۳۶۸۔

[2] اصدق، ص ۴۹۔ کامل، ج ۳، ص ۳۶۸۔

دیئے۔ اور اس اثنا میں سے قاتلین حسینؑ میں سے جو شخص گھر میں ملا اسے فوراً واصل جہنم کر دیا۔[1]

سید الشہداءؑ کی لاش مقدس پامال کرنے والوں کا قتل

قاتلین سید الشہداءؑ میں سے جنہیں مختار نے سب سے پہلے قتل کیا وہ دس نفر تھے جنہوں نے بعد از شہادت جناب سید الشہداءؑ کے بدن مقدس پر گھوڑے دوڑائے تھے۔ مختار نے ان کو پشتوں کے بل لٹا دیا۔ اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں لوہے کی میخیں گاڑ کر اور پر گھوڑے دوڑائے پھر ان کے نجس بدنوں کو نذر آتش کر دیا۔[2]

عمرو بن الحجاج زبیدی کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جو نہر فرات پر متعین شدہ فوج کا افسر تھا۔ جس کی شدت گرفت کی وجہ سے ساقی حوض کوثر کا کنبہ دریائے فرات کے کنارے العطش العطش کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا۔ اس ملعون کے قتل کی کیفیت میں قدرے اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ بجانب ''واقصہ'' روانہ ہوا۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں گیا؟ بعض نے کہا ہے کہ مختار کے آدمی اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے پاس اس وقت پہنچے جب کہ وہ شدت پیاس سے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا۔ انہوں نے اس کا سر قلم کر لیا اور لے جا کر مختار کے سامنے پیش کیا۔[3] اور بعض نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس ملعون نے اندیشۂ قتل کے ماتحت بصرہ کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ راستہ میں اہل شراف کے ہاں پناہ گزین ہونا چاہا مگر ان لوگوں نے مختار کے خوف سے پناہ نہ دی۔ مایوس ہو کر چلا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ان لوگوں نے اسے پناہ نہ دینے پر افسوس کیا۔ اور چند آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے پیچھے دوڑے کہ اسے واپس لائیں۔ جب عمرو نے ان کو اس طرح آتے دیکھا تو اس نے یہ خیال کیا کہ یہ مختار کے آدمی ہیں اس لیے بنی کلب و طئے کے شہروں کے درمیان بمقام بیضہ ریتلی جگہ پر عین شدت گرما کے وقت گھوڑا ڈال دیا۔ اور بالآخر پیاس کے غلبہ سے روح داروغۂ جہنم کے حوالہ کر دی اس طرح خدا نے اسے پیاسا ہلاک کیا۔ و لعذاب الآخرۃ اشد و ابقی۔[4]

خولی بن یزید اصبحی کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جو کربلا سے سید الشہداءؑ کا سر اقدس کوفہ لایا تھا۔ اور رات اپنے گھر تنور میں یا بروایتے طشت رخت شوئی کے نیچے رکھا تھا۔ جب اس کی زوجہ نوار (کامل، ج ۳، ص ۳۷۰ اور قمقام، ص ۹۲۶ پر اس کا نام عیوف بنت مالک لکھا ہے) کو جو خاندان نبوتؐ سے محبت رکھتی تھی پتہ چلا تو اس نے اس شقی کو زجر و توبیخ کرتے

---

[1] قمقام، ج ۲، ص ۲۳۰۔ اصدق الاخبار، ص ۵۰۔

[2] اصدق، ص ۵۰۔

[3] کامل، ج ۳، ص ۳۶۸۔

[4] صدوق، ص ۵۰۔ قمقام، ج ۲، ص ۲۳۱۔

ہوئے کہا کہ لوگ مال وزر لائے ہیں اور تم فرزند رسولؐ کا سر لائے ہو؟ پھر عہد کیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ایک چھت کے نیچے جمع نہیں ہوں گی۔ بہر حال جب مختار کے آدمی اس کی طلب میں اس کے گھر پہنچے تو یہ بدبخت بیت الخلاء میں ایک ٹوکری کے نیچے چھپ گیا۔ جب ان آدمیوں نے ''نوار'' سے دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے؟ تو اس نے زبان سے تو یہ کہا کہ مجھے معلوم نہیں مگر ہاتھ سے بیت الخلاء کی طرف اشارہ کر دیا۔ چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر مختار کے پاس لے جایا جا رہا تھا کہ راستہ میں مختار سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ اسے اپنے گھر کے سامنے لے جا کر قتل کر دو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت مختار بھی موجود تھے۔ انہی کے حکم سے قتل کے بعد اس کی نجس لاش کو نذر آتش کیا گیا۔ اور اس وقت مختار نے وہاں سے اس وقت حرکت کی جب وہ جل کر خاکستر ہوگئی [1] خسر الدنیا و الآخرۃ۔

حکیم بن طفیل کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس نے جناب ابوالفضلؑ کی شہادت کے بعد ان کا لباس اتارا تھا اور جناب سید الشہداء علیہ السلام کو تیر مارا تھا۔ مختار نے عبداللہ بن کامل کو ایک جماعت کے ساتھ اس کی گرفتاری کے لیے بھیجا چنانچہ انہوں نے جا کر اسے گرفتار کر لیا۔ اس کی عورت عدی بن حاتم کے پاس چلی گئی تاکہ ان سے مختار کے پاس اپنے شوہر کی سفارش کی استدعا کرے۔ جب ابن کامل کو اس امر کی اطلاع ملی تو محض اس اندیشہ سے کہ مبادا عدی اس کی سفارش کریں اس نے راستہ ہی میں اس ملعون کا کام اس طرح تمام کر دیا کہ ان کے کپڑے اتروا کر اس پر اس قدر تیر برسائے کہ اس کا بدن چھلنی ہوگیا اور بالآخر اس طرح جہنم رسید ہوا۔[2]

مالک بن نسر (بسر) جہنی اور اس کے دو ساتھیوں کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس نے روز عاشوراء جناب سید الشہداءؑ کے حق میں بعض نازیبا کلمات استعمال کیے تھے اور آپ کے فرق اقدس پر تلوار کا ایسا وار کیا تھا جس سے آنجنابؑ کا سر شگافتہ ہوگیا اور جب آپ کی وہ ٹوپی جو آپ نے زیر عمامہ پہنی ہوئی تھی خون سے تر ہوگئی تھی تو جناب نے اتار کر پھینک دی تھی جسے یہ شقی اٹھا کر گھر لے گیا تھا۔ بہر حال مختار کو اطلاع دی گئی کہ یہ شقی عبداللہ بن اسید جہنی اور حمل بن مالک محاربی (جو کہ جناب مظلوم کربلا کے قتل میں شریک تھے) سمیت قادسیہ میں قیام پذیر ہے مختار نے مالک بن عمرو نہدی کو جو کہ آپ کے اصحاب کبار میں سے تھا۔ ایک جماعت کے ساتھ ان کی گرفتاری کے لیے قادسیہ بھیجا۔ چنانچہ وہ انہیں گرفتار کر کے عشاء کے وقت مختار کے پاس لائے! مختار نے ان سے کہا۔ اے خدا و رسول، کتاب اور اہل بیت رسول کے دشمنو! تمہیں شرم نہ آئی کہ ان لوگوں کو

---

[1] اصدق، ص ۵۱۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۲۲۔ کامل، ج ۳، ص ۳۷۰۔

[2] فرسان، ج ۲، ص ۲۲۲۔ اصدق، ص ۵۱۔ کامل، ج ۳، ص ۳۷۱۔

شہید کیا جن پر نماز میں درود و سلام بھیجنے کا حکم ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا: ہم پر احسان کر کے چھوڑ دو کیونکہ ہمیں مجبور کر کے ان کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مختار نے کہا: تم نے حسینؑ پر کیوں احسان نہ کیا تھا؟ پھر مالک بن نسر کو خطاب کر کے کہا: کیا تم وہی شخص ہو جس نے امام حسینؑ کے فرق اقدس پر تلوار ماری تھی۔ اور ان کی ٹوپی لے گیا تھا؟ بعض حاضرین نے کہا: ہاں ہاں یہ وہی ہے! پھر مختار نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا یہاں تک کہ وہ ملعون تڑپ تڑپ کر واصل جہنم ہو گیا اس کے بعد اس کے دوسرے دونوں ساتھیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[1]

شمر بن ذی الجوشن کا قتل

جن لوگوں کی واقعات کربلا پر نگاہ ہے ان کے لیے یہ منحوس نام کوئی اجنبی نہیں ہے یہ وہی ملعون ہے جس نے کند شمشیر کی بارہ ضربوں سے جوانان جنت کے سردار کا سر تن سے جدا کیا تھا اور یہی وہ شقی ازلی ہے جس نے صرف امام حسینؑ کے بچوں کو نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے تمام زن و مرد اور خورد و کلاں کو یتیم و بے نور کیا تھا۔ اس شقی ازلی کے واصل جہنم ہونے کی کیفیت میں کافی اختلاف ہے جو کچھ عاشر بحار میں امالی شیخ طوسیؒ کے حوالہ سے مرقوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب شمر نے کوفہ سے چند آدمیوں سمیت[2] بصرہ کی طرف) راہ فرار اختیار کی تو مختار نے ابو عمرہ کو ایک جماعت کے ساتھ (جن کی تعداد ایک سو تھی)[3] اس کی تلاش میں بھیجا چنانچہ راستہ میں اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ سخت خونریز جنگ لڑنے اور زخموں سے چور چور ہو جانے کے بعد اسے گرفتار کر کے مختار کے دربار میں لایا گیا۔ مختار نے حکم دیا کہ تیل کی دیگ گرم کی جائے۔ گرم ہونے کے بعد اس شقی کو اس میں ڈال دیا گیا۔ یہاں تک کہ بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ ﴿وباء في الدنيا قبل الأخرة بالذل و سوء العذاب﴾ نیز اس کے ہمراہیوں کو بھی تہہ تیغ کیا اور ان کے سر قلم کر کے مقام ''رحبۂ خدا بندہ'' میں سولی پر لٹکا دیئے گئے۔[4]

حرملہ بن کاہل اسدی کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس نے تیر سہ شعبہ سے شہزادہ علی اصغرؑ کی شمع حیات کو گل کیا تھا۔ منہال بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ میں مکہ سے واپسی (مدینہ میں) امام زین العابدینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امامؑ نے فرمایا: حرملہ بن کاہل اسدی کا کیا بنا؟ میں نے عرض کیا کہ میں اسے زندہ کوفہ میں چھوڑ آیا ہوں۔ امامؑ نے آسمان کی طرف دست دعا بلند کر کے کہا: ﴿اللّٰهم اذقه حرّ الحديد اللّٰهم اذقه حرّ النار﴾ خداوندا! اسے لوہے اور آگ کا ذائقہ

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۲۲۳۔ قمقام، ص ۶۲۶۔ کامل، ج ۳، ص ۳۶۹۔
[2] فرسان، ج ۲، ص ۲۲۳۔
[3] فرسان، ج ۲، ص ۲۲۳۔
[4] عاشر بحار، ج ۲۷۹۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۲۳۔

چکھا! جب میں واپس کوفہ پہنچا تو اس وقت مختار نے خروج کیا ہوا تھا۔ چونکہ میرے ان کے درمیان قدیمانہ راہ و رسم محبت تھی۔ لہٰذا چند روز کے بعد ان سے ملنے کے لیے گیا۔ اس وقت مختار گھر سے باہر آ رہے تھے۔ مجھ سے دریافت کیا: اب تک کہاں رہے ہو؟ نہ ہماری امارت میں شریک ہوئے نہ ہی ہمیں مبارک باد دی۔ میں نے بتایا کہ میں مکہ گیا ہوا تھا۔ اب آیا ہوں۔ پھر میں ان کے ہمراہ چلنے لگا۔ جب کناسہ کے مقام پر پہنچا تو وہاں اس طرح رک گئے جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک جماعت آئی اور کہا: ﴿ایھا الامیر! البشارۃ، البشارۃ﴾ حرملہ کو لایا جا رہا ہے چنانچہ جب اسے حاضر کیا گیا تو مختار نے خوش ہو کر کہا: ﴿الحمد للّٰہ الذی مکننی منک﴾ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے تم پر غلبہ دیا۔ پھر جزار (قصاب) طلب کیا۔ اسے حاضر کیا گیا۔ حکم دیا: پہلے ایک ایک کر کے اس کی انگلیاں کاٹی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ پھر اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے۔ بعد ازاں دوسرے اعضاء و جوارح کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ پھر آگ روشن کر کے اس کے نجس بدن کو اس میں ڈال دیا گیا یہاں تک کہ جل کر بالکل خاکستر ہو گیا۔ منہال کہتا ہے میں نے یہ واقعہ دیکھ کر صدائے تکبیر و تسبیح بلند کی۔

مختار نے اس تعجب خیز تکبیر و تسبیح کا سبب دریافت کیا۔ میں نے امام زین العابدینؑ کی ملاقات والا تمام واقعہ کہہ سنایا یہ سنتے ہی مختار گھوڑے سے اتر آئے۔ دو رکعت نماز پڑھی پھر طویل سجدۂ شکر ادا کیا۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ واپسی پر جب میرے گھر کے پاس سے گزرنے لگے تو میں نے دعوت طعام دی۔ مختار نے کہا کہ تم نے ہی تو مجھے اطلاع دی ہے کہ میرے آقا علی بن الحسینؑ نے اس طرح دعا فرمائی تھی۔ جب خداوند عالم نے ان کی اس دعا کو میرے ہاتھوں پر مستجاب فرمایا ہے تو تم مجھے دعوت طعام دیتے ہو؟ میں کس طرح آج کھانا کھا سکتا ہوں۔ میں نے تو اس نعمت کے شکریہ میں روزہ کی نیت کر لی ہے۔ منہال کہتے ہیں: میں نے کہا خدا آپ کو موفق فرمائے۔[1]

سید الشہداءؑ کا ورس لوٹنے والے چند آدمیوں کا قتل

مختار نے ان لوگوں کی گرفتاری کے لیے اپنے آدمی بھیجے جنہوں نے دوسرے سامان کے علاوہ جناب سید الشہداءؑ کا ورس (یمن میں اگنے والا خوشبودار گھاس) لوٹا تھا کہ من جملہ ان کے زیاد بن مالک ضبعی، عمرو بن خالد غنوی، عبد الرحمٰن بن ابی خشکارہ بجلی اور عبد اللہ بن قیس خولانی تھے جب ان کو پکڑ کر مختار کے سامنے لایا گیا تو مختار نے کہا: اے خدا کے نیک بندوں اور جوانانِ جنت کے سردار کو قتل کرنے والو! دیکھو خدا نے تم سے کس طرح انتقام لیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ورس تمہارے قبضہ میں کسی نحس دن میں آیا تھا پھر حکم دیا کہ ان کو بازار میں لے جا کر قتل کر دیا جائے چنانچہ وہاں

---

[1] تقام، ص ۲۲۸۔ قرسان، ج ۲، ص ۲۴۷۔ اصدق، ص ۵۵۔ عاشر بحار، ص ۲۷۸ وغیرہ۔

لے جا کر ان کو واصل جہنم کیا گیا۔[1]

حضرت امام حسینؑ کے قاتلوں میں سے ایک جماعت کا قتل

مختار کے آدمی ان لوگوں کو پکڑ کر لائے جنہوں نے سید الشہداء اور آپ کے اعزا و انصار کی شہادت میں حصہ لیا تھا۔ من جملہ ان کے ایک ابو الحتوف جعفی بھی تھا جس نے آنجنابؑ کی پیشانی اقدس پر تیر مارا تھا۔ دوسرا ابو قدامہ عامری جس نے جناب کے قلب و جگر پر وہ سخت تیر مارا تھا جسے آپؑ نے پس پشت سے کھینچا تھا۔ تیسرا صالح بن وہب تھا جس نے آپؑ کے پہلو میں نیزہ مارا تھا۔ چوتھا ابجر بن کعب تھا جس نے شہزادہ عبداللہ بن الحسنؑ کے بازو پر تلوار ماری تھی جس سے ہڈی کٹ گئی تھی۔ پانچواں ابو ایوب غنوی تھا جس نے تیر سے آنجنابؑ کے حلقوم کو زخمی کیا تھا۔ چھٹے اور ساتویں نصر بن خرشہ اور عمرو بن خلیفہ جعفی تھے جنہوں نے آنجنابؑ کو زخمی کیا تھا۔ آٹھویں اور نویں عبداللہ و عبدالرحمٰن پسران صلخت اور دسویں اور گیارہویں عثمان بن خالد و بشر بن حوط (سوط) تھے۔ جنہوں نے عبدالرحمٰن بن عقیل کو شہید کیا تھا۔ ان سب کو جناب مختار کے حکم سے سر بازار بڑی ذلت و خواری کے ساتھ داصل جہنم کیا گیا اور پھر ان کی نجس لاشوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔[2]

عمر بن سعد کا قتل

جن دنوں مختار نے خروج کیا تھا اور ان کی حکومت قائم ہوگئی تھی، عمر بن سعد ملعون روپوش ہوگیا تھا پھر کسی طرح عبداللہ بن جعدہ بن ہبیرہ کے ذریعہ سے جو کہ مختار کا مقرب بارگاہ تھا۔ مختار سے اپنے لیے امان نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر مختار نے امان نامہ میں کچھ ایسے ذومعنی الفاظ درج کئے تھے جن کی وجہ سے مناسب وقت پر اس ملعون کے نجس وجود سے زمین کو پاک کر سکتے تھے چنانچہ بعد ازاں وہ ظاہر ہوگیا اور گاہ بگاہ مختار کے دربار میں آنے جانے لگا۔ چند یوم کے بعد مختار نے حسب عادت مسجع الفاظ میں اعلان کیا: ﴿لاقتلن غداً رجلاً عظیم القدمین. غائر العینین مشرف الحاجبین یهمز الارض برجله یسّر قتله المؤمنین و الملائکة المقربین﴾ چونکہ یہ صفات بظاہر ابن سعد پر منطبق ہوتی تھیں اس لیے حاضرین میں سے ایک شخص (ہیثم نخعی) نے حقیقت حال سے مطلع ہو کر اپنے بیٹے (عریان) کو ابن سعد کے پاس بھیجا۔ چنانچہ ملعون صورتِ حال سے مطلع ہوا تو آدھی رات کے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر راہِ فرار اختیار کر لی مگر کچھ مسافت طے کرنے کے بعد زین کے قربوس پر سر رکھ کر سو گیا۔ اس کا سونا تھا کہ گھوڑا اسے واپس کوفہ لے آیا۔ جب آنکھ کھلی تو اپنے تئیں کوفہ کے محلوں میں پایا۔ پھر

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۲۲۸۔ اصدق، ص ۵۵۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۰۔

[2] فرسان، ج ۲، ص ۲۲۷۔ اصدق، ص ۵۵، ۵۶۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۰۔

جلدی سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ بقول مرزبانی جب ابن سعد کو مختار کے اس اعلان کی اطلاع ملی کہ میں کل فلاں فلاں صفات والے شخص کو قتل کروں گا تو اس نے بنی تمیم کے ایک بہادر مالک نامی آدمی کو چار سو دینار دے کر ہمراہ لیا اور راہ فرار اختیار کی۔ جب مقام حمام، اعین و نہر عبدالرحمٰن پر پہنچا تو مالک سے کہا: تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں کوفہ سے کیوں نکلا ہوں؟ مالک نے کہا: نہیں۔ ابن سعد نے کہا: میں مختار سے خائف ہوں۔ یہ سن کر مالک نے کہا: تو نے یہ اقدام کر کے سخت غلطی کی ہے۔ تیرا یہ خیال غلط ہے۔ مختار تجھے ہرگز قتل نہیں کرتا۔ لیکن اگر اسے تیرے فرار کی اطلاع ملی تو وہ تیرے مکانات مسمار کر دے گا اور جائیداد ضبط کر لے گا۔ ابن سعد اس کی باتوں آ گیا اور واپس کوفہ چلا آیا مگر آتے ہی یہ احتیاطی کارروائی کی کہ اپنے لڑکے حفص کو مختار کے پاس تجدید عہد کے لیے بھیجا۔ چنانچہ حفص نے مختار کے پاس جا کر کہا کہ میرا باپ کہتا ہے کہ آیا میں حسب سابق امان میں ہوں؟ مختار نے کہا: تیرا باپ ہے کہاں؟ حفص نے کہا: گھر میں ہے۔ مختار نے کہا: بیٹھ جاؤ۔ حفص بیٹھ گیا۔ پھر مختار نے ابوعمرہ کو بلا کر اس کے کان میں کہا: عمر بن سعد کے گھر جاؤ۔ اور اسے جس حال میں پاؤ قتل کر دو اور اس کا سر میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ ابوعمرہ حسب الحکم اس کے گھر پہنچا۔ دیکھا کہ ابن سعد شب خوابی کے کپڑوں میں رخت خواب پر بیٹھا ہے۔ ابوعمرہ نے کہا: تمہیں حاکم (مختار) نے یاد کیا ہے۔ پسر سعد اٹھنے لگا مگر پاؤں کپڑے کے ساتھ الجھا۔ جس کی وجہ سے گر پڑا۔ ابوعمرہ نے اسی وقت تلوار میان سے نکالی اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس طرح جناب سید الشہداؑ کی ابن سعد کے متعلق بددعا پوری ہو گئی کہ خدا تجھ پر ایسے شخص کو مسلط کرے جو تجھے تیرے رخت خواب میں ذبح کرے۔ بہرکیف ابوعمرہ نے پسر سعد کا سر مختار کے پاس حاضر کیا۔ مختار نے حفص سے کہا: آیا اس سر کو پہچانتے ہو۔ حفص نے کہا: ہاں! اس کے بعد اب زندگانی دنیا میں کوئی خیر و خوبی نہیں ہے۔ مختار نے کہا: تو نے سچ کہا ہے۔ پھر حکم دیا کہ اسے بھی اپنے باپ کے ساتھ ملحق کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت مختار نے کہا: آیا عمر بن سعد حسینؑ کی جگہ اور حفص علی اکبرؑ کی جگہ ہو سکتا ہے؟ پھر خود ہی کہا: نہ بخدا! اگر میں قریش کی ایک تہائی بھی تہ تیغ کر دوں تو بھی یہ لوگ حسینؑ کی ایک انگلی کے برابر بھی نہیں ہو سکتے! بعد ازاں مختار نے ابن سعد کا سر محمد بن الحنفیہ کے پاس مدینہ بھجوا دیا کیونکہ موصوف نے ابن سعد کو ڈھیل دینے پر مختار کی کچھ سرزنش کی۔ جب ملعون ابن سعد کا سر محمد بن الحنفیہ کے پاس پہنچا تو سجدۂ شکر ادا کیا اور مختار کے حق میں دعائے خیر کی۔[1]

بجدل بن سلیم کلبی کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے جناب سید الشہداؑ کی انگوٹھی اتاری تھی اور اس کی

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۲۳۰۔ اصدق، ص ۵۹۔ قمقام، ص ۱۳۲۔

خاطر آنجناب کی انگلی قطع کی تھی۔ مختار کے حکم سے پہلے اس کی انگلیاں کاٹی گئیں، پھر ہاتھ اور پاؤں قلم کیے گئے اور وہ شقی اسی حالت میں تڑپ تڑپ کر واصل جہنم ہو گیا۔[1]

زید بن رقاد کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس نے ابی مخنف کے بیان کے مطابق شہزادہ عبداللہ بن مسلم کی پیشانی پر تاک کر تیر مارا تھا اور جب شہزادہ نے حفاظت کے لیے (۔۔۔) ہاتھ بلند کیا۔ تو وہ پیشانی کے ساتھ چھد گیا۔ مختار نے عبداللہ بن کامل کو اس کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے اپنے آدمیوں سمیت جا کر اس کے گھر کو گھیرے میں لیا۔ ناچار زید شمشیر برہنہ بکف ہو کر نکل آیا۔ مختار کے آدمی اس پر حملہ آور ہوئے۔ ابن کامل نے کہا: اسے تلواریں نہ مارو بلکہ صرف تیروں اور پتھروں کا نشانہ بناؤ۔ چنانچہ اس پر اس قدر تیر و پتھر برسائے گئے کہ ملعون گر پڑا ہنوز زندہ تھا کہ آتش جہنم سے پہلے اسے آتش دنیا کے حوالہ کر دیا گیا جس سے بہت جلد اس کی روح داروغہ جہنم کے پاس پہنچ گئی۔[2]

عمرو بن صبیح (صدائی صیداوی) کا قتل

ابو مخنف کے علاوہ دوسرے عام ارباب مقاتل کے بیان کے مطابق شہزادہ عبداللہ بن مسلم کو اسی ملعون نے مذکورہ بالا کیفیت سے تیر مارا تھا۔ ایک بیان کے مطابق رات کے وقت جبکہ عام لوگ سو چکے تھے۔ مختار کے آدمی اس ملعون کی گرفتاری کے لیے اس کے گھر پہنچے۔ یہ مکان کی چھت پر سویا ہوا تھا۔ اور تلوار سر کے نیچے تھی۔ اسے تلوار سمیت گرفتار کر کے مختار کے پاس لایا گیا۔ اس نے کہا: میں نے صرف اصحاب حسینؑ کو نیزے مارے تھے مگر کوئی آدمی قتل نہیں کیا تھا۔ مختار نے صبح تک اسے قید رکھا۔ صبح ہونے پر لوگوں کو حاضر ہونے کا اذن عام دیا۔ پھر حکم دیا کہ اسے اس قدر نیزے مارو کہ ہلاک ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جس سے وہ جہنم رسید ہو گیا۔[3]

قیس بن اشعث بن قیس کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس نے سید الشہداءؑ کی شہادت کے بعد آپ کی چادر اتاری تھی۔ دینوری کے بیان کے مطابق اس نے عبداللہ بن کامل کے پاس پناہ لے لی تھی۔ عبداللہ نے مختار سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ مختار نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر باتوں باتوں میں عبداللہ سے کہا: اپنی انگوٹھی تو دکھاؤ۔ عبداللہ نے انگوٹھی اتار کر دکھائی۔ مختار نے اپنی انگشت میں پہن لی۔ پھر ابن کامل کو کسی کام کے لیے بھیج دیا۔ اور ابو عمرہ کو بلا کر کہا کہ ابن کامل کے گھر جاؤ اور اس کی

---

[1] فرسان، ج ۲، ص ۳۳۱۔ اصدق، ص ۶۰۔

[2] فرسان، ج ۲، ص ۳۳۰۔ اصدق، ص ۵۹۔ کامل، ج ۳، ص ۲۷۱۔

[3] فرسان، ج ۲، ص ۳۳۲۔ اصدق، ص ۶۰۔ کامل، ج ؟؟، ص ۲۷۱۔

زوجہ کو اس کے شوہر کی یہ انگوٹھی بطور علامت دکھا کر کہو کہ میں قیس بن اشعث کو قتل کر اس سے کچھ ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ مختار کے گزند سے محفوظ ہو جائے پھر جب قیس ملے تو فوراً اس کا سر قلم کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ ابو عمرہ نے حسب ہدایت ایسا ہی کیا اور جب اس کا سر قلم کر کے مختار کے سامنے پیش کیا۔ تو مختار نے کہا: ﴿ھذا بقطیفة الحسین﴾ (یہ حسینؑ کی چادر کا بدلہ ہے) اس وقت ابن کامل موجود تھا۔ اس نے شکوہ کے انداز میں مختار سے کہا: تم نے اس شخص کو قتل کیا جو میری پناہ میں تھا؟ مختار نے کہا: چپ رہو! کیا تم اس بات کو جائز سمجھتے ہو کہ قاتلین حسینؑ کو پناہ دو۔[۱]

سنان بن انس نخعی کا قتل

یہ وہی ملعون ہے جس نے روز عاشوراء اور جنایات کثیرہ کے علاوہ سید الشہداءؑ کو سخت کاری نیزہ مارا تھا بلکہ بہت سے علماء کے نزدیک آنجنابؑ کا قاتل بھی یہی شقی ازلی ہے۔ مختار نے ایک جماعت کو اس کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ معلوم ہوا کہ وہ بصرہ کی طرف فرار ہو گیا۔ مختار کو یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا۔ اس کا گھر تباہ کر دیا۔ اور اس کا سراغ لگانے کے لیے کچھ جاسوس مقرر کئے۔ چنانچہ چند یوم کے بعد انہوں نے مختار کو اطلاع دی کہ سنان بصرہ سے قادسیہ کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ سن کر مختار کو روحانی شادمانی ہوئی۔ اور ایک جماعت کو اس کی گرفتاری کے لیے قادسیہ روانہ کیا۔ چنانچہ اسے عذیب و قادسیہ کے درمیان گرفتار کر لیا گیا اور مختار کے سامنے پیش کیا۔ مختار نے حکم دیا کہ پہلے تو اس کی ایک ایک کر کے تمام انگلیاں قطع کی جائیں۔ پھر ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بعد ازاں روغن زیتون کی ایک دیگ گرم کی گئی۔ اس طرح کھولتے ہوئے تیل میں ملعون کو ڈال دیا گیا جس سے وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔[۲]

مختار کا راہ فرار اختیار کرنے والوں کے مکانات کا مسمار کرانا

جن دنوں مختار کوفہ میں قاتلین سید الشہداءؑ کو چن چن کر ہلاک کر رہے تھے۔ اس اثناء میں بہت سے قاتلین کوفہ سے بھاگ کر اکثر بصرہ میں (مصعب بن زبیر کے پاس) چلے گئے۔ چنانچہ ان میں مرۃ بن منقذ[۳] (قاتل شہزادہ علی اکبرؑ) محمد بن اشعث، عبد اللہ بن عروہ خثعمی، عبد اللہ بن عقبہ غنوی (قاتل ابی بکر بن الحسین) شبث بن ربعی اور

۱۔ اخبار الطوال، ص ۲۹۴ طبع مصر۔

۲۔ تمام، ص ۲۲۷۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۲۳۔ اصدق، ص ۹۱۔

۳۔ اس کے بصرہ فرار کرنے کا ماجرا کچھ اس طرح ہے کہ مختار نے اس کی گرفتاری کے لیے چند آدمی بھیجے جنہوں نے جا کر اس کے گھر کا گھیراؤ ڈال لیا۔ ملعون گھوڑے پر سوار اور مسلح ہو کر نکلا اور زد و خورد کرتا ہوا بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی اثناء میں اس کے بازو پر تلوار لگی جس سے وہ بازو شل ہو کر بیکار ہو گیا۔ کامل، ج ۳، ص ۳۷۱۔ تمام، ص ۱۲۷ وغیرہ۔

اسماء بن خارجہ فزاری وغیرہ بھی شامل تھے۔ مختار نے ان کے مکانات منہدم کرا دیے۔[1]

عبیداللہ بن زیاد، حصین بن نمیر اور شراحیل بن ذی الکلاع کا قتل

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ مختار نے ابراہیم بن الاشتر کو ابن زیاد بدنہاد کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے لشکر جرار دے کر بھیجا تھا مگر کوفہ کی داخلی شورش کو فرو کرنے کے لیے ان کو واپس بلانا پڑا۔ جب وہ شورش موقوف ہوگئی اور داخلی حالات سازگار ہوگئے تو بعد ازاں مزید دو یوم قیام کرنے کے بعد پھر مختار نے ان کو بارہ بروایتے نو اور بقولے کچھ کم بیس ہزار کا لشکر جرار دے کر ابن زیاد اور اہل شام کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے بائیسویں ذی الحجہ ۶۶ھ کو روانہ کیا۔ مختار کچھ دور تک ان کی مشایعت کے لیے ہمراہ گئے۔ اور ضروری ہدایات و وصایا کرنے کے بعد واپس آگئے۔ ابراہیم نے بڑی سرعت کے ساتھ منازل سفر طے کرتے ہوئے موصل سے پانچ فرسخ اس طرف نہر خاذر پر پہنچ کر اسے اپنا لشکر گاہ قرار دے دیا۔ دوسری طرف سے ابن زیاد بھی تیس[2] ہزار اور بقول ابن نما اس سے بھی زیادہ لشکر کے ساتھ موصل پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھ آیا اور ابراہیم کے لشکر کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ ابن زیاد کے ایک رئیس لشکر عمیر سلمی نے ابراہیم کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ رات کے وقت خلوت میں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ رات کے وقت اپنے ایک اور ساتھی فرات بن سالم (ابراہیم ن۔د) کے ہمراہ ابراہیم کے پاس آیا اور کہا کہ اگرچہ میں اور میری قوم ابن زیاد کے ہمراہ ہیں مگر میں اپنی قوم سمیت بنی مروان کو برا سمجھتا ہوں۔ کل جب جنگ شروع ہوگی تو ابن زیاد کے میسرہ کی کمان میرے ہاتھ میں ہوگی۔ تم میسرہ پر حملہ کرنا ہم راہ فرار اختیار کریں گے۔ اس طرح بہت جلد آپ کو فتح و کامرانی حاصل ہو جائے گی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس کی باتیں صداقت پر مبنی تھیں۔ مگر وہ دوسرے روز حسب وعدہ بوجہ خوف ننگ و عار جلدی راہ فرار اختیار نہ کر سکا بلکہ سخت جنگ کے بعد جب پہلے ابن زیاد کے کچھ اور آدمیوں نے میدان جنگ سے منہ موڑا تب اس نے بھی میدان چھوڑا۔[3]

ابراہیم بن الاشتر اس رات ہرگز نہ سو سکا بلکہ تمام رات لشکر کو مرتب کرنے اور ان کو دشمن کے ساتھ فیصلہ کن جنگ و جدال کرنے پر ترغیب و تحریص دلانے میں مشغول رہا۔[4] وہ تمام لشکر سے برابر یہی کہتا تھا۔ اے ناصران دین و شیعیان امیرالمومنینؑ! تمہارے سامنے عبیداللہ بن مرجانہ موجود ہے۔ جو حسین بن فاطمہ بنت رسول کا قاتل ہے۔ یہ وہی ہے جو حسینؑ اور ان کے اہل و عیال اور نہر فرات کے درمیان حائل ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ العطش العطش کرتے ہوئے شہید کر دیے گئے۔ اسی نے ان کے لیے چوڑی چکلی زمین کا دامن تنگ کر دیا تھا حتیٰ کہ ان کو اور ان کے اہل

---

[1] اصدق، ص ۹۲۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۳۵۔

[2] تذکرۃ الخواص، ص ۲۸۶ طبع النجف۔

[3] کامل، ج ۳، ص ۳۸۰۔ لقمام، ص ۲۳۷ وغیرہ۔

[4] کامل، ج ۳، ص ۳۸۰۔

بیت کو شہید کر دیا۔ بخدا فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا تھا جو ابن مرجانہ نے ذرّیتِ رسولؐ کے ساتھ کیا۔ بخدا مجھے امید ہے کہ خدا تمہارے ہاتھوں سے اس کا خون بہا کر تمہارے دلوں کو شفا دے گا اور تمہیں فتح و فیروزی عطا فرمائے گا۔ نمازِ صبح کے بعد طرفین کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہو گئے۔ اور سواروں پر شراحیل بن ذی الکلاع الحمیری کو کمانڈر مقرر کیا۔[1] اور ابراہیم نے اس طرح اپنا لشکر ترتیب دیا کہ میمنہ پر سفیان بن یزید، میسرہ پر علی بن مالک، سواروں پر طفیل بن القیط اور پیادوں پر مزاحم بن مالک کمانڈر مقرر کیا۔[2] پہلے پہل ابن زیاد کے لشکر سے ابن ضبعان کلبی رجز پڑھتا ہوا نکلا اور مبارز طلب کیا۔ ادھر ابراہیم کے لشکر سے احوص بن شداد ہمدانی رجز پڑھتا ہوا مقابلہ کے لیے نکلا۔ احوص نے کلبی سے نام پوچھا۔ اس نے کہا: میرا نام "منازل الابطال" ہے۔ احوص نے کہا: میرا نام مقرب الآجال ہے۔ پھر اس چابک دستی سے اس پر تلوار ماری کہ ایک ہی وار میں واصلِ جہنم کر دیا۔ پھر داؤد دمشقی مقابلہ کے لیے نکلا۔ احوص نے اس کو بھی ایک ہی وار میں داروغۂ جہنم کے سپرد کر دیا۔ پھر واپس صف میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ بعد ازاں ابن زیاد اور آگے بڑھا۔ جب دونوں لشکر بالکل ایک دوسرے کے قریب آ گئے تو یہ کیفیت دیکھ کر حصین بن نمیر نے جو لشکرِ شام کے میمنہ کا افسر تھا اپنے سپاہیوں کو للکارتے ہوئے اور رجز پڑھتے ہوئے ابراہیم کے میسرۂ لشکر پر حملہ کر دیا۔ ابراہیم کے لشکر سے شریک تغلبی شعلۂ جوالہ کی طرح رجز پڑھتے ہوئے اس ملعون پر ٹوٹ پڑا۔ اور باہم گھتم گتھا ہو گئے۔ اور وہ چار بار باہمی ردّ و بدل کے بعد شریک نے اسے ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس شقی کی پلید روح واصلِ جہنم ہو گئی۔

بہر حال یہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ ابراہیم کے میسرۂ لشکر کا افسرِ اعلیٰ بن مالک الجشمی کام آ گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے قرہ بن علی نے علم سنبھال لیا بلکہ ابراہیم کے میسرہ میں کچھ بھگدڑ بھی مچنے لگی۔ اس وقت میسرہ کا علم عبداللہ بن ورقا کے ہاتھ میں تھا مگر ابراہیم کے شیرانہ تابڑ توڑ حملوں نے جنگ کا پانسہ بدل کے رکھ دیا۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح جدھر کا رخ کرتا کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔ راویانِ اخبار کا بیان ہے کہ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ اور طرفین سے نیزوں، تیروں اور تلواروں کی بارش برس رہی تھی۔ اور لوہے سے لوہے کے ٹکرانے کی وجہ سے اس قدر شور بلند تھا کہ میدانِ جنگ لوہاروں کا بازار معلوم ہوتا تھا۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرا کر چنگاریاں برسانے لگیں اور غبارِ جنگ نے فلکِ نیلگوں کو تاریک کر دیا۔ اسی اثناء میں نمازِ ظہر کا وقت آ گیا۔ اصحابِ ابراہیمؒ نے تکبیر اور اشارہ کے ساتھ نماز پڑھی۔ دونوں طرف سے کثیر التعداد آدمی مارے گئے۔ اب ابن زیاد کے لشکر نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ بعض نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس وقت عمیر سلمی نے بھی میسرہ سمیت میدان چھوڑ دیا۔ اب تو ابن زیاد کے لشکر میں بری طرح بھگدڑ

---

[1] کامل، ج ۳، ص ۲۸۰۔ [2] تمام، ص ۲۳۵۔

بچ گئی۔ ابراہیم کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ دوسری طرف نہر خازر تھی۔ شامی اندھا دھند اس میں گر رہے تھے۔ اتنے میدان میں نہیں قتل ہوئے ہوں گے جس قدر اس نہر میں ڈوب کر ہلاک ہوئے۔ ابراہیم کے لشکریوں کو بہت کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا نیز اسی جنگ مغلوبہ میں شرجیل بن ذی الکلاع الحمیری بھی جو شامیوں کا بہت بڑا جرنیل تھا۔ مارا گیا اور اس طرح میدان اہل عراق کے ہاتھ رہا اور خداوند عالم نے ابراہیم کو نمایاں فتح و فیروزی عطا فرمائی۔ جب جنگ موقوف ہوگئی اور ابراہیم کے آدمی مال غنیمت جمع کرنے سے فارغ ہو چکے تو ابراہیم نے ان سے کہا: میں نے اثناءِ جنگ میں ایک ایسے شخص کو نہر خازر کے کنارے قتل کیا ہے جو ایک منفرد علم کے نیچے تھا اور اس سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔ میں نے اسے تلوار کے ایک بھرپور وار سے دونیم کر دیا۔ اس کے ہاتھ مشرق کی طرف اور پاؤں مغرب کی جانب تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابن زیاد تھا جاؤ اسے تلاش کرو۔ چنانچہ اس ملعون کی تلاش شروع ہوئی بالآخر اس کا جسد مل گیا۔ جب اس کی شناخت کر لی گئی کہ یہ ابن زیاد بدنہاد ہی ہے تو ابراہیم نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ پھر حکم دیا کہ اس کا سرتن سے جدا کر لیا جائے پھر اس کے نجس بدن کو پہلے الٹا سولی پر لٹکوایا۔ بعد ازاں اسے نذر آتش کر دیا گیا۔ اور ابن زیاد، حصین بن نمیر اور شراحیل وغیرہ سرداران لشکر شام کے سر مختار کے پاس بھجوا دیے گئے۔ یہ روز عاشورا ۶۷ھ یعنی سید الشہداءؑ کے شہادت کے پورے چھ برس بعد انہی کے یوم شہادت کا واقعہ ہے۔ جب مختار کے پاس سر پہنچے تو وہ اس قدر مسرور و شادکام ہوئے۔ قریب تھا کہ فرطِ مسرت سے بےخود ہونے لگیں۔ جب ابن زیاد کا نجس سر مختار کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ کھانا کھانے میں مشغول تھے، اٹھے اور اس کے منہ پر لاتیں ماریں۔ پھر جوتا اتار کر غلام کو دیتے ہوئے فرمایا کہ اسے پاک کرو کیونکہ میں نے اسے ایک نجس کافر کے منہ کے ساتھ چھوا ہے۔[1] پھر حکم دیا کہ ان سروں کو وہاں رکھا جائے جہاں جناب سید الشہداءؑ کا سر مبارک رکھا گیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بعد ازاں ان کو وہاں سولی پر لٹکایا گیا جہاں حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک نصب کیا گیا تھا۔ وارد ہے کہ جب ابن زیاد کا سر مختار کے سامنے رکھا گیا تو ایک باریک سانپ آیا جو اس ملعون کے منہ میں داخل ہوا اور ناک کے سوراخ سے نکل گیا۔ پھر ناک سے داخل ہوا اور منہ سے نکل گیا۔ اس نے کئی بار ایسا ہی کیا۔ اور جب سر سولی پر لٹکا ہوا تھا تو پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ بروایتے تین دن تک ایسا ہی ہوتا رہا۔[2] اس کے بعد مختار نے ابن زیاد، حصین بن نمیر اور شرجیل بن ذی الکلاع کے سر مع تیس ہزار دینار کے مکہ میں جناب محمد بن الحنفیہ کے پاس بھجوا دیے۔ اور اس مضمون کا ایک مکتوب بھی ہمراہ ارسال کیا کہ: (انی بعثت انصارکم و شیعتکم الی عدوکم فخرجوا محتسبین آسفین فقتلوهم فالحمد لله الذی

---

[1] فرسان، ج ۲، از ص ۲۲۵ تا ۲۳۹۔ اصدق، ص ۶۲ تا ص ۷۰۔ کامل، ج ۳، ص ۳۷۷ تا ۳۸۱۔

[2] اصدق، ص ۷۰۔ تذکرة الخواص، ص ۲۸۶۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۸۱ وغیرہ۔

ادرک لکم الثار و اھلکم فی کل فج عمیق و شفی اللّٰہ صدور قوم مؤمنین ﴾ جب یہ سر محمد بن الحنفیہ کے پاس پہنچے تو وہ سجدۂ باری میں گر گئے۔ اور مختار کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿جزاہ اللّٰہ المختار خیر الجزاء فقد ادرک لنا ثارنا و وجب حقہ علی کل من ولدہ عبد المطلب بن ھاشم﴾۔ پھر ابن الاشتر کے حق میں بھی دعائے خیر کی۔ بعد ازاں یہ سر مدینہ میں حضرت امام زین العابدینؑ کی خدمت میں بھجوا دیے۔ جب امامؑ کی خدمت میں سر حاضر کیے گئے۔ اس وقت آپ کھانا تناول کرنے میں مشغول تھے۔ فوراً سجدۂ شکر میں سر رکھ دیا۔ پھر سر بلند کرنے کے بعد خدا کی حمد و ثنا اور مختار کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿الحمد للّٰہ الذی ادرک لی ثاری من عدوی و جزء اللّٰہ المختار خیراً﴾ پھر فرمایا: جب ہمیں دربار ابن زیاد میں پیش کیا گیا اس وقت وہ کھانا کھانے میں مشغول تھا اور میرے والد ماجد کا سر اقدس اس کے سامنے رکھا ہوا تھا اس وقت میں نے یہ دعا کی تھی کہ ﴿اللّٰھم لا تمتنی حتی ترینی راس ابن زیاد﴾ بارالہا! مجھے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک اسی طرح ابن زیاد کا سر مجھے دکھا نہ دے۔[1] اس طرح قاتلان سید الشہداءؑ عذاب آخرت سے پہلے دنیوی عذاب میں گرفتار ہوئے اور جو قتل سے بچ گئے وہ نابینائی، چہرہ کی سیاہی وغیرہ آفات و بلیات میں گرفتار ہو گئے۔ جیسا کہ زہری سے مروی ہے: ﴿ما بقی منھم احد الا و عوقب فی الدنیا اما بالقتل او العمی او سواد الوجہ او زوال الملک فی مدۃ یسیرۃ﴾ (تذکرۃ الخواص، ص ۲۹۰) اس طرح ان نابکاروں کے بارے میں سید الشہداءؑ کی وہ بددعا پوری ہوئی جو اس طرح کی تھی: ﴿اللّٰھم اشھد علی ھؤلاء القوم فانھم دعونا لینصرونا ثم عدوا علینا یقاتلوننا اللّٰھم امنعھم برکات الارض و فرقھم تفریقاً و مزقھم تمزیقاً و اجعلھم طرائق قددا ولا ترض الولاۃ عنھم ابداً و اقتلھم بدداً ولا تغادر منھم احداً﴾۔

(فرسان الہیجا، ج ۲، ص ۲۲۷)

مختار کا ہنگام وفات

حالات کا بنظر غائر جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کاملہ مختار سے جو کام لینا چاہتی تھی۔ وہ لے چکی تھی اور ان کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اس لیے بارگاہ ایزدی سے جلد ان کا بلاوا آ گیا۔ اس امر کا اظہار خود مختار نے بھی ابتداء امر میں کیا تھا کہ جب میں خاندان نبوت کا انتقام لے کر اہل ایمان کے دلوں کو شفا دے دوں تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں کہ میری سلطنت زائل ہو جائے اور پیک اجل آ جائے (جیسا کہ پہلے تفصیل گزر چکی ہے)۔ مختار نے اپنے اٹھارہ ماہ دور حکومت میں قاتلین سید الشہداءؑ میں سے اٹھارہ ہزار آدمیوں کو قتل کیا۔ اور اگر نہر خازر کے مقتولین کو بھی

---

[1] اصدق، ص ۷۱۔ فرسان، ج ۲، ص ۲۳۰۔

ساتھ شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب تک مختار بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہوں سے نبرد آزما تھے۔ عبداللہ بن زبیر اور اس کے ہوا خواہ خاموش تھے۔ کیونکہ بنی امیہ ان دونوں کے مشترکہ دشمن تھے۔ البتہ جب مختار اس طرف سے فارغ ہوئے تو عبداللہ بن زبیر اور ان کے عمال نے شاید اس اندیشہ سے کہ کہیں مختار ان کے خلاف اعلان جنگ نہ کر دیں۔ خود پیش قدمی میں مصلحت دیکھی۔ چنانچہ اس کا بھائی مصعب بن زبیر نے جو کہ بصرہ کا گورنر تھا۔ غالباً عبداللہ کے حکم سے ایک لشکر جرار کے ساتھ کوفہ پر چڑھائی کر دی۔ اس لشکر میں اکثر وہ لوگ تھے جو کوفہ سے بھاگ کر بصرہ پہنچے تھے۔ ادھر مختار کی جمعیت پراگندہ تھی۔ کیونکہ زیادہ تر فوج ابراہیم کے پاس تھی اور وہ "فتح خازر" کے بعد وہیں بمقام نصیبین قیام پذیر ہو گئے تھے۔ لہٰذا مختار نے نہایت عجلت میں صرف چار ہزار کا لشکر ترتیب دیا۔ اور کوفہ سے نکل کر مقام "حمام امین" (بقولے بمقام نہر البصیرین) پر مصعب کے مقابلہ کے لیے پہنچ گئے۔ مصعب بھی اپنی جمعیت کے ساتھ مقابل میں آ کر جم گیا۔ اور پہلے مختار سے ابن زبیر کی بیعت کا مطالبہ کیا۔ مختار نے انکار کرتے ہوئے اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ پہلے ہم دونوں فریق مل کر دشمنان آل رسولؐ کو ختم کریں۔ پھر باہمی مشورہ سے اہل بیت رسولؐ میں سے جس شخص پر اتفاق ہو گیا اس کی بیعت کر لیں گے۔ اسے مصعب نے منظور نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طرفین سے آتش جنگ مشتعل ہو گئی۔ اس جنگ میں مختار کے کئی سربرآوردہ اور مخلص ساتھی کام آ گئے اور اکثر تاب مقابلہ نہ لاتے ہوئے راہ فرار اختیار کر گئے۔ مخالف کا کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ البتہ ایک مشہور دشمن اہل بیت یعنی محمد بن اشعث واصل جہنم ہو گیا۔[1] مختار اپنے چند مخلص ساتھیوں کے ساتھ واپس کوفہ لوٹ کر قصر دار الامارہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ اس طرح مصعب بلا مزاحمت کوفہ میں داخل ہو گیا اور دار الامارہ کا محاصرہ کر لیا۔ بقول دینوری اس محاصرہ نے چالیس یوم تک طول کھینچا۔[2] اس طرح مختار کا ازوقہ ختم ہونے لگا۔ اور ان پر قافیۂ زیست تنگ ہونا شروع ہو گیا۔ لہٰذا مختار نے زندگانی دنیا سے مایوس ہو کر غسل کیا۔ حنوط کیا اور خوشبو لگائی۔ اپنی زوجہ ام ثابت وغیرہا کو الوداع کہا۔ پھر باہر نکل کر اپنے چند جانثاروں کے ساتھ دلیرانہ و مجاہدانہ انداز میں داد شجاعت دیتے ہوئے زندگانی دنیا سے منہ موڑتے ہوئے ہمیشہ کے لیے عروس موت سے ہمکنار ہو گئے۔ ظالموں نے ان کا سر بدن سے جدا کر کے مصعب کے سامنے پیش کیا۔ پھر مصعب نے اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کے پاس مکہ بھیج دیا۔ یہ ۱۴ ماہ رمضان ۶۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سرسٹھ (۶۷) برس تھی۔[3] اس سلسلہ میں چھ ہزار آدمی مارے گئے۔[4] مصعب بدنہاد کی آتش کینہ و عناد اس پر بھی نہ بجھی۔ بلکہ مختار کی دونوں بیویوں ام ثابت بنت سمرۃ بن جندب اور عمرۃ بنت نعمان بن بشیر انصاری کو گرفتار

---

[1] اخبار الطوال، ص ۲۶۷۔ کامل، ج ۳، ص ۳۸۲۔
[2] الاخبار الطوال، ص ۲۶۷۔
[3] فرسان، ج ۲، ص ۲۴۱۔ الاخبار الطوال، ص ۲۶۸۔ کامل، ج ۳، ص ۳۸۸۔
[4] کامل، ج ۳، ص ۳۸۸۔

کر کے مختار سے اظہار برأت پر مجبور کیا۔ چنانچہ ام ثابت، ثابت قدم نہ رہ سکی اور اظہار برأت کر کے اپنی گلوخلاصی کرا لی مگر عمرہ آخر تک اپنے انکار پر قائم رہی۔ اور اس انکار کی اسے یہ قیمت ادا کرنا پڑی کہ مصعب کے حکم سے "جبانہ" میں لے جا کر اس کی گردن اڑا دی گئی۔ بعض شعراء نے اس کے مرثیے کہے۔ ایک مرثیہ کے چند شعر یہ ہیں ؎

ان من اعجب العجائب عندی　　　قتل بیضاء حرۃ عطبول

قتلوها بغیر ذنب سفاها　　　ان للّٰه درها من قتیل

کتب القتل و القتال علینا　　　و علی المحصنات جر الذیول[1]

اگرچہ اس کے ساتھ مختار کی ظاہری زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور نفس کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مگر جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ قدرت کاملہ مختار سے جو کام لینا چاہتی تھی وہ اس کی تکمیل کی سعادت حاصل کر کے بارگاہ ذوالجلال والاکرام سے بقاء دوام کا انعام حاصل کر چکے تھے۔ اب زمانہ کروڑوں کروٹیں بدلے، لیل و نہار لاکھوں بار گردش کریں۔ انقلاب روزگار ہزاروں بار کوشش کرے آفتاب و ماہتاب سینکڑوں بار طلوع و غروب کریں مگر کیا مجال کہ مختار کے نام و کام کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکیں۔ گویا مختار زبان حال سے پکار رہے ہیں ؎

افلت شموس الاولین و شمسنا　　　ابداً علی افق العلی لا تغرب

سچ ہے ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را　　　ہر زمان از غیب جانے دیگر است

و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین و صلی الله علی سیدنا خاتم النبیین و عترته الطاهرین المعصومین اللّٰهمّ اجعل سعی هذا لوجهک الکریم و اجعله ذخراً لی و لوالدی ولاساتیذی و خلّص تلامیذی و کمّل اخوانی المؤمنین لیوم لا ینفع فیه مال ولا بنون الا من اتی الله بقلب سلیم و اجعلنی من ورثة جنت نعیم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم برحمتک یا ارحم الراحمین. آمین یا ربّ العالمین بجاه النبی و اٰله الطاهرین صلوات اللّٰه علیه و علیهم اجمعین قد تم الکتاب بعون الله الوهاب فی لیلة العشرین من ذی القعدة الحرام ۱۳۸۹ھ من هجرة سید الانام علیه و علی اله الصلوة و السلام المصارف للتسع و العشرین من جنوری ۱۹۷۰ء فی الساعة التاسعة و الربع

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ۔

---

[1] الاخبار الطوال، ص ۲۹۹۔ کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۳۸۹ وغیرہ۔

اسلامک بک سینٹر اسلام آباد

ہمارے ادارے کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ عوام کو مستند علمی کتب اعلیٰ پرنٹنگ کے ساتھ مہیا کی جائیں۔

یہ ادارہ ''ایلیا'' ''ادم اور علی'' اور ''نماز شیعہ'' کی اشاعت کے بعد واقعاتِ کربلا پر ایک جامع علمی اور تحقیقی کتاب

''سعادت الدارین فی مقتل الحسینؑ''

شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

یوں تو واقعاتِ کربلا پر بہت سی کتب شائع ہو چکی ہیں لیکن قاری کے لیے مستند واقعات تلاش کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے انتہائی تحقیق کے بعد مستند واقعات کو جمع کیا ہے۔ امید ہے یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت زیادہ پسند کی جائے گی۔

(نوٹ):۔ ہر قسم کے اسلامی موضوعات پر کتب، علمائے کرام کی آڈیو / ویڈیو کیسٹیں اور CD's کی خریداری کے لیے رابطہ فرمائیں۔

سید عمار رضا کاظمی

اسلامک بک سینٹر، C-362، گلی نمبر 12، سیکٹر G-6/2، اسلام آباد

فون نمبر 2870105